The Drinched Book

text fiy book

فہرستِ مضامین

جلد (۳۱)

نمبر (۲)

ہمایوں بابت ماہِ فروری ۱۹۳۷ء

ڈیزائن:- بڑھاپا

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ر

۱۳۵۱

ہمایوں کا انعامی مقابلہ

بیگم محمد رفیع صاحبہ کی طرف سے پچاس روپے کا عطیہ

ہم بہت خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ اس سال پھر حضرت ہمایوں مرحوم کی دختر اور مدیر "ہمایوں" کی ہمشیرہ بیگم محمد رفیع صاحبہ نے اُردو کے اہلِ ادب کو ذیل کے عنوان پر مضمون لکھنے کی دعوت دی ہے:-

اُردو زبان و ادب کے عیوب و محاسن

(۱) مضمون نگار کو اُردو کے محاسن کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً ہندوستان کی دوسری زبانوں سے اس کا موازنہ کرنا چاہئے اور عیوب کے سلسلے میں اُن کے رفع کرنے کی تدابیر بھی پیش کرنی چاہئیں۔

(۲) موصولہ مضامین میں سے بہترین مضمون پر پچاس روپے انعام دیا جائے گا اور باقی مضامین میں سے چند مضمون "ہمایوں" میں شائع کئے جائیں گے۔

(۳) مضامین یکم مئی ۱۹۳۷ء سے پہلے دفتر "ہمایوں" میں پہنچ جانے چاہئیں۔ ارادہ ہے کہ منتخب مضامین جولائی کے مہینے میں شائع کئے جائیں۔

(۴) مضمون زیادہ سے زیادہ "ہمایوں" کے بیس اور کم سے کم دس صفحات پر پورا ہو۔

بزمِ ہُمایوں

Checked 1978

دسمبر ۱۹۳۶ء میں فیض پور میں کانگرس کا جو اجلاس ہوا اُس میں قومی زبان کی کانفرنس میں مہاتما گاندھی نے یہ پیغام بھیجا کہ "اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ سارے ملکِ ہندوستان کے لئے کسی مشترک زبان کی ضرورت ہے ۔سوال یہ ہے کہ یہ زبان ہندی ہو یا ہندوستانی۔اس کا یہ جواب ہے کہ یہ زبان وہ ہے جسے ہندو مسلمان دونوں سمجھ سکتے ہیں" کاکا کالیلکر کی تجویز پر کانفرنس نے یہ قرار داد منظور کی کہ ہندوستانی ہندوستان کی قومی زبان ہونی چاہئے۔

نام کا جھگڑا فضول ہے یہی زبان جو ہم لکھ رہے ہیں اور بولتے ہیں بس یہی قومی اور ملکی زبان ہے اور اس میں اللہ کے فضل اور خدا کی مہربانی کے ساتھ ایشور کی کرپا کے لئے بھی گنجائش ہے۔اُردو ہندی بہنیں ہیں ساتھ ساتھ پھلیں پھولیں اور پریم محبت سے مل جل کے رہیں سہیں۔

گزشتہ ماہ میں انجمن اُردو پنجاب کے متعدد جلسے منعقد ہوئے۔۲۱ر نومبر ۱۹۳۶ء کو راقم (سکرٹری انجمن) کے مکان المنظر پر ایک پُر رونق ادبی جلسہ راجہ نریندر ناتھ صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔مولانا ظفر علی خاں صاحب ،سالک ،حمید احمد خاں ،پروفیسر بشیر احمد ہاشمی ،حکیم احمد شجاع پنڈت ہری چند اختر ،خلیفہ عبد الحکیم ،پروفیسر فیاض محمود ،ڈاکٹر تصدق حسین خالد ،احسان بن دانش اور بشیر احمد مدیر "ہمایوں" نے اپنے نظم و نثر کے مضامین سنائے اور صدرِ محترم نے ایک نہایت معقول و مدلل تقریر کی اور فرمایا کہ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ آج شعرا اور ادبا نے اپنے نظم و نثر کے مضامین میں عہدِ حاضر کی تحریکات ،مناظرِ قدرت ،ملک کی بے روزگاری ،لسانی اور ادبی مسائل اور معاشری کوائف پر سنجیدہ یا ظریفانہ رنگ میں روشنی ڈالی ہے۔اخیر میں کہا کہ اس اختلافات کے زمانے میں ایسی ادبی صحبتوں میں شرکت ہر طرح باعثِ مسرت ہے۔

انجمن کے شعبۂ نسواں کا ایک جلسہ ۸ دسمبر ۱۹۳۶ء کو بیگم بشیر احمد کی تحریک پر المنظر میں منعقد ہوا جس میں بیگم امتیاز علی تاج ،بیگم عبد اللہ پروفیسر اُردو "لاہور کالج فار ومن"، امتیاز علی دستگیر صاحبہ پرنسپل اُمِ حمایتِ اسلام ہائی سکول ،بیگم تصدق حسین وغیرہ نے خاص طور پر حصہ لیا اور ایک دائرۂ ادبیہ قائم کیا گیا۔

انجمن کا ایک عام ادبی جلسہ ۳ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو وائی ،ایم ،سی ،اے میں ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مدیر ہمایوں نے تجزیۂ نفس پر ایک مقالہ پڑھا جو بعد میں "ہمایوں" کے جنوری اور فروری کے نمبروں میں شائع ہوا۔

۱۳ر جنوری ۱۹۳۷ء کے جلسے میں جناب خواجہ دل محمد صاحب کی صدارت میں ہوا۔پروفیسر عابد علی نے اپنا دلچسپ مقالہ پڑھا۔

۱۷ر جنوری ۱۹۳۷ء کو انجمن کے نائب صدر ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر کی دعوت پر اُن کے مکان واقع گالف روڈ میں ایک دلچسپ

ادبی اجتماع ہوا جس میں سید امتیاز علی تاج، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مولانا چراغ حسن حسرت، پروفیسر رام پرشاد کھوسلہ، پروفیسر فیض احمد اور حامد علی خاں صاحب نے اپنی نظم ونثر سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

اِس کے علاوہ تقریباً ہر ہفتے لاہور کے ریڈیو سٹیشن سے انجمن کی طرف سے انجمن کے اسسٹنٹ سکرٹری حفیظ ہوشیارپوری اور میاں عطاء الرحمٰن وغیرہ نے مختلف مفید موضوعات پر دلچسپ تقریریں کیں۔

انجمن کی باغبانپورہ (متصل لاہور) کی شاخ نے جس کے صدر میاں عطاء الرحمٰن ہیں متعدد کامیاب جلسے منعقد کئے جن سے ظاہر ہوا کہ اس مقام میں جو کبھی جسٹس شاہ دین ہمایوں مرحوم اور سر محمد شفیع مرحوم کا گہوارہ تھا علم وادب اور قومی مفاد کے لئے ابھی کافی جذبہ موجود ہے۔

انجمن اُردو پنجاب کے سکرٹری کو بہت سے خطوط پنجاب اور بیرون پنجاب مثلاً لکھنؤ، پٹنہ، بمبئی، میسور وغیرہ سے موصول ہوتے رہے ہیں جن سے مختلف مقامات میں اُردو زبان وادب کے لئے لوگوں کے شغف اور گہری دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ مختلف شہروں میں اُردو کی انجمنیں قائم ہو رہی ہیں اور جو قائم ہیں وہ اب پہلے کی نسبت زیادہ سرگرمی دکھا رہی ہیں۔ آثار اچھے ہیں لیکن ضرورت تنظیم اور باہمی مشورے اور مرکزیت کی ہے اور شاید سب سے زیادہ محنت اور مسلسل توجہ کی کہ بغیر غور اور باقاعدہ محنت کے آج کل کی دُنیا میں کوئی شاندار نتیجہ ظہور میں نہیں آسکتا۔ اُردو سی دلکش زبان کے لئے کس کا دل محنت کرنے کو نہ چاہے گا؛

مسٹر بی۔ ایل رلیا رام سکرٹری وائی۔ ایم۔ سی۔ اے لاہور کی خواہش کے مطابق مدیر "ہمایوں" نے اُردو کی بہترین نظم کے لئے جو پنجاب یونیورسٹی کے کسی کالج کے طالب علم کی ذاتی کوشش کا نتیجہ ہو ایک طلائی تمغہ موسومہ "شاہدین ہمایوں گولڈ میڈل" پیش کیا ہے۔ ۳۱ جنوری تک وصول شدہ نظموں پر تین اشخاص کی ایک کمیٹی غور کرے گی اور پھر منتخب شدہ نظمیں ایک ادبی جلسے میں پڑھی جائینگی اور سامعین کا فیصلہ کمیٹی کے فیصلے سے مختلف ہونے کی صورت میں سب سے زیادہ آراء حاصل کرنے والے طالب علم کو "سامعین کا انعام" دیا جائے گا +

بشیر احمد

جہاں نما

شہنشاہِ اعظم ایڈورڈ ہشتم کا خُلقِ عظیم

یہ عظیم الشان آدمی ایڈورڈ ہشتم جس کے جمہوری رجحان نے انسان کے اوّلین پیدائشی حقوق کے تحفظ کے لئے تاریخِ عالم کی سب سے بڑی سلطنت کے تاج و تخت کو ایک بے حقیقت سنگِ راہ کی طرح ٹھکرا دیا ہے جب ولیعہدِ سلطنت تھا تو ایک دن اسے ایک... ایسے چھوٹے سے ہسپتال کے معائنہ کی دعوت دی گئی جہاں جنگِ عظیم کے زمانے کے بعض ایسے خوفناک مقطوع الاعضاء مجروحین ہیں جو شفایابی کی اُمید سے ہمیشہ کے لئے محروم ہونے کے باوجود اب تک صبر و رضا کی ایک جان توڑ جنگ لڑ رہے ہیں، چنانچہ ایڈورڈ نے ایک دن مقرر کیا اور اُس دن چپکے سے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں پہنچ کر اُس نے حسبِ دستور زخمیوں کے بستروں کے گرد ایک چکر لگایا اور پھر ہسپتال کے شکر گزار کارپردازوں نے دروازے کی طرف اس کی رہنمائی کی، لیکن ایڈورڈ دفعتہً رُک کر بولا "مجھے بتایا گیا تھا کہ یہاں چھتیس آدمی ہیں لیکن میں نے تو صرف اُنتیس کو دیکھا ہے۔"

اس پر شہزادے کو بتایا گیا کہ باقی سات اعضا بریدہ اشخاص کی صورتیں اس الم انگیز حد تک بگڑ چکی ہیں کہ اُن کے کمروں کا معاینہ کرانے سے دانستہ اعراض کیا گیا ہے۔ لیکن جب ایڈورڈ نے اُن کو دیکھنے پر بھی اصرار کیا تو ہسپتال کے کارکن اُسے اُس حصّے میں لے گئے جہاں یہ تباہ حال لوگ بستروں پر پڑے اپنی موت سے بدتر زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ شہزادہ ایک ایک آدمی کے بستر کے پاس کافی دیر تک ٹھہر ٹھہر کر تسلّی آمیز باتیں کرتا رہا اور انگلستان کی طرف سے اِس ایثارِ نفس کے لئے فرداً فرداً ہر شخص کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ اس کے بعد پھر اُس نے ذرا سا تامّل کیا اور کہا "لیکن یہاں تو صرف چھ آدمی ہیں ساتواں کہاں ہے؟"

شہزادے کو بتایا گیا کہ ساتویں آدمی کو دیکھنے کی تاب کوئی انسان نہیں لا سکتا۔ وہ بالکل اندھا اور بہرہ ہو چکا ہے اور اعضا کی قطع و برید اور ہولناک جراحتوں کی کثرت کی وجہ سے اُس کی صورت اس قدر دہشت انگیز طور پر مسخ ہو چکی ہے کہ انسان سے اس کی کوئی مشابہت باقی نہیں رہی۔ یہ شخص بالکل تنہا ایک الگ کمرے میں ہے۔

شہزادے نے کہا "لیکن مجھے اُس کو ضرور دیکھنا ہے۔"

"بہتر ہے کہ حضور یہ ارادہ ترک فرما دیں۔ اس کا نظارہ نہایت ہولناک ہے۔"

"پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ اُسے ضرور دیکھوں۔"

ہسپتال کا صرف ایک کارکن شہزادے کو اُس چھوٹے سے تاریک کمرے میں لے گیا۔ شہزادہ نہایت ثابت قدمی کے ساتھ اُس شخص کے بستر کی طرف بڑھا لیکن اُس کی صورت دیکھ کر شہزادے کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا۔ اگرچہ وہ شخص نہ شہزادے کی بات سُن سکتا تھا اور نہ اُس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا لیکن پھر بھی شہزادہ وہاں کھڑا رہا اور دردناکی کے اُس مجسمہ کو جو کبھی انسان تھا' دیکھتا رہا۔

پھر بہت آہستہ سے جُھک کر ایڈورڈ نے اُس آدمی کے دہشت ناک چہرے کو چُوما اور کہتے ہیں کہ جب ایڈورڈ اعظم نے سر اُٹھایا تو اُس کے چہرے پر بدھ اور مسیح کا سا روحانی نور برس رہا تھا۔

بادشاہی اور خدمت گزاری

"پرنس آف ویلز کی حیثیت میں میرے پاس ایک نشان تھا جس پر "میں خدمت کرتا ہوں" کا قدیم مقولہ درج تھا۔ اب بادشاہ ہو جانے پر بھی یہ نشان اسی طرح میرے پاس رہے گا کیونکہ ایک بادشاہ خدمت کرنے سے زیادہ اہم اور کوئی کام نہیں کر سکتا"
(شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم)

ایڈورڈ ہشتم نے اپنی بادشاہت کے دنوں میں بعض ایسے کام کئے جن کی توقع اس مادہ پرست زمانے کے کسی بادشاہ سے نہیں ہو سکتی۔ بادشاہ کلائڈ کے بے روزگار مزدوروں کی ہمدردی کے جذبے سے متأثر ہو کر چُپ چاپ اُن کے علاقے میں چلا گیا۔ اور اپنی رعایا کے ادنیٰ ترین افراد کے جھونپڑوں کو بھی اپنی سچی انسانی ہمدردی کے نور سے جگمگا دیا۔ ان بے سروسامان غریبوں کے جوشِ مسرت کا خیال کرو کہ جب وہ اپنے جھونپڑوں کا دروازہ کھولتے تو سامنے شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کو کھڑا پاتے۔ شہنشاہ سلام کے لئے اپنی ٹوپی سر سے اُٹھاتا اور اُن سے پوچھتا "مجھے اندر آنے کی اجازت ہے؟"

وہ ایک لوہار کے گھر پہنچا۔ گھر صرف دو کوٹھڑیوں سے عبارت تھا اور گھر میں رہنے والے سات آدمی تھے۔ بادشاہ نے دروازہ کھول کر کہا "کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

لوہار بولا "ہاں! ہاں! ضرور اندر آؤ۔ لیکن تم کون ہو؟"

ذرا لوہار کی مسرت کا اندازہ کرو جب ملاقاتی نے جواب دیا "میں بادشاہِ انگلستان ہوں" اور پھر اُس سے اور اُس کے گھر والوں سے مصافحہ کیا۔

اس کے بعد بادشاہ نے اُن کے شیر خوار بچے کو اُٹھا کر پیار کیا اور پھر پوچھا "تم اتنی تنگ جگہ میں کس طرح گزارا کرتے ہو؟"

لوہار کی بیوی بولی "جس طرح بھی ہو ہم اس وقت تک گزارا کرتے رہیں گے جب تک جہاں پناہ ہمارے لئے کسی نئے گھر کا انتظام نہ فرما دیں۔"

بادشاہ نے کہا "ہاں میں ضرور اس کا انتظام کروں گا۔"

بادشاہ ایک اور عمارت کی بالائی چھت پر گیا۔ وہاں اُسے پانچ سال کا ایک بچہ چارلی سٹوری ملا۔

چارلی نے کہا "آپ میرے نئے بادشاہ ہیں؟"

بادشاہ نے اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "ہاں میرے بچے میں ہی تمہارا نیا بادشاہ ہوں۔"

جب بادشاہ غریبوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا گزرا تو وہ خوشی سے تالیاں بجاتے اور چلّاتے رہے "اعلیحضرت آپ پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں!"

اِس کے بعد بادشاہ نے لارڈ پروووسٹ کے ساتھ چائے پیتے ہوئے کہا کہ اب ان لوگوں کو ان گھروں سے جن میں وہ رہتے ہیں بہتر گھر مل جائیں گے۔

اپنے باپ کی نقرئی جُبلی کی تقریب پر ایڈورڈ ہشتم نے پرنس آف ویلز کی حیثیت سے سینٹ جیمز پیلیس میں ایک عظیم الشان دعوت دی۔ اس موقع پر صرف معزز مہمان ہی شاہی ضیافت سے محظوظ نہ ہوئے بلکہ پرنس آف ویلز نے اُن پندرہ سَو شوفروں کو بھی نہ بھلایا جو اس کے بلند مرتبت مہمانوں کو لائے تھے چنانچہ محل کے عظیم الشان صحن کے ایک طرف اُن کے لئے ایک ریسٹران کا انتظام کر دیا گیا اور ہر شوفر کو محل سے ایک ٹکٹ مِلا جسے ریسٹران میں دکھا کر وہ پرتکلف کھانا اور لذیذ شربت حاصل کر سکتا تھا۔

غریبوں کا بادشاہ

"وہ ننھا پھول جو بہار کی ایک صبح کو کھلے اور دوپہر ہوتے ہوتے مرجھا جائے لیکن شاخسار پر سے گرنے سے پہلے گلشن کو اپنی خوشبو سے مہکاتا جائے، بڑکے اُس عظیم الہیئت صحرائی ادبو سے بدرجہا بہتر ہے جو تنہائی میں صدیوں تک پھیلتا، پھلتا اور پھولتا رہے اور بالآخر کسی کو فائدہ پہنچائے بغیر اس کی بے فیض اور طویل زندگی کا چشمہ خشک ہو جائے اور وہ ایک گرانڈیل لاشے کی طرح زمین پر آ رہے۔"

ایڈورڈ ہشتم کا زمانۂ حکومت ایک سال سے بھی کم رہا۔ لیکن رعایا کی خدمت گزاری کا جو عہد اس نے دل سے باندھ رکھا تھا اس کی پاسداری ہر لمحہ اس کے پیشِ نظر رہی۔ امیروں کے بادشاہ تو سبھی ہوتے ہیں "جس کے پاس ہے اُسے اور دیا جائے گا" کے روحانی مقولے کے مادّی مقلد تو ہزاروں ہیں لیکن ایڈورڈ اُن غریبوں کا بادشاہ تھا "جن کے پاس نہیں ہے" وہ (مادہ پرستوں کی اس روش کے علی الرغم کہ اُن سے وہ بھی لے لیا جائے جو اُن کے پاس ہے) انہیں کچھ دینا چاہتا تھا۔

غریبوں سے ایڈورڈ کی ہمدردی کے بیسیوں افسانے زبانِ زدِ خلائق ہو چکے ہیں لیکن بادشاہت سے دستبردار ہوتے ہوتے

وہ ایک ایسا کام کر گیا جو تاریخ انگلستان میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

ساؤتھ ویلز کے مزدوروں کی حالت ایک مدت سے ناگفتہ بہ چلی آتی تھی۔ نہ اُن کے پاس رہنے کو مکان تھے نہ کھانے کو روٹی اور نہ پہننے کو کپڑا۔ اُن کے واویلا پر حکومت مطلق کان نہ دھرتی تھی۔ ایڈورڈ کو ان لوگوں کا بڑا خیال تھا چنانچہ جانے سے پہلے اُس نے ضروری سمجھا کہ ان غریبوں کے لئے کوئی انتظام کرتا جائے۔

انگلستان کے بادشاہ کو بعض اختیارات حاصل ہیں لیکن اب مدتوں سے بادشاہ ان اختیارات کو کام میں نہیں لاتے اور وزرار بھی یہ نہیں چاہتے کہ بادشاہ اُن کے "حکم" کے بغیر کوئی کام کریں۔ ایڈورڈ نے اپنے اُن اختیارات سے کام لیا جن سے کوئی بادشاہ اب کام لینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ وہ وزرار کی خواہش کے خلاف ساؤتھ ویلز چلا گیا۔ خود غریبوں کے گھروں میں پھرا۔ اُن کا حال پوچھا بچے، بوڑھے، مرد، عورت سب کی دلجوئی کی اور اُن کی بدحالی سے متأثر ہو کر کہا " میں تمہارے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا "

واپسی پر ایڈورڈ نے اُن غریبوں کی مدد کے لئے انتظامات کرنے کا حکم دیا۔ وزرار کو ایڈورڈ کی یہ آزادہ روی ناگوار گزری لیکن وہ آئینِ حکومت کی پابندیوں سے مجبور تھے کہ اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ چنانچہ ساؤتھ ویلز میں نئے کارخانوں کے قیام کا انتظام کیا گیا اور کارخانہ داروں کی حوصلہ افزائی کے لئے یہ تجویز کی گئی کہ ایک عرصے کے لئے اُن کو انکم ٹیکس معاف کر دیا جائے سرکاری خزانے سے بھی کارخانہ داروں کو مدد پہنچائی گئی اور حکومت کے میزانیۂ مصارف میں اضافے کے لئے بیئر، شراب اور بعض اور تعیشات پر زائد محصول عائد کر دیا گیا۔

جاتے جاتے بھی ایڈورڈ نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ غریبوں کا بادشاہ تھا۔ تختِ انگلستان پر کئی بادشاہ بیٹھیں گے اور حکومت کریں گے اور بالآخر یہ سلطنت بھی تاریخ کا ایک افسانۂ پارینہ ہو کر رہ جائے گی لیکن ایڈورڈ ہشتم کی حکمرانی غریبوں کے دلوں پر ابدالآباد تک قرار رہے گی۔

حامد علی خاں

(۲)

انسانی فطرت کا کیا تقاضا ہے اور سیرت کی نشوونما کیونکر ہوتی ہے؛ تجزیۂ نفس کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ انسانی نفس کے دو حصّے ہیں شعوریہ اور غیر شعوریہ۔ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس میں چند جبلی خواہشات ہوتی ہیں جو کسی نہ کسی طرح اپنی تکمیل چاہتی ہیں۔ لیکن بچے کا ماحول بڑی حد تک بچے کی جبلّت کے برعکس ہوتا ہے، وہ آزاد ہونا چاہتا ہے، معاشرت اُس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالتی ہے۔ وہ بتدریج یہ بندشیں محسوس کرتا ہے اور چونکہ وہ قوت سے عاری ہوتا ہے اس لئے بتدریج وہ اِن بندشوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ وہ باطنی کشمکش ہوتی ہے جو اُس کی سیرت پر ایک گہرا اثر ڈالتی ہے۔ وہ ممنوعہ خیالات کو چھپاتا ہے، اُنہیں دبا دیتا ہے لیکن وہ اندر ہی اندر اپنے کھیل کھیلتے ہیں۔

عمر کے پہلے سال میں بچے کی تمام خواہشات کا مرکز اُس کا منہ ہوتا ہے، وہ مُنہ سے ماں کا دودھ پیتا ہے، وہ ہر چیز منہ میں ڈالتا ہے زندگی کا تمام تر حظ وہ منہ کے ذریعے سے لیتا ہے۔ دوسرے سال میں اُس کی توجہ بول وبراز کی طرف مبذول ہوتی ہے، ان کے اخراج میں اُسے مزا ملتا ہے۔ تیسرے سے پانچویں سال تک اُسے اپنے اعضائے مخصوص میں لطف اندوزی حاصل ہونے لگتی ہے۔ اس کے بعد یہ خواہشات اور لُطف اندوزیاں چھ سات سال تک ایک حد تک پردۂ خفا میں چلی جاتی ہیں۔ لیکن سِن بلوغ پر پھر ان کا زور ہوتا ہے اور اس دفعہ شعوری طور پر زور ہوتا ہے، بالخصوص جنسیت کا جذبہ ایک طوفان برپا کر دیتا ہے۔ بچے کی یہ خوراک کی خواہش، یہ چیزوں کے حاصل کرنے کی تمنا، یہ جنسیت سے لطف اُٹھانے کی آرزو سب فطری ہیں اور جبلی۔ وہ ان میں کوئی بُرائی نہیں دیکھتا، بُرائی کا تو اُسے علم ہی نہیں، وہ تو فقط بعض ہیجانات کو محسوس کرتا ہے اور اِن کی پیروی میں وہ اپنی اِن خواہشات کی تکمیل کی راہیں ڈھونڈتا ہے۔ وہ خود غرض ہے، خود پسند ہے، خود نما ہے لیکن وہ تنِ تنہا نہیں وہ ایک معاشری حلقے کا رکن ہے، یہاں مقیّد ہے اور یہاں اُس کی خود غرضی اور لطف اندوزی سے دوسروں کے خیالات کا تصادم ہوتا ہے۔ اُس کی خود غرضی کو قدم قدم پر ٹھوکر لگتی ہے، اُس کی لطف اندوزی کو بات بات میں روکا جاتا ہے۔ اُسے صرف اتنا دودھ پینا چاہئے اور فلاں وقت پر پینا چاہئے، اُسے اپنے بول وبراز کی طرف توجہ نہ کرنی چاہیے، اُسے فلاں فلاں اوقات میں رفعِ حاجت کرنی چاہئے، اُسے اپنے مخصوص اعضاء کو چھُونا اور اُن سے لطف نہ لینا چاہئے یہ ہیں معاشری بندشیں اور یہ ہے اخلاق کی ابتدا۔ بچہ اِن کے خلاف اپنی ساری طاقت

صرف کر دیتا ہے لیکن یہ آہنی دیواریں یہ صدیوں کی آہنی دیواریں ایک نرم و نازک وجود کے سر ٹکرانے سے ٹوٹ نہیں سکتیں۔ مجبور ہو کر وہ اپنی اِن خواہشات کو ایک حد تک روکتا ہے اور اپنے عمل کے اندر ہی اندر انہیں چھپا لیتا ہے اور دبا دیتا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہو گا اس چھپانے اور دبانے کے بعض اچھے لیکن بعض بُرے نتائج بھی ہوتے ہیں جن کا ظہور وقتاً فوقتاً کئی معمولی اور غیر معمولی واقعات میں عمر بھر ہوتا رہتا ہے۔

ماہرینِ تجزیہ کا خیال ہے کہ انسانی سیرت اوائل عمر میں بلکہ زیادہ تر پہلے پانچ سالوں ہی میں ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ بعض وراثت کو مطلق اہمیت نہیں دیتے اور بعض اسے سیرت کی ساخت و پرورش کا اہم جزو سمجھتے ہیں لیکن تقریباً سبھی اس امر پر متفق ہیں کہ تربیت سے موروثی خصائص پر بہت اہم اثر پڑتا ہے۔ ماہرین نے بالغ انسان کی ایک ایک خصلت کا سُراغ شیر خواری، بول و براز اور جنسی جذبے کی گوناگوں کیفیتوں میں پایا ہے۔ لاڈلا پن، بے چارگی، ضد، استقلال، بزدلی، حوصلہ وغیرہ وغیرہ سب کے سرچشمے یہاں ملتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ بچے کی ابتدائی تربیت کس قدر اہم ہے اور نتیجہ خیز اور اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے معاشری ادارے اور ہمارے اخلاقی خیالات نوعِ انسان کی آئندہ نسل کی ذہنی ساخت اور زندگی پر کتنے گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ ورڈز ورتھ نے سچ کہا ہے کہ "بچہ انسان کا باپ ہے"۔ بچپن زندگی کی کل کا ابتدائی کارخانہ ہے، سب پُرزے یہیں ڈھلتے ہیں، سب صلاحیتوں کی ابتدا یہیں ہوتی ہے۔ کسی کا قول ہے کہ بچے کو پہلے پانچ سالوں کے لئے مجھے دے دو اور پھر عمر بھر جہاں چاہو اُسے رکھو۔ اس سے ماں باپ اور خصوصاً ماں کی توجہ اور تربیت کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک ماں اپنے بچے کو ہر لحاظ سے بنا یا بگاڑ سکتی ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کو انسانی معاشرت میں جو درجہ جو عزت و وقار حاصل ہونی چاہئے وہ حاصل نہیں بالخصوص مشرق میں تو عورت ناقص العقل اور عموماً مرد کی غلام سمجھی گئی ہے پھر وہ کس طرح فہیم و دلیر بن کر اپنے بچے کے لئے ایک ایسا زندہ نمونہ ہو سکتی ہے جسے دیکھ کر وہ اپنی زندگی کو مربوط و مضبوط بنا لے؛ غرض جس طرح بچے اور عورت پر بندشیں عائد کی جاتی ہیں؛ جس طرح اُن کی فطری اور جبلی خواہشات کا قلع قمع کیا جاتا ہے، جس طرح اُن کی مخصوص اور انوکھی صلاحیتوں کو عام رسم و رواج کے شکنجے میں دبا کر ملیامیٹ کر دیا جاتا ہے اس کے بعد کیا تعجب ہے کہ ہماری مشرقی نسل اور خصوصاً ہماری ہندوستانی قوم کچھ عرصے سے غلامانہ ذہنیت اور ناخوشی اور ذلت کے پنجے میں گرفتار ہے۔ جب زندگی کی بنیاد ہی کھوکھلی اور بودی ہوگی تو اُس پر کیسا ہی عالیشان قصر کیوں نہ بنے وہ کسی نہ کسی روز لا محالہ مسمار ہو کر رہے گا: جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا!

جب روز و شب "یہ مت کرو" "وہ مت کرو" کی رٹ لگی رہے گی تو بچہ بڑا ہو کر نہ یہ کر سکے گا نہ وہ اور جو کچھ وہ کرے گا بھی وہ عموماً ٹیڑھی طرح کی بات اور غلط قسم کا کام ہوگا۔ اُس کی قوتِ تخلیق استعمال نہ ہو سکنے کے باعث بعض حالتوں میں کمزور اور بعض میں ملیامیٹ ہو جائے گی۔ غیر قوموں کی غلامی سے بدتر وہ غلامی ہے جو ہمارے گھروں میں صبح و شام بلکہ ایک ایک گھڑی میں دیکھی جاتی ہے اور پھر وہ غلامی سب سے زیادہ سخت ہے جس میں ہر شخص نے اپنے نفس کو آپ ہی قید کر رکھا ہے۔ یہ غلامی اکثر زندگی

کو محسوس کر کے موت کا نمونہ بنا دیتی ہے اور بعض اوقات وہ کُھل کھیلتی ہے کہ جاننے والے ہی جانتے ہیں۔ کیا اِس سے یہ بہتر نہیں کہ اُسے اعتدال کے اُس رستے پر چلا جائے جو انسانی جبلّت کا تقاضا ہے؟

انسان کے احتباس و اجتناب کی خرابیاں عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتی ہیں۔ ایک شخص در پردہ بد دیانت ہے لیکن بظاہر نہایت دیانت دار اتنا کہ اُسے ہر وقت دوسروں کی دیانت داری کی فکر لگی رہتی ہے اور اسی لئے اُس کی اصلی نیت ظاہر ہوتی ہے اسی طرح انتہائی ہمدردی بعض اوقات در اصل انتہائی نفرت کا اظہار ہوتی ہے۔ ہاں ان بندشوں کی قلبِ ماہیت کی ایک نہایت اہم اور دلچسپ صورت بھی ہے اور وہ ہے انسان کے بعض حیوانی یا خود غرضانہ میلانات کا سود مند اور رفاہِ عام کے کاموں میں تبدیل ہو جانا۔ بچہ ہر چیز پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس خواہش کو دبا دیا یا روک دیا جاتا ہے تو اسی دباؤ اور اسی روک سے مثلاً اُس کی حصولِ علم کی خواہش پیدا ہوتی ہے اسی طرح ایذا رسانی کی فطری خواہش عملِ جرّاحی کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ یہی وہ روک ٹوک اور ایثار ہے جس سے نوعِ انسان کے تمدن کی عظیم الشان عمارت معرضِ وجود میں لائی گئی ہے۔ اگر فطری میلانات کو بے روک ٹوک بڑھنے دیا جاتا تو آج انسان محض ایک زیادہ چالاک اور خود غرض حیوان ہوتا اور بامِ ترقی پر نہ چڑھ سکتا۔ یہ تبدیلیاں عموماً بغیر ہمارے جانے بوجھے عمل میں آتی ہیں سو بعض قسم کی بندشیں بعض لوگوں کے اندر مفید کاموں کی سرگرمی میں تبدیل ہو جاتی ہیں لیکن اکثر دبی ہوئی خواہشات شخصیت میں انتشار پیدا کر دیتی ہیں جس سے وہ تمام بُرے نتائج مترتب ہوتے ہیں جن سے بڑے اور چھوٹے آدمیوں کی زندگیاں عبارت ہیں۔ کوئی اعصابیت کا شکار ہو جاتا ہے، کوئی غم و اندوہ میں مبتلا ہو جاتا ہے کوئی ترکِ دُنیا کا عزم کر لیتا ہے، کوئی ہر معمولی فعل کو ایک بُرا فعل اور ہر خواہش کو بُرائی سے تعبیر کرنے لگتا ہے، کوئی مغرور کوئی بے حیا، کوئی مجسّم حیا داری بن جاتا ہے، کوئی امن پسندی اور خاموشی کا فلسفہ ایجاد کر لیتا ہے، کوئی چین نہیں لیتا جب تک اپنوں اور غیروں کی زندگی کو عذاب کا نمونہ نہ بنا دے اور کوئی موقع پا کر آمر بن جاتا ہے اور لاکھوں کروڑوں کی معاشرت میں ایک اچھا یا بُرا انقلاب پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ سب کے سب غیر معمولی افراد ہیں اور ان کی آج کل کے متمدن زمانے میں اتنی کثرت ہے کہ یہ ہمیں معمولی اور عام انسان معلوم ہوتے ہیں اور اُدھر معمولی اعتدال پسند انسان غیر معمولی اور شاذ ہو کر رہ گئے ہیں۔ فی الحقیقت یہ غیر معمولی افراد سب کے سب عصب زدہ اور خلافِ فطرت ہستیاں ہیں۔ ان کا علاج محض تجزیۂ نفس کے ذریعے سے ممکن ہے۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ تجزیۂ نفس کیسے انسان کے ایک ایک معمولی سے فعل بلکہ اُس کے ایک ایک فضول سے لفظ اور اُس کے ایک ایک بے معنی سے خواب سے اُس کے نفس کی ماہیت دریافت کرتا ہے۔ تجزیۂ نفس متمدن دُنیا کی اعصابیت کی مختلف صورتوں کے انسداد و معالجہ کا دعوے دار ہے۔ یہ اعصابیت عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتی ہے اُدھر قلب و جگر و معدہ کی بیماریاں مختلف قسم کے خوف و ہول تشنج، وجع المفاصل، دمہ وغیرہ اور اِدھر غم پسندی، کم ہمتی، خلوت پسندی، تکبر و نخوت، مجہولی

اور بیسیوں ایسے ہی اور جسمانی و نفسی بیماریاں اور حالتیں ہیں جن کا بارہا تجزیہ کاروں نے کامیاب طور پر علاج کر کے دکھا دیا ہے۔

تجزیاتی علاج اس اصول پر مبنی ہے کہ انسان کے نفس غیر شعوریہ میں جو مسدود و ممنوع خیالات محبوس ہیں اُن کے اظہار و اقرار اور اُن کی از سرِ نو ترتیب و اصلاح اور تسلّی و تشفی سے نفس صحت مند ہو کر تمام نفسی اور متعدد جسمانی عوارضات دُور ہو جاتے ہیں اور انسان صحیح معنوں میں ایک زندہ و کامیاب وجود بن جاتا ہے۔

تجزیاتی طریقۂ علاج یہ ہے کہ تجزیہ کار اور مریض علیحدہ ایک کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ تجزیہ کار مریض سے کہتا ہے کہ وہ اپنے تمام حالات من وعن بیان کرتا چلا جائے، بچپن سے لے کر تا حال سب واقعات ٹھیک ٹھیک کہہ دے اور کسی بات کو چھپائے نہ رکھے۔ اس کے علاوہ اور بھی جو جو خیالات اُس کے دل میں آتے ہیں وہ بھی بیان کئے چلا جائے جو پُرانے یا نئے خواب اُس نے دیکھے ہیں وہ سُنائے۔ اس میں کئی دن گزر جاتے ہیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد یا جلد ہی مریض کہتا ہے کہ اب اور کوئی بات باقی نہیں رہی۔ لیکن عموماً یہ امر حقیقت پر مبنی نہیں ہوتا اور مریض بہت سی باتیں چھپائے رکھتا ہے بالخصوص بہت سے وہ واقعات یا خیالات جو اُس کے جذبۂ جنسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ "مدافعت" کی منزل ہے جب مریض ان مخفی باتوں پر پردہ ڈالتا ہے۔ "مدافعت" کا پیدا ہونا بُری علامت نہیں بلکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرض باہر کو نکلنا چاہتا ہے مگر مریض اس کا سدِباب کرتا ہے۔ بتدریج تجزیہ کار طریقِ تلازم اور اظہارِ ہمدردی اور دوسرے ذرائع سے اس "مدافعت" کا انسداد کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک عجیب و غریب کیفیت رونما ہوتی ہے یعنی مریض تجزیہ کار سے بہ غایت وابستہ ہو جاتا ہے اور اس کو دنیا میں اپنا سب سے بڑا رفیق تصور کرنے لگتا ہے جس کے بغیر زندگی سُونی معلوم ہوتی ہے۔ اس "تحویل" کا "استحالہ" تجزیہ کار کا آخری مقام ہے۔ وہ مریض کو سمجھاتا ہے کہ وہ اپنے اوائل عمر میں اپنے باپ یا ماں سے وابستہ تھا اور اُس کی زندگی کی خوشیوں کا انحصار فقط اُن پر تھا۔ اب اُس کے نفس نے اس اولیں سہارے کی بجائے تجزیہ کار کو اپنا مطمحِ محبت بنا لیا ہے لیکن ہر ہوشمند انسان کو خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا خوگر ہونا لازم ہے لہٰذا مریض کو چاہیئے کہ اپنے آپ پر بھروسا کرے اور صحیح معنوں میں خوددار بن جائے۔ یہ ہے فرائڈ کے نزدیک شفا کا آخری مرحلہ۔ لیکن بعض دوسرے تجزیہ کار سمجھتے ہیں کہ یہ مرحلہ آخری نہیں۔ یہ درست ہے کہ عموماً مریض کے علاماتِ مرض دُور ہو جاتے ہیں اور وہ بظاہر خوش و خرم بھی نظر آنے لگتا ہے لیکن نفس کی کامل صحت یابی کے لئے ابھی ایک عرصہ درکار ہوتا ہے اور اُس کی تعلیم و تربیت گویا از سرِ نو بتدریج ہوتی رہتی ہے۔

تجزیاتی علاج کے سلسلے میں دو اور باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ تجزیہ کاری بڑا دشوار کام ہے۔ لہٰذا تجزیہ کار ایسا ہونا چاہیئے جو اپنے فن کا پورا ماہر اور طبی معلومات سے بخوبی آگاہ ہونے کے علاوہ فہیم دوراندیش صابر ہمدرد اور انسانی فطرت کا جاننے پہچاننے والا ہو۔ دوسرے یہ کہ ایک صحیح معنوں میں سمجھدار شخص ایک حد تک آپ اپنا تجزیہ بھی کر سکتا ہے۔ کیا دُنیا میں

سینکڑوں انسان ایسے نہیں ہیں جو فطری میلانات اور خارجی حالات کو مدِ نظر رکھ کر وقتاً فوقتاً خود اپنی زندگی پر تبصرہ کرتے ہیں اور اُس میں کامیابی کے ساتھ ایک انقلاب پیدا کر دیتے ہیں؛ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لوگوں میں کثرت اُن کی ہے جو ایسے کام کی صلاحیت نہیں رکھتے یا صلاحیت رکھتے ہوئے اُسے اعتمادِ نفس کے ساتھ کام میں نہیں لاتے۔ اسی لئے نوعِ انسان کو بلند نظر پُر خلوص رہنماؤں کی ہر وقت اشد ضرورت رہتی ہے!

تمثیلاً ہم یہاں آڈلر اور سٹیکل دو مشہور تجزیہ کاروں کے بیان کردہ چند واقعات اور تجزیاتی علاج کی چند مثالیں بیان کرتے ہیں:-

آڈلر کا بیان ہے کہ ایک سولہ سال کی لڑکی میرے پاس علاج کی غرض سے بھیجی گئی۔ اُسے چھ سات سال کی عمر سے چیزیں چرانے کی عادت تھی اور بارہ سال کی عمر سے وہ رات کو لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی بھی کیا کرتی تھی۔ جب وہ دو سال کی تھی تو اُس کے ماں باپ میں سخت لڑائی جھگڑے کے بعد طلاق ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنی نانی کے گھر میں رہنے لگی جہاں اُس کی نانی نے جیسا کہ نانی دادیوں کا دستور ہے اُسے حد سے زیادہ لاڈ پیار کر کے بگاڑ دیا۔ اُس کی پیدائش کے وقت اُس کے ماں باپ میں سخت لڑائی جھگڑے ہوا کرتے تھے اور اُس کی ماں کو اُس کے پیدا ہونے پر خوشی نہ ہوئی تھی۔ اُس نے کبھی اس لڑکی کو زیادہ نہ چاہا اور ماں بیٹی کے درمیان ہمیشہ ایک رنجیدگی سی رہتی تھی۔ جب لڑکی میرے پاس آئی تو میں نے اس سے ہمدردانہ گفتگو کی۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ "مجھے چیزیں چرانا پسند نہیں ہے اور نہ مجھے لڑکوں کے ساتھ گھومنے پھرنے میں خاص مزا آتا ہے لیکن میں اپنی ماں کو یہ ضرور دکھانا چاہتی ہوں کہ وہ مجھے ٹھیک نہیں کر سکتی"۔ میں نے پوچھا "تم ماں سے بدلہ لیتی ہو؟" اُس نے جواب دیا "ایسا ہی ہوگا"۔ یہ لڑکی اپنے آپ کو اپنی ماں سے زیادہ زبردست اور ضدی ثابت کرنا چاہتی تھی لیکن وہ ایسا صرف اس لئے کرتی تھی کہ وہ اپنی کمزوری کو محسوس کرتی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اُس کی ماں اُس سے نفرت کرتی ہے اور اس لئے اُس کے نفس پر خبطِ کمتری سوار تھا۔ "برتری" جتانے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ وہ اپنی ماں کو تنگ کرے۔ بچے جب چوری کرتے ہیں یا ایسی ہی کوئی نازیبا حرکت کرتے ہیں تو عموماً اُس کی وجہ بدلہ لینا ہوتا ہے"۔ دیکھو یہ لڑکی کیسے بُرے حالات میں پیدا ہوئی۔ اُس کے والدین کی کشمکش کا اُس پر کیسا بُرا اثر پڑا ہوگا پھر اُس کی نانی نے اُسے لاڈ سے بگاڑا۔ اُس کی ماں کی نفرت نے اُس کے دل میں بیزاری اور ضد پیدا کر دی۔ لیکن وہ ابھی بچی تھی اپنی ماں کے تابع۔ کیا کرتی؟ ایسی حالتوں میں انسانی فطرت جو جبلتاً آزاد واقع ہوئی ہے جب بجائے آزادی کے اُس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جاتی ہیں تو وہ بغاوت کرتی ہے کبھی جہاں مغرب کی طرح کچھ آزادی مل سکے یہ بغاوت چھوٹی چھوٹی کارستانیوں میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی جہاں مشرق کی طرح بندشوں پر بندشیں ہوں یا تو اس کا نتیجہ کسی سخت شرمناک فعل میں رونما ہوتا ہے اور یا عموماً مظلوم بچہ دب کر رہ جاتا ہے اور اُس کی سیرت عمر بھر کے لئے خراب اور کمزور ہو جاتی ہے۔

تعاون و اشتراک پر انسانی زندگی کی صحیح بنیاد قائم ہوتی ہے خصوصاً شادی میں کہ وہ بغیر اشتراکِ عمل اور مساوات کے کبھی کامیاب نہیں

ہو سکتی۔ ایک طلاق شدہ مغربی خاتون نے ایک طلاق شدہ مغربی مرد سے شادی کر لی۔ وہ دونوں نہایت مہذب اور سمجھدار تھے اور اُن کو پوری اُمید تھی کہ اُن کا یہ تجربہ پچھلے تجربے سے زیادہ دل خوش کن ثابت ہوگا۔ انہیں یہ علم نہ تھا کہ اُن کی پہلی شادیاں کیوں ناکام رہی تھیں۔ وہ دونوں چاہتے تھے کہ اب کی بار خوش رہ سکیں، لیکن اُن کو اپنی ناملنساری کا پتہ نہ تھا۔ اُن کا دعوٰے تھا کہ وہ آزادی پسند ہیں اور ایک ایسا زن و شوئی تعلق قائم رکھنا چاہتے ہیں جس میں ہر طرح کی آسانی ہو تاکہ وہ ایک دوسرے سے کبھی نہ اُکتائیں۔ اُنہوں نے آپس میں سمجھوتا کیا کہ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پوری طرح آزاد رہیں گے، وہ جو چاہیں گے کریں گے لیکن اُن کو ایک دوسرے پر اتنا بھروسا کرنا ہوگا کہ جو کچھ بھی وہ کریں گے وہ ایک دوسرے کو صاف صاف بتا دیا کریں گے۔ اس معاملے میں شوہر زیادہ دلیر نکلا۔ جب کبھی وہ گھر واپس آتا تو وہ اپنی بیوی کو اپنی دل لگی کے بہت سے قصّے سناتا جس سے بہت محظوظ معلوم ہوتی اور اپنے شوہر کی کامرانیوں پر فخر کرتی۔ وہ کئی بار ارادہ کرتی کہ میں بھی کسی سے دل لگاؤں اور لُطف اُٹھاؤں لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اِس بارے میں کچھ اقدام کرتی اُسے ایک پُراسرار سی شکایت پیدا ہوگئی۔ وہ کسی کھُلی جگہ میں آ جا نہ سکتی۔ اُس کے دل میں کھلی جگہوں سے ہول پیدا ہو جاتا۔ وہ کہیں اکیلی باہر نہ جا سکتی اور اُس کی اس اعصابیت نے گویا اُسے ایک کمرے میں قید کر دیا۔ اگر وہ دروازے سے ایک قدم بھی باہر کو اُٹھاتی تو وہ فوراً لوٹنے پر مجبور ہو جاتی۔ دراصل یہ ہر کھُلی جگہ کا ہول اُس کے دل لگی کے ارادے کے خلاف ایک ردِّ عمل تھا۔ اُس کے نفس میں دو خیالوں کے درمیان ایک مجادلہ برپا ہو گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہول تھا۔ پھر لطف یہ کہ اب وہ باہر آ جا نہ سکتی تھی اور اُس کے شوہر کو بھی مجبوراً اُس کے پاس ٹھہرنا پڑتا تھا۔ شادی نے اُن کی آزاد مَنشی کا خوب سدِّباب کیا۔ نہ اُس کا شوہر اُسے اکیلا چھوڑ کے جا سکتا تھا اور نہ وہ خود ہی اکیلی کہیں جا سکتی تھی۔ شادی میں ایسے آزادانہ لطیفوں کی گنجائش نہیں۔ اگر شادی شدہ ہو کر خوش رہنا ہے تو آپس میں تعاون کرو۔ اور اگر تعاون نہیں کرتے تو مِل کر نہ رہو بلکہ اکیلے ہی رہو اور اپنی کرتوتوں میں خوش رہ سکتے ہو تو رہا کرو۔

آڈلر کو یقین ہے کہ تعاون اور ہمدردی نوعِ انسان کی جملہ مصیبتوں کا کامیاب علاج ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنا ایک تجربہ بیان کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی ہمدردی دیوانگی میں بھی کیونکر شفا کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ایک لڑکی ایک بُری قسم کی دیوانگی میں مبتلا تھی اور پاگل خانے میں محبوس تھی۔ اُس کی دیوانگی کو آٹھ سال گزر گئے تھے اور وہ دو سال سے پاگل خانے میں پڑی تھی۔ وہ ایک کتے کی طرح بھونکتی تھی، تھوکتی تھی، اپنے کپڑے پھاڑتی تھی اور اپنا رومال کھانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اُسے دوسروں سے کوئی دلچسپی باقی نہ تھی۔ وہ کتے کی طرح اس لئے بھونکتی تھی کہ اُس کی ماں نے کتے کی طرح اُس سے سلوک کیا تھا اور اب شاید وہ زبانِ حال سے یہ کہتی تھی کہ جتنا زیادہ میں انسانوں کو دیکھوں گی اُتنا ہی زیادہ میں کتا بننا چاہوں گی۔ میں اُس سے متواتر آٹھ روز بات کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اُس نے ایک لفظ جواب میں نہ کہا۔ میں نے اپنی کوشش برابر جاری رکھی۔ تیس روز کے بعد وہ کچھ مبہم اور ناقابلِ فہم طریقے سے بولنے لگی۔ میں نے اُس سے ہمدردی ظاہر کی تھی، اس سے اُس کا حوصلہ بڑھا۔ جب اس قسم کے

مریض میں حوصلہ پیدا ہونے لگتا ہے تو اُسے شروع شروع میں پتہ نہیں چلتا کہ اس حوصلے سے وہ کس طرح کام لے۔ وہ چاہے گا کہ کوئی شرارت کرے یا کسی طرح دوسروں کو تنگ کرے یا کچھ توڑے پھوڑے۔ اس کے بعد جب میں نے اُس سے جا کر بات چیت کرنی چاہی تو اُس نے مجھے مُکا مارا۔ میں نے سوچا کہ اب میں کیا کروں۔ اس کا جواب جس سے وہ حیران سی ہو جائے یہی تھا کہ اُس کا مطلق مقابلہ ہی نہ کروں۔ سو میں نے اُسے مارنے دیا اور اس پر ایک ہمدردانہ رویہ اختیار کیا۔ اس کی اُسے توقع ہی نہ تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ اب اور کس طرح وہ مجھے بھڑکائے۔ اُسے پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ وہ اپنی نوآموز ہمت سے اب کیا کرے۔ اُس نے میری کھڑکی توڑ دی جس سے اُس کا ہاتھ شیشے کے ٹوٹنے سے زخمی ہو گیا۔ میں نے اُسے پھر بھی سخت سُست نہ کہا بلکہ اُس کے ہاتھ کی مرہم پٹی کر دی۔ اگر میں عام دستور کے مطابق اُسے ضرب لگاتا اور اُسے کمرے میں بند کر دیتا تو اس کا نتیجہ کبھی اچھا نہ ہوتا۔ ہمارا ارادہ اگر اُس کا دل موہنے کا ہے تو ہمیں اپنا رویہ بدلنا چاہیئے۔ ایک دیوانے سے ہمیں کبھی اُمید نہ رکھنی چاہیئے کہ وہ ایک ہوش مند آدمی کی طرح کوئی بات کرے گا۔ اس کے بعد لڑکی صحت مند ہو گئی۔ برابر ایک سال گزر گیا اور وہ بالکل صحت رہی۔ ایک روز جب میں اُسی پاگل خانے کی طرف جا رہا تھا تو وہ مجھے راہ میں ملی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا تم کیا کر رہے ہو؟ میں نے جواب دیا تم میرے ساتھ آؤ میں اُس پاگل خانے کی طرف جا رہا ہوں جہاں تم دو سال تک رہی تھیں۔ ہم اکٹھے وہاں گئے اور میں تھوڑی دیر اُسے اُس ڈاکٹر کے پاس چھوڑ گیا جو اُس کا علاج کیا کرتا تھا۔ جب میں واپس آیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ یہ واقعی بالکل صحت مند ہے لیکن اس کی ایک بات مجھے بہت بُری لگتی ہے کہ یہ مجھے ناپسند کرتی ہے۔ یہ لڑکی اب متواتر دس سال سے پوری صحت میں ہے، وہ خود اپنی روزی کماتی ہے، وہ اب اپنے ہم جنسوں کے ساتھ بخوشی مل کر رہتی سہتی ہے اور کوئی شخص اُسے دیکھ کر یقین نہیں کر سکتا کہ یہ کبھی اس حد تک دیوانہ رہ چکی ہے۔"

سٹیکل نے ایک کامل تصنیف "اعصابی تشویش" کے معالجہ کے متعلق وقف کی ہے اور اس میں اُس نے اپنے ۱۲۵ مریضوں کا حال بیان کیا ہے۔ سٹیکل کا نظریہ یہ ہے کہ ہر قسم کی اعصابیت میں ایک نفسی کشمکش ہوتی ہے اور اس کے دُور کرنے سے مرض ہمیشہ دُور ہو سکتا ہے بخلاف فرائڈ کے جس کے نزدیک بعض قسم کی اعصابیت "اصلی" ہوتی ہے، جس کا سبب جسمانی ساخت میں مضمر ہوتا ہے۔ سٹیکل کہتا ہے کہ میں نے آج تک کسی قسم کے عصبی زدہ آدمی کو نہیں دیکھا جسے میں نے نفسی کشمکش کی تحلیل سے بھلا چنگا نہ کر دیا ہو۔ یہ کشمکش عموماً جنسی جذبے کے سرچشمے سے ظہور میں آتی ہے لیکن کئی حالتوں میں یہ اور قسم کی سُوءِ نیت یا دوسری وجوہ سے بھی وجُود میں آتی ہے۔ ہر ایسے حال میں نفس کی گنجلک کے دُور کرنے سے جسمانی عوارضات دُور ہو جاتے ہیں۔

سٹیکل کہتا ہے کہ ایک دفعہ ایک بیس سال کا وجیہہ تنومند جوان میرے پاس آیا۔ اُسے کُھلی جگہوں کا ہَول تھا۔ وہ بہت سے پانی اور بجلی کے علاج آزما چکا تھا لیکن کامیابی نہ ہوئی تھی۔ اُس کے ہول کی نوعیت یہ تھی کہ جہاں کہیں کوئی کھلی جگہ آتی وہ فوراً سر سے پاؤں تک کانپنے لگ جاتا اور لاکھ ترغیبوں پر بھی اکیلا وہاں سے نہ گزر سکتا، ہاں کسی اور شخص کی معیت میں اُسے مطلق یہ ڈر محسوس

نہ ہوتا۔ میں نے اُس سے مختلف قسم کے سوال کئے، اُس کی جنسی زندگی کے متعلق خوب جرح کی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا تم کو اپنے ماں باپ سے محبت ہے؟ (تجزیۂ نفس کا ایک مشتبہ مشہور نظریہ ہے کہ بچپن میں تین چار یا پانچ برس کی عمر میں لڑکا اپنی ماں سے شدید جنسی محبت کا احساس کرنے لگتا ہے اور لڑکی باپ سے۔ یہ وابستگی کچھ دیر قائم رہ کر مٹ جاتی ہے لیکن جس حالت میں یہ کسی نہ کسی طرح چھپ کر قائم رہے اُس حالت میں یہ عمر بھر کے لئے سیرت پر اپنے بُرے اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ پھر ایسے اشخاص دوسری جنس والوں سے بخوبی محبت نہیں کرسکتے وغیرہ وغیرہ۔ میکڈوگل نے اس "ایڈی پس عقدے" کے نظریے پر فرائڈ کو بہت ملامت کی ہے) مریض نے جواب دیا "ہاں ماں سے کچھ زیادہ"۔ میں نے کہا "کیا تمہارے ماں باپ غریب ہیں؟" اُس نے کہا "ہاں بہت۔ اُن کا گزارہ مجھی پر ہے"۔ "اچھا تو تمہارا پیشہ کیا ہے؟"۔ "میں ایک بڑے بنک کا خزانچی ہوں"۔ "کیا تمہارے ہاتھوں بہت سا روپیہ نکلتا ہے؟" "ہاں لاکھوں روپیہ ہر روز"۔ مجھے فوراً سُوجھی کہ اس کے دل کے اندر ہی اندر ایک خاص رقم لے بھاگنے کا خیال آتا رہا ہوگا۔ میں نے پوچھا "کیا تم کو کبھی خیال نہیں آیا کہ ادھر لاکھوں روپیہ ہر روز میرے ہاتھوں میں پانی کی طرح بہتا ہے اور اُدھر میرے غریب ماں باپ کا یہ بُرا حال ہے؟" اُس نے کہا "ہاں کئی بار"۔ میں نے کہا تو پھر یہ خیال تمہیں نہیں آیا کہ کچھ روپیہ لے کر بھاگ نکلوں تاکہ میرے ماں باپ کی رہی سہی عمر چین سے کٹے؟" یہ سُن کر اُس کا رنگ زرد ہوگیا۔ وہ ذرا سے توقف کے بعد بولا "ہاں خیال تو مجھے آیا تھا لیکن میں نے اسے فوراً دل میں دبا دیا"۔ میں نے کہا "ہاں بلاشبہ ہر شریف آدمی ایسا ہی کرتا ہے"۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے کہا کہ میری نصیحت تم کو یہی ہے کہ تم یہ کام چھوڑ دو اور کوئی اور کام اختیار کرلو جس میں اس طرح بددیانتی کا خیال نہ آتا ہے۔ اُس نے کہا اس کا چھوڑنا ناممکن ہے۔ اُس وقت میں اُسے ترغیب نہ دے سکا لیکن چھ ماہ کے بعد مجھے اُس کے عزیزوں کے ذریعے سے معلوم ہوگیا کہ اُس نے وہ ملازمت ترک کردی ہے اور اب وہ بالکل صحت یاب ہوگیا ہے۔ اس نیک دل آدمی کو جو کُھلی جگہوں کا ہَول تھا اُس کی وجہ یہ تھی کہ ہر کُھلی جگہ اُس کے لئے اُس کے غیر معلوم مستقبل کا ایک نشان اور اُس کے ارادے کا نمونہ تھا جہاں سے اُسے روپیہ چُرا کر اور روپوش ہوکر امریکا کی طرف بھاگ نکلنا تھا۔ سو جب کبھی کسی کُھلی جگہ کا سامنا ہوتا اُس کا مجرم ضمیر فوراً کانپنے لگ جاتا اور باوجود اپنی طاقت و تنومندی کے وہ ایسی حالت میں ایک بچے سے زیادہ بزدل بن جاتا۔ انسان کے نفسی مجادلے اُس کے بغیر جانے بوجھے اُس کی زندگی کی بنیاد کھوکھلی کردیتے ہیں ورنہ انسان بڑے سے بڑے خطروں اور بڑی سے بڑی مصیبتوں کے کامیاب مقابلے کے لئے پیدا ہُوا ہے۔ انسان کی نفسی صحت کو جتنی اہمیت بھی دی جائے کم ہے۔

سٹیکل ایک اور جگہ لکھتا ہے: "مسٹر اے وی میرے پاس آتا ہے اور مجھے بتاتا ہے کہ مجھے اپنڈے سائیٹس یعنی اندھی آنت کے درد (Appendicitis) کی شکایت ہے اور ڈاکٹر نے مجھے آپریشن کا مشورہ دیا ہے۔ اُسے پیٹ میں شدید درد کے دورے ہوتے ہیں۔ خصوصاً ذرا زیادہ کھا لینے کے بعد لیکن اُسے کبھی بخار کے ساتھ اندھی آنت کے درد کا دورہ نہیں ہُوا۔ اِس

پربھی ڈاکٹر آپریشن پر اصرار کرتا ہے۔ مریض اس قدر دُبلا ہے کہ سُوکھ کر کانٹا ہوگیا ہے۔ ڈر کے مارے وہ اتنا کم کھاتا ہے کہ گویا بھُوکوں مرتا ہے۔ اُسے دیکھ کر مجھے شُبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ دق کا مریض ہے۔ میں نے اُس سے اُس کی جنسی زندگی کے متعلق سوال کیا۔ تین سال سے اُسے ایک لڑکی سے سخت محبت ہوگئی ہے اور گو وہ اکثر ملتے ہیں اور وہ مختلف طرح اس کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا رہا ہے مگر لڑکی نے اُسے کسی قسم کے نامناسب تعلق پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ تم یا اس لڑکی سے تعلق چھوڑ دو یا اس سے شادی کر لو۔ اپنی اندرونی تکلیفوں کے لئے زیتون کے تیل کے تین چمچے ہر روز پیو اور رفع قبض کے لئے تیل سے انیما کر لیا کرو اور درد سے مطلق نہ ڈرو کہ یہ درد محض جنسی اجتناب اور شدید اشتہا کا نتیجہ ہے۔ تم اپنی معمولی خوراک کھاؤ، وہم نہ کیا کرو اور اگر واقعی اصلی "اندھی آنت کے درد" کا دورہ ہو بھی جائے تو بلاتکلف آپریشن کرا لو۔ آپریشن اس سے بہتر ہے کہ تم عمر بھر ڈر کے مارے ہر روز مرتے رہو۔ میری تشخیص اور مشورہ مریض کو پسند آیا۔ چنانچہ اُس نے میری نصیحت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اُس کا وزن ایک من چودہ سیر تھا۔ اس کے بعد تین ماہ میں وہ بقدر ۱۶ سیر کے بڑھ گیا۔ اُس نے جلد شادی کر لی اور اب تین سال سے وہ بالکل صحت مند ہے اور ایک تنومند جوان نظر آتا ہے اور اُس کا وزن ۲ من ، سیر ہو گیا ہے۔

اسی مصنف نے ایک نوجوان عورت کا قصہ لکھا ہے جو اپنے علیل شوہر کی تیمارداری کرنے کے بعد سخت بیمار ہوگئی۔ علاوہ اُن مضر اثرات کے جو جنسی تعلقات سے اجتناب کرنے اور شب بیداری کی تکالیف سہنے سے اُس پر ہوئے ہوں گے یہ دلدوز خیال اُس کے غیر شعوریہ نفس میں اُس کی جان کھائے جاتا تھا کہ "اگر تمہارا شوہر اب مر جائے تو تم مسٹر ڈبلیو سے شادی کر سکو گی جو تمہارے لئے زیادہ موزوں ہے۔" اس غیر شعوری خیال نے اظہار کا کیا ذریعہ ڈھونڈا! اس گناہ آلودہ خواہش کے ردِ عمل کے طور پر بیوی کے دل میں اپنے شوہر کی طرف انتہائی محبت کا جذبہ لہریں لینے لگا اور اُس کی تشویش میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ اگر شوہر کی حرارت ذرا سی بھی بڑھ جاتی تو فوراً ڈاکٹر کو ٹیلیفون کی جاتی کہ فوراً چلے آؤ حالت خطرناک ہے۔ ہر بار ایک نیا ڈاکٹر طلب کیا جاتا اور وہ کسی اور کو تیمارداری بھی نہ کرنے دیتی۔ وہ نہ اچھی طرح سوتی نہ کھاتی نہ آرام کرتی، غرض ہر طرح وہ ایک پُر ایثار تیماردار بنی رہی۔ ہماری بُرائیاں عموماً اسی طرح نیکیوں کا جھوٹا لباس پہن کر نمودار ہوتی ہیں اور بعض دفعہ ایک بڑا نیک کام ایک سخت بُرا کام بننے سے بال بال بچ جاتا ہے اس مریضہ سے بھی بے جانے بُوجھے ایک عجیب فعل ظہور میں آیا جس سے اُس کی چھپی دبی ہوئی خواہش صاف ظاہر ہوگئی۔ بجائے بیس قطروں کے اُس نے ایک رات اپنے بیمار شوہر کو "سورنیا" (افیون کے ست) کا پورے کا پورا جائے کا چمچہ پلا دیا جو ممکن ہے کہ مہلک ثابت ہو جاتا۔ اس پر وہ بہت سوئی چلّائی۔ اکثر نیک لوگ ایسا ہی کرتے ہیں لیکن تجزیۂ نفس اب ہم پر ان بھلے مانسوں کے اندرونِ قلب کی کیفیت صاف صاف واضح کر دیتا ہے۔ سچ پوچھو تو کوئی "نیک" زیادہ نیک اور کوئی "بُرا" زیادہ بُرا نہیں۔ کئی نیکوں کی بُرائیوں پر پردہ پڑا رہتا ہے لیکن دیکھنے والوں کے لئے یہ پردہ کبھی نہ کبھی ضرور اُٹھ جاتا ہے۔ اور کئی بُروں کی بُرائی کے صرف یہ معنی ہیں کہ ہمارے

اُنہیں دباتی ہے پیستی ہے اور جب وہ نہیں دبتے تو اُن کو اُن کی اس گستاخی کی "بُرا" اور "مردود" کہہ کر سزا دیتی ہے اور وہ پھٹکار دیئے جاتے ہیں۔

یہاں اور گنجائش نہیں ورنہ تجزیاتی علاج کا ایک ایک قصہ فطرت و تمدن کے تصادم کی ایک ایسی پُرلطف اور سبق آموز کہانی ہے جسے سن کر دُنیائے حاضرہ کی چلتی پھرتی تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ اس میں شُبہ نہیں کہ تجزیۂ نفس سے سینکڑوں ہزاروں اشخاص کی زندگیوں میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوگیا ہے اور اب یورپ و امریکہ میں اس کی عملی اہمیت کا ہر شخص قائل نظر آتا ہے۔ ہاں چند دُور اندیش مفکرین نے اس کی بعض انتہائی صُورتوں کے قبیح اثرات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ بدقسمتی سے بالخصوص مغرب میں بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر ہم اپنے فطری جذبات و شہوات کی باگ ڈور بالکل ڈھیلی چھوڑ دیں اور جو جی میں آئے کریں دل لگی کریں، بڑوں کی توہین کریں، اسراف کو اپنا معمول بنالیں۔ مذہب اور ہر قسم کے روحانی اعتقاد کا نام توہم پرستی رکھ دیں تو ہماری زندگی ضرور زیادہ پُرلطف اور مضبوط ہو جائے گی، صحیح قسم کا تجزیۂ نفس اس آزادی کے ہڑ کا سخت مخالف ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ہمیں یہ ضرور بتاتا ہے کہ اکثر حالتوں میں انسانی ناخوشی اور ذلت و خواری کے اسباب اِدھر افراد کی سُوءِ نیت، بزدلی اور وہم پرستی میں مرکوز ہیں اور اُدھر زیادہ تر سوسائٹی کی احمقانہ بندشوں میں مضمر۔ اِن کا انسداد ہمارا اوّلین فرض ہے۔

تجزیۂ نفس کا عملی اثر مغربی زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں طور پر ظاہر ہے۔ اوائل عمر کی تربیت نے اب پیشتر کی نسبت کچھ اور صورت اختیار کر لی ہے اور خانگی زندگی میں پہلے کی نسبت ہر بچے کو نہ صرف زیادہ آزادی حاصل ہے بلکہ والدین اُس کی ہر جزوی و غیر ضروری بات کی اہمیت کو سمجھ کر اُس کی صحیح رہنمائی کرتے ہیں۔ سکول کے معنی اب یہ نہیں رہے کہ لڑکا چند گھنٹوں کے لئے کتابوں، کاپیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہر لڑکے میں کس قسم کی صلاحیت اور کس قسم کے میلانات ہیں؛ اُس کے مطابق اُس کے تمام قوٰی کو کام میں لانے کی ترکیب عمل میں لائی جاتی ہے اور کوُدن سے کوُدن لڑکے کی بھی حوصلہ شکنی نہیں کی جاتی۔ قید خانوں کا مدعا تریاق النفس انسانوں کو سزا دینا نہیں رہا بلکہ اُن کی ذہنی کشمکش کا مطالعہ کر کے دوبارہ اُن کو دائرۂ معاشرت میں داخل کر لینا ہے۔ تربیت تعلیم، جرائم، اب اِن سب میں سزا کے تازیانہ کی بجائے آزادی و حوصلہ افزائی کا حربہ فطرت کی اصلاح اور اُس کے نشوونما کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ پُرانے اخلاق کا اصول تھا "اِلزام دھرنا"، نئے اخلاق کا اصول ہے "ہمدردی سے سمجھانا"۔ اُس سے لغزش کھانے والا دبا تھا اُس کی لغزش اُس کے دل میں کھٹکتی تھی، اِس سے گرنے والا اُبھرتا ہے اُٹھتا ہے چل نکلتا ہے، قدیم اخلاق دُور سے ڈراتا دھمکاتا تھا اور دبا دیتا تھا، جدید اخلاق سمجھ کر سمجھاتا اور پاس آکر دلاسا دیتا ہے جس سے اعتمادِ نفس پیدا ہو کر ایک شکستہ دل انسان کی رگوں میں بھی زندگی کا خون از سرِ نَو دوڑنے لگتا ہے!

اخیر میں یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اس وقت یورپ میں ماہرینِ تجزیہ کے تین مختلف مشہور گروہ ہیں۔ ایک کا سرکردہ اس علم تجزیہ

نفس کا بانی سابق فرائڈ ہے۔ دوسرے طرزِ خیال کا موجد ژُنگ ہے۔ اُس کا وضع کردہ نظام "تجزیاتی نفسیات" کہلاتا ہے۔ تیسرا رہنما آڈلر ہے۔ اُس کا طریقہ "انفرادی نفسیات" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ سب نفسِ غیر شعوریہ کی اہمیت اور بندش و احتباس کے مضر اثرات کے قائل ہیں، اور انسانی نفس کے تجزیہ کی سُودمندی پر زور دیتے ہیں لیکن ان کی تفصیلات اور دوسرے متعلقہ امور کے بارے میں ان میں شدید اختلافات ہیں۔ فرائڈ جنسیت کو تقریبًا سب اچھی بُری چیزوں کا منبع قرار دیتا ہے۔ ژُنگ کے فلسفے میں رُوحانیت اور مذہبیت کا عنصر بھی شامل ہے۔ آڈلر استقدار کی بنا پر تعاون کی عمارت کھڑی کرتا ہے۔ ژُنگ بعض حالتوں میں خواب کی پیشین گوئی کو مانتا ہے۔ فرائڈ اس سے انکار کرتا ہے۔ آڈلر نے "خبطِ برتری" اور "خبطِ کمتری" کی گتھی کو سلجھا کر دکھایا ہے کہ یہی وہ ذہنی امراض ہیں جن میں آج کل کے اکثر متکبر شیخی خور یا خلوت پسند متمدن لوگ مبتلا ہیں۔ ژُنگ آج کل کی بے کلی، بے اطمینانی اور نفسیاتی مظاہر کے متعلق اُس انتہائی عالمگیر دلچسپی سے جسے وہ زمانۂ حال کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھتا ہے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ دورِ حاضر کا انسان ایک روح کی تلاش میں سرگرداں ہے اور عجب نہیں کہ عنقریب وہ اپنے اس نصب العین کو پالے!

اِس مختصر مضمون میں ہم تجزیۂ نفس کے صرف بعض اہم پہلوؤں پر تبصرہ کر سکے ہیں، آئندہ کبھی ہم ان مختلف الخیال ماہرینِ تجزیہ کے دلچسپ نظریات پر یکے بعد دیگرے غور کریں گے اور اس کے بعد بعض اور مفکرین کے خیالات سے مستفید ہو کر دیکھیں گے کہ ہماری انفرادی و قومی زندگی پر ان جدید خیالات سے کیسی روشنی پڑتی ہے اور ہم کس نتیجے پر پہنچتے ہیں؛

بشیر احمد

تجزیاتی علاج	Psychotherapy	تجزیاتی نفسیات	Analytical psychology
تجزیہ کار	Analyst	انفرادی نفسیات	Individual psychology
اعصابی تشویش	Nervous Anxiety	استقدار	Will to power
کھلی جگہوں کا ہَول	Agoraphobia	خبطِ کمتری	Inferiority Complex
مدافعت	Resistance	خبطِ برتری	Superiority Complex
تحویل	Transference	عقدہ۔ گنجلکِ خبط	Complex
استحالہ	Dissolution	عقدۂ ایڈی پس	Oedipus Complex

غزل

عشق میں دُنیا نئی سی ہوگئی
زندگی آزردگی سی ہوگئی

کیا کہیں نظریں سلامت آپ کی
دردِ دل میں کچھ کمی سی ہوگئی

قہر ہے وہ مہربانی کی نظر
دوستی بھی دشمنی سی ہوگئی

لاش پر وہ مُسکراتے آگئے
کچھ مرے غم میں خوشی سی ہوگئی

ہم بھی جلوہ دیکھنے والوں میں تھے
کیا بتائیں بےخودی سی ہوگئی

کچھ نہ اظہارِ تمنّا سے مِلا
بات میری خامشی سی ہوگئی

ہوشِ غم بھی اب نہیں باقی شجیعؔ
یہ تو اک دیوانگی سی ہوگئی

شجیعؔ

اشتراکیت، جنگ اور فسطائیت

جنگ اب محض ممکنات میں سے نہیں رہی، کیونکہ استعماریت اب اُس نازک مرحلے پر پہنچ چکی ہے جہاں جنگ قطعاً ناگزیر ہو جاتی ہے، یقیناً جس طرح سورج کل مشرق سے طلوع ہوگا، بالکل اسی طرح یہ بھی وثوق سے کہا جا سکتا ہے، کہ عنقریب مستقبل میں ایک ہولناک عالمگیر جنگ چھڑنے والی ہے، اگر آپ کسی روزانہ اخبار کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ امر آپ پر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا، اگر آپ کراچی میں رہتے ہیں تو رائیٹر خبررساں ایجنسی نے یہ بات آپ کے کانوں تک پہنچا دی ہوگی کہ کراچی پر ہوائی بمباری کا کتنا خطرہ ہے؛ اور اسے کس طرح محض چند لمحوں میں بمباری کر کے خس و خاشاک کا ڈھیر بنایا جا سکتا ہے، اگر آپ کاروباری، تجارتی پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ کو شاید پتہ لگ گیا ہو کہ لائڈز انڈر رائیٹرز اور دیگر یوروپی اور امریکن کمپنیاں کس طرح دھڑا دھڑ جنگی بیمے کر رہی ہیں، یہ بیمے دراصل آنے والی جنگ کا ضروری پیش خیمہ ہیں، جو فوج میں ملازم ہیں اُنہیں ان احکام کا پتہ ہوگا جو ہر ملک میں ریزرو فورس (Reserve force) کو مل چکے ہیں، اور اگر آپ خدانخواستہ محض بےکار ہیں تو جس جنگ پر آپ اتنی اُمیدیں باندھے بیٹھے ہیں وہ اب جلد آیا چاہتی ہے، اور عین ممکن ہے کہ کسی زہریلی گیس کا ایک ہلکا سا جھونکا آپ کی اُمیدوں کے فانوس کو ایک دم گُل کر دے۔ بہرحال موضوع گو قدرے تلخ ہے مگر ازبس ضروری، اس لئے یہ بہتر ہوگا کہ ہم کم از کم آنے والی جنگ کے نتائج و عواقب سے بخوبی آگاہ ہو جائیں، آخر یہ جنگ کیوں لڑی جائے گی؛ کس لئے، کیونکر اور اِس کا حشر کیا ہوگا؛

اگر آپ اپنا جغرافیہ نہیں بھولے تو میں آپ کی توجہ چند لمحوں کے لئے یوروپ اور افریقہ کے نقشے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں، خاص کر بحیرۂ معتدلہ کی طرف جسے انگریزی زبان میں میڈیٹرینین سی کہتے ہیں اور جو سیاسی اصطلاح میں "انگریزی جوہڑ" یا انگریزی جھیل "The British Lake" کہلاتا ہے اور یہ ہے بھی ایک جوہڑ سا، چاروں طرف خشکی سے رُکا ہُوا، شمالی کنارے پر یعنی یوروپی کنارے پر شرقاً غرباً ترکی بحیرۂ اسود، یونان، اٹلی، فرانس اور سپین واقع ہیں، جنوبی کنارے پر یعنی افریقی ساحل پر شرقاً غرباً مصر، طرابلس، الجیریا، صحرائے اعظم، ٹیونس اور مراکو ہیں۔ اس جوہڑ سے باہر نکلنے کو دو راستے ہیں ایک تو ہے مغرب کا انتہائی نقطہ جبل الطارق اور دوسرا مشرق کی سمت انتہائی نقطہ جہاں نہر سویز واقع ہے، یہ دونوں مقام انگریزوں کی عملداری میں ہیں اور مشرقی سمت پر تو سویز کے علاوہ جزائر سائپرس اور مالٹا بھی انگریزی عسکریت سے مستحکم ہیں، نئے انگریزی مصری معاہدے کی رُو سے

بھی اسکندریہ میں انگریزی جنگی جہاز ٹھہر سکیں گے۔ بس یہ ہے انگریزی جھیل کا قدو دار بعہ، جسے آئندہ جنگ میں مرکزی اہمیت حاصل کرنی ہے، پچھلی جنگِ عظیم میں پہلے بلقانی بارودخانے کو آگ لگائی گئی تھی۔ اس دفعہ آگ پانی کو لگائی جائے گی اور جنگ کے شعلے بحیرۂ معتدلہ کے پانیوں سے اُٹھ کر دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

قدرتی طور پر یہ سوال آپ کے دل میں پیدا ہوگا، کیوں؛ آخر بحیرۂ معتدلہ کی مرکزی اہمیت کی کیا وجہ ہے؟ تو سنئے، اپنے جغرافیہ کو بند کیجئے اور اس مشہور ضرب المثل کو دُہرایئے کہ جنگ ہمیشہ زر، زن اور زمین کے لئے لڑی جاتی ہے، پہلے دو تو بہت حد تک متروک ہو چکے مگر موخرالذکر باقی ہے۔ یہ جنگ زمین کے لئے لڑی جائے گی یعنی نوآبادیوں کے لئے، اس وقت دُنیا میں جو ملک جنگی تیاریوں میں منہمک ہیں وہ ماسوائے روس استعماری نظام کے زیرِ تحت ہیں، استعماری نظام ملوکیت کی تخلیق کرتا ہے، اور ملوکیت صرف نوآبادیوں کے لئے پیدا ہوتی ہے، نوآبادیوں پر پھیلتی ہے، اور نوآبادیوں کے لئے ہی مرجاتی ہے، پچھلی جنگ بھی نوآبادیوں اور تجارتی خطوں کو حاصل کرنے کے لئے لڑی گئی تھی، گو بظاہر یہ جنگ آزادی، دائمی امن وصلح کے نام پر شروع کی گئی تھی، موجودہ جنگی تیاریوں میں بھی یہی اغراض پنہاں ہیں، گو بظاہر "جمہوریت خطرے میں" اور "یوروپی کلچر" کا رونا رویا جارہا ہے، مگر مچھ کے آنسو رونے کے اور، دکھانے کے اور۔

بہت سے کانٹے معاہدات ورسائے اور لوکارنو کے توسط سے بوئے گئے تھے وہ آج پھل لا رہے ہیں، ان معاہدوں نے استعماری اقوام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک تو وہ جنہیں جنگِ عظیم کے اختتام پر زرخیز نوآبادیاں اور وسیع تجارتی خطے ملے اور دوسرے وہ جنہیں حقیقتہً کچھ بھی حاصل نہ ہُوا، اول الذکر میں امریکا، فرانس اور برطانیہ اور آخرالذکر میں جاپان، اٹلی و جرمنی شامل ہیں۔ تفرقے کی خلیج گو شروع میں اتنی واضح نظر نہ آتی تھی، جتنی کہ اب ہے۔ رُوس کو جنگِ عظیم میں اتحادیوں سے کچھ مراعات نہیں ملیں، اُس نے اپنے نقصان کو اس طرح پورا کیا، کہ اپنے استعماری نظام کو یکسر بدل ڈالا اور اُس کی بجائے اشتراکیت کو ترویج دی، جو استعماری نوآبادیاں نہیں چاہتی۔

اسی طرح جاپان، جرمنی، اٹلی، ترکی نے ابھی جنگِ عظیم کے بعد اپنے سیاسی نظاموں کو بدل دیا ہے، انہوں نے فسطائیت اور آمریت کو اختیار کر لیا ہے۔ اور یہ وہ طاقتیں ہیں جنہیں جنگِ عظیم میں بزعمِ خود کچھ نہیں ملا، بخلاف اس کے برطانیہ اور فرانس جنہیں جنگِ عظیم کے بعد سب سے زیادہ نوآبادیاں اور تجارتی خطے ملے ابھی تک استعماری جمہوریت (Imperialist Demo-cracies) ہیں، اُنہوں نے اشتراکیت یا فسطائیت دونوں میں سے کسی کو ابھی تک اختیار نہیں کیا۔

فسطائیت، ملوکیت کی آخری شکل ہے، فسطائیت کے فلسفہ کو اکثر لوگ جوان و توانا سمجھتے ہیں، اُنہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ بجھتے ہوئے چراغ کا آخری بلند شعلہ ہے جو گل ہونے سے پہلے اٹھتا ہے اور پھر ایک دم بجھ جاتا ہے، اُس کے بعد کیا ہے؟ تاریکی اور

مسلسل تاریکی؛ ــــ یا پھر نیا تیل اور نیا شعلہ۔

یوروپی ملوکیت کی وہ طاقتیں جنہیں جنگِ عظیم کے بعد تجارتی مراعات اور نو آبادیاں نہیں ملیں اس وقت فسطائیت کے سیاسی نظام کو اختیار کر رہی ہیں، ذرا بحیرۂ متدلہ کے یوروپی کنارے پر نظر دوڑائیے، ترکی میں کمال اتاترک، یونان میں فاسی عسکریت، اطالیہ میں مسولینی، اور اب سپین میں جنرل فرانکو کے آمر بن جانے کے قوی امکانات ہیں، بظاہر اس وقت تک صرف فرانس بچا ہُوا ہے، ورنہ "انگریزی جھیل" کے چاروں طرف فسطائیت زور پکڑ رہی ہے، اور بحیرۂ متدلہ ہی سے یورپ سے تمام نو آبادیوں کو راستے جاتے ہیں، یہی بحیرۂ متدلہ کی مرکزی اہمیت کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

فسطائیت نو آبادیاں چاہتی ہے، ہٹلر نے Mein Kampf میں اس مسئلہ پر بہت زور دیا ہے۔ اور مسولینی کی "جنگِ حبش" اسی پیاس کو بجھانے کے لئے لڑی گئی تھی، لیکن یہ تو محض وقتی پالیسیاں ہیں، آخر نئی زمین کہاں سے آئے، اب اس کرۂ زمین پر کوئی نیا امریکہ نہیں جسے کوئی فسطائی کولمبس دریافت کر سکے ہر پھر کر اُس کی للچائی ہوئی نگاہیں اُن نو آبادیوں پر پڑتی ہیں جو استعماری جمہوریوں کے قبضہ میں ہیں، اُن تجارتی خطوں کی طرف دوڑتی ہیں جو امریکہ، روس، برطانیہ یا فرانس کے زیر اثر ہیں۔ ہٹلر چاہتا ہے کہ اگر اُسے افریقی نو آبادیاں واپس نہیں مل سکتیں تو کم از کم اُسے پولینڈ پر قبضہ کرنے کی کھلی چھٹی مل جائے، پھر اگر اس کے بدلے اُسے رُوسی یوکرین کا زرخیز علاقہ بھی حاصل ہو جائے تو جرمنی کی بڑھتی ہوئی آبادی اور پریشان کن کشاکش روزگار کا ایک فوری حل مل سکتا ہے۔ اور چونکہ نو آبادیوں کی کثیر تعداد پر غیر فسطائی حکومتوں کا قبضہ ہے اس لئے انہیں حاصل کرنے کے لئے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے، اسی لئے فسطائی آمر مثلاً ہٹلر یا مسولینی جنگ کے فلسفہ پر اتنا زور دیتے ہیں۔ یہ تو وہی پرانا استعماری فلسفہ ہے، وہی پرانی شراب نئی بوتلوں میں بند کی گئی ہے، وہی تلخ مزہ ہے، اقتصادی بدحالی، بے کاری، مقابلہ کی خرابیاں، بڑھتی ہوئی آبادی، تجارتی انفرادیت ان سب کے لئے اس کے پاس صرف ایک ردِّ عمل ہے: جنگ، جنگ۔ تاکہ نو آبادیاں مل سکیں۔ اور اگر نو آبادیاں نہ بھی مل سکیں تو بھی جنگ، کیونکہ نو آبادیاں نہ ملنے کی صُورت میں بھی جنگ سے اور کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں، بڑھتی ہوئی آبادی گھٹ جاتی ہے، قیمتیں بڑھ جاتی ہیں، اسلحہ جات کے کاروبار میں ترقی ہوتی ہے۔ جنگ سے ملحقہ ہر ایک تجارتی شعبے میں کام بڑھ جاتا ہے، بیکاری کم ہو جاتی ہے، دیکھا کیسی سہل ترکیب ہے، کتنا آسان فلسفہ ہے، ہر پندرہ بیس سال کے عرصے کے بعد جوانوں کی نئی پود کو خودکشی پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ فسطائی حکمت کے پاس معاشی بیماریوں کا اس کے سوائے اور کیا علاج ہے؛

خالص نفسیاتی نکتۂ نگاہ سے فسطائی فلسفہ خود غرضی، بے رحم انفرادیت کا علمبردار ہے، یہ انسان کے خالصتہً حیوانی جذبات کو اُبھارتا ہے۔ ترقی، آزادی، روشن خیالی اور ہر اُس جذبے کا سخت ترین دشمن ہے کہ جس پر حیاتِ انسانی کی سربلندیاں منتج ہیں۔ سیاسی نکتۂ نگاہ سے ہر ایک ملک کو دوسرے ملک کا غلام دیکھنے پر مجبور ہے۔ سماجی صورت میں یہ عورت پر مرد کی ابدی فوقیت

جتاتا ہے اور اُسے برقرار رکھنا چاہتا ہے، اقتصادی صُورت میں یہ اور بھی رجعت پسند ہے، یہ جماعتیں پیدا کرتا ہے اور انسان کو انسان کا دشمن بناتا ہے۔

جنگ کی ایک وجہ تو میں نے تفصیل سے بیان کردی ہے یعنی نوآبادیاں جو استعماری جمہوریوں اور فسطائی حکومتوں کے مابین بنائے نزاع ہیں، ——— جنگ کی ایک اور بھی وجہ ہوسکتی ہے، یعنی فسطائیت اشتراکیت کا تصادم!

فلابیر نے اپنے ایک مشہور افسانے کی ابتدا یوں کی ہے "ایک دن آسمان کے نیلے فرش پر دو ستارے بالمقابل آتے ہوئے یکایک ٹکرا گئے" ——— میرے خیال میں آنے والی جنگ کی ابتدا بھی دو ستاروں کے ٹکرانے ہی سے ہوگی، ایک تو ہے فسطائی ستارہ اور دوسرا ہے اشتراکی، اشتمالی، اجتماعی، کچھ کہہ لیجئے، مگر یاد رہے کہ مؤخر الذکر فسطائیت کا بالکل اُلٹ ہے۔

روس اشتراکی ہے، اور یورپ فاسی ہو رہا ہے، اور ممکن ہے کہ عنقریب ہی یہ دونوں بحیرۂ معتدلہ کے کنارے آپس میں ٹکرا جائیں۔

ابھی کل تک اشتراکیوں کا پلّہ بھاری تھا، سپین میں نیم اشتراکی حکومت، فرانس میں فرنٹ پاپولیئر "Front Populaire" روسی فرانسیسی معاہدہ، بلقانی ریاستوں کا روسی اشتراکیت سے اتحادِ عمل، کل تک یہ سب کچھ تھا، مگر آج صورتِ حال مختلف ہے، بلجیم لوکارنو پیکٹ سے علیحدگی اختیار کر چکا ہے، بلقانی ریاستوں نے روس سے بیزاری اور روسی فرانسیسی معاہدے سے علیحدگی کا اظہار کردیا ہے، اُدھر سپین میں جنرل فرانکو فسطائیوں کی شہ پر نیم اشتراکی حکومت کو کچل رہا ہے، مشرق بعید میں جاپان، روسی منگولیا اور سائبیریا پر حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے۔

مگر جیسا کہ ایک امریکن مصنف لکھتا ہے، برطانوی کامن ویلتھ "British Common wealth" کا محض وزن ہی اس قدر بھاری ہے کہ جس طرف وہ جُھک جائے، اُسی طرف سارا پلڑا جُھک جاتا ہے، لیکن انگریز پھر بھی خاموش ہے! کیا وہ جنگ چاہتا ہے؟ ہرگز نہیں! اُسے کیا میسّر نہیں، آدھی دُنیا کی بادشاہت، جہاں سُورج کبھی غروب نہیں ہوتا، دنیا کے سرسبز و شاداب و زرخیز ترین علاقے قیمتی کانوں اور جنگلوں کی فراوانی رکھنے والے خطّے، دولت، عزت، تجارت، اُسے سب کچھ نصیب ہے۔ اُسے جنگ میں یقیناً کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا ——— ہاں یہ اور بات ہے کہ فاسی ممالک اُس کی نوآبادیات پر دندانِ آز تیز کریں، اس صورت میں اُسے اپنی نوآبادیات کی حفاظت کیلئے جنگ میں کُودنا پڑے گا ——— وہ یقیناً سپین کے لئے جنگ کرنے کو تیار نہیں۔

اور فرانس! ——— وہ نئے اور پرانے انقلابوں کا علمبردار، مغربی تہذیب اور کلچر کا گہوارہ، وہ کیا سوچ رہا ہے، اُس کی خارجی پالیسی کیا ہے؟ ——— فرانس میں اس وقت فرنٹ پاپولیئر کی حکومت ہے، جسے در اصل سوشل ڈیموکریٹ (Social Democrates) پارٹی کی حکومت کہنا چاہئے۔ اس کے ترجمانِ اعلےٰ مسٹر بلم (Mr. Blum) ہیں، کچھ اس قسم کی پارٹی جرمنی

میں بھی فسطائی انقلاب سے پہلے نمودار ہوئی تھی، یہ سوشل ڈیموکریٹ بھی ایک گورکھ دھندہ ہیں، ان میں ریڑھ کی ہڈی بالکل نہیں ہوتی، اس لئے ان کی ہر پالیسی بے جان پھسپھسی اور غیر پسندیدہ ہوتی ہے۔ سیاسی طور پر "آدھا تیتر اور آدھا بٹیر" کی مثال ان پر صادق آتی ہے۔ کہنے کو تو یہ اشتراکی نظریوں میں یقین رکھتے ہیں، لیکن شعوری یا غیر شعوری طور پر فسطائی انقلاب کی جڑیں مضبوط کرتے ہیں۔ چنانچہ جرمنی میں یہی ہوا، اب فرانس میں بھی یہی ہو رہا ہے، برطانوی لیبر پارٹی بھی سوشل ڈیموکریٹ ہے۔

کچھ بھی ہو، بہر حال فرانس و برطانیہ دونوں حکومتوں کی خارجی پالیسی موجودہ وقت میں اُن کے اپنے اغراض و مقاصد کے لئے بھی خطرے سے خالی نہیں۔ سپین و مراقش میں فسطائی انقلاب کی تکمیل ہونے پر فرانسیسی افریقی نوآبادیاں یقیناً خطرے میں پڑجائیں گی۔ خاص کر ٹیونس کی نوآبادی کا کیا بنے گا؛ جس میں پہلے ہی سے ایک لاکھ تیس ہزار اطالوی آباد ہیں۔ خود فرانس بھی خطرے سے خالی نہیں! جرمنی، پرتگال، سپین، اٹلی تین طرف فسطائی حکومتوں سے گھرا ہوا، بلقانی ریاستوں، یوگوسلاویہ، آسٹریا کی ہمدردی کو کھو کر فرانس اکیلا یقیناً خطرے میں ہے، آج سے صدیوں پہلے فرانس کے مشہور وزیر ٹیلے رینڈ (Tallyrand) نے کیا خوب کہا تھا کہ "فرانس پر اگر حملہ کرنا ہو، تو پہلے اُسے باقی حکومتوں کی ہمدردی و اعانت کو کھو لینے دو، اور پھر ایک دم ہلہ بول دو" کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی؟

برطانیہ کی خارجی پالیسی بھی میرے خیال میں اُس کے امپیرل مفاد "Imperial interets" کے لئے کافی نہیں، سب سے پہلے وہ غلطی کی گئی جب اٹلی کو حبش پر غاصبانہ قبضہ جمانے دیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہر سویز، نیل کا منبع، مالٹا کا جزیرہ اور Red sea میں برطانوی اقتدار خطرے میں پڑ گیا، اور اس طرح بحیرۂ معتدلہ کے شرقی دروازے پر جہاں پہلے صرف برطانوی طاقت نظر آتی تھی وہاں اب اطالویوں نے بھی قدم جمانے شروع کر دیئے ہیں، اور اب تو مسولینی کے حوصلے یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ وہ بحیرۂ معتدلہ میں انگریزوں سے اپنے نئے حقوق منوانا چاہتا ہے اور برطانیہ کو دعوتِ عمل دے رہا ہے کہ وہ بحیرۂ معتدلہ کے سلسلے میں اطالویوں سے ایک نیا معاہدہ کر لیں۔

اور اب دوسری غلطی یہ کی گئی ہے کہ سپین کی نیم اشتراکی حکومت کو امداد پہنچانے سے انکار کر دیا ہے، سپین اور فرانس میں فسطائی انقلاب کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جبل الطارق کی انگریزی کنجی بھی نہر سویز کی طرح خطرے میں پڑ جائے گی، اور یہی دونوں دروازے برطانوی و فرانسیسی نوآبادیوں کی بحری شاہراہوں کے محافظ ہیں —— مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی برطانیہ کی موجودہ خارجی پالیسی سپین میں دخل دینے کے خلاف ہے۔ غالباً ایک تو عالمگیر جنگ چھڑ جانے کا خطرہ ہے جسے برطانیہ پسند نہیں کرتا، اور ٹوری پارٹی کے نزدیک یہ امر بھی پسندیدہ نہیں کہ سپین میں سوویٹ طرز کی حکومت کو استحکام ہو —— اسی تذبذب میں صورتِ حالات بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

آخری دلچسپ سوال یہ ہے کہ اس وقت فسطائیت اور اشتراکیت کے دو متضاد خیالات کی جو جنگ ہو رہی ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ بات تو یقیناً سب جانتے ہیں کہ یہ جنگ اب مہلک ترین ہتھیاروں سے لڑی جائے گی۔ زہریلی گیس اور بمبار ہوائی جہاز، موت کی شعاع اور ٹینک! لیکن نتیجہ کیا ہوگا؟ —— کیا انسانیت فنا ہو جائے گی؟ کیا تہذیب، کلچر، ادب، آرٹ سب نیست و نابود ہو جائیں گے؟ یا کہ اس جنگ کی تباہ کاریوں کے سائے میں ایک نئی انسانیت، ایک نئے اخلاق، ایک نئے ادب، ایک نئے آرٹ کی تخلیق کی جائے گی؟ جو ہمیں دائمی سکون، ابدی امن اور ایک لازوال حسن عطا کرے گی؟

مشہور انگریز مفکر ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "Shape of things to come" میں اس کا جواب یوں دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"انسانی عقاید ہمیشہ خیالات کی جنگوں پر منتج ہوتے ہیں، خیالات اور عقاید ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، انسانی مٹی میں ایک ایسی ازلی آگ کے شعلوں کی تڑپ ہے جو کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ انسان ترقی کرتا جائے گا، ایک منزل سے دوسری منزل تک، مگر اُسے سکون کبھی عطا نہیں ہوگا۔ انسان کا ستارۂ تقدیر ہمیشہ گردش میں رہتا ہے، وہ ایک جگہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی کا نام زندگی ہے۔"

اس کے بعد کچھ کہنے کی حاجت محسوس نہیں ہوتی۔

کرشن چندر ایم۔ اے

پر اوج پہ پہنچیں گے کہ گرد شیں
حاصل کریں نے نہم وحاصل بن دیا

زبانِ اُردو

ہوشیار! اُردو زباں کے پاسبانو ہوشیار!
تاک میں ہے خنجرِ اغیار کی مسموم دھار

لوگ بوسہ دیں عقیدت کا ہمارے ہات پر
تُل گئے ہیں چند غدارِ وطن اس بات پر

ہے اگر اخلاصِ خدمت کا یہی لیل و نہار
ہو کے رہ جائے گا آزادی کا دامن تار تار

اس تمہاری خود فراموشی کو جب پالیں گے وہ
صفحۂ ہستی سے اُردو کو مٹا ڈالیں گے وہ

کب تلک چھائی رہیگی موت کی سی خامشی
کب تلک سوتے رہو گے زندگی ہے زندگی

دم زدن میں سونے والوں کو کچل دیتے ہیں یاں
کشتیٔ عمرِ رواں کو اس طرح کھیتے ہیں یاں

گنگناتے، اینڈتے، گاتے، گرجتے، جھومتے
لیلیٔ اُردو کی تیکھی چتونوں کو چومتے ق

صُورتِ اسلاف چھا جاؤ دیارِ ہند پر
پرچمِ اُردو کو لہراؤ دیارِ ہند پر

اِس طرح دینا پڑے گا زندگانی کا ثبوت
جذبۂ ایثار سے مملو جوانی کا ثبوت

الطاف مشہدی

محبت کی ایک رات

اگرچہ ہے یہ کئی سال کی پُرانی بات — کبھی نہ بھولے گی اِک عشق کی سہانی رات

جھلک رہا تھا ستاروں کا عکس پانی پر — اندھیری رات کا رومان تھا جوانی پر

ندی کو شب کی خنک ظلمتوں نے گھیرا تھا — سحر کے نور کا روکش حسیں اندھیرا تھا

ہوا کی رَو میں محبت کے راگ پنہاں تھے — ندی کی لَے میں جوانی کے راگ رقصاں تھے

تری نگاہ میں حیرت بھی انفعال بھی تھا — سُرورِ نَو کی خوشی بھی تھی کچھ ملال بھی تھا

رُخِ ملیح پہ چمپا کی نرم رنگت تھی — جوانیوں میں نہائی ہوئی ملاحت تھی

جُھکے تھے میرے لبوں پر ترے گلابی ہونٹ — فشارِ بوسہ سے ناآشنا شرابی ہونٹ

نظر میں شوق کا جھینپا ہُوا تبسّم تھا — لبوں پہ راگ میں ڈوبا ہُوا ترنّم تھا

شگفتہ سانس میں دوشیزگی کی نکہت تھی — سرورِ لمس میں بھیگی ہوئی حرارت تھی

بسا ہُوا تھا بدن کامنی کے پھُولوں میں — چمک رہی تھی جبیں گیسوؤں کے جھُولوں میں

مئے شباب میں ڈوبی ہوئی نگاہیں تھیں
سکوتِ شوق تھا، انگڑائیاں تھیں آہیں تھیں

ذوقی

گوریلا کی متاہل زندگی

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے، گوریلا صوبجاتِ اوجاگا اور کیمرون کے حدود میں پایا جاتا ہے، یہ صوبے مغربی افریقہ کی حکومت بخیریا کے حصے ہیں۔ گوریلا سنگین کوہستانی ارتفاع پر بود و باش رکھتا ہے اور کبھی سطحاتِ مرتفع پر نہیں دیکھا گیا۔ ان کی صحیح تعداد ہنوز نامعلوم ہے، تاہم افریقی شکاریوں کے بقول تقریباً پینتالیس نر، ایک سو بیس مادین اور چند بچوں پر مشتمل ہے، دس میل عریض پینتالیس میل طویل رقبے میں یہ پھیلے ہوئے ہیں، اور ہمیشہ جماعت در جماعت چلتے پھرتے ہیں۔ اس خطے میں گوریلا کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل قسم خاکی گوریلا ہے، اور قسم دوم سیاہ گوریلا اور ہر دو اقسام باہم گر خلا ملا نہیں رکھتے۔ خاکی گوریلا جسامت کے اعتبار سے پانچ فٹ چھ انچ کا ہوتا ہے اور اس کی مادہ بھی قریب قریب اتنی ہی جسیم ہوتی ہے۔ نر اور مادہ دونوں خونخوار ہوتے ہیں اور دیکھتے ہی حملہ کر دیتے ہیں۔ نر اور مادہ دونوں کے سر، گردن اور چھاتی پر زیادہ گھنے بال نہیں ہوتے۔

سیاہ گوریلا قطعی سیاہ ہوتا ہے تاوقتیکہ وہ اپنی پوری نشو و نما نہ حاصل کر لے، کیونکہ کامل نشو و نما ہونے کے بعد اس کے سر کی رنگت قدرے تبدیل ہو کر فاختئی ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے گوریلا کی مادین دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو اسی کی جسامت کی ہوتی ہے، اور اپنے نر کے جنگجویانہ جذبے کا مسابقانہ مقابلہ کرتی ہے، اور دوسری قسم کی مادہ نر سے جسامت میں بقدر نصف ہوتی ہے، اور بہت ڈرپوک، چنانچہ جہاں کہیں ذرا سی جنگ اور کشمکش دیکھتی ہے، فی الفور اپنے بچوں کو لے کر اس مقام سے ہٹ جاتی ہے۔ سیاہ گوریلا ان ہر دو اقسام کی مادین کو اپنی زوجیت میں لے لیتا ہے، البتہ یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ ہر دو اقسام کی مادین سے جب اولاد ہوتی ہے تو خواہ وہ چھوٹی قسم کی مادہ ہی سے کیوں نہ ہو، نر ہو تو اپنی پوری جسامت کو پہنچ جاتا ہے اور ماں کی کوتاہ جسامت کا مطلق اثر نہیں لیتا۔ سیاہ گوریلا جب انتہائی ضعف اور سن رسیدگی کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے تمام بال جھڑ جاتے ہیں، اور اس کی کھال خاکستری ہو جاتی ہے جسے ہاتھی کی کھال سے بخوبی تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

گوریلا دن میں دو مرتبہ کھاتا ہے، علے الصباح اور سہ پہر کو، اس کی خاص غذا جنگلی درختوں کے پھلوں اور قندوں پر مشتمل ہوتی ہے، آج کل وہاں کے باشندوں کی خاص غذا کیلا ہے، لیکن گوریلا کی ایک جماعت ایک ایکڑ سے ڈیڑھ ایکڑ تک کے رقبے میں لگے ہوئے کیلے کے درختوں کو صرف ایک مرتبہ کی غذا میں تمام کر ڈالتی ہے۔ کیلے کے درخت کے پتوں اور پھل کو تو وہ ہاتھ بھی نہیں لگاتے، صرف درخت اکھاڑ لیتے ہیں، اور تنے کی چھال چھیل کر نرم نرم گودا بصد ذوق و شوق تناول کر لیتے ہیں۔

گوریلا دوپہر کی سخت تمازت اور طپش میں آرام کرتا ہے، اور سہ پہر کو غذا حاصل کرنے کے بعد پانچ بجے شام کے قریب رات بسر کرنے کے لئے بستر تیار کرتا ہے۔ مادہ کے لئے بستر اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ کسی مضبوط اور گھنے درخت کی لمبی لمبی شاخوں کو جھکا کر ایک دوسرے سے جکڑ دیتے ہیں اور جب خاصی سطح تیار ہو جاتی ہے تو اس پر نرم نرم گھاس اور پتیاں بچھا دیتے ہیں۔ مادہ اس پر آرام بھی کرتی ہے اور اپنے نر کی نگہبانی کے فرائض بھی انجام دیتی ہے جو فرش خاک پر بستر بچھا کر مصروف خواب ہوتا ہے۔ اس کا بستر بھی لکڑیوں اور نازک پتیوں سے تیار ہوتا ہے۔ نر اور مادہ ہر دو ایک ہی طرز پر اپنے دونوں بازوؤں کو ایک پر ایک بطور تکیہ رکھ کر اس پر اپنا سر رکھ کر لیٹتے ہیں۔

علے الصباح بستر سے اُٹھ کر نر اور مادہ ایک جماعت بنا لیتے ہیں اور ایک کے پیچھے ایک لمبی قطار میں اپنے کھانے کی جگہ کی تلاش میں روانہ ہوتے ہیں، مادہ پیچھے ہوتی ہیں اور نر آگے، وہ ہمیشہ چار پاؤں سے چلتے ہیں اور بڑی سُرعت سے چلتے ہیں چنانچہ گھنے جنگلوں میں ان کی رفتار کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ گو شکاری کہتے ہیں کہ ہموار اور صاف جگہ گوریلا کو رفتار اور دوڑ میں ہرایا جاسکتا ہے۔

گوریلا علی العموم پچھلے پیروں پر کھڑا ہو کر حملہ آور ہوتا ہے۔ لیکن نہ تو یہ جھپٹتا ہے نہ اچھلتا ہے، بلکہ اپنے پچھلے پاؤں پر کھڑے کھڑے متحرک ہو کر دشمن پر حملہ کرتا ہے۔

گوریلا کی متاہل زندگی پر اب تک تفصیلی روشنی نہیں ڈالی جاسکی ہے، نر اپنی بیوی یا بیویوں کے ساتھ صرف دن میں ہم خلوت ہوتا ہے رات میں ہرگز جنسی مصروفیات سے متمتع نہیں ہوتا۔ ایام حمل کی میعاد بارہ ماہ کی یقین کی جاتی ہے۔ حاملہ صرف ایک بچہ دیتی ہے، جسے وہ ہمیشہ اپنی پشت پر لئے رہتی ہے تاوقتیکہ مدتِ رضاعت ختم نہ ہو جائے۔ یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ مادہ شاید وضع حمل کے فوراً بعد ہی اپنے نر سے جنسی عمل میں مصروف ہو جاتی ہے، کیونکہ اکثر شیر خوار بچوں والی مادیں ماری گئی ہیں اور دیکھا گیا ہے کہ وہ از سرِ نو حاملہ ہیں۔

گوریلا میں اگرچہ کوئی غیر معمولی ذہانت نہیں دیکھی گئی۔ شکاری بیان کرتے ہیں کہ جب گوریلا کی جانب بندوق چھتیائی جاتی ہے تو وہ غالباً اسے خطرناک آلہ قتل تصور کر کے اسی کی طرف ملتفت ہوتا ہے لیکن اپنی حفاظت کی خاطر جب شکاری بندوق پٹک کر درختوں پر پناہ لینی چاہتا ہے تو گوریلا کی بندوق سے دلچسپی زائل ہو جاتی ہے اور وہ شکاری کی طرف رجوع کرتا ہے، اور بندوق کو مس تک نہیں کرتا۔ شکاری جب اس کی دسترس سے باہر ہوتا ہے اور اس کا کچھ بس نہیں چلتا تو گوریلا بہانہ کر کے وہاں سے ہٹ آتا ہے اور تاک میں رہتا ہے کہ شکاری نیچے اُترے اور وہ آ دبوچے۔ زخمی گوریلا اکثر پُرپیچ راستوں سے آگے بڑھ کر جا بیٹھتا ہے اور شکاری کی واپسی کا منتظر رہتا ہے۔ لڑائی میں وہ اپنے ناخن اور دانت کا بہت استعمال کرتا ہے اور اکثر افریقی شکاری نوچنے اور کاٹنے کے نشانات دکھاتے ہیں جو اپنے حریف کی جست سے پہلے بخوبی درخت پر نہ چڑھ سکے تھے۔ گوریلا ہمیشہ دیکھتے ہی حملہ کر دیتا ہے لیکن اگر اس کی اہلیہ حاملہ ہو۔ تو پھر وہ خود دشمنوں کو تلاش کر کے ہلاک کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اپنا دشمن دیکھتے

ہی وہ فی الفور انتہائی مشتعل ہوجاتا ہے، اور مختصر چنگھاڑیں مارتا ہے۔

شکار بافراط ملنے کے باعث اس خطے میں ہر کس وناکس شکاری ہے، لیکن تمام آبادیوں کے شکاری ہونے کے باوجود صرف سات افریقیوں نے گوریلا کو ہلاک کیا ہے، افریقی طبائع کے لئے گوریلا بہت زبردست ہوا ہے، اور خود وہ شکاری جو کبھی پہلے گوریلا کا تعاقب کر چکے ہیں، کمال صاف دلی سے اپنے خوف وہراس کا اعتراف کرتے ہیں جو گوریلا کے مدمقابل ہونے پر انہیں لاحق ہوا تھا۔

جب کاشتکار اپنے کیلوں کی فصل کو گوریلا کے ہاتھوں تاراج دیکھتے ہیں تو وہ شکاری کو خبر دیتے ہیں، شکاری اپنی دقیانوسی توڑے دار یا ٹوپی دار بندوق اور تبر لے کر آموجود ہوتے ہیں اور گوریلا کی تلاش کرتے ہیں، کیونکہ انہیں اُمید ہوتی ہے کہ دوپہر کے آرام کی حالت میں یا سہ پہر کے کھانے کے وقت ان سے سابقہ پڑ جائے گا لیکن شکاری کو انتہائی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ جنگل کی نباتات کی ذرا سی جنبش گوریلا کو چوکنا کر دیتی ہے۔ گوریلا کی جماعت نظر آتے ہی شکاری کسی ایسے درخت کی آڑ لے کر ایک آدھ گوریلا پر فیر کرتا ہے، جس پر وہ بڑی جلدی چڑھ سکے، چنانچہ وہ فیر کرتا ہے، ایک دم بندوق زمین پر پھینک کر درخت پر چڑھ جاتا ہے، اپنا زبردست تبر اپنے ہمراہ لئے رہتا ہے تاکہ جو گوریلا درخت پر آئے اُسے تبر سے ہلاک کر سکے۔

اگر اس کا شکار بڑی قسم کا نر یا مادہ ہے تو شکاری کو درخت پر گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر چھوٹی قسم کی مادہ کو اس نے ہلاک کیا ہے تو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا، کیونکہ شوہر اپنی متوفیہ کی لاش کو بآسانی پشت پر لاد کر ایک دم ڈیڑھ دو میل تک دوڑ سکتا ہے، اور اتنی دُور جا کر جب اسے یقین ہوجاتا ہے کہ وہ مرگئی ہے تو پھر پھینک کر روانہ ہوجاتا ہے۔

ایک جانباز شکاری کا واقعہ ناقابلِ فراموشی ہے، اور اس کی شجاعت کی یاد مدتوں تازہ رہے گی جس نے ۱۹۰۴ء - ۱۹۱۴ء کے مابین ایک وقت گوریلا کا شکار کرنے کی جسارت کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بسبب بغاوت بندوقیں ضبط کر لی گئی تھیں۔ وہ صرف ایک تبر اور ایک جال سے مسلح تھا، اس نے جال گوریلا پر اس حالت میں پھینکا جب کہ وہ کھا رہا تھا، بندر کی دو مادیں تھیں جو شور سنتے ہی آموجود ہوئیں اور دونوں نے اس بیچارے شکاری کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ اس کا طریقِ شکار کبھی دوبارہ استعمال نہیں کیا گیا۔

افریقی کاشتکاروں کی فصلوں کو جو نقصان پہنچتا رہتا ہے۔ اور اس جانور کے حملہ آور ہونے کا جو طبعی خوف ہر شخص پر مستولی رہتا ہے اس کے بالمقابل ۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۳ء کے درمیان صرف اٹھتر گوریلاؤں کا ہلاک کیا جانا کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

لیکن اب شکار کے قوانین کی رو سے گوریلا کی نسل کی حفاظت ہو رہی ہے اور اس کا مارنا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور گو افریقیوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ گورنمنٹ ان کے جدی مخالف اور دشمن کی پرورش کر رہی ہے تاہم وہ قانون کی پوری متابعت کر رہے ہیں۔

حسن عزیز جاوید

نالۂ نیم شب

کیا حال سناؤں میں
اے شاہدِ رعنائی
کیا تجھ کو بتاؤں میں
اے پیکرِ زیبائی
دُنیا کا ستایا ہُوں قسمت کا رُلایا ہُوں
در پر ترے آیا ہُوں کچھ حسرتیں لایا ہُوں
اِس دُکھ کی دوا کر دے
اے شاہدِ رعنائی
ہاں زخمِ جگر بھر دے
اے پیکرِ زیبائی
مایوسِ تمنا ہُوں جذبات کی دُنیا ہُوں
بے تان کا نغمہ ہُوں پھوٹا سا نصیبا ہُوں
تقدیر کو روتا ہُوں
اے شاہدِ رعنائی
جی اپنا میں کھوتا ہُوں
اے پیکرِ زیبائی
دُنیا کی میں نفرت ہُوں محرومِ مسرت ہُوں
ناکامِ محبت ہُوں وابستۂ وحشت ہُوں
دن رات تڑپتا ہُوں
اے شاہدِ رعنائی
رہ رہ کے مچلتا ہُوں
اے پیکرِ زیبائی
بستی سے مجھے وحشت صحرا سے مجھے رغبت
ہستی سے مجھے نفرت مرنے کی مجھے حسرت
بہتر ہے کہ مرجاؤں
اے شاہدِ رعنائی
اور جی سے گزر جاؤں
اے پیکرِ زیبائی
او حُسن کے متوالے بس ختم ہوئے نالے
اب جان کے ہیں لالے کچھ بس ہو تو بچوا لے
بچنے کا نہیں یاور
اے شاہدِ رعنائی
رہنے کا نہیں یاور
اے پیکرِ زیبائی

حجاب اسمٰعیل

طیورِ آوارہ

مَیں تجھ سے اپنے گھر میں آنے کو تو نہیں کہتا اے میرے پیارے! تُو میری غیر محدود تنہائی میں آ۔

موت زندگی سے ویسا ہی تعلق رکھتی ہے جیسے پیدائش۔ رفتار نام ہے قدم کے اُٹھنے اور زمین پر پڑنے کا۔

میں نے تیری سرگوشیوں کے سادہ مفہوم کو روشنی اور پھولوں میں پالیا ہے۔ مجھے توفیق دے کہ میں تیرے الفاظ درد و موت میں سمجھ سکوں۔

رات کے پھول کو کھِلے ہوئے دیر ہو چکی تھی جب صبح نے اُسے بوسہ دیا، وہ کانپ اُٹھا اور اِک آہ کر کے زمین پر گر پڑا۔

تمام اشیاء کی اُداسی میں مادرِ ازل کو گنگناتے ہوئے سنتا ہوں۔

اے میری زمین! میں تیرے ساحل پر اک اجنبی کی طرح آیا، میں تیرے گھر میں اک مہمان ہو کے رہا اور اب تیرے دروازے سے میں دوست بن کر رخصت ہوتا ہوں۔

جب میں چلا جاؤں تو میری یاد تیرے دل میں اس طرح جاگزیں ہو جیسے غروبِ آفتاب کے بعد تاروں کی خاموشی کے کنارے جھولتی ہوئی شفق۔

میرے دل میں سکون و اطمینان کا ستارۂ شام روشن کر اور پھر رات کو چپکے چپکے مجھ سے محبت کی باتیں کرنے دے۔

مَیں ایک بچہ ہوں اندھیرے میں پڑا ہوا۔ مَیں رات کی چادر میں اپنی باہیں تیری طرف پھیلاتا ہوں اے ماں!

کام کاج کا دن ہو چکا ہے۔ اے ماں! میرے چہرے کو اپنی باہوں میں چھپا لے اور مجھے خواب دیکھنے دے۔

میل جول کا چراغ دیر تک جلتا رہتا ہے لیکن جدائی کے وقت وہ ایک لمحے میں گُل ہو جاتا ہے۔

اے دُنیا! جب مَیں مر چکوں تو تُو میرے لئے اس ایک لفظ کو اپنی خاموشی میں رکھ لیجیو کہ "میں نے محبت کی ہے"۔

ہم اِس دُنیا میں اُس وقت رہتے ہیں جب کہ ہم اِس سے پیار کریں۔

مرجانے والے شہرت کی بقائے دوام رکھیں لیکن وہ لوگ جو جی رہے ہیں اُن کا حصّہ تو صرف بقائے محبت ہے۔

مَیں نے تجھ کو اس طرح دیکھا ہے جیسے ایک نیم بیدار بچہ آغازِ سحر کے دھندلکے میں اپنی ماں کو دیکھتا ہے اور پھر مُسکرا کر میٹھی نیند سو جاتا ہے۔

میں بار بار فنا ہو کر یہ جان لُوں گا کہ زندگی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

جب کہ مَیں ہجوم کے ساتھ رستے پر سے گزر رہا تھا تو میں نے شہ نشین پر تیرے تبسّم کو دیکھ پایا اور نغمہ زن ہو کر ساری شورش کو بھول گیا۔

ایک لبریز جام کی طرح محبت زندگی ہے معمور و مکمل۔

وہ اپنی ہی شمعیں جلاتے ہیں اور اپنے ہی الفاظ اپنے عبادت کدوں میں گاتے ہیں۔ لیکن پرندے تیرے ہی نُورِ سحر میں تیرا نام گاتے ہیں کیونکہ تیرا نام انبساط ہے۔

مجھے اپنی خاموشی کے مرکز پر لے چل اور میرے دل کو نغموں سے لبریز کر دے۔

اُن کو جو اپنی آتش بازی کی پُرشور دُنیا میں رہنے کے تمنائی ہوں وہیں رہنے دے۔ اے میرے خدا میرا دل تو تیرے ستاروں کے لئے بے قرار ہے۔

محبت کے درد نے میری زندگی کے گرد بے تھاہ سمندر کی طرح اپنا گیت گایا اور محبت کی مسرت اُس کے پھُولتے ہوئے گلزاروں میں چڑیوں کی طرح نغمہ زن ہوئی۔

جب تیرے جی میں آئے چراغ گُل کر دے۔ میں تیری تاریکی کو جان لوُں گا اور اُسی کو پیار کرُوں گا۔

جب دن کے اختتام پر میں تیرے حضور کھڑا ہو جاؤں گا تو تُو میرے نشانوں کو دیکھے گا اور جان لے گا کہ مَیں نے زخم بھی کھائے اور میں صحت یاب بھی ہو گیا۔

ایک روز کسی اور دُنیا کے طلوعِ آفتاب میں مَیں تیرے سامنے یہ گیت گاؤں گا کہ "میں اس سے پہلے زمین کی روشنی میں انسان کی محبت کے اندر تجھے دیکھ چکا ہوں۔"

گزرے دنوں کے بادل میری زندگی میں تیرتے ہوئے آتے ہیں لیکن مینہ برسانے یا طوفان بپا کرنے کو نہیں بلکہ میرے شام کے آسمان کو نت نئی رنگینیوں سے آراستہ کرنے کے لئے۔

راستی اپنی مخالفت میں وہ طوفان بپا کر دیتی ہے جو پھر دُنیا بھر میں اُس کی تخم ریزی کرتا ہے۔

گزری ہوئی رات کے طوفان نے صبح کو سنہری امن کا تاج پہنا دیا ہے۔

حق اپنے آخری لفظ کے ساتھ آتا معلوم ہوتا ہے لیکن اس آخری لفظ سے ایک اور لفظ پیدا ہو جاتا ہے۔

خوش قسمت ہے وہ شخص جس کی شہرت حقیقت سے زیادہ روشن نہیں ہوتی۔

جب میں اپنا نام بھول جاتا ہوں تو تیرے نام کی شیرینی میرے دل کو اس طرح لبریز کر دیتی ہے جیسے تیرا آفتابِ صبح وادیوں کو جب کہ کُہر تحلیل ہونے لگے۔

خاموش رات ماں کی خوبصورتی رکھتی ہے اور پُرشورش دن بچے کا حُسن۔

جب انسان مسکرایا تو دُنیا نے اُس کو پیار کیا لیکن جب وہ ہنس پڑا تو دُنیا اُس سے سہم گئی۔

خدا منتظر ہے کہ انسان عقل سے کام لے کر پھر اپنے بچپن کو پالے۔

مجھے محسوس کرنے دے کہ یہ دُنیا تیری محبت ہے جس نے ایک صُورت اختیار کر لی ہے، پھر میری محبت اُس کی مدد کرے گی۔

تیری ضیا، آفتاب میرے دل کے ایامِ خزاں پر مسکراتی ہے اور کامل یقین رکھتی ہے کہ اس میں پھر بہار کے پھُول شگفتہ ہوں گے۔

خدا اپنی محبت میں "محدود" کو بوسہ دیتا ہے انسان "غیر محدود" کو۔

تُو ویران زندگی کے صحرا کو عبور کر رہا ہے اس لئے کہ ایفاءِ عہد کے لمحہ تک پہنچ جائے۔

خدا کی خاموشی انسان کے خیالات کو گویائی کا درجہ بخشتی ہے۔

اے سافرِ ازل تُو اپنے قدموں کے نشان میری راگنیوں میں پائے گا۔

اے باپ! جس کی شان اپنے بچوں میں رُونما ہوتی ہے تُو مجھے توفیق دے کہ مَیں تجھے شرمسار نہ کروں۔

دن مغموم ہے۔ چیں بہ جبیں بادلوں کے نیچے روشنی ایک ایسے مار کھائے ہوئے بچے کے مانند معلوم ہوتی ہے جس کے زرد رخساروں پر ابھی آنسوؤں کے نشان باقی ہوں اور ہوا کا شور گویا ایک زخمی دُنیا کی چیخ پکار ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ میں اپنے دوست سے مِل رہنے کی غرض سے یہ سفر کر رہا ہوں۔

آج رات کھجوروں کے پتوں میں ایک سرسراہٹ ہے اور سمندر میں کچھ ہلچل جیسے دُنیا کے دل کی دھڑکن! اے چودھویں کے چاند! تُو کس نامعلوم آسمان سے محبت کا یہ درد آفریں راز اپنی خاموشی میں لے کر آیا ہے؛

میں ایک ستارے کا خواب دیکھتا ہوں جو روشنی کا اک جزیرہ ہے، جہاں مَیں پیدا ہوں گا اور جس کی حیات بخش فرصت کی گہرائی میں میری زندگی اپنی آرزوؤں کی اس طرح تکمیل کرلے گی جیسے چاول کا کھیت خزاں کی دھوپ میں پختہ ہو جاتا ہے۔

پُرنم زمین کی خوشبو بارش میں اس طرح اُٹھتی ہے جیسے ناقابلِ شمار ہستیوں کے بے زبان گروہ سے ستائش کے نغمے۔

ہم اس بات کو تسلیم نہ کریں گے کہ محبت کبھی خسارہ اُٹھا سکتی ہے۔

ہم ایک روز جان لیں گے کہ موت کبھی ہم سے وہ چیز نہیں چھین سکتی جسے ہماری روح حاصل کر چکی ہے۔ کیونکہ روح کے اکتسابات بھی رُوح کا ایک جزو ہیں ۔

خدا شام کے دھندلکے میں میری عمرِ رفتہ کے پھُولوں کو جو ابھی اُس کی خوشنما ٹوکری میں شگفتہ ہیں لئے ہوئے میرے پاس آتا ہے۔

اے میرے آقا! جب میرے سازِ حیات کے سب تار درست ہو چکیں گے تو پھر تیرے ہر مَس پر اُس سے محبت کی موسیقی پیدا ہو گی۔

اے میرے مالک! مجھے توفیق دے راستی پر زندہ رہنے کی تا کہ موت بھی میرے لئے راست ہو جائے۔

انسان کی تاریخ ناکام آدمی کی فتح یابی کے لئے صبر کے ساتھ انتظار کر رہی ہے۔

اس وقت میں اپنے دل کے اوپر تیری نظریں اس طرح محسوس کرتا ہوں جیسے صبح کی روشن خاموشی کسی اکیلے سے کٹے ہوئے کھیت پر۔

مَیں رنگینیوں کے اُس جزیرے کے لئے بیتاب ہو رہا ہوں جو ہنگاموں کے اس پُرجوش سمندر کے پار واقع ہے۔

رات کا تمہیدی راگ غروبِ آفتاب کی موسیقی میں شروع ہوتا ہے جو ناقابلِ اظہار تاریکی کی پرستش کا ایک شیریں نغمہ ہے۔

مَیں چوٹی پر پہنچ چکا ہوں اور میں نے شہرت کی خشک و ویران بلندی پر کوئی جائے پناہ نہیں پائی۔ اے میرے رہبر! تو شام ہونے سے پہلے پہلے مجھے اُس خاموش وادی میں لے چل جہاں زندگی کی کھیتی فہم و دانش کا سنہرا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

دُھندلکے کی ہلکی تاریکی میں چیزیں بھوت پریت کی شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔ میناروں کی نچلی منزل تاریکی میں گم ہے اور درختوں کی چوٹیاں سیاہی کے دھبے نظر آتی ہیں۔ مَیں صبح کا انتظار کروں گا اور بیدار ہو کر تیرے شہر کو روشنی میں دیکھوں گا۔

میں صدمے اُٹھا اُٹھا کر، مایوس ہو ہو کر موت سے آشنا ہو چکا ہوں اور خوش ہوں کہ مَیں اس پُرعظمت دُنیا میں موجود ہوں۔

میری زندگی کے بعض حصے خالی اور خاموش ہیں۔ وہ کُھلے ہوئے میدان ہیں جہاں میرے مصروف دن روشنی اور ہوا سے لطف اُٹھاتے رہے۔

مجھے میرے ماضی سے جس کے حقوق مجھ سے ادا نہیں ہو سکے، رہائی دے کہ وہ پیچھے سے میرا دامن پکڑے ہوئے موت کو میرے لئے دشوار بنا رہا ہے۔

بس میرا آخری لفظ یہی ہو کہ مجھے تیری محبت پر پورا اعتماد ہے۔

(ترجمہ از ٹیگور) بشیر احمد

شاعر کا خطاب

اپنے بیٹے مُبارک بن علی سے

دل تیرا بڑھائے گی جب طاقتِ جسمانی
خود اپنی ہی جرأت پہ ہو گی تجھے حیرانی
ہو گا تری ٹھوکر سے پتھر کا جگر پانی
جب تک نہ اجل آئے کر اس کی نگہبانی

ہے ورزشِ جسمانی راز اس کی حفاظت کا
ہو جائے گا ورزش سے شُہرہ تری طاقت کا
موقع نہ ملے گا پھر غیروں کو شرارت کا
ہو نگے وہ خجل تجھ سے جو ظُلم کے ہیں بانی

گو بحرِ شجاعت کا تُو بیش بہا دُر ہے
لیکن ترا دشمن بھی فی الحال بہادُر ہے
دشمن کو بھگانے کا بس ایک یہی گُر ہے
رہ دُور گناہوں سے کر ورزشِ جسمانی

گر تجھ کو جوانی میں تقوے کا سہارا ہو
یہ ورزشِ جسمانی سونے پہ سُہاگا ہو
ظاہر تری پیری میں تیرا نہ بڑھاپا ہو
رُخ تیرا جوانی کی دکھلائے درخشانی

قایم یہی رکھے گی یونہی تری صحت کو
ہونے ہی نہ دے گی یہ افسردہ طبیعت کو
ہر وقت اُبھارے گی ورزش تری ہمت کو
آئے گی نظر اس سے مشکل میں بھی آسانی

پھُرتی کے دکھانے کا آجائے گا جب موقع
خوش ہو کے کہے گا تُو آیا ہے عجب موقع
بولیں گے عدو چھُپ کر رونے کا ہے اب موقع
ہر حال میں جاری رکھ تُو ورزشِ جسمانی

علی منظور حیدرآبادی

ایک امیرزادے سے

میری عسرت سے نہ کھینچ میری غریبی سے نہ ڈر
اپنی خودداری کو کب نیچا دکھا سکتا ہوں میں

دل سے لب تک آ نہیں سکتی مری کوئی اُمید
اپنے بل بوتے پہ کوہِ غم اُٹھا سکتا ہوں میں

جامۂ الفاظ سے بیزار ہے میرا سوال
آن پر شانِ دو عالم کو لُٹا سکتا ہوں میں

آ نہیں سکتی مرے لہجے میں حسرت کی رمق
نالۂ شبگیر کو نغمہ بنا سکتا ہوں میں

میرے ہر ذرّے میں ہیں کون و مکاں کی وسعتیں
اپنے ہر قطرے سے اک طوفاں اُٹھا سکتا ہوں میں

داستانِ غم کو دے سکتا ہوں عنوانِ نشاط
موت پر مُہرِ حیاتِ نو لگا سکتا ہوں میں

کھل نہیں سکتی مرے ایمان میں فاقوں سے درز
ضعف پر رنگِ توانائی چڑھا سکتا ہوں میں

میری آنکھیں میرے دل کا راز کہہ سکتیں نہیں
خارِ پیشانی سے سو سو گل کھلا سکتا ہوں میں

ہے مری پرواز زہریلی ہواؤں میں مگر
گردشِ افلاک کا خاکا اُڑا سکتا ہوں میں

میری ناداری مجھے مجبور کر سکتی نہیں
ہر پریشانی کو آئینہ دکھا سکتا ہوں میں

وضعداری میرے غیرتمند اشکوں کی نہ پوچھ
مُوت سے پنجہ ملا کر مُسکرا سکتا ہوں میں

ضبطِ غم، ضبطِ محبت، ضبطِ شیون، ضبطِ اشک
عمر بھر ان مورچوں پر فتح پا سکتا ہوں میں

احسان دانش

دو رُوحیں

میں جیل میں مرا۔ موت کے فرشتے نے تو آنے میں دیر نہ کی تھی مگر میری دو روحیں بڑی مشکل سے نکلیں۔ بہت دیر تک میری روحوں میں "آپ پہلے" کا تکلف رہا مگر آخر موت کے فرشتے نے ان دو کو الگ الگ دمینوں سے دبوچ نکالا۔ دونوں کم بخت میرے جسم کو اپنا گھر سمجھنے لگیں تھیں۔ (اب بعد مرگ معلوم ہوا کہ ایک جلد باز فرشتے نے پہلے مجھ میں قدامت پسند روح ڈالی اور بھولے سے پھر ایک جدت پسند روح بھی ڈال دی) زندگی بھر تو ان دونوں کی تُو تُو مَیں مَیں سے حیران رہا ہی تھا جُدائی کے وقت پھر ان لڑاکیوں نے مجھے چین لینے نہ دیا۔

جب یہ دفع ہو چکیں تو چونکہ ہندوستان کے سوا میرا کوئی وارث نہ تھا میرا مردہ جیل کے ہسپتال میں چیرنے پھاڑنے کی میز پر ڈالا گیا۔ ایک نوجوان اپنے استرے قینچیاں نشتر نکال کر مصروف ہونے کو تھا کہ منکر نکیر آ پہنچے۔ غالباً میری روحیں ابھی میرے جسم کے ارد گرد ہی منڈلا رہی ہوں گی کیونکہ منکر نکیروں کو دیکھتے ہی گویا مجھے اپنی جدت پسند روح کی آواز سنائی دی۔

جدت پسند روح۔ حضرات کیا گاندھی کے راج میں بھی منکر نکیروں کو چلنے پھرنے کی اجازت ہے؟

قدامت پسند روح۔ اے متبرک فرشتو! تم ہمارے خاندانی قبرستان کی طرف چلو وہیں تمہیں پانچوں کلمے، پکی روٹی، راہ نجات سب سنا دوں گی۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے اور تم اس دوسری چڑیل کی بات پر مت جاؤ۔

منکر نکیر یہ دو آوازیں سن کر بہت چکرائے اور سراسیمہ ہو کر چل دیئے۔ میری دونوں روحیں کھسکنے کو ہی تھیں کہ وہ فرشتہ جس نے بھولے سے مجھے وہ جدت پسند بلا عطا کی تھی آنکلا اور آتے ہی اس نے روحانی جال نکال کر دونوں روحوں کو قابو میں کر لیا، اور پھر موت کے فرشتے کو آوازیں دینے لگا۔ موت کا فرشتہ بھی آنکلا۔

موت کا فرشتہ:۔ کہو بھئی کیا کام ہے۔

جلد باز فرشتہ:۔ بھائی صاحب ہم تم دونوں بُری طرح پھنسے ہیں۔

موت کا فرشتہ:۔ وہ کیسے؟

جلد باز فرشتہ:۔ تمہیں حکم ایک جان نکالنے کا تھا تم نے دو کیوں نکالیں؟

موت کا فرشتہ:۔ مجھے کیا خبر تھی کہ دو جانیں نکال رہا ہوں میں تو حسب ضابطہ اس جسم کو مردہ چھوڑنے کا ذمہ دار ہوں کسی کم بخت

میں ایک جان ہو کہ سو جانیں ہوں مجھے اس سے کیا غرض ہے؟

جلد باز فرشتہ:۔ بھائی صاحب تم نے لائسنس کی شرائط کو کبھی قانونی نگاہ سے نہیں دیکھا ذرا پہلی ہی شرط تو دیکھو "تمہارا فرض ہے کہ روزانہ ڈائری کی مندرجہ روحوں کو علے الترتیب نکالو اور تم شناخت کے قطعی ذمہ دار ہو۔ روزانہ قبض شدہ روحوں کا میزان ڈائری کے مطابق ہونا چاہئے"۔

اگر آج تم ڈائری کے مطابق کام کرتے گئے تو اخیر والے ذات شریف کی روح کو قبض ہی نہ کر سکو گے تمہارے پاس دسپناہی نہ ہو گا اس آدمی کی جان کیسے نکالو گے؟

موت کا فرشتہ:۔ ہاں یہ تو سچ ہے دو دسپنے تو یہاں ہی خرچ ہو گئے۔

جلد باز فرشتہ:۔ بہتر یہ ہے کہ اس میں یہ پرانی روح ڈال دو اور تم صرف اس جدت پسند روح کو اپنی فہرست میں درج کر لو۔

موت کا فرشتہ:۔ اچھا تو لاؤ جلدی وہ اپنی روح ڈالنے والی دھونکنی۔

جلد باز فرشتہ:۔ یہ رہی۔

میں قطعی بے بس تھا فرشتوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ میری اس قدامت پسند روح کو دھونکنی کی نالی سے پھر میرے اندر ڈال دیا اور میں کلمہ پڑھ کر اٹھ بیٹھا نوجوان ڈاکٹر پہلے تو دہشت زدہ ہو گیا اور پھر بزرگ سے کہنے لگا کہ تمہیں سکتہ ہو گیا تھا اور دوسرے ڈاکٹر نے غلطی سے کہہ دیا کہ تمہاری جان نکل گئی ہے۔ ڈاکٹر کا شکریہ تو ادا کیا مگر چونکہ اصل حال سے مجھے آگاہی تھی میں دل ہی دل میں پھولا نہ سماتا تھا کہ شکر ہے کہ اس جدت پسند روح سے نجات ملی۔ کیا کیا لغو حرکتیں وہ مجھ سے کرایا کرتی تھی کبھی ملک کی محبت کے ناچ نچواتی تھی، کبھی انگریزوں کی نفرت کی آگ سے پھکواتی تھی۔ کمبخت نے ترقی و دولت کی کشمکش میں ڈال کر مجھ سے میری نمازیں بھی ترک کرا دی تھیں روح کیا تھی ایک آفت تھی اس سے چھٹکارا ہوا اچھا ہوا اگر یاد بھی بہت آئے گی۔

لاحول ولاقوۃ۔ ابھی انہیں صفحوں پر تو یہ مضمون پڑھا ہے اور اب اس کی جگہ مشینوں کی موت والا فضول سا قصہ ہے بھئی آج کل کے کاتب بھی بلا کے نظر فریب ہیں ایسی وشنائی استعمال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ پڑھو تو کچھ اور دوسری دفعہ پڑھو تو کچھ اور کہیں "ہمایوں" کے منیجر صاحب کو یہ پتہ نہ چلے نہیں تو ایک جلد کی دو قیمتیں وصول کرنے لگیں گے۔ مگر کیا یہ میری نظر کو دھوکا ہوا یا بعض دفعہ "ہمایوں" کے صفحوں پر بھتنے ناچتے ہیں۔

یہ جن دو روحوں والے ذات شریف کا قصہ تھا کیا ہی لطف ہو جو وہ کبھی مل جائیں۔ دو بیویوں والے بہت دیکھے مگر دو روحوں کی بھی ایک ہی رہی اگر واقعی محض مسخرا پن نہیں اور ایسی ہستیاں بھی ہیں جن کے اندر دو یا تین یا چار متضاد روحیں ہیں (حد شرع سے زیادہ تو کیا ہوں گی؟) تو ان اشخاص کو ایک وقت میں گویا چار زندگیوں کی بے لطفی کا مزہ آتا ہو گا۔

فلک پیما

بیزاری

دُنیا میں اب وہ مہر و مروّت نہیں رہی
ظاہر پرستیاں ہیں محبت نہیں رہی

بیزار زندگی سے نہ کیوں ہو دلِ حزیں
اب زندگی میں کوئی مسرّت نہیں رہی

ناکامیوں نے دل کو جہنّم بنا دیا
اب وہ مرے خیال کی جنّت نہیں رہی

وہ دل جو آرزوؤں کا مرکز تھا اب وہاں
جُز مرگ اور کوئی بھی حسرت نہیں رہی

بے کیف ہو گیا ہے گلستاں بہاریں
پھولوں میں وہ نکھار وہ رنگت نہیں رہی

اے زیست تیرے مکر و ریا پر ہزار حیف
میری نظر میں کچھ تری وقعت نہیں رہی

رشیدہ بیگم

السّلامُ علیکم

محمدؐ افتخار الدین احمدؐ ایک دن خوابِ شیریں سے بیدار جو ہوئے تو دماغ میں ایک زبردست خیال چکر لگا رہا تھا۔

محمدؐ افتخار الدین احمد ماشاء اللہ خوب لکھے پڑھے آدمی تھے، اور ہزاروں نظموں، سینکڑوں ناولوں اور بیسیوں ڈراموں کے مصنّف بھی تھے، یہ اور بات ہے کہ نہ کوئی ناشر ان کی نظمیں اور ناول چھاپنے کو تیار ہوتا تھا اور نہ کوئی کمپنی ان کے ڈرامے قبول کرتی تھی۔ لیکن انہیں کبھی اپنی ذہانت، قابلیت اور عظمت میں شک نہیں ہؤا، کیونکہ وہ بجائے اپنے دوسروں کو کم عقل، جاہل، اور نافہم تصوّر کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ دوسروں کی اندھا دُھند تقلید کرنے اور لکیر کا فقیر بننے کا وقت گزر چکا ہے، اور وہ دنیا میں جدّت اور آزاد خیالی کے علم بردار بننے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، کیونکہ متقدمین کی پیروی کرنا کُند ذہنی اور کم حوصلگی کا ثبوت ہے، ہر زمانے کا علم اور ادب اس زمانے کے حالات اور ضروریات کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ان کے معاصرین یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں تو وہ ان کو اس حقیقتِ گراں کے سمجھنے پر مجبور کریں گے۔

اور محمدؐ افتخار الدین احمد تھے بھی راستی پر۔ اگرچہ ان میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ تحریک جس کے بانی ہو کر وہ دُنیا میں آئے تھے اُسے وہ سرے چڑھا سکتے، لہٰذا اُن کے بحث مباحثوں کا حلقہ قہوہ خانوں کی شاموں اور سینما کی راتوں سے زیادہ وسیع نہ ہو سکا۔ اور ان میں بھی وہ یہیں تک کامیاب ہوئے کہ یا تو چند ایک احمقوں کو اپنا حامی بنایا اور یا اپنے قرضے میں معتدبہ اضافہ کیا۔

لیکن آج کی صبح جو وہ بیدار ہوئے تو عالم ہی اور تھا، جس گنجِ گراں مایہ کی انہیں مدت سے جستجو تھی وہ آج مِل گیا۔ آج انہیں ایک نہایت اچھوتا عنوان سُوجھ رہا تھا۔ لیکن اس عنوان پر لکھا کیا جائے؛ اس بات کا ابھی فیصلہ نہیں ہؤا تھا؛ بہرحال عنوان کے متعلق انہیں کوئی شک و شبہ نہیں تھا، ایسا اچھوتا، ایسا جاذبِ توجہ، ایسا جامع اور مانع، ایسا جدّت آگیں اور ایسا عجیب و غریب عنوان! اور طرّہ اس پر یہ کہ عنوان اس قدر نادر اور شگفتہ ہونے کے باوجود روزمرہ کا مستعمل تھا اور ایسا عام ہونے کے باوجود بھی اس قدر نادر اور شگفتہ تھا۔ اور تھا کیا؛ محض دو الفاظ کا مجموعہ جو ہر روز لاکھوں دفعہ بولا اور کروڑوں دفعہ سُنا جاتا ہے۔ یعنی:۔

"السّلام علیکم"

پہلے تو اُنھوں نے اس عنوان پر ایک نظم مرتب کی اور اُسے بڑی بڑی تمہیدوں اور تشریحوں کے ساتھ دوستوں کے سامنے پڑھا، اور حرکات والفاظ سے ہر ممکن کوشش کی گئی کہ احباب اس کی لفظی اور معنوی، لغوی اور اصطلاحی خوبیوں سے

کماحقہ لطف اندوز ہوں۔ چنانچہ اوّل اوّل چاروں طرف سے واہ واہ اور مرحبا کے نعرے بلند ہوئے، خوب حوصلہ افزا داد ملی، لیکن بعد میں ایک ظالم ایک کونے سے بول اُٹھے:۔

"میرے خیالِ ناقص میں عنوان پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ نظم اگرچہ بذاتِ خود بے نظیر و عدیم المثال ہے لیکن کیا یہ صحیح نہیں کہ ایسے اچھوتے عنوان کے لئے یہ نظم کافی نہیں۔ اسے ابھی شاعر کے تخیل کی مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ ذرا خیال تو فرمایئے! ایسے نادر عنوان پر صرف دس شعروں میں کیسے مکمل بحث ہو سکتی ہے! ابھی اس اختصار کو تفصیل کی حاجت ہے۔"

رفتہ رفتہ سب سامعین اِس رائے پر متفق ہو گئے۔ میاں محمد افتخار الدین احمد بھی خوشی میں پھُولے نہ سمائے اور بولے:۔

"درست، بجا! میں نے واقعی از حد اختصار سے کام لیا ہے، اس قدر وسیع مضمون اور دس شعر! سبحان اللہ۔ خدا معلوم میں اُس وقت کس خیال میں ہوں گا؟ آپ حضرات کی اس دلچسپی، حوصلہ افزائی اور قدر کا تہِ دل سے شکریہ۔ میں انشاء اللہ کوشش کرونگا کہ اس عنوان پر پانچ ایکٹوں اور گیارہ راگنیوں کا ایک مکمل و مبسوط ڈرامہ لکھوں۔" اور یہ کہتے ہوئے باوجود دوستوں کی بناوٹی ممانعت کے انہوں نے وہیں اپنے شاہکار والے کاغذ کے پُرزے پُرزے کرکے ہوا میں اُڑا دیئے۔

اگلے پانچ سال محمد افتخار الدین احمد نے کچھ اپنی اُس نظم کی یاد میں اور کچھ اُس پر ناز کرتے کرتے گزار دیئے۔ اور ہمیشہ اپنے احباب کو اپنے ڈرامے (بعنوان السلام علیکم) کے وعدے اور خوشخبریاں ہی دیتے رہے۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا یہ موہوم ڈرامہ قبل از پیدائش ہی انہیں شہرت کے بامِ بلند پر چڑھانے کے لئے جا رہا تھا۔ احباب کو معلوم تھا کہ صرف چند ایک سین اور دو چار مکالمے باقی ہیں ورنہ ڈرامہ بالکل مکمل ہے جن لوگوں نے مصنف کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا وہ تک بھی اُس کے گیت گاتے پائے جاتے تھے۔ اگر افواہ پر اعتبار کیا جا سکے تو محمد افتخار الدین احمد کے "ادبی خدا" بننے میں صرف ایک آنچ ہی کی کسر باقی تھی۔

کیا ڈرامے کے مکمل ہونے میں ضرورت سے زیادہ دیر نہیں ہو رہی تھی؟ ـــــ لیکن عنقا بھی تو سَو سال کے بعد انڈا دیتا ہے! آخر کار ڈرامہ مکمل ہو گیا! اخباروں کے لئے یہ ایک قابلِ یاد دن ہوگا۔ خدا معلوم وہ کونسا خوش قسمت تھیئٹر ہوگا جس کو ہادیٔ ادب کے اس شاہکار کو سب سے پہلے پبلک کے سامنے پیش کرنے کا فخر حاصل ہوگا۔ وہ کونسے عجائبِ زمانہ ایکٹر ہوں گے جو پورے طور پر اس ڈرامے کی روح کا اظہار کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

سب سے پہلے محمد افتخار الدین احمد نے اپنے چھوٹے سے دربار کو جمع کیا تاکہ ثمرِ کامیابی ان کے سامنے پیش کیا جائے لیکن ڈرامے کو اتنا پُرجوش استقبال نصیب نہ ہوا جتنا کہ نظم کو ہوا تھا۔ ممکن ہے اس سرد مہری اور مایوسی کی وجہ یہ ہو کہ سالوں کے انتظار کے سبب سے یاروں نے ڈرامے کا بہت ہی مکمل اور اعلےٰ تصور باندھ رکھا تھا۔ یا ممکن ہے یہ بات بھی ہو کہ واقعی

محمد افتخار الدین احمد کی طبیعت میں اس دفعہ وہ روانی پیدا نہیں ہوئی تھی جو نظم کی دفعہ تھی۔ یا ممکن ہے کہ سامعین میں سے بعض کو حسد نے اندھا کر دیا ہو ـــ یا ممکن ہے کہ اب اس کے احباب زیادہ جہاں دیدہ اور پختہ کار ہو گئے تھے ـــ بہرحال وجہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس پہلی میٹنگ میں (یا سماعت میں) محمد افتخار الدین احمد کو مکمل ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ صرف وہی صاحب جنہوں نے نظم کو نامنظور کیا تھا اب کے کچھ کچھ ہمدرد معلوم ہو رہے تھے، لیکن بجائے خوشی کے محمد افتخار الدین احمد کو اس دوست پر غصہ آ رہا تھا کیونکہ اسی نے نظم پھڑوا کر انہیں یہ دن دکھائے تھے۔

محمد افتخار الدین احمد بہت دل شکستہ ہوئے اور دوسرے دوستوں سے کہنے لگے "برائے نوازش یہ تو بتائیے کہ اس میں غلطی یا سُقم کیا ہے؟" "کچھ نہیں، بالکل کوئی نقص نہیں"۔ سب احباب ہم آواز ہو کر بولے لیکن ان کے اصرار پر ایک صاحب حوصلہ کر کے بول ہی دیئے:-

"حضرت موجودہ زندگی اس قدر وسیع ہے کہ ڈراما اس کے سب پہلوؤں پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ حادثات، دل کی کیفیات، خیالات کی اُلجھنیں، روحانی اور مادی واقعات، دماغی اور نفسیاتی سوالات ـــ آخر یہ چیزیں ایکٹنگ میں کیسے پورے طور پر ظاہر ہو سکیں! آپ کو بڑی مشکلات کا سامنا ہے۔ کبھی تو آپ نے احساسات سے پہلوتہی کی ہے جس سے ڈراما نامکمل رہ گیا، اور کبھی ان سے حد سے زیادہ متاثر ہو گئے ہو۔ جس سے صفائی اور روانی میں نقص آ گیا۔ باوجود اپنی ساری قابلیتوں کے آپ اس دیو پر قابو نہیں پا سکے۔ آپ کی کہانی بالکل بے معنی ہے۔ آپ کے کیریکٹر اصلیت سے بہت دُور ہیں، اور نتیجہ بالکل غیر ممکن۔ لیکن باوجود ان نقائص کے خوبیوں کی بھی کمی نہیں۔ مناظر قدرت کا مطالعہ اس غضب کا، واقعات کا اس قدر گہرا تجزیہ، زبان اس قدر شُستہ! کیا کہنے! باوجود مندرجہ بالا خامیوں اور رکاوٹوں کے اس قدر جوش اور اخلاص سے لکھنا ایک فوق الفطرت انسان ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ آپ کے آخر بس میں ہی کیا تھا؛ ناممکن بات ممکن کیسے بنائی جا سکتی ہے! اگر میں آپ کی جگہ ہوتا ہے تو میں اپنے خیالات کو اور وسعت دیتا، اور واقعات پر اور فراخدلی سے روشنی ڈالتا، اور وقت خرچ کرتا اور میں اپنی کتاب کو اپنے خیالات کے مطابق پھیلا دیتا ـــ قصہ کوتاہ میں بجائے ڈرامے کے ناول لکھتا!"

"بالکل ٹھیک، مطلقاً صحیح، حرف حرف درست"۔ سب احباب نے یکدم شور مچانا شروع کر دیا "آپ ضرور السلام علیکم پر ایک ناول لکھیئے!" اس رائے پر سب متفق ہو گئے۔ محمد افتخار الدین احمد اس قدر نیک تھے کہ اُن کو اس مشورے میں سوائے اپنی بھلائی کے اور کچھ نظر نہ آیا۔

ایک شجاع اور بہادر انسان کی طرح اُنہوں نے اپنا ڈراما جلا دیا اور از سر نو ناول کی تصنیف شروع کر دی۔

اور دس سال اور ناول پر محنت کرتے کرتے گزر گئے۔

اس عرصے میں ہر شخص اُسے اپنا دوست اور حوصلہ افزا خیر خواہ محسوس ہوتا تھا۔ تعریف تو اُس کی ہر شخص کرتا تھا، لیکن وجہیں مختلف تھیں۔ کوئی تو واقعی اس کے عقیدت مند تھے۔ کوئی اس ڈھب سے تعریف کرتے تھے کہ وہ جانتے تھے کہ اُنہیں کامیابی نہ ہو گی نہیں اس

لئے نہ مقابلے کا خوف ہے نہ رقابت کا ڈر۔ ایڈیٹر اور مبصر اُن کی مثالیں دے دے کر رسالی مصنفین کی تواضع کرتے تھے۔ اخبار نویس اکثر ان کے حوصلے اور ناول کا تذکرہ کرتے کرتے صفحوں کے صفحے سیاہ کر دیتے تھے۔ گپتی، جھوٹے اور باتونی بغیر کچھ جانے بوجھے ہی اُن کا ذکر خیر کرتے رہتے تھے۔ الغرض حضرت شیطان کی طرح مشہور ہو گئے۔

لیکن یہ پبلک جوش و خروش آخر کب تک رہتا۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے انہیں بھولنا شروع کر دیا۔ اور جب محمد افتخار الدین احمد کی عمر ساٹھ سال کی ہوئی تو زمانہ اُنہیں تقریباً بالکل فراموش کر چکا تھا۔ اب اگر کبھی ان کا ذکر آتا تھا محض ایک خبطی یا دیوانے کی صورت میں۔ چند لوگوں کو صرف کچھ کچھ یاد تھا کہ وہ ایک ناول لکھ رہے تھے لیکن اُس کے ختم ہونے کا کسی کو یقین نہیں تھا۔ اور کبھی کسی نے اُن کے ناول کی ہیں جلدوں کا ذکر دلچسپی سے نہیں کیا تھا۔ اور ناول بھی وہ ناول جو بیسویں صدی کی ایک قابل یادگار اور قابلِ تقلید چیز ہو گی۔

کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ میاں محمد افتخار الدین احمد کس مصیبت میں گرفتار تھے۔ بچارے نے اپنا حیرت انگیز مرحلہ طے کر لیا تھا، اپنے ناول کو ستائیس جلدوں میں ختم کر لیا تھا، عنوان وہی دلچسپ الفاظ "السلام علیکم"۔ ختم ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ ناول تو بہت زیادہ لمبا ہو گیا۔ اتنا لمبا کہ خود حضرت کو دُہرانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

اب دوسرا کام اس کے مختصر کرنے کا شروع ہو گیا۔ محنت کرتے کرتے پہلے ستائیس کی بجائے بیس جلدیں ہوئیں، پھر دس ہوئیں، پھر دو ہوئیں اور آخر میں ایک جلد کر دی گئی، ایک جلد کو کاٹتے چھانٹتے کہانی کو بصد مشکل ایک سو صفحوں میں ختم کیا گیا۔

اس وقت غریب محمد افتخار الدین احمد اسّی سال کو پہنچ گیا۔ اور دوست بھی صرف ایک باقی رہ گیا تھا جو اب تک اُسے حوصلہ دیتا جا رہا تھا۔ اس نے کہا:-

"اپنی کہانی کو شائع کر دو۔ مجھے یقین ہے کہ دُنیا میں تہلکہ مچ جائے گا۔ جدت کا عطر کھینچ گیا ہے عطر؟"

محمد افتخار الدین احمد بولے:۔ "ابھی نہیں، ابھی مجھے اس میں اور اختصار کرنا ہے۔ میں اپنے آپ کو بھی جانتا ہوں اور پبلک کو بھی پہچانتا ہوں۔ دُنیا میں نام پیدا کرنے اور یادگار چھوڑنے کے لئے انسان کی تحریر بہت مختصر اور پُرزور ہونا چاہئے۔ اپنی پہلی کوشش میں میں اس لئے زیادہ کامیاب ہُوا تھا کہ میں نے اس راز کو پا لیا تھا یعنی نظم دیکھیئے نہ، پُرزور لیکن مختصر ہونے کی وجہ سے اس قدر مقبول ہوئی تھی، اے کاش! میں آج وہ نظم یاد کر سکوں جو میں نے جوانی کے دنوں میں لکھی تھی۔ لیکن اگر میں آج پھر اسی موضوع پر ایک نظم ہی لکھنے کی کوشش کروں تو ممکن ہے ان دنوں سے زیادہ کامیاب ہو جاؤں کیونکہ اب تو خیالات کے ساتھ میرا تجربہ بھی شامل ہو گا۔ کاش میں دس سال اور زندہ رہ سکوں تو میں دُنیا میں ایک ایسی عجیب و غریب نظم چھوڑ جاؤں گا کہ زمانہ حیران ہو گا کہ کس طرح اس قدر وسیع زندگی کے وسیع تجربات کی روح کو اس چھوٹی سی نظم میں کھینچ کر رکھ دیا۔"

میاں محمد افتخار الدین احمد دس سال اور بھی زندہ رہے اور بچارے ناول کا وہی حشر ہُوا جو نظم اور ڈرامے کا ہُوا تھا۔ اور آہستہ آہستہ

تھوڑا تھوڑا کر کے لفظ لفظ جوڑ کر، مصرع مصرع لکھ کر، انہوں نے وہ دس شعر کی حیرت انگیز نظم پوری کی جس میں رازِ حیات تمام وکمال بیان کیا گیا تھا۔

بانوے سال کی عمر میں محمد افتخار الدین احمد جب بسترِ مرگ پر پڑے تھے تو ان کے باوفا دوست ان کے پاس بیٹھے یہ دیکھ کر رو رہے تھے کہ اتنے بڑے ذہین اور قابل شخص کا ایسا قابلِ رحم حشر ہو!

محمد افتخار الدین احمد بولے :۔ "رؤو نہیں میرے دوست! رونے کا کونسا موقعہ ہے؛ میں تو اگرچہ مر رہا ہوں لیکن میرے خیالات تو زندہ رہیں گے، میں نے پہلی نظم پھاڑ دی، میں نے ڈرامہ جلا دیا، میں نے ناول کی ستائیس جلدیں یکے بعد دیگرے نذرِ آتش کر دیں، پھر اس کی بیس، پھر دس، پھر دو اور پھر آخری ایک جلد بھی تباہ کر دی۔ لیکن میں ناکام نہیں جا رہا۔ میرا شاہکار، میری آخری نظم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری عظمت کی یادگار رہے گی"۔ دوست بولا "نظم نظم! مجھے تو آج تک وہ نظم تم نے سنائی بھی نہیں، مجھے تو ذرا دکھاؤ مجھے یقین ہے کہ یہ نظم منرور گراں مایہ چیز ہو گی۔ میں اسے شائع کروں گا، اگر مجھے اس کیلئے افلاس کا مُنہ بھی دیکھنا پڑا تو میں پروا نہیں کروں گا لیکن میں اسے سونے کی لوح پر ہیرے کے الفاظ میں لکھواؤں گا۔ دُنیا حیران رہ جائے گی"۔

محمد افتخار الدین احمد نے سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا؛ "نظم؛ کونسی نظم؛"

دوست نے محمد افتخار الدین احمد کو سرسامِ مرگ میں مبتلا دیکھ کر کہا "وہی تمہارا شاہکار! اور کونسی نظم؟"

محمد افتخار الدین احمد:۔ "ہوں ہوں، نظم، وہ گرانقدر نظم، وہ طول طویل نظم! لیکن اسے پُر زور بنانے کیلئے بہت زیادہ مختصر کرنا پڑے گا"۔

دوست "کیا؛ تو آخری نظم بھی جلا دی ہے کیا؛"

محمد افتخار الدین احمد: "میں نے اس نظم سے بھی ایک بہتر چیز پالی ہے۔ میں نے سب کچھ پالیا ہے، موجودہ زندگی، جدت، یہ سب کچھ میرے قبضے میں ہے، یہ نہ نظم میں ہے، نہ ناول میں، نہ ڈرامے میں، نہ رباعی میں، نہ فرد میں، نہ مصرعے میں، یہ ہے . . . . . . "

اس کی آواز کمزور ہوتی گئی، اور آخر کار بالکل بند ہو گئی،

دوست، بچارا گریاں و نالاں دوست، یہ سمجھ کر کہ شاید آخری لمحوں میں، ساری عمر کے تلخ تجربات کے بعد، خدا معلوم محمد افتخار الدین احمد نے کونسا رازِ حیات پالیا ہے، کونسی کیمیائے ہستی معلوم کر لی ہے، بے صبری سے بولا "بول! بول! دوست"

بدمعاسکرات کے جوش میں اُٹھا اور چلّانے لگا: "سب کچھ دو لفظوں میں، سب کچھ دو لفظوں میں" یہ کہہ کر تھک کر پھر تکیئے پر گر گیا۔

گرتے گرتے کچھ الفاظ اس کے مُنہ سے نکلے اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

وہ الفاظ تھے "السلام علیکم"۔

(جین رِشِس پن)

ف م ۔ افضل
ایم۔ اے

الوداع

سلام اے زمینوں کے دلکش نظارو
سلام اے نظاروں کی دلکش بہارو

تمہیں داغِ فرقت دیئے جا رہا ہوں
سمندر میں کشتی لیئے جا رہا ہوں

مرے پیارے بھائی مری پیاری بہنیں
اگر مجھ کو گھبرا کے ہر سمت ڈھونڈیں

ہواؤ انہیں بڑھ کے تم روک لینا
انہیں میرے پیچھے تم آنے نہ دینا

انہیں جا کے میرا یہ پیغام دینا:-

وہ اس تنگ دُنیا میں گھبرا گیا تھا
تمہاری زمینوں سے اُکتا گیا تھا

مری جان تھی "وہ محبت کی دیوی"
مروّت کی دیوی لطافت کی دیوی

یہ دُنیا خدا جانے کیا چاہتی تھی
مجھے اُس سے کرنا جُدا چاہتی تھی

اگر یاد آؤں تو گھبرا نہ جائیں
نہ میرے لئے کوئی آنسو بہائیں

مَیں کب اُن سے مُنہ موڑ کر جا رہا ہوں؛
مَیں خود کو وہیں چھوڑ کر آ رہا ہوں

مروّت کی دیوی تو اب تک وہیں ہے
محبت کی دیوی تو اب تک وہیں ہے

مرا رنگِ رُخ اس کی صُورت میں دیکھیں
سراپا مرا اس کی مُورت میں دیکھیں

کہ میں بھی اسی حسُن کی روشنی تھا
بظاہر نہیں تھا مگر مَیں وہی تھا

مہدی علی خاں

محبّت

گُلوں سی گلستانوں سی محبت کر محبت کر — چمن کے نغمہ خوانوں سی محبت کر محبت کر

خدا کی طرح سے ہو یہ محبّت بے غرض تیری — زمینوں آسمانوں سے محبّت کر محبت کر

یہ دُنیائیں خدا کے نُور کا آئینہ خانہ ہیں — تُو اِن آئینہ خانوں سے محبّت کر محبت کر

جو ٹھکرایا ہے اس دُنیائے دوں نے تیری اُلفت کو — تو نادیدہ جہانوں سے محبّت کر محبت کر

ہزاروں کارواں بھٹکے ہوئے ہیں جادۂ حق سے — اُٹھ اور اِن کاروانوں سی محبّت کر محبت کر

مصیبت میں ہزاروں بیکس و بیمار و مفلس ہیں — اُٹھ اور اِن خستہ جانوں سی محبّت کر محبّت کر

تُو اپنے دشمنوں کو بھی محبت ہی سی حصّہ دے — اور اپنے مہربانوں سے محبّت کر محبّت کر

لُٹانے سے محبّت کے خزانے کم نہیں ہوتے
لُٹا سَو سَو بہانوں سے محبّت کر محبّت کر

ح - ب

م۔ک۔ن۔ب

ہمایوں جنوری ۱۹۳۷ء میں "م۔ک۔ن۔ب" (میں کبھی نہ بھولوں گا) کے عنوان کا ذکر دیکھا۔ چنانچہ میں بھی ایک سچا واقعہ قلمبند کر کے بھیج رہا ہوں۔

مَیں کبھی نہ بھولوں گا اُس واقعہ کو جو مجھے ایک روز اپنے ایک مربعۂ زمین میں کھڑے ہوئے پیش آیا۔ اور اُس کا اندوہ انگیز احساس کبھی میرے دل سے دُور نہ ہوگا ٭ میں کبھی کبھی اپنے مربعہ میں تفریح اور فصل کی دیکھ بھال کے لئے جایا کرتا تھا۔ ایک روز حسبِ معمول اپنے کھیتوں میں پھر رہا تھا کہ چند شکاری ادھر آ نکلے۔ اُن کے ساتھ کتے تھے۔ بڑے کتوں کو اُنہوں نے پکڑ رکھا تھا۔ اور چھوٹے کتے اُنہوں نے اُگی ہوئی فصلوں میں سے جانور نکالنے کے لئے چھوڑ رکھے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک خرگوش جوار کے کھیت سے بھاگ نکلا۔ شکاریوں نے اُس پر کتے چھوڑے۔ کتے آناً فاناً اُسے جا ملے۔ خرگوش کو کوئی جائے پناہ نہ ملی۔ وہ میری طرف بھاگا۔ اور ایک لمحہ میں وہ میری ٹانگوں کے درمیان تھا مجھے خیال آیا کہ اسے اٹھا لوں۔ مگر میں نے تساہل سے کام لیا۔ کتے قریب آ گئے۔ وہ میری ٹانگوں سے بھاگ نکلا۔ کتے پھر لپکے اور فوراً ہی اُس کو جا لیا۔ خرگوش پھر مڑا اور کتوں کو دھوکا دیتا ہوا میری ٹانگوں میں آ گھسا۔ مَیں نے پھر اُسے اُٹھانے میں تامل کیا اور کتے اُس کے قریب آ پہنچے۔ وہ پھر بھاگ نکلا اور اُسی طرح پھر تیسری بار میری ٹانگوں میں پناہ گزیں ہوا۔ مگر میں اس معمے کو حل کرنے سے قاصر رہا کہ آخر خرگوش میری پناہ لینے کے بجائے دُور کیوں نہیں بھاگ جاتا۔ اب وہ بالکل تھک چکا تھا کتے اُس پر پھر جھپٹے۔ وہ اُن کی دستبرد سے نہ بچ سکا اور اپنی عزیز جان کو کھو بیٹھا۔

شکاری خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے آن پہنچے۔ انہوں نے خرگوش کتوں سے چھین لیا۔ اُسے ذبح کرنے کے بعد جب اُس کا پیٹ چاک کیا گیا تو اُس میں سے تین بچے برآمد ہوئے۔ جن کا فوراً ہی سانس جاری ہو گیا۔

بچوں کو دیکھتے ہی میرے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ مجھے اپنے تساہل پر سخت ندامت ہوئی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ خرگوش مادہ تھی۔ جو عنقریب بچے جننے والی تھی۔ اُس میں بھاگنے کی ہمت نہ تھی۔ اُسے اپنی جان بچانے کے ساتھ ساتھ اپنے عزیز بچوں کی جان کا خطرہ لاحق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے ایک قریب ترین جائے پناہ کی ضرورت تھی اور وہ میرے سوا اُسے اَور کہیں نظر نہ آتی تھی۔ مگر افسوس کہ میری ذرا سی بے توجہی اور تساہل سے چار جانیں تلف ہو گئیں۔ مجھے بار بار اُس کی مایوسی اور اُس کی ممتا کا خیال آتا تھا۔ مگر وقت گزر چکا تھا اور اب دستِ تاسف ملنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

میرے بہت سے دوست شکار کے دلدادہ ہیں۔ اور جب کبھی شکار کے متعلق گفتگو ہوتی ہے۔ مجھے فوراً اُس مادہ خرگوش کا خیال آتا ہے۔ دل لرز جاتا ہے۔ اور اپنے تساہل پر سخت ندامت ہوتی ہے۔ میں نے اپنے دوستوں کو متعدد بار یہ کہانی سنائی ہے بہت سے دوستوں نے اسی بنا پر شکار کھیلنا چھوڑ دیا ہے۔ مگر میرے دل سے اِس جگر پاش واقعہ کا نقش کسی طرح نہیں مٹتا اور اِسے مَیں کبھی نہ بھولوں گا ٭

ڈاکٹر حمید

آوارگی

میں جو پھرتا ہوں ترے شہر میں آوارہ سا
کھویا کھویا ہُوا مدہوش سا بے چارہ سا
رہ نوردی کا جنوں مجھ کو لئے پھرتا ہے
ایک بے نام فسوں مجھ کو لئے پھرتا ہے
ہوش گفتار سے پیدا ہے نہ رفتار میں ہے
کبھی گلیوں میں ہے چکر کبھی بازار میں ہے
کبھی لاتا ہے جنوں مجھکو نئی راہوں پر
حُسن اور عشق کی مرغوب گزرگاہوں پر
دیکھتا ہوں میں جو الفت کی طرحداری کو
عشق کی سادہ دلی، حسن کی پرکاری کو
ہر طرف نور کے سیلاب نظر آتے ہیں
قافلے حُسن کے آتے ہیں گزر جاتے ہیں

کبھی ان قافلوں میں تُو جو نظر آتی ہے
ترے نظارے سے دُنیا ہی بدل جاتی ہے
مری آنکھوں میں چمک اُٹھتی ہے اُمید تری
شوق کی آگ کو دیتی ہے ہوا دِید تری
دِل یہ کہتا ہے کہ اِک آن ٹھہر جاؤں مَیں
شاید اُن ہونٹوں سے اِک حرف ہی سُن پاؤں مَیں
مگر افسوس یہ کیا بات ہے، ڈر جاتا ہوں
ترے ملنے کے تصوّر ہی سے گھبراتا ہوں
اِک نظر دیکھتا ہوں تجھ کو پلٹ جاتا ہوں
اور پھرتا ہوں ترے شہر میں آوارہ سا!

عطاءاللہ سجاد بی۔اے

غمِ عشق

دل کی بجھ گئی ہے آگ !

یہ تاریکیاں اب مجھ سے نہیں سہی جاتیں ۔ میں اُن لمحات کے تصور میں گم ہوا جاتا ہوں جب میرے کاشانے میں عشق کا چراغ روشن تھا ۔ مجھے نہیں معلوم کہ نزہت اور روحی کو مجھ سے کوئی لگاؤ تھا یا نہیں ۔ لیکن میری روح میں اُنہوں نے سیاہ بادلوں میں لپک لپک کر چمک جانے والی بجلیوں کی بے تابیاں بھر دیں ۔ میرا دل میری کائنات تھا ۔ حسن، کشش، گداز اور خارجی دنیا شاید میرے دل کی دُنیا کا عکس تھی ۔ فضا سے رس ٹپکتا تھا، وہی مستی، وہی سحر ۔ بہشت کے لئے کیا رہ گیا ہے! جیسے میں نے اِک خواب دیکھا ہو! اُس خواب کا تصور بھی زندگی سے کسی قدر دل آویز ہے! کاش یہ تصور جاوداں ہو جائے!

مجھے عورت کی پیاس نہیں ستا رہی ۔ میں عشق کے غم میں گھُلا جاتا ہوں ۔ نزہت اور رُوحی مثالی حُسن کی مالک تھیں حسن کے سانچے میں ڈھلا ہوا پیکر دیکھنے کی آرزو ہوتی تو اُن کی تصویر سامنے آجاتی ۔ شاید اُن میں آگ بھری تھی کہ اُن کی چاہت نے مجھے شعلوں کا سوز دے دیا پہلے میری آنکھوں میں صرف وہی بستی تھی ۔ پھر صرف نزہت ۔ اب ہزار چہرے ہیں ۔ نہ کہیں بے عیب حسن ہے، نہ وہ بے کلی ۔ عورت عورت معلوم نہیں ہوتی ۔ برف کی سلوں سے تراشی ہوئی شکلیں ہیں جن میں سُورج کی شعاعیں رنگ آمیزی کر دیں ۔ کسی میں کیفِ خود فراموشی دینے کی طاقت نہیں ۔ کوئی رُوح کو مائلِ پرواز نہیں کر سکتی ۔ نزہت اور روحی میں وہ بات نہیں رہی میں جان گیا ہوں کہ عورت نہیں محبت حسین ہے!

قیامت ہے کہ جس شمع نے میرے بچپن کی انجان راتوں کو نورانی بنائے رکھا، جوانی آئی تو وہ گل ہو گئی ۔ لڑکپن اُس وادی کو طے کرتے ہوئے گزرا جہاں روشنی پھولوں کے رنگ سے بنی تھی، جہاں شفق کی سرخیوں میں دریا کے پانی پر مئے ارغوانی کی متلاطم موجوں کا دھوکا ہو، جہاں خمار آلود چاندنی میں پہاڑ اس انداز سے آسمان کی طرف اُٹھتے نظر آئیں گویا کھلی آنکھوں تخیل کی بستی دیکھ رہے ہوں، جہاں جھیل کے پانی میں ایک دھندلی سی بھیگی ہوئی دُنیا نظر آئے، اور رہ رہ کر جی میں اُمنگ اُٹھے کہ وہیں جا بسیں ۔ وہ حسین وادی جہاں رُوحِ کائنات کی مدہوش تجلیاں اتنی فراواں ہوں کہ بیان نہ ہو سکیں ۔ کوئی نورِ سحر سے ڈھلی ہوئی، کوئی ہرے ہرے پتوں میں ڈھکی ہوئی گلابی گلاب کی نیم وا کلی، کوئی موتیا، کوئی بجلی کی تڑپ، کوئی چاند کی کرنوں سے بنی ہوئی، کوئی اُس پھول کی طرح جس پر نشہ چھایا ہوا کوئی شاعر کے خیال کی تخلیق، کوئی الف لیلہ کی شہزادی، کوئی یونان و مصر کے ماضی کی پہنائیوں میں سے اُبھری ہوئی، کوئی پرستاں بدوش، کوئی دامن میں بہشت بسائے ہوئے ۔ اور جوانی آئی تو اپنے آپ کو ایک ایسی چوٹی پر تنِ تنہا کھڑے پایا جہاں گھاس کا ایک تنکا بھی نہ ہو، جہاں کپکپا دینے والی

سرد ہوائیں چل رہی ہوں جہاں ہر دم اس بات کا خطرہ ہو کہ بیتے ہوئے دنوں کی یاد سے دِل کہیں بیٹھ نہ جائے!

میری لڑکپن میں آرزو تھی کہ مجھے کبھی موت نہ آئے میں اس بات کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا تھا کہ میں غیر فانی نہیں ہوں میں، میرے دوست، فطرت، اور میری ہر شئے میری نگاہ میں جاوداں تھی۔ زندگی کی محبّت صرف جوانی کا دل جانتا ہے۔ اور میری جوانی؛ خدایا! میں، میرے دوست، فطرت، اور میری ہر شئے میرے لئے اِن میں کوئی دلکشی نہیں رہی! اُس پژمردہ بوڑھے آدمی کی طرح جسے تڑپانے کے لئے ماضی کی بہت سی چیزوں کی یاد ہو اور مستقبل کے دامن میں اُس کے لئے کوئی اُمید نہ ہو، میرا دل مُرجھا گیا ہے۔ موت کس قدر آسان معلوم ہوتی ہے!

رُوحی کو چاہا تو میرے خیال کی اُڑان اُسی تک محدود ہو گئی۔ یہ طلسم ٹوٹنے سے پہلے میرے نزدیک دُنیا میں کسی اور لڑکی کا وجود ہی نہیں تھا۔ آنکھیں کھلتے ہی دل ڈولنے لگا۔ ابھی گرنے نہ پایا تھا کہ زہت کی نظر نے پھر ملکوتی ماحول میں پہنچا دیا۔ محبّت نے میرے چہرے پر دیوتاؤں کے تقدس کا حسن پیدا کر دیا۔ یہ نشہ اُترا تو قدم قدم پر وہ وہ لغزشیں کھائیں کہ پاکبازی بھولی بسری یاد ہو کے رہ گئی۔ رُوح کو اُن بلندیوں سے گر کے انتہائی پستیوں میں پامال ہوتے دیکھ کر دِل خون ہُوا جاتا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ بھولے سے کہیں آئینے میں نظر نہ پڑ جائے، چہرے کا ہر خط ان گنت گناہوں کے نفرت انگیز نقوش لئے ہے۔ یہ بدلی ہوئی صُورت مجھ سے دوبارہ نہیں دیکھی جاتی!

جی چاہتا ہے پرانی محبتیں تازہ کر لوں۔ یہ میرے بس میں نہیں میں نے کسی کو اپنی پسند سے نہیں چاہا تھا۔ یہ تجدید میرے بس میں نہیں!

دانتے کے غم نے اسے لازوال بنا دیا۔ کردار خام ہو تو اِس صدمے سے انسان لوٹ کے رہ جائے۔ غم میں کوئی نہیں جیتا غم غلط کرنے کے لئے اپنی ہستی کو بُھلا کر کسی شئے میں کھو جاتے ہیں۔ کوئی مئے ارغوانی میں، کوئی ہوس پرستی میں۔ نگاہ بلند ہو تو رُوح کے نشے اِن سے زیادہ تیز ہیں۔ آرٹ کی محبت اُس کے آڑے آئی اور مئے خانۂ عرفان کے اُس سرمست نے کسی مینا میں ایک قطرہ نہ رہنے دیا۔ میرا غم اُس سے سوا ہے۔ ناکامیاں روز دیکھنے میں آتی ہیں۔ عشق کی موت ——— "خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے"۔ شاید میری اُن بلندیوں تک رسائی ہو جائے جن سے اُس کا فکر نا آشنا ہی رہا!

مجھے عشق سے عشق ہے۔ اس کے بغیر اب نہیں رہا جاتا، نگاہ پرکھتی ہے۔ فریب کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ اور محبت کا وجود رنگیں دھوکوں سے ہے۔ بن دیکھے منگنی ہو جائے تو اِسی خیال سے کہ تم کسی کے ہو چکے، دل جی اُٹھتا ہے۔ آرٹ زندگی پر قربان کر دوں، یا زندگی آرٹ پر؟ افسردگی کے زمانے کو اور طول دے دوں؛ جوانی کے بعد محبت کس کام کی! ان دنوں رُوح پر موت طاری ہے دُنیا میرے لئے قبر ہے۔ زندگی کے سانس دوزخ کی ہوا کے آتشیں جھونکے ہیں۔ آرٹ؛ اسے دوزخ میں جھونک دو! میں ابھی جینا چاہتا ہوں! ابھی جینا چاہتا ہوں!

ابنِ مریم

میں نے ایک عالیشان مکان کے پائیں باغ کی دیوار کے قریب ایک پھٹی ہوئی بوسیدہ کتاب دیکھی، جو اُس کوڑے کے ڈھیر میں پڑی ہوئی تھی جو مکان کے کسی کمرے کو صاف کر کے نکالا گیا تھا، کتاب کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ وہاں کافی عرصے سے پڑی ہوئی تھی، بارش اور برف باری کی وجہ سے اُس کے صفحات کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے اور مرجھائی گھاس کے تنکے کاغذوں پر چمٹ گئے تھے۔ موسمِ بہار کی گرمی اور دھوپ کی وجہ سے کتاب کے صفحات پر کی کیچڑ تو سُوکھ چکی تھی لیکن الفاظ مٹ گئے تھے۔

میں نے اُس کتاب کو اپنے پیر سے جنبش دی اور یہ سوچتا ہُوا اپنی راہ چلا گیا کہ یہ اوراقِ پارینہ آخر کس کتاب کے ہو سکتے ہیں، آیا یہ کتاب کسی غیر معمولی دماغی محنت کا نتیجہ ہے، اور ایک عرصے تک موضوعِ گفتگو رہ چکی ہے، یا کسی کی بہترین مونسِ تنہائی ثابت ہوئی ہے اور اُس کے دماغ کو سکون پہنچایا ہے۔

اس واقعہ نے مجھے اپنی جوانی کی یاد دِلا دی جب کہ کتابیں واقعی میری بہترین دوست تھیں، اس وقت میرا ذہن ایک خاص واقعہ کی طرف منتقل ہو گیا اور ایک ایسے وقت کی یاد تازہ کر دی جسے میں نے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گزارا تھا جو دریائے والگا اور ڈان کی درمیانی ریلوے لائن پر واقع ہے۔

یہ اسٹیشن کھُلی ہوئی فضا میں ایک غیر آباد میدان میں واقع تھا، سردیوں کا ہیبت ناک سکوت سخت خوفناک ہوتا، ہر طرف ہُو کا عالم ہوتا، اس موسم میں اگر سکوت شکن کوئی چیز تھی تو وہ برفانی طوفان تھے جو اکثر آتے رہتے اور جن کی وجہ سے ہوا کی سنسناہٹ تیز ہو جاتی اور درختوں کے پتے شور مچانے لگتے، گرمیوں کا موسم بھی سخت تکلیف دہ ہوتا کیونکہ اس موسم میں مچھر ہمیں بڑی بے رحمی سے کاٹتے، ہر طرف اُداسی اور مُردنی چھائی رہتی، اگر وہاں کچھ آثارِ حیات تھے تو صرف اس قدر کہ چند کترنے والے جانور اپنے بلوں کے ارد گرد بیٹھے کچھ نہ کچھ کترتے رہتے اور شکاری پرندے گرم اور غبار آلود ہوا میں چکر لگاتے رہتے، کبھی کبھی گڈریے اپنی بھدی اور غیر مانوس وضع میں اپنے گلوں کے ساتھ میدان میں سے گزرتے ہوئے دکھائی دیتے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد گڈریوں کی عجیب و غریب "ہو، ہو، ہا، ہا" کی آواز بلند ہوتی اور چند لمحے فضا میں تھرتھرا کر اُسی سکوتِ بہیم میں ڈوب جاتی، اسی علاقے کی ایک وادی میں جو اسٹیشن سے زیادہ دُور نہ تھی کوسک لوگوں کا ایک گاؤں آباد تھا جس کا نام پیکی تھا، گاؤں کی جفاکش اور آزاد عورتیں جاڑوں کے موسم میں ریلوے لائن پر سے برف صاف کرتیں اور اُن کے باپ اور بھائی راتوں کو ریلوے لائن سے ایندھن کے لئے لکڑی یا لائن پر کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سے جو کچھ اُن کے ہاتھ لگ جاتا، چُرا لاتے،

رات کے بھیانک سکوت میں جب کوئی گاڑی اسٹیشن کے سامنے سے گزرتی تو گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ پلیٹ فارم کی مدھم روشنی میں ارتعاش پیدا کردیتی، یہ بے چین کردینے والی یکسانیت محض اُن چند لمحات کے لئے دُور ہوجاتی جب کہ کوئی مال گاڑی ایک خوفناک دیو کی طرح اپنی شعلہ بار آنکھوں سے گھورتی ہوئی اور اپنے تنفس سے آگ برساتی ہوئی رات کی تاریکی میں سے گذرتی یا پھر جب کوئی مسافر گاڑی چند منٹ کے لئے پلیٹ فارم پر آکر ٹھیرتی اور گاڑی کے ٹھیرتے ہی کھڑکیوں میں حسین عورتوں کے چہرے دکھائی دیتے جن کی آنکھوں اور لبوں پر تبسم کھیلتا ہوتا، کچھ دیر بعد گاڑی روانہ ہوجاتی اور ہمارے اندر اُس گھبرادینے والی یکسانیت کا احساس تیز تر کردیتی۔

اسٹیشن پر ہم کل گیارہ آدمی تھے۔ ان میں سے چار ایسے تھے جن کے ساتھ اُن کے اہل وعیال بھی تھے، ہم میں سے ہر ایک دوسرے کی خانگی زندگی سے اچھی طرح واقف تھا، اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ ہماری تنہائی اور بے کیف زندگی ہم کو مجبور کرتی کہ ہم جلد از جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہوجائیں، دفع الوقتی کے لئے ہم لوگ تاش کھیلتے، ووڈکا پیتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بعض اوقات ہم لوگوں کا برتاؤ ایک دوسرے کے ساتھ حد درجہ بے باکانہ ہوجاتا تھا۔

پیٹر اگنٹینچ کلتنوف، نائب اسٹیشن ماسٹر ایک عجیب وغریب فطرت کا انسان تھا، وہ ہمیشہ شراب کے نشہ میں چور رہتا اور ہر موضوع پر بکواس کرتا اور اپنے خیالات کا اظہار عجیب وغریب پیرایہ میں کرتا، اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی ذاتی رائے بھی رکھتا تھا لیکن یا تو وہ اس کا عمداً اظہار نہ کرتا یا اُس کے اظہار پر اُس کو قدرت نہ تھی، وہ اپنے آپ سے اس قسم کے سوالات کرتا "آخر میرا مقصدِ حیات کیا ہے؟ کیا مجھے محض کیڑوں کی غذا بننا ہے؟" لوڈن تار بابو اور میں اکثر آنے والے انقلاب وتغیرات کے متعلق باتیں کرتے۔ ایسے موقعوں پر وہ ہماری گفتگو میں مخل ہوتا "تم لوگ ہر وقت آنے والے انقلابات کے راگ لاپا کرتے ہو — کیسے انقلاب، کہاں کے تغیرات، آج سے دس سال بعد، بیس سال بعد حالات وواقعات ایسے ہی رہیں گے جیسے آج ہیں۔"

وہ نہایت دُبلا پتلا آدمی تھا، اُس کے سر کے بال سُرخی مائل اور سخت تھے اور مونچھیں بہت زیادہ گھنی تھیں، وہ اپنے سر کو ایک خاص انداز سے جنبش دے کر اور اپنی پلکوں کو اپنی کنجی آنکھوں پر جھکا کر عجیب طرح سوال کرتا "وہ کس قسم کا خدا ہے جس پر تم لوگ ایمان رکھتے ہو، اور اُس کی عبادت کرتے ہو؟" اُس کے نزدیک ہربرٹ اسپنسر نے بکواس کی تھی اور اُس کے یہاں صداقت نام کو نہ تھی، ترگنیف اُس کی نگاہ میں ایک گھوڑے کے سوداگر سے بڑھ کر نہ تھا اور روس کے بڑے بڑے اہلِ قلم روسی کہلانے کے مستحق نہ تھے۔

وہ کسی قدر ضدی واقع ہوا تھا اس لئے تم اس کے خیالات کو تبدیل نہ کرسکتے تھے، ایک مرتبہ اُس نے اپنی زندگی کے کچھ واقعات سنائے، اُس نے ہم لوگوں کو بتایا کہ وہ ایک پادری کے گھرانے میں پیدا ہوا، اُس کی تعلیم وتربیت پہلے ٹمبو کے مکتب اور بعدۂ قازان کی یونیورسٹی میں ہوئی، جہاں اُس کو شراب کا چسکا پڑگیا، جب وہ یونیورسٹی میں تھا تو اُس نے ایک دن اپنے پروفیسر کا سمور دار کوٹ اور ہیٹ پہن لیا، جسے رہن رکھ کر وہ ووڈکا پی آیا، "تمہارے خیال میں اُنھوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟" اُس نے اپنی کنجی

آنکھوں کو گردش دے کر پوچھا" اُنھوں نے مجھے اشارۃً اس بات سے آگاہ کیا کہ میرے لئے یونیورسٹی کی زندگی کو خیرباد کہہ دینا ہی بہتر ہے، اور ظاہر ہے کہ میں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد میری زندگی اِدھر اُدھر کے کاموں میں گزری، پھر ایک دن وہ آیا کہ میں نے ایک لڑکی سے شادی کرلی، جس سے میری تمام آزادیوں پر مُہر لگ گئی"

وہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ نہ رکھتا تھا، اس لئے اُس کی بیوی اور اُس میں نہ نبھی اور وہ اسے چھوڑ کر میکے میں بیٹھ رہی۔

کلتنوف کی ایک چھوٹی سی چھ سال کی بچی تھی، جس کا نام ویرا تھا لیکن کلتنوف اپنی پدرانہ محبت کا اظہار کرنے کے لئے اُسے پیترو فنا ویرا کے نام سے پکارتا، وہ اپنے دل میں بچی کے لئے ایک خاص احترام رکھتا تھا جس کا اظہار وہ اپنی شرمیلی فطرت کی وجہ سے نہ کرسکتا، ویرا کا چھوٹا سا چہرہ اُس کے سنہری پریشان بالوں میں چھُپا رہتا، وہ شاذونادر ہی مسکراتی، لوگ اُس کی موجودگی میں آہستہ آہستہ گفتگو کرتے، مائیں اُس کو اپنے بچوں کے لئے ایک اچھا نمونہ سمجھتیں اور اُس کو مثال کے طور پر پیش کرتیں، اُس کو پھُولوں سے خاص اُنس تھا، وہ میدانوں میں تنہا گھومتی پھرتی اور حقیر ترین پھولوں تک کی تلاش میں سرگرداں رہتی، جو اُس بنجر زمین میں دستیاب ہو سکتے، اکثر اوقات وہ ریلوے لائن کے اُس پار پھُولوں کی تلاش میں چلی جاتی، مال گاڑیوں کے ڈبے ایک دوسرے سے جوڑے جاتے ہوتے تو اُس کی پتلی پتلی ٹانگیں جن میں وہ سُرخ موزے پہنے ہوتی انجن کے پہیوں میں سے صاف دکھائی دیتے، لوگ کلتنوف سے شکایت کرتے کہ وہ کیوں اس طرح اپنی بچّی کو انجن کے قریب جانے کی اجازت دے دیتا ہے لیکن وہ اُس بچی کی حفاظت کا انتہائی خیال رکھتے ہوئے بھی باندازِ تجاہلِ عارفانہ جواب دیتا" اوہوں، ہوگا بھی، وہ خود محتاط رہتی ہے" وہ اکثر رات گئے سر سے پیر تک ایک سرمئی شال میں لپٹی ہوئی ایک پر سمیٹے ہوئے چمگادڑ کی طرح مجھے اطلاع دینے آتی کہ اُس کا باپ نشہ میں چوُر ہے، میں اُسے گود میں اُٹھا لیتا، اور اُس کے گھر جا کر اُس کے باپ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتا جس کا چہرہ سُرخ ہوتا، گلا بیٹھا ہوتا اور وہ فرش پر لوٹتا ہوتا، وہ اُس کے پہلو میں بیٹھ جاتی اور اُس کے جھرّیوں دار گالوں کو تھپکی دے کر مغموم لہجہ میں اپنے آپ سے کہتی" میرا غریب باپ، میرا غریب باپ، ہائے یہ کس قدر شرابی ہوگیا ہے!"

یوڈن، اکثر اتار بالو بچی کی حالتِ زار پر افسوس کرتا" اگر میری ماں ہوتی" وہ خود بخود کہتا" یا کوئی بیوقوف عورت ہی مجھ جیسے کبڑے شخص سے شادی کرنے پر آمادہ ہوجاتی تو میں اپنی انتہائی کوشش کرتا کہ ویرا میرے گھر آکر میرے ساتھ رہے۔ کلتنوف کے وہ کس کام کی ہے"

یوڈن اور مجھے کتابوں سے بہت زیادہ دلچسپی تھی، ہمیں چاہے کتنی ہی کتابیں مل جاتیں لیکن ہماری تشنگی اُن سے کبھی نہ بجھتی تھی۔ کتابیں ہمارے لئے ایک ایسا جھروکا تھیں جس کے ذریعہ ہم اپنی اُداس دُنیا سے حقیقی دنیا کی عملی زندگی پر ایک نظر دوڑا سکتے، تھوڑے ہی عرصے میں ہم اُن تمام کتابوں کا مطالعہ کرچکے تھے جو قریب کے اُن چھ اسٹیشنوں پر دستیاب ہوسکیں جو والگا اور ڈان کے درمیان کی ریلوے لائن پر واقع تھے، اس کے بعد ہم نے ایک ذہنی قحط محسوس کرنا شروع کیا، ایسا قحط جس کی اذیت صرف وہ لوگ ہی محسوس کر

سکتے ہیں جو ہمارے ملک کے غیر آباد اور غیر زرخیز خطّوں میں رہتے ہیں، اور اُن کی وادیوں میں سانس لینے کے لئے ہوا تک کو ترستے ہیں، وہاں کوئی چیز بھی ایسی دلچسپ نہ تھی جو ہماری زندگی کی بے حسی کو دُور کر سکتی، میری زندگی کا یہ تلخ ترین دَور تھا۔

کلتنوف ہماری زندگی کی ان تلخیوں سے ایک حد تک واقف تھا لیکن وہ سوائے ہم لوگوں کو پریشان کرنے اور چڑانے کے کچھ نہ کرتا۔

"اوہو! میرا خیال ہے کہ تم پر نزع کا عالم طاری ہے" ان الفاظ میں ایک وزاُس کے صحیح احساسات کا اظہار ہوا۔ اُس نے ہم سے ہمدردانہ طور پر کہا "قلاچ میں میرا ایک ملاقاتی ہے جس کے پاس نئی نئی کتابیں آتی رہتی ہیں اگر تم کہو تو میں اُس سے کوئی کتاب منگوا بھیجوں، بہت ممکن ہے وہ ہمیں کوئی کتاب پڑھنے کو دے دے۔"

ہم نے اُس سے نہایت عاجزی سے درخواست کی کہ وہ ضرور کوئی کتاب منگوائے، اور وہ اس پر راضی بھی ہوگیا۔

چند روز کے بعد مسافر گاڑی کے گارڈ نے کلتنوف کو ایک بنڈل اور ایک خط لا کر دیا "کتاب!" کلتنوف کتاب کو اُچھالتے ہوئے حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے تحت پکار اُٹھا، پھر اُس نے اُس خط کو پڑھا لیکن جونہی اُس نے خط کو ختم کیا وہ اپنی مُونچھوں کو تاؤ دینے لگا، ایک بار اُس نے اپنے ساتھیوں پر تمکنت سے نظریں ڈالیں اور کتاب کو اپنی کہنی کے نیچے اس طرح دبا کر بیٹھ گیا گویا اُسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی اُس سے چھین نہ لے۔

"لائیے لائیے، کتاب تو ہمیں دیجئے" یوڈن نے مسکراتے ہوئے درخواست کی۔

"آخر اتنی جلدی کیا ہے!" کلتنوف نے نہایت سرد مہری سے تحکّم کے انداز میں جواب دیا۔

یوڈن حیرت زدہ ہو کر پیچھے کو ہٹ گیا، آج تک کلتنوف نے اُس سے ایسی بے باک بد لحاظی سے کام نہیں لیا تھا" میں نے اس کتاب کو منگوانے کی تمام زحمت گوارا کی ہے اور سب سے پہلے میں ہی اس کتاب کو پڑھوں گا" کلتنوف نے نہایت ترش رو ہو کر کہا، "تمہاری باری اُس کے بعد آئے گی" اُس نے اُسی سخت لہجہ میں کہا۔

میں نے بھی کلتنوف کے سخت لہجے اور بُرے سلوک کو محسوس کیا، اب تک ہم لوگوں کا یہ دستور تھا کہ ایک ساتھ بیٹھ کر بلند آواز میں کتاب پڑھتے تھے، اگر ہم میں سے کسی کو فرصت ہوتی تو وہ تنہا ہی پڑھ لیتا تھا، اس لئے کتاب تار گھر میں رکھ دی جاتی تھی جہاں سے ہم میں سے ہر شخص اُس کو لے سکتا تھا،

"آخر تم اس قسم کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟" یوڈن نے متعجب ہو کر پوچھا۔

کلتنوف یہ سُن کر اور زیادہ برہم ہوگیا "چپ رہو!" اُس نے چلّا کر کہا "یہ میں اپنی ذاتی منفعت کے لئے پڑھنا چاہتا ہوں نہ کہ بحث و مباحثہ کے لئے، صحیح مطالعہ کے لئے خاموشی اور سکون چاہئے، لیکن تم لوگوں کی عادت ہے کہ پڑھنے میں طرح طرح کے سوالات کرتے جاتے ہو 'ایسا کیوں ہے؛ ویسا کیوں نہیں؛' میں اس قسم کے مطالعہ سے تنگ آگیا ہوں، اب مجھے اس چیز سے سخت کوفت

ہوتی ہے، اس لئے یہاں سے چلے جاؤ ـــــ جاؤ، جہنم میں جاؤ!"

اُس نے کتاب میز کی دراز میں مقفل کردی، جب تک وہ اپنے کام پر رہا اُس نے اپنی زبان سے ایک لفظ تک نہ نکالا، وہ بار بار گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتا گویا اُسے کسی خطرہ کا اندیشہ تھا، جب اپنا کام پورا کرکے وہ گھر جانے لگا تو یوڈن نے اُس سے کہا "اگر تمہیں تکلیف نہ ہو تو سونے سے قبل کتاب کسی ایسی جگہ رکھ دینا کہ مجھے مل جائے، میں وقتاً فوقتاً اُسے لینے کے لئے آیا کروں گا۔"

یہ سُن کر وہ ہنسا لیکن اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

کوئی آدھی رات گئے یوڈن نے مجھ سے کہا "جاؤ، ایک چکر لگا آؤ شاید تمہیں کتاب مل جائے، اب وہ یقیناً سو گیا ہوگا۔"

دوپہر تک سخت بارش ہوتی رہی تھی، اس کے بعد مطلع صاف ہوگیا تھا اور سورج اپنی تمام تمازت کے ساتھ چمک چکا تھا، اس وقت زمین سے بخارات نکل رہے تھے اور شدید حبس ہو رہا تھا، آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے، میرے آگے آگے ایک مینڈک کودتا جا رہا تھا گویا میری رہنمائی کر رہا ہے، اور کہیں دُور سے ریل کی سیٹی کی آواز آرہی تھی، پمپ روم سے 'بھینگے' یہودی فائرمین کے گانے کی دھیمی آواز آرہی تھی، جس کے لبوں پر ایک مستقل اُداس تبسم رہا کرتا تھا۔

کلتنوف کے کمرے کی کھڑکی سے زرد روشنی آرہی تھی، یہ مدھم روشنی لکڑیوں کے کندوں کے ایک ڈھیر، چنار کے درخت اور آس پاس کی زمین پر پڑ رہی تھی، ململ کے باریک پردے میں سے جو کھڑکی میں پڑا ہوا تھا کلتنوف کا جسم صاف نظر آرہا تھا، وہ میز پر کہنیاں رکھے شب خوابی کے لباس میں بیٹھا ہوا اپنی اُنگلیوں سے اپنے سُرخ بالوں میں کنگھی کر رہا تھا، اُس کی لانبی اور نوکدار ٹھوڑی تھرتھرا رہی تھی، اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اور اُس کتاب پر گر رہے تھے جو اُس کی کہنیوں کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی، اس کے آنسو ایک ایک کرکے گر رہے تھے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آنسوؤں کے کتاب پر گرنے کی دھیمی آواز میرے کانوں میں آرہی ہے،

آہ! وہ کس قدر تکلیف دہ منظر ہوتا ہے جب کہ کسی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوں،

میز پر ایک لیمپ رکھا تھا، قریب ہی ووڈکا سے بھری ہوئی ایک بوتل جس کا کاگ ہنوز نکالا نہ گیا تھا، رکھی تھی، میز کے ایک سرے پر پلیٹ میں تربوز کی ایک قاش رکھی تھی، ایک آرام کرسی پر ویرا پڑی سو رہی تھی، جس کا مُنہ اس طرح کھلا ہوا تھا گویا وہ حیرت زدہ ہے، مکان کا باقی اندرونی حصہ ایسا ہی تاریک تھا جیسی کہ باہر کی فضا،

کلتنوف یک بیک کھڑا ہوگیا اور کھڑکی کے قریب آیا، اُس کا چھوٹا اور غیر وضع چہرہ آنسوؤں سے تر ہونے کی وجہ سے اور بھی چھوٹا اور دُھندلا نظر آرہا تھا، وہ کتاب کو لیمپ کی بتی کی لو کے قریب لے گیا تاکہ آنسوؤں سے تر شدہ اوراق خشک ہو جائیں، ایک بار یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آیا وہ خشک ہوگئے اس نے کتاب کے اوراق پر ہاتھ پھیرا، اور تھوڑی دیر اور آنچ دے کر کتاب کو بند کر دیا۔

پھر میں وہاں سے چلا گیا کیونکہ مجھے ایک آنے والی گاڑی دیکھنی تھی، جب گاڑی چلی گئی تو میں نے یوڈن سے کہا "وہ اب تک اسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھا۔"

"وحشی کہیں کا" یوڈن نے گاڑی کی روانگی کی اطلاع دینے کے لئے تار کے آلہ پر انگلیاں مارتے ہوئے جھنجھلا کر کہا "وہ اپنے آپ کو کامریڈ کہتا ہے! ہم لوگ اسی وقت تک کامریڈ ہیں جب تک کسی ترقی کی توقع ہوتی ہے، اور پھر کوئی کامریڈ نہیں رہتا۔"

طلوع آفتاب سے قبل میں ایک بار پھر اس کی کھڑکی کے پاس گیا، اور پردے میں سے جھانک کر کمرے کے اندر دیکھا، لیمپ گل ہو چکا تھا، پیتل کے شمع دان میں ایک موم بتی جل رہی تھی، شراب سے بھری ہوئی بوتل پر موم بتی کا سایہ کچھ اس طرح پڑ رہا تھا کہ ایک اور موم بتی کے وجود کا دھوکا ہو رہا تھا، کلتنوف سو رہا تھا، اس کا بے حرکت سر اس کے سینے پر جھکا ہوا تھا، اس کے ہاتھ اس کے ٹخنوں پر ڈھیلے پڑے ہوئے تھے، وہ آرام کرسی جس پر ویرا سو رہی تھی، اب خالی تھی، کمرہ پہلے سے زیادہ تاریک تھا، کتاب بند تھی اور کھڑکی کی دہلیز کے قریب ایک میز کے کونے پر رکھی ہوئی تھی، میں نے نہایت آہستہ سے پردے کو پھاڑ کر کتاب اٹھانے کو اندر ہاتھ ڈالا، یکایک کلتنوف چونک کر کھڑا ہو گیا، شمع دان اٹھا کر پھینکنے کے لئے گھمایا اور نہایت بہیمانہ انداز میں چلا کر کہا،

"چلے جاؤ! ورنہ جان لے لوں گا!"

موم بتی بجھ گئی لیکن اس کے بجھتے وقت میری نگاہیں ایک خشمناک چہرے پر پڑیں جو اسی لمحہ (شمع کے بجھ جانے کی وجہ سے) تاریکی میں گم ہو گیا، ایک دو لمحہ بعد اس نے آہستہ مگر سخت الفاظ میں پوچھا "تم کون ہو؟" "میں ہوں، میں، میں تمہارے پاس کتاب لینے آیا ہوں، کیا تم دے سکتے ہو۔"

"نہیں، میں تمہیں کتاب ہرگز نہ دوں گا۔"

جب میں واپس ہوا تو آفتاب طلوع ہو رہا تھا، صبح کی سپیدی میں دور افق کے قریب ایک سوار کی شکل دھندلے طور پر نظر آ رہی تھی، بھیڑوں کا ایک گلہ سیاہ بادل کی طرح گزر رہا تھا، لیکن یہ مناظر ہمارے لئے کوئی نئے نہ تھے، ہمیں ضرورت تو صرف کتاب کی تھی کیونکہ صرف کتاب ہی ایسی چیز تھی جو ہماری اداس زندگی میں ایک تازہ روح پھونک سکتی تھی،

کلتنوف کی حالت ناقابلِ برداشت اور تباہ ہو رہی تھی، جیسے وہ خود بھی سمجھتا تھا، ہمیں اس سے نفرت ہو گئی تھی یہاں تک کہ اس کی لڑکی سے کچھ زیادہ دلبستگی نہ رہ گئی تھی، ایک بار جب وہ دوڑی ہوئی یوڈن کے پاس آئی میں نے اسے دھتکار دیا، اس کے حسین چہرے پر مایوسی کا ایک ہلکا سا پردہ پڑ گیا، کلتنوف نے یہ سب کچھ دیکھا اور مشتعل ہو کر پوچھا "کیا تم کتاب پڑھنا چاہتے ہو؟ تم ضرور چاہتے ہو گے مگر میں تمہیں کتاب تو ہرگز نہ دوں گا۔"

یوڈن یہ سن کر آگ بگولا ہو گا، اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اس نے غصے میں چیخ کر میری طرف مخاطب ہو کر کہا: "اب اگر یہ کتاب

خود دیں تو بھی ہم ہرگز نہ لیں گے، میں واقعی کہتا ہوں کہ اب ہرگز نہ لیں گے"۔

"بہت بہتر ہے!" میں نے اُس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم واقعی میری رائے کی تائید کرتے ہو؟"

"بیشک مجھے تمہاری رائے سے اتفاق ہے"۔

یہ تمام واقعات رفع دفع ہو گئے، ایک دن صبح کلتنوف جب کام پر آیا تو اُس نے یوڈن کی طرف وہی کتاب پھینکتے ہوئے کہا۔

"لو یہ لو، اب جب تک دِل چاہے پڑھو!"

اُسی لمحہ یوڈن نے کتاب کی ورق گردانی شروع کردی، شام کے وقت ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کتاب پڑھی، کتاب میں ایک نیک عورت کا ذکر تھا جس کی شادی ایک نہایت اوباش اور نکمے شخص کے ساتھ ہوئی تھی، وہ ایسا شوہر تھا جس کے ساتھ وہ گزار نہ کر سکی اور جس سے کنارہ کش ہو کر اُس نے اپنی باقی زندگی عوام النّاس کی خدمت میں صرف کردی،

میں متحیّر تھا، کیا کلتنوف کے رونے کی وجہ یہی تھی،

یکایک کلتنوف شراب کے نشہ میں چُور ڈگمگاتے ہوئے کمرے میں داخل ہؤا، اُس نے کتاب کو پکڑتے ہوئے کہا "خبردار . . . . اسے . . . . ہر ہر ہرگز . . . . . نہ . . . . . پڑھنا"

وہ بدمست ہو رہا تھا، اُس کی سُرخ مخمور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی، اُس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اُس نے چیخ کر کہا "دے دے . . . . دیکھو . . . . اسے . . . . ما، ما . . . . مت . . . . . پڑھو . . . . میں، میں . . . . تم . . . . سے سے . . . . کہتا ہوں، . . . . . وہ کیا جانیں . . . . نہیں کوئی نہیں سمجھ سکتا . . . . کوئی نہیں . . . . یہ ادیب کیا جانیں . . . . . کوئی نہیں . . . . . . "

وہ لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا، اپنے ہاتھوں کو ہماری طرف پھیلا کر بڑبڑایا:-

"خاموش! . . . . . ما . . . . ما . . . . مت . . . . پا . . . . پا . . . . پڑھو!"

دروازے میں کلتنوف کے پیچھے معصوم بچی ویرا پیتروفنا کھڑی تھی، برہنہ پا، فراک کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور وہ اس کے ایک شانے سے اُتر آئی تھی، اُس کے سنہری گھونگروالے بال اوپر کو اُٹھے ہوئے شمع کی لَو کے مانند معلوم ہوتے تھے، وہ گم سُم کھڑی تھی اور اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا،

"آپ نے میرے باپ کے ساتھ ایسا بُرا سلوک کیوں کیا؟"

(میکسم گورکی) مشاہد لطیف

اتحادی غزل

آج کل اُردو ہندی کی ناگوار بحث سے ملک کی ادبی فضا اس قدر مکدر ہو رہی ہے کہ کوئی اتحاد دوست اور ادب آشنا ہوا خواہِ وطن اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اسی احساس کے اثر سے ذیل کی غزل لکھی گئی ہے، اور یہ صرف میرے ذاتی احساس کا اظہار نہیں بلکہ ملک میں جو عام طور پر ادب و اتحاد کا ماتم ہو رہا ہے۔ یہ بھی اسی کی آواز بازگشت ہے۔ سیاسی ہیجان بھائی کو بھائی سے اور مرید کو مرشد سے جدا کر رہا ہے۔ اور ایک یہ ٹانکا جو زبان کا باقی رہ گیا تھا اب وہ بھی اُدھیڑا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندو مذہب اور کلچر کے لئے ہندی اور سنسکرت زیادہ موزوں ہیں اور مخصوص مسلم تمدن کے لئے عربی و فارسی۔ مگر اس کو چھوڑ کر ہمارے تمام ادبی، معاشرتی، اقتصادی و سیاسی وغیرہ بے شمار اغراض مشترک ہیں اور ان کے لئے اب تک اُردو شمالی ہندوستان کی مشترکہ زبان رہی ہے اور بہت سے نامور ادبا، وطن کے جواہر افکار اور کئی سو سال کی مسلسل کوشش سے اس زبان میں ایک قابلِ قدر ادبی سرمایہ جمع ہو گیا ہے کیا اب اس کو دریا برد کرنا ضروری ہے اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ اب تک برادرانِ وطن کو اس زبان سے جو تعلقِ خاطر رہا ہے وہ بدستور قایم رہے اور عَلَمِ جہاد اس کے خلاف بلند نہ کیا جائے۔

علاوہ ادبی اغراض کے اس وقت سب سے اہم مسئلہ محبانِ وطن کے لئے یہ ہے کہ عام طور پر ہمارے اہلِ وطن اپنی تنگ نظری اور جاہلانہ تعصبات کی وجہ سے ہر کام کے لئے الگ الگ ادارے قایم کر رہے ہیں اور صرف ادبی اتحاد کی ایک کشش باقی رہ گئی ہے جو عزیزانِ وطن کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لا سکتی ہے۔ ہمارے سیاسی لیڈر جو اختلافِ السنہ کے اہم تاثرات سے واقف نہیں، وہ نینوا کی بربادی کا حال تاریخوں میں دیکھ لیں:—

کسی کے عشق کا لپکا لگا لیا نہ کرے — تو کیا کرے کوئی دُنیا میں اور کیا نہ کرے

کہا طبیب نے آ کر یہ میری بالیں پر — یہ درد وہ ہے کہ جس کی کوئی دوا نہ کرے

کوئی مہاتما گاندھی سے جا کے عرض کرے — کہ جنگ لشکرِ اُردو سے برملا نہ کرے

کرے وہ وصل کی باتیں، نہ فصل کی باتیں — یہ اس کا "پھرج[1] ہے" اُس کو بھلا دیا نہ کرے

[1] یہ لفظ مہاتما جی کی ایک تقریر سے لیا گیا ہے۔

اِس ایک ٹانکے کو گاندھی نے گر اُدھیڑ دیا
تو پھر قبائے وطن کو کبھی سِیا نہ کرے

"مہا پُرش" بھی جو کرنے لگیں دھڑا بندی
مہاتماؤں کی پُوجا کوئی کیا نہ کرے

زبانِ عشق لبوں پر جو اُس کے آ نہ سکے
تو برہمن سے کہو پریم کی کتھا نہ کرے

جو ہم زبانیٔ مسلم سے مالوی کو ہے عار
تو سوانگ قوم پرستی کا وہ بھرا نہ کرے

عجب یہ اُن کی عدالت کا تازہ فرماں ہے
کہ آشنا سے کوئی بات آشنا نہ کرے

جو حال یہ ہے تو کوئی غیور قوم پرست
اِس اتّحاد کے پھندے میں اب پھنسا نہ کرے

جو راز داں بھی نہ ہو اور ہم زباں بھی نہ ہو
وہ اِن کی بزم میں آنے سے کیوں اِبا نہ کرے

بتوں کو ضد ہی کہ کاٹینگے شیخ جی کی زباں
کہ بتکدہ میں وہ شورِ حرم بپا نہ کرے

یہ کہیئے ملک کے معمار سے کہ بہرِ خُدا
ہزار سالہ بناؤں کو ڈھا دیا نہ کرے

وہ چاہتے ہیں کہ کیفیؔ سے اور بکسرؔ سے
مشاعرہ میں بھی ناظرؔ کہیں مِلا نہ کرے

طوافِ کعبہ میں ناظرؔ بھی آج حاضر ہے
کہیں بتوں سے نہ پھر جائے، یہ خدا نہ کرے

خوشی محمد ناظرؔ

ترقی پسندوں سے دو دو باتیں

جناب مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد

ترقی پسند ادیبوں کا پہلا جلسہ ماہ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں ہوا تھا۔ شعبۂ اردو کی صدارت کے لئے انہوں نے مجھے طلب کیا تھا میں جانے کے لئے تیار تھا لیکن میں وقت پر ایک ناگزیر وجہ سے شریک نہ ہو سکا۔ اس جلسہ کے لئے جو خطبہ میں نے لکھا تھا۔ وہ اب شایع کیا جاتا ہے۔

میرے نوجوان رفیقو اور دوستو!

آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ ایک بڈھا کہیں جا رہا تھا۔ چلتے چلتے راستے میں ٹھوکر لگی اور گر پڑا۔ اس وقت بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا "ہائے رے جوانی" پھر جھٹ اٹھ کر ادھر ادھر نظر ڈالی اور جب دیکھا کہ کوئی نہیں ہے تو کہنے لگا "جوانی ہی میں کون سے تیر مارے تھے"۔ جب میں ایسے قابل جوانوں کی جماعت اپنے سامنے دیکھتا ہوں جیسی کہ اس وقت میرے سامنے ہے تو مجھے وہ شریف بڈھا یاد آتا ہے ایک دو بار نہیں بارہا میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ پہلے کے نوجوان (یعنی تیس چالیس برس پہلے کے) زیادہ قابل ہوتے تھے۔ میں نے اس کی ہمیشہ تردید کی۔ بات یہ ہے کہ انسان طبعاً گذشتہ سے بہت حسن ظن رکھتا ہے، اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو تو بھول جاتا ہے اور خوبیاں یاد رہ جاتی ہیں مثلاً یہی وجہ ہے کہ سارے ہندوستان میں بچوں کا کوئی اچھا مدرسہ نہیں۔ بچپن میں جو ہمیں قدم قدم پر مشکلات پیش آئی تھیں بڑے ہو کر بھول گئے اور یاد رہا تو یہ کہ مکتب میں خوب پٹتے تھے اور جب ہمیں پڑھانے کا موقع ملا تو ہم نے بھی خوب کان اینٹھے اور قمچیاں لگائیں۔ یہ کچھ انسان کی فطرت سی ہو گئی ہے کہ گذشتہ کو سراہتا اور حال کو سراپتا ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آج کل کے نوجوانوں میں جو عقل و شعور اور مستعدی ہے وہ میرے طالب علمی کے زمانے میں نہیں تھی۔ اس لئے مجھے آپ کی جوانی پر نہیں، آپ کی ذہانت، طباعی اور مستعدی پر رشک آتا ہے میں جب کسی قابل نوجوان کو دیکھتا ہوں تو میرا جی باغ باغ ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی مجھے یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش اس عمر میں اگر مجھ میں اتنی قابلیت ہوتی تو میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن گیا وقت اور خاص کر جوانی کبھی واپس نہیں آتی تو پھر میں نے گذشتہ کی تلافی نہیں بلکہ کفارہ کی یہ تدبیر سوچی کہ بدنصیبی سے جب میں خود کچھ نہیں کر سکا تو لاؤ میں نوجوانوں کی خدمت کیلئے نہ کروں جو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ سا جو! یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے ارشاد پر آپ کی خدمت میں اس طرح کھنچا چلا آیا جیسے حاتم طائی کے قصے میں بعض جانثار کوہ ندا کی صدا پر کھچے چلے جاتے تھے۔

ادب ہو یا زندگی کا کوئی اور شعبہ اس میں ترقی پذیری کی قوت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک اس میں تازگی، جدت اور توانائی پائی جاتی ہے۔ اور تازگی اور جدت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ہمارے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد ہو جس پر ہمارا ایمان ہو اور جس کے حصول کے لئے ہم ہر قسم کی قربانی کے لئے آمادہ ہوں۔ جب کوئی خاص مقصد پیشِ نظر نہیں ہوتا تو جدت، تازگی اور توانائی بھی رخصت ہو جاتی ہے۔

اور زندگی کے کاموں میں یکسانی اور مساوات سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک ہی لکیر کو پیٹتے پیٹتے انسان اُکتا جاتا ہے۔ اور اس بیزاری کے عذاب سے بچنے کے لئے وہ عیاشی اور طرح طرح کی لغویات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس وقت آثارِ حیات گھٹنے لگتے ہیں۔ قویٰ میں انحطاط پیدا ہونے لگتا ہے۔ دل میں اُمنگ نہیں رہتی۔ دل و دماغ کے ابھارنے کے لئے طرح طرح کے محرکات استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن وہ سب عارضی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ آخر اسی عالمِ نیم جانی میں اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ اصول افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبے پر صادق آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ روما کی عظیم الشان سلطنت کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اہلِ روما جو کچھ کرنا تھا کر چکے اور ان کے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد نہیں رہا تھا۔ اس لئے وہ لہو و لعب اور عیاشی میں مبتلا ہو گئے۔ اولوالعزمیاں جاتی رہیں۔ حوصلے پست ہو گئے۔ کاہلی میں جس کا دوسرا نام عیاشی ہے، مزہ آنے لگا۔ انحطاط نے استقبال کیا اور زوال نے انہیں لے جا کر دفن کر دیا۔

ہمارے اصول، عقائد اور خیالات کیسے ہی اعلےٰ کیوں نہ ہوں اور خواہ وہ ہمیں کیسے ہی عزیز کیوں نہ ہوں۔ اگر زمانے کے اقتضا کے مطابق ان میں جدت اور تازگی نہیں پیدا کی جائے گی تو ایک روز پانی کی طرح ان میں سڑاند پیدا ہونے لگے گی اور ان میں ایسے زہریلے جراثیم پیدا ہو جائیں گے جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوں گے۔ بندریا کو اپنے بچے سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ بچہ مر جاتا ہے، تو بھی اسے جدا نہیں کرتی اور اپنے سینہ سے چپٹائے پھرتی ہے۔ آخر اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا ایک ایک عضو گل سڑ کر گرنے لگتا ہے۔ یہی حال افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبے کا ہوتا ہے جب لوگ اپنے مرغوب رسم و رواج اور توہمات کو سینے سے چپٹائے پھرتے ہیں تو وہ تو خیر زمانے کے دستور سے گل سڑ کے گر ہی جاتے ہیں مگر وہ خود بھی انہی کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں۔

ایک شخص کو تسخیرِ جن کا بہت شوق تھا اور اس کا عمل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اُسے ایک عامل ملا۔ بڑی خوشامد اور خدمت کے بعد یہ عمل سکھایا۔ سنا ہے کہ یہ عمل بہت سخت ہوتا ہے اور اکثر اس میں جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس نے شوق کی دھن میں یہ سب تکلیفیں سہیں اور جن کو تسخیر کر کے رہا۔ جن دست بستہ حاضر ہوا اور کہنے لگا "فرمائیے کیا ارشاد ہے۔ جو حکم ہو گا اُسے بسر و چشم بجا لاؤں گا۔" عامل صاحب بہت خوش ہوئے اور اُنہوں نے اپنی دانست میں بڑے بڑے مشکل کام اسے بتائے۔ جن نے جھٹ پٹ کر دیئے اور اور کام لینے کے لئے حاضر ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ جن کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ ہر وقت اس کے لئے کچھ نہ کچھ کام ہونا چاہئے۔ اگر کام نہ دیا جائے تو وہ ستانا شروع کر دیتا ہے اور شرارتیں کرنے لگتا ہے۔ عامل صاحب کچھ نہ کچھ کام دیتے رہے مگر اس جن کے لئے جو ہر وقت "ہل من مزید" کی صدا دیتا تھا اتنے کام کہاں سے لاتے۔ اب جن نے انہیں ستانا شروع کیا اور وہ بہت پریشان ہوئے۔ آدمی تھے ذہین۔ انہیں ایک تدبیر بہت خوب سوجھی کہا کہ ہمارے صحن میں جو املی کا درخت ہے اس پر اُترو اور چڑھو اور چڑھو اور اُترو اور جب تک ہم حکم نہ دیں برابر اُترتے چڑھتے رہو۔ کچھ دن تو وہ اُترتا چڑھتا رہا۔ لیکن کب تک آخر اس قدر عاجز اور تنگ آ گیا کہ چیخ اُٹھا اور عامل صاحب کی دُہائی دینے لگا کہ خدا کے لئے

مجھے اس عذاب سے بچائیے۔ آپ جو کہیں گے وہی کروں گا۔ عامل صاحب نے حکم دیا کہ اب اُترنا چڑھنا بند کردو۔ جب ہم کسی کام کا حکم دیں اسے کرو ورنہ چپ چاپ یہاں بیٹھے رہو۔ بیکار بیٹھے بیٹھے وہ اُکتا جاتا تو شرارت کی سوجھتی، مگر فوراً املی کے درخت کا خیال آتا تو وہیں دبک کر بیٹھ جاتا۔ اب بیکاری کی وجہ سے جنّ صاحب کا یہ حال تھا کہ کونے میں بیٹھے اونگھا کرتے اور مُنہ پر مکھیاں بھنکتی رہتی تھیں۔

یہ قصّہ جھوٹ سہی، لیکن سبق آموز ہے۔ اوّل یہ کہ کام کی یک رنگی اور یکسانی ایسی بدبلا ہے کہ جن جیسی ہستی جس میں توانائی اور مستعدی کوٹ کوٹ کے بھری ہو وہ بھی اس سے عاجز آجاتی ہے، دوسرے بیکاری انسان کے قویٰ کو مضمحل اور بیکار اور شوق اور اُمنگ کو خاک میں ملادیتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں حیات کی دشمن ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ توانائی آدمی کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ اس کا اقتضا ہے کہ کچھ نہ کچھ کیا جائے، یہ انسان کی تمیز اور شعور پر ہے کہ کونسا ایسا کام کرے جو ممدِ حیات ہو اگر وہ املی کے پیڑ ہی پر اترتا چڑھتا رہا تو سمجھو کہ کھو یا گیا۔

ممدِ حیات وہ کام ہیں جن میں تازگی اور جدت ہوتی ہے اور جو اپنے اثر سے لوگوں کے خیالات اور عمل میں تازگی اور جدت پیدا کرتے اور نئی راہیں سُجھاتے ہیں اور شوق کو مُردہ نہیں ہونے دیتے۔ آپ نے ادب کو اپنا مقصد قرار دیا ہے یہ بھی ممدِ حیات کاموں میں سے ہے۔ اس سے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ دلوں میں اُمنگ اور خیالات میں انقلاب پیدا کرسکتے ہیں۔ زندگی کو زیادہ پُرلطف اور زیادہ کارآمد بنا سکتے ہیں اور ملک و قوم کو ترقی کے راستے پر لگا دینے میں مدد کرسکتے ہیں لیکن ادب وہی کارآمد ہوسکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے جو اپنے اثر سے حرکت پیدا کرنے کی قوت رکھتا ہے اور جسمیں زیادہ سے زیادہ اشخاص تک پہنچنے اور ان میں اثر پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ ترقی پذیر ادب کی یہی تعریف ہوسکتی ہے۔

لیکن ترقی کا راستہ بہت دشوار گزار، تنگ اور کٹھن ہے، یہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ بڑے صبر و استقلال اور بہت پتّا مارنے کا کام ہے۔ باوجود ان اوصاف کے وہ حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آزادی نہ ہو۔ ترقی سرزمینِ آزادی ہی میں پھول پھل سکتی ہے۔ ادب کو اگر آزادی نہیں تو اس کی حالت مفلوج کی سی ہے۔ ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی ہونی چاہیئے کہ جو چاہے لکھے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے "بھونڈے پن" کے لفظ میں ادب کے ظاہر اور باطن دونوں کی قباحتیں آجاتی ہیں۔ اگر اس سے بچنا ممکن ہے تو وہ ادب قابلِ مبارکباد ہے۔ ترقی پسند مصنفین کو یہ نکتہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے ورنہ ان کی بہت سی محنت اکارت جائے گی۔

آپ کو اپنے خیالات صرف تعلیم یافتہ طبقے تک محدود نہیں رکھنے چاہئیں بلکہ اس کثیر طبقے تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے جو ان سب نعمتوں سے محروم ہے جو آپ کو حاصل ہیں تعلیم عام نہ ہونے سے اس میں آپ کو بہت دشواری پیش آئے گی لیکن پھر بھی ان کا خیال مقدم ہے اس لئے کہ ان کے دلوں میں جو ابھی بہت سی آلائشوں سے پاک ہیں ان خیالات کا جمانا آسان ہے بہ نسبت اِن لوگوں کے جو کہلاتے تو تعلیم یافتہ ہیں مگر دلِ زنگ آلودہ ہیں۔ اس پر آپ کو اپنی کانفرنس میں جو غور کرنا ہوگا یہ نہایت دشوار کام ہے اور اس کام کو انجام دینے والے بہت مشکل سے ملیں گے۔

زندگی مسلسل ہے اسی طرح ادب بھی مسلسل ہے اس لئے گذشتہ کا مطالعہ حال کے سمجھنے میں اور ماحول کا مشاہدہ، حال کی اصلاح اور آئندہ

کی تیاری میں مدد دے گا ممکن ہے کہ زندگی کے بعض شعبوں میں سراسر تخریب اور استیصال کارآمد ہو یعنی جب تک ہر پرانی چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیا جائے نئی تحریک سرسبز نہیں ہو سکتی۔ اس کی مثال عموماً یہ دی جاتی ہے کہ جب تک پرانا بوسیدہ مکان بالکل نہ ڈھا دیا جائے نئی تعمیر نہیں بن سکتی۔ یہ تشبیہ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں ٹھیک ہو لیکن ادب کے معاملہ میں یہ کامل طور پر منطبق نہیں ہو سکتی۔ ترقی کے لئے تخریب ضروری مگر لازم نہیں۔ ادب میں بے شک آپ کو نئے اسلوب، نئے خیالات پیدا کرنے ہونگے اور بہت سے پرانے مضر خیالات اور توہمات کی بیخ کنی کرنی ہوگی، سوکھی شاخیں چھانٹنی ہوں گی اور مرجھائی ہوئی ٹہنیوں کو پانی دے دے کر پھر ہرا کرنا ہوگا اور درخت کی جڑ میں کھاد اور پانی ڈال کر سرسبز کرنا ہوگا تاکہ نئی کونپلیں اور نئے پتے پھوٹیں لیکن اگر آپ درخت ہی کو جڑ سے کاٹ ڈالیں گے تو کام کا موقع کہاں رہے گا۔ ہمیں پچھلوں کے کام اور ان کی محنتوں سے حسب ضرورت ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے اور ایسے ادب کی بنیاد ڈالنی چاہئے جو ہماری زندگی میں تازگی پیدا کرے اور ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہو اور پھر آئندہ آنے والے اپنی نئی ضروریات اور حالات کے مطابق اس میں ترمیم اور اصلاح کریں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے۔

مجھے معاف فرمائیے گا میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جو دل میں ہے وہ بیان میں نہیں آتا۔ ممکن ہے وہ یہ جواب دیں کہ ہمارے خیالات اس قدر اعلیٰ ہیں کہ عام فہم سے بالا ہیں۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا اور غالباً کوئی بھی تسلیم نہ کرے گا۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ کیوں ایسا ہے۔ یہ ایک عام اور معمولی بات ہے لیکن کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ ہر پرانی چیز بری نہیں اور ہر نئی چیز اچھی نہیں ہوتی۔ رجعت یا ترقی کوئی نئی چیز نہیں۔ رجعت پسند اور ترقی پسند ہر زمانے میں ہوئے ہیں، اب ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ رجعت اور ترقی اضافی چیزیں ہیں، کائنات کا ہر ذرہ حرکت میں ہے اور ہر چیز پر تغیر کا عمل جاری ہے۔ رجعت یا ترقی ہر زمانے کے حالات اور ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ ہر چیز جس کا تعلق گذشتہ زمانے سے ہے سراسر رجعت سے آلودہ ہے صحیح نہیں۔ محض ہم اس بنا پر کہ ہم لوگ آگے بڑھ گئے ہیں گذشتہ سے اپنا تعلق بالکل قطع نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا کرنا اپنی جڑیں کاٹنا ہے۔ ہم گذشتہ کے وارث ہیں۔ اگر کوئی وارث اپنے ارث سے بے خبر ہے یا کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتا تو خواہ وہ کیسا ہی ذہین، مستعد اور انقلاب پسند کیوں نہ ہو نہ کوئی اصلاح کر سکتا ہے، نہ خود فائدہ حاصل کر سکتا ہے اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، اس لئے ہر ترقی پسند ادیب کا فرض ہے کہ گذشتہ تاریخ اور گذشتہ ادب کا غور سے مطالعہ کرے اور دیکھے کہ ہمارے ادب میں کہاں تک آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ کن چیزوں کا ترک کرنا مناسب ہے اور کن ذرائع سے اسے بلند مقام تک پہنچانے کی ضرورت ہے کیونکہ جو چیز آپ کو ارثاً ملی ہے۔ اگر آپ اس کے حسن و قبح سے واقف نہیں تو اصلاح کس کی اور انقلاب کیسا؟ لیکن "میراث پدر خواہی علم پدر آموز" ہی کافی نہیں۔ علم پسر آموز بھی لازم ہے۔ ہم صرف حال کے ہی سامنے جواب دہ نہیں۔ آئندہ کے بھی جواب دہ ہیں۔ اس لئے زندگی کے جس شعبے میں بھی ہم ہاتھ ڈالیں۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہمارے اعمال و افعال کا اثر آئندہ نسلوں پر کیا ہوگا۔ کیونکہ آئندہ زمانہ میں ہمارے کاموں کی تنقیح و تنقید اسی اصول پر ہوگی۔

دوسری چیز جو آپ کے قابلِ غور ہے یہ ہے کہ جس زبان میں آپ اپنے خیالات ادا کرنا چاہتے ہیں، اس پر پوری قدرت ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب ہم اپنے گذشتہ ادب کو اس نظر سے مطالعہ کریں گے۔ زبان کیا ہے؟ خیال کے ادا کرنے کا آلہ۔ اگر کسی کاریگر کا اوزار بھدا ہے تو اس کا کام بھی بھدا ہوگا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہماری زبان میں ہمارے خیالات سما نہیں سکتے۔ کوئی زبان ایسی نہیں جس میں خیال ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو بشرطیکہ کسی میں ادا کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ زبان بھی ارتقائی ہے۔ اور جب تک ہم اس پر قدرت نہ حاصل کریں گے اپنے خیالات ادا کرنے پر قادر نہ ہوں گے۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے خیال کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس خیال کو ہم نے ادا کرنے کی کوشش کی ہے شاید وہ ہمارا نہیں۔ اصل نہیں نقل ہے شاید مستعار ہے کہیں سے بہتا ہوا چلا آیا ہے۔ ہمارے دل پر اس کا گہرا نقش نہیں۔ اس نے ہمارے دل میں گھر نہیں کیا۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ ادا نہ ہوتا۔ خیال اپنا ہو یعنی جسے ہم نے خود سوچ کے پیدا کیا ہے یا کسی دوسرے کا لیکن ہمارے دماغ میں اس قدر صاف اور روشن ہونا چاہئے کہ جس وقت ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحہ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلکتا ہوا نظر آئے لیکن جب ہمارے دماغ میں صاف اور روشن نہیں ہوتا تو بیان لامحالہ تاریک اور مبہم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ادیب اپنی زبان کی صرف و نحو اور لغت سے واقف ہوتا ہے لیکن اس میں سب سے بڑی چیز لفظ کا صحیح استعمال ہے۔ اسے معمولی بات نہیں سمجھنا چاہئے۔ لکھنے والوں میں کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ لفظ ایک بڑی قوت ہے اور اس کا برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کر دیتا ہے۔ جو اس گُر سے واقف نہیں اور لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال کو نہیں جانتا، اس کا بیان اکثر ناقص، ادھورا اور بے جان ہوتا ہے۔

یہ دو چیزیں ہیں ایک ادب کا ظاہر یعنی زبان اور دوسرے ادب کا باطن یعنی خیال۔ اگرچہ ان کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہو سکتیں۔ یہ لازم و ملزوم ہیں۔ انہی کے میل سے اسلوب بیان یعنی اسٹائل بنتا ہے اس لئے ترقی پسند نوجوانوں کی خدمت میں میری یہ عرض ہے کہ وہ اپنے ادب اور زبان کا گہرا مطالعہ کریں ورنہ ان کی سادہ کوششیں رائیگاں جائیں گی اور ان کے خیالات کیسے ہی بلند اور انقلاب انگیز کیوں نہ ہوں۔ پت جھڑ کی طرح ہوا میں بکھر جائیں گے۔

ادب و زبان کے علاوہ جو ایک بات میں آپ کی خدمت میں عرض کرنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ترقی پسند جماعت کو اپنے مقاصد کے عمل میں لانے کے لئے اخلاقی آزادی اور اخلاقی جرأت سے کام لینا پڑے گا۔ اگر آپ نے مقبولیت اور ہر دلعزیزی یا کسی قسم کی امداد حاصل کرنے یا اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کی خاطر ذرا بھی رجعت پسندی کی طرف میلان ظاہر کیا تو یاد رکھئے کہ معقول پسند اور حقیقی ترقی پسند لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے اور اگر ابتدا میں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی تو اس کے رفع کرنے میں بڑی مدت درکار ہوگی۔ بنیاد اگر بگڑ گئی تو عمارت کا خدا حافظ ہے۔ آپ کے ایک قابل رکن کا یہ کہنا کہ ہم بعض حضرات کی رجعت پسندی سے ناواقف نہیں ہیں مگر ابھی ہم میں اتنی

مطبوعات

عروسِ ادب:۔ یہ مصورِ حقیقت جناب قاضی عباس حسین صاحب ظریفؔ دہلوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔کل چودہ مضامین ہیں ان میں سے بعض مضامین ملک کے مشہور رسائل میں چھپ کر مقبول ہو چکے اور بعض غیر مطبوعہ ہیں۔ قاضی صاحب کی زبان سلیس اور شُستہ ہے، اور جابجا لطیف مزاحیہ اشارات نے کتاب کو کشتِ زعفران بنا دیا ہے۔ فرصت کے اوقات کو لطف سے گزارنے کے لئے یہ کتاب بہت اچھی ہے۔ اُمید ہے کہ اہلِ شوق قدر کریں گے۔ قیمت عہ۔ ساقی بُک ڈپو دہلی سے طلب کیجئے۔

آزادی کی جنگ ۔ یہ کتاب جناب چودھری غلام حیدر خاں صاحب (سابق ایڈیٹر "ترجمان" و صداقت کلکتہ و مترجم "ترکی حرم" "مسلمانانِ چین" ، "کامیاب زندگی" وغیرہ) نے شائع کی ہے۔ یہ کتاب مشہور امریکی مصلح بکرٹی واشنگٹن کی ولولہ انگیز سوانح عمری ہے۔ واشنگٹن ایک زر خرید حبشی لونڈی کا بیٹا تھا جو اپنی حیرت انگیز ذہانت اور قوتِ عمل کے باعث بالآخر اپنی قوم کا ایک زبردست لیڈر بن گیا اس کتاب کا مطالعہ ہندوستانیوں اور دوسری غلام اور از کار رفتہ قوموں کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کتاب ایک ناول کی طرح دلچسپ بھی ہے۔ قیمت مجلد عہ ۔ پتہ:۔ صداقت بُک ڈپو، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور۔

سوزِ ناتمام ۔ حضرتِ عاشق بٹالوی کی افسانہ نویسانہ شہرت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُن کے اکثر افسانے "ہمایوں" میں چھپتے رہے ہیں۔ اب اُنھوں نے اپنے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ افسانوں کو یکجا جمع کر کے سوزِ ناتمام کے نام سے شائع کیا ہے عاشق بٹالوی کا سا پختہ اور سُلجھا ہُوا طرزِ تحریر بہت کم لوگوں کو میسّر ہے اور بلا شبہ وہ ایک خاص انداز کے مالک ہیں۔ حجم ۲۴۰ صفحات قیمت صرف عہ۔ دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگز۔ لاہور سے طلب فرمائیے۔

شیرازہ ۔ اس نام سے مولانا چراغ حسن صاحب حسرت "سندباد جہازی" مدیر احسان نے ایک ہفت روزہ فکاہی اخبار جاری کیا ہے۔ اس کے لئے پنجاب کے بعض اُدبا بھی مضمون نگاری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہ اخبار بہت دلچسپ ہے اور اس کی ترتیب ۔ سے قابلِ تعریف خوش سلیقگی نمایاں ہے ۔ چندہ سالانہ تین روپے۔ دفتر شیرازہ لاہور سے طلب کیجئے۔

گہوارۂ تبسم ۔ یہ قاضی عباس حسین صاحب ظریفؔ دہلوی کی مزاحیہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۴۶ صفحات۔ قیمت چار آنے۔ پتہ: ساقی بک ڈپو دہلی۔ اشعار کا نمونہ یہ ہے:۔

جس کو انگلش میں بار کہتے ہیں	شیخ اس کو لُہار کہتے ہیں
بوریوں میں جتنے تھے گیہوں چنے سب بھُن گئے	یہ کرشمہ ہے ہماری آہ شعلہ بار کا

مطبوعات

عروسِ ادب:۔ یہ مستورِ حقیقت جناب قاضی عباس حسین صاحب ظریفؔ دہلوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ کل چودہ مضامین ہیں ان میں سے بعض مضامین ملک کے مشہور رسائل میں چھپ کر مقبول ہو چکے اور بعض غیر مطبوعہ ہیں۔ قاضی صاحب کی زبان سلیس اور شستہ ہے اور جا بجا لطیف مزاحیہ اشارات نے کتاب کو کشتِ زعفران بنا دیا ہے۔ فرصت کے اوقات کو لطف سے گزارنے کے لئے یہ کتاب بہت اچھی ہے۔ اُمید ہے کہ اہلِ شوق قدر کریں گے۔ قیمت عہ۔ ساقی بک ڈپو دہلی سے طلب کیجئے۔

آزادی کی جنگ ۔ یہ کتاب جناب چودھری غلام حیدر خاں صاحب (سابق ایڈیٹر "ترجمان" و صداقت کلکتہ و مترجم ترکی عوام، مسلمانانِ چین"، "کامیاب زندگی" وغیرہ) نے شائع کی ہے۔ یہ کتاب مشہور امریکی مصلح بکر ٹی واشنگٹن کی ولولہ انگیز سوانح عمری ہے۔ واشنگٹن ایک زرخرید حبشی لونڈی کا بیٹا تھا جو اپنی حیرت انگیز ذہانت اور قوتِ عمل کے باعث بالآخر اپنی قوم کا ایک زبردست لیڈر بن گیا۔ اس کتاب کا مطالعہ ہندوستانیوں اور دوسری غلام اور ازکار رفتہ قوموں کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کتاب ایک ناول کی طرح دلچسپ بھی ہے۔ قیمت مجلد عہ۔ پتہ:۔ صداقت بک ڈپو، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور۔

سوزِ ناتمام ۔ حضرتِ عاشق بٹالوی کی افسانہ نویسانہ شہرت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُن کے اکثر افسانے "ہمایوں" میں چھپتے رہے ہیں۔ اب اُنھوں نے اپنے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ افسانوں کو یکجا جمع کر کے سوزِ ناتمام کے نام سے شائع کیا ہے۔ عاشق بٹالوی کا سا پختہ اور سلجھا ہوا طرزِ تحریر بہت کم لوگوں کو میسّر ہے اور بلاشبہ وہ ایک خاص انداز کے مالک ہیں۔ حجم ۲۴۰ صفحات۔ قیمت صرف عہ۔ دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگز۔ لاہور سے طلب فرمائیے۔

شیرازہ ۔ اس نام سے مولانا چراغ حسن صاحب حسرتؔ "سندباد جہازی" مدیر احسان نے ایک ہفت روزہ فکاہی اخبار جاری کیا ہے۔ اس کے لئے پنجاب کے بعض اُدبا بھی مضمون نگاری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہ اخبار بہت دلچسپ ہے اور اس کی ترتیب سے قابلِ تعریف خوش سلیقگی نمایاں ہے۔ چندہ سالانہ تین روپے۔ دفتر شیرازہ لاہور سے طلب کیجئے۔

گہوارۂ تبسّم ۔ یہ قاضی عباس حسین صاحب ظریفؔ دہلوی کی مزاحیہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۰۴ صفحات۔ قیمت چار آنے پتہ: ساقی بک ڈپو دہلی۔ اشعار کا نمونہ یہ ہے:۔

جس کو انگلش میں بار کہتے ہیں — ہیچ اس کو بہار کہتے ہیں

بوریوں میں جتنے تھے گیہوں چنے سب بھن گئے — یہ کرشمہ ہے ہماری آہِ شعلہ بار کا

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ اپریل ۱۹۳۷ء

تصویر :- تنہائی

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول) قیمت فی پرچہ ۸/

بزمِ ہمایوں

ہمیں کیمبل پور سے نذیر احمد صاحب کا یہ نکتہ آموز اور فہیمانہ مراسلہ موصول ہوا ہے جسے ہم قارئین کی دلچسپی کے لئے صاحب ممدوح کے شکریے کے ساتھ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

"ہمایوں"

جناب ایڈیٹر صاحب "ہمایوں"۔ آپ اور آپ کا ہمایوں اُردو کے لئے جو کام کر رہے ہیں ہزار تحسین کے لائق ہے۔ ہماری زبان کو وسیع کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ ہونا ہے، اِس مدعا کے حصول میں ترجمے کی اہمیت ظاہر ہے اور انجمن اُردو والوں کی یہ تجویز کہ دوسری زبانوں کی اعلیٰ کتابوں کے ترجمے کرائے جائیں نہایت خوب ہے۔ اب تک جو ترجمے کئے گئے ہیں اُن پر ایک اعتراض آتا ہے وہ یہ کہ یا تو وہ درسی کتابوں کے ترجمے تھے۔ اِس لئے صرف مدرسوں اور کالجوں میں کام آسکتے تھے یا وہ محض ادبی کتابوں کے ترجمے تھے اور اُن میں بھی افسانہ و ناول کا حصّہ غالب تھا۔ اِن کے سوا کسی دیگر قسم کے ترجمے کم ہوئے۔ میری رائے میں اب ایسی کتابوں کے ترجمے زیادہ ہونے چاہئیں جو مضمون کے اعتبار سے سائنس اور ادب کے درمیان ایک الگ نوع رکھتی ہیں اور جن کی اکثریت کو شاید انگریزی اصطلاح Sociology کے تحت درست طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ گو یہ نام ایسی سب کتابوں کو شامل نہ کر سکے گا۔

اگر میں کسی دار الترجمہ کا ناظم یا نگران ہوتا تو سب سے پہلے برٹرینڈ رسل۔ ایچ۔ جی۔ ویلز۔ ہیرلڈ لاسکی اور برنارڈ شا کی کتابوں میں سے بعض کے ترجمے کراتا۔

نیز ترجمے سے بھی شاید بڑھ کر اخذ و تالیف کے کام کی ضرورت ہے۔ مثلاً برٹرینڈ رسل کی کتاب "فتحِ مسرت" (-Conquest of Happiness) اور ڈاکٹر ڈبلیو ہیرلن وُلف کی کتاب How to be happy though Human (انسان ہونے پر بھی انسان کیسے خوش رہ سکتا ہے) کے تمام مضامین کا ایک شستہ، آسان اور مرغوب خلاصہ ایک چھوٹی کتاب کی صورت میں تیار کرایا جائے۔

آپ نے غالباً تین چار برس پہلے ہمایوں میں ایک سلسلہ مضامین لکھا تھا جس کا عنوان "خوش کیونکر رہئے" تھا اُسی کو مندرجہ بالا دو کتابوں سے مزید مواد بڑھا کر شایع کر دیا جائے تو عام یاس زدہ اور غم گرفتہ آبادی کے لئے سامانِ مسرت بن سکتا ہے۔

ہمارے پُرانے تعلیمی نظام کے تحت اخلاق محسنی و اخلاق جلالی کی طرح کی کتابیں عام پڑھائی جاتی تھیں، وہ اب متروک ہو گئیں۔ اور مروجہ درسی کتابوں میں کسی اچھی کتاب نے اُن کی جگہ نہیں لی نتیجہ یہ ہے کہ روزانہ زندگی میں جن آداب و اخلاق کی ہر لمحے ضرورت ہے وہ عام طور پر سخت کمیاب ہیں۔ انگریزی زبان میں اس موضوع پر کتابیں بکثرت موجود ہیں۔ کسی لائق اور صاحب نظر مؤلف کی ضرورت ہے کہ مذہبی اور ایشیائی نقطہ ہائے نگاہ سے ان کو دیکھے اور پھر ان کی اور ہماری پرانی کتابوں کی دل پذیر آمیزش سے ایک جامع تالیف بہم پہنچا دے۔ یہ زندگی کو کتنا خوشگوار بنا سکتا ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے کہ آپ کا ہمایوں اس باب میں سب سے بڑھ کر کام کر رہا ہے۔ تمام جدید مضامین اور نافع خیالات نہایت مناسب صورت میں آپ کے پڑھنے والوں تک پہنچتے رہتے ہیں۔ گو کچھ دنوں سے ایسے مضامین کی مقدار میں کسی قدر کمی آ رہی ہے شاید نسبتہً خشک سمجھے گئے ہیں۔

چند روز ہوئے میں نے ایک چھوٹی سی کتاب بعنوان "Be Kind to yourself" دیکھی ہے مصنف کا نام Vash Young ہے۔ اور انارکلی والے راما کرشنا سے مل سکتی ہے۔ اس کا خلاصہ ہمایوں کے تقریباً دس صفحوں پر بخوبی آ سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کیا خوب ہو۔

ہمایوں کی وساطت سے میں شعرائے اردو کی خدمت میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ ریڈیو پر ہندوستانی گانا براڈکاسٹ ہو رہا ہے اس میں چھے گانے والے جب کوئی راگ کی پکّی چیز گاتے ہیں تو لازماً ہندی زبان استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جو چیزیں 'خیال' اور 'ٹھمری' کے نام سے ادا کی جاتی ہیں وہ سب ہندی ہی میں ہوتی ہیں۔ یہ ہر روز کا واقعہ ہے۔ ہندی زبان بُری نہیں لیکن شمالی ہندوستان کے عام لوگ اُسے نہیں جانتے۔ اب مشکل یہ ہے کہ راگ والوں کے لئے اُردو زبان کا جو حصّہ کام آ سکتا ہے وہ غزل ہے اور غزل کے ذریعے عموماً راگ کی وہ چیزیں ادا نہیں کی جا سکتیں جو 'خیال' اور 'ٹھمری' کہلاتی ہیں۔ برعکس اس کے ہندی میں ایسا مسالہ کثرت سے موجود ہے۔ اب ریڈیو کی روز افزوں گرم بازاری اور آئندہ وسعت کے پیشِ نظر اُردو شاعری کا یہ صریح فرض ہے کہ اُردو ٹھمریاں بھی مہیا کرے۔ یقیناً یہ کام دلچسپ ہونے کے علاوہ اُردو میں ایک نئے پہلو کا اضافہ کرے گا۔

اِس سلسلے میں مَیں ایک پنجابی شاعر کے ایک تازہ گیت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اہلِ پنجاب "ماہیا" کی ہمہ گیری اور مقبولیت سے آگاہ ہیں۔ دیہات میں جس شوق، سوز اور تاثیر کے ساتھ "ماہیا" گایا جاتا ہے کسی سے مخفی نہیں۔ حضرت "سندباد جہازی" نے احسان کے ۱۴ر ستمبر ۱۹۳۶ء کے پرچے میں "ایک گیت" کے عنوان سے اُردو ماہیا کی ابتدا کی ہے۔ مثال کے لئے تین ٹکڑے ملاحظہ ہوں:-

(۱) باغوں میں پڑے جھولے۔ تم بھول گئے ہم کو ہم تم کو نہیں بھولے

(۲) ساون کا مہینا ہے۔ ساجن سے جُدا ہو کر جینا کوئی جینا ہے

(۳) دِل میں ہیں تمنّائیں۔ ڈر ہے کہ کہیں ہم تم بدنام نہ ہو جائیں

کیا اچھا ہو اگر ہندی ٹھمریوں کا جواب بھی اُردو میں پیدا کر دیا جائے۔ یوں تو ہر شاعر لازماً ایک حد تک شناسائے موسیقی ہوتا ہے شعر اور موسیقی کی یگانگت ظاہر ہے۔ لیکن شاعر حضرات میں جو راگ سے ذرا زیادہ واقف ہوں گے وہ نہایت آسانی سے ہر راگ کے لئے ٹھمری موزوں کر دیں گے۔ مثلاً جو ٹھمری پیلو یا بھیم گانے کے لئے کام آ سکتی ہے وہ ایسی ٹھمری سے مختلف وزن یا بحر کی ہو گی جس میں بھاگیسری یا درباری ٹھیک سما سکتی ہیں۔ خاکسار نذیر احمد

تاریخ زبان و ادب اُردو۔ جناب محمود بریلوی اتالیق شہزادگان مانگرول (ریاست کاٹھیاواڑ) اس نام سے اُردو کی ایک مبسوط تاریخ لکھ رہے ہیں۔ ادبا و شعرا سے اُن کی درخواست ہے کہ وہ مندرجہ بالا پتے سے اپنے سوانح حیات اور تصانیف بھیج کر اُن کو ممنون فرمائیں۔

جہاں نما

یورپ کے مصارفِ جنگ

گزشتہ جنگِ یورپ کے بعد جو دُنیا میں اپنی قسم کی سب سے بڑی جنگ سمجھی جاتی ہے، خیال تھا کہ شاید انسان ایک طویل عرصے کے لئے اس خونیں اور آتشیں تماشے سے اُکتا جائے اور انسانیت مستقبل قریب میں دوبارہ بہیمیت کا چولا بدلنے پر تیار نہ ہو لیکن جنگ کے بعد جو صلح نامے اور عہد نامے مرتب ہوئے بہ الفاظِ غالب اُن کی عدل و مساوات سے عاری "تعمیر ہی میں خرابی کی صُورت مُضمر تھی" چنانچہ ربع صدی بھی گزرنے نہیں پائی کہ جنگِ عظیم کی ہزیمت خوردہ سلطنتیں اپنے فاتح حریفوں کو آنکھیں دکھانے لگی ہیں۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ آئندہ جنگ اس قدر ہولناک ہوگی کہ گزشتہ جنگِ عظیم کو اس سے کوئی نسبت نہ رہے گی۔

یورپ کی سلطنتیں جنگ کی تیاریوں پر اب ۱۹۱۴ء کے مقابلہ میں بہت زیادہ خرچ کر رہی ہیں۔ یہ محض کہنے ہی کی بات نہیں بلکہ فی الحقیقت توپوں، طیاروں اور جنگی جہازوں وغیرہ پر اب مقابلتہً اس قدر زیادہ روپیہ صرف کیا جارہا ہے کہ اس کے تصوّر ہی سے حیرت و استعجاب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ انگلستان کے اخبار ڈیلی ہیرلڈ نے اس کے متعلق کچھ اعداد و شمار فراہم کئے ہیں جن کا مطالعہ امن پسند لوگوں کو لرزہ براندام کر دینے کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ اُس نے لکھا ہے کہ مجموعی طور پر امریکا، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان اور رُوس نے ۱۹۱۴ء میں اسلحہ پر تقریباً دو ارب بیس کروڑ پاؤنڈ خرچ کئے تھے۔ لیکن اُن کے موجودہ مجموعی جنگی مصارف کا اندازہ گیارہ ارب پاؤنڈ سے زیادہ ہے۔ مصارفِ جنگ میں سب سے زیادہ اضافہ جرمنی نے کیا ہے یعنی ۱۹۱۴ء میں اِس کے جنگی مصارف تقریباً ۴۷ کروڑ پاؤنڈ تھے لیکن ۱۹۳۶ء میں ان کا اندازہ چار ارب ستر کروڑ پاؤنڈ کیا گیا۔

ذیل کے نقشے سے مختلف ممالک کے گزشتہ و موجودہ جنگی مصارف کا اندازہ ہوسکتا ہے:۔

	۱۹۱۴ء	۱۹۳۶ء	
جرمنی	۴۷ کروڑ پاؤنڈ	۴ ارب ۷۰ کروڑ پاؤنڈ	۱۰۰۰ فیصدی اضافہ
رُوس	۴۵ کروڑ پاؤنڈ	۲ ارب ۹۵ کروڑ پاؤنڈ	
امریکا	۲۵ کروڑ پاؤنڈ	ایک ارب پاؤنڈ	
فرانس	۳۵ کروڑ پاؤنڈ	۹۰ کروڑ پاؤنڈ	(۱۹۳۷ء کا میزانیہ)

برطانیہ	۳۸ کروڑ پاؤنڈ	اسی کروڑ پاؤنڈ
اٹلی	۱۸ کروڑ پاؤنڈ	پچھتر کروڑ پاؤنڈ
جاپان	نو کروڑ پچاس لاکھ پاؤنڈ	تیس کروڑ پاؤنڈ

اِن اعداد و شمار میں بہت سی باتیں غور طلب ہیں مثال کے طور پر ان میں جرمنی اور رُوس کی جنگی تیاری حقیقت سے کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے ہاں اشیاء کی گرانی کی وجہ سے روپے کی قیمت کم ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ جاپان کی جنگی تیاری اس کے میزانیہ سے جتنی معمولی نظر آتی ہے دراصل اتنی معمولی نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاپان میں نہ صرف ارزانی کا دَور دَورہ ہے بلکہ یورپ والوں کے مقابلہ میں جاپانیوں کا معیارِ زندگی بھی پست ہے۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار کے مطالعہ کے وقت ایک اَور بات پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، وُہ یہ کہ اگر آبادی اَور رقبہ کے تناسب کو ملحوظ رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ جرمنی رُوس کے مقابلہ میں (جسے ایک وسیع اور طویل و عریض سرحد کی حفاظت کرنی ہے) بدرجہا بہتر طور پر مسلح ہے۔ روس اپنے رقبہ کی زیادتی کے پیشِ نظر دراصل اتنی اچھی طرح مسلح نہیں ہے جتنا وہ اپنے جنگی میزانیہ سے نظر آتا ہے۔

جرمنی کی آبادی متذکرہ بالا سات سلطنتوں کی مجموعی آبادی کا ۱۱،۸ فیصدی ہے لیکن اس کے مصارفِ جنگ اِن ساتوں سلطنتوں کے مجموعی مصارفِ جنگ کا ۴۱ فیصدی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں رُوس کی آبادی مجموعی آبادی کا ۲۹،۸ فیصدی ہے اور اس کا میزانیۂ مصارف مجموعی میزانیہ کا ۲۶ فیصدی ہے۔ دوسری سلطنتوں کی حالت کا اندازہ ذیل کے نقشے سے ہو سکتا ہے:-

	مجموعی آبادی سے نسبت	مجموعی جنگی مصارف سے نسبت
امریکا	۲۲،۵ فیصدی	۸،۸ فیصدی
جاپان	۱۲،۳ "	۲،۶ "
برطانیہ	۸،۳ "	۷ "
فرانس	۷،۴ "	۸،۱ "
اٹلی	۷،۸ "	۶،۶ "

رُوس کا قانونِ ازدواج

شیخ افتخار رسول نے اپنے سفرِ رُوس کے حالات بیان کرتے ہوئے وہاں کے قانونِ ازدواج پر روشنی ڈالی ہے۔ رُوس کا قانونِ ازدواج

زندگی کے نئے نظریوں پر مبنی ہے۔ اِس قانون کی اساس جن دلائل پر ہے وہ یہ ہیں کہ قانون کا منشا، ایسے قاعدوں کا وضع کرنا ہے جن کی پیروی سے زندگی صالح اور پُرمسرّت بن سکے۔ یہ قاعدے ممکن العمل حقائق پر استوار ہونے چاہئیں کیونکہ یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ قانون کچھ ہو اور حقیقی زندگی کا تقاضا کچھ اور ہو۔ ابھی تک مرد و عورت کی محبت کے تعلقات کے مسئلے کا کوئی ایسا حل تجویز نہیں ہوا جو زندگی اور قانون میں مطابقت پیدا کر سکے۔ چنانچہ انسانی زندگی کو مطمئن اور مسرور بنانے کے لئے کوئی راہ نکالنے کی خاطر اس باب میں متواتر تجربوں اور نتیجۃً مسلسل قانونی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

روس کے قانونِ ازدواج پر بار بار نظرِ ثانی ہوتی ہے۔ بعض اور ممالک مثلاً ڈنمارک میں بھی اس قانون میں متواتر تبدیلیاں کی جاتی ہیں لیکن روس میں ان تبدیلیوں کی رفتار زیادہ تیز ہے۔

روس میں شادی کرنے کے دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ شہر کے شادی خانے کے رجسٹر میں اپنا نام درج کرانے کا ہے اور دوسرا آزادانہ رضامندی کا طریقہ ہے۔ دونوں صورتوں کو قانون جائز تسلیم کرتا ہے۔ رجسٹری کا طریقہ یہ ہے کہ دُولھا دُلہن ایک مجسٹریٹ کے پاس جاتے ہیں (اس کے لئے پیشگی اطلاع دینا ضروری نہیں) اور اُس کے سامنے شادی کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ حکام کی طرف سے صرف ایک سوال کیا جاتا ہے "تمہیں یہ علوم ہے کہ تمہارا مجوزہ شوہر (یا تمہاری مجوزہ بیوی) صحت مند ہے۔" اگر جواب قابلِ اطمینان ہو تو شادی رجسٹرڈ ہو جاتی ہے اور اسی پر اس رسم کے تمام مراحل طے ہو جاتے ہیں۔

آزاد طریقے میں شادی کی رجسٹری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور میاں بیوی صرف اپنے بیاہے جانے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں بھی میاں بیوی پر وہی قانون عاید ہوتے ہیں جو رجسٹری کی شادی میں عاید ہوتے ہیں۔ ضرورت ہو تو اس صورت میں بھی شادی کا ثبوت بہت آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ یا تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ دونوں میاں بیوی کے طور پر اکٹھے رہ چکے ہیں اور یا کوئی ایسا گواہ مل جاتا ہے جس کے سامنے انہوں نے اپنے میاں بیوی ہونے کا اعلان کیا ہو۔

کچھ عرصہ قبل کسی قدر چھوٹی عمر کی شادی کی اجازت تھی۔ مثلاً پندرہ سال کی لڑکی شادی کر سکتی تھی لیکن آخر تجربے سے معلوم ہوا کہ اس طریقے سے لڑکیوں کی صحت تباہ ہو رہی ہے۔ چنانچہ اب لڑکیوں کے لئے شادی کی عمر کم از کم اٹھارہ سال قرار دی گئی ہے۔

طلاق کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک جب علیحدگی کا خواہش مند ہو تو طلاق ہو جاتی ہے۔ طلاق کیلئے کوئی دلیل یا سبب پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں مرد اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ علیحدگی کے چھ مہینے بعد تک عورت کے نان و نفقہ کا کفیل رہے اور اگر عورت کی صحت اچھی نہ ہو یا وہ کام کرنے کے قابل نہ ہو تو پھر مرد کو ایک سال تک اس کے مصارف ادا کرنے پڑتے ہیں۔

رجسٹری کی شادی اور آزادی کی شادی دونوں کی اولاد کے حقوق یکساں ہوتے ہیں۔ اِن میں کسی قسم کا امتیاز نہیں کیا جاتا۔ روس میں "ناجائز" اولاد کا نام و نشان نہیں۔ ہر قسم کی اولاد یکساں جائز ہے۔ قانون نے اپنا سب سے بڑا فرض بچوں کی حفاظت اور اُن کی بہتری کو قرار دے رکھا ہے۔ جوانوں کی نیرنگ کارمحبت خواہ کیسی ہی آسانی سے اپنے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے، اس کی نیرنگیاں وہاں معصوم بچوں کے حقوق کو کسی طرح نقصان پہنچانے کی مجاز نہیں سمجھی جاتیں۔

سینما اور تعلیم

سینما یورپ کے ممالک میں محض ایک تفریحی مشغلہ ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ وہاں اس کی تعلیمی حیثیت بھی بہت اہم سمجھی جاتی ہے اور یہ ہے بھی درست ۔ مثلاً کسی ملک کی معاشری حالت پر بیسیوں لکچر بھی وضاحت میں وہاں کی معاشری حالت کی ایک فلم کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ایک خرد سال بچہ سو دفعہ جزیرے کی یہ تعریف رٹنے کے باوجود کہ "جزیرہ خشکی کا وہ قطعہ ہے جو چاروں طرف پانی سے گھرا ہو" جزیرہ کا ویسا صحیح تصور قائم نہیں کرسکتا جیسا سینما میں ایک دفعہ کسی جزیرے کو دیکھ لینے سے کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں علی العموم اور سوویٹ روس میں علی الخصوص سینما کی تعلیمی اہمیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اور اچھی سے اچھی تعلیمی اور تفریحی فلمیں تیار کی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں چونکہ سینما کو حکومت کی سرپرستی حاصل نہیں اس لئے یہاں تجارتی مصالح کی وجہ سے تعلیمی فلموں پر تفریحی فلموں کو ترجیح دی جاتی ہے اور محض تفریحی فلمیں ہی تیار کی جاتی ہیں لیکن افسوس کہ یہ تفریحی فلمیں بھی نہایت پست اور بھونڈے مذاق کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب تک بہت کم اچھے ہندوستانی ادباء نے فلمی ڈرامانگاری کی طرف توجہ کی ہے لیکن اس میں محض ادبار کے تساہل کا دخل ہی نہیں بلکہ فلم کمپنیوں کے مالکوں کی کوتاہ اندیشی بھی شامل ہے۔ غنیمت ہے کہ اب بعض فلم کمپنیاں خوش ذوق ہندوستانی ادباء کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھانے لگی ہیں چنانچہ بمبئی کے ہفتہ وار کا ایک اخبار معتبر اس اطلاع کا ذمہ دار ہے کہ شانتی نکیتن (بنگال) کے پروفیسر ضیاء الدین صاحب نے جو ایک سلیم الذوق شاعر اور ادیب ہیں امپیریل فلم کمپنی بمبئی کے لئے ایک افسانہ لکھا ہے جس سے پہلا ہندوستانی رنگین فلم تیار کیا جائے گا۔ اس افسانے کے مکالمے اُردو کے نوجوان ادیب مسٹر سعادت حسن منٹو نے لکھے ہیں جن کے فاضلانہ مضامین اور ڈرامے ناظرینِ ہمایوں سے بارہا خراجِ تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ امپیریل فلم کمپنی نے ملک کے مشہور ڈرامانگار حکیم احمد شجاع کے بعض ڈرامے بھی خریدے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ایسی فلموں کا افتتاح اہلِ سینما کے مذاق کی اصلاح کی طرف پہلا قدم ثابت ہوگا۔

ٹیگور کا بنگالی خطبۂ تقسیم اسناد

حال میں ٹیگور نے کلکتہ یونیورسٹی کا خطبۂ تقسیم اسناد بنگالی زبان میں پڑھا ہے۔ یہ ہندوستان کی انگریزی یونیورسٹیوں میں پہلا موقع ہے کہ ایسا خطبہ ایک ملکی زبان میں پڑھا گیا ہو لیکن اس واقعہ پر فخر کا اظہار ہندوستانیوں کی افسوسناک ذلت کا اشتہار ہے۔ جو باتیں دوسرے ملکوں میں عام اور قدرتی ہیں اُن پر فخر کیسا! انگلستان نے کبھی اس بات پر فخر یا اچنبھے کا اظہار نہیں کیا کہ اس کی یونیورسٹیوں میں "کانووکیشن ایڈریس" انگریزی زبان میں پڑھا جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ شرمناک بات یہ ہے کہ ہمارا ذریعۂ تعلیم دنیا بھر کی روش کے خلاف سات سمندر پار کی ایک زبان ہے اور ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دلوانے کے لئے یہاں زبردست دلائل کی ضرورت درپیش ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بیس سال بعد بھی بعض اوجھے سمجھدار اس سوچ میں ہیں کہ یہ اچھا ہوا یا برا۔ دوسری قومیں تو صرف ایک قدم اُٹھا کر علم کے دروازے پر پہنچ جاتی ہیں لیکن ہمیں وہاں تک پہنچنے کے لئے ایک غیر زبان کا بلاخیز ہفتخواں بھی طے کرنا پڑتا ہے۔ ٹیگور نے کیا خوب کہا ہے کہ "ایک غیر زبان کی چھلنی میں چھن جانے کے بعد علم کا جوہرِ حیات ضائع ہوجاتا ہے۔" انگریزی زبان سیکھنے سے کہیں فرصت پائیں تو ہمیں علمی حقائق پر غور کرنے اور خود سوچنے سمجھنے کا موقع بھی ملے مگر یہ قسمت میں کہاں!

حامد علی خاں

سارس

صدیوں کی بات ہے جاپان کے کسی چھوٹے سے گاؤں میں سونجو نامی ایک شکاری رہا کرتا تھا۔ ایک دن وہ شکار کے لئے نکلا تو شام تک مارا مارا پھرتا رہا لیکن اُسے کچھ نہ ملا۔ واپسی پر اکنوما کے قریب' دریا میں اُسے سارس کا ایک جوڑا نظر پڑا۔ نر اور مادہ دونوں دریا میں تیر رہے تھے۔ سارس کو مارنا اچھا نہیں ہوتا مگر سونجو اُس وقت بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اِس لئے اُس نے کمان چڑھا کر دونوں پر تیر چلایا۔ شکاری کا تیر نر کے سینے میں کھُب گیا لیکن مادہ بچ کر دوسرے کنارے کی جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ سونجو مُردہ پرندے کو اُٹھا کر گھر لے گیا اور اُسے پکایا۔

اُس رات سونجو نے ایک عجیب ڈراؤنا خواب دیکھا۔ اُس کو یوں معلوم ہؤا کہ ایک خوبصورت عورت اُس کے کمرے میں آئی ہے اور اُس کے سرہانے کھڑی ہو کر رونے لگی ہے۔ اُس کا رونا اتنا دردناک تھا کہ اُسے سُن کر سونجو کو محسوس ہؤا کہ میرا دِل کٹا جا رہا ہے۔ عورت سونجو سے کہہ رہی تھی :-

"کیوں آہ کیوں تم نے اُسے مار ڈالا؟ —— اُس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا
. . . . اکنوما میں ہم دونوں کیسے خوش خوش رہا کرتے تھے —— آہ تم
نے اُسے مار ڈالا! . . . . اُس نے تُم کو کیا دُکھ دیا تھا؟ تُم جانتے بھی ہو تُم
نے کیا کر دیا ہے؟ ہائے تم جانتے بھی ہو تم نے کتنا ظلم، کِتنا گناہ کیا ہے؟ . . . .
تُم نے اُس کے ساتھ مجھے بھی مار ڈالا ہے —— مَیں اپنے خاوند کے بغیر زندہ
نہیں رہ سکتی۔ تمہیں یہی بتلانے کے لئے میں آئی تھی . . . ."

اِس کے بعد وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس کی آواز اتنی دردناک تھی کہ سننے والے کی ہڈیوں کے گودے تک میں چبھی جا رہی تھی۔ پھر اُس نے سسکیوں میں نوحے کے یہ الفاظ کہے :-

دن ڈھلے پر وہ مرا اُس کو بُلانا، آہ آہ —— وہ مرا کہنا کہ آ' میں تجھ پہ واری، وائے وائے
اور اب تنہا پڑے آنسو بہانا، آہ آہ —— ہے مری آنکھوں پہ کیسی رات بھاری، وائے وائے

نوحے کے بعد وہ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور بولی :-

تنہائی

"آہ تم نہیں سمجھتے۔ تم نہیں سمجھ سکتے تم نے کیا کر دیا ہے لیکن کل جب تم اکنوما جاؤ گے

تو تم دیکھ لو گے —— تم دیکھ لو گے . . . . . ."

یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی اور سسکیاں بھرتی ہوئی چلی گئی۔

× × × × × ×

× × × × × ×

صبح جب سونجو اُٹھا تو اُس کے دل پر اِس خواب کا بہت گہرا اثر تھا۔ اُس کی صُورت مُرجھا گئی تھی۔ اُس کو یہ بات یاد آئی "کل جب تم اکنوما جاؤ گے تو تم دیکھ لو گے"۔ چنانچہ وہ یہ دیکھنے کے لئے کہ میرا خواب محض خواب ہی تھا یا اُس میں کچھ حقیقت بھی ہے، فوراً اکنوما کی طرف چل کھڑا ہوا۔

وہاں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ سارس کی مادہ دریا میں اکیلی تیر رہی ہے۔ اُسی وقت مادہ سارس نے بھی سونجو کو دیکھ پایا۔ اور اُس سے بچنے کی کوشش کے بجائے وہ سیدھی اُس کی طرف تیرتی چلی آئی۔ اُس کی نظر ایک عجیب انداز سے سونجو کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ پھر دفعتہً اُس نے اپنی چونچ سے اپنے سینے کو چیر ڈالا اور شکاری کی آنکھوں کے سامنے مرگئی . . . .

سونجو نے اُسی دِن بھدرا کرایا اور بھکشو بن گیا۔

(لیفکا ڈیو ہرن)

ترجمہ
از
حامد علی خاں

دشت ہے تاریک اور رہ رہ کے کوندے کی لپک

چھو رہی ہے آسماں کی ظلمتِ خاموش کو

جیسے اُس مایوس کی آنکھوں کا عالم جو غریب،

حال کہنا چاہتا ہو اور کہہ سکتا نہ ہو

مجھے کُتّے نے کاٹا

بات میں سے بات نکل آتی ہے، اس لئے ممکن ہے آپ پوچھ بیٹھیں کہ عنوان "مجھے کُتّے نے کاٹا" کے بجائے "مجھے باؤلے کُتّے نے کاٹا" کیوں نہ رکھا تو اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ مجھے آج تک بھی جب اس حادثہ کو گزرے ہوئے ایک مدت ہو چکی ہے، اس امر کا پتہ نہیں کہ وہ کُتا جس نے مجھے کاٹ کھایا تھا باؤلا بھی تھا کہ نہیں، در اصل باؤلے اور "غیر باؤلے" کُتّے میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ ایک پاگل اور ذی ہوش انسان میں، یعنی دونوں میں تمیز کرنا بہت مشکل ہے، یہ امر صرف نہایت دشوار ہی نہیں بلکہ بسا اوقات ناقابلِ حل نفسیاتی اُلجھنوں کا حامل ہوتا ہے۔ خود میں اپنی زندگی کے کئی ایسے لمحے گن سکتا ہوں جب میں نے اپنے آپ کو بالکل پاگل متصور کیا ہے، اور بارہا سڑک پر چلتے ہوئے میں نے اکثر شریف اجنبیوں کو مسکرا مسکرا کر اپنے آپ سے باتیں کرتے سُنا ہے، یا چھڑی کو اس طرح زور زور سے تہدیدی انداز میں ہلاتے ہوئے دیکھا ہے گویا کسی غیبی دشمن کے حملوں کا جواب دیا جا رہا ہے، اس وقت بشرے سے اتنی درشتی اور بربریت کا اظہار ہوتا ہے کہ چوک میں کھڑا ہوا پولیس کا سپاہی بھی مشتبہ نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر دل میں سوچتا ہے کہ کہیں یہ وہی پاگل خانہ سے بھاگا ہوا سودائی تو نہیں جس کا حلیہ میری ڈائری میں محفوظ ہے۔

چنانچہ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ایک باؤلے اور ہوشمند کتے کی پہچان کافی مشکل ہے۔ کم از کم عام انسانوں کے لئے۔ ایک ڈاکٹر بھی تو کافی دیر کے بعد فیصلہ کر سکتا ہے کہ کتا پاگل تھا کہ نہیں اور اس دُنیا میں ہر آدمی ڈاکٹر یا پاگل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بازار میں چلتے چلتے کتے نے مجھے کاٹ لیا، تو میں حیران سا رہ گیا، اور پہلے چند لمحوں میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔

بات یوں ہوئی کہ وہ شام ذرا غیر معمولی طور پر خنک تھی۔ اور بڑے بازار میں بھی غیر معمولی رونق تھی۔ میں ایک بڑا، بھورا کوٹ لپیٹے ہوئے بڑے مزے سے سگرٹ کے کش لگاتا ہوا جا رہا تھا، کہ یکایک ـــــ جیسے قصّے کہانیوں میں اکثر ہوتا ہے ـــــ کسی کُتّے نے پیچھے سے آکر میری ٹانگ کو دبوچ لیا، ہاں خوب یاد آیا، داہنی ٹانگ تھی اور میں ایک گرم پتلون پہنے ہوئے تھا، کتے نے پہلے تو اپنے تیز تیز دانتوں سے پتلون کو پارہ پارہ کیا۔ پھر بڑھ کر گوشت پر بھی ـــــ جیسا کہ قصّے کہانیوں میں اکثر لکھا جاتا ہے ـــــ "محبت کی ایک مُہر ثبت کردی" اور یہ سب کچھ اتنی پھرتی اور خاموشی سے ہوا کہ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ دوسرے لمحہ میں دیکھا تو کُتا نظر سے غائب "یا مظہر العجائب!"

اگلے چند ثانیے اسی بوکھلاہٹ میں گزر گئے، اس کے بعد خیال آیا کہ کُتّے کا پیچھا کروں اور اُسے پکڑ کر اور مار مار کر اُس کا کچومر نکال دوں، ادھر دیکھا اُدھر دیکھا، شاید وہ اس موڑ کے پرے رنجن داس کی دکان کے قریب سے گھوم گیا تھا۔ مگر کدھر؟ پھر پتلون کے لٹکتے ہوئے ٹکڑوں کی طرف دیکھا اور اپنے درزی کے ہاں جانے کی صلاح کی، آخر بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ خیال آیا کہ اگر کُتا پاگل ہوا تو ——

نتیجہ یہ ہوا کہ میں رام بھجاول انگریزی دوا فروش کی دکان پر پہنچا اور اُس سے جلد جلد چند ٹوٹے پھُوٹے جُملوں میں زخم پر دوا لگانے کو کہا۔ اُس نے فوراً ایک تیز قسم کا کاربالک ایسڈ لگایا، پھر زخم پر پٹی بھی باندھ دی، اور میرے مُنہ میں ایک سفید سفوف سا پھینک کر کہا، "لو، اب دو گھونٹ گرم پانی کے پیو، کل بڑے ہسپتال چلے جانا اور ٹیکہ لگوانا، دیکھو، ضرور۔"

میں دو دن متواتر غور کرتا رہا کہ بڑے ہسپتال جا کر ٹیکہ لگانا مفید بھی ہوگا؟ چند دوستوں نے مشورہ دیا، ارے میاں! جانے دو، اوّل تو آج کل سردیوں کے دنوں میں کتے سرے سے پاگل ہوتے ہی نہیں اور اگر کوئی خدانخواستہ پاگل ہوا بھی تو اُسے بڑے بازار میں کون پھرنے دے گا، پھر ٹیکہ لگوانا تو ایک بہت بڑی زحمت ہے، کیا تم نے اسے آسان سمجھ رکھا ہے، سارا پیٹ سُوج جائے گا، ہمارے ہاں ساتھ کی کوٹھی میں ایک بوڑھے وکیل رہتے تھے۔ اُن کے کتے نے ایک دن انہیں کھیلتے کھیلتے کاٹ کھایا تھا۔ بوڑھے وکیل صاحب نے پہلے تو کُتے کو گولی کا نشانہ بنایا، اور پھر خود ہسپتال میں ٹیکہ لگواتے پھرے، سارا پیٹ سُوج گیا تھا، چھ مہینہ بستر پر پڑے رہے، آخر بوڑھے آدمی تھے، مر گئے۔

بعض احباب نے کہا۔ کیا واہیات ہے، ٹیکہ لگواتے پھرو گے، جانے دو، میاں جانے دو، لال مرچیں اور سُرمہ پیس کر زخم پر لگایا کرو۔ چند دنوں میں آپ ہی آپ زخم سے سارا زہر رس رس کر بہ جائے گا، بھلا جب ہمارے ملک میں ٹیکہ کا رواج نہ تھا تو کیا اُس وقت اور کوئی شافی علاج نہ تھا۔ اونہہ۔

امجد نے کہا، بھئی میں تو کھری کھری کہوں گا چاہے کوئی ناراض ہی ہو جائے، اصل بات تو یہ ہے کہ یہ بہت ہی نامراد مرض ہے، جب اس مرض کی سب علامات ظاہر ہو جائیں تو پھر مریض کبھی نہیں بچتا، ارے اِس کے کاٹے کا تو پانی بھی نہیں مانگتا۔ دراصل یہ ضرب المثل تو باؤلے کتوں پر صادق آتی ہے نہ کہ بچارے سانپوں پر، ہمارے محلے میں ایک نوجوان کو کُتے نے کاٹ کھایا تھا، بچارا اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، دس پندرہ روز یونہی ہلدی پیاز لگاتا رہا، پندرھویں روز اُسے یکایک بخار اور ہذیان ہو گیا۔ خدا کی قسم بستر میں پڑا پڑا چھت تک اُچھل اُچھل کر جاتا تھا، میرے اللہ کتنا موذی مرض ہے، آدمی ہوا کا ایک جھونکا تک نہیں سہہ سکتا، سارا بدن کانپتا ہے، اور پانی؟ —— پانی تو مطلق نہیں پی سکتا —— دوسرے دن بچارا اس دُنیا سے کوچ کر گیا۔" یہ کہہ کر امجد نے اپنی آنکھیں اوپر چڑھا لیں اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

امجد کے اس بیان نے کہ "وہ بچارا چھت تک اُچھل اُچھل کر جاتا تھا" مجھ پر بہت اثر کیا۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ میں ہسپتال میں پڑا ہوں اور چھت تک اُچھل اُچھل کر سر سے ٹکریں لگاتا ہوں۔ گھر والے، احباب، دوست، بیوی بچے سب روکتے ہیں مگر میں کسی کے قابو میں نہیں آتا، اب سر سے خون جاری ہو گیا ہے، اب بھیجا بھی باہر نکل آیا ہے، میری بیوی سر پیٹ رہی ہے، بڑا لڑکا میرے پاؤں پکڑے ہوئے رو رہا ہے، لوگ میرے جنازے کو لئے جا رہے ہیں، یہ میری قبر ہے، مرمریں لوح پر سیاہ حرفوں میں اُستاد ذوق کا شعر لکھا ہے :-

سگِ دُنیا پس از مردن بھی دامنگیرِ دُنیا ہو ۔۔۔ کہ اِس کتے کی مٹی سے بھی کُتا گھاس پیدا ہو

اتنے میں امجد نے آنکھیں جھکا کر میری طرف دیکھا، ہاں، میاں، ضرور، کل بڑے ہسپتال جا کر ٹیکہ لگوانا، کوئی ہنسی نہیں ہے، زندگی اور موت کا سوال ہے۔

x x x x x x x x x x x

بڑے ہسپتال جا کر دیکھا تو حیران رہ گیا کہ مفلس و نادار کتوں کی جماعت کس طرح نوع انسان سے بدلہ لے رہی ہے۔ کتے وہی باؤلے ہوتے ہیں جو اکثر بھوکے رہیں، جن کا مالک کوئی نہ ہو، جنہیں ہر جگہ سے دُھتکارا جائے، گرمیوں میں کوئی پانی پینے کو نہ دے، سردیوں میں کسی مکان کے گرم گوشے میں پناہ نہ مل سکے، جسم پر خارش نکل آئے تو کہیں سے کوئی دوا دستیاب نہ ہو۔ اس حالت میں اگر دماغ چل جائے تو کیا عجب ہے، اگر وہ سوسائٹی سے بدلہ لینے پر تُل جائیں تو اور کیا کریں۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ چاہے وہ کُتا پاگل ہو چاہے نہ ہو، اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ مجھے کاٹ کر وہ غیر شعوری طور پر انسانی سوسائٹی کے خلاف جس نے اُس کی جنس کو غلام بنا دیا تھا پُر زور آواز بلند کر رہا تھا۔ غلامی میں ہمیشہ چند افراد ہی خوش رہتے ہیں ورنہ اکثریت تو ہمیشہ بازاروں میں بھیک مانگتی دکھائی دیتی ہے۔ بچارے کُتے!

ایک بڑے کمرے میں پرچیاں لکھی جا رہی تھیں، اور سگ گزیدہ لوگوں کی اتنی بھیڑ تھی کہ میں نے سمجھا کہ میں بھول کر کسی الیکشن کیمپ میں گھس آیا ہوں، مگر پھر فوراً ہی اطمینان ہو گیا، جب میں نے بستر پر پڑے ہوئے ایک صوتی آلہ کو دیکھا کہ جس سے ڈاکٹر لوگ مریضوں کی چھاتی ٹھونکا کرتے ہیں، کرسی پر بیٹھ کر پرچی لکھائی، آپ کا نام، پتہ، پیشہ، ذات، انکم ٹیکس، یہ سب سوال اتنی جلدی سے کئے گئے کہ مجھے پھر شک ہو گیا کہ ہو نہ ہو، یہاں ووٹروں کی پرچیاں بنائی جا رہی ہیں، جلدی میں اُٹھ کھڑا ہوا، ڈاکٹر صاحب نے فوراً پرچی ہاتھ میں دے کر کہا، دوسرے کمرے میں ٹیکہ لگوا لیجئے، اُدھر سے جائیے، "آداب عرض!" "آداب عرض!"

دوسرے کمرے کا دروازہ بند تھا، باہر برآمدے میں دو تین سو کے قریب آدمی بیٹھے ہوئے تھے، دُور دُور سے لوگ آئے ہوئے تھے، غریب زمیندار، میلی پگڑیاں اور کالے تہمد باندھے ہوئے، کسی کی بغل میں بقچہ، کسی کے کاندھے پر چھوٹا سا بستر

داڑھیاں خاک آلودہ، سکین و پامال سے چہرے جیسے کسی نے ٹھوکر یار مار کر مسخ کر دیئے ہوں۔ بوڑھی عورتیں، روتے چلاتے ہوئے ننگے بچے، کوئی فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا، کوئی سامنے سبز سبز کیاریوں میں لیٹا ہوا کراہ رہا تھا، کمرہ کچھ توقف کے بعد کھلتا۔ چپراسی پرچی پر سے نام پڑھ کر زور سے آواز دیتا جیسے عدالت میں پیشی ہوتی ہے، کوئی لاٹھی ٹیکتا ہوا جاٹ اندر داخل ہو جاتا، اور پھر دروازہ کھٹ سے بند ہو جاتا، مجھے کسی نے بتایا، آج آپ کی باری نہیں آئے گی اور اگر آئے گی بھی تو بہت دیر سے اگر کل آپ صبح کو آئیں اور اور دوسرے دروازے سے جو اس وارڈ کے دوسری طرف کھلتا ہے، اُس طرف سے داخل ہوں، وہ ـــــ میرے خیال میں وہ بہتر رہے گا۔

دوسرے دن صبح ہی اُٹھ کر گیا، ابھی ڈاکٹر صاحب تشریف نہ لائے تھے، کمرے میں ایک چپراسی آگ تاپ رہا تھا۔ ایک کمپونڈر ٹیکہ کی پچکاریوں کو سپرٹ سے صاف کر رہا تھا، چھوٹا ڈاکٹر یعنی ڈاکٹر کا نائب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رجسٹر پر کچھ درج کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا ”ڈاکٹر صاحب ابھی نہیں آئے؟“

کمپونڈر نے جواب دیا ”وہ ادھر عورتوں کے کمرہ میں ٹیکے لگا رہے ہیں۔“

کچھ توقف کے بعد کمپونڈر نے چھوٹے ڈاکٹر سے نہایت مسکین لہجہ میں کہا۔ ”جی، آج میرے لڑکے کو بخار چڑھے ہوئے پندرھواں روز ہے۔“

”ہونہہ! پندرھواں روز؟“ ڈاکٹر نے قلم چھوڑ کر ٹہلتے ہوئے کہا ”کچھ مضائقہ نہیں، سنبھال لیں گے۔“ یہ کہہ کر آپ آتشدان کے قریب ٹہلنے میں مشغول ہو گئے۔

چند لمحوں کے بعد آپ نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کمپونڈر کے چہرے پر گاڑدیں اور اُس سے پوچھا۔ ”اچھا، تو اُسے بخار ہے، خوب، گویا کہ پندرھواں روز ہے! ہونہہ!“

اس کے بعد ایک طویل خاموشی۔ چپراسی گربۂ مسکیں بنا ہوا آتشدان کے قریب آگ تاپتا رہا، کمپونڈر پچکاریاں صاف کرتا رہا، چھوٹا ڈاکٹر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھا کر فرش پر ٹہلتا رہا، اُس کے ہاتھ اُس کی پتلون کی جیبوں میں تھے، آخر اُس نے ہاتھ جیبوں سے نکال لئے اور دائیں ہاتھ کی چھنگلیا کو دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے پر رکھ کر کہنے لگا، ”بخار؛ پندرھواں روز؛ ـــــ کیا کھانسی بھی ہوتی ہے؟“

”جی نہیں“ کمپونڈر نے سپرٹ لیمپ جلاتے ہوئے جواب دیا۔

ڈاکٹر کی بھویں تن گئیں گویا کہہ رہا تھا، کتنی بُری بات ہے، بخار کے ساتھ کھانسی بھی نہیں۔

ڈاکٹر بولا، ”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے نمونیا نہیں؟“

"جی، بالکل نہیں"، کمپونڈر نے ٹیکہ کی ٹیوبوں (ampoules) کو گنتے ہوئے جواب دیا" ایک، دو، تین، چار، بالکل نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ بڑے ڈاکٹر صاحب نے اُسے دیکھا تھا، کہنے لگے اِسے تپ محرقہ ہے، ڈیڑھ ماہ کے بعد بخار اُترے گا، دوائی بھی وہی دیتے ہیں، میں آپ سے گزارش کرنے والا تھا کہ ـــــ"

چھوٹے ڈاکٹر نے جلدی سے کہا،" ٹھیک، ٹھیک میں سمجھ گیا، آخر، ہو سکتا ہے، بڑے بڑے ڈاکٹروں سے بھی تشخیص میں غلطی ہو جاتی ہے، میں خود اُسے چل کر دیکھ لوں گا۔"

کمپونڈر نے کہا،" آپ کی بہت نوازش ہوگی، مگر، مگر، میرا مطلب یہ تھا کہ گو بڑے ڈاکٹر بہت مہربان ہیں، پھر بھی ـــــ بات یہ ہے کہ میں چاہتا تھا کہ آپ بڑے ڈاکٹر صاحب سے میرے متعلق سفارش کردیں، میں تین چار روز کی چھٹی چاہتا ہوں، لڑکا سخت بیمار ہے، گھر پر بیچاری بیوی بھی گھبرائی ہوئی ہے، اور ـــــ"

"اوہ ـــــ" ڈاکٹر نے رنجیدہ ہو کر کہا" ـــــ اوہ ـــ مگر، ہاں، ہاں، مگر، بھئی معاف کرنا، جب بڑے ڈاکٹر صاحب کو خود تمہارے لڑکے کی بیماری کا علم ہے تم خود انہیں سے چھٹی مانگ لو، دوا اور نسخہ بھی تو انہیں کا ہے میں کیسے سفارش کر سکتا ہوں۔"

کمپونڈر نے سر جھکا لیا، ڈاکٹر ٹہلنے لگا۔

اتنے میں ایک دروازہ کھلا، اور بڑے ڈاکٹر صاحب داخل ہوئے، اُن کی مسکراہٹ ہی سے مترشح ہوتا تھا کہ یہی بڑے ڈاکٹر ہیں، ان کے پیچھے پیچھے ایک نرس داخل ہوئی، میں نے ٹوپی اُٹھا کر اس طرح سے سلام کیا کہ دونوں خوش ہو جائیں، دونوں خوش ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا،" اچھا، یہ سچ ہے، مگر آپ کل نہیں آئے!"

نرس نے کہا،" مگر زخم تو تھوڑا سا ہے۔ یہ تو جلد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں" ڈاکٹر صاحب نے کہا" زخم گو اتنا گہرا نہیں، پھر بھی ٹیکے تو آپ کو پورے چودہ روز لگوانے پڑیں گے۔"

"صرف چودہ روز!" میں نے نرس کے سُرخ اور چمکیلے لبوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

نرس مسکرا دی، بڑے ڈاکٹر ہنس کر چھوٹے ڈاکٹر سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے، چھوٹا ڈاکٹر کہہ رہا تھا،" ہاں جناب میں ابھی ابھی کمپونڈر سے کہہ رہا تھا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب کا نسخہ بہت ہی اعلےٰ ہے، اور جناب تشخیص تو اس عمدگی سے کرتے ہیں کہ مرض کو جڑ سے پکڑ لیتے ہیں، جی ہاں، بالکل ٹھیک، تپ محرقہ کے سوا اور کیا ہوگا، جی، بالکل ٹھیک، بجا فرمایا آپ نے، یہ چھٹی لے کر کیا کرے گا، یہاں آ گئے ہی کیا تھوڑا کام ہے، تین چار سو مریضوں کو روز دیکھنا پڑتا ہے۔"

اتنے میں دروازہ پھر کھلا، اور نیلی وردی پہنے ہوئے ایک چپراسی اندر داخل ہوا اور بڑے ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہو کر

کہنے لگا، "حضور کو بڑے ڈاکٹر صاحب یاد کرتے ہیں۔" جب بڑے ڈاکٹر چلے گئے تو میں سوچنے لگا، کتنی عجیب بات ہے۔ اس دورِ مہاجنی میں ہر کوئی دوسرے سے بڑا ہے، چھوٹا ڈاکٹر، بڑا ڈاکٹر، اور پھر اُس سے بھی بڑا ڈاکٹر، کیا انسانوں کی غلامی کسی درجے پر پہنچ کر بھی ختم نہیں ہوتی، کتنی عجیب بات ہے، زندگی کے ہر شعبے میں ——

نرس بولی (انگریزی میں) "تم بڑے شریر ہو۔"

میں نے کہا (انگریزی میں) "میں بالکل معصوم ہوں، مجھے باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہے، میں دُکھ کا مارا ہوں۔"

نرس نے رُک کر کہا "میں ان معصوم شرارتوں کو خوب سمجھتی ہوں، اچھی طرح سے۔"

میں نے کہا "تم بہت خوبصورت ہو، لو اب تو پیچھا چھوڑو، یہی بات تم میرے مُنہ سے کہلوانا چاہتی تھیں نا!"

نرس۔ "بالکل جھوٹ، میں تمہاری چالوں کو خوب سمجھتی ہوں،" یہ کہہ کر وہ میز کے قریب گئی اور پچکاریوں میں دوا بھرنے لگی۔

میں نے نرس سے پوچھا، "بھلا یہ تو بتاؤ، اگر ایک دفعہ پورے ٹیکے لگوالئے جائیں، تو اگر پھر کوئی کُتا کاٹ لے تو کیا اُس صورت میں دوبارہ ٹیکے ——" میں نے فقرہ ناتمام چھوڑ دیا۔

نرس۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ مجھے تم نیک آدمی معلوم نہیں ہوتے، کیا تم سارے شہر کے باؤلے کتوں سے اپنے آپ کو کٹوانے پر تیار ہو؟

میں۔ یہ میں نے کب کہا ہے؟

نرس۔ تو پھر —— ؟

میں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ آخر تمہارا بھی کوئی کتا ہوگا۔

نرس۔ ہے، مگر وہ تمہاری طرح باؤلا نہیں۔

میں۔ (جھینپ کر) اُس کا نام کیا ہے؟

نرس۔ ٹیڈی!

میں۔ کتنا بھونڈا سا نام ہے، تمہیں نام رکھنے کا سلیقہ تو ہونا چاہیے۔

نرس۔ شٹ اپ (shut up)

پھر فوراً ہنس پڑی، کہنے لگی۔ اپنی پرچی دکھاؤ، کتنی دوائی بھرنی ہے، پانچ سی سی (cc) کہ سات؟

بڑے ڈاکٹر صاحب اندر داخل ہوئے (اب انہیں منجھلے ڈاکٹر صاحب کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا) کہنے لگے "آیئے آپ کو ٹیکہ لگا دیں۔" ایک چٹکی میں پسلیوں کے قریب پچکاری کی سوئی گھونپ دی اور کہنے لگے، "آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی۔"

میں نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ نرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور فوراً جواب دیا، "مطلق نہیں، ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر صاحب نے پیٹ سے سوئی نکالتے ہوئے کہا، "اوہ ـــــ میرا خیال ہے ۔ (کمپونڈر سے مخاطب ہو کر) تم نے پچکاری میں دوائی نہیں بھری، کیوں ؟"

"جی،" کمپونڈر نے ہچکچاتے ہوئے کہا "جی ۔ مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں ، شاید ـــــ"

نرس جلدی سے بولی " تو کوئی حرج نہیں ۔ انہیں تکلیف تو مطلق ہوتی نہیں ، دوسری پچکاری کر دیجئے ۔"

ڈاکٹر نے کہا " ہاں یہ درست ہے ۔"

دوسرے انجکشن کے بعد ـــــ

میں نے ٹوپی اُٹھائی اور کہا " گڈ مارننگ ڈاکٹر صاحب" (نرس کو) " گڈ ما ـــــ رننگ "

ڈاکٹر صاحب ۔ (روتی اور تھکی ہوئی آواز میں) " گڈ مارننگ "۔

نرس ۔ " گڈ ما ـــــ رننگ "

اُس کی آواز پتلی اور باریک تھی ، جیسے دوائی پینے کے بلوریں گلاس کے ساتھ ایک نقرئی چمچہ ٹکرا جائے ۔

× × × × × × × × × ×

کمرے سے نکل کر میں بڑے بڑے برآمدوں میں سے گزرتا ہوا ہسپتال کے اُس عالی شان ایوان میں پہنچا جس کے اوپر نیلے کلسوں والے گنبد کھڑے ہیں اور چاروں دروازوں پر نیلی وردیوں والے خدمتگار ایستادہ ہیں ، اسی ایوان کی خوبصورت منقش چھت کے نیچے ایک بوڑھا کسان اور اُس کی بیوی چھوٹے ڈاکٹر کے آگے ہاتھ جوڑے ہوئے واپس جانے کا کرایہ مانگ رہے تھے ۔

چھوٹے ڈاکٹر نے ترشرو ہو کر کہا " مگر ایک دفعہ جو کہہ دیا کہ تمہارے کاغذات کلکٹر صاحب کو بھیج دیئے ہیں ، تمہیں واپس جانے کا کرایہ کچہری سے مل جائے گا ۔"

بوڑھے کسان نے آبدیدہ ہو کر کہا ۔ " صاحب ! ہم یہاں بالکل ناواقف ہیں ، ہم ہرگوئی سے آئے ہیں ، یہاں ہمارا کون واقف ہے ، ہرگوئی میں صاحب نے کہا تھا کہ تمہیں واپس جانے کا کرایہ یہاں سے مل جائے گا ، چودہ دن ہم میاں بیوی سرکار آپ کے سہارے ہی یہاں پڑے ٹیکے لگواتے رہے ہیں ، اب واپس جانے کا کرایہ بھی آپ سے ہی مل جائے ، تو حضور کو دعائیں دیں گے ۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا ۔ " مگر بھائی کرایہ اتنی جلدی تمہیں کہاں سے دے دیں ، ہم نے تمہارے کاغذات کلکٹر صاحب کو بھیج دیئے ہیں ۔"

" سرکار ! " کسان نے کہا " ہم آج رات کو کہاں رہیں گے ، روٹی کہاں سے کھائیں گے ، ہرگوئی کے صاحب نے کہا تھا کہ یہاں سے واپس جانے کا کرایہ مل جائے گا اور ـــــ "

ڈاکٹر جلدی سے بولا " پھر وہی ، کرایہ ، کرایہ ، کرایہ ، ایک دفعہ جو کہہ دیا ۔" اتنا کہہ کر وہ چلنے لگا ۔ مجھے دیکھ کر اُس کی بشاشت

عود کر آئی، ہنس کر کہنے لگا" آپ نے ٹیکہ لگوا لیا، بہت اچھا کیا، اب آپ کل تشریف لائیں گے نا، اچھا، اچھا!! گڈ مارننگ۔"

"گڈ مارننگ"

میں جب ایوان سے باہر نکلا تو کسان کی بیوی اپنی دُہری کمر پہ ہاتھ رکھے پوپلے مُنہ سے ایک دروازے پر کھڑی خدمتگار سے پوچھ رہی تھی، "کیوں بیٹا" کچہری کدھر ہے؟"

× × × × × × × × × ×

بات میں سے بات نکل آتی ہے، اُسی شام کو بڑے بازار اور شیام بازار کے چوک کے قریب میں نے ایک بوڑھے آدمی اور بوڑھی عورت کو بھیک مانگتے دیکھا۔ میں اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا کہ معاً کسی نے سامنے سے دو ہاتھ پھیلا دیئے۔

بابا، پیسہ، ایک پیسہ

دو پُرشکن ہتھیلیاں کانپ رہی تھیں، میں نے نگاہ اُٹھائی، یہ وہی بوڑھا کسان تھا جو لاٹھی ٹیکتا ہوا اپنی بوڑھی بیوی کو سہارا دیتا ہوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا، آہ، یہ دو غریب معصوم سی روحیں کیوں اس مکر و فریب کی دُنیا میں گھوم رہی تھیں!! نکبت و یاس کے دو مٹتے ہوئے مرقعے تھے۔ ان کے لب بھیک مانگتے مانگتے سُوکھ گئے تھے، اور وہ اپنے کھیتوں سے بہت دُور اس پردیس میں اکیلے تھے، بوڑھے کسان کی لرزتی ہوئی آواز میں نظر نہ آنے والے آنسوؤں کا نم تھا اور وہ غریب عورت کسی صدیوں کی مصیبت کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔

میرے دل پر چھُریاں سی چل گئیں، یکایک میرے ذہن میں آ گیا کہ غریبوں کو بھیک مانگنا اتنی آسانی سے کیوں آ جاتا ہے۔ مجھے ایسا احساس ہوا کہ ان کی بدنصیبی کا میں خود ذمہ دار تھا، شاید، یہ میرا ہی افلاس تھا جو اس طرح دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے مجھ سے بھیک مانگ رہا تھا۔

بابا، پیسہ، خدا کا واسطہ، ایک پیسہ

میں انہیں پیسہ دینے کی بھی جرأت نہ کر سکا اور چُپ چاپ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے آگے بڑھ گیا +

کرشن چندر ایم اے

نواہائے راز

دردسے اپنے خدا کو تلملا سکتا ہوں مَیں

اپنے غم کو دوجہاں کا غم بنا سکتا ہوں مَیں

کس قدر ہے ناگوار اتر ریا کی دوستی

آہ افعی کو بھی سینے سے لگا سکتا ہوں مَیں

مَیں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہی مآلِ ہست و بود

زمزموں کو نالۂ ماتم بنا سکتا ہوں مَیں

بات سچّی دِل سے لب تک آئے بِن رہتی نہیں

ورنہ سَو محشر کو سینے میں دبا سکتا ہوں مَیں

دولتِ کونین کو ہر بار کیوں ٹھکرا نہ دوں

دِل سے لعل اَور آنکھ سے قلزم لٹا سکتا ہوں مَیں

اپنے غم خانے کو آہوں سے لگا سکتا ہوں آگ

اِس سیہ خانے کو اب بھی جگمگا سکتا ہوں مَیں

اِس کی لَو پر صورتِ پروانہ جل سکتا نہیں

پھونک سے قندیلِ ہستی کو بجھا سکتا ہوں مَیں

یہ جہانِ تیرہ کیا ہو میری وحشت کا حریف

اے خدا یہ خاک ماتم میں اُڑا سکتا ہوں مَیں

قطرے قطرے میں نظر آتا ہے دریا کا جگر

آبِ گوہر سے بھی سَو طوفاں اُٹھا سکتا ہوں مَیں

داغ بن کر دل کی گہرائی کی لاتا ہوں خبر

بن کے دل پتھر کے سینے میں سما سکتا ہوں مَیں

دستِ آدم لکھ رہا ہے سر نوشتِ کائنات

اے خدا قسمت کے لکھّے کو مٹا سکتا ہوں مَیں

مردہ مِلّت تیرا لاشہ تک کہیں ہلتا نہیں

ورنہ قُم کہہ دُوں تو مُردوں کو جِلا سکتا ہوں مَیں

حامد علی خاں

مہاتما گاندھی سے بات چیت

ٹھیٹ اُردو میں

مہاتما جی۔ پرنام۔ ڈاکٹر تاراچند جی سے میں نے جو باتیں کیں وہ آپ نے سُنی تو ہوں گی۔ انہیں باتوں میں "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" پرچار کی بات چیت بھی چھڑ گئی تھی جس پر میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا۔ میں کبھی کھل کر اس پر گاندھی جی سے الگ باتیں کروں گا، اسے کئی مہینے ہو چکے۔ جب سے اب تک آپ سے باتیں کرنے کا رہ رہ کے دھیان تو آتا رہا پر ادھر اُدھر کے بکھیڑوں میں ایسا پھنسا جو ادھر آنا چاہئے یہ بھی اب تک نہ آسکا۔ کچھ دنوں سے ان جھمیلوں سے چھٹکارا ملا ہے۔ آج چاہتا ہوں جو کچھ جی میں ہے اور جو اب تک نہ کہہ سکا وہ سب ایک سانس میں آپ سے کہہ دوں۔ پرماتما کرے آپ ٹھنڈے جی سے اسے دیکھ سکیں۔ کس نے کہا اسے دیکھنے والے تو بہت ہیں اور کیا کہا اس کے پرکھنے والے بہت تھوڑے ہوئے اور ہیں اور ہوں گے۔ کون کہہ رہا ہے اسے چھوڑ کر کیا کہا جا رہا ہے اسی کو جانچئے اور برتا لیجئے۔

پہلے یہ جتا دینا چاہتا ہوں۔ دیس کے پیچھے آپ نے اپنا سکھ چین سب کچھ کھو دیا۔ اسی کے لئے آپ نے جوگ سادھا۔ نئے نئے ڈھب سے اس سنسار نے آپ کو جھنجھوڑا اور دُکھ پہ دُکھ دیئے۔ دوسرا ہوتا تو ست پٹا جاتا اور ہڑبڑا کے نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔ پر آپ ٹس سے مس بھی نہ ہوئے اور آپ نے یہ دکھا دیا:۔ نہیں لگتی ہے جونک سپنھر کو۔ دیس کے سُدھرنے کے لئے جو آپ نے اپنے جی میں ٹھان لی اُٹھتے بیٹھتے وہی دھیان ابھی تک ہے اور اپنا سب کچھ تج کے اس کے پیچھے آپ دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ ایسا بات کا دھنی اور دھن کا پکا ہونا ہنسی کھیل نہیں۔ ہند ماتا کی دُکھ بھری کہانی میں سے یہ آپ کی باتیں کسی کے بھلائے سے بھلائی نہیں جاسکتیں۔ یہ میں نے اس لئے لکھا کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں لکھنے والا مجھے اور آج تک جو میں نے کیا اسے جانتا ہی نہیں۔ جو کچھ کہنا ہے وہ تو پھر کہوں گا پہلے یہ ایک کہانی سُن لیجئے:۔

اِک برہمن، اِک چھتری، اِک ویش، اِک شودر، یہ چاروں الگ الگ گھرانوں کے نہ جانے کیسے ایک جگہ اکٹھے ہو کے جی بہلانے جنگل چلے۔ چلتے چلتے پیاس لگی۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈنے پر بھی کہیں پانی کی اِک بوند تک نہ ملی، اور آگے بڑھے تو سامنے اِک ایکھ دکھائی دی۔ لمبے لمبے اور موٹے موٹے پونڈے کھڑے جھومتے دیکھ کر سبھوں کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ لپک کے ایک نے چٹاخ سے ایک گنا توڑ لیا۔ دوسرے نے پٹاخ سے دوسرا۔ جو دو رہ گئے تھے۔ انہوں نے بھی ساتھیوں کی دیکھا دیکھی بڑھ بڑھ کے اپنے اپنے لئے اک اک توڑ لیا۔ گنے توڑتے ہی ایک دوسرے کو سراہنے لگا۔ سبھی کیا کہنا اتنا موٹا اور ایسا لمبا گنا ایک ہی جھٹکے میں

جڑ سے اُکھیڑ پھینکا۔ کیوں نہ ہو ہونا برہمن۔ برہمن نے کہا اور تم اپنے چھتری پن کو تو گنتے ہی نہیں۔ کتنا بڑا بانس کا بانس گنا کس پھُرتی سے اُکھیڑ لیا۔ ویش اور شودر میں بھی ایسی ہی باتیں ہوئیں۔

ایکھ والا وہیں کہیں آڑ میں کھڑا یہ سب سُن رہا تھا۔ سنتے ہی جی ہی جی میں کہنے لگا۔ ارے یہ تو سب کے سب الگ الگ گھرانوں کے ہیں۔ ان سے گنّے چھین لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ کہہ کے چلا اور ٹھٹکا۔ پھر کچھ سوچ ساچ کے اک لمبا سا چکر کاٹ کے ان چاروں کے سامنے آتے ہی ڈنڈوت کی اور ڈنڈوت کر کے ایک سے کہنے لگا۔ آپ تو ہمارے مائی باپ برہمن ہیں۔ دھرم اور اس کی پوجا پاٹ آپ ہی سے ہے۔ آپ نہ ہوں تو جگ میں دھرم پرچار کا اُجالا ہی نہ رہے اور پورے سنسار میں ایسا اندھیر اگھُپ ہو جائے جو ہاتھ سے ہاتھ نہ سجھائی دے۔ پھر چھتری سے بولا آپ ہی کے بھروسے پر راج جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ آپ ہی کی تلوار کی چھاؤں میں راج پاٹ پھُولتا پھلتا ہے۔ یہ چھاؤں نہ ہو تو وہ جھُلس جائے۔ آپ لوگوں سے بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویش سے کہا تمہاری کھیتی باڑی کا کٹھن دھندا بھی ایسا نہیں جو کوئی اس کا گُن نہ مانے۔ اسی سے سارا جگ بھلا چنگا دکھائی دے رہا ہے۔ نہیں تو گھڑی بھر میں ادھ مؤا ہو جائے۔ میں تم سے بھی کچھ نہیں کہتا۔ تم نے جو کیا اچھا کیا۔

اب ایک شودر ہی رہ گیا تھا۔ اسے گھُور کے کہنے لگا۔ کیوں بے ملیچھ! تیری یہ ڈھٹائی۔ تجھے تو کچّا ہی چبا جاؤں گا۔ اسے بتا۔ تو نے کیا سمجھ کے گنّ توڑا۔ یہ کہتے ہی اسے کھینچتا اور گھسیٹتا ہؤا اپنی جھونپڑی میں لے جا ہاتھ پاؤں باندھ کے ڈال آیا۔

چار میں سے ایک کی تو یوں چھیچ ہوئی۔ جو تین بچے وہ اپنے اپنے گنّے لئے لمبے لمبے ڈگ رکھتے آگے بڑھ ہی رہے تھے جو وہ ایکھ والا جھپٹ کے ویش سے آگے بڑھ گیا اور ڈانٹ کے کہنے لگا۔ او ہل چلانے والے تجھے بھی یہ دن لگے جو دن دہاڑے یوں ڈاکا ڈالنے لگا۔ یہ گنّے کیا تیرے ماتا پتا کے لگائے ہوتے ہیں۔ برہمن چھتری یہ تو ہمارے مائی باپ ہیں۔ ہم ان کے منگتا اور انہیں کا دیا کھاتے ہیں۔ لو۔ تو نے بھی پیٹ سے پاؤں نکالے اور ان کی ریس کرنے لگا۔ یہ کہہ کے اسے بھی پکڑ دھکڑ کے لے گیا۔

جب وہاں سے وہ چمپت ہؤا تو برہمن چھتری دونوں کے دونوں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ چلو ہماری تو کرکری نہیں ہوئی۔ یہ کہہ ہی رہے تھے جو وہ پھر دوڑتا ہؤا آگے بڑھ کے چھتری سے جا بھڑا اور اسے روک کر کہنے لگا۔ کیوں جی کیا تم چھتری ہو۔ چھتری کیا ایسے ہی لٹیرے ہؤا کرتے ہیں۔ بڑے آئے وہاں سے چھتری بن کے۔ ایسے چھتری وتری بہت سے دیکھے ہیں یہ کہتے کہتے اس کی بھی کولی بھر لی۔ چھتری نے بہت ہچر مچر کی اور پنڈت جی نے بھی بہت چھڑانا چاہا پر اُس نے کسی کی بھی نہ مانی اور اسے بھی جھونپڑی میں لے جا باندھ بوندھ کے ڈال آیا۔

برہمن کہنے لگے۔ ساتھی گئے تو گئے ہم تو بچ گئے۔ وہ کایاں ہتھ چھُٹ اور مُنہ پھٹ ایکھ والا بھلا ایک کو کیسے چھوڑ دیتا۔ پنڈت جی ہانپتے کانپتے بھاگوں بھاگ بڑھے چلے جا رہے تھے جو وہ پھر جھونپڑی سے نکلا اور نکلتے ہی وہیں سے للکارا۔ للکارتا ہؤا جھپٹا اور جھپٹ کے پنڈت جی کو بھی جا دبوچا۔

کہنے کو تو یہ ایک کہانی ہے۔ پر سمجھ والوں کے لئے اسی میں بہت سی سیکھنے کی باتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اپنی اپنی پڑی ہونے سے اک دُھن کے پکّے نے اپنے سے جوگنوں کو کیسے باندھ کے ڈال دیا۔ ان میں اتنا ہی ایکا ہوتا جیسے یہ سب مل کے ساتھ آئے تھے تو بھلا ایک تو ایک دُگنے تگنے بھی ایسے جھٹ پٹ ان کا بال بیکا نہیں کر سکتے تھے۔

آج کل دیس میں بھی ایسی ہی آپا دھاپی کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ راج نے کسی کو ڈھیل دی اور کسی کو جکڑ دیا۔ جدھر ڈھیل آئی اُدھر والے اپنے آپے میں نہیں — مونچھوں کو تاؤ دے دے کر لگے ہنکارنے اور ٹوپیاں اُچھالنے۔ یہ دھیان ہی نہیں آتا، ڈھیل دی تو کیا ہوا۔ ہیں تو سب کے سب بندھے ہوئے۔ اس کا بھروسہ ہی کیا آج کی ڈھیل کل کھنچ بھی تو سکتی ہے۔ ایک جگہ کا اُٹھنا بیٹھنا رہنا سہنا۔ اس پر آپس میں آئے دن کی دانتا کلکل۔ "ساہتیہ پریشد" میں جو آپ نے کہا۔ کوئی اور اس سے بڑھ کر بھی کہتا تو اسے کوئی دیکھتا بھی نہیں۔ اچھا تو اسی کا ہے آپ کے منہ سے ایسی ایسی باتیں نکلیں جو کوئی دوسرا کہے تو سب انہیں اٹکل پچو سمجھیں۔

پہلے تو یہی دیکھ لیجیے۔ دیس کے لئے ابھی کیا کچھ کرنا نہیں۔ آپ برسوں سے نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے جگانا چاہتے ہیں۔ پھر کیا سب کے سب جاگ اُٹھے، بہت سے بہت ہوا تو یہی گھوڑے بیچ کے سونے والوں نے آپ کے جھنجھوڑنے سے ہوں ہوں کر کے کروٹوں پہ کروٹیں لیں۔ ہاتھ ادھر جھٹکے پاؤں اُدھر پٹکے جمائیوں پہ جمائیاں اور انگڑائیوں پہ انگڑائیاں لیتے لیتے پھر آنکھیں میچیں اور پھر خراٹے لینے لگے اور آپ کا جھنجھوڑنا ان کے لئے لوری بن گیا۔

"ساہتیہ پریشد" کی دھوم دھام بتا رہی ہے۔ دیس کے لئے جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ سب ہو چکنے سے سب انند اور نچنت ہو کر نئی بھاشا کے پرچار میں لگے ہوئے ہیں۔ بھاشا واشا کی دیکھ بھال جانچ پرتال ناپ تول کا کھڑاگ اس گھڑی کے لئے ہے جب کٹھن باتوں میں سے ایک ایک کر کے سب کی سب پوری ہو چکی ہوں۔

دیس کس جنجال میں پھنسا ہوا ہے۔ کنگلاپن کتنا بڑھتا چلا جاتا ہے اور پورا دیس کیسا اپاہج ہو کے رہ گیا ہے۔ اپنے بل بوتے پر آج تک نہ یہ کچھ کر سکا اور آپس ہیں بھی تناریری رہی تو آگے بھی یہ کچھ کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ جب ابھی تک دیس کی کسی بات کا بھی ٹھیک ٹھاک نہیں تو سب چھوڑ چھاڑ کے پہلے دیس ہی کو سُدھاریئے پھر جو جی چاہے وہ کیجیے۔

گھر میں تو ہنڈس پڑی ہے۔ کہرام مچا ہوا ہے۔ بھیانک چیخوں سے کان پھٹے جا رہے ہیں۔ جیسے بھیڑوں کا ریوڑ تتر بتر ہو کے اِدھر اُدھر مارا مارا پڑا پھرتا ہو۔ ایسے ہی دیس والے بھی ہیں۔ آپس میں جوتی پیزار، گالم گلوج اور بھوگ سنائے جا رہے ہیں۔

ایسے دنوں میں "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کی نیو رکھنا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کے پرچار پر اڑنا ایسا ہی ہے جیسے کسی گھر میں تو آگ لگی ہوئی ہو دھڑ دھڑ گھر جل رہا ہو اور اس کے رہنے والے آگ بجھانے کی جگہ نئے گھر کا ڈزائن، چھت کی اونچائی چھت کی بناوٹ، انگنائی کی چوڑائی، جھروکوں کھڑکیوں کی لمبائی اور پورے گھر میں کہاں کہاں پھول پتیاں بنائی جائیں گی، گھر سجنے کے

لئے اور کیا کیا ہونا چاہئے ایسی ایسی باتیں کھڑے سوچتے رہیں۔ گھر بنے پیچھے اس کے سجنے کے لئے آپ جو چاہیں کریں۔ کوئی ٹوک نہیں سکتا۔ گھر بنا کیسا ابھی تو بھرا گھر اُجڑ رہا ہے اور اس کے بننے کی گھڑی آنے تک نہ جانے ابھی کیا کیا ہونا ہے۔ تو ایسی کھچڑی پکانا آپ کے لئے تو ٹھیک نہیں۔

یہ تو سوچئے۔ آپ کدھر جا رہے تھے اور لوگوں کے بہکانے سے بھٹک کے کدھر چلے آئے۔ چلے آنے میں تو کچھ نہ تھا۔ پر اَڑنا اور یہیں جم کے بیٹھ جانا تو اچھا نہیں۔

کوئی بڑا اکیت جیالا چھکیت منچلا سورما اپنا سب کچھ لُٹا کے دُہری تہری بیڑیوں ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دیس والوں کے چھڑانے کی دُھن میں جھٹ پٹ اُٹھ کھڑا ہو اور لڑائی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں کود کے سوجھ بوجھ اور نت نئی گھاتوں سے جم کے ایسا لڑے جو دوسروں کے دانت کھٹے کر دے اور چھکے چھڑا دے۔ پھر وہی ایکا ایکی لڑائی بھڑائی چھوڑ چھاڑ گھومتا گھماتا بھاشا کے پرچار کرنے والوں میں آ بیٹھے اور ان کے سکھانے پڑھانے سے انہیں کا ساتھ دینے پر اَڑ جائے تو اسے یہاں بیٹھا دیکھ کے دیکھنے والے اپنی اپنی سی کہنے لگیں گے۔

جتنے منہ اتنی باتیں ہوں گی۔ ساتھ ہی سوجھ بوجھ والے بھی یہی کہیں گے۔ ایسے منچلے کے لئے سب سے پہلے دیس ہی کی سیوا چاہئے۔ دیس کے پورے بندھن جب کھل چکیں تو بھاشا وا شا کا پرچار سب کچھ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہو سکتا ہے۔ اور جب تک دیس نہ سنبھلے تب تک ایسے اُلجھاوے میں اُلجھنا نہ چاہئے۔

بکسر کی لڑائی سے ایک بانکے منہ موڑ کے چلے۔ دیکھنے والوں نے ٹوکا۔ ہائیں یہ کیا؟ آپ کی بکیتی پھکیتی کی تو دھوم تھی۔ بڑے بڑے جیالے لوہا مانتے تھے۔ جب آپ ہی نہ جم سکے تو پھر کون جمے گا اور اس گڑھی کو پھر کون جیتے گا اس ٹوکنے پہ بانکے بپلٹے اور جھنجھلا کے کہنے لگے۔ کیا کہتے ہو۔ تم کیا جانو۔ تمہیں تو یہی آتا ہے جو منہ میں آیا بک دیا۔ کیا کہیں ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھ لیا ایسے ایسے پٹھے جو نک سک سے ٹھیک ڈیل ڈول کے اچھے پورے اور ایسے سجیلے جدھر سے نکل جائیں دیکھنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں اور چھوٹے بڑے سب کی ٹکٹکی بندھ جائے۔ ان میں ایک ایک سینکڑوں پہ بھاری رہتا بھی ہو تو لاکھوں کے ٹڈی دل میں گھس کے دانتوں سے بوٹیاں کاٹ کاٹ کے تھوک دے اور منچلوں کا پتا پانی کر دے۔ ایسے ایسے جیالوں کے دھڑ گولیوں سے چھلنی چھلنی ہوتے ہوئے دیکھے۔ اس سب کچھ ہونے پر بھی دیکھنے کی بات یہ ہے جس جگہ ان کے پاؤں جم گئے پھر وہاں سے نہ ہٹے اور وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے ٹھنڈے ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی لڑائی ہے۔ اس سے تو بھیڑوں کی لڑائی اچھی۔ کوس بھر سے دَن دَن ہونے لگی اور یہاں جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی تلوار کے دھنی تھے تو منہ کیوں چھپایا۔ آمنے سامنے ہو کے دو دو ہاتھ ہمارے بھی دیکھ لئے ہوتے۔ کھیرے ککڑیاں جیسے کٹتی ہیں ایسے ہی گھڑی بھر میں پرے کے پرے کاٹ کے نہ رکھ دیتے تو یہ اپنی مونچھیں منڈا ڈالتے۔ اب یہ جگہ منچلوں کے ٹھہرنے کی نہیں اور سچ تو یہ ہے اب جینا دُوبھر ہو گیا۔

پہلے کبھی بانکوں کی بڑی دھاک تھی اور ہوتے بھی تھے بڑے تلوریئے پھر بھی ان میں اول جلول پن بہت ہؤا کرتا تھا پر آپ تو ایسے نہیں ۔ آپ میں جو سمجھ سوجھ بوجھ اور اچھی اچھی باتیں پرمیشر نے اکٹھی کر دی ہیں ۔ وہ پہلے کے بانکوں میں کہاں ۔ آج آپ ہی ہند ماتا کے اکلوتے بانکے ہیں ۔ دیس کا اکھاڑا کھلا ہؤا ہے اور اس میں برسوں سے راج کے ساتھ آپ کی گتھم گتھا ہو رہی ہے دونوں ایک دوسرے کو رگید رگید کے چت کرنے کی گھات میں لگے ہوئے ہیں ۔ دیکھنے والوں کے جھنڈوں کے جھنڈ اور لونڈوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں جمائے آپ کے اس بھڑنے کو بڑے اچنبھے سے دیکھ رہی ہیں ۔ پر کچھ دنوں سے جو آپ اس اکھاڑے سے نکل کر دوسرے دھندے میں لگ گئے ۔ اس پر اپنے پرائے سب میں کانا پھوسی ہو رہی ہے اور کہا جا رہا ہے مہاتما جی سیدھے جاتے جاتے یہ کدھر مڑ گئے ۔

آپ کے اِدھر آنے سے دیس کی بات کیسی ادھوری ہو کے رہ گئی تو پھر اُدھر ہی جایئے نا ، اور دیس ہی کے لئے جو بن پڑے وہ کیجے ۔ رہا بھاشا کی گتھیاں سلجھانا اسے پھر کے لئے اُٹھار کھیئے ۔ بھاشا کیا کہیں بھاگی جا رہی ہے ، جو اس کی روک تھام ابھی ہو سکتی ہے پھر نہ ہو سکے گی ۔ جدھر آپ جا رہے تھے اس کے سامنے بھاشا واشا ہے کیا ، انند ہو کے ایسے سینکڑوں کھیل کھیلے جا سکتے ہیں ۔

گاؤں میں دیکھا ہو گا جو ہاٹ آج بھرا پھر سات دن تک یونہی سنسان پڑا رہتا ہے ۔ اس سنسار میں جو جو دھندے لوگ کر رہے ہیں کچھ ہی دنوں کے لئے ان دھندوں سے انہیں الگ رکھا جائے تو وہ پہلے سے نہیں رہتے ۔ سینے پرونے والوں سے سلائی ، بڑھیوں سے لکڑی کی چیر چار ، لہاروں سے لوہے کی پیٹ پاٹ ، کمہاروں سے مٹی کی تھوپ تھاپ ، لکھنے پڑھنے والوں سے لکھت ، پڑھت ، بچار ، بہت نہیں ، تھوڑے ہی دنوں کے لئے یہ ان سے چھڑا کے دیکھ لیجے ۔ ان میں سے کسی میں بھی پہلے کی سی بات نہیں رہے گی ۔

آج جو کرنا ہے اسے کل کے لئے اُٹھار کھنے پر بات آئی گئی ہو جاتی ہے ، آج کا دھندا آج ہی کے ساتھ ہے اسے آج ہی پورا ہو جانا چاہئے ، کل کا دھندا آج سے الگ ہو گا ۔ آج کی بات کل پر چھوڑ دی تو کل کی پرسوں اور پرسوں کی اترسوں پر چھوٹتی رہے گی اور یونہی چھوٹتے چھوٹتے پھر وہ بات ہی چھوٹ جائے گی ۔ بات ادھر ٹھنڈی پڑی تو پھر دھیان بھی ٹھٹر کے رہ جاتا ہے تو ابھی دیس کی بات ٹھنڈی نہیں پڑی ہے ۔ یہ سماں ابھی ایسا ہے جس میں بھاشا واشا کو چھوڑ چھاڑ کے پھر آپ دیس کو پکڑ سکتے ہیں اور اس کے لئے ان تھک دوڑ دھوپ کر سکتے ہیں ۔ آپ کی دوڑ دھوپ باسی کڑھی کا اُبال نہیں جو کچھ نہ ہو سکے ۔ آج کچھ نہیں ہے تو کل کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا اور آگے بڑھ کر آنکھیں یہ سہانا سماں دیکھیں گی ۔

دیس میں میل ملاپ کے جھنڈ کے جھنڈ ایسے چھائے ہوئے ہیں جن کی گھنی چھاؤں میں پریم جل انگڑائیاں لیتا بہ رہا ہے ۔ ایک کے من کی ٹہنیاں دوسرے کے من میں کھچڑی ہو رہی ہیں ۔ پیار کی بیل میل جول کے پھپکتے ہوئے پودوں پر چڑھی جا رہی ہے ۔ پریم کے پھولوں کے گچھے کے گچھے اِدھر اُدھر لٹک رہے ہیں ، سکھ چین کے پھولوں کی بھینی بھینی باس سے دیس

کا دیس بسا ہوا ہے۔ دھن برسانے والی گھنگھور گھٹائیں سنسار کی آنکھوں میں کاجل لگا رہی ہیں۔ کالے کالے بادلوں کے بھاٹ رہ رہ کے دیس کے گیت گا رہے ہیں۔ کوئل کی کوک، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، ہلکی ہلکی پھوار، سانولی سانولی گھٹاؤں کے اندھیرے گھپ میں رہ رہ کے بجلی کی چمک، جیسے کسی جوبن کی متوالی کے بھیگے ہوئے بال سکھانے کے لئے جھٹکنے میں گھڑی گھڑی منہ پہ آجاتے ہیں ایسے دھندلکے میں دیس کے سپوت آپ کے چرنوں میں جھکے ہوئے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور آپ دیس کی ہری بھری پھلواری کے منڈوے میں ایسی شبھ گھڑی کو دیکھ دیکھ کے مسکرا رہے ہیں۔

اچھا۔ لگے ہاتھوں اپنی اس نئی بھاشا کو بھی دیکھتے چلئے جس کے پرچار کی دھن میں آپ اپنا اب تک کا کیا کرایا سب اکارت کر دینا چاہتے ہیں۔ اُردو میں عربی فارسی بولوں کی بہتات سے ایسا دھوکا کھایا جو کھلم کھلا آپ یہ کہہ اُٹھے۔

"اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ کہاں مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا اور کہاں اُردو، دونوں میں کوئی تک بھی ہے۔ ایسی بات منہ سے نکالنے سے پہلے آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو ہی سے پوچھ لیا ہوتا۔

ہندی اور اُردو کے جھگڑے پر پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈاکٹر سید محمود کو جو ایک لمبی چوڑی چٹھی لکھی تھی اس میں ایک جگہ پنڈت جی یہ لکھتے ہیں:-

"عجیب بات تو یہ ہے کہ نجانے ہمارے ملک میں کتنی چیزیں ہیں جو فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ زبان کا مسئلہ بھی مذہبی بن گیا اور بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ میں بصد ادب عرض کروں گا کہ میں اسے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اُردو کو اپنی زبان سمجھتا ہوں جسے میں بچپن سے بولتا چلا آیا ہوں۔"

لیجیے۔ پنڈت جی تو اُردو کو اپنی ایسی بھاشا سمجھ رہے ہیں جسے وہ بچپن سے بولتے چالتے ہیں اور آپ اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا کہنے پر اڑے ہوئے ہیں، اب آپ ہی بتائیے۔ سننے والا کس کا کہا مانے کسے جھٹلائے اور کسے سچ جانے۔ اسی کے ساتھ ساتھ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے مسلم یونیورسٹی یونین میں اُردو کانفرنس کے اسٹیج پر "اُردو ہماری زبان" کہہ کر جو لمبی چوڑی اسپیچ پڑھی اسے بھی کہیں کہیں سے سن لیجئے۔ پنڈت جی اسی میں ایک جگہ یہ کہتے ہیں:-

"اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اُردو قوموں کے میل جول اور دیس بدیس زبانوں کے اختلاط سے پیدا تو ہو گئی لیکن بعد میں بھی ہندو اس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے۔ حضرات میں اس تنقیح کو گم میں رکھنا پسند نہیں کرتا۔ سنئے ہندوؤں میں تبلیغِ مذہب تو عرصہ سے بند ہو چکی تھی۔ قریباً دو ہزار برس کے بعد اب پھر تازہ ہوئی ہے۔ اس واقعہ کو نظر میں رکھ کر دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں میں دھرم پرچار کے سلسلے میں اُردو اختیار کی گئی یا

نہیں۔ اگر تحقیق سے اس کا جواب اثبات میں ملے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُردو کو ہندوؤں نے اپنے ہندو بھائیوں کی دینی ہدایت کے لئے استعمال کیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوّل برسوں میں اچھوت ادھار اور ہریجنوں کی تبلیغ یا شدھی کا نام تک کوئی نہ جانتا تھا مگر ۱۸۱۹ء میں سریمو بھاگوت کا دسواں اسکندلینی باب' اردو کی ایک ضخیم مثنوی مسمی آئینۂ مستور کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ کئی سو صفحے کی قلمی کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ مذہبی اور اعتقادی کتاب ایک ہندو اپنے ہندو بھائیوں کے لئے اچھی اُردو نظم میں تصنیف کرتا ہے۔"

پھر پنڈت جی نے ہندو دھرم کی لائبریری میں سے ایسی بہت سی چھوٹی بڑی اُردو لکھتوں کا اتا پتا دیا ہے، جو پوری کی پوری ہندو دھرم کی باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ گھر کے بھیدی کی یہ باتیں بھی سننے کی ہیں:۔

"سنسکرت اور ہندی بھاشاؤں کے ہوتے ساتے ہندوؤں نے اُردو کو اوراد و وظائف سے یا زیادہ احتیاط سے یہ کہئے کہ مذہبی اور ملی تقریبوں سے خارج نہیں کیا۔ شکتی چالیسی ایک اُردو کی کتاب' استوتر' یعنی وظیفہ کی ہے۔ یہ اُردو کے مخمس ترجیع بند کی صنف سے ہے۔ ہر بند کے چار مصرعے ٹھیٹ اُردو میں ہیں اور ترجیع کا مصرع "تمس تسی" چار بار آتا ہے، اس کو میں نے پوجن کے سلسلے میں وظیفہ یا مناجات کی طرح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ "تلسی داس" رامائن لکھ چکے تھے۔ اس کی کتھا برابر ہو رہی تھی۔ مہابھارت اور بہت سے پران اور دوسری مذہبی کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی تھیں لیکن اپنے اہالیٔ ملت میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوئی جب تک کہ اُردو سے کام نہیں لیا گیا، اس ضمن میں وہ" تمام اُردو دُنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے مہابھارت، رامائن، گیتا، مہاتم، شوپران، گنیش پران اور جانکی بجے وغیرہ دھرم پستکیں اُردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ یہ کتابیں منشی نول کشور کے مطبع سے چھپ کر آج تک شائع ہو رہی ہیں اور ہندوؤں میں ان کے مذہب کی تلقین اور روایاتِ ملی کے زندہ رکھنے کا زبردست آلہ ہیں۔ ان نظم کی کتابوں کے علاوہ بہت سے اُپنشد اور چھوٹی شاستر اور سمرتیاں اُردو نثر میں منتقل ہو کے شائع ہوئیں اور آج تک اُن کی مانگ برابر جاری ہے۔ یہی حال آریہ سماج کے لٹریچر کا ہے۔"

یہ کہانی کہتے کہتے پنڈت جی نے کہی ہوئی باتوں کو پھر ایک جگہ اکٹھا کر کے اک چیلنج بھی دیا ہے جس کا نچوڑ یہ ہے:۔

"آپ نے دیکھا کہ اُردو کی تعمیر و تدوین، اور ترویج میں ہندوؤں کا کتنا مقتدر حصہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ہندوؤں کی مذہبی اور ملی کتابیں کس کثرت سے اُردو میں لکھی گئیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ بھگوت گیتا کے ایک سے زیادہ نئے ترجمے اور تفسیریں اُردو نظم اور نثر میں ہر سال بلا ناغہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ہندی والا (میرا مطلب ہے اُردو ہندی کے جھگڑے کا علمبردار) اس وقت یہاں موجود ہے تو سامنے آ کر بتائے کہ جو واقعات ابھی پیش کئے گئے ان میں سے کونسا صداقت سے محروم ہے۔"

پنڈت کیفی کی باتیں سنتے سنتے آپ اُکتا ہو گئے ہوں گے۔یہاں تک تو آپ سُن ہی چکے۔گنتی کی دو ڈھائی باتیں اور سُن لیجیے۔یہ لکھت کسی مسلمان کی ہوتی تو سچ مانئے اس میں سے دو بول بھی کبھی یہاں نہ لکھتا۔پر اس کا لکھنے والا ہندو اور ہندو بھی ایسا ویسا نہیں بڑی سوجھ بوجھ کا پنڈت ہے جس کی آنکھیں سچائی پر جمی ہوئی ہیں۔اپنے ساتھ کے بھٹکے ہوؤں کو پکار پکار کے ادھر ہی بلانا چاہتا ہے جدھر سچائی کا اُجالا ہے۔اس کی لکھت کے ایک ایک بول سے یہی دکھائی دیتا ہے۔جن باتوں سے دیس نڈھال ہوتا جا رہا ہے۔ان پر وہ جی ہی جی میں کڑھ رہا ہے اُونٹ رہا ہے اور بھرا بیٹھا ہے۔اس لکھت میں جی کی بھڑاس نکالی ہے اور پتے پتے کی باتیں ایسی ایک جگہ اکٹھی کر دی ہیں جنہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔اسی میں ایک جگہ پنڈت جی نے یہ بھی لکھا ہے:۔

"جب مہاتما گاندھی نے اپنے سابرمتی کے آشرم کی بھجناولی مرتّب کرنے کا حکم دیا۔اس وقت بھارتیہ ساہتیہ کا یہ نظریہ جواب ناگپور میں ہنگامہ آرا ہؤا کہاں چلا گیا تھا یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہو گا کہ مہاتما جی کے مرحوم سابرمتی آشرم کے بھجنوں کے اس ہندی کے مجموعے میں کل ۱۸۱ بھجن ہیں جن میں ۱۰۲ بھجنوں کو ہندستانی نام دیا گیا ہے باقی ۹ بھجن گجراتی مرہٹی وغیرہ دوسری زبانوں کے ہیں اور یہ واضح رہے کہ ان ۱۰۲ ہندستانی بھجنوں میں کئی غزلیں بھی ہیں جیسے:۔ ہے بہارِ باغِ دُنیا چند روز دیکھ لو اس کا تماشا چند روز
یہ بھجناولی ہندی میں چھپی ہے۔اب اگر اُردو کے لفظ سے کسی وجہ سے بے اعتنائی ہو گئی تھی تو بھارتیہ ساہتیہ میں ہندستانی ہی سے کام رکھتے۔"

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی کیا یہ سب باتیں ٹھیک ہیں۔اچھا انہیں چھوڑیئے۔بیچ میں بات میں سے بات نکل آئی اور جو کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا۔میں یہ کہہ رہا تھا اُردو میں آپ نے عربی، فارسی بولوں کی ریل پیل دیکھ کے اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا سمجھ لیا۔دیکھئے بات یہ ہوئی، اُردو کی جب نیو ڈالی جا رہی تھی تو یہاں کے چھوٹے بڑے جتھے سب ہی اس میں لگے ہوئے تھے اور مسلمانوں کا راج تھا اس لئے عربی، فارسی کے بول اُردو میں آئے اور بہت آئے اور جو مسلمان راج کی جگہ کوئی اور راج ہوتا تو اُس راج کی بھاشا کے بولوں کی بھیڑ کی بھیڑ اُردو میں لگ جاتی۔کسی بھاشا میں اور دوسری بھاشا کے بولوں کی بھرمار دیکھ کر بے سوچے سمجھے کہہ دینا یہ بھاشا اس جتھے کے دھرم کی بھاشا ہے سوچئے تو یہ کتنی بڑی بھول ہے۔آج کل اُردو میں انگریزی بول بڑھتے جا رہے ہیں۔کوئی نہ جاننے والا انگریزی بولوں کی بہتات دیکھ کر اُردو کو انگریزوں کے دھرم کی بھاشا کہنے لگے تو سچ کہئے اس کے اس کہنے پر کیا آپ اپنی ہنسی روک سکیں گے۔

دھرم اور بھاشا ان دونوں کے ڈانڈے الگ الگ ہیں۔ان دونوں کے گھال میل کو جس سے پوچھئے یہی کہے گا یہ کوئی اچھی بات نہیں۔جب دھرم اور بھاشا کا آپس میں گڈمڈ کرنا ٹھیک نہیں کہا جاتا تو منہ سے جو کہا جا رہا ہے وہ کیا کیوں نہیں جاتا۔چبا چبا کے باتیں کرنا کس لئے۔دونوں کا میل جول اچھا لگتا ہے تو کھل کر کہہ دیجئے دھرم اور بھاشا کو ہم الگ الگ نہیں دیکھ سکتے،

اور دونوں کو ملا دینا چاہتے ہیں ۔ اس کہنے پہ بھی کوئی آپ کو ٹوکے تو اسے جو جی چاہئے کہئے ۔ پر جب تک آپ مُنہ سے یہ نہ کہیں گے تب تک پُوچھا گچھی کی لے بڑھتی ہی رہے گی ۔

پہلے پہل جو بھاشا کے جھگڑے کی بھنک کانوں میں پڑی تو مَیں نے جی میں کہا ۔ کہیں ایسا تو نہیں نئے نئے مولوی ملّا اپنی بڑائی جتانے کے لئے چھانٹ چھانٹ کے ایسے موٹے موٹے اور بھاری بھاری عربی فارسی کے بول بات چیت میں ٹھونستے ہیں جو بہت سے ہندو نہیں سمجھ سکتے ۔ یہ بات ہندؤں کو بُری لگی ہو اور جھلّا کر اُنہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چُننے کی ٹھان لی ہو ۔ ساتھ ہی یہ بھی دھیان آیا ایسا تھا بھی تو اس کا یہ توڑ تو نہ تھا جو کیا جا رہا ہے ۔ وہ بات ہی کیا تھی ۔ دونوں جگہ کے لکھے پڑھے سمجھ والوں کو بُلا لیا ہوتا یہ سب ایک جگہ بیٹھ بٹھا کے گھڑی دو گھڑی میں یہ جھگڑا اُچکا دیتے ۔

یہ بھی آج کل کا اک نیا ڈھکوسلا ہے ۔ جسے دیکھیئے "اردو" اور "ہندی" کا منتر پڑھ رہا ہے اور اس کی مالا جپ رہا ہے ۔ بہت سے پڑھے لکھوں سے یہ پہیلی بُوجھی جا چکی ۔ میرا پُوچھنا ہی تھا اور ہے ۔ جب اُردو کا ڈیل ہندی ہی کی مٹّی سے بنا ہے تو پھر اُردو کے ساتھ اور "ہندی" لکھنا کس لئے ۔ اُردو میں ہندی ایسی پیری ہوئی ہے جو کبھی اس سے الگ ہی نہیں ہو سکتی اور کیسے الگ ہو سکتی ہے ، جب اُردو کی کھال ، چمڑا ، ہڈیاں ، ڈھانچہ جو کچھ ہے وہ ہندی ہی ہے ۔ اپنی اپنی سب کہہ رہے ہیں اور اسے کوئی دیکھتا ہی نہیں یہ ہے کیا ۔ جانچیئے تو گھڑی بھر میں دودھ کا دودھ ، اور پانی کا پانی الگ الگ دکھائی دینے لگے گا ۔ اس کے پرکھنے اور جانچنے کا ڈھب یہ ہے :۔

دو اچھے پڑھے لکھے سامنے بٹھا کے ایک سے کہئے تم ایسی اُردو لکھو جس میں عربی فارسی بولوں ہی کی ریل پیل ہو اور بھولے سے بھی کہیں ہندی کا ایک آدھ بول تک نہ آنے ۔ ہندی کے کسی بول کے نہ آنے پہ بھی پوری لکھت اُردو ہی رہے ۔ دوسرے سے کہا جائے تم عربی ، فارسی کو ہاتھ نہ لگاؤ اور ایسی اُردو لکھو جس میں عربی ، فارسی بولوں کی کہیں چھاں نہ آئے اور پوری کی پوری لکھت ٹھیٹ اردو رہے ۔ تو پہلا ایسے ڈھائی بول بھی نہیں لکھ سکتا جس میں اُردو پن رہ سکے ۔ پہلے لکھنے والے کی لکھت عربی ، فارسی بولوں کی ایسی کھچڑی ہو کے رہ جائے گی جسے اُردو سے نہ کوئی لگاؤ ہوگا اور نہ کوئی اسے اُردو کہہ سکے گا ۔

دوسرا لکھنے والا عربی ، فارسی بولوں کی بھیڑ چیرتا ، ہٹاتا آگے بڑھ کے ٹھیٹ اُردو لکھ سکتا ہے ۔ تو اُردو لکھنے اور بولنے میں ہندی سے کترا کے کوئی کتنا ہی نکلنا چاہے کبھی نہیں نکل سکتا اور کیسے نکل سکتا ہے ، جب اُردو کے پُتلے میں پُوری مٹّی ہندی ہی کی لگی ہوئی ہو ، باہر والی بولیوں میں سے عربی ، فارسی بول اس میں بہت سی پر ہندی کے آگے وہ ایسے ہی ہیں جیسے موسلا دھار مینہ کے سامنے پانی کی کچھ بوندیں ۔

یہ کبھی نہیں ہو سکتا ، جو ہندی کو نہ چھوڑا جائے اور عربی ، فارسی بولوں ہی کی اُلٹ پلٹ سے اُردو لکھت اور بات چیت ہو سکے ۔ ہندی کو ہاتھ نہ لگانے اور عربی ، فارسی کے اکٹھا کر دینے سے اُردو نہیں رہ سکتی ۔ اُردو میں سے عربی ، فارسی بول نکال کے یوں

لکھا جا سکتا ہے جیسے لکھنے کا یہی ڈھنگ جس میں آپ سے باتیں کی جا رہی ہیں۔ جب کسی جتن سے بھی ہندی کو اُردو سے الگ نہیں کیا جا سکتا تو پھر اُردو کے ساتھ ساتھ" اور ہندی" کا ٹکڑا کس لئے بڑھایا جا رہا ہے۔ کیا آپ یہ بتا سکیں گے؟

اور سُنئے۔ پھُل گیندا نہ مارو لگت کلیجوا میں چوٹ، سائیں سے سچارہ اور بندہ سے ست بھاؤ، مو پہ ڈار دیو سارے رنگ کی گگر۔ یہ سب اور لکھنے کا یہ ڈھب جس میں بات چیت ہو رہی ہے، ان میں سے آپ کسے ہندی کہیں گے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا جو ایک لاٹھی سے سب کو ہانک دیں اور کسی کو بھی آپ ہندی نہ کہیں۔

اچھا ان میں سے آپ جسے بھی ہندی کہیں اپنے بنارس کے "ہنس" کو اس سے ملا کے تو دیکھئے۔ ہنس کی لکھت کیا اس کی سی ہے۔ آپ ہنس کی لکھت کے ڈھب کو کٹھن نہیں سمجھتے نہ سمجھئے۔ اوروں سے پڑھوا کے تو دیکھئے۔ اسے سب پڑھ بھی تو نہیں سکتے اور کیسے پڑھ سکیں گے۔ اس کی ایسی نرالی لکھت ہے جو پہلے اور آج کل کے ہندؤوں کی لکھت سے میل ہی نہیں کھاتی۔ "ہنس" اور کچھ ہنس والوں کو چھوڑ کے ہندؤوں ہی میں سے کیا دو ایک کی بھی ایسی لکھت آپ دکھا سکیں گے۔ ہنس میں ادبدا کے ایسے ایسے من مانے کڈھب سے کڈھب بول ٹھونسے جا رہے ہیں اور ایسے بھولے بسرے بولوں کی بھرمار کی جا رہی ہے جن کے سمجھنے کے لئے مسلمان تو مسلمان ہندؤوں کو بھی سنسکرت کی ڈکشنری دیکھنا پڑتی ہے۔ آج کل کے نئے ہندی لکھنے والوں کی نہ کہئے یہ سب ادوان کے توتے ہیں۔ کچھ لکھنا لکھانا ہوا، جھٹ سے سنسکرت کی ڈکشنری گھسیٹ لی۔ اسے سامنے رکھ کر آئیں بائیں شائیں جو جی میں آیا بھولے بسرے بول کے بول دیکھ دیکھ کے لکھتے چلے گئے۔ یہ میں نہیں کہتا۔ ان کے لکھنے کا ڈھب آپ پُکار پُکار کے کہہ رہا ہے۔

سنسکرت کا ہندو دھرم کی بھاشا ہونا اور اس بھاشا کا کبھی نہ برتا ہوا پھیلاؤ کون ایسا لکھا پڑھا ہے جو نہیں جانتا، اس میں دیکھنے کی جو بات ہے وہ یہی ہے، سنسکرت جب سُہاگن تھی اور راج کی چہیتی بھاشا سمجھی جاتی تھی تب بھی چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب اسے نہیں بول سکے۔ کچھ ہی لوگ تھے جو اس میں بات چیت کر سکتے تھے۔ تو راج کی بھاشا ہونے پر بھی جب یہ سب کی بھاشا نہ بن سکی تو اب کیا بن سکتی ہے۔ راج کے پانی ہی سے جو پودا نہ پھیک سکا وہ بھوبل میں کیا پھل پھُول سکتا ہے۔ پھُلواری کی دیکھ بھال اور اس کے ٹھیک ٹھاک ہونے پر بھی جو پھول نہ کھل سکے تو اب پت جھڑ میں کیا کھلیں گے۔ جس مچھی بھون کو راج بھی نہ بنا سکا تو راج کی دھوپ ڈھل چکنے پر وہ کیا بنتا۔ جب دانت تھے جبھی جو چنے نہ چب سکے تو دانت ٹوٹنے پر وہ کیسے چبائے جا سکتے ہیں۔ وہ پُرانے ڈھنگ کے سڈول موتی جو راج کا سنگھار ہونے پر بھی مٹی میں اٹے رہے اب ٹوٹ پھوٹ پر ان کی جھاڑ پونچھ ہو بھی تو کیا۔

پھر یہ بھی دیکھئے۔ آج جس نئے گھر کی نیو رکھی جا رہی ہے۔ یہ بنتا بھی رہا تو کب تک پورا بن سکے گا۔ بھاشا کا گھر اور گھروں کا سا تو نہیں جو کچھ دنوں میں بن بنا کے پورا ہو گیا اور اس میں گھر والے رہنے سہنے لگے۔ بھاشا کا گھر بنانا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور

پھر یہ ایک آدھ جتھے کے بوتے کا روگ نہیں۔ اس کے بنانے کے لئے سب کا ایکا اور بڑی سُوجھ بُوجھ چاہیئے۔ یونہی سی آنکھ بچی اور کچھ سے کچھ ہو گیا یونہی سی چُوک ہوئی اور کی کرائی باتوں پر پانی پھر گیا۔

نہ ماننے اور اپنی بات کی پیچ کرنے کی تو اور بات ہے۔ پر ٹھنڈے جی سے دیکھئے تو آپ کی اُردو میں وہ سب باتیں پائی جا رہی ہیں جو بڑھنے والی بڑی سی بڑی بھاشا میں ہونا چاہئیں اور جو سچ کہنا کوئی پاپ نہ ہو تو مجھے یہ کہنے دیجے۔ اُردو میں کچھ پھیلاؤ کی ایسی ایسی باتیں چھپی ہوئی ہیں جو اوروں میں نہیں۔ ابھی اس کا چُھٹپنا ہے۔ اس چُھٹ پن ہی میں بھولی بھولی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ چنچی تُلی گہری گہری باتیں بھی اس میں ہیں جنہیں دیکھ کر اچمبا ہوتا ہے۔ بڑے بوڑھوں نے سچ کہا ہے۔ بہو کے بول گھونگٹ میں اور پوت کے پاؤں پالنے میں اس پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھئے تو جب ابھی سے اس کی اَدھ کٹی باتیں جی موہے لیتی ہیں تو آگے کیا ہو گا۔ کسی بھاشا کے پھیلاؤ کے جانچنے کے لئے اور بہت سے ڈھبوں میں سے ایک ڈھب یہ بھی ہے:۔

جگ میں لوگوں کی چُھٹائی بڑائی ایک سی نہیں ہوتی۔ سنسار میں یہی ہوتا آیا ہے۔ کوئی چھوٹا ہے تو کوئی بڑا۔ کوئی بہت چھوٹا ہے تو کوئی بہت بڑا کوئی راجہ ہے تو کوئی مہاراجہ۔ کوئی اس کی چوکھٹ کا منگتا ہے اور کوئی اس منگتا کے گھر کا بھکاری۔ ایسے ہی تھوڑی بہت اونچ نیچ اور سینکڑوں اُتار چڑھاؤ لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ تو جس بھاشا میں ایسے اُتار چڑھاؤ کے لئے الگ الگ بات کرنے کے ڈھب (form of address) جتنے بہت ہوں اس بھاشا کا پھیلاؤ ماننا پڑے گا۔

عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی ان سب میں سے کسی میں بھی یہ بات کرنے کے ڈھب بہت سے بہت نکلیں گے تو تین چار۔ انہیں کے سامنے اب اپنی اُردو کا پھیلاؤ دیکھئے گننے گا تو ان کی گنتی اُردو میں پندرہ سولہ تک پہنچے گی اور پورا پورا سوچ بچار کیا جائے تو ایسے اور اور بول بھی نکل سکیں گے۔ انہیں دیکھ کے کہیں یہ نہ کہہ اُٹھیے گا یہ بول ہیں کہاں کہاں کے۔ جہاں کے بھی ہوں اب یہ سب کے سب اُردو ہی کے ہیں۔ اُردو کوئی ایک بھاشا تو نہیں کھچ میل مٹھائی ہے اچھا اب اُنہیں دیکھئے

تو، تم، آپ، جناب، جنابِ من، جنابِ مکرم، جنابِ محترم، جنابِ والا، والا جناب، عالی جناب، سرکار، حضور، پیر و مرشد، جلالت مآب، اعلیحضرت، ملک معظم، شہنشاہ، جہاں پناہ۔ یہ موتی جن جن سیپیوں کے ہیں کیا وہاں بھی انہیں ایک جگہ ایسا ہی اکٹھا کر لیا گیا ہے جیسے ان بکھرے ہوئے موتیوں کی اُردو نے چمکتی ہوئی لڑیاں بنا دیں یہ آپ جب چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔

تو جس ندی کا پاٹ اتنا چوڑا ہو چکا ہو، جس کا اُتھلا پن گہرے پن میں چھپتا جا رہا ہو۔ اُسے پاٹنے کی دُھن میں دن رات نئے نئے جتن کرنا اور الگ سے اک نئی ندی نکالنے کے سوچ بچار میں آئے دن کھکیڑیں اُٹھانا کیا کوئی سمجھ والا اسے اچھا سمجھ سکتا ہے۔

عربی کو آپ ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے۔ اچھا نہ سہی پر فارسی سے آپ کی یہ چڑ کیسی۔ فارسی اور سنسکرت یہ دونوں تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان دونوں کے کچھ بول لکھتا ہوں اِن کا مِلا جُلا ہونا دیکھئے:۔

فارسی اور سنسکرت کے ملتے جلتے بول

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
مہ	مہا	شاخ	شاکھا	ترس	تراس
کافور	کرپور	آستان	ستھان	بیوہ	ودھوا
بیم	بھیم	بار	بھار	بروت	بھرورت
تباس (عبادت)	تپسیا	کرباس	کپاس	جندال	چنڈال
گمرمچ	مگرمچھ	انگارہ	انگار	موش	موشک
باش	باس	فرمان	پرمان	ریشم	رشمی
است	استی	داغ	داگھ	کف	کپھ
خشخاش	کھس کھس	بند	بندھ	ابرو	ابھرو
زانو	جانو	انگشت	انگشٹ	ادرک	آدرک
آتش	آتش	اشتر	اشٹر	سرشت	سرشٹی
خسر	سوئسر	خر	کھر	سخت	شکت
بادام	باتام	دیر	دھیر	سریر	شریر
میغ (ابر)	میگھ	نیلوفر	نیلوت پھل	کان	کھان
گنج	گنج	گرم	گھرم	کام	کامنا
در	دوار	گرہ	گرہ	تن	تنو
ماست (دہی)	مستو	یک	ایک	شام	شائم
برشگال	برشا گال	بارش	برشا	جنگل	جنگل
میشرو	مھشرہ	ارج	ارج	بوم	بھوم
شغال	سرگیال	گاؤ	گو	ماہ	ماس
روز	روج	گندم	گودھوم	شیر (دودھ)	کشیر
جو	یو	پارینہ	پورانا	چرم	چرم
خون	شون	پدر	پتر	مادر	ماتر

برادر	بھراتر	دختر	پور	پتر	دہتر
سرین	شرونی	...	بخش (حصہ)	پکش	...
پُر	پُورن	پنجم	ششم	ششتم	پنجم

آپ نے ان بولوں کا ملا جلا ہونا تو دیکھ لیا، اب فارسی اور سنسکرت کے پرانے میل ملاپ کی کچھ اور کڑیاں بھی ساتھ ساتھ ہی دیکھ لیجے۔ یُوں تو انگریزی اور جرمن بھاشا کے بھی کہیں کہیں سے اِکا دُکا کچھ بول سنسکرت سے ملتے جلتے ہیں پر جو بات پرانی فارسی اور سنسکرت کے بولوں کو آمنے سامنے رکھنے پر دکھائی دیتی ہے وہ اور کسی بھاشا میں نہیں۔ اسی سے تاڑنے والے نہ رہ سکے اور یہ کہہ اُٹھے۔

ایران کے کیانی نند دشتی اور ہند ماتا کے سپوت، برہمن، چھتری ان سب کے پُرکھا اور بڑے بُوڑھے ایک ہی گھرانے کے تھے۔ جن میں کبھی بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک ہی جگہ سب کا رہنا سہنا، اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ پرانی فارسی اور سنسکرت ایک ہی بھاشا تھی۔ جب آپس میں پھُوٹ پڑنے سے یہ الگ ہوئے تو الگ الگ رہنے سے اس ایک بھاشا میں پہلے تھوڑا، پھر بہت اُل بل ہوتا گیا۔ ژند اوستا اور سنسکرت کے بول ایک سے ہیں جنہیں نہ جاننے والا سنے تو ایک ہی سمجھے اور دونوں کو ایک ہی بتائے۔

پُرانی فارسی کو الگ الگ تین نمبروں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک ژند اوستا کی بھاشا۔ دوسرے پہلوی بھاشا جو ژند کے پیچھے بڑھی اور پھیلی۔ تیسرے دری بھاشا جو ساسانیوں کے راج میں پھلی پھُولی۔ یہ دری بھاشا ژند اوستا سے بہت الگ اور محمود غزنوی کے راج کی بھاشا سے میل کھاتی ہے۔ ساسانی راج کی بھاشا اور غزنوی راج کی بھاشا جیسے یہ دونوں ملتی جلتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے ہی ژند اوستا اور سنسکرت ہیں۔ یہی دیکھ کے یورپ کے کھوج لگانے والے یہ کہنے لگے۔ یونہی سی گھٹ بڑھ سے ویدک گیت اوستا میں اور اوستا کے بول ویدک کے سانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔

اوستا کا منترا اور ہوما اور وید کا منتر اور سوما دونوں کے دونوں ایک ہیں۔ ایسے ہی ژند اوستا کا مترا وہی ہے جو رگ وید کا مترا، متھرا ہے۔ رگوید کا اریمن دیوتا اور ژند اوستا کا ایریمن یہ دونوں بھی ایک ہی ہیں۔ ایران کی راجدھانی میں پہلے پہلے جن جن کا راج رہا وہ رِگوید اور ژند اوستا میں ایک ہی سے ہیں۔ ژند اوستا کا یما خشائتا (جمشید) رگوید میں یما راجہ ہے، خشائتا مہاراجہ (بادشاہ) کو کہتے ہیں۔ اس لئے یما خشائتا اور یما راجہ یہ دونوں ایک ہی ہوئے۔ ژند اور رگوید میں کیکاؤس اور کاویہ اشنس دونوں کی باتیں ایسی ایک سی ہیں جن میں رتی بھر اُل بل نہیں۔

بھینٹ دینے والے اور چڑھاوے چڑھانے والے کو ژند اوستا میں اتروا کہتے ہیں، وید میں اسی اتروا کو اتھرون کہا گیا ہے کوئی یہ بول ویدوں میں آنے والی باتوں کو جاننے والوں اور بڑے بھاری بھرکم سمجھ والوں کے لئے بولا گیا ہے۔ ایران میں بھی بڑے بڑے راج پاٹ والوں کے لئے یہی بول بولا جاتا تھا جیسے کوی ہسرو (کیخسرو) کوی کوات (کیقباد) ٹوہ لگانے والوں نے تو یہاں تک کھوج لگا لیا۔ پوجا پاٹ میں جو بول مُنہ سے نکلتے تھے وہ ژند اور ویدوں میں کہیں کہیں یونہی سا اُل بل ہو تو ہو نہیں تو دونوں

کے بول کے بول ایک ہی سے ہیں۔

وید میں سورج کو گھوڑے والا اور دوڑنے والا بتایا گیا ہے۔ اوستا میں بھی یہی ہے۔ سورج دیوتا کو وید میں اریامن اور اوستا میں میں ایریامن کہا گیا ہے۔ یہاں وہاں دونوں جگہ اس دیوتا کے منتر بیاہ کی شبھ گھڑی میں پڑھے جاتے تھے۔ انگیرا رشی کی پود سے آگ کی پوجا کا پرچار ہندو مانتے ہیں۔ اوستا میں اسی آگ کی پوجا کا پرچار اتھروا اور اس کے گھر والوں سے مانا گیا ہے۔ تریتا کو اوستا میں پہلا بید بتایا گیا ہے۔ رگوید اور اتھروں وید میں بھی تریتا، اتھریتا تریتا ہے جو دکھوں سے اچھا کرنے والا دیوتا مانا گیا ہے۔ اگنی ماتا کو جیسے ہندو گھروں میں رکھتے تھے، ایسے ہی ایرانی بھی۔ ایرانی آگ پوجنے والوں کے رات دن گانے کے منتر کو گاتا کہتے تھے۔ ہندوؤں میں یہی گاتا گائتری منتر کہلاتا ہے جو نسے برس ہندو اپنے لڑکوں کو جنیو پہناتے، ایرانی بھی اسی برس پہناتے تھے۔

یہاں ندیوں پر جیسے اشنان کے میلے لگتے ہیں۔ ایسے ہی ایران میں آب ریز کے تہوار ہوا کرتے تھے۔ جاڑے آتے جیسے یہاں دوالی کا تہوار ہوتا ہے ایسے ہی ایرانیوں میں چراغاں کی دھوم دھام ہوا کرتی تھی۔ ہولی سے اگلے دن یہاں ہندو جو کیا کرتے ہیں یہی سب ایران میں کوسہ برنشین کے تہوار میں کیا جاتا تھا۔ جس مہینے میں یہاں بسنت کا میلہ لگتا ہے۔ ایران میں بھی اسی مہینے جشن گل کو بی منایا جاتا تھا۔ ان باتوں سے بھی پتا چلتا ہے۔ پہلے پہل یہاں کے آریہ جب ایرانیوں سے الگ ہوئے تو یہ اور ایرانی ایک ہی دھرم رکھتے تھے۔ پرانے لکھنے والوں میں سے کچھ نے ایران سے آریوں کے نکلنے کی باتیں یوں لکھی ہیں۔

ان میں کا ایک جتھا دھرم کی باتوں میں کچھ کتر بیونت کر کے دھرم کو بگاڑنا چاہتا تھا۔ اس سے اک آگ بھڑک اُٹھی اور دھرم کے بچاؤ کے لئے تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑا رن پڑا۔ لڑائی بھڑائی ہو چکنے پر آپس میں ایسی چھٹم چھٹا ہوئی جو پھر کبھی ایک جگہ مِل جُل کے نہ بیٹھ سکے۔ ہارا ہوا جتھا ٹھوکریں کھاتا ادھر آنکلا اور یہیں رہ پڑا۔

۱۷۵۰ میں پرانی دھرانی لکھت کے کچھ ٹکڑے کسی پارسی کے ہاتھ سے نکل کر یورپ پہنچے۔ پھر پرانی لکھت کے کھدے ہوئے کئی ٹکڑے ڈھونڈنے والوں کو ایران سے ملے۔ ان سب کو دیکھ بھال اور جانچ پرتال کے بال کی کھال نکالنے والوں نے سوچ بچار سے ان بکھری ہوئی کڑیوں کی لڑیاں بنا دیں۔

ان باتوں کا پھیلاؤ یہاں نہیں سما سکتا اس لئے انہیں چھوڑتا ہوں۔ فارسی اور سنسکرت کے کبھی کے میل جول پر جو لکھا گیا وہ اتنا بھی نہیں جتنا اک بہتی ہوئی ندی سے چلّو بھر پانی۔ پھر بھی آپ نے یہ تو دیکھ ہی لیا ہوگا۔ فارسی اور سنسکرت ایک ہی پیڑ کی ڈالیاں ایک ہی پھلواری کے پھول ایک ہی سیپی کے موتی اور ایک ہی مُنہ کی دو آنکھیں ہیں۔ جب ان دونوں کا میل ملاپ آپ دیکھ چکے تو اب فارسی بدیسی بھاشا کہاں رہی، یہیں کی ہوئی اور جب یہیں کی ہوئی تو پھر اس کے بولوں کو ٹھکرانا کس لئے۔

فارسی اور سنسکرت کے ملے ہوئے پریم کی کہانی میں آریوں کے باہر سے یہاں آنے کی بات چھڑ گئی ہے تو یہیں وہ جھگڑا بھی چکا دینا چاہئے جو مسلمانوں اور ہندوؤں میں چلا آرہا ہے۔ ان دونوں جتھوں میں جلی کٹی اور جو لاگ جھونک چلی آتی ہے اس میں سب

سے بڑھ کر ہندوؤں کی یہ ہنکار ہے۔ ہند ہمارا دیس اور ہمارا ہی جنم بھوم ہے۔ دیس کا جھولا ہمارے ہی لئے ہے۔ اور ہمیں اس میں جھولتے رہیں گے۔ پہلے سے ہمیں یہاں کے رہنے والے ہیں۔ باہر سے آنے والے جو ساتھ رہ پڑے یہ کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے دیس کے اکلوتے سپوت ہمیں ہیں اور رہیں گے۔ یہ دیس کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔

گونڈ، بھیل، لمباڑے یہ بات کہیں تو سچ یہ ہے انہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا اور ہے بھی یہی۔ انہیں گونڈ، بھیل، لمباڑوں کی یہ جگہ جنم بھوم ہے اور انہیں کے جتھے دیس والے ہیں جو ننگے دھڑنگے پہاڑوں، بنوں، جنگلوں میں مارے مارے پڑے پھر رہے ہیں انہیں چھوڑ کے دیکھئے تو پھر کوئی دیس والا ہی نہیں رہتا۔ آگے پیچھے سب باہر ہی سے آئے ہوئے ہیں۔

کیسی ہی پرانی سے پرانی لکھت اُٹھا کے کیوں نہ دیکھئے یہی پتا ملے گا آریہ پہلے سے یہاں کے رہنے والے نہیں۔ یہ باہر ہی سے آئے اور یہاں رہ پڑے جیسے آریہ باہر سے یہاں آئے ایسے ہی مسلمان بھی آ دھمکے۔ دونوں کے یہاں آنے میں کچھ بڑا بل تھا۔

آریہ جو آئے تو آتے ہی اپنی دھاک بٹھانے کے لئے اُنہوں نے یہاں کے بسنے والوں کا مار مار کے ایسا کچومر نکالا جو بچ نکلے دیس والے یہاں کا رہنا چھوڑ چھاڑ بھاگ بھوگ کر اندھیری گھاٹیوں میں مُنہ چھپا کے بیٹھ رہے اور جو نہ بھاگ سکے شودر کہلائے یہ اور ان کی پود داس بن کے باہر والوں کی سیوا کرتی رہی۔ گھر بنانا، چھپر چھانا، گھر کی جھاڑ پونچھ، کوڑا کرکٹ اُٹھا اُٹھا کے پھینکنا، چکیاں پینا، برتن باسن مانجھنا، لکڑیاں چیرنا، گائے بھینسوں کو چرانا، گوبر اُٹھانا، اُپلے تھاپنا' انہیں دھندوں میں ان دیس والوں کے دن رات کٹتے تھے۔ یونہی سی بھول چوک پہ ان کی وہ درگت بنتی جس کے دھیان سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر یہ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ مندروں میں آنا جانا کیسا۔ ان کی پرچھائیں سے پوجا پاٹ کی ستھری جگہ پاپ کی کیچڑ میں لتھڑ جاتی تو ایسے ملیچھ وہاں کیسے پھٹک سکتے تھے۔

یہ اودھم دیکھ کے سنسار نے کروٹ لی اور وہ ڈری ہوئی بھیڑیں جو آئے دن کی مار دھاڑ سے چپ چاپ رہتی تھیں، اب سب کی سب مل کے چیخ اُٹھیں، ایسے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اب آنکھیں کھلیں اور اُنہیں چمکار چمکار کے روکا تھاما جا رہا ہے اور ان کے اپنے سے الگ نہ ہونے کے لئے سینکڑوں جتن کئے جا رہے ہیں اور یہ جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے ان کے لئے نہیں یہ بھی سب اپنے ہی لئے ہے۔ ڈر یہ لگا ہوا ہے کہیں یہ پورا ریوڑ کا ریوڑ کسی اور گلے میں جا کے نہ مل جائے اور اس کے ملنے سے دوسرے اپنی بہتات کے گھمنڈ پر آگے بڑھ جائیں اور ہمیں چپ چاپ بیٹھنا پڑے۔

رہے مسلمان تو وہ یہاں ایسے آئے تھے جیسے کوئی اپنے گھر میں آتا ہے۔ کسی نے انہیں دیکھ کے ٹیڑھی ٹوپی کی تو راج نے ڈانٹ ڈپٹ دیا۔ نہیں تو یہاں والوں کو مسلمان اپنے راج کی جگمگاتی سبھا میں ساتھ بٹھاتے رہے۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں' ان میں سے اکبر کا تو پوچھنا ہی کیا، یہ تو اوتار ہی مان لیا گیا۔ اوروں کو بھی ہندو اچھا ہی جانتے ہیں۔ برا نہیں کہتے۔ اس لئے ان کی باتیں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ ان سب میں سے ایک اورنگ زیب ہی ایسا ہے جسے دھرم کا کٹر، بس کی گانٹھ، ہندوؤں کو

دُکھ دینے والا، ستانے والا اور نہ جانے کیا کیا اسے ہندو کہا کرتے ہیں۔

یہی اورنگ زیب جو ہندوؤں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب دکھن کا گورنر تھا تو ہندوؤں کو آگے بڑھانے، انھیں جنجال سے چھڑانے کے لئے اُس نے کیا کیا کیا۔ یہ کہانی سر جدو ناتھ سرکار کے مُنہ سے سُننے کی ہے۔ دھرم کا کٹّر اورنگ زیب، شاہجہان کو ہندوؤں کے لئے ایسے ایسے ڈھب سے لکھتا تھا جو کبھی کبھی شاہجہان کی تیوری پر بل پڑ جاتے تھے۔ اس پر بھی اس نے ہندوؤں کا ساتھ دینا نہ چھوڑا اور ان کی جو باتیں اسے سچّی دکھائی دیں شاہجہان کے سامنے ان کے کہنے سے کبھی نہ چُوکا۔

دیوگڑھ کا راجہ کیسری سنگھ، راؤ کرن راجپوت، مہیش داس راٹھور، نرسنگھ داس، حیات سنگھ، سارنگدھر، اندرمن یہ اور ایسے ہی اور اور ہندوؤں کو سُکھ چَین سے بٹھانے کے لئے اورنگ زیب اپنے سے جتن کرتا رہا۔

یہ باتیں تو جب کی ہیں جب یہ پرنس تھا اور اس نے اپنے راج میں ہندوؤں کے ساتھ کیا کیا انھیں کیسی کیسی جگہیں دیں ان کی بڑی سے بڑی بھُول اور بھاری سے بھاری چُوک کو بھی کیسا ٹالا۔ اس کے لئے پیچھے ہٹ کے یہ دیکھنا چاہئے۔ کھجوا کی لڑائی میں مہاراجہ جسونت سنگھ نے دارا شکوہ سے مل کے اورنگ زیب کو جو نیچا دکھانا چاہا۔ ایسے ہی اجمیر کی لڑائی میں کنور رام سنگھ سے جو بڑی بھاری چُوک ہوئی، کوئی اور راج ہوتا، تو انھیں پاپی ٹھیرا کے ان کے ایسے کرتوت سے نہ جانے ان کی کیا دُرگت بنا دیتا۔ پر اورنگ زیب نے نہ جب اور نہ لڑائیاں جیتنے پر کسی سے بھی کچھ پُوچھ گچھ نہ کی، اور جو کچھ ہو چکا تھا اسے ایسا کر دیا جیسے کچھ ہُوا ہی نہ تھا۔

دھیراج، راجہ جے سنگھ، بجے سنگھ، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، راؤ دلیپ سنگھ بندیلہ، رائے سنگھ راٹھور، راجہ راج روپ، رائے رایان راجہ رگھناتھ داس، رام سنگھ ہاڈا، راجہ رام سنگھ کچواہا، رگھناتھ سنگھ سیسودیہ یہ اور ایسے اور بہت سے ہندو نکلیں گے جو اورنگ زیب ہی کی دیا سے پھلے پھُولے اور پروان چڑھے۔ ان باتوں کے پھیلاؤ کے لئے نہ یہاں جگہ ہے اور نہ یہ ڈھائی بولوں میں سما سکتی ہیں۔

تو آپ نے دیکھا باہر سے آنے میں مسلمان اور ہندو دونوں کے دونوں ایک سے ہیں۔ بس اتنا ہی ہے آریوں نے پہلے آ کے ہند میں چھاؤنی چھائی اور مسلمان آریوں کے پیچھے پیچھے یہاں آئے۔ آگے پیچھے آنے کا اٹکل پچّو ایسا نہیں ہُوا کرتا جو پہلے آنے والے جس جگہ آ کے ٹھہریں اسے اپنا تو جنم بھوم سمجھیں اور اپنے پیچھے آنے والوں کو باہر والا ہی سمجھتے رہیں۔

یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ کسی جگہ آگے پیچھے دو جتھے باہر سے آ کے ٹھہریں اور پھر وہیں رہ پڑیں۔ ان دونوں میں سے پہلے آنے والا جتھا اپنے پیچھے آنے والوں سے یہی کہتا رہے۔ یہ جگہ ہماری ہی ہے۔ تم ساتھ رہنے سہنے پر بھی کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے اور نہ یہ جگہ کبھی تمہاری ہو سکتی ہے۔ تو اس اڑنے اور ہٹ کرنے کو سمجھ والے بالک ہٹ کہیں گے۔ بات کا بتنگڑ بنانا کوئی اچھی بات نہیں۔ مسلمان ہندو جو بھی یہاں آ کے رہ پڑے ہند اب ان سب کا جنم بھوم ہے اور رہے گا۔ منہ سے کہہ دینے سے یہ کسی ایک جتھے کا دیس کبھی نہیں بن سکتا۔

دیس کے باہر اب بھی اک چھوڑ کئی کئی راجدھانیاں مسلمانوں کی ہیں۔ پر ان میں سے کسی میں بھی یہاں کے مسلمانوں کے

لئے چورتا ٹیکنے کی بھی جگہ نہیں۔ جیسے ہندوؤں کا باہر کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ ایسے ہی یہاں کے مسلمان بھی ہیں جن کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا، مرنا، جینا جو ہے وہ سب یہیں تو پھر اب یہ باہر والے کیسے ہو سکتے ہیں۔

یہ سچ ہے مسلمان ہندوؤں سے تھوڑے اور بہت تھوڑے۔ پر جب ان کے دکھ، سکھ، مرنے، جینے کی بات بیچ میں آ پڑے تو پھر تھوڑے سے تھوڑے بھی تھوڑے نہیں رہتے۔ آٹھ کروڑ کا ٹڈی دل کبھی ایسا نہ بن سکے گا جس کا ہونا نہ ہونا ایک سا ہو کے رہ جائے۔ سانس لینے والا اتنا بڑا اجتماعی کا تھوا تو بننے سے رہا۔ اس میں کھلونوں کی سی من مانی توڑ پھوڑ کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہاں رہنا سہنا کیچڑ کا سا دھبہ نہیں ہے جسے جب چاہا دوڑ دھوپ کے پانی سے دھو دھلا کے چھڑا ڈالا۔

مہاتما جی! پرماتما کے لئے دیس والوں سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اڑنا، ہٹ کرنا، چھڑا دیئے۔ یتری چھوٹی میری موٹی ایسی بے سُری اُلجھی ہوئی تانیں کب تک۔

دیکھئے اسی آپس کی جھنک پٹک تن پھن سے دیس اب تک کتنے ٹوٹے میں رہا۔ آپ میں بھلائی اچھائی کی جو جو باتیں ہیں انہیں بھگوان کی دیا سمجھ کے آگے بڑھیئے اور جگت گرو بنیئے۔ یہ ایک جتھے کا لیڈر بننا کیسا آپ کو تو پورے دیس کا گرو بننا چاہیئے۔ سچ ہے یہ بات ایسی نہیں جس میں نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جائے۔ پر آپ کو پاؤں توڑ کے بیٹھنا نہیں چاہیئے۔ آپ تو پتّا مار چکے ہیں۔ کٹھن سے کٹھن باتیں ہم جیسوں کے سٹ پٹا جانے کے لئے بہت سہی۔ پر آپ کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں۔ آپ تو دیس ہی کے سدھارنے کی اُدھیڑ بُن میں رہے اور رہیں تو دیس والوں کو بھی ایسا بنا دیجئے جو آپ کی دیکھا دیکھی یہ سب بھی دیس کے بروگی بن جائیں اور یہ جواب تک آگ لگا کے پانی کو دوڑتے رہے ہیں ایسی اندھا دھند دوڑ دھوپ سے اُکتا کر آپ کے ساتھ ساتھ اس چوڑی سڑک پہ چلنے لگیں جو پریم نگر پہنچا دیتی ہے۔ ان کے من کی انگیٹھیوں میں پریم کی دبی ہوئی چنگاریوں کو کُرید کُرید کر منتروں کے پنکھے سے دھونک دھونک کے ایسی بھڑکتی ہوئی آگ بنا دیجئے جو بھول چوک کے پانی کے چھینٹوں سے بھی نہ کبھی بجھے اور نہ کبھی کجلائے۔

ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی۔ پرماتما نے ان سبھوں کو ایک سا ڈیل ڈول ہاتھ پاؤں آنکھیں ناک کان دیئے ہیں۔ جیسے اس دین میں سب کو ایک سا رکھا وہ چاہتا تو کیا بڑی بات تھی جو سارے جگ میں ایک ہی دھرم کے پرچار کا ڈنکا بجتا، ایک ہی دھرم کے مندر میں سب مل جُل کے ایک ہی ڈھب پر اُس کی پوجا کرتے۔ پر بھگوان نے ایسا نہیں کیا۔ کسی نے اُسے ایک ڈھب پر پوجا۔ دوسرے نے اُس کے پوجنے کا اور ڈھنگ نکالا۔ تیسرے نے کسی اور ڈھب سے اُس سے لو لگائی۔ سب دھرموں کو دیکھیئے تو یہ سب کے سب چھوٹی بڑی الگ الگ سڑکیں ہیں جو اُسی ایک کے پاس پہنچانے کے لئے کھلی ہوئی ہیں جن کے راج کا پھیلاؤ چھوٹے بڑے لاکھوں کروڑوں ان گنت سنساروں سے بھی آگے نہ جانے کہاں تک یونہی گھیرے ہوئے ہے۔ ایسے سنسار اسے نہ مانیں اور اس کے پوجنے کا دھاگا سب مل کے توڑ تاڑ کے رکھ دیں جب بھی اس کے امٹ راج میں سے ایک رتی بھی کبھی گھٹ نہیں سکتی۔ ایسے ہی انہیں جگمگاتے سنساروں کے رہنے والے کیسی ہی بڑھ چڑھ کے اس کی پوجا پاٹ کیوں

نہ کریں۔ پر اس سے اس کا راج رتی بھر بڑھ نہیں سکتا۔

دھرموں کے ماننے نہ ماننے کی بھلائی بُرائی جو بھی ہے وہ دھرم والوں ہی کے لئے ہے۔ وہ ماں باپ سے بڑھ کے پیار کرنے والا پرماتما ان باتوں سے ایسا الگ تھلگ ہے جو یہاں کے دُکھ سُکھ کی دھوپ چھاؤں اس پر پڑ نہیں سکتی۔ اس کے نہ مٹنے والے راج کی چوکھٹ اتنی اونچی ہے جو یہ سنسار اپنے پہاڑوں کے ہاتھوں سے بھی اسے چھُو نہیں سکتے۔ ہمارے دھیان کا پھیلاؤ اور پھرتی جس کے سامنے بجلی کا چھلاوا پن بھی پانی بھرتا ہے اور جو گھڑی بھر میں اونچی سی اونچی جگہ کو روند کر اس کی اُنچائی ناپ تول کے رکھ دیتا ہے وہاں تک پہنچنے میں یہ بھی اپاہج ہے۔ رات دن سے گھرے ہوئے سنسار اس کے راج کے پھیلاؤ کو کبھی نہیں پا سکتے۔

جب سب کے سب اسی ایک کو اپنے اپنے من کی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ اپنے اپنے ڈھنگ پر اسی کے آگے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور اسی کے دھیان میں دھُونی رمائے بیٹھے ہیں۔ تو الگ الگ دھرم ہونے پر دھرم کے لئے آپس میں یہ ارے ترے کرنا کیسا۔ دھرم الگ الگ ہیں ہوا کریں۔ اس سے کیا ہوتا ہے جو دھرم ہے وہ اپنی جگہ اچھا۔ کسی کو بھُول کے بھی یہ نہ چاہئے جو دوسرے کے دھرم کو بُرا کہے۔ بُرا کہنا کس لئے۔ ایک کے دھرم کی پُوچھ گچھ دوسرے سے تو ہونے سے رہی۔ جو جس کا دھرم ہی اس کا بوجھ اسی کے کاندھوں پر ہے۔ اِس کے پیچھے آئے دن آپس میں لڑنا جھگڑنا بڑی بُری بات ہے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک دن دو دن کا تو ساتھ نہیں۔ پہلے بھی یہی مسلمان تھے اور یہی ہندو، یہی مسجدیں تھیں اور یہی مندر، یہی دُکھ کا اندھیرا تھا اور یہی سُکھ کا اُجالا، یہی سُنہری دن تھے اور یہی روپہلی راتیں۔ باجا گاجا مسجدوں کے سامنے بھی بجتا تھا، اور مندروں کے بھی۔ اس پر نہ کبھی مسجد والے بھڑکے اور نہ کبھی مندر کے پجاری بڑبڑائے۔ آپس میں مِل جُل کے رہتے اور جس سے جتنی جان پہچان ہو جاتی مرتے مرتے اسے نباہتے اور اس میں کچھ بل نہ آنے دیتے تھے۔ بڑے بوڑھوں سے ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ کی جو کہانیاں کان سُن چکے ہیں وہ اب ساری کی ساری من گھڑت اور زٹل دکھائی دینے لگیں۔

آج کل کے مسلمان اور ہندو تو ایسے ہو گئے جیسے توے سے روٹی اُلٹ جاتی ہے بات بات میں آپے سے باہر، یونہی سی کچھ بات ہوئی اور بھڑک اُٹھے۔ پھر کیا تھا۔ چیخم چاخ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی جو یہ آپس میں گتھ گئے۔ سمجھ والے اُجڈوں کی گتھم گتھا الگ تھلگ ہو کے دیکھنے لگے۔ آپس کی لاگ ڈانٹ کی آگ بجھانے کا دھیان کسی کو بھی نہیں۔

یہ سُنتے سُنتے کان جھنّانے لگے۔ آج یہاں جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا، کل وہاں لاٹھی چلی، پرسوں اس جگہ گھمسان کی لڑائی ہوئی سیکڑوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے لہو لہان ہوئے، بیسیوں مارے گئے۔ جب لڑتے لڑتے دونوں تھک کے ہانپنے لگے، تو راج نے پکڑ دھکڑ کے جیل میں ڈال کے بیچ بچاؤ کر دیا۔ پٹے پٹائے الگ چھُوٹنے کی دوڑ دھوپ میں جو کچھ انٹی میں تھا وہ ہاتھ سے الگ نکل گیا، جن دھندوں سے چار پیسے ہاتھ میں آ رہے تھے وہ دھندے الگ چھُٹے اور گانٹھ میں ایک جھنجھی کوڑی بھی نہ رہی بیٹھے بٹھائے جو اکڑ تکڑ کا دھیان آ گیا تھا اس کا یہ پھل مِل گیا۔ چلئے چھٹی ہوئی۔

یہ آئے دن کی جھڑپ بات بات میں ٹڑبھس گھڑی گھڑی کا ٹرا پن۔ دیس والوں کی ایسی سمجھ پر تیل ماش اُتاریئے اور جیسے بنے اُنہیں اس سٹھیّ پن سے روکیئے۔ یہ سمجھ کے ہیٹے کالوں کے کچّے آپس میں گتھے چلے جاتے ہیں اور ان کی جھپیٹ میں دیس کا ستیاناس ہوتا جا رہا ہے۔ آپس کی نوچ کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے دیس کے لنگوٹی بندھوادی۔ مہاتما جی! آپ کے سامنے ایسی باتیں کرنا سُورج کو دیا دکھانا ہے۔ پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کبھی کبھی بڑے بڑے سمجھ والوں سے بھی سامنے کی باتیں دیکھنے سے رہ جاتی ہیں۔

اب پھر اسی بھاشا کو لیجیے۔ کٹھن باتیں چھوڑ چھاڑ کے نئی بھاشا بنانے کے جنجال میں پھنسنا اور منجھی منجھائی بھاشا کو ٹھکرا کے مُنہ پھیر لینا یہ بھی نئی بات ہے۔ میں مانتا ہوں دیس کے کچھ ٹکڑوں کی بولیاں ایسی الگ الگ ہیں جو ایک دوسری سے نہیں ملتیں۔ اور ایک ٹکڑے کی بولی بولنے والا دوسرے کی بولی نہیں سمجھتا۔ پر یہ سب کی سب بولیاں ایسی چھوٹی چھوٹی سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں ہی میں بولی جاتی ہیں باہر انہیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ ان سب میں اکیلی اُردو ہی ایسی ہے جو سارے دیس میں تھوڑی بہت بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دیس کی پُوری بولیوں میں سے ایک اُردو ہی کا ایسا پھیلاؤ ہے جو ٹھیکم ٹھیک پورے دیس کی بھاشا بننے کا بل بوتہ رکھتا ہے۔

کسی بھاشا میں باہر والی بولیوں کے بولوں کی بہتات سی بہتات جتنی بھی ہو پر کھنے والے اسے تو بھاشا کی بڑھوتری سمجھتے ہیں اور آپ نہ جانے کیا چاہتے ہیں جو عربی فارسی بول اُردو میں دیکھ نہیں سکتے۔ اور یہ بھی نہیں بتاتے یہ کیوں آپ کو بُرے لگتے ہیں۔ کیا آپ کوئی بھی ایسی آگے بڑھنے والی بھاشا بتا سکیں گے جو باہر کی بولیوں کو ٹھکرا کے اپنے ہی گنے چنے ڈھائی بول لئے بیٹھی رہی ہو اور انہیں کے سہارے آگے بڑھ کے یہ ٹٹ پونجیا بھاشا ایسی پھلی پھُولی ہو جو دوسری بڑھنے اور پھیلنے والی بولیوں کے لگ بھگ کہی جا سکے۔ عربی فارسی بولوں کے نکال ڈالنے سے اُردو کی بڑی لمبی چوڑی انگنائی گھٹ گھٹا کے بالشت بھر رہ جائنگی جس بھاشا کی بڑھوتری دن دونی رات چوگنی ہو اور جس کی دوڑ پھیلاؤ سے پھیلاؤ کو بھی روندتی چلی جا رہی ہو۔ اسے آپ ٹھکرانا چاہتے ہیں۔ اسے تو کلیجے سے لگا رکھیئے۔

آپ سے یہ تو کوئی نہیں کہتا۔ عربی، فارسی کے نئے نئے من من بھر کے بھاری سے بھاری بول اُردو میں آپ ٹھونستے چلے جائیں۔ جو یہ کہے اُسے سڑی سمجھیے۔ پر ان دونوں بولیوں کے وہ بول جنہیں پڑھے لکھے تو پڑھے لکھے اَن پڑھ گاؤں والے اور گنوار تک دن رات بولتے چالتے ہیں انہیں اُردو میں سے نکالنے کے جتن کرنا تو ٹھیک نہیں۔

دیکھیئے وہ ہل جوتنے والے جو پو پھٹتے ہی تاروں کی چھاؤں میں اپنے اپنے دھندوں میں لگے تو سُورج ڈوبنے پہ ستانے کے لئے ٹھہرتے ہیں۔ وہ بھاشا واشا کے کھٹراگ کو کیا جانیں۔ پر یہ اُردو کا پھیلاؤ دیکھنے کا ہے جو وہ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے عربی فارسی کے سینکڑوں بگڑے ہوئے بول کے بول بن جھجکے بولتے چالتے ہیں۔ اچھوتوں کے لئے جب آپ گاؤں گاؤں پھر رہے تھے تو یہ سب کچھ آپ سُن چکے ہوں گے۔ جو اب آپ کو سنایا جا رہا ہے۔

عربی، فارسی کے وہ بگڑے ہوئے بول جو گاؤں والے اور گنوار رات دن بولتے ہیں :-

مرجی (مرضی)، ناراج (ناراض، کھپا (خفا)، منجور (منظور)، تکدیر (تقدیر)، جمین (زمین)، مپھت (مفت)، منائی (منع)، کبالہ (قبالہ)، کھزانہ (خزانہ)، تنکھاہ (تنخواہ)، مجوری (مزدوری)، کھون (خون)، بیدکھلی (بیدخلی)، دستاویج (دستاویز)، کاگج (کاغذ)، کلم (قلم)، کاجی (قاضی)، راجی (راضی)، کھتا (خطا)، جُلم (ظلم)، کابل (قابل)، کبول (قبول)، جکام (زکام)، بھونچال (زلزلہ)، بکھار (بخار)، رجا (رضا)، مپھیج ممتد (فیض محمد)، کھیرات (خیرات)، کیامت (قیامت)، اجاب (عذاب)، ناجک (نازک)، کمبھکت (کمبخت)، ہاجر (حاضر)، کھالی (خالی)، کسور (قصور)، جیجا (سزا)، سورت (شہرت)، ز لدی (جلدی)، ترا ترا (طرح طرح)، میجود (موجود)، مالوم (معلوم)، نغد (نقد)، مالمہ (معاملہ)، گلت (غلط)، مندرسا (مدرسہ)، نالت (لعنت)، رونک (رونق)، مولی صاب (مولوی صاحب)، ہمیسہ (ہمیشہ)، کم جور (کمزور)، کھسامد (خوشامد)، ریسم (ریشم)، جمانت (ضمانت)، جامن (ضامن)، مکدما (مقدمہ)، کھارج (خارج)، دسکھت (دستخط)، کواب (کباب)، سادی (شادی)۔

یہ کچھ بول تو یونہی لکھ دیئے ہیں۔ سوچ بچار کیا جائے تو اور ایسے سینکڑوں بول کے بول نکل آئیں گے۔ عربی، فارسی کے بگڑے ہوئے کچھ بول ابھی آپ نے سُنے، اب انہیں بولیوں کے وہ بول بھی دیکھ لیجے، جنہیں اَن پڑھ سے اَن پڑھ گاؤں والے اور گنوار جوں کا توں بولتے ہیں۔

جیسے مکان، دکان، میدان، جان، ران، تکیہ، لتہ، صورت، بدن، گردن، سینہ، ملک، کمر، آدمی، عورت، بچہ، اگر، مگر، کتاب، سردی، گرمی، بادام، ادرک، کام، نام، کمان، تیر، لگام، مال، عینک، گلاب، بہار۔

میرا کہنا یہی ہے یہ اور ایسے اور عربی، فارسی کے وہ بول جو اُردو میں پورے سما چکے ہیں جنہیں چھوٹے بڑے سب بولتے ہیں انہیں ہاتھ نہ لگایئے۔ ایسے ہی ہندی کے وہ گھلے ملے بول جو سب کی بات چیت میں چلے آرہے ہیں۔ ان سب کو ملا جلا کے اُردو کو اور آگے بڑھانے کے نئے نئے ڈھب نکالئے۔ ہند جیسے ہندو مسلمان سب کا جنم بھوم ہے۔ ایسے ہی اُردو بھی ان میں سے کسی ایک کی بھاشا نہیں، یہ ان سب کی بھاشا ہے۔ سب کی بھاشا اس لئے کہہ رہا ہوں۔ اُردو کے آگے بڑھنے اور پنپنے کے لئے مسلمان اور ہندو دونوں ساتھ ساتھ اب تک اپنے اپنے سے جتن کرتے رہے۔

یہ کہہ چکا ہوں ہند کے چپے چپے کی چھوٹی چھوٹی بولیاں، ایسی بہت سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں الگ الگ بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں دیکھئے اور ڈھونڈیئے، تو عربی، فارسی بول چھپے چھپائے ملیں گے۔ بل اتنا ہی ہو گا کسی میں بدیسی بولیوں کے بول بہت ہوں گے، کسی میں تھوڑے اور کسی میں بہت تھوڑے۔ دیس کی سب بولیوں کے گنتی ہی کے کچھ کچھ بول یہاں لکھے جائیں تو یہ لکھت بڑھ کے نہ جانے کہاں تک پہنچے۔ اس لئے وہ سب تو نہیں اک مرہٹی بھاشا ہی کے کچھ بول لکھتا ہوں :-

عربی، فارسی بولوں کی ریل پیل مرہٹی میں :—

ائیں (آئین)، اکل (عقل)، اکھتیار (اختیار)، اکھر (آخر)، اکھیر (اخیر)، سپھائی (صفائی)، عجب، اجمت (عظمت)، اجماس (آزمائش)، اجار (آزار)، اجاری (آزاری)، اتر (عطر)، عدالت، عداوت، انامت (امانت) اچکرا (اعجزہ)، اپھوا- (افواہ)، اباد (آباد)، امباری (عماری)، ابھر (ابر)، عیب، ارکھ (عرق)، ارج (عرض)، الاہیدا (علیحدہ)، اول (اوّل)، آتس باجی (آتش بازی)، آپ گرجی (خود غرضی)، آمیج (آمیز)، اواج (آواز)، اشک (عشق)، آشک (عاشق)، اشک باج (عشقباز)، اکرار (اقرار)، اکھلاس (اخلاص)، اجت (عزت)، ایجا (ایذا)، اتبار (اعتبار) آتلّا (اطلاع)، انساپھ (انصاف)، انام (انعام)، ارادہ، عنایت، امان (ایمان)، عادت، انگشتان (انگلستان)، عالم، آلی سان (عالی شان) عبرت، الاکھا (علاقہ)، علاج، علّت، عمدہ، عمر، ادا، ادب، امین، امرا، امیدوار، اولاد۔

مرہٹی کی بات چیت پر اک بھولی ہوئی بات دھیان میں آئی۔ بہت دن ہوئے جو مرہٹی کے اک اناڑی کھلاڑی سے مٹ بھیڑ ہوئی، اس کا اوڑھنا بچھونا جو تھا وہ مرہٹی اور انگریزی اور کوئی بھاشا واشا جانتا نہ تھا۔ کچھ لوگ آپس میں کسی بھاشا کے پھیلاؤ پر کچھ کہہ سُن رہے تھے۔ مرہٹی کا نیا کھلاڑی جو سب سے الگ بیٹھا تھا۔ یہ بات چیت سُن کے نہ رہ سکا اور وہیں سے تڑ سے بولا، ہماری بھاشا کا سا پھیلاؤ دیس کی کسی بھاشا میں نہیں۔ چار دن سے اُردو جو بڑھ چلی ہے یہ بھی ہماری بھاشا کے بل پر۔ نہ جانے مرہٹی نے اُردو کی کیسی سیوا کی، جو اس کے سینکڑوں بول اُردو میں آ گئے۔ جنہیں اُردو والے اپنے یہاں کا سمجھ رہے ہیں۔ وہ بول کون کون سے ہیں اس پوچھنے پر وہ مسکرا کے کہنے لگا۔ ایک دو سیکڑوں ——— یہ کہہ کے اوپر لکھے ہوئے بولوں میں سے کئی بول اس نے سنائے۔ جس پر جاننے والے ہنس پڑے اور وہ ہکا بکا ہو کے ایک ایک کا مُنہ دیکھنے لگا۔ اس میں ہنسی کی کون سی بات ہے اسی پر اسے اچمبا ہوُا۔

مظفرپور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے اک بڑے بھاری بھر کم پنچ نے، جو وہاں پڑھ کے سُنایا، اس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا یہاں لکھتا ہوں :—

"ہماری ہندی کے کویوں کی متی گتی بالکل نرالی ہے۔ وہ کبتا کی گاڑی کے دُھرے اور پہیّے بھی بدل رہے ہیں۔ اپنے اُدبُھت جھکڑے میں پیچھے کی اور مرلی ٹٹو جوت کر گنتو بیچھ پر پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ اتنی نہیں منو مکھتا کا لکشن ہے۔ اس سے کبتا کا سدھار نہیں سنگھار ہو رہا ہے۔"

کیا ایسی ہی اَن گھڑ بھاشا سارے دیس کی بھاشا بن سکتی ہے۔ کیا ایسی ہی انوکھی بولی پورے دیس میں پھیل سکتی ہے۔ کیا ایسی ہی لکھت کے پرچار پر آپ اڑے ہوئے ہیں۔ کیا یہی سب جنم بھوم والوں کی اکیلی بھاشا بن سکے گی اور کیا اسے ہی سب چھوٹے بڑے بول سکیں گے۔ دیکھئے تو یہ کیسا اودھم مچا ہوُا ہے۔ عربی، فارسی کے گھُلے مِلے بول، جو سب بولتے چالتے ہیں جان

جان کے انہیں چھوڑ چھاڑ اور چھانٹ چھانٹ کر کویں، ستی گتی، کبتا، اُدبھت، گنتو سچھ، منو کمنا، لکش - ان بھولے بسرے بولوں کو ٹھونسا گیا ہے۔ باہر والی بولیوں سے کترا کے اور بچ بچا کے نکلنے پر بھی بدیسی بولوں سے یہ لکھت نہ بچ سکی۔ اور گنتی ہی کے سہی۔ پر کئی بول اس میں آ ہی گئے۔ کچھ فلم بنانے والی کمپنیاں بھی اپنے یہاں کے ڈراموں میں ایسی ہی ٹھونس ٹھانس کر رہی ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے دیس کے ماتھے کے لئے کلنک کا ٹیکا ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اس نئی اپج کو دیکھ کے نہ رہ سکے اور انہیں یہ کہنا ہی پڑا:۔

"یہ زبان کیونکہ کُل مُلک کی زبان ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے اور کوئی مذاقِ سلیم اور اُردو میں شعور رکھنے والا اُردو کو چھوڑ کر اسے کس طرح اختیار کر سکتا ہے۔"

فارسی کے رسیا بھیم سین کالستھ، پٹن کے الیسری داس، پٹیالے کے سجان رائے، جگجیون داس، کیول رام اگروال، منشی بھوپت رائے، منشی چندر بھان، اودے رائے، منشی ٹیک چند بہار، یہ اور ایسے اور اور ہندوؤں کی فارسی لکھتیں دیکھنے کو آپ سے نہیں کہا جاتا پر وہ نئے پرانے اُردو لکھنے والے ہندو جنہوں نے اُردو کی ایسی سیوا کی جس پر اتنا لکھا جا سکتا ہے جو لکھتے لکھتے بڑا ڈھیر لگ جائے۔ ان کی لکھتوں کو تو دیکھ لیجئے۔

پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت بیندو لال زار، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت نوبت رائے نظر، پنڈت بشن نرائن در، پنڈت برج نارائن چکبست، منشی درگا سہائے سرور، منشی پریم چند، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت امرناتھ جھا، پنڈت گنگا ناتھ جھا، پنڈت آنند نرائن مُلّا، پنڈت کشن پرشاد کول، پنڈت منوہر لال زتشی، مسٹر رگھوپتی سہائے فراق، مسٹر اقبال ورما سحر، مسٹر رام پرشاد کھوسلا ناشاد، مسٹر کرشن سہائے، مسٹر تلوک چند محروم، مسٹر مہاراج بہادر برق، چودھری جگت موہن لال رواں، پروفیسر سری رام شرما، مسٹر رام دیال سکسینہ، ٹھاکر جے آر رائے، لالہ روشن لال، مسٹر رام سرن نگم، مسٹر سری سری نرائن نگم، مسٹر دیا نرائن نگم، مسٹر سورج نرائن مہر، مسٹر سدرشن، مسٹر شیام موہن لال جگر، یہ سب کے سب ہندو اور پکے ہندو۔ اس پر بھی ان کی لکھتوں کا ڈھیر ایسا ہے جس میں کویں، ستی گتی، کبتا، اُدبھت، گنتو سچھ، منو کمنا، لکش، سمپتی، شکتی، ریکھا، نویدن، آشا، دشا، سمبندھ، کلاہل، ویاکرن، ہتوان، ایسے ایسے بولوں کا پتہ بھی نہیں اور ڈھونڈے سے بھی ایسے کڈھب بول ان میں کہیں نہ مل سکیں گے۔

ان ہندوؤں کی لکھت کا وہی ڈھنگ ہے جو مسلمانوں کا۔ دونوں میں بال بھر اَل بَل نہیں اور اَل بَل ہو کیسے۔ جب ہندو مسلمانوں نے مل جُل کے اب تک اردو کو یہاں تک سدھارا جو راج کے بل پر بڑھنے والی بولیوں کے لگ بھگ دکھائی دینے لگی، اب تک پہلا سا نہ سہی۔ اسی اُردو کے بولنے چالنے ہی میں تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے۔ ہے تو ایکا۔ یہی ایکا آگے بڑھ کے جب مت سدھی ہو گی تو پورا بھی ہو سکتا ہے اور جو یہ تھوڑا بھی نہ رہا تو پھر رہا کیا۔ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔

ہند ماتا کا گہنا پاتا جو بھی تھا ایک ایک کر کے سب کا سب کب کا لٹ چکا اور آئے دن کی لوٹ کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے ایک چھلا بھی نہ چھوڑا۔ لے دے کے یہی اُردو، ہندو مسلمانوں کے ملاپ کی اک پرانی انگوٹھی دیس کے ہاتھ میں پڑی رہ گئی تھی۔ آج کل

اس کی بھی چھینا جھپٹی ہو رہی ہے اور دیس کی انگلی سے اسے بھی اتارنے کے جتن کئے جا رہے ہیں۔ یہ پرانی انگوٹھی بھی چھن گئی تو پھر کیا ہوگا یہ آپ سوچئے۔

اُردو کو مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا آپ کہہ چکے ہیں اس لئے یہ ڈر لگتا ہے کہیں اس بات چیت سے آپ یہ نہ سمجھ لیں اپنی بھاشا کی پڑ چک لی جا رہی ہے اور اس کے بچاؤ کے لئے یہ باتیں بنائی جا رہی ہیں۔ کسی کے دھیان پر روک ٹوک کیسے ہو سکتی ہے جس کا جو جی چاہے سمجھ لے۔ پر سچی بات تو یہ ہے دیس کے لئے یہ باتیں چھیڑنا پڑیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ دیس کے منہ پر کیسی جھریاں پڑتی جا رہی ہیں، یہ کیسا نڈھال ہوتا جا رہا ہے۔ آپا دھاپی کے کیسے جھگڑے چل رہے ہیں۔ ایسا اندھیاؤ ہے جو آنکھیں کھولنا دوبھر ہو گیا ہے۔ دیس کے اندھیرے گھپ میں بگاڑ کا لمبا تڑنگا بھوت ہاتھ پھیلائے دانت نکالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ اس کے پرچھاویں سے یہاں نرالے سڑی بن کے آپس میں لڑتے مرتے ہیں، کوئی بڑا منتر پڑھنے والا ایسا منتر پڑھے اور ٹوٹکا کرے جس سے دیس پر سے یہ بھوت اتر جائے اور بھوت اتر جانے سے یہاں کے ساتھ رہنے سہنے والوں کی ایسی آنکھیں کھلیں جو سب مل ملا کے سانس لینے کے یہ ڈھائی دن آپس میں ہنس بول کے کاٹ دیں۔ بھوت اتارنا ہنسی کھیل نہیں۔ اس کے لئے بڑی پڑھنت پھونک چاہئے جسے آپ ہی کر سکتے ہیں۔

رہی اُردو، تو اب یہ مٹنے مٹانے کے جوکھوں سے نکل چکی۔ اس کا پودا اب پودا نہیں رہا جو لو کے تھپیڑوں اور ٹھنڈک سے جھلس اور ٹھٹھر کے رہ جائے۔ یہ پودا ابنا اور بن رہا ہے۔ اس کی جڑیں آگے تک پھیلیں اور پھیل رہی ہیں۔ اس کی بڑی بڑی ڈالیاں موٹے موٹے ٹھنے اور ہری بھری ٹہنیوں سے موٹی پتلی اور اور ٹہنیاں نکل نکل کے ان میں نئی نئی کونپلیں پھوٹتی چلی جا رہی ہیں۔ اس کا تو اب کچھ ڈر ہی نہیں۔ اس میں ایک ہی بات دیکھنے کی ہے۔ جس دھندے کو سب اب تک مل جل کے کر رہے تھے۔ اب ان میں پھوٹ پڑنے اور الگ تھلگ ہو جانے سے ایک ہی جتھے کو وہ پورا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ جسے پہلے سب مل ملا کے اٹھا رہے تھے۔ اس سے بڑھتی ہوئی چال دھیمی پڑ جائے گی اور پہلی سی پھرتی نہیں رہے گی۔ پہلے جو بات دنوں میں پوری ہوتی تھی وہ اب مہینوں پہ جا پڑے گی۔ پر مجھے تو یہ دکھائی دیتا ہے۔ پورے ہندو بھی کبھی اپنی اُردو کو چھوڑ نہیں سکتے اور اپنے بڑے بوڑھوں کے گاڑھے پسینے سے سینچی ہوئی اس ہری بھری کھیتی سے کبھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔

مہاتما جی! دیکھئے تو آپ کی اُردو کسی بھاشا سے بھی ہیٹی اور دبتی ہوئی نہیں۔ وہی باتیں وہی گھاتیں ایک ایک کر کے اس میں دیکھ لیجے۔ تو نئی بھاشا کی جگہ اپنی اسی اُردو کو ایسے ہی آگے بڑھائیے نا، جیسے آج تک ہندو مسلمان سب مل جل کے اسے بڑھاتے اور سُدھارتے چلے آئے۔

اس کے پرچار کے لئے پہلے ایسی ریڈریں لکھوائی جائیں جن میں عربی، فارسی، ہندی ان سب کے وہی گھلے ملے بول ہوں جنہیں سب بولتے ہیں جیسے عربی، فارسی کے گڈھب بول ان میں جگہ نہ پا سکیں۔ ایسے ہی ہندی کے بھولے بسرے بول بھی ان

میں کہیں نہ آنے پائیں۔ اس بات میں آگے بڑھ کے یہ دیکھ بھال بھی کرنا پڑے گی۔ اُردو کے اور پھیلاؤ اور بڑھانے کے لئے کہاں کہاں سے اور کون کون سے بول چُنے جائیں۔ یہ گُتھی ایسے لوگوں کے اکٹھا کرنے سے سُلجھ سکتی ہے جو بھاشا کی بناوٹ، اُس کا اُتار چڑھاؤ، لوچ، گھُلاوٹ اور بولوں کی ناپ تول، ان کا بھدا پن، ہلکا پن، یہ اور ایسی اور اور باتوں کو پرکھ سکتے ہوں۔

جیسی جگہ ہو چُن چُنا کے ویسے ہی وہاں بولوں کا جڑنا، اور بٹھانا جانتے ہوں۔ سب لوگ بھاشا کا رت لوا نہیں بنا سکتے۔ بڑی سی بڑی سبھا میں سے بھی چھانیئے گا تو ایسے لوگ کچھ ہی نکلیں گے۔ عربی، فارسی، ہندی ان میں سے نئے بول جس کے بھی ہوں پورے سوچ بچار سے جانچ جانچ کے، اُن کا چُننا اور انہیں اپنی اپنی جگہ ایسا جمانا، جو وہ پھر نہ اُکھڑ سکیں۔ ایسے ڈھب انہیں لوگوں کو آتے ہیں جو بھاشا کے پورے ہتھکنڈے جانتے ہوں۔ ایسے لوگوں کی دیکھ بھال سے یہ ریڈریں ایسی لکھی جائیں گی، جن میں نہ بھاری بھاری عربی، فارسی کے بول ہوں گے اور نہ ہندی کے بھُولے بسرے بھدیلے بول۔ ان میں نہ مولویوں، مُلّاؤں کے اَن گھڑ بول دکھائی دیں گے اور نہ پنڈتوں کے کٹھن اور کُڈھب بول۔ ان میں نہ ٹھیٹ مُلّا پن ہوگا اور نہ ٹھیٹ پنڈت پن۔ یہ ریڈریں ٹھیٹ مولویوں اور ٹھیٹ پنڈتوں کی لکھتوں سے الگ ہوں گی۔

ان کے لکھنے کا ڈھب ایسا سمویا ہوا، موتی سا چمکتا، میٹھا پانی ہوگا، جس میں بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس کا کوڑا کرکٹ اور گدلا پن کچھ بھی نہ رہ سکے گا۔ اور یہ سوجھ بوجھ بڑھانے والا امرت جل آنکھوں سے پیا جائے گا۔ جس سے مَن ڈھلتے ڈھلتے چمک اُٹھیں گے اور آنے والی پود پہلے ہی سے یہ پریم جل پی کے سمجھ کی پوری آنکھ کھُلنے تک ایسے سُتھرے مَن کی ہو جائے جسے پھُرتی سے آگے بڑھنے اور دیس کے سنبھالنے میں کوئی رُکاوٹ ہی نہ رہے گی۔

پہلے ہی سے عربی، فارسی، ہندی اِن سب کے ملوان بول ساتھ ساتھ پڑھنے، لکھنے سے پھُوٹ ڈالنے والا یہ دھیان کبھی بھُولے سے بھی پھیر کسی کو نہ آئے گا۔ اس لکھت میں بدیسی بولیوں کے اتنے بول ہیں اور دیسی بولی کے اتنے۔ ان میں سے انہیں چھوڑ کر انہیں چُن لینا چاہیئے۔ سب بولوں کو ساتھ ساتھ دیکھتے دیکھتے اور پڑھتے پڑھتے ان سب کا پیار پریم جی میں جڑ پکڑتا چلا جائے گا اور سب اسی اُردو کو اپنی بھاشا سمجھیں گے، اور اس کے اور اور بناؤ سنگار کے لئے سوچ سوچ کے نئے نئے ڈھب نکالتے رہیں گے۔ تو اس جتن سے بھاشا الگ پھلے پھُولے گی، اور آج کل کی سی چھیڑ چھاڑ جس سے دیس کو گھُن لگتا جا رہا ہے۔ یہ بات بھی پھر نہ رہے گی۔ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے، اس کہاوت کو سچا کر کے دکھا دیجے اور جو اوپر لکھا جا چکا ہے، اس کا پرچار ایسا کیجے جس سے گھڑی گھڑی کے جھگڑے ٹنٹے کا سانپ بھی مر کے رہ جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے۔

بھاشا کے لکھنے کا ڈھنگ (Transcription) کون سا رکھنا چاہیئے۔ یہ بھی اِک بڑی اُلجھی ہوئی گتھی ہے، اس پر بھی یہیں لکھنا چاہتا تھا، پر اس لئے چھوڑتا ہوں، ایک تو یہ بات کٹھن ہے اور اس کے کٹھن ہونے سے بہت پھیلنا پڑے گا

دوسرے یہاں تک جو کچھ لکھا جاچکا ابھی یہ بھی دیکھنا ہے ، اسے دیکھ کے آپ کہتے کیا ہیں۔ یہ باتیں آپ نے کان دھر کے سُن لیں تو پھر کبھی اس پر بھی، جو جو باتیں دھیان میں ہیں ایک ایک کر کے سب لکھوں گا، اور بتاؤں گا اس کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

یہاں تک اُدھ کٹے بولوں میں جو بھی کہا جاچکا ۔ ٹھنڈے جی سے اسے آپ نے سُنا اور سوچ بچار کی آنکھوں سے دیکھا تو سمجھوں گا یہ لکھت ٹھکانے لگی اور جو یونہی دیکھ دکھا کے ڈال دیا تو بات آئی گئی ہوئی ۔ اچھا چلتے چلتے یہ ایک بات اور سُن لیجیے۔

اب تک میں نے جو بھی کہا، اسے آپ نہیں سُنتے اور نہیں مانتے ۔ نہ سنئے اور نہ مانئے۔ عربی، فارسی بولوں کو آپ ہاتھ لگانا نہیں چاہتے، نہ لگایئے۔ ان بدیسی بولیوں کے بول آپ نہیں دیکھ سکتے نہ سہی۔ اچھا ٹھیٹ اُردو لکھنے کا یہی ڈھب جو آپ کے سامنے ہے اسی کو برتئے اور اسی کا پرچار کیجیے ۔ عربی، فارسی بول جن سے آپ کو چڑ ہے ۔ دیکھ لیجیے اس میں ان کا پتہ بھی نہیں۔ تو پھر کویوں، متی، گتی، کبتا، اُدبھوت، گنتو بتھ، منو مکھتا، لکشن، کرتویہ، ساہتیہ، سوبھاؤ، سمئے، جیون آشا، دشا، شکتی، شکشا، سمبندھ، انیکتا، ہتوان، ابھیاس، وشے، شبد، رکچھا، نشیچئے، کلاہل، ویاکرن، اودے، راج نیتی، ایسے ایسے بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس سے نئی بولی بنانے کی کھکیڑیں اُٹھانے سے کیا یہ اچھا نہیں جو آپ اس ٹھیٹ اُردو لکھت کے پرچار کی ہامی بھریں اور اسی کو پھیلائیں اور اس کو آگے بڑھائیں۔

آپ سے باتیں کرنا تھیں اور آپ کو بدیسی بولیوں سے چڑ۔ تو پھر لکھنے کا یہ ڈھب نہ رکھتا تو کیا کرتا، عربی، فارسی، ہندی بولوں کو سمو کے لکھتا، جیسے لکھا کرتا ہوں تو اس کے دو بول بھی آپ نہ دیکھتے۔

اسے دیکھ چکنے پہ جو سچی بات آپ کو دکھائی دے۔ وہ آپ لکھ بھیجیں ۔ پرماتما کرے آپ انند ہوں۔

سید ابوالقاسم
(دارالتراجم۔ حیدرآباد دکن)

مایا منگل

۱ — دِل کی آنکھیں کھول مُسافر، دِل کی آنکھیں کھول!

دل میں بسے ہیں دونوں عالم
دیکھ نہ ہوں یہ عالم برہم
روح کبھی ہے عیش کبھی غم
ہنستا رہ اور رو بھی کم کم
عیش اور غم کی اُٹھا ترازو، عقل کی پونجی تول
مسافر! دل کی آنکھیں کھول!

۲ — چیخ رہے ہیں لوگ جہاں کے
کھُل گئے رستے یہاں وُہاں کے
گئے وہ دِن اب آہ وفغاں کے
اُٹھ گئے پردے کون و مکاں کے
تُو بھی دکھا جینے کے لچھن اب تو مُنہ سے بول
مسافر! عقل کی آنکھیں کھول!

۳ — ناؤ زیست کی سنبھل کے کھینا
سودا دیکھ کے قیمت دینا
ٹھونک بجا کر ہر شئے لینا
جیسا لینا ویسا دینا

دل کا سودا میرے مسافر، دُنیا میں انمول
مسافر! دل کی آنکھیں کھول!

۴

دن گزرا اور نکلے تارے
بجی بانسری ندی کنارے
پھوٹ بہے اشکوں کے دھارے
دہک اُٹھے دل کے انگارے
سنبھل سنبھل اور خود کو بچا لے، دِل نہ ہو ڈانوا ڈول
مسافر! عقل کی آنکھیں کھول!

۵

نیند کے ماتے کچھ کچھ جاگے
آنکھ کھلے کوئی دوڑے بھاگے
سب تو بڑھے جاتے ہیں آگے
توڑ دے تُو بھی رسم کے دھاگے
پھینک بانسری دُور مسافر اور بجا اب ڈھول
مسافر! عقل کی آنکھیں کھول!

۶

ہاں دُنیا ہے رَین بسیرا
تُو بھی سجا لے اپنا ڈیرا
حاجت کیا تُو بنے لُٹیرا
اپنا کر لے جو ہے تیرا
کوئی بکے سب میرا میرا ہنس ـــــ اور پھر لٹو ول
مسافر! عقل کی آنکھیں کھول!

سید مقبول حسین احمد پوری

ایک قانونی مسئلہ

حمید اپنی کوٹھڑی کی کھڑکی میں سے بادل کے اُس سفید ٹکڑے کی طرف دیکھ رہا تھا جو آسمان کے نیلگوں سمندر میں ایک جزیرہ سا معلوم ہوتا تھا۔

وہ پندرہ سال سے اسی کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ سارا دن اسی حجرے کی مختلف اشیاء سے گفتگو کرنے میں مشغول رہتا۔ لیکن آج معمول کے خلاف ایک بادل کے ٹکڑے سے گفتگو کرنے میں منہمک تھا۔

وہ بادل سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا "مشکل یہ ہے کہ میں بہت زیادہ سوچتا ہوں۔ بہت ہی زیادہ۔ یہاں تک کہ میرے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ وہ جو جی چاہے کہہ سکتے ہیں۔ جو جی چاہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ شنکر کو میں نے قتل کیا تھا۔ وہ کہا کریں۔ لیکن یہ بات مجھے قاتل نہیں بنا سکتی۔"

وہ ایک سٹول پر بیٹھ گیا اور بولا "دوسری مشکل یہ ہے کہ وہ میری بات پر یقین بھی تو نہیں کرتے۔ خاصکر وہ جو کالا چغہ پہنے ہوئے تھا۔ اُس سے زیادہ جھوٹا شخص میں نے دُنیا میں نہیں دیکھا۔ کیسے کچہری میں کھڑے ہو کر میرے خلاف بولنے لگا۔ جیسے اُس نے قتل ہوتے خود دیکھا تھا۔ اور وہ سوال جو اُس نے کئے۔ اللہ کی پناہ۔ کوئی سمجھے شنکر کا لنگوٹیا یار تھا۔ حالانکہ اُس نے خود کہا تھا کہ میں نے شنکر کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"اور پھر جج نے کہا کہ وہ مجھے پھانسی دے دیں گے۔ لیکن میں ابھی تک زندہ ہوں۔ اگر میں نے یہ کام کیا ہوتا تو ضرور مجھے پھانسی دے دیتے۔ لیکن اگر میں نے نہیں کیا تو اُن کو مجھے قید کرنے کا کیا حق تھا۔"

برآمدے میں کسی کے بھاری بھاری جوتوں کی آواز آئی۔

"ہوں! بوڑھا سنتو کھانا لا رہا ہوگا۔ دال اور سوکھی روٹی۔ اور اس کے بعد نمبر چھ سو اکتیس اپنے کند اُسترے سے ہمارا خط بنائے گا۔ وہ بھی یہ ظاہر کرتا ہے جیسے یہاں آنے سے پہلے حجام ہی تھا۔"

دروازے کا تالا کھلا اور سپاہی کی آواز آئی "برتن لاؤ۔"

وہ برتن لے کر کھانا لینے کو دروازے تک گیا۔

"نمبر تین سو پینتالیس تم کھانے کے بعد ورزش کو مت جانا۔ جیلر صاحب تمہیں دیکھنے کے لئے آئیں گے۔" سپاہی یہ کہہ کر کچھ دیر اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا،۔

"تم آج بیمار سے معلوم ہوتے ہو۔"

"نہیں میں بالکل اچھا ہوں"۔

"تمہیں معلوم ہے ہم کیوں تمہارے پاس آرہے ہیں ؟"

حمید نے خوفزدہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"کل تم رہا کر دیئے جاؤ گے !"

حمید پر جیسے بجلی گری۔ وہ ایک دم زمین پر گر گیا اور تمام کھانا اپنے اوپر گرا لیا۔ سپاہی قفل لگا کر چلتا ہوا۔

جب جیلر آیا تو اُس نے حمید کو چپ چاپ ایک کونے میں پڑے پایا۔

"کیسے ہو تم نمبر ۲۴۵ - میں تمہیں ایک خوشخبری سنانے آیا ہوں - کل تم رہا کر دیئے جاؤ گے - لیکن میں یہ دریافت کرنے آیا تھا کہ تم اب کیا کرو گے ؟"

حمید نے جواب دیا" میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں یہاں کافی مدت گزار چکا ہوں۔ اور غالباً جو تھوڑے بہت لوگ مجھے جانتے بھی تھے اب مر چکے ہوں گے"۔

جیلر نے کہا" بہت افسوس ہے لیکن اگر تم کچھ کرنا چاہو تو مجھے بتانا۔ شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں"۔

حمید بولا" میرا یہ ارادہ ہے کہ میں شنکر کو ڈھونڈ نکالوں۔ کیونکہ جیلر صاحب آپ جانتے ہیں کہ میں نے اُس کو قتل نہیں کیا"۔

تقریباً تین ماہ کے بعد حمید نے اتفاقیہ اُس کالے چغے والے آدمی کو سڑک پر دیکھ لیا۔

"اجی حضرت" اُس نے آواز دی اور قریب جا کر کہنے لگا" آپ کو وہ باتیں یاد ہیں جو آپ نے میرے متعلق کچہری میں کہی تھیں"۔

اُس نے اس کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر بولا" مجھے تو کچھ یاد نہیں، لیکن ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ شاید وہ . . . . ."

"ہاں ہاں وہی شنکر کے قتل کا مقدمہ"۔

بیرسٹر نے ایک لمبی سانس لے کر کہا" اچھا تو تم رہا ہو گئے کیا ؟"

"جی ہاں"

"اب کیا کام کرتے ہو ؟"

"ایک باغ کا مالی ہوں"۔

بیرسٹر نے ایک پانچ روپیہ کا نوٹ حمید کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا" تم بہت اچھے آدمی ہو۔ جاؤ یہ تمہارا انعام ہے"۔

"لیکن جناب ایک بات تو بتلایئے"۔

"کہو"

"فرض کیا جائے کہ میں اُس شنکر کو جس کے قتل کا آپ نے مجھ پر الزام لگایا تھا ڈھونڈ کر لا دوں تو کیا ہوگا؟"

بیرسٹر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہا "تم بہت اچھا کرو اگر اس کو لے کر میرے مکان پر آجاؤ۔"

حمید نے بہت اچھا کہا اور دونوں اپنے اپنے راستے پر ہو لئے۔

کچھ روز بعد بیرسٹر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اپنے مکان میں بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا کہ اُس کا منشی کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا۔

"ایک شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اپنا نام حمید بتاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میں شنکر کو بھی ساتھ لایا ہوں۔"

بیرسٹر کا مُنہ حیرانی سے کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ وہ اپنے مہمانوں کو مخاطب کر کے بولا۔

"آپ لوگوں کے سامنے ایک عجیب چیز پیش ہونے والی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا پندرہ سال گزرے ایک شخص حمید نے ایک آدمی شنکر کو قتل کیا تھا۔ میں گورنمنٹ کی طرف سے وکیل تھا اور رحم اعجاز اس وقت جج تھے۔"

سب نے سر ہلا کر واقعے کے یاد ہونے کا اقرار کیا کیونکہ یہ ایک بہت مشہور مقدمہ تھا۔

"وہ دونوں قاتل اور مقتول ابھی آپ کے سامنے آنے والے ہیں" یہ کہہ کر اس نے منشی کو حکم دیا کہ دونوں کو اندر لائے۔

حمید نے اندر داخل ہوتے ہی دریافت کیا "یہ سب کون لوگ ہیں؟"

بیرسٹر نے جواب دیا۔ "یہ سب میرے دوست ہیں اور یہ بھی میری طرح تمہاری درخواست سننے اور مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

اُس نے کہا "مجھے کسی کی مدد درکار نہیں" اس نے شنکر کو کمرے کے درمیان گھسیٹ لیا اور بولا۔ "میں نے اس کو ڈھونڈنے کے لئے کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی اور جب میں نے اس کو ڈھونڈ لیا تو یہ میرے ساتھ نہیں آتا تھا۔ آخر میں نے اس کو آپ کے متعلق سب کچھ بتایا اور بہت مشکل سے اس کو یہاں تک لایا ہوں۔"

"آپ لوگوں کو پورا یقین تھا کہ میں نے اس کو قتل کر کے کہیں چھُپا دیا ہے۔ میں نے آپ کو ہزار دفعہ کہا کہ میں نے اس کو نہیں مارا لیکن آپ سُنتے ہی نہ تھے۔ آخر آپ نے مجھے پندرہ سال کے لئے قید کر دیا۔ حالانکہ میں قصوروار نہ تھا۔ اور اب —"

یہ کہتے ہوئے اُس نے جیب سے پستول نکالا اور شنکر کے سر میں گولی مار دی۔

"اور اب میں وہ قتل کرتا ہوں جس کی سزا میں بھگت چکا ہوں۔

آپ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

عزیز محمود

نوائے نیم شبی

دوائے درد، دُعا کے سوا کچھ اَور نہیں
دُعا ـــــ کمالِ رضا کے سوا کچھ اَور نہیں

وہ کوئی نالۂ غم ہو، کہ نغمۂ مسرور
شکستِ دل کی صدا کے سوا کچھ اَور نہیں

بجا ہے گرمیِ تعزیر ہو تغافلِ ناز
مرا قصور، وفا کے سوا کچھ اَور نہیں

قفس نصیب تغافل کو ہر عتاب ترا
نسیم لطف و عطا کے سوا کچھ اَور نہیں

سلوکِ عشق میں کہتے ہیں جس کو گم شُدگی
تلاشِ راہ نما کے سوا کچھ اَور نہیں

یہ راز مرحلۂ بے خودی کے بعد کُھلا
خودی بھی، قربِ خدا کے سوا کچھ اَور نہیں

رَوِش یہ عالمِ فرقت یہ کائناتِ وصال
خیالِ خواب نما کے سوا کچھ اور نہیں!

رَوِش صدیقی

ہیر رانجھا کے خطوط

جب ہیر اور رانجھا کے تعشق کا راز آشکار ہو گیا اور ہیر پر چاروں طرف سے انگلیاں اُٹھنے لگیں تو ہیر کے والدین نے اس کے چچا کیدو لنگڑے کے کہنے پر ہیر کے انکار کے باوجود اس کی شادی سیدے کھیڑے سے کر دی۔ رنگپور (سسرال) جا کر ہیر رانجھا کے فراق میں بہت مغموم رہنے لگی۔ اسی حالت میں ایک سال گزر گیا تو ایک دہقان زادی اپنے سُسرال جھنگ سیال جانے کے واسطے تیار ہوئی۔ اس نے ہیر سے کوئی پیغام طلب کیا :-

ایک دہقان زادی کا جھنگ کا قصد کرنا اور ہیر سے پیغام طلب کرنا

ایک دہقان زادی
جھنگ سیال جانے کے واسطے تیار ہوئی
اور ہیر کے پاس جا کر
یوں بولی
مَیں قربان جاؤں
تُو اس قدر مغموم کیوں ہے ؟
مجھے بتا کہ میں تیری غمخواری کروں
مَیں سُسرال چلی ہوں
اپنے ماں باپ کے لئے کوئی پیغام دے دے
ہیر رونے لگی
اور بولی
میں رانجھا کے فراق میں نڈھال ہوں

ہیر کا پیغام

ہاتھ باندھ کر
دیس کو میرا سلام کہنا
اور سکھیوں سے کہنا
مجھے دشمنوں کے حوالے کر کے
مجھ کو بھول گئی ہو۔
مجھے اپنے ماں باپ سے کوئی سروکار نہیں ہے
خدا انہیں بدلہ دے
ہاں رانجھا کے پاس جانا
اور ہاتھ باندھ کر اور قدم چھُو کر
یہ پیغام دینا
میرے حال پر مہربانی کرو
اور خود آ جاؤ
نہیں تو
میرا کام تمام ہو جائے گا
اے وارث بے وارثوں پر رحم کرو
اے شیام مجھ پر دیا کرو
اور آ جاؤ

اے رانجھا ! تیرے لئے

ہیر کو کیا کیا مصائب جھیلنے پڑے ہیں

مجھے تیرے فراق کا زخم لگا ہے

اور ہر دم سینے میں ٹیس اُٹھتی ہے

میں اب جینا نہیں چاہتی

اور مرنے پر تُلی ہوئی ہوں

مجھے دن کھٹتا رہے

نہ رات کو آرام

میں عشق کی آگ میں جلی جا رہی ہوں

تیرا کوئی پیغام بھی تو نہیں ملتا

میرا دل چاہتا ہے

کہ تُو جوگی بن کر آئے

اور مجھ سے ملے

اے رانجھا!

کبھی تو آمل

مَیں تیرے دیدار کی بھوکی ہوں

رانجھا کا خط ہیر کے نام

اے مُلّا!

دعا سلام کے بعد لکھ

تُو نے مجھ کو یاد کیا ہے

شکریہ

جلتی آگ پر تیل ڈال دیا ہے

اور لکھنا

پہلے تُو نے مجھے ملازم بنایا

اب فقیر بھی بنا لے

اور اسے مُلّا! لکھ کہ

تجھے شادی کا بہت شوق تھا

لے! اب خوش ہو

کہ

سُسرال میں جا پہنچی ہے

اے معشوقِ رنگین ادا

اے کھیڑوں کی بہو

اے کیدو لنگڑے کی عیّار بھتیجی

اے عاشق کے ساتھ بے وفائی کرنے والی

تُو سَیدے کھیڑے پر ریجھ گئی ہے۔

ہیر کا خط رانجھے کے نام

ہیر نے یہ خط لکھوایا

اور

مُلّا کو بُلا کر کہا

رانجھا کو مفصّل سُنا دینا

مَیں رو رو کر

اور دست بستہ

سلام بھیجتی ہوں

اور کہنا

مَیں تو مر چکی ہوں

صرف ایک دید کے شوق میں

جان لبوں پہ ہے

رنج و غم میں
سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہوں
صرف تیرا انتظار ہے
کہ تجھ سے
دل کی حقیقت کہہ لوں
تُو ہی میرا جنازہ پڑھیو
اگر تیرا عشق صادق ہے
تو آ جا!
اے قاصد!
یہ بات رانجھا تک پہنچا دینا
اور یہ انگوٹھی
میری نشانی دے دینا

اے قاصد! براہِ خدا
میرے درد و الم کا حال
رانجھا سے کہہ دینا
اس کا مکھڑا دیکھنے کے واسطے
تڑپ رہی ہوں
اور میرا دم
لبوں پر آ گیا ہے
میرے آنسوؤں کی بدلی
میری جھولی میں
چھم چھم برستی رہتی ہے

اور مَیں تیرے فراق میں
سرگرداں رہتی ہوں
میں نے تجھ سے
بے وفائی نہیں کی
اور سَیدے کو
اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیا
کاگ اُڑا اُڑا کر
تیرے ہی شگون لیتی رہتی ہوں
میری تقدیر میں
یہی لکھا ہے

ہیر کے خط کا رانجھا کے پاس پہنچنا

قاصد نے ہیر کا خط رانجھا کو دیا
اور کہا
ہیر جاں بلب ہے
کیا تُو نے
اس پر جادُو کر رکھا ہے
تیری یاد میں
اس کو ایک پل بھی چین نہیں
اور تیرے عشق میں
وہ
رات تارے گننے میں گزارتی ہے
تو جوگی بن کر
وہاں جا

اے وارث شاہ
جب خدا مہربان ہوتا ہے
تو سب کام سرانجام ہو جاتے ہیں۔

رانجھا نے خط پڑھا
اور ٹھنڈی آہ بھری
اور مُلّا سے کہا
میرے دردِ فراق کا حال لکھو
ایسا
جو آسمان کو ہلا دے
اور میرے دل کا گلہ لکھو
جیسا
کہ عاشق معشوق کو لکھتے ہیں
رانجھا نے یہ جواب لکھایا
پہلے اس دلبر کو
سلام دُعا پہنچے
مَیں تو
اس روز سے فقیر ہو گیا ہوں
جس روز سے میں
حُسن کا چور بنا
میں نے تو
جان و مال قربان کر دیا
لیکن تم نے
پریت کی ریت
توڑ دی
تم نے
مجھ کو برباد کر کے
کھیڑوں کے ساتھ پریت لگائی
اور میری جوانی ویران کر کے
سُسرال کو جا بسایا۔
یہ کنواریاں
دِل لگا لیتی ہیں
اور پھر بے وفائی کر کے
ڈولی میں جا بیٹھتی ہیں
اور عاشقوں کو فقیر بنا کر
سُسرال میں عیش کرتی ہیں
اور خود
سہاگ رچا کر
عاشقوں کو
خوار کر جاتی ہیں
اور سرداروں کے بیٹوں کو نوکر بنا کر
خود سُسرال میں
سردار بن جاتی ہیں۔

(وارث شاہ)

دھامی
بی۔اے۔آنرز

غالب کے سات بہترین شعر

(سات مختلف حضرات کی نظر میں)

۱۵ فروری کو "یوم غالب" کے سلسلے میں "انجمنِ اُردو پنجاب" کا ایک عام جلسہ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے لاہور کے ہال میں زیر صدارت پنڈت برجموہن کیفی دتاتریہ منعقد ہوا۔ مختلف قسم کے مضامینِ نظم و نثر کے علاوہ چند اہل الرائے شعراء و ادباء نے جن کو خاص طور پر اس بات کی دعوت دی گئی تھی، اپنے اپنے مذاق کے مطابق "غالب" کے سات بہترین شعر سنائے۔ "انجمن" کی اس دلچسپ جدت کو بہت پسند کیا گیا۔ قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے یہ "انتخاب" ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

حفیظ ہوشیارپوری
اسسٹنٹ سکرٹری انجمنِ اُردو پنجاب

حکیم احمد شجاع:-

محرم نہیں ہے تُو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز — دُعا قبول ہو یارب کہ عُمرِ خضر دراز!

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مل جائیگی — یہ جو اِک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے سے اُٹھا ظالم — کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

منظر اِک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گُہر ہونے تک

مولانا حامد علی خاں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

دریائے معاصی تنک آبی سے ہُوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہُوا تھا

ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اَور

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہُوا تھا

حضرتِ نشتر جالندھری

بوئے گُل، نالۂ دِل، دُودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لئے ہوتے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

رائے بہادر وزیر چند چوپڑہ

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا — مُوئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دُوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہے تجھ کو گر یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مُدّعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گُنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ترے سروِ قامت سے اِک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

میاں بشیر احمد

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے — مرا ہر داغِ دل اِک تخم ہے سروِ چراغاں کا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہُوا تھا

رنج سے خُوگر ہُوا انساں تو مِٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

بس ہجومِ نااُمیدی خاک میں مل جائے گی — یہ جو اِک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات — ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

حفیظ ہوشیارپوری

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار — سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گُل نا آشنا!

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال — ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب — بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد!

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خودبیں!

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مُرغِ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خُدا — افسونِ انتظار، تمنّا کہیں جسے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

"میری ناتمام محبت"

(عنوان کے لئے معذرت چاہتے ہوئے مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ انسانی زندگی کے رنگین واردات کسی ایک ہستی تک محدود نہیں۔)

اب کی بہار بغیر کسی رومان کے آئی ہے۔ جی چاہتا ہے گزری ہوئی زندگی ایک بار پھر بسر کرلوں۔ یہ میری دوسری محبت کی داستان ہے۔

نزہت کو دیکھے تقریباً سات سال ہوگئے تھے۔ اُس کی تصویر میرے ذہن میں یہ تھی کہ نو دس برس کی چھوٹی سی گوری گرمندی لڑکی، جسے دن بھر رونے اور لڑنے جھگڑنے سے کام ہو، اور جس کے ساتھ کھیلنے کے لئے میں کبھی آمادہ نہ ہوسکا۔ میری پہلی محبت کا مرکز میری خالہ زاد بہن تھی۔ اُس محویت نے اتنی فرصت نہ دی کہ اس بات کا خیال بھی کرسکوں کہ نزہت جوان ہوکر کیسی اُٹھی ہوگی۔ یہ طلسم ٹوٹ جانے کے بعد بھی جب دن رات سکونِ دل کی بربادی کی دعائیں مانگتا تھا میری خالہ زاد بہن میری روح میں سمائی رہتی پہلے اِس تصوّر میں کھو جاتا تھا۔ اب بے کسی اور افسوس کے ساتھ دبی زبان سے کہتا "اس پیکر سے مجھے کوئی وابستگی نہیں"۔

ایک روز نزہت کے ماموں ریاض جو میرے بہت ہی اچھے دوست ہیں آئے اور کہا کہ آپا دہلی سے آئی ہیں۔ اُن کے گھر میں مجھ سے پردہ نہیں تھا۔ آپا برآمدے میں تھیں۔ سلام کے بعد اندر نظر کی تو ایک مرمریں جسم کو موتیا ساری میں ملبوس سامنے کھڑے پایا۔ جیسے بجلی بادلوں کی طرف لوٹنے سے پہلے ایک لمحے کے لئے ساکن ہو جائے اور نگاہوں کو خیرہ کردے۔ "آپا، کون آئے ہیں؟" "کوئی نہیں، نزہت ہے اندر۔" ہیں! یہ نزہت ہے! دوشیزگی ایسی ہوتی ہے! اتنی دلآویز! ایسی ہوش ربا! مجھے دیکھ کر آنکھیں جھکائے وہ پرے ہٹتی گئی، جیسے ہوا کا رُخ یکایک پلٹ جانے سے طوفان تھم جائے، بلند ہوکر پھر دُگنی طاقت سے آگے بڑھے، اور ساری وادی پر چھا جائے۔ ریاض کو ڈھونڈتے ہوئے اندر چلا گیا۔ نزہت کھڑکی میں سے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نظر نے فطرت کو خمار آلود بنا دیا۔ ساری کا آنچل کندھوں پر جا گرا تھا۔ اُف، وہ حسین سنہری جال جس میں پھنسنے کے لئے میرا دل بیتاب ہوکے پر تولنے لگا! "ریاض کہاں ہیں؟" بڑی لجاجت سے کہا "کہیں باہر ہوں گے۔ مَیں نے بہت دیر سے انہیں نہیں دیکھا"۔ اتنے سے جواب میں کیا کچھ پنہاں تھا! کھیل کود میں وقت گزار دینے والے غلیظ سے بچے کے بجائے ایک خوب رُو سنجیدہ مگر زندہ دل نوجوان کو دیکھ کر شاید وہ بھی حیرت میں کھو گئی ہو!

اُس موسم میں نزہت کو صرف ایک بار اور دیکھنے کا موقع ملا۔ اُن کی ڈیوڑھی کے ایک طرف بیٹھک ہے اور دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ۔ میں اس کمرے میں تھا۔ اچانک نزہت کو ڈیوڑھی میں آتے دیکھا۔ آنکھیں چار ہوگئیں۔ فوراً اُس نے بیٹھک

کی طرف رُخ کر لیا۔ پھر کامل سکون کے ساتھ چٹخنی کھولی اور اندر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ بہت سی لڑکیوں نے بے اختیار ہو ہو کے میری طرف دیکھا ہے، ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے میری طرف آئی ہیں، اور اس سے زیادہ ٹیں۔ نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ تختۂ گُل بن بیٹھا ہوں، ہوا کے بوجھ سے شاخیں جھکی ہیں، اور پھولوں نے میرے قدموں پر بوسے دیئے ہیں۔ لیکن نزہت کا وقار میرے دل کو روندتا ہوُا چلا گیا! ناگہانی طور پر اس کا سامنے آنا، پھر اس طرح آنکھوں سے اوجھل ہو جانا، میں اُس مسافر کی طرح تھا جو دوش و فردا کے خوابوں میں کھویا ہوُا ایک ایسی پگڈنڈی پر جا رہا ہو جو کسی نامعلوم منزل کو جاتی ہو، اُس کی نگاہ آسمان کی طرف اُٹھے، ماہِ کامل کی تابانی اُسے مسحور کر دے، کائنات کا ذرّہ ذرّہ جگمگ جگمگ کرتا نظر آئے، لیکن اُس کی اپنی من کی دُنیا میں اُجالا بھی نہ ہونے پائے کہ چاند ناقابلِ بیان تیزی سے لپکتا ہوُا کالی کالی گھٹاؤں کی آغوش میں چھُپ جائے، اور وہ مسافرِ دل اور دُنیا کے اندھیروں میں بھٹکتا ہوُا رہ جائے!

نزہت نے رگ رگ میں زندگی بھر دی۔ وہ ایک نہ بھُولنے والی رنگین یاد مجھے دیتی گئی۔ میں نے خیال ہی خیال میں اُس کو اپنی زندگی کے سفر کا رفیق بنا لیا۔ مستقبل کی ہر ساعت اُس کی ضو سے مجھے روشن دکھائی دینے لگی۔ سر سبز کھیتوں، پھولوں میں چھپی ہوئی شاداب وادیوں، اور پہاڑوں کی سفید سفید برف سے ڈھکی ہوئی بلند چوٹیوں سے گزرتے ہوئے بادلوں کی دُنیا میں پہنچے۔ وہاں ہماری روحوں نے ایک حسین کھیل کھیلا۔ پھر چاند اور ستاروں کو پامال کرتے ہوئے آسمان کی نیلگوں فضاؤں میں ایک بہشت بسائی گھومتی ہوئی ندیاں، آبشاریں، گھاس کے تختے، رنگ رنگ کے پھُول، گھومتی ہوئی شاخیں، پرندوں کے چہچے، اس دُنیا سے کہیں زیادہ خوبصورت بادل، چاند اور تارے، حسین نغمے، حسین نظارے، حسین نکہتیں۔ ہر شے میں نزہت کا تبسّم، ہر حسن نزہت کے پرتو سے حسین تر، ہماری چھوٹی سی بہشت ہمیں لئے اتھاہ فضاؤں میں محوِ پرواز۔ اور ہم محبّت کے نشے میں نیم مدہوش۔ اس سے جی اُکتا گیا تو ختم نہ ہونے والی خوشیوں میں کھیلنے کے لئے اپنے خدا کی بہشت کا دروازہ جا کھٹکھٹایا!

جتنی تڑپ میرے دل میں اپنی خالہ زاد بہن کے لئے تھی نزہت کے لئے شاید اُس سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن ایک بات میری پہلی محبت میں ایسی تھی جس سے میری دوسری محبت محروم ہی رہی۔ کوشش کے باوجود خود فراموشی حاصل نہ ہو سکی۔ میرا خیال تھا کہ روحی[1] کے بغیر میں جی نہیں سکتا۔ میری محبت غیر فانی ہے، اور روحی مجھے دل سے چاہتی ہے لیکن نزہت! اس کے بغیر مر تو نہیں جاؤں گا۔ پہلی محبت ابدی نہ تھی تو یہ کیسے لازوال ہو سکتی ہے؛ شاید روحی کی طرح نزہت کی نظریں بھی فریب ہوں؛ یا پہلے کی طرح شاید یہ میری ہی غلط فہمی ہو؛ ہاں، روحی میرے نزدیک مثالی حُسن کا پیکر تھی۔ اور اب میں اس تلخ حقیقت سے آگاہ ہو چکا تھا کہ کوئی عورت مثالی نہیں۔ عورتوں کو ہماری محبت ایسا بنا دیتی ہے۔ روحی کو ہمیشہ وارفتگی کی نظروں سے دیکھا تھا۔ نزہت پر میری پہلی نگاہ میں بھی تنقید شامل تھی۔ وہ میرے دل میں بس رہی تھی۔ لیکن پہلی ہی نظر نے بتا دیا تھا کہ کہیں نہ کہیں اُس میں

[1] خالہ زاد بہن

کوئی خامی ضرور ہے۔ اور بہشت میں بھی یہ خلش مجھے ستاتی رہی کہ روحی کی طرح نزہت کا حسن بھی میری آنکھوں کا دھوکا نہ ہو!

ایک روز میں نے بہن سے کہا "تمہاری نگاہ میں کوئی جچتا ہی نہیں۔ نزہت کے حسن کو تو مانتی ہونا!" وہ ہنس دی "تم حسن لڑکی کو دیکھ پاتے ہو اُس کا دم بھرنے لگتے ہو۔ نزہت کا چہرہ کتنا لمبوترا سا ہے۔ رنگ کھلتا ہوا تو ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں جیسا کشمیر لڑکی کا ہونا چاہیئے۔ اور اُس کے اتنے بڑے سر میں دماغ تو معلوم نہیں ہوتا۔ اُس کے انداز سے وحشت ٹپکتی ہے" میں نے غور کیا تو بہن کی باتیں سچ معلوم ہوئیں۔

محبت کی آندھی اُتر گئی۔

کیا محبت اندھی ہے؛ مجھے بچپن سے تلقین کی گئی تھی کہ عورت کو دیکھنا گناہ ہے۔ خیال میں ہوس اور محبت کی ساری منزلیں طے کرلیں۔ یوں عورت کی شکل سے بھی اچھی طرح شناسا نہیں تھا۔ رُوحی پہلی لڑکی تھی جس سے مجھے واسطہ پڑا۔ وہ مجھے اپنا سبق سناتی تھی، میرے لئے کھانا لاتی تھی، مجھے پنکھا جھلتی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ میرے پاس آئے اور میں اُٹھ کے بھاگ جاؤں؛ وہ مجھ سے ایک بالشت کے فاصلے پر سُرخ لباس میں شعلہ بنی بیٹھی ہو اور میں اُسے نہ دیکھوں؛ وہ مجھے بُلائے اور میں جواب نہ دوں! حسن عورت کا زیور تو ہے، لیکن پہلی چیز جو کشاں کشاں ہمیں اُس کی طرف لے جاتی ہے اُس کی نسائیت ہے۔ رُوحی جیسی بھی تھی، ایک لڑکی تھی۔ اور میرے لئے دُنیا بھر میں بس وہی ایک لڑکی تھی۔ پھر اُسے چاہے بغیر میں کیسے رہ سکتا تھا؛ اُس کی ہر بات مجھے کیوں بھلی معلوم نہ ہوتی۔ ایسے ہی نزہت ایک ہی جھلک سے دِل میں اُتر گئی۔ میرا مشاہدہ وسیع ہوتا تو شاید یہ صُورتیں اِس طرح دھوکا نہ دے سکتیں! اتنی آسانی سے دل ہار نہ دیتا۔ اور لڑکیوں کو ہم لڑکے اچھی طرح پرکھ بھی تو نہیں سکتے۔ نسائیت آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اُن کے وجود سے اُن کے نام سے اُن کے خیال سے پیار ہو تو اُن کی خامیوں کی طرف نظر کیسے جاسکتی ہے؛

اگلی سردیوں میں نزہت پھر آئی۔ بجھی ہوئی راکھ میں کبھی کبھی کوئی چنگاری دمک اُٹھتی۔ "میں نے اُسے چاہا تھا تو میری محبت جاوداں کیوں نہ ہوگئی؛ میرے دل کو محبت کا سوز اور حرارت کبھی نصیب نہ ہوگی؛ میری عقل مجھے دو بھر ہو رہی ہے۔ بہن محبت کے دھوکوں سے مجھے کیوں نکالتی ہے؛ دم بھر کے لئے دل و نظر کا اضطراب، پھر وہی تھکا دینے والا روح فرسا سکون۔ میری عمر یونہی گزر جائے گی؛ یہ پیہم پیاس۔ یہ آئے دن نئے نئے جام۔ پہلے مزا، بعد میں تلخی۔ کیوں میری روح ہمیشہ کے لئے کسی ایک کے ساتھ وابستہ نہیں ہوجاتی؛"

میرا دل سرد تھا۔ اُس کے دل کی گرمی روز بروز بڑھتی چلی جارہی تھی۔ آپا سے باتیں کرتے کرتے نزہت کی طرف دیکھا تو اُس کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ حیا سے اُس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ آنکھیں نیچی کرلیں، اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ کیفیت میں کیسے بھول سکتا ہوں؛ عورت کی آنکھ ایک سمندر ہے جہاں دل کی کشتی ساحل کے خیال سے ناآشنا ڈولتی جارہی ہو، یا ایک آسمان، ہماری روح کی پروازیں جس کی وسعتوں کا احاطہ نہ کرسکیں۔ اُس کی نگاہ میں حیرت اور محبت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اُس کی نظر ایسی پاکیزہ

تھی جیسے موتیے کا تازہ پھول ۔ آپا کہنے لگیں "وقار، تم شملہ کیوں نہیں آتے ؟" "رستہ اچھا نہیں ۔ دیکھئے نا، کرایہ بہت زیادہ ہے۔" نزہت بول اُٹھی "بھلا کرایہ زیادہ ہونے سے بھی رستے خراب ہوتے ہیں ؟ بھائی جان، رستہ تو ایسا اچھا ہے کہ جی چاہتا ہے کبھی ختم نہ ہو۔" جیسے میں نے سنا ہی نہیں، انجان بن کے پوچھا "کیا کہا تھا تم نے ؟" جھجک جھجک کے، رُک رُک کے اُس نے وہ فقرہ دُہرایا ۔ اُن کی واپسی سے ایک روز پہلے کا واقعہ ہے ۔ میں صحن میں اکیلا بیٹھا تھا ۔ نزہت اپنے چھوٹے بھائی حامد کو گود میں لئے باہر نکلی ۔ ستون کی آڑ میں جہاں میرے سوا اُس پر کسی کی نظر نہ پڑے کھڑی ہو گئی ۔ حامد کا دایاں ہاتھ اُس کے ماتھے پر رکھا اور کہا "انہیں سلام کرو۔" پانچ چھ بار اُس نے ایسا کیا ۔ میں اپنے تئیں کھویا کھویا سا محسوس کرنے لگا ۔ آخر ہاتھ اُٹھا کر سلام کا جواب دے دیا۔ وہ گھبرا سی گئی اور موہوم سی ہنسی ہنستے ہوئے دوسری طرف مُنہ کر لیا ۔ خدا جانے وہ حامد سے سلام کرا رہی تھی، یا خود مجھے رخصتی سلام کرنا چاہتی تھی !

میں گرمیوں میں شملہ گیا ۔ نزہت میرے پاس سے گزری "نزہت بہن، اچھی ہو نا !" شرماتے، گھبراتے، سمٹتے، لرزتے، لجاتے اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے اُس نے کہا "جی ہاں۔" اُس کا ہونا چاہتا ہوں تو بہن کی باتیں یاد آتی ہیں اور دل کی دھڑکن اچھی طرح بڑھنے نہیں پاتی کہ اُسے معمولی حالت پر لوٹنا پڑتا ہے ۔ اُسے بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں تو اُس کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور قہر ملی رحم کی نظروں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہتی ہے :-

"بودا تھا اگر ایسا پیمانِ شناسائی   کیوں مجھ کو دو عالم سے بیگانہ بنایا تھا ؟"

میری خالہ زاد بہن نے مجھے ٹھکرا دیا تھا ۔ عورت ہم سے ایسا سلوک کر سکتی ہے تو ہم کیوں اُس پر رحم کریں ! نزہت کے دل کو صدمہ ہوگا ۔ خدا جانے میری طرح وہ اس قسم کے کتنے صدمے سہہ چکی ہے ۔ آہ ! جس دل سے دائمی طور پر وابستہ ہونا ہے، بلا شبہ وہ بھی پہلے سے داغ داغ ہو گا ! ایک تیسری بیوی والے شوہر نے مجھے بتایا تھا کہ مرد پہلی کی نسبت دوسری کو زیادہ چاہتا ہے ۔ لیکن کوئی عورت ایسی نہیں جس کے دل کا پہلا نقش ہر دوسرے نقش سے فروزاں تر نہ ہو ! میں اُس محبت کی تلاش میں ہوں جس کے لئے گوئٹے سرگرداں تھا : "جوان محبت، پاک محبت، پہلی، میری نظر کی پیدا کی ہوئی، آخری محبت ۔" کاش مجھے ایسی محبت مل جائے ! کاش اس کے بدلے میں دینے کے لئے میرے پاس بھی ایک بے داغ دل ہوتا !

ابنِ مریم

طیورِ دام

اُردو

مغلوں نے ہندوستان کو ایک مشترکہ زبان بھی دی ہے۔ اس زبان کا نام اُردو ہے۔ وہ فارسی اور ہندی کو ملا کر بنائی گئی ہے اور یقین ہے کہ آزاد ہندوستان کی مشترکہ ملکی زبان تسلیم کر لی جائیگی۔

(مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی (تقریر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ نومبر ۱۹۳۴ء)

نسبتِ یکدلیٔ انگلش و اُردو ست بہم — پُرس ایں نکتہ ز صاحب نظرانِ دہلی
اینک اعلانِ شہنشاہ باندازِ بلیغ — خواند نواب لُوانہ بزبانِ دہلی

(مولانا گرامی مرحوم (بتقریب دربار تاجپوشی دہلی ۱۹۱۱ء)

داغ	حالی
بگڑی شوریدہ سری سے مرے گھر کی صُورت	اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صُورت
نہ وہ دیوار کی صُورت ہے نہ در کی صُورت	نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صُورت
ہاتھ آنکھوں پہ شبِ وصل عبث رکھتے ہو	ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
میری صورت نہ سہی دیکھو سحر کی صُورت	ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صُورت

م۔ک۔ن۔ب

دیکھو ہم کو بھول نہ جانا — بھُولو گے تو یاد کرو گے (حفیظ ہوشیارپوری)

کس دل سے یہ کہتے ہو مجھے بھُول نہ جانا — بھُولے ہو تمہیں بھولنا آساں نہیں ہوتا (حامد علی خاں)

اثرِ نظارہ

دیکھا ترا نظارہ اے شوخ نظر دیکھا — اِک آگ لگا دی ہے اُف! تُو نے جدھر دیکھا

(محوی صدیقی)

اِن شوخ نگاہوں میں بجلی کا اثر دیکھا — اِک آگ لگا دی ہے ظالم نے جدھر دیکھا

(حفیظ ہوشیارپوری)

اِن مست نگاہوں میں جادُو کا اثر دیکھا — اِک حشر کا عالم تھا ظالم نے جدھر دیکھا

(راحل)

راحل ہوشیارپوری

ایک صفحہ میرے لئے

مَیں نے کہا ایک صفحہ میرے لئے اب کی ہمایوں میں رکھ چھوڑئیے۔ "بزمِ ہمایوں" چند ماہ سے میرے لئے وقف رہی، اپنا رسالہ اپنی بزم لیکن سچ یہ ہے کہ اپنے گھر میں بھی انسان جو چاہے نہیں کر سکتا۔ گھر کے اندر سہی لیکن انسانیت سے باہر نہیں ہو سکتا۔ بزمِ ہمایوں میں جو اُردو اُردو کی آوازیں اُٹھیں تو سننے والوں نے بھی کچھ کہنا چاہا اور کیوں نہ کہیں کہنا سننا دونوں طرف ہی سے نہ ہو تو کہنے سننے سے حاصل: بات سے بات نکلتی ہے اور انسان کے معنی ہی ہیں مل جل کر رہنے والا اپنی کہنے اور دوسرے کی سننے والا۔ انسان کی جو چیز بھی ہے وہ باہمی ہی ہو تو ٹھیک ہے۔ یہی ہماری اُردو کا حال ہے، اُردو اُردو جب ہی ہوگی کہ اس کی یہ "باہمیت" روز بروز بڑھے اور وہ ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے ہر امیر غریب ہر ہندو مسلمان کے دل کی بات جہاں تک ممکن ہو آسانی سے کہہ سکے اور آسانی سے سمجھا سکے۔

ہاں تو تھوڑے عرصے سے جو بزمِ ہمایوں میں مجھے بھی باتیں کرنے کی عادت پڑ گئی وہ اس دفعہ بزم میں گنجائش نہ پا کر گھبرائی لیکن ایڈیٹر کا شکریہ کہ اُس نے ایک صفحہ اس کے لئے نکال ہی دیا۔ اب یہ سوچتی ہے کہ کیا کروں؛ جگہ نئی خود پرائی کرے تو کیا کرے؛ مصنّفوں اور ایڈیٹروں کے لکھنے کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ لکھنے کی دُھن لگی ہے لیکن لکھیں کاہے پر؛ یہ ابھی نہیں سوجھتی؛ نہ رہی بات وہ مضمون سجھانے والی! دوسرے یہ کہ لکھنے کی سینکڑوں چیزیں دماغ میں ہیں لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان میں سے کس کو لیں کس کو نہ لیں؛ آج میری یہ دوسری حالت ہے۔ بہار کا موسم ہے حالات خاصے موافق ہیں، صحت بھی کم از کم دل کی اچھی خاصی ہے اسی لئے!۔ آتے ہیں خیر سے یہ مضامیں . . . . نئے نئے . . . . کہوں؛ کانگرس کی فتح، عہدوں کی قبولیت، جواہری گاندھیانہ میل، اُدھر برطانوی حکمتِ عملی لیکن ساتھ ہی احساسِ قوت، کیا ہوگا؛؟ ہاں عدیس ابابا میں اطالویوں کا قتلِ عام لیکن اسے چھوڑئیے یہ تو اِک قصّۂ پارینہ ہے —— اچھا ہسپانیہ میں فاشیت اور اشتمالیت کی ٹکر، یہ بھی کانگرس اور گورنمنٹ کی لڑائی کی طرح رہے سہنے کی چیز ہے —— ہاں! مرنے کی! مرنے کی! واہ حضرت آپ کو اتنا ہی حقیقت کا احساس ہے؛ بس اتنا ہی دوسروں کا درد ہے؟ بیٹھے مضمون نگاروں کی طرح انگڑائیاں لینے اور ایک سفید کاغذ پر جا بجا سیاہی چھڑکنے اور پھر اُس پر ایک مکھی کی طرح بھنبھنانے! اس سے تو بہتر ہوتا کہ آپ اِس بہار کے موسم کی ایک تازہ دم بھڑ ہی ہوتے جو کسی جنرل ڈائر یا مسولینی کی ناک میں گھس کر اُسے کم از کم چند روز کے لئے تو ظلم وستم سے روک سکتی! لیکن آپ ایک زندہ غصیلی بھڑ کہاں آپ تو زیادہ سے زیادہ ہمایوں کے رنگیں باغ کی ادبی کیاریوں کی ایک کبھی کبھی پر پھڑ پھڑانے والی تیتری ہیں!

بشیر احمد

رقّاصہ

اندھیری رات تھی، بادل گرج رہے تھے، جسم کو سن کر دینے والی سرد ہوا چل رہی تھی۔ مینہ موسلادھار برس رہا تھا۔ پہاڑ کے دامن میں ایک گھنا اور مہیب جنگل تھا اور اس میں ایک راستہ بھولا ہوا نوجوان مسافر۔

مصوری کا شوق اسے کشاں کشاں جاپان کے دارالسلطنت ٹوکیو کی طرف لے جا رہا تھا۔

درماندہ مسافر نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی کہ اگر کوئی جھونپڑی وغیرہ نظر آئے تو اس طوفانِ باد و باراں سے بچنے کا کوئی سامان پیدا ہو لیکن چاروں طرف مایوسی مُنہ کھولے کھڑی تھی۔

مایوس مسافر نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ راستے میں کئی جگہ وہ پھسلا، کئی جگہ اس نے نوکدار پتھروں سے ٹھوکریں کھائیں۔ کئی جگہ گرتے ہوئے درخت کے نیچے دب جانے سے بال بال بچا۔ کئی جگہ وہ خاردار جھاڑیوں میں اُلجھا، مگر اُس نے دامنِ ہمت کو ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا۔

وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا، یہاں پہنچ کر پھر ایک دفعہ اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی، لیکن ایک دفعہ پھر اُسے ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا۔ مصیبت زدہ نوجوان کو ہر لمحے یقین ہونے لگا کہ آج کی رات آخری رات ہوگی، اس کے بعد موت ـــــــ بے کسی کی موت۔

اُس نے دوزانو ہو کر دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے، دِل میں ایک اطمینان سا پیدا ہوگیا۔ وہ خاموش تھا۔ یکایک تمام عالم پر سکوت چھا گیا۔ تیز ہوا رُک گئی اور اس کی جگہ ہلکی معطر بیز اور نرم ہوا نے لے لی۔ بارش تھم گئی، بادل چھٹ گئے اور آسمان پر خوبصورت چاند نمودار ہوا۔

مُسافر کے دل میں پھر ایک دفعہ اُمید کی کرن پیدا ہوئی۔ اُس نے سر اُٹھا کر نیچے وادی کی طرف دیکھا۔ دُور کسی جھونپڑی میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مدھم سی روشنی اُسے نظر پڑی۔ اُس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ وہ اپنے آپ میں ایک نئی طاقت محسوس کرنے لگا وہ اُٹھا اور چراغ کی سیدھ میں چل کھڑا ہوا۔

لڑکھڑاتا ہوا نوجوان جھونپڑی کے دروازے کے پاس پہنچا، اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک خوش آہنگ نسوانی آواز سُنائی دی۔

"کون ہے"

"میں ایک تھکا ماندہ مسافر ہوں۔ اگر مضائقہ نہ ہو تو کسی کونے میں رات بسر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

اسی وقت ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور کسی نے مُسافر کی شکل و شباہت۔ حالت اور اُس کی سچائی کا جائزہ لینے کے لئے باہر جھانکا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔

"تشریف لے آیئے۔ خوش آمدید!" وہی سُریلی آواز آئی۔

مُسافر نے قدم بڑھائے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کی میزبان ایک نہایت حسین، پری وش لڑکی تھی۔

نوجوان آداب بجالایا۔

"مَیں یہاں بالکل اکیلی ہوں۔ میرے پاس صرف ایک چارپائی اور بستر ہے۔ آپ اِس پر آرام فرمایئے۔ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی کیونکہ رات کا بیشتر حصّہ مَیں آنکھوں میں کاٹتی ہوں۔ مَیں ابھی آپ کے لئے کھانا تیار کر کے لاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ نوجوان حیران تھا کہ اتنی حسین لڑکی اور اس ہیبت جنگل میں یکہ و تنہا۔ یہ کیا راز تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اتنے میں لڑکی اُس کے لئے کھانا لے آئی۔ وہ کھانا کھاتے ہُوئے بھی یہی سوچتا رہا کہ اس لڑکی کے یہاں رہنے میں کیا راز ہے۔ کھانے کے بعد اپنی حسین میزبان کی درخواست پر وہ بستر پر جا لیٹا۔ اتنی تکان کے بعد اُسے نیند آجانی چاہئے تھی لیکن نہ آئی۔ وہ اِسی عقدے کے حل کی فکر میں تھا۔ آخر بہت دیر کے بعد اُس پر نیم مدہوشی کی سی حالت طاری ہونے لگی۔ تکان اپنا کام کرنے لگی اور وُہ سو گیا۔

کتنی دیر وہ سوتا رہا؛ یہ نہیں کہا جاسکتا لیکن ایک عجیب سی آواز سے اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ وہ اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے سو جانے کے بعد ایک پردہ اُس کے سرہانے کی طرف لٹکا دیا گیا تھا۔ آواز اُسی پردے کے پیچھے سے آتی تھی۔ اس خیال سے کہ شاید جھونپڑی میں کوئی چور گھس آیا ہو اُس نے جھونپڑی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وُہ پردے کی طرف بڑھا اور جھونپڑی کے دوسرے کمرے میں داخل ہُوا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے ایک ایسا نظارہ دیکھا جس نے اُس کو حیرت سے نقش بر دیوار بنا دیا۔

اُس کے سامنے مہاتما بُدھ کا ایک بُت تھا۔ بُت کے پاس ایک خوبصورت نوجوان کی تصویر تھی۔ اِن دونوں پر رنگارنگ کے جنگلی پھولوں کے ہار پڑے تھے۔ اور حسینہ وجد کے عالم میں ان دونوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔ وہ رقص کر رہی تھی اور مُسافر اُس کا رقص دیکھنے میں محو ـــــ دونوں دُنیا جہان سے بے خبر نظر آتے تھے۔

بیخودی کے اس دَوران میں حسین رقّاصہ کی نظر مُسافر کے مدہوش چہرہ پر پڑی۔ اُس نے ناچنا بند کر دیا۔ پہلے تو اُس کی خوبصورت پیشانی پر غصہ کے آثار پیدا ہوئے لیکن فوراً ہی اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"مَیں اپنی اس غلطی کے لئے آپ سے معافی چاہتی ہوں اور مَیں سخت نادم ہوں کہ آپ کی نیند میں مخل ہوئی۔"

نوجوان چونکا ـــــ جیسے ایک حسین خواب سے۔ اس نے پشیمانی سے کہا "مَیں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ کی تنہائی میں خلل انداز ہوا لیکن گُستاخی معاف، آپ ایک بے مِثل رقّاصہ ہیں۔ آپ کے رہنے کے لئے یہ جھونپڑی کسی طرح موزوں معلوم نہیں ہوتی۔ آپ ...... "

"ہاں میں ایک رقاصہ تھی۔ تمام ٹوکیو میں شہنشاہ اور بڑے بڑے امیروں کی مجلسوں میں مَیں رقص کیا کرتی تھی مگر ...... "

وُہ رُک گئی اور اس کا سر کسی نامعلوم غم کے بار سے جُھک گیا۔

نوجوان نے ذرا اضطراب سے پُوچھا "مگر؟"

پری پیکر رقاصہ نے اشکوں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو اُوپر اُٹھایا۔

"آپ میری کہانی سُننا چاہتے ہیں؟ چلیئے دوسرے کمرے میں۔ وہاں میں آپ کو سناؤں گی۔ اپنی کہانی"

دونوں چارپائی والے کمرے کی طرف بڑھے، نوجوان مسافر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ خوبصورت رقاصہ جھونپڑی کی دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی۔

مہ لقا رقاصہ نے کہنا شروع کیا "یہ کوئی دو سال کا قصہ ہے۔ ٹوکیو میں میرے ناچنے کی دُھوم مچی تھی۔ نواب و امیر مجھے اپنی محفلوں میں بلاتے اور فخر کرتے تھے۔ اچانک میری اس دُنیا میں ایک نوجوان نے قدم رکھا۔ وہ میرے ناچ پر بے خود ہو جاتا تھا۔ اُس نے میرے مکان پر آنا شروع کیا۔ یہ ہماری دوستی کی ابتدا تھی۔ رفتہ رفتہ آشنائی نے محبت کا رنگ اختیار کیا، ہمیں ایک دوسرے سے ایک ایک لمحہ کی جدائی شاق گزرنے لگی۔ پھر ــــــ ہم نے ماں باپ کی مخالفت پر بھی شادی کر لی۔ اور ایک سال ہم دونوں تمام دُنیا کو بھول کر خوش رہے۔ لیکن ایک سال کے بعد . . . . "

رنج سے اُس کی آواز بند ہو گئی۔

اس کے بعد اُس نے نہایت غمناک آواز میں کہا "موت کے بیرحم ہاتھوں نے اُس کو مجھ سے چھین لیا۔ وہ میرے ناچ کا شیدا تھا اس لئے مَیں اب بھی ہر شب اُس کی تصویر کے سامنے اچھی سے اچھی ناچنے کی پوشاک پہن کر رقص کرتی ہوں تاکہ اُس کی رُوح کو خوشی حاصل ہو جس طرح وہ یہاں مجھے ناچتا دیکھ کر خوش ہُوا کرتا تھا اُسی طرح وہاں بھی وہ خوش ہو"

نوجوان مبہوت بنا اُس کی دردناک کہانی سُن رہا تھا۔ انجام پر اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔

رقاصہ نے آنسوؤں کو دیکھ کر کہا "مجھے معاف کیجئے کہ مَیں نے آپ کو رنج پہنچایا ہے"

نوجوان خاموش تھا اور اُس کی نظر حسین رقاصہ کے حسرت زدہ چہرے پر جمی تھی۔

(۲)

اِس واقعہ کو چالیس سال کا عرصہ گزر گیا۔

مصوّر اپنے عالی شان قصر کے نگارخانہ میں بیٹھا ہُوا کسی بلند پایہ رئیس کی تصویر بنانے میں محو تھا۔ جاپان میں ہر طرف اس کی مصوّری کا چرچا تھا۔ بڑے بڑے رئیس گراں بہا معاوضہ دے کر اُس سے اپنی تصاویر کھنچوایا کرتے تھے۔ ٹوکیو کے تمام مشہور اخبار اس کی مصوّری کے گُن گاتے تھے ــــــ ایک خادم نے آکر اطلاع دی "ایک بڑھیا کوئی تین چار روز سے یہاں آتی ہے اور حضور سے ملاقات کی خواہاں ہے ہم ہر روز اُسے ٹالتے رہے مگر آج یہی مناسب جانا کہ جناب کو اطلاع کر دی جائے۔ وہ پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ہے اور بے حد غریب معلوم ہوتی ہے"

مصوّر نے غصہ میں کہا "مَیں تم لوگوں کو اس لئے اپنے دروازے پر کھڑا نہیں رکھتا کہ خونخوار کتوں کی طرح کسی غریب کو میرے پاس پھٹکنے ہی نہ دو۔ جاؤ اور فوراً اُس غریب بڑھیا کو میرے پاس لاؤ"

خدمتگار کچھ عرصہ کے بعد بڑھیا کو ساتھ لے کر واپس آگیا۔ مصوّر نے نہایت عزت کے ساتھ اُسے ایک کوچ پر بٹھایا اور اس سے ملاقات کی غرض دریافت کی۔ بڑھیا نے اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور کہا "مَیں اپنی تصویر بنوانا چاہتی ہوں۔ بڑھاپے کی نہیں بلکہ جوانی کی۔ اُس وقت میں حسین تھی"

مصوّر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اُس زمانے کی ایک پوشاک میرے پاس رہ گئی ہے جسے پہن کر ایک خاص طرز میں کھڑی ہو کر میں یہ تصویر کھنچوانا چاہتی ہوں۔ آپ کو معاوضہ دینے کے لئے میرے پاس سوائے اس پوشاک کے اور کچھ نہیں۔ تصویر کھنچوانے کے بعد ہی میں آپ کی نذر کر سکتی ہوں۔ یہ پرانی وضع کا لباس شاید ایک عجوبے کے طور پر آپ رکھنا پسند کریں۔"

بڑھیا نے پوشاک نکالی۔

مصوّر نے حیرت سے پوچھا "ہیں آپ؟"

بڑھیا نے گھبرا کر جواب دیا "ہیں!"

مصوّر نے سوال کیا "کیا آپ نے مجھے پہچان لیا ہے۔ کیا آپ اُس درماندہ مُسافر کو بھول گئیں جس نے ایک دفعہ آپ کے ہاں رات بسر کی تھی؟"

بڑھیا نے کہا "تقدیر نے میری رہنمائی کی ہے کہ میں آپ تک پہنچ گئی ہوں۔ آپ نے اُس رات مجھے ناچتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اُسی وقت کی اور ویسی ہی میری تصویر کھینچ دیجئے۔"

"ہاں ضرور! آپ کہاں رہتی ہیں؟"

"یہ مَیں نہیں بتانا چاہتی۔ میرے رہنے کی جگہ اس قابل نہیں کہ آپ سے اس کا ذکر کروں۔"

چند دنوں میں مصوّر نے اس کی مرضی کے مطابق اس کی تصویر بنا دی یعنی اُس وقت کی جب وہ حسین تھی۔ تصویر میں مصوّر نے اُس کو کچھ اس خوبی سے ناچنے کی حالت میں دکھایا کہ تصویر پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ یہ مصوّر کی بہترین تصویر تھی۔

بڑھیا نے تصویر لے کر مصوّر کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنی پوشاک اُس کے حوالے کر دی۔

"نہیں۔ مَیں یہ نہیں لوں گا۔ اِسے آپ اپنے پاس رکھیئے۔"

"یہ اب میرے کسی کام کی نہیں۔ ایک پرانی یادگار کے طور پر میری خاطر رکھ لیجئے۔" رقاصہ چلی گئی۔

مصوّر نے ایک نوکر اُس کے پیچھے روانہ کیا کہ چُپ چاپ اُسکے رہنے کی جگہ معلوم کرے۔ نوکر نے آ کر کہا کہ وہ شہر سے باہر فقیروں اور گداگروں کے محلّے میں ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں رہتی ہے۔ مصوّر نے دوسرے دن گھوڑا گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا اور اپنے ساتھ کپڑے، تحائف اور روپے لے کر اُس کی جھونپڑی میں پہنچا تاکہ اس کی بقیہ زندگی کے آرام سے گزرنے کا سامان کرے۔

جھونپڑی پر بالکل خاموشی چھائی تھی آواز دینے پر جب کسی نے جواب نہ دیا تو وہ اندر داخل ہوا۔ بُدھ کے بُت اور نوجوان کی تصویر کے سامنے مصوّر کی تازہ بنائی ہوئی تصویر آویزاں تھی اور بڑھیا چارپائی پر ہمیشہ کی نیند سو چکی تھی۔ اب وہ خود اپنے محبوب کی رُوح کو اپنے رقص سے خوش کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ اور اپنے بجائے اپنی نوجوانی کی تصویر چھوڑ گئی تھی۔

(ماخوذ از لیفکاڈیو ہرن)

امتیاز اللہ خاں

میں کبھی نہ بھولوں گا وہ عجیب واقعہ جو ایک رات ہمارے گاؤں کے مکان میں پیش آیا۔ ہمارا مکان ایک بہت بڑے باغ میں واقع ہے۔ بہار کا موسم شباب پر تھا اس لئے مکان کے کشادہ صحن کے اندر اور باہر ہر جگہ تتلیاں، بھونرے، شہد کی مکھیاں اور کیڑے مکوڑے نظر آتے تھے۔

اُس دِن صبح جب ماما چائے بنانے کے لئے باورچی خانے میں گئی تو ایک کوڑیالے سانپ کو چولھے پر بیٹھا دیکھ کر شور مچانے لگی۔ سانپ نہایت اطمینان سے رینگتا ہؤا پانی کی موری کے راستے سے نکل کر باہر گھاس کے تختے میں غائب ہوگیا۔ سہ پہر کو پھر وہی سانپ صحن میں سیر کرتا ہؤا دیکھا گیا لیکن اس دفعہ غائب ہونے سے پہلے مالی نے اس کا سر کچل دیا۔

رات ہوئی تو گھر کے چھوٹے بچے دادی اماں کو جو ضعیف العمری کے باعث بینائی کھو چکی تھیں، ایک دفعہ پھر سانپ اور شہزادی کی کہانی سنانے پر مجبور کرنے لگے۔ دادی اماں کہانی سُنانے لگیں تو بچے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے بیچ ہی میں سو گئے۔ حمید اپنی چارپائی پر ذرا دُور لالٹین کی دھیمی روشنی میں مدرسے کی کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اور بعض دفعہ جب مچھر اور بھونرے اس کے چہرے سے چھو جاتے تو وہ طیش سے اپنے گالوں پر ایک آدھ کا تھپڑ جما دیتا۔

دادی اماں برابر کہانی سنائے جا رہی تھیں۔ یکایک حمید اپنی چارپائی پر سے بولا " دادی اماں آپ کہانی کسے سُنا رہی ہیں؟ بچے تو بہت دیر ہوئی سب سو چکے ہیں"۔ دادی اماں بولیں " اب تو تھوڑی سی رہ گئی ہے"۔ حمید جو کتاب کی طرف پوری توجہ نہ دے سکتا تھا سٹپٹا کر رہ گیا۔ پھر صبر سے بولا " اکیلے بیٹھ کر بولنے کا مقصد کم از کم مَیں تو نہیں سمجھ سکتا اور تخت پر مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد میری بھی آنکھ لگ گئی۔ آدھی رات کا وقت ہوگا کہ ہم سب حمید کی ایک ہلکی سی چیخ سُن کر جاگ اُٹھے مَیں اس کی چارپائی کی طرف دَوڑا۔ دادی اماں نے شور مچا دیا۔ ارے کمبختو۔ دوڑو۔ بچے کو دیکھو۔ ڈر گیا ہے۔ مَیں نے پوچھا حمید کیا ہؤا ہے۔ مگر ڈر سے اس کی آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ آخر نہایت مشکل سے وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ سانپ .... گردن ......

تمام گھر میں کہرام مچ گیا۔ لوگ گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ میں حمید کو تسلی دینے کے لئے اندھیرے میں

اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے جسم پر گردن تک ایک چادر اوڑھ رکھی تھی۔ حمید پھر کمزور سی آواز میں بولا " اب پیٹھ کی طرف . . . . . ہائے !"

میرے ہوش و حواس گم ہو چکے تھے۔ گھر کے سب لوگ گھبرائے ہوئے تھے اس لئے سُوجھتا کسی کو کچھ نہیں تھا۔ اور کرتے بھی کیا، اگر کپڑوں کو ہلایا جاتا تو ڈر تھا کہ کہیں سانپ ڈس نہ لے۔ حمید بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ اتنے میں عنایت اللہ جو ہم سب میں ذرا منچلا اور دلیر واقع ہُوا تھا، اپنے ہاتھ اور بازو کے ارد گرد ایک موٹا سا کپڑا لپیٹ کر پنجوں کے بل آگے بڑھا اور بولا " کدھر ہے، حمید اب کدھر ہے ؟ "

حمید نے سر اور آنکھوں سے ایک دردناک اشارہ کیا اور سہمی ہوئی آواز میں بولا " اس طر . . . . . اس طرف پیٹھ پر "

عنایت اللہ نے کچھ دیکھ کر کمال مردانگی سے حمید کی پیٹھ پر ہاتھ مارا اور سانپ کو زور سے پکڑ کر زمین پر جھٹک دیا۔ دھاگا ٹوٹ گیا اور تسبیح کے دانے سب اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

حمید کی عادت تھی کہ نماز پڑھتے وقت " زیادہ ثواب حاصل کرنے کے لئے " گلے میں تسبیح ڈال لیا کرتا تھا۔ رات کو نماز کے بعد نیند نے ایسا غلبہ کیا کہ وہ تسبیح گلے سے اُتارنا بھُول گیا۔ آدھی رات کو کہیں آنکھ جو کھُلی تو بدحواسی میں تسبیح کو سانپ سمجھ کر لگا گھر بھر کو جگانے۔

یارو حمید بھی بڑا مزے کا آدمی ہے۔ مَیں اس رات کی ہڑبڑی کو کبھی نہ بھُولوں گا۔

فاروق علی خاں

ایمان کے بغیر انسان بے کار ہے لیکن ایمان علم کو تباہ کر سکتا ہے۔

جو کچھ مَیں نے دیکھا ہے اُس سے مَیں نے خدا پر بھروسا کرنا سیکھا ہے اُس سب کچھ کے لئے جو میں نے نہیں دیکھا۔

گلچیں

محفلِ ادب

ماں کا دِل

وہ نوجوان تھا ــــ

اس کا گرم شباب دل اُس دوشیزہ کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔

محبوبہ نے اُس کی محبت کو آزمائش کی کسوٹی پر کسنا چاہا۔ بولی۔

"کیا تمہیں مجھ سے سچی محبت ہے ؟"

نوجوان نے آنکھوں میں آنسو بھر کر جواب دیا۔ "ہاں"۔

دوشیزہ نے کہا "میں تمہاری محبت کا ثبوت چاہتی ہوں"۔

وہ بولا "مَیں اس کے لئے تیار ہوں"۔

دوشیزہ نے اس کے دھڑکتے ہوئے دل پر برقِ تبسم گرا کر کہا۔ "جو کچھ مَیں مانگوں۔ مجھے دو گے ؟"

نوجوان نے سینہ تان کر جواب دیا "مَیں تمہارے لئے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں"۔

"جو چیز منگاؤں۔ لا دو گے ؟"

"ہاں ضرور لادوں گا۔ چاہے وہ چیز دُنیا کے کسی گوشہ میں بھی ہو ــــ میں تیرے لئے آسمان سے تارے توڑ لاؤں گا۔ زمین کا کلیجہ چیر کر دھات نکال دُوں گا۔ سمندر کی خوفناک لہروں سے کھیل کر آبدار موتی لے آؤں گا"۔

"دیکھو ۔ میری آزمائش بہت سخت ہے "۔

"تو دنیا کی کوئی چیز بھی منگائے ۔ مَیں اسے لاکر تیرے قدموں پر قربان کر دوں گا"۔

"مشکل ہے ۔ ہر شخص نہیں لاسکتا"۔

"دُنیا میں کوئی بھی انسان نہ لا سکتا ہو۔ لیکن مَیں لاؤں گا"۔

دوشیزہ نے اس کی طرف ممنون نگاہوں سے دیکھا اور پھر اطمینان سے بولی "تو اپنی ماں کا سینہ چیر کر دل نکال لاؤ"۔

نوجوان چونک پڑا۔ اس نے چند سیکنڈ تک متحیر نگاہوں سے دوشیزہ کی طرف دیکھا۔

محبت کی نیرنگیاں ــــ ! کون بیان کر سکتا ہے ؟ دُنیا کی نگاہوں نے محبت کے بڑے بڑے کرشمے دیکھے ہیں۔

نوجوان نے کہا "اچھا" اور چھری لے کر گھر کی طرف چلا۔

مادرانہ محبت نے اسے تصوّر میں جھلک دکھلائی۔

اُس کا دل کانپ گیا۔

چاہا کہ چھری ہاتھ سے پھینک دے۔

مگر پھر ــــ دوشیزہ کی محبت ماں کی محبت پر غالب آئی۔

حُسن کی کارفرمائیوں نے اس کے دل کو قوت دی۔ وہ دوڑتا ہوا اپنے گھر جارہا تھا۔

وہ گھر پہنچا ــــ

مامتا کی ماری دیر سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

بیٹے کا چہرہ گرد و غبار میں اٹا ہوا دیکھ کر گھبرا گئی۔

بولی "بیٹا! خیر تو ہے ــــ آج اتنی دیر سے کہاں تھے ؛ تمہارا چہرہ اُترا ہوا کیوں ہے ــــ ؟ آؤ ۔ میرے لال! میرے قریب آؤ ۔ مَیں تمہارے گھونگر والے بالوں کی گرد تو صاف کر دوں"۔

بیٹا اپنی ماں کے پاس گیا۔

وہ اس کے سر پر دستِ شفقت پھیر رہی تھی۔ نوجوان نے اس کے سینہ میں چھری پیوست کر کے دِل نکال لیا۔

وہ خوش تھا ــــ

اس کی نگاہوں میں کسی کا جلوہ تھا۔

خوشی کے مارے کوئے جاناں کی طرف دیوانہ وار بھاگا جا رہا تھا۔

زمین پر پیر نہ پڑتے تھے۔ راستہ کے نشیب و فراز کا بھی خیال نہ تھا۔

جب اس کی نظر اپنی ماں کے خونچکاں دِل پر پڑتی وہ اپنے قلب میں ایک نئی رُوح محسوس کرتا تھا۔

سمجھتا تھا کہ آج میں زندگی کے حقیقی لُطف سے آشنا ہُوا ہوں۔

وہ اپنی محبوبہ کے تصوّر سے شاد کام تھا۔

سوچتا تھا کہ جب میں اس خونچکاں دِل کو اس کے قدموں پر ڈال دوں گا تو وہ کس قدر خوش ہو گی۔

"مَیں نے اس کے حکم کی تعمیل میں اپنی ماں کو ــــ اس پیاری ماں کو جس نے مجھے پرورش کیا تھا موت کی گہری نیند سُلا دیا ــــ"

مَیں نے دُنیا کا سب سے بڑا پاپ کیا ہے ــــ لیکن کچھ نہیں۔ محبوبہ کی خوشی کے لئے سب کچھ جائز ہے۔

وہ کوئے جاناں کی طرف بہت تیزی سے دوڑتا ہُوا جارہا تھا۔ اسے راستہ کی بھی خبر نہ تھی۔

دفعتہً ٹھوکر لگی۔

وہ مُنہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

ماں کا دِل اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور گرا۔

خون میں لتھڑے ہوئے دل سے آواز آئی ــــ

"ہے ہے ــــ میرے لال ۔ کہیں تیرے چوٹ تو نہیں لگی ــــ ؟

. . . . . . کیا کروں ۔ میرے ہاتھ نہیں ورنہ تیری گرد جھاڑ دیتی"۔

"یہ ہے ماں کی مامتا"

ریاست

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ مئی ۱۹۳۷ء

تصویر:- تخیلات

چندہ سالانہ صر ششماہی سے مع محصول — قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

ہُمایوں کا انعامی مقابلہ

بیگم محمد رفیع صاحبہ کی طرف سے پچاس روپے کا عطیّہ

فروری ۱۹۳۷ء کے "ہمایوں" میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ اس سال پھر حضرت ہمایوں مرحوم کی دختر اور مدیر "ہمایوں" کی ہمشیرہ بیگم محمد رفیع صاحبہ نے اُردو کے اہلِ ادب کو

اُردو زبان کے عیُوب و محاسن

کے موضوع پر انعامی مقابلے کے لئے مضمون لکھنے کی دعوت دی ہے۔ مضامین کے دفتر میں پہنچ جانے کی آخری تاریخ ۳۰ اپریل ۱۹۳۷ء قرار دی گئی تھی لیکن اب اِس میں ایک مہینے کی مزید توسیع کر دی گئی ہے۔ شرائط حسب ذیل ہیں:-

(۱) مضمون نگار کو اُردو کے محاسن کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً ہندوستان کی دوسری زبانوں سے اُس کا موازنہ کرنا چاہئیے اور عیوب کے سلسلے میں اُن کے رفع کرنے کی تدابیر بھی پیش کرنی چاہئیں۔

(۲) موصولہ مضامین میں سے بہترین مضمون پر پچاس روپے انعام دیا جائے گا اور باقی مضامین میں سے چند مضمون "ہمایوں" میں شائع کئے جائیں گے۔

(۳) مضامین یکم جون ۱۹۳۷ء سے پہلے دفتر "ہمایوں" میں پہنچ جانے چاہئیں۔ ارادہ ہے کہ منتخب مضامین اگست کے مہینے میں شائع کئے جائیں۔

(۴) مضمون زیادہ سے زیادہ "ہمایوں" کے بیس اور کم سے کم دس صفحات پر پورا ہو۔

بزمِ ہُمایوں

ہمارے ملک میں آج کل بڑے بڑے سوال درپیش ہیں، کانگرس اور گورنمنٹ کی اینچاتانی، کسانوں اور تعلقداروں کے جھگڑے ہندو مسلم مسئلہ، اُردو ہندی کی بحث ان پرانے زنی ہو رہی ہے اور اپنی اپنی طرف سے پروپگنڈا ہو رہا ہے۔ یہ ہمارے وطن کے لئے ایک بڑا نازک وقت ہے خطرناک بھی ہے ممکن ہے بہت خطرناک ہو لیکن اس زندگی میں عموماً کوئی فائدہ خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ آج کل عمل کی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا بھر میں بڑی بڑی باتیں ہو رہی ہیں اور خوب تیزی سے ہو رہی ہیں۔ کیا ہونے والا ہے یہ کسی کو معلوم نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہم میں سے اکثروں کے لئے اس جدّ و جہد میں حصّہ لینا لازم ہو گیا ہے۔

سیاسی کشمکش کے بعد اس وقت ایک نہایت ضروری مسئلہ زبان کا درپیش ہے بلکہ سچ پوچھئے تو یہ بھی بدقسمتی سے ایک سیاسی مسئلہ بن گیا ہے لیکن عارضی بدقسمتی ممکن ہے کہ ایک زیادہ مستقل خوشی اور اطمینان کا موجب بن جائے۔ بہرحال اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے سے یہ سوال حل نہ ہوگا، بہتر ہے کہ لوگ اس پر غور کریں اور ایک مفید نتیجے پر پہنچیں۔

پچھلے سال بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا وہ مشہور اجلاس ناگپور میں ہوا جس میں گاندھی جی نے ہندی اعنی ہندوستانی والی تجویز پیش کی گاندھی جی مدتوں سے ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر رہیں، وہ کئی سال سے ہندی کے لئے پروپگنڈا کر رہے ہیں، بقول مولوی عبدالحق صاحب کے انھوں نے ناگپور میں کہا کہ اُردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے وہ چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ اس پر بہت رنجش پیدا ہوئی۔ اُردو ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے ہندوستان کی پیداوار ہے اس پر اسلام کی پرچی چسپاں کرنا پرلے درجے کی ناانصافی بلکہ کوتاہ اندیشی ہے۔ یہ ہندو مسلم تعلقات اور اتحاد کی ایک جیتی جاگتی نشانی ہے۔ ہمارے جو رہنما ہندوستان کی ترقی اور آزادی چاہتے ہیں انہیں اپنے کام میں اس زبردست آلے کو استعمال کرنا چاہئے۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ایک بنی بنائی چیز کو ایک بنے بنائے پلیٹ فارم کو توڑا جائے ڈھایا جائے اور پھر یہ کوشش کی جائے کہ لوگ ایک نیا پلیٹ فارم بنائیں، اس کا صرف نتیجہ ہوگا کہ ہر گروہ اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد اور اپنا اپنا ڈیڑھ اینٹ کا مندر بنالے گا۔

اس بارے میں ہمایوں کے پچھلے نمبر میں جو بے انتہا دلچسپ اور مفید مضمون مولانا ابوالقاسم صاحب کا "مہاتما گاندھی سے بات چیت" شائع ہوا ہے وہ ہندوستان کے ہر سیاسی کارکن کو نہایت غور سے پڑھنا چاہئے۔ مولانا ہماری طرف اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اختتامِ مضمون پر معلوم ہوا کہ مہاتما اچھی طرح اُردو لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ اس لئے زیرِ تذکرہ مضمون ناگری میں لکھوانا پڑا جس نے سو صفحوں سے زیادہ جگہ گھیری۔ ناگری میں لکھی ہوئی کاپی پر اُردو ٹائپ کی ۵۰ صفحے والی کاپی رکھ کے جوابی رجسٹری سے گاندھی جی کے پاس بھجوائی۔ گاندھی جی نے اس کا جو جواب دیا وہ بے کم و کاست بعینہٖ درج ذیل ہے:-

بھائی صاحب آپ نے بہت محنت لے کے مجھے لمبا خط لکھا ہے لیکن جو بات میں نے کبھی نہیں کی ہے اس پر آپ نے اپنا لیکھ بنایا ہے میں تو اُردو زبان کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ اُردو زبان اچھی طرح جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے جو خیالات دس برس پہلے اندور میں ظاہر کئے تھے وہی آج بھی ہیں۔ اب آپ کہیں مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ وردھا۔ آپ کا گاندھی

اس جواب پر یہاں سے غالباً ایسے ہی دوڈھائی بول لکھ بھیجے تھے :۔

مہاتماجی۔ آپ نے پوری لکھت نہیں پڑھی اُسے پڑھ لیتے تو پھر آپ مجھ سے یہ نہ پوچھتے "آپ کیا چاہتے ہیں"۔ اچھا آپ نے مجھ سے جو کہا اور مدراس میں آپ کو جو کہنا پڑا کیا یہ دونوں ایک ہیں؛ پرماتما کے لئے پہلے میری پوری لکھت پڑھیئے اور پھر جو آپ کو لکھنا ہے وہ لکھیئے۔

مہاتما نے اس کا جو جواب بھیجا اُس کی نقل بھی بے کم و کاست بعینہٖ درج کی جاتی ہے :۔

سید صاحب۔ آپ کا خط ملا ہے۔ میں نے آپ کی لکھت پوری پڑھ لی تھی۔ میرا کہنا تو یہ تھا نہ کی جو آپ نے مان لیا۔ میں نے کہا تھا وہ میں نے کہا ہی نہیں تھا۔ آپ کو تو یہ بتانا ہے میں نے ایسا کہاں کہا تھا۔ جی ہاں جو میں نے مدراس میں کہا سو میں نے ہمیشہ کہا ہے مانا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اخبار والوں نے کیا لکھا ہے۔ وردھا۔ آپ کا گاندھی

مہاتما کی تحریروں میں خط کشیدہ الفاظ قابلِ گرفت نہیں۔ اُن کا اتنا اُردو لکھ لینا بھی بہت ہے ۔

افسوس ہے کہ اس خط و کتابت سے معاملہ واضح نہیں ہوتا۔ غالباً مہاتماجی یہ کہتے ہیں کہ مَیں نے کہیں نہیں کہا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اگر واقعی یہی بات ہے تو ہماری اُن سے درخواست ہے کہ وہ صاف صاف لفظوں میں ایسا کہہ دیں تاکہ غلط فہمی دُور ہو جائے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اُردو ہندی کے سارے جھگڑے کے متعلق وہ چند لفظوں میں معاملہ طے کر سکتے ہیں۔ پچھلے سال جب یہ غلط فہمی پیدا ہوئی اور مسلمانوں میں بدگمانی پھیلی تو پنڈت جواہر لال نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ جہاں تک میرا ذاتی تعلق ہے میری زبان اُردو ہے اور جہاں تک کانگرس کا تعلق ہے کانگرس صاف لفظوں میں کہہ چکی ہے کہ اُس کے نزدیک مُلک کی زبان ہندوستانی ہے جو اُردو اور ناگری دونوں صورت میں لکھی جائے گی۔ یہ بات تو ہر چھوٹے بڑے کی سمجھ میں آسکتی ہے لیکن مہاتماجی کے بیانات یا ہندی کی طرف داری میں ہیں یا شک و شبہ پیدا کر دیتے ہیں۔ مہاتماجی سارے ہندوستان کے رہنما ہیں کم از کم اُنہیں ایسا ہی ہونا چاہئے۔ نرے ہندوؤں کی نمائندگی، نری ہندی کا پرچار اُن کی شان کے شایاں نہیں۔ اگر وہ اُردو کو صحیح قسم کی سلیس اُردو کو جس کی بنیاد تمام تر ہندوانی ہے ہندوستان کی زبان مان لیں اور اُس کی اشاعت کا کام کریں تو بدگمانی کرنے والے مسلمان بھی فوراً اُن کے گرویدہ ہو کر اُن کے پیچھے ہو لیں جس سے ملک کی بہت سی مشکلیں حل ہو جائیں۔ اور اگر یہ نہیں تو ہماری کم از کم اُن سے یہ توقع ہے کہ وہ ہندی کا پرچار چھوڑ دیں اور ہندوستانی میں ایک سیاسی یا معاشرتی اخبار یا رسالہ جاری کریں جس میں پہلو بہ پہلو اُردو اور ناگری حُروف میں ایک ہی مضمون لکھا جائے۔ وہ شمالی ہند کے ہندوؤں کو ہدایت کریں کہ وہ پہلے کی طرح اُردو لکھتے پڑھتے رہیں پھر اُردو اور ہندی اپنی اپنی جگہ پھولیں پھلیں یہاں تک کہ رواداری کے پانی سے سیراب ہو کر ایک دن سارے ہندوستان کی ایک ہی واحد مشترکہ قومی زبان بن جائے!

بشیر احمد

جہاں نما

"ہندو کُش" اورنگ زیب اور سر پی سی رائے

حال ہی میں کلکتے کے مسلمان طلبہ کے ایک نیم سیاسی جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے شہرۂ آفاق بنگالی عالم سر پی سی رائے نے بہت کھری کھری باتیں کہیں۔ اُنہوں نے مسلمان طلبہ کو اُن کی موجودہ بیداری پر مبارکباد دیتے ہوئے مصطفےٰ کمال اور رضا شاہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کی اور ہندوستان میں مسلمانوں کے گزشتہ کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ اسلامی عہدِ حکومت میں بنگال آج کل کے مقابلے میں زیادہ خوش حال تھا۔

سر پی سی رائے نے اورنگ زیب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "آج کل ہمارے کالجوں اور مدرسوں میں ہندوستان کی جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں وہ خاص الخاص سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر لکھی گئی ہیں اور اُن کی یہ مسخ شدہ صورت بے انتہا گمراہ کن ہے۔ مروجہ نصاب تاریخ کے پیش کردہ اورنگ زیب کو جو نہایت متعصب اور ظالم بادشاہ ظاہر کیا جاتا ہے اصل اورنگ زیب سے دُور کی نسبت بھی نہیں۔ اورنگ زیب کے ہندوؤں سے نفرت کرنے کے افسانے بالکل بے سروپا ہیں اور محض سیاسی مصالح کی بنا پر گھڑ لئے گئے ہیں۔

فاضل مقرر نے کہا یہ ایک نہایت شرمناک حقیقت ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اُن من گھڑت تاریخی افسانوں کا یقین دِلا دیا گیا ہے جو بالکل بے بنیاد ہیں۔ مَیں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ سر جدوناتھ سرکار اور ڈاکٹر موزمدار جیسے مشہور مؤرخ اس بات کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے کہ اورنگ زیب نے بنگال کے ہندوؤں سے جزیہ لیا ہو، بلکہ اس کے برعکس اورنگ زیب کے عہد میں بنگالی ہندوؤں کو بڑے بڑے منصب اور جاگیریں عطا ہوئیں۔ مرشد قلی خاں جو بنگال میں اورنگ زیب کا نائب حکومت مقرر ہوا ایک برہمن نو مسلمان تھا۔ اور اس کے ماتحت کاروبارِ حکومت مسلمان اور ہندو عہدہ داروں کے اشتراکِ عمل سے انجام پاتا تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں ہندوؤں کو نہ صرف بڑی بڑی جاگیریں ملیں بلکہ وہ گورنر، گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف تک کے عہدوں پر سرفراز ہوئے۔
یہ بات آج کل کے گمراہ کردہ ہندوستانیوں کو عجیب معلوم ہوگی کہ افغانستان کے خالص اسلامی صوبے میں ہندوؤں کے دشمن جان اورنگ زیب کا نائب السلطنت ایک ہندو راجپوت تھا۔

اورنگ زیب اور سیواجی کی کشمکش کا تذکرہ کرتے ہوئے سر پی سی رائے نے کہا کہ اس کشمکش کو بھی انہیں مصالح کی بنا پر مذہبی رنگ دے دیا گیا جن کی بنا پر اورنگ زیب اور دوسرے ہندوستانی حکمرانوں کو ناحق بدنام کیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب اور سیواجی

کی آویزش مذہبی نہیں بلکہ خالص سیاسی تھی۔ آج کل کی تاریخوں میں ہمیں گمراہ کرنے کے لئے سیواجی کو ہندو مذہب کا ایک دیوتا بنا دیا گیا ہے۔ جو لوگ سیواجی اور اورنگ زیب کی چپقلش کو مذہبی جنگ قرار دیتے ہیں کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ سیواجی کو بغاوت کی سزا دینے کے لئے اورنگ زیب نے اپنے ایک ہندو جرنیل یعنی مہاراجہ جے سنگھ کو مقرر کیا تھا اور مہاراجہ جے سنگھ نے کئی دفعہ اورنگ زیب سے دکن کے بعض مسلمان سرداروں کی شکایت کی تھی کہ وہ انہیں سیواجی کے خلاف مدد بہم نہیں پہنچاتے۔ سیواجی کی بغاوت کو مذہبی رنگ دینا بے انتہا نادانی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغل بادشاہوں نے اتحاد ہندو مسلم کو حدِ کمال تک پہنچا دیا تھا اور انگریزی حکومت کو مغلوں سے سبق لینا چاہیئے۔ تاریخ ہند کے اُس زریں عہد میں مُغلوں کا ہندو والسرائے افغانستان پر حکومت کرتا تھا اور اُن کا مسلمان والسرائے دکن کا حاکم تھا جہاں کی آبادی کا جزوِ اعظم ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ سچے سوراج کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

پروفیسر مننی کی نئی ایجاد

انسانی دماغ ہزارہا سال سے مذہبی روایات اور عوام کے افسانوں میں جن باتوں کے خواب دیکھتا رہا ہے رفتہ رفتہ مادی قالب میں ڈھل کر افسانے سے حقیقت کی صورت میں تبدیل ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے کی ایک جدید کڑی اٹلی کے ایک سائنس دان پروفیسر مننی کی نئی ایجاد ہے جس نے جادو کی ٹوپی اور الوپ انجن کے افسانوں کو حقیقت کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ ایک مشین ہے جو اپنے عمل سے آنکھوں آنکھوں میں حاضر کو غائب کر دیتی ہے۔

پروفیسر مننی حال ہی میں اپنے مکان پر "غیر مرئی دعوتیں" دیتے رہے ہیں۔ مہمانوں کا بیان ہے کہ اُن میں سے کوئی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

یہ عمل ایک کل کی مدد سے انجام دیا جاتا ہے جس کا چرچا آج کل تمام اٹلی میں ہو رہا ہے۔ ہر وہ چیز جو اس کل کی شعاعوں کی زد میں آتی ہے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پروفیسر مننی ایک سٹیج پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کو مجموعی یا حسب مراد انفرادی طور پر گم کر سکتے ہیں۔

ایکس ریز سے یہ شعاعیں اس بات میں مختلف ہیں کہ یہ آدمی کے گوشت کے ساتھ اس کی ہڈیوں کو بھی "نظر انداز" کر سکتی ہیں حالانکہ دوسری ٹھوس چیزیں مثلاً کرسیاں جن پر غیر مرئی آدمی بیٹھے ہوں مرئی ہی رہتی ہیں۔

اس کل کے موجد کا ارادہ اسے پیٹنٹ کرا کے اس کی فروخت کے لئے ایک کمپنی بنانے کا ہے۔

جو لوگ اس کل کے معمول بن چکے ہیں اُن کا بیان ہے کہ انہیں اس عمل کے دوران میں قطعاً کوئی احساس نہیں ہوا اور نہ

دو بارہ صورت پذیر ہونے پر کسی قسم کی تکلیف محسوس ہوئی۔

یوگوسلاویا کا کمسن بادشاہ

یوگوسلاویا کا بادشاہ پیٹر ثانی ابھی محض ایک لڑکا ہے اور اگرچہ بادشاہی کی پوری ذمہ داری ابھی اُس نے نہیں اُٹھائی لیکن وہ اپنی رعایا کے حالات سے بہت دلچسپی لیتا ہے۔ پیٹر کی روزانہ زندگی کے حالات پیرس کے ایک اخبار نے شائع کئے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔ اُس کی زندگی بہت باقاعدہ ہے۔ وہ ہر روز صبح سات بجے بیدار ہوتا ہے اور خُدا سے دُعا مانگ کر اپنے دن کا آغاز کرتا ہے۔ ناشتے کے بعد جس میں گھر کے دُوسرے لوگ بھی اس کے شریک ہوتے ہیں بادشاہ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ تھوڑی دُور تک سَیر کے لئے نکل جاتا ہے۔ اِس کے بعد ۹ بجے وہ اپنے مکتب کے کمرے میں پہنچتا ہے جہاں اُستاد اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ یہاں اسے چالیس چالیس منٹ تک چار مختلف سبق پڑھائے جاتے ہیں۔ بارہ بج کر پینتالیس منٹ پر بادشاہ دوپہر کا کھانا کھاتا ہے۔ اس کے بعد تین بجے تک آرام اور مطالعہ کا وقت ہے۔ تیسرے پہر کا باقی حصّہ جسمانی ورزشوں کے لئے وقف ہے۔ دوسرے کھیلوں اور تفریحات کے علاوہ اس وقت وہ گھوڑے کی سواری بھی کرتا ہے۔

ساڑھے چار بجے بادشاہ گھر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ چائے پیتا ہے۔ رات کا کھانا ساڑھے سات بجے کھایا جاتا ہے۔ اس وقت تک بادشاہ اپنے دن بھر کے کاموں سے فارغ ہو چکتا ہے اور شام کا باقی وقت وہ اپنی والدہ کے پاس گزارتا ہے۔ رات کے نو بجے بادشاہ سونے کے لئے اپنی خوابگاہ میں چلا جاتا ہے۔ پیٹر کو کھُلی فضا زیادہ پسند ہے۔ چنانچہ موسم کی خرابی کی صُورت کے سوا وہ اپنے سبق بھی مکتب کے کمرے کے بجائے عموماً باہر ہی لیتا ہے۔

گزشتہ سال بادشاہ نے اپنے بعض ہمجولیوں سے شکایت کی کہ والدہ مجھے بہت کم جیب خرچ دے رہی ہیں۔ ملکہ میری جو اسے جزرسی سکھانا چاہتی تھیں ہر ہفتہ اُسے صرف چند دینار دے رہی تھیں۔ چنانچہ ایک دن پیٹر ثانی نے اپنی والدہ سے کہا "اماں اس طرح گزارا مشکل ہے۔ مجھے ناکافی روپیہ ملتا ہے۔ بہتر ہے کہ میں کوئی کام سیکھوں۔"

ملکہ میری نے کہا "ہاں بیٹا یہ بہت اچھی بات ہے۔" چنانچہ محل کے ایک ملحقہ حصّہ میں بڑھئی کی دُکان کھول دی گئی اور ایک قابل بڑھئی بادشاہ کو کام سکھانے پر مامور ہؤا۔ بادشاہ نے جب اپنے نئے اُستاد کو دیکھا تو اُس نے کہا "جناب میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ایسی نفیس چیزیں بنانا سکھا دیں کہ وہ کاروبار کی اس کسادبازاری کے زمانے میں بھی آسانی سے اچھی قیمت پر بک سکیں۔ کیونکہ مجھے روپیہ درکار ہے۔"

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بادشاہ بڑھئی کی مدد سے جو چیزیں بناتا وہ بہت جلد مُنہ مانگی قیمت پر بِک جاتیں۔

پیٹر ثانی اب چودھویں سال میں قدم رکھا ہے۔ اور اس کی رعایا محبت اور عقیدت سے اس زمانے کا انتظار کر رہی ہے جب وہ

ملک کی قسمت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے گا۔

ہندوستان کا افلاس

سرہری سنگھ گوڑ نے ہندوستان کے افلاس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ "اس ملک کے لوگ پیدائش دولت کے مغربی طریقے اختیار نہیں کرتے اور ایک صدیوں کے فرسودہ صنعتی نظام کے پابند ہیں۔ سرہری سنگھ کو افسوس ہے کہ اہل ہند مشینوں سے کام نہیں لیتے حالانکہ ہاتھوں سے کام کرنے والے مشینوں کا مقابلہ کبھی نہیں کرسکتے۔ مشینیں کم وقت میں نسبتہً بہت زیادہ کام کرلیتی ہیں اور اس طرح چیزیں سستی بھی پڑتی ہیں۔ مشین اور دستکاری کی یہ دوڑ ایک دیو اور ایک ٹھنگنے کی دوڑ ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ ایک گدھا ایک عربی گھوڑے سے بازی لے جانے کی کوشش کررہا ہے۔ ہمیں یہ اُمید دل سے نکال دینی چاہئے کہ لوگ گھر کے بنے ہوئے کھردرے کپڑے کو مشین کے نرم و نفیس اور خوبصورت کپڑوں پر ترجیح دیں گے جب کہ مشین کے کپڑے مقابلتہً سستے بھی پڑتے ہیں۔

"گدھے اور عربی گھوڑے کا یہ مقابلہ جو ہمارے ملک میں ابھی تک جاری ہے ظاہر کرتا ہے کہ ہم نہایت کوتاہ اندیش ہیں۔ ہندوستان کے باشندوں نے آج سے تین ہزار سال پہلے سوچ بچار کا کام چھوڑ دیا تھا اور بدقسمتی سے آج کے دن تک اُنہوں نے دوبارہ یہ کام شروع ہی نہیں کیا۔"

سرہری سنگھ نے ہندوستان کے افلاس کی جو وجہ بتائی ہے وہ درست تو ہے لیکن اگر اُن کا روئے سخن ہندوستانی عوام کی طرف ہے تو اُن کا الزام درست نہیں۔ ہندوستان کے عوام کو مشینوں سے ہرگز نفرت نہیں ہے بلکہ غلامی اور محکومی نے انہیں اس قابل چھوڑا ہی نہیں کہ وہ کارخانے قائم کرسکیں۔ اگر آج ہندوستان کی تجارت کا سرکاری طور پر تحفظ ہوجائے اور ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی دولت سے کام لینے کا موقع دیا جائے تو دیکھتے دیکھتے ملک میں مشینوں اور کارخانوں کا ایک جال بچھ جائے۔ یہ درست نہیں کہ ہندوستانیوں نے تین ہزار سال پہلے سوچ بچار کو چھوڑ دیا تھا مشینوں کے دَور کو تو ابھی تین سو سال بھی نہیں گزرے۔ حقیقت یہ ہے کہ چند سو سال سے فرنگیوں کے غلبہ نے ایشیائیوں کو سوچ بچار سے کام لینے کے قابل چھوڑا ہی نہیں۔ جو لوگ چرخے اور کھادی کے حامی ہیں اُن کا منشا یہ ہے کہ جب ہم کارخانے قائم کرنے کے قابل نہیں رہے تو کم ازکم اپنی گھریلو صنعتوں سے تو فائدہ اُٹھائیں۔ ملائم کپڑوں کو چھوڑ کر کھردرا کپڑا پہننا واقعی بہت بڑا ایثار ہے! اور جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہ پاگل نہیں بلکہ مجبور ہیں اور اُن کی اولوالعزمی دستِ شل کو بھی بیکار رکھنے کی روادار نہیں۔ اگر آپ کارخانے قائم کرسکتے ہیں تو شوق سے کیجئے لیکن اس راستے میں جو مشکلات حائل ہیں اُن سے آنکھیں بند کرکے کارخانوں کے قیام کا انتظار کرنے لگنا اور اس جنون میں گھریلو صنعتوں کو تیاگ دینا ایسا ہی ہے جیسے "ایک گدھا" یا "ایک ٹھنگنا" اس وجہ سے چلنا پھرنا ترک کردے کہ یہ کام صرف "عربی گھوڑے" یا "ایک دیو" (یا موٹر کار) کو زیب دیتا ہے ۔

حامد علی

تخیلات

اُردو

وہ اُردو جس کو ہمیں اپنی مادری زبان کہنے کا فخر تھا اب مذہبی فیلنگ (یعنی اثر) کا رنگ اختیار کر کے ڈیڑھ سو برس بعد دیوناگری کی جون بدلنے لگی۔

آریاورت کا طوطی اب شکر سے گھبرا گیا ہے اور ہمیں بدقسمتی سے یہی زبان بولنی آتی ہے۔

جگن ناتھ پرشاد شوق نگم دہلوی (اپنے دیوان "آئینۂ شوق" مطبوعہ ۱۹۱۱ء کے دیباچہ میں)

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ ! سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔ داغ

نوائے نیم شبی

بیا کہ وصل ترا از خدائے می خواہم
بیا کہ گوش بر آواز و چشم بر راہم
ز مہر روئے تو با دیدہ ستارہ فشاں
نشستہ شب ہمہ شب در نظارۂ ماہم
خوش آنکہ من بہ فراغت نہادہ باشم دل
نوید دولتِ وصلت دہند ناگاہم
جامی

فغانِ زیر لبی

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب
مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب
چشمک چلی گئی تھی ستاروں کی صبح تک
کی آسماں نے دیدہ درائی تمام شب
تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے
دیتے رہے ہیں میر دکھائی تمام شب
میر

م ۔ ک ۔ ن ۔ ب

اُبھرا ہُوا وہ ماتھا ، وہ آنکھیں غزال سی — اور اُن پہ ابروؤں کی سجاوٹ ہلال سی
آیا ہُوا لبوں پہ تبسم ذرا ذرا — وہ توتلی زباں کا تکلم ذرا ذرا
بچپن کی شوخیاں وہ ادب سے رُکی ہوئیں — ہر وقت وہ کتاب پہ آنکھیں جھکی ہوئیں

تلوک چند محروم

تین شعر

حُسن سے بھی دل کو بے پروا کیا — کیا کیا اے عشق تُو نے کیا کیا — (جگر مراد آبادی)

آہ کے پردے میں رازِ افشا کیا — دردِ دل آخر یہ تُو نے کیا کیا — (حفیظ ہوشیارپوری)

بجلیاں بھر دیں نگاہِ یار میں — تُو نے آہِ آتشیں یہ کیا کیا — (فانی بدایونی)

طیورِ دام

حُسن سبزے بخطِ سبز مرا کرد اسیر — دام ہمرنگِ زمیں بود گرفتار شدم — (صائب)

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد — در انتظارِ ہُما دام چیدم بنگر — (غالب)

ہزار رخنہ بہ دام و مرا زِ سادہ دلی — تمام عُمر بہ اندیشۂ رہائی رفت — (عُرفی)

طائروں پر سحر ہے صیّاد کے اقبال کا — اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا — (اکبر)

بلاکشاں زگرامی خبر کہ می آرد — اجل گرفتہ بزنجیرِ بے کسی بنداست — (گرامی)

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم — نو گرفتار تڑپتا ہے تہِ دام ابھی — (اقبال)

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے — (غالب)

دُنیا اسیر ہے مرے دامِ خیال میں — اے بے خبر مقیدِ دُنیا نہیں ہوں میں — (عبدالباری آسی)

مطلب پرست دست نہ آئے فریب میں — بیٹھا رہا لئے ہوئے دامِ وفا کو میں — (حفیظ جالندھری)

مجھے دامِ وفا میں پھنسا کے رکھو، تہِ دامنِ لُطف چھپا کے رکھو

مرے عشق کی ہو نہ کسی کو خبر، مجھے دیکھ لے کوئی حسیں کہیں — (//)

راحل ہوشیارپوری

ٹین کا ثابت قدم سپاہی

ٹین کے پچیس سپاہی تھے۔ سب کے سب آپس میں بھائی بھائی تھے۔ کیونکہ وہ پرانے ٹین کے ایک ہی بڑے ٹکڑے سے کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ وہ اپنے اپنے کندھے پر ایک ایک بندوق لئے کھڑے تھے۔ وہ بالکل سامنے کی طرف نظریں گاڑے ہوئے تھے ان کی پوشاک نیلے اور سُرخ رنگ کی تھی۔ سب ایک ڈبے میں پڑے تھے۔ ڈبے کا ڈھکنا اُٹھا دیا گیا اور اُنھوں نے دُنیا میں سب سے پہلی جو آواز سُنی وہ ایک چھوٹے سے بچے کی تھی۔ وہ تالیاں بجا بجا کر کہہ رہا تھا "ٹین کے سپاہی! آہا آہا ٹین کے سپاہی!"

اُسے یہ تحفہ اس کی سالگرہ کی تقریب پر ابھی ابھی ملا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس نے تمام سپاہیوں کو میز پر کھڑا کر دیا۔ سب سے چھوٹے کے سوا باقی سب ایک دوسرے سے ہُو بہُو ملتے تھے۔ اُسے سب سے آخر میں جب ٹین بہت تھوڑا رہ گیا تھا تراشا گیا تھا۔ ٹین اتنا تھوڑا تھا کہ اُس کی صرف ایک ہی ٹانگ بن سکی لیکن وہ اپنی ایک ہی ٹانگ پر اُسی مضبوطی سے کھڑا تھا جس سے باقی سب دو دو ٹانگوں پر کھڑے تھے۔

جس میز پر یہ کھڑے کئے گئے تھے وہاں اَور بھی بہت سی خوبصورت چیزیں پڑی تھیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ چیز کاغذ کا ایک خوبصورت قلعہ تھا ـــــ ایسا کہ تم اس کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت کھڑکیوں سے خوب اچھی طرح اندر جھانک سکو۔ بڑے دروازے کے سامنے ایک چھوٹے سے گول آئینے کے اردگرد سرسبز درخت اُگے تھے۔ یہ آئینہ ایک شفاف جھیل معلوم ہوتا تھا اس جھیل پر موم کی چھوٹی چھوٹی بطخیں تیر رہی تھیں جن کا عکس پانی میں پڑ رہا تھا۔ یہ نظارہ بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ خوبصورت نظارہ اس حسینہ کا تھا جو کھلے دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ کاغذ سے تراشی گئی تھی۔ اس کا لباس سفید اور شفاف تھا۔ اس کے نرم و نازک کندھوں کے آر پار جاتے ہوئے نیلے فیتے کے دونوں سرے سینے پر آکر ختم ہوتے تھے جہاں یہ سرے ملتے تھے۔ وہاں گلاب کا ایک بھڑکیلا سا پھول نظر آتا تھا۔ اس نَو خیز حسینہ نے جو دراصل ایک رقاصہ تھی اپنے بازو آگے کی طرف پھیلا رکھے تھے، ایک ٹانگ پیچھے کی طرف اس قدر اُونچی اٹھا رکھی تھی کہ یہ ٹین کے سپاہی کو نظر نہ آتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ میری طرح اس کی بھی ایک ہی ٹانگ ہے۔

اس نے اپنے دل میں سوچا "میں اسی سے شادی کروں گا۔ لیکن یہ بڑی مغرور ہے۔ اَور قلعہ میں رہتی ہے۔ میرے پاس تو رہنے کے لئے صرف ایک ہی ڈبہ ہے اور اُسی میں ہم پچیس بھائی رہتے ہیں ـــــ سو یہ جگہ اس کے لئے

موزوں نہ ہو گی۔ میز پر ایک طاؤس دانی بھی پڑی تھی وہ ذرا اس کے پیچھے ہو لیا، یہاں سے وہ اس نوخیز حسینہ کو زیادہ اچھی طرح سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ وہیں ایک ٹانگ پر کھڑی تھی اس کا توازن بگڑتا ہی نہ تھا۔

رات آئی تو ٹین کے تمام دوسرے سپاہیوں کو بھی صندوق میں ڈال دیا گیا اور گھر کے لوگ سونے کے لئے اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ اب کھلونوں نے کھیلنا شروع کیا۔ بعض جنگ لڑنے کا کھیل کھیلنے لگے بعضوں نے ناچ شروع کر دیا۔ کوئی مہمان بن بیٹھا اور کوئی میزبان۔ ٹین کے سپاہی اس قدر مضطرب ہوئے کہ اُنھوں نے ڈبے میں زور زور سے کھڑکھڑاہٹ پیدا کرنی شروع کر دی کیونکہ وہ بھی کھیل میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ لیکن ان سے ڈھکنا نہیں اُٹھتا تھا۔ سروتا قلابازیاں لگانے لگا اور سلیٹ پنسل اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگی۔ سب نے مل کر اتنا شور مچایا کہ گانے والی چڑیاں بھی جو ایک پنجرے میں بند تھیں شاعرانہ باتیں کرنے لگیں۔ صرف دو ہستیاں ایسی تھیں جو اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھیں۔ ایک تو ٹین کا سپاہی دوسری رقاصہ۔ وہ اپنے بازو آگے کی طرف بڑھائے پاؤں کی اُنگلیوں کے آخری سروں پر ساکت کھڑی تھی۔ سپاہی بھی اپنی ایک ٹانگ پر نہایت ثابت قدمی سے کھڑا تھا مجال ہے جو ایک لمحے کے لئے بھی اس نے حسینہ کے چہرے سے نظریں پرے ہٹائی ہوں۔ گھڑی نے ٹن ٹن بارہ بجائے۔ "ٹک" کی آواز پیدا ہوئی اور طاؤس دانی کا ڈھکنا اڑ کر پرے جا گرا۔ لیکن اس ڈبیا میں ناس نہیں تھی بلکہ ایک بوڑھا بھتنا رہتا تھا ــــــ یہ بھی ایک کھلونا تھا۔ وہ کہنے لگا "او ٹین کے سپاہی جب تیرے سے تجھیں کوئی واسطہ نہ ہو اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مت دیکھیو"۔

ٹین کے سپاہی نے سنی ان سنی ایک کر دی۔

بھتنا بولا "اچھا میاں ذرا دن چڑھ لینے دو!"

دوسرے دن جب بچے اپنے اپنے بستر سے اُٹھے ٹین کے سپاہی کو کھڑکی میں کھڑا کر دیا گیا۔ اب چاہے تم سمجھو کہ یہ بھتنا تھا۔ چاہے سمجھو یہ ہوا کا جھونکا تھا، بہر حال کھڑکی کے پٹ ایک دم زور سے بند ہوئے اور ٹین کا سپاہی تیسری منزل سے سر کے بل نیچے جا گرا۔ اُف اس کے لئے یہ ایک خوفناک سفر تھا۔ اس نے اپنی ٹانگ ہوا میں خوب سیدھی کر لی اور اپنی فوجی ٹوپی اور سنگین کے اگلے سرے سمیت فرش کے دو پتھروں کے درمیان ایک شگاف میں دھنس گیا۔ اس کی ٹانگ اب سیدھی آسمان کی طرف تھی۔ نوکرانی اور چھوٹا لڑکا دونوں اسے اُٹھا لانے کے لئے نیچے اُترے، وہ اس کے بالکل قریب آ آ کر مڑ جاتے تھے لیکن ان کی نظر اس پر نہ پڑتی تھی۔ بعض وقت تو اتنے قریب آ جاتے تھے کہ ٹین کے سپاہی کو خطرہ محسوس ہونے لگتا کہ کہیں یہ مجھے کچل نہ جائیں۔ اگر ٹین کا سپاہی چلا کر کہہ سکتا کہ "میں یہاں ہوں" تو یقیناً وہ اسے پا لیتے لیکن اس نے مناسب نہ سمجھا کہ فوجی لباس پہن کر اس طرح چلایا جائے۔

تھوڑی دیر بعد بارش ہونے لگی۔ مینہ کے قطرے زیادہ موٹے ہوتے گئے اور جلد جلد گرنے لگے یہاں تک کہ خوب موسلا دھار بارش ہوئی۔ جب ختم ہوئی تو دو بازاری لونڈے دوڑتے دوڑتے ادھر آ نکلے۔ وہ چلا کر کہنے لگے "ارے! ارے ادھر دیکھنا! ارے

اُلو ٹین کا سپاہی! آؤ اسے باہر نکالیں اور کشتی میں بٹھا کر سیر کرائیں۔

اُنہوں نے اخبار کے کاغذ سے ایک کشتی بنائی اور ٹین کے سپاہی کو اس میں بٹھا کر نالی میں چھوڑ دیا۔ دونوں لڑکے بہتی ہوئی کشتی کے ساتھ ساتھ تالیاں بجاتے ہوئے دوڑنے لگے۔ "توبہ! نالی میں کتنی بڑی بڑی لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ بہاؤ کس قدر تیز ہے۔ شاید آگے جا کر پانی کسی نیچی جگہ آبشار بن کر گر رہا ہے"۔ اب کاغذ کی کشتی ہچکولے کھانے لگی، وہ بار بار تیزی سے گھومنے بھی لگتی جس سے ٹین کے سپاہی کا سر چکرانے لگا۔ بہر کیف وہ ثابت قدم رہا۔ اس نے کسی قسم کا اضطراب ظاہر نہ ہونے دیا بلکہ بندوق کندھے پر لئے ایک سیدھ میں سامنے دیکھتا رہا۔ یکایک کشتی اُچک کر ایک چھت والی نالی میں آگری "اُف یہاں تو اتنا اندھیرا ہے جتنا میرے ڈبے میں تھا"۔

اس نے دل میں سوچا "میں اب کہاں جا رہا ہوں۔ یہ سب اس بھتنے کی شرارت ہے۔ کاش اس سفر میں میری پیاری حسینہ بھی میرے ہمراہ ہوتی۔ چاہے اس سے دُگنا اندھیرا ہو جاتا میں پروا نہ کرتا۔

یکایک اس کے سامنے ایک بڑا سا پن چوہا جو اسی نالی میں رہتا تھا آموجود ہوا اور کہنے لگا "ذرا اپنا پاسپورٹ تو دکھاؤ! پاسپورٹ نہیں لائے!" ٹین کے سپاہی نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ اپنی بندوق کو پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھا۔

کشتی اُچھل کر تیزی سے آگے بڑھ گئی اور پن چوہا اس کے پیچھے پیچھے تیرنے لگا۔ اس نے غصّے سے خوب ہی دانت پیسے اور چھوٹے چھوٹے تنکوں اور لکڑی کے ٹکڑوں کو پکار پکار کر آوازیں دیں "پکڑو! پکڑو! جانے نہ پائے۔ اس نے ٹیکس ادا نہیں کیا! اس کے پاس کوئی پاسپورٹ نہیں!"

بہاؤ زیادہ تیز ہونے لگا۔ جہاں نالی ختم ہوتی تھی وہاں ٹین کے سپاہی کو دن کی روشنی نظر آنے لگی۔ لیکن اس وقت اسے ایک مسلسل گرج کی آواز سنائی دینے لگی۔ ایسی آواز جو بہادر سے بہادر آدمی کا دل بھی ہلا دے۔ یہ نالی ایک بڑی سی نہر میں جا گرتی تھی اور یہ بات اس کے لئے ایسی ہی ہیبت ناک تھی جیسی ہم میں سے کسی آدمی کے لئے یہ بات کہ وہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ کسی آبشار کی طرف کھنچتا چلا جا رہا ہو۔ اب وہ اس نہر کے اس قدر قریب آگیا کہ کشتی ٹھہرانے کا کوئی موقع ہی نہ رہا۔ وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آگے ہی آگے کھنچتی چلی جا رہی تھی۔ ادھر غریب ٹین کا سپاہی اپنی پوری قوت کے ساتھ جم کر کھڑا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے آنکھ تک جھپکی ہے۔ تین دفعہ ــــ چار دفعہ کشتی نے چکر کھائے، پانی سے لبالب بھر گئی اور اب اس کا ڈوب جانا یقینی ہو گیا ــــ جوں جوں کشتی ڈوبتی جاتی تھی اس کے جوڑ کھلتے جاتے تھے۔ آخر ایک ایسا وقت بھی آیا جبکہ پانی ٹین کے سپاہی کے سر سے گزر گیا۔ اسے اپنی شیریں ادا رقاصہ کے خیال آنے لگے جس سے اب وہ کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ اس کے کانوں میں یہ گیت گونجنے لگا:۔

"الوداع! الوداع! اے بہادر سپاہی!
موت اور شوکت کی سرزمین میں سفر کرتا چلا جا!"

کاغذ دو ٹکڑے ہو گیا اور سپاہی نیچے ہی نیچے جانے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اسے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ تو بہ مچھلی کے پیٹ میں کس قدر اندھیرا تھا۔ اتنا اندھیرا تو چھت والی نالی میں بھی نہیں تھا۔ جگہ تنگ بھی بہت تھی لیکن ٹین کا سپاہی ثابت قدم رہا اور کاندھے پر بندوق لئے خوب پاؤں پھیلا کر لیٹا رہا۔ مچھلی اُچھلنے کودنے لگی اور پھر اس نے بڑی بڑی ڈراؤنی حرکتیں شروع کر دیں۔ آخر کار اس کا اُچھلنا کودنا بند ہو گیا۔ روشنی کی ایک لکیر اس کا بدن چیرتی ہوئی اندر آئی اور وہاں روشنی ہی روشنی ہو گئی۔ کسی نے چلّا کر کہا "ٹین کا سپاہی"۔۔۔۔ مچھلی پکڑی گئی تھی اور مارکٹ میں پہنچ کر بک بھی چکی تھی۔ اور باورچن چولھے کے قریب بیٹھی ایک تیز چاقو سے اس کا پیٹ چاک کر رہی تھی۔ اس نے سپاہی کو کمر سے پکڑ لیا اور ملاقات کے کمرے میں لے گئی تاکہ ہر کوئی اس مشہور آدمی کو دیکھ سکے جس نے مچھلی کے پیٹ میں تمام دنیا کا سفر کیا تھا۔ لیکن ٹین کا سپاہی مغرور نہیں تھا۔ اُنہوں نے اسے میز پر کھڑا کر دیا۔

"ہیں؛ میں کہاں ہوں؛ یہ تو وہی کمرہ ہے جس میں میری حسینہ رہتی تھی۔ تو بہ دنیا میں کیسی عجیب عجیب باتیں ہوتی ہیں"۔۔۔۔ درحقیقت ٹین کا سپاہی اُسی کمرے میں تھا جس میں وہ پہلے رہ چکا تھا۔ وُہی بچّے تھے، وہی میز، وہی کھلونے، وہی خوشنما قطعہ اور وہی گلروپیاری حسینہ جو اب تک ایک ٹانگ پر کھڑی تھی اور دوسری ہوا میں اُٹھا رکھی تھی۔ وہ بھی بڑی ثابت قدم تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر ٹین کے سپاہی کے دِل پر بہت اثر ہؤا۔ وہ اس وقت ٹین کے آنسو رو دیتا لیکن اس وقت رونا مناسب ہی نہ تھا۔ اس نے حسینہ پر ایک نگاہ ڈالی پر وہ بالکل خاموش رہی۔

اس کے بعد ایک چھوٹے سے لڑکے نے ٹین کے سپاہی کو اُٹھا کر آگ میں ڈال دیا۔ گو اسے یوں آگ میں پھینکنے کی وجہ اس نے کوئی نہ بتائی۔ یہ ضرور اُس بھُتنے کی شرارت تھی جو ہلاس دانی میں رہتا تھا۔

ٹین کا سپاہی آگ میں کھڑا تھا۔ اس کا بدن گرمی سے جلا جا رہا تھا لیکن یہ گرمی آگ کی تھی یا محبّت کی؟۔۔۔ یہ بات کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ اب اپنا چمکیلا رنگ کھو چکا تھا۔ سفر کی وجہ سے یا غم کی وجہ سے۔۔۔ یہ بات کوئی بھی یقین سے نہیں بتا سکتا تھا۔ اس نے اپنی حسینہ پر نظریں گاڑ لیں اور حسینہ نے اس پر۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ پگھلا جا رہا ہے۔ جب بھی وہ کندھے پر بندوق لئے ثابت قدم رہا۔ یکایک دروازے کا پٹ زور سے کھُلا جیسے کوئی چیز پھٹتی ہے۔ حسینہ آندھی کے جھونکے کی لپٹ میں آ گئی اور ایک پری کی طرح اُڑتی ہوئی آگ میں ٹین کے سپاہی کے پاس جا پہنچی۔ آگ بھڑک اُٹھی اور ساتھ ہی وہ غائب ہو گئی۔ یہ دیکھ کر ٹین کا سپاہی بھی پگھل گیا۔

دوسری صبح جب خادمہ نے چولھے سے راکھ باہر نکالی اس نے دیکھا کہ ٹین کا سپاہی ایک دِل کی صورت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ رقاصہ کا بھی نام ونشان باقی نہ تھا، البتہ گلاب کا وہ چمکیلا پھول جو اس کے سینے پر لگا تھا اُس دِل کے قریب پڑا تھا گو اب وہ کوئلے کی طرح سیاہ ہو چکا تھا۔

(ہینز اینڈرسن) مہدی علی خاں

دعوتِ پرواز

تیرے بازو میں اگر کچھ بھی ہے قوت باقی!

تیرے دل میں ہے اگر کچھ بھی حرارت باقی!

گر ترے سر میں ابھی ذوقِ جنوں ہے کچھ بھی

گر ترے تن میں ابھی گرمیِ خوں ہے کچھ بھی

رُوح میں کچھ بھی اگر تاب و تواں باقی ہے

گر ترے سینے میں تھوڑی سی بھی جاں باقی ہے

اِک بھی پیمانہ اگر ہے ترے میخانے میں

ایک بھی قطرہ اگر ہے ترے پیمانے میں

کُچھ بھی باقی ہے اگر طاقتِ پروازِ خیال

گر نہیں ٹوٹ چکا شہپرِ شہبازِ خیال

آ مرے ساتھ، تجھے عرش پہ پہنچاؤنگا

ہوا ممکن تو پرے اس سے بھی لے جاؤنگا

آثر صہبائی

اقوال

اس بات کو یاد رکھو کہ خوش گوار زندگی بہت کم محنت سے حاصل ہوسکتی ہے۔ (مارکس اویلیس)

بہترین اُستاو زمانہ ہے۔ بہترین کتاب دُنیا ہے۔ بہترین دوست خدا ہے۔ (تلمود)

سُست آدمی ٹھیرے ہوئے پانی کے مانند ہے جو اپنے آپ کو خراب کرلیتا ہے۔ (رلے مینا)

میرا وطن دُنیا ہے۔ میرے ہم وطن انسان ہیں۔ (گیریسن)

لوگوں میں قوت کی کمی نہیں ہے بلکہ قوتِ ارادی کی کمی ہے۔ (وکٹر ہیوگو)

ضرورت ہمیں عقلمند بنا دیتی ہے۔ (ورڈز ورتھ)

انسان کی بہترین کامیابی اس کے ناکام ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ (بیچر)

غصّہ کرنا دوسروں کے قصور کا بدلہ اپنے سے لینا ہے۔ (پوپ)

دُنیا میں عقل کی کمی نہیں ہے۔ دُنیا میں خلوص کی کمی ہے۔ (گیٹے)

ہماری شوکت اِس میں نہیں ہے کہ کبھی نہ گریں بلکہ اس میں ہے کہ ہر دفعہ گرنے کے بعد اُٹھ بیٹھیں۔ (گولڈ اسمتھ)

سیّد عبدالحی

شہر اَور اُن کے باشندے

(آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کیا گیا)

یہ مضمون "ہمایوں" کے افسانہ نگار خاص پروفیسر سید فیاض محمود کی ادبی سرگرمیوں کی ایک نئی جولانگاہ کا انکشاف کرتا ہے۔ قارئینِ ہمایوں اُن کی افسانوی معجز بیانیوں سے بارہا آشنا ہو چکے ہیں۔ آج کا مضمون یہ ثابت کرے گا کہ فیاض محمود مزاحیہ نگاری میں بھی اپنے کسی ہم چشم سے پیچھے نہیں ہیں۔
"ھمایوں"

آپ حضرات نے کبھی نہ کبھی کوئی گاؤں تو دیکھا ہوگا اور غالباً کوئی شہر بھی۔ اس لئے یہ بتانا شاید ضروری نہیں کہ شہر سے میری مراد کیا شئے ہے۔ اور گاؤں اور شہر میں کیا فرق ہوتا ہے۔ البتہ اپنی پہچان کی خاطر یہ سمجھ لیجئے کہ شہر ایک ایسے خطۂ زمین کو کہتے ہیں جہاں بہت سے ناہموار اور پیچ در پیچ بازار، بہت سے تنگ و تاریک کوچے، بہت سی گندی اور گہری نالیاں، بہت سے ٹانگے اور بہت سے لوگ پائے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں لوگوں کے دِل بہلاوے کے لئے کوئی فراخ اور ہموار اور خوش نما سڑک بھی بچھا دی جاتی ہے۔ عام طور پر باشندوں کی کثرت ہی قصبہ کو شہر بنا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ شہروں کی سب سے بڑی خصوصیت، جو انجان سے انجان شخص کی نظر سے بھی نہیں چھپتی، یہ ہے کہ صبح سویرے تقریباً ہر شخص اپنے گھر سے کام ہو یا نہ ہو، کسی نہ کسی بہانے نکل پڑتا ہے۔ اور سارا دن اِدھر اُدھر خواہ دفتروں میں ہو خواہ بازاروں میں، گھوم گھام کے شام کے وقت اپنے گھر کی طرف روانہ ہونے کا ارادہ کرتا ہے۔ ایسے لوگ جو شام کے قریب گھر لوٹنے کا ارادہ کرتے ہیں، اکثر گھر پہنچ جاتے ہیں، اگر یہ امر کچھ ضروری نہیں۔ تفریح اور سیر کے لئے بہت سی جگہیں موجود ہوتی ہیں، چنانچہ وہاں اجتماع شروع ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ گردش شہر والوں کی قسمت میں ہوتی ہے، اِس لئے جو لوگ سارا دن کسی نہ کسی وجہ سے گھروں سے باہر نہیں نکلتے، مثلاً عورتیں، بچے اور بڈھے، وہ بھی اس وقت یکدم دروازے کھول باہر چلے آتے ہیں۔ ہر ہر سڑک پر آپ کو پانچ پانچ دس دس کی بے شمار ٹولیاں آتی جاتی، چہکتی چہکتی نظر آئیں گی۔ اگر آپ ان میں سے کسی سے پوچھیں گے کہ بھئی کہاں جا رہے ہو؟ تو کہیں گے "یہی باہر" یعنی گھروں سے باہر، یا شہر سے باہر! ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شہر والوں کو اپنے گھروں سے نفرت ہے۔

ہم نے اس معاملے میں بہت چھان بین کی ہے، بہت لوگوں سے پوچھا ہے مگر اس نفرت کی وجہ تو کوئی نہیں بتا سکا۔ غور کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ خواہ وجہ کیا ہی کچھ ہو، اس نفرت کی بدولت بہت سے کام نکلتے ہیں۔ مثلاً لوگ تجارت، صنعت و حرفت،

سرکاری دفتروں اور نجی کاروبار میں مصروف ہونے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس سے انہیں اور قوم کو بہت فائدہ ہوتا ہے شہروں کے اردگرد اور بعض دفعہ عین درمیان میں بہت سے کارخانے جاری کر لئے جاتے ہیں۔ جن میں قالین، کھانڈ، کپڑے اور دھواں پیدا ہوتا ہے۔ اِن کارخانوں میں لاتعداد آدمی کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ صبح منہ ہاتھ دھو کے، شاید کچھ کھا پی کے بھی، گھروں سے رخصت ہو آتے ہیں۔ دن بھر اپنے کپڑوں اور جسموں کو کالا کرتے رہتے ہیں اور پھر شام کے وقت شرمندہ و پریشان گھر واپس آتے دکھائی دیتے ہیں مگر ان میں سے بہتوں کے منہ سیاہ ہوتے ہیں۔ یہ سیاہی خواہ چہروں کی ہو، یا انگلیوں کی، خواہ کپڑوں کی، شہر والوں کو بہت پسند ہے۔ ان کے نزدیک ایسے حلیہ والے اشخاص کام کرنے والے مرد ہوتے ہیں۔ بیکار بیٹھنا انہیں اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ سُنا گیا ہے کہ جسے اور کوئی کام نہیں ہوتا وہ کسی مَثل کے مطابق، اپنے کپڑے ہی اُدھیڑ کے سِیتا رہتا ہے۔ یہ بات فقط شہروں میں ہی پائی جاتی ہے +

شہروں کی ماہیت سمجھنے کے لئے بہت سی چیزوں کو خیال میں رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً شہر کی جسمانی کیفیت یعنی مکانات دوکانیں اور عمارتیں۔ مگر سب سے پہلے یہ کہ ہر ذی عزت شہر کے لئے ایک سٹیشن کا ہونا لازمی ہے۔ خواہ سٹیشن شہر سے دُور ہو، یا نزدیک، مگر اس کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ شہر کی ابتدا ہوتی ہی سٹیشن سے ہے سٹیشن کے باہر ہر بڑے شہر میں آپ کو ٹانگے، موٹریں، سپاہی اور نان بائی نظر آئیں گے۔ ہر طرف ایک آدھ سڑک کہیں نہ کہیں جاتی دکھائی دے گی۔ چاروں جانب سے آپ کو ٹانگے والے آچمٹیں گے۔ ایک آپ کا بازو پکڑے گا تو دوسرا آپ کا کوٹ، کوئی آپ کا سُوٹ کیس کھینچے گا تو کوئی آپ کو پیچھے سے دھکیلے گا۔ یعنی یہ کہ آپ کو خواہ دو قدم پر ہی جانا ہو، خواہ پیسے بچانا مقصود ہوں، ٹانگا ضرور لینا ہوگا۔ جب آپ کا سامان ٹانگے میں رکھ لیا جائے گا تو دام چکنے کا وقت آئے گا۔ یہ مرحلہ آسانی سے طے نہ ہوگا۔ جب دام ٹانگے والے کی تسلّی بموجب طے ہو جائیں گے تو ٹانگا چلے گا۔ چُنگی کے پاس جا کے ٹانگے والا خود چُنگی کے منشی سے کہہ دے گا کہ اِن کے پاس گھی بھی ہے اور ایک ٹین کا ڈبّا اور بھی ہے۔ جب اس مصیبت سے آپ کا چھٹکارا ہوگا تو گھوڑے کو نیند آجائے گی۔ اگر اُونگھتا، ٹھوکریں کھاتا، گرتا پڑتا دس قدم چلے گا بھی تو اسے پیاس لگ جائے گی۔ پیاس کی پہچان کوچوان کو خُوب ہوتی ہے۔ آپ کو پُوچھے بغیر، کسی گلی سڑی جگہ، پیروں تک ٹانگے کو کھڑا کر رکھے گا۔ جب گھوڑا اِس چہ بچے کے سیاہ پانی کو ختم کر چکے گا تو ٹانگا پھر روانہ ہوگا۔ مگر صاف ظاہر ہوگا کہ اب گھوڑے کا پیٹ اُبھر گیا ہے، اِس سے اس کی رفتار اور بھی آہستہ ہو جائے گی۔

اگر آپ کو شہر میں جانا ہو، یعنی پرانی آبادی میں تو کسی نہ کسی دروازے سے آپ کو شہر میں داخل ہونا ہوگا۔ یہاں خُوب چہل پہل ہوتی ہے۔ دائیں بائیں جانب سے بچے اور کتّے آپ کے ٹانگے کے سامنے آ آ کے گھوڑے کے نیچے آجانے کی کوشش کرینگے ایک آدھ بائیسکل چلانے والے کی بھی یہی خواہش ہوگی کہ آپ کے ٹانگے تلے آجائے۔ اگر ٹانگے میں بیٹھے ہوئے آپ کا مُنہ پچھلی

طرف سے تو آپ کی شکل سے متاثر ہو کر دو ایک بچے تانگے کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیں گے۔ بظاہر وہ آپ سے پیسہ مانگیں گے مگر دراصل ان کا مطلب آپ کے بیوی بچوں کو دعائیں دینا ہوتا ہے۔ آپ غلطی سے انہیں گھوریں گے، ناراض ہوں گے، اِن سے مُنہ پھیر لیں گے، پانچ دس دفعہ معافی مانگیں گے مگر ان بچوں پر آپ کی باتوں کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ آپ چُپ ہو جائیں گے، مگر وہ آپ کو دُعائیں دیتے نہ تھکیں گے۔ حتّٰی کہ آپ ہار مان لیں گے اور ناچار دو ایک پیسوں کی رشوت دے کر ان کا منہ بند کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

دس پندرہ موڑ گھومنے کے بعد تانگا کھڑا ہو جائے گا۔ یہ آپ کی گلی کا دہانہ ہے۔ آپ اُتریں گے، سامان تانگے سے خود اُتاریں گے عام طور پر تانگے والا اُس وقت گھوڑے کا سازوسامان درست کرنے میں مشغول نظر آئے گا۔ یہاں سے اندر آپ کو غالباً کسی دُور دراز مقام پر جانا ہے۔ پانچ دس منٹ کے بعد شاید کوئی مزدور آپ کو مِل جائے کیونکہ شہروں میں مزدور فقط اس جگہ موجود ہوں گے جہاں آپ کو اُن کی ضرورت نہ ہوگی۔ آخر گلی در گلی اور کوچہ در کوچہ گزرنے کے بعد آپ اس مکان پہ جا پہنچیں گے جہاں آپ کو اُترنا ہے۔ یہاں گلی کی چوڑائی دو فٹ ہوگی اور عین درمیان میں نالی ہوگی، جس پر رنگا رنگ کے بچے رفع حاجات کرنے میں مشغول ہوں گے۔ آس پاس اپنے اپنے دروازوں کی دہلیز پر بیٹھی ان کی مائیں اُونچی اُونچی آواز سے، ہاتھ پھیلا پھیلا کے، مُنہ بنا بنا کے ایک دوسری سے تُو تُو مَیں مَیں کرنے میں مصروف ہوں گی، نالی سے جو جگہ بچی ہوگی اس میں بہت سے پانی کے نل بچھے ہوں گے۔ جس مکان پر آپ کو جانا ہے اس کی سیڑھیاں اِس قدر اندھیری ہوں گی کہ ایک آدھ دفعہ آپ ضرور ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچیں گے۔ یعنی اگر آپ کی قسمت اچھی ہوئی تو ان مکانوں کی نچلی منزلوں میں کوئی نہیں رہتا ہوگا۔ اُوپر کی منزلوں میں چھتیں نیچے کو جھکی ہوں گی اور لکڑی کے ستون جن کے سہارے وہ قائم ہوں گی، وہ خود آڑے ترچھے انداز میں کھڑے یا یہ سمجھئے کہ جھکے ہوئے ہوں گے۔ شہروں کی بیشتر آبادی ایسے مکانوں میں ہی رہتی ہے۔ اُوپر سے روشنی آتی ہے اور اندر پچھلے کمروں سے سرد، پُرانی اور محفوظ کی ہوئی ہوا۔

اندرونِ شہر کا دلچسپ حال تو آپ نے سُن لیا۔ اب شہر کے باہر کا حال سنئے، ہر بڑے شہر میں ایک خاص سڑک ہوگی جسے انگریزی میں "مال" کہتے ہیں مگر عُرفِ عام میں "ٹھنڈی سڑک"۔ ٹھنڈی سڑک اس کا نام اِس لئے رکھ دیا جاتا ہے کہ گرمیوں میں شاید لُگ کی وجہ سے جو اس پر بہت اچھی طرح سے بچھی ہوتی ہے، یہ سڑک خوب تپتی ہے اور یہاں سے گزرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ یہ نام اوّل اوّل مذاق کے طور پر رکھا گیا تھا۔ مگر چونکہ مذاق بہت سلجھا ہوا تھا، اس لئے لوگوں نے بہت پسند کیا اور ایسی سڑکوں کا نام پیار سے "ٹھنڈی سڑک" رکھنے لگے۔ شہر کے بیرونی حصّوں میں کچہریاں، سرکاری دفتر، اُونچی اُونچی عمارتیں اور دو چار درخت آپ کو ملیں گے۔ دیواروں پر سینما کے رنگا رنگ

کے اشتہارات ہوں گے اور ہر جگہ صابون تیل اور قسم قسم کی دوائیوں کے اعلانات موٹے موٹے حروف میں لکھے نظر آئیں گے۔

یہاں کی سڑکیں آپ کی توجہ اپنی طرف ضرور کھینچیں گی۔ شاید آپ کا خیال ہوگا کہ شہر کی سڑکیں آمد و رفت کی سہولت اور گاڑیوں، سائیکلوں، یا موٹروں میں بیٹھنے والوں کے آرام کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ مگر معاف فرمائیے، یہ خیالات اب پرانے ہو چکے ہیں۔ آج کل کی سڑکوں میں آپ کو گڑھے، کیچڑ، پانی اور غلاظت پڑی ہوئی نظر آئے گی۔ اس سے آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ ہماری میونسپل کمیٹیاں اپنے فرائض پوری طرح ادا نہیں کرتیں، سڑکوں کو اس حالت میں چھوڑ دینے کے کئی ایک راز ہیں جو ہر شخص کو نہیں بتائے جاتے۔ مگر چونکہ ہمیں آپ کی خاطر بہت منظور ہے۔ ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں۔ سڑکوں میں گڑھے اس لئے رکھے جاتے ہیں کہ خواہ آپ ٹانگے میں بیٹھے ہوں، خواہ موٹر میں، آپ کو ہچکولے آتے رہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل کے لوگ بہت سست ہوتے جا رہے ہیں۔ سنا ہے کہ بعض لوگ تو ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتے۔ پیدل چلنا وہ گناہ سمجھتے ہیں۔ ورزش کے وہ پاس نہیں پھٹکتے۔ ان گڑھوں کی بدولت اُن کے تمام اعضاء کی ورزش ہو جاتی ہے۔ کہیں جسم کے بیٹھنا پڑتا ہے کہیں انہیں بائیں کوئی چیز پکڑنی پڑتی ہے۔ کبھی سیدھا، کبھی اُلٹا، کبھی اس طور پر، کبھی اس طور پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ آدمی ہوشیار رہتا ہے۔ پاس بیٹھنے والوں سے گفتگو کرنے کا موضوع مفت مل جاتا ہے۔ لیجئے کتنے فائدے ہوئے؛ جسمانی، دماغی اور اخلاقی! پھر لوگ کہتے ہیں کہ عام شہروں کی سڑکیں ٹوٹی ہوئی، گندی اور خطرناک ہوتی ہیں! — یہ تعصب نہیں تو اور کیا ہے!

رہی کیچڑ سو اس کے بارے میں شاید زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سب لوگ کیچڑ کے فائدوں سے واقف ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ اوّل تو آدمی سنبھل کے چلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا دھیان اپنے پاؤں کی طرف رہتا ہے، اس لئے اس میں رعونت نہیں پیدا ہوتی۔ تیسرے، کیچڑ کی وجہ سے لوگ ٹانگے کرایہ پر زیادہ لیتے ہیں اور ٹانگے والوں کے کچھ دن اچھے گزر جاتے ہیں۔ ملک کی غربت کم ہو جاتی ہے، پھر یہ کہ بچے وچے باہر کم نکلتے ہیں۔ فضول خرچی نہیں کرتے، والدین کی نظروں میں رہتے ہیں اور ماں باپ اور بڑے بوڑھوں کی شفقت کی وجہ سے ان کے دل و دماغ کی پرورش ہوتی ہے۔ یہ سب فائدے فقط کیچڑ کی بدولت ہمیں حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے اُمید کی جاتی ہے کہ آئندہ آپ شہروں کی اس خصوصیت کو بُرا نہیں خیال کریں گے۔

شہروں کی اور نمایاں بات۔ یہاں کے تہوار اور میلے ہوتے ہیں یعنی دسہرہ، دیوالی، عید، محرم، شب برات اور ہولی — شاید کسی دشمن نے یہ بات مشہور کر رکھی ہے کہ میلوں پر بہت سے لوگ روپیہ بیکار خرچ کر دیتے ہیں اور دکاندار اپنی دکانوں کو بنا سجا کے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اس طرح اپنا اشتہار دیتے ہیں۔ سچائی کی خاطر ہمیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس غلط فہمی کو دور کر دیا جائے۔ مثلاً دیوالی کے موقع پر ہر مناسب اور نامناسب جگہ روشنی کی جاتی ہے۔ بجلی کے چکر اور فوارے، بھارت ماتا کے مجسّمے اور ایسی ایسی اور بہت سی دلکش چیزیں دیکھنے والوں کے دلوں کو لبھاتی ہیں۔ مگر جو لوگ بجلی پر روپیہ خرچ کرتے ہیں وہ کوئی اپنے ذاتی نفع کی

خاطر تو نہیں کرتے۔ اس سے بھلا ان کا اپنا کیا فائدہ ہوگا۔ وہ تو سب فقط اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس چراغاں کو دیکھ کے آپ کا دِل خوش ہو۔ آپ کی تھکن دُور ہو، آپ اس روشنی میں جس تماشائی کو چاہیں دِل کھول کے دیکھ سکیں، بھیڑ بھاڑ ہو، دھکم دھکے میں شریک ہو کر اور لوگوں کے پاؤں کچل کے آپ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔ مگر یہ تو آپ سے کوئی نہیں کہتا کہ دوسرے دن ہی آپ کو چیزیں خریدنے کا شوق چرائے اور آپ سیدھے اسی دوکان پہ چلے آئیں جو رات کو اس سج دھج سے دُلہن بنی آپ کے دل کو گدگدا رہی تھی۔ باقی رہی ہولی تو اس پر کسی کا کچھ خرچ نہیں آتا۔ سُرخ رنگ بہت سستا ہے اور اگر رنگ نہ ہو تو راکھ اور مٹی سے ہی کام چل سکتا ہے۔ اگر لوگوں کی خوشی ہی اس بات میں ہے کہ مُنہ پہ بھبوت مل لیا جائے، یا مل لینے دیا جائے اور بالوں میں چھان چھان کے مٹی ڈالی جائے تو آپ کا کیا حرج ہے۔ اور اگر آپ کی شیروانی یا سُوٹ یا ساڑھی پہ کسی نے اپنی پچکاری سے بیل بُوٹے ڈال بھی دیئے تو کیا ہُوا، کسی کی خوشی ہو گئی، آپ کا کیا بگڑا!؛

پھر شب برات کو لیجئے! اس موقع پر آتش بازی کا بازار گرم ہوتا ہے کہیں انار چھوٹتے ہیں اور کہیں پٹاخے، کہیں مہتابی کا زور ہے تو کہیں پھلجھڑیاں پھول گرا رہی ہوتی ہیں۔ ایسے دلنواز نظاروں سے کسی کو کیا شکایت ہو سکتی ہے اور اگر کسی بھولے بھالے بچے نے آپ کے راہ جاتے کوئی چھچھوندر چھوڑ بھی دی تو کوئی ناراضی کی بات نہیں، آخر بچے بچے ہوتے ہیں، بڑے ہونگے تو سمجھ آ جائے گی۔

یہ بہتان بھی شہریوں کے سر لگایا جاتا ہے کہ ان کی غذا سادہ نہیں ہوتی اور یہ کہ شہروں کی آب و ہوا خراب ہوتی ہے۔ ان دو مسئلوں کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ کہنا لازم آتا ہے۔ غذا کے متعلق معلوم نہیں کیوں لوگوں کے دلوں میں ایسے شبہات پیدا ہو جاتے ہیں؛ مثلاً دُودھ کو لیجئے۔ دودھ سے بہتر چیز دُنیا میں کوئی نہ ہوگی۔ شہروں کا دُودھ یعنی وہ دُودھ جو شہروں میں بکتا ہے، دیہات کے دودھ سے کئی درجے اچھا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اُس میں چکناہٹ نہیں ہوتی، وہ گاڑھا نہیں ہوتا، جلدی ہضم ہو جاتا ہے، اُسے کاڑھنے پر بالائی جیسی موٹی چیز اس کے نزدیک نہیں آتی، اِس کا رنگ دیہات کے دودھ سے بہت زیادہ دلفریب ہوتا ہے، یعنی اس کی سفیدی میں جو نیلے رنگ کی جھلک ہوتی ہے وہ بہت لطف دکھاتی ہے، پھر سب سے زیادہ یہ کہ اِس میں پانی ملانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ آپ کو اس کے علاوہ اَور کیا چاہیئے؛

باقی سب سے زیادہ جو چیز شہروں میں کھائی جاتی ہے وہ ہوا ہے اور وہ بھی تازہ! آپ بتایئے ہوا سے پاکیزہ اور کیا چیز ہوگی! یہاں کے لوگ صبح و شام آپ کو سڑکوں پر تازہ ہوا کھاتے دکھائی دینگے۔ شام کے وقت ان کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ شام کی ہوا مقدار میں اور وزن میں ہوتی بھی زیادہ ہے، اور لوگ سارے دِن کے بھُوکے بھی ہوتے ہیں۔ اگر بقولِ دشمناں تمام دن کی گرد، موٹروں کا دھواں، پٹرول کی خوشبو اور گندے نالوں کی سڑاند اس میں مِلی ہوتی ہے۔ مگر اِن سب اجزاء کی نسبت، باقی ہوا کے حصّوں سے بہت کم ہوتی ہے، اس لئے ہمیں اُن کی طرف زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیئے اور نہ کوئی صحیح دماغ والا شخص اس سے انکار ہی کر سکتا ہے کہ شہری لوگ ہوا خوری کے بہت قائل ہیں اور اپنے قول پہ عمل بھی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ شہریوں کی غذا اچھی نہیں ہوتی، ان پر ظلم کرنا ہے + شہری زندگی کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر ہم زیادہ تعریف کے قائل نہیں، اِس لئے اس مختصر سے کلام پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے +

سید فیاض محمود

دَولتِ سرمد

سرمدؒ

آنکس کہ ترا کارِ جہانبانی داد
ما را ہمہ اسبابِ پریشانی داد
پوشاند لباس ہر کرا عیبے دید
بے عیباں را لباسِ عریانی داد

سرمدؒ

از منصبِ عشق سرفرازم کردند
وز منتِ خلق بے نیازم کردند
چوں شمع دریں بزم گدازم کردند
از سوختگی محرمِ رازم کردند

ترجمہ

جس نے دی تجھ کو سرداری
کیا اُسی نے مجھے بھکاری
عیب چھپانے کو ہے کپڑا
بے عیبوں پر دُھجّی بھاری

ترجمہ

پریم کا دھن ایشور سے پایا
گری نظر سے جگ کی مایا
جلے سبھا میں جیسے دیپک
پریت کی آگ نے بھید بتایا

لہ مثل مشہور ہے "ہر فرعونے را موسےٰ"۔ شہنشاہ اورنگ زیب کو مذہبی اُستواری کے اعتبار سے اگر فرعون (مگر یہ لفظ صرف محاورۃً مستعمل ہوا) مانا جائے تو میاں سرمدؒ اُن کے لئے موسےٰ تھے۔ وہ رندی و سرمستی کی فرعونیت کو دیکھتے ہوئے سرمدؒ کے لئے شاہ عالمگیر موسےٰ تھے۔" یقیں پنا اپنا سمجھ اپنی اپنی "دُنیا کی تاریخ میں اس قسم کا اجتماعِ اضداد معمولاً پایا گیا ہے + کہتے ہیں کہ یہ رُباعی سرمد شاہ رحمہ نے عالمگیر کے اس سوال پر کہ تم بخلافِ حکمِ شریعت ستر پوشی کیوں نہیں کرتے لکھی تھی۔ جواب اگر معقول نہیں تو کم از کم دلچسپ ضرور ہے کیونکہ اس میں سچے فقیر اور حقیقی بادشاہ کا فرق نیز شریعت کی پابندی اور رندی کا فرق بدرجۂ اتم نمایاں ہے۔ دُوسری رُباعی مزید تشریح ہے۔ مقبول

سرمدؒ

یاراں چو فرس در رہِ دو رنگی دارند

مصحف[1] بہ بغل و دینِ فرنگی دارند

پیوستہ ہمہ چو مہرہ ہائے شطرنج[2]

در دل ہمہ فکرِ خانہ جنگی دارند

ترجمہ

چلتے ہیں سب راہ دو رنگی

بغل میں پوتھی[1] دِین فرنگی

چوسرگیاں[2] میں جیسے مُہرے

وَیسے ہی اِن میں خانہ جنگی

سرمدؒ

نے سرو قدے کہ زو وفا باید یافت

نے سیمبرے کہ زر ازو باید یافت

آں یار گزیں کہ ہر چہ خواہی باید

یارے کہ بکارِ تو بیاید یافت

ترجمہ

سُندر مکھڑے کی کیا یاری

چَندر بَدن کو چاندی پیاری

یار وُہی جو آڑے آئے

بِگڑے بھاؤ کا ہو بیوپاری

مقبول احمد پوری

[1] کتاب [2] چوسرگیان یعنی شطرنج۔

پنجاب کی زبان

مسٹر سوم ناتھ چب بی۔اے (کنٹب) لکچرار انگریزی دیال سنگھ کالج لاہور نے "ہندوستان میں زبان، یونیورسٹیاں اور قومیت" (*Language, Universities and Nationalism in India*) کے نام سے ایک مختصر سی کتاب لکھی ہے جو ۱۹۳۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ ہماری درخواست پر انہوں نے اس کتاب کا کچھ حصہ جو پنجاب کی زبان سے متعلق ہے، اُردو میں ترجمہ کرکے "انجمن اُردو پنجاب" کی طرف سے ۳۰ مارچ کی شام کو لاہور کی نشرگاہ سے براڈکاسٹ کیا۔ قارئین "ہمایوں" کی دلچسپی کے لئے یہ تقریر ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم مصنف کے خیالات سے پوری طرح اتفاق کریں مثلاً آپ کی یہ تجویز کہ "ہندوستانی" کو رومن رسم الخط میں لکھا جایا کرے، بیشتر حضرات کو قابلِ قبول نہیں ہوگی۔

(حفیظ ہوشیارپوری (ایم اے) اسسٹنٹ سکرٹری انجمن اُردو پنجاب)

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی رہنما اور ماہرینِ تعلیم اپنے وطن کے لئے ایک مُشترکہ قومی زبان کے امکانات پر لمبی لمبی بحثیں چھیڑ دیتے ہیں، جن سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانی، ہندی، اور اُردو کے اصلی مفہوم کو نہیں سمجھتے۔ حالانکہ یہ بات نہایت ضروری ہے کہ سب سے پہلے اِن تینوں لفظوں کے معانی کو اچھی طرح ذہن نشین کیا جائے۔ جو لوگ ہندوستانی کو قومی زبان بنانے کے حق میں ہیں اُن کے نزدیک عام طور پر ہندوستانی، ہندی اور اُردو ہم معنی الفاظ ہیں۔

ہندوستانی دیسی زبان کی حیثیت سے "مغربی ہندی" کی ایک شاخ ہے جو گنگا کے دوآبہ کے بالائی حصے، روہیلکھنڈ، اور پنجاب میں ضلع انبالہ کے مشرقی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ اس کی گرامر مغربی ہندی کی ہے مگر اُس کے الفاظ پنجابی سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی سے میری مُراد وُہ زبان ہے جو شمالی ہندوستان کی ادبی زبان اور تقریباً تمام ملک کی مُشترکہ زبان تصوّر کی جاتی ہے۔ یہ فارسی اور ناگری دونوں خطوں میں لکھی جا سکتی ہے۔ اور اس میں فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کثرت سے استعمال نہیں کئے جاتے۔ اِس لئے اُردو کا نام ہندوستانی کی صرف اُس خاص قسم کے لئے مخصوص کیا جا سکتا ہے جس میں فارسی کے الفاظ زیادہ ہوں اور جو فارسی خط ہی میں آسانی سے لکھی جا سکتی ہو، اسی طرح ہندی اُس ہندوستانی کو کہہ سکتے ہیں جس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہوں اور جس کے لئے صرف ناگری خط ہی موزوں ہو۔ میرے خیال میں اس تعریف کو قبول کرنے میں اُن لوگوں کو بھی کوئی عذر نہیں ہوگا جو اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ہندوستانی، ہندی اور اُردو ایک ہی

زبان کے مختلف نام ہیں۔

اُردو میں فارسی، اور ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کے استعمال پر اعتراض کرنا اسی طرح تکلف کی دلیل ہے جس طرح انگریزی میں اُن لفظوں سے احتراز کرنا جن کی اصل لاطینی ہے۔ اس سلسلے میں یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ "کیا اس وقت ہندوستان میں کوئی زبان ہندی یا اُردو رائج ہے جس میں سنسکرت یا فارسی کے لفظ کثرت سے استعمال نہیں ہوتے؟" اگر ایسی زبان مُلک کے کسی حصے کی "ادبی زبان" ہے تو یقیناً ہندوستانی بھی رائج ہے۔ اور اس کا یہ دعویٰ کہ یہ شمالی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے قابلِ غور ہے۔

جب ورڈز ورتھ نے کہا تھا کہ شعر کی زبان ایسی ہونی چاہیے جو بیرونی اثرات سے آزاد ہو تو کولرج نے جواب دیا تھا کہ اگر عام لوگوں کی زبان کو باہر کے تمام اثرات سے محروم کردیا گیا تو وہ عام لوگوں کی زبان ہی نہیں رہے گی بلکہ متمدن اور شائستہ سوسائٹی کی زبان بن جائے گی۔ اسی طرح اگر اُردو اور ہندی میں سے فارسی اور سنسکرت کے الفاظ خارج کر دیئے گئے تو یہ وہ زبانیں نہیں رہیں گی جو اُردو اور ہندی کے رسالوں، اخباروں اور کتابوں میں پڑھی جاتی ہیں۔

۱۹۱۶ء میں ہندوستان کے بہت سے لیڈر کلکتہ میں اکٹھے ہوئے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو اُس وقت سے لے کر آج تک مُلک کے سیاسی انقلابات کے مشیر ثابت ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ایک کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستانیوں کو ہندوستانی اپنی قومی زبان کے طور پر اختیار کرلینی چاہیے۔ گاندھی جی، تلک آنجہانی، مسز سروجنی نیڈو، پنڈت مدن موہن مالوی، مولانا محمد علی مرحوم، اور مولانا ابوالکلام آزاد نے متفقہ طور پر اس قرارداد کی حمایت کی تھی ان میں سے بہت سے حضرات نے ہندوستانی کو فروغ دینے کی کوشش بھی کی ہے۔ لیکن گزشتہ بیس سال کے عرصے میں لوگوں کا خیال اس طرف بہت رہا ہے کہ اُردو میں فارسی اور ہندی میں سنسکرت کے زیادہ سے زیادہ الفاظ استعمال کئے جائیں۔ بعض دفعہ تو اُردو میں فارسی الفاظ اور محاورات کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ فقرے میں فعل کے سوا ہر لفظ بدیسی نظر آتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس بات پر ان لفظوں میں اظہارِ افسوس کیا ہے۔ "ایک اَور خطرہ یہ ہے کہ اُردو روز بروز فارسی اور ہندی روز بروز سنسکرت بنتی چلی جارہی ہے۔ اور ان دونوں دیسی زبانوں میں جو خلیج حائل ہے اُس کا پاٹ ہر سال بڑھ رہا ہے"۔ اُردو اور ہندی مِل جُل کر ایک ہو جانے کی بجائے، ایک دوسری سے زیادہ دُور جارہی ہیں۔ اور ہمارے لیڈروں کی پیش گوئی غلط ثابت ہورہی ہے۔

ہندی اپنی موجودہ شکل میں زمانۂ حال کی پیداوار ہے اور اس کا آغاز گذشتہ صدی میں شروع ہوا۔ اس سے پہلے اُردو نہ جاننے والے ہندو برج بھاشا، ہندوستانی اور بندیلی وغیرہ میں لکھتے تھے۔ ہندی ایک ادبی زبان کی حیثیت سے مغربی اور مشرقی ہندی کی مختلف شاخوں سے نکلی ہے، اور یہ صُوبجاتِ متحدہ، راجپوتانہ اور صُوبجاتِ متوسط کے ہندوؤں کے لئے کم و بیش ایک مشترکہ زبان کا کام دیتی ہے۔ اُردو اور ہندی کو شمالی ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے ساتھ وابستہ کر کے انھیں فرقہ وارانہ فسادات کا آلۂ کار

بنایا جارہا ہے مسلمان اور ہندو ایک دوسرے سے دُور جا پڑے ہیں۔ اُردو فارسی خط اور ہندی ناگری خط میں لکھی جاتی ہے، اور دونوں خطوں کے حامیوں کی بحث کو ختم کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ہندو مُسلم سوال کا حل تلاش کرنا کیونکہ دونوں کی وجہ ایک ہی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان دونوں مسئلوں کے حل کرنے میں ابھی کافی مدت تک ہندوستانی رہنماؤں کو ناکامی اور مائوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

جو لوگ ہندی، اُردو اور ہندوستانی کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں وہ دو باتوں کا خیال نہیں رکھتے۔ اول یہ کہ ہندوستان بھر کے پڑھے لکھے مسلمانوں میں ایک فی صدی بھی ہندی لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ دُوسرے یہ کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صُوبے، کشمیر، بلوچستان اور سندھ کے مسلمان گفتگو کے وقت ہندی کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اور ان صُوبوں کے ہندو بھی عام طور پر فارسی خط ہی استعمال کرتے ہیں۔ چند مثالوں سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی :-

(۱) ہندوستان کی تین مشہور فلموں "پُورن بھگت"۔ "راج رانی میرا" اور "چنڈی داس" میں ایکٹروں کی گفتگو نہایت ہی سادہ اور آسان ہندی زبان میں تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام صُوبوں میں ان فلموں کو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود پنجاب اور صوبۂ سرحد کے مُسلمانوں کو یہ فلمیں دیکھ کر بہت مائوسی ہوئی کیونکہ ان میں ایسی زبان بولی جاتی تھی جسے وہ اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے تھے۔

(۲) دیال سنگھ کالج لاہور میں جہاں ہر قوم اور مذہب کے ایک ہزار سے زیادہ طالب علم تعلیم پاتے ہیں ایک تجربہ کیا گیا تھا اس کا نتیجہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہُوں :-

(ا) اکسٹھ طالب علموں کی ایک جماعت کو جس میں اڑتیس ہندو۔ چودہ سکھ اور نو مسلمان تھے، شمالی ہندوستان کے بہترین ہندی رسالے "سرسوتی" میں سے ایک پیرا لکھنے کے لئے دیا گیا۔ اس بات کا اختیار تھا کہ خواہ یہ پیرا اُردو میں لکھا جائے خواہ ہندی میں۔ نو کے نو مسلمانوں، چودہ میں سے بارہ سکھوں اور اڑتیس میں سے بائیس ہندوؤں نے جواب دیا کہ وہ پیرے کا مطلب بالکل نہیں سمجھ سکے۔

(ب) اسی جماعت کو لاہور کے مشہور اُردو رسالے "ہمایوں" میں سے ایک پیرا دیا گیا۔ پندرہ ہندوؤں اور چھ سکھوں نے جواب دیا کہ یہ اُن کی سمجھ سے باہر ہے۔ باقی طالب علموں نے کوئی شکایت نہ کی۔

اس تجربے سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ گذشتہ سالوں میں دیسی زبانوں سے ناواقفیت کی وجہ سے ہم میں بظاہر پڑھے لکھے لوگوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو در اصل کسی زبان میں بھی مہارت نہیں رکھتا۔ یہ لوگ اپنی زبان کو بھی کھو بیٹھے ہیں اور اس کے ساتھ بدیسی زبان میں بھی بالکل کورے ہیں۔

پنجاب میں میٹریکولیشن کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ لیکن تاریخ اور جغرافیہ کے امتحان میں اس بات کی اجازت ہوتی ہے کہ سوالوں کے جوابات انگریزی، اُردو، ہندی اور پنجابی میں سے کسی ایک زبان میں لکھے جائیں۔ ۱۹۳۱ء میں تاریخ اور جغرافیہ کا امتحان دینے والوں کی تعداد ۱۹۸۴۴ تھی جن میں سے ۱۷۸۳۲ طلبہ نے اُردو میں جوابات لکھے۔ ۱۹۳۲ء میں بھی تقریباً یہی ہوا۔ یعنی ۱۹۷۱۰ امتحان دینے والوں میں سے ۱۷۵۹۵ لڑکوں نے پرچے اُردو میں کئے۔ اسی صوبے میں ۱۹۳۲ء میں ایف۔ اے اور بی۔ اے کے طلبہ میں سے ۸۲ فی صدی نے اختیاری مضمون کے طور پر اُردو کا امتحان دیا۔

اخبارات کی اشاعت سے اس بات کا اندازہ صحیح طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ پنجاب کی زبان اُردو ہے یا ہندی؛ پنجاب سے اس وقت اُردو کے آٹھ مشہور روزانہ اخبار شائع ہوتے ہیں جن میں سے چار ہندوؤں کے ہیں اور چار مسلمانوں کے۔ ہندوؤں کے اخباروں کی اشاعت کی مجموعی تعداد ساڑھے تیس ہزار ہے اور مسلمانوں کے اتنے ہی اخبار مجموعی طور پر ساڑھے سات ہزار کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ گویا پنجاب سے نکلنے والے اُردو اخباروں کی کُل اشاعت ۳۸ ہزار ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ہندی کا کوئی خاص روزانہ اخبار نہیں۔ "ملاپ" نے ایک ہندی ایڈیشن نکالا ہے جس کی اشاعت پانچ سات سَو سے آگے نہیں بڑھی۔

لاہور سے اُردو کے بے شمار ہفتہ وار اخبار اور ماہانہ رسالے بھی نکلتے ہیں لیکن ہندی کا کوئی اعلیٰ درجہ کا ہفتہ وار اخبار یا ماہانہ رسالہ نہیں چھپتا۔ انہیں باتوں کی وجہ سے ہندوستان بھر میں پنجاب کو اُردو کا مرکز مانا جاتا ہے۔ اور یہ ہے بھی ٹھیک! ہندوستان کے باقی صوبوں کے روزانہ، ہفتہ وار اور ماہانہ اخباروں اور رسالوں کی تعداد مل کر بھی لاہور کے اُردو اخبارات اور رسالوں کی تعداد سے کم رہتی ہے۔

میں نے اس تقریر میں دو باتیں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اول یہ کہ ہندی صوبجاتِ متحدہ، صوبجاتِ متوسط، اور وسطِ ہند کی دیسی ریاستوں کی اصلی زبان ہے اور یہی درجہ پنجاب، صوبہ سرحد اور کشمیر میں اُردو کو حاصل ہے۔ دُوسرے یہ کہ عملی طور پر اُردو اور ہندی کو ایک ہی زبان نہیں سمجھا جا سکتا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے رسم الخط مختلف ہیں۔ ایک فارسی میں لکھی جاتی ہے اور دوسری ناگری میں۔

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رُو سے پنجاب میں اُردو رسم الخط جاننے والوں کی تعداد نَو لاکھ ساڑھے آٹھ ہزار ہے اور اس کے برعکس گورمکھی، ہندی اور انگریزی جاننے والوں کی تعداد مل کر بھی سوا چار لاکھ سے زیادہ نہیں۔

اگر صوبجاتِ متحدہ اور دیگر صوبوں کی تمام پڑھی لکھی آبادی کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ تو ہندوستان بھر میں فارسی رسم الخط جاننے والوں کی تعداد ناگری رسم الخط جاننے والوں کی تعداد کے تقریباً برابر ہو جاتی ہے۔ اس لئے بعض حضرات رسم الخط کے جھگڑے کا حل یہ پیش کرتے ہیں کہ فارسی اور ناگری دونوں رسم الخط اُڑا دیئے جائیں اور ان کی بجائے رومن رسم الخط

اختیار کر لیا جائے۔ بیدلوگ ترکی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ترکی ایک چھوٹا سا ملک ہے جہاں کی عام زبان ایک ہے۔ ایسے ملک میں زبان یا رسم الخط کا ایک ہونا یا کر دینا ہندوستان کی بہ نسبت آسان ہے جو ترکی کے مقابلے میں ایک وسیع برِ اعظم ہے اور جس میں مختلف نسلوں، قوموں اور مذہبوں کے لوگ بدیسی حکومت کے نیچے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔

غرض رسم الخط کا سوال بہت اہم ہے اور اس کا حل بہت مشکل! موجودہ حالات میں شاید رومن رسم الخط ہی ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ لیکن فارسی، ناگری اور گورمکھی کو چھوڑ کر اگر اسے قبول کرنے کی کوشش کی گئی تو لوگوں کی زبانوں سے اور اخباروں کے کالموں میں یہ الفاظ سُنے اور دیکھے جائیں گے "مذہب خطرے میں!"

یہ تو اب فیصلہ شدہ امر ہے کہ پنجاب کی زبان اُردو اور یُو۔ پی اور بعض دیگر صوبوں کی زبان ہندی ہے اور یہ دونوں مختلف حروف یعنی فارسی اور ناگری میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں ادبی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن سب سے ضروری مسئلہ عام لوگوں کی بول چال کی زبان کا ہے جس کے لئے میں نے "ہندوستانی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس زبان کو بنگال، مہاراشٹر اور مدراس وغیرہ کی علمی و ادبی زبان نہیں بنایا جا سکتا۔ ان صوبوں میں وہاں کی اپنی صوبجاتی زبانیں ذریعۂ تعلیم ہونی چاہئیں۔ اور "ہندوستانی" صرف پرائمری جماعتوں میں لازم قرار دی جائے۔ اور بڑی جماعتوں میں اسے اختیاری مضمون کے طور پر پڑھایا جائے۔ پرائمری جماعتوں میں اسے لازم کر دینے کا مقصد یہ ہے کہ مختلف صوبوں کے رہنے والوں کو روزانہ گفتگو اور کاروباری خط وکتابت میں انگریزی استعمال کرنے سے نجات مل جائے۔

اگر ہم قومی زبان کو دیر تک اپنی اپنی مذہبی زبانوں کے حروف میں لکھتے رہے تو ہمارے اختلافات روز بروز بڑھتے چلے جائیں گے۔ اس لئے میرے خیال میں رومن رسم الخط ہماری تمام مشکلات کا بہترین حل ہے۔ اسے اختیار کر لینے سے ہمارے خیالات میں یگانگت پیدا ہو جائے گی اور فرقہ پرستی بڑی حد تک مٹ جائے گی ◆

سومناتھ چِب

مور

دلکش مور! ادائیں تیری — تیرے ساتھ دعائیں میری
کتنا سُندر تاج ہے تیرا — سُندر بن تک راج ہے تیرا
جوڑا باندھے، مانگ نکالے — سینہ تانے، بازو ڈالے
نیلا چُست شلوکا تیرا — تیرے پر ہیں گہنا تیرا
تیری صُورت پیاری پیاری — بر میں تیرے اُودی ساری
چلتے چلتے یُوں لہرائے — جیسے شاخ جھکولا کھائے
دیپک راگ سُنائے جا تُو — دِل میں آگ لگائے جا تُو

اب یہ قصّہ رام کہانی
قِسمت نے کی آنا کانی

صحن میں اب وہ مور نہیں ہے — دِل پر میرا زور نہیں ہے
آنکھوں سے جاری ہیں جھڑیاں — بیت گئیں عشرت کی گھڑیاں
بیٹھے ہیں بپتا کے پہرے — بیاکُل ہردا کیسے ٹھہرے
مِلنا اب، مقسوم نہیں ہے — مُجھ کو کچھ معلوم نہیں ہے

مور ہے آنکھ سے اوجھل کس جا
اور ہے مور سے مطلب اس جا

شاد عارفی

اُردو خیال اَور ٹھُمریاں

ہم حضرتِ نصیب نصرانی کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے اپنے علم و تجربہ کی بنا پر بہت دلچسپ اور مفید باتیں اہلِ اُردو کو سُجھائی ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ دیگر اہل الرائے حضرات بھی اس باب میں ادباء و شعراء کی رہنمائی فرمائیں گے۔ ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ اُردو کے ادیب اور شاعر اس باب میں عملی پیش قدمی کریں گے اور اُردو کی ترقی کیلئے نئی نئی راہیں نکال کر اپنی زبان کو ہر طرح مکمل بنا دینے میں مصروف ہو جائیں گے۔ "ہمایوں"

جناب نذیر احمد صاحب (کیمبل پور) نے اپنے نکتہ آموز اور فہیمانہ مراسلہ میں فی الحقیقت چند اُن باتوں کی بروقت تحریک فرمائی ہے جن کی ہمارے ادب میں سخت ضرورت ہے۔ میں ادبِ اُردو کی ضروریات کے عنوان پر بالفعل کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ مجھے نذیر احمد صاحب سے مطلق اختلاف نہیں۔ صرف بات یہ ہے کہ میں اس امر میں آپ سے کچھ زیادہ زیادہ کہنا چاہتا ہوں۔ عدیم الفرصت ہونے کے باعث اس وقت معذور ہوں۔ بہرحال اتنا ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ قریب چھ سال سے ہیچمداں "اُردو کی ادبی ضروریات" ہی کی تحقیقات میں مصروف ہے۔ متعدد نتائج تحقیق کے حاصل ہو چکے ہیں یا جو کچھ ابھی باقی ہیں وہ بھی انشاءاللہ جلد حاصل ہو جائیں گے۔ اُمید ہے کہ آئندہ ماہ ترجمہ کی اہمیت پر اپنے چند خیالات کا اظہار کر سکوں گا۔ جناب نذیر احمد صاحب نے ترجمے کی اہمیت پر جو رائے زنی فرمائی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔

آداب و اخلاق پر ایک جامع تالیف کی تحریک بھی برمحل ہے۔ میں نذیر احمد صاحب کو اس پر آفرین کہتا ہوں۔

خاص موضوع جس پر میں اس وقت لکھنے پر مجبور ہوتا ہوں وہ نذیر احمد صاحب کی اُس فرمائش سے متعلق ہے جو آپ نے اُردو کے شعراء سے فرمائی ہے۔ "اُردو میں "خیال" اور "ٹھمریاں" کہنا یہ حقیقتاً ایک اہم مسئلہ ہے۔ چند غور طلب اُمور کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ غزل ہماری زبان میں ایک قابلِ قدر چیز ہے۔ اس میں غِنا کا عنصر کافی پایا جاتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ہماری زبان نغمہ (song) سے بالکل خالی ہے۔ تھیئٹریکل اور فلمی نغموں کو میں یک قلم اس بحث سے خارج کرتا ہوں۔ موجودہ نوجوان شعراء میں چند ایسے ضرور ہیں جن کے کلام میں موسیقیت کی کمی نہیں، نظموں کی ساخت بھی ان کی "فطنتِ طربیہ" (Musical genius) سے موافقت کرتی ہے، مثلاً حضرتِ ساغر نظامی کا "موجوں کے ساز پر ملاحوں کا گیت"۔ مگر ایسی نظمیں فقط "طربیہ" (Lyrical) کہی جا سکتی ہیں، نغمے (songs) نہیں۔ "طربیہ نظموں" (Lyrical Poems) اور "نغموں" (songs) میں بہت فرق ہے۔ کالیداس کی "میگھدوت" اور "رِتُ شرنگار" "طربیہ" یا "غنائی نظمیں ہیں، نغمے نہیں۔ شیلے کی "بادِ مغرب" اور "اسکائی لارک"

بھی غنائی نظمیں ہیں، نغمے نہیں۔ بائرن کی "عبرانی راگنیاں" نغمے ہیں، غنائی نظمیں نہیں۔ اسی طرح ٹامس مور کے بیشمار نغمے زبانِ انگریزی میں اور ٹیگور کے بنگلہ میں ملاحظہ ہوں۔ ہمارے ہاں غزلیں نغموں کی ضرورت ایک حد تک پورا کرتی ہیں، مگر دراصل کوئی غزل "نغمہ" کہلانے کی اصولاً مستحق نہیں، چہ جائیکہ اُسے ہندوستانی موسیقی (سنگیت) کی ایک صنف تصور کیا جائے۔

۲۔ چونکہ خیال اور ٹھمریاں صحیح معنی میں "نغمے" (Songs) ہوتی ہیں، لہٰذا نغمہ کی تعریف و توضیح کرنا ضروری امر ہے۔ نغمہ وہ قسم نظم ہے جس کی غایت "گایا جانا" ہوتی ہے۔ اس کے اصول و مصطلحات دیگر اصناف نظم سے جدا ہوتے ہیں۔ نغمے میں چند باتوں کا پایا جانا لازمی ہے۔ اہم ترین امر یہ ہے کہ موسیقی اور شاعری میں اس طرح کا توازن ہو کہ ایک دوسری پر حاوی نہ ہونے پائے۔ نغمے کی تصنیف دو طرح پر ہوتی ہے، اور دونوں صورتوں میں اس توازن کا لحاظ رکھنا لابدی ہے۔ . . . .

. . . . پہلی صورت یہ کہ نظمِ نغمہ کی تصنیف کسی منتخب راگ کے مقررہ "ٹھاٹ" اور "رس" یعنی اثر و جذبہ (Emotion and Pathos) کے لحاظ سے ہو، یا راگ کا انتخاب، ٹھاٹ کا قیام اور سُروں کی ترتیب اور شکل کا تعین کسی نظمِ نغمہ کے الفاظ و جذبات کے لحاظ سے ہو۔ (واضح رہے کہ نغمہ کے جذبہ و خیال میں توازن اور تسلسل اور کیف میں بسط و استقلال کا ہونا لازمی ہے)۔ تال[1] اور لے (Musical rhythm) اور نغمہ کی بحر (Poetic metre) میں التزام ہو۔ ایک کا تعین اور قیام دوسرے پر حسبِ ضرورت منحصر ہوتا ہے۔ ہر قوم کی موسیقی کے مطابق، نغمہ کے چند جزو ناگزیر ہوتے ہیں۔ ہندوستانی موسیقی میں ایسے اجزاء استھائی، انترہ، سنچارک، اور آبھوگ ہیں۔ اِن کے اصولوں کا لحاظ تصنیفِ نغمہ میں ضروری ہے۔

اس بات کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ کبھی نظمِ نغمہ راگ اور تال کی موجب ہوتی ہے اور کبھی "راگ" اور تال نغمہ کی "نظم" اور "بحر" کی۔ اقدام کا انحصار "شاعرِ مغنّی" یا "مغنّی شاعر" کے وجدان پر ہوتا ہے۔

نغمے کی اس تعریف و توضیح کے بعد قارئین پر یہ ظاہر ہو جانا چاہیئے کہ اُردو میں نغمے کی تصنیف کی طرف کبھی کوئی متوجہ نہیں ہُوا۔ اس کی وجہ اِن اُمور کے عمیق مطالعہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اُردو شاعری اور موسیقی میں رابطہ کم رہا ہے۔ گو کہ ہمارے مستند غزل گو شعراء میں بھی دو چار ہی ایسے نظر آتے ہیں، جن کے متعلق کچھ حد تک یہ کہا جا سکے کہ اُنہوں نے غزلیں موسیقی کی غرض سے کہی ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ بہر صورت تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں، شاعری اور موسیقی میں ربط پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہیں ہوئی جو کچھ ربط ان دونوں چیزوں میں ہے، وہ محض طبعی اور کمزور! یہ دونوں فن دو جُدا چیزیں تصور کئے گئے ہیں۔ مگر ہندی میں ایسا نہیں ہے، وہاں شاعری اور موسیقی میں جو باہمی ربط ہے وہ گویا "ازدواجی" ہے، یا یوں کہئے کہ وہاں ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

[1] "تال" اور "لے" اصطلاحی الفاظ ہیں۔ دونوں کے مفہوم جُدا ہیں۔ "تال" "لے" یعنی سلاستِ حرکت (Flow of Movement) کی کسی مقررہ منقسم شکل کو کہتے ہیں۔

۳- تیسرا غور طلب امر یہ ہے کہ موسیقی ہر قوم کی اپنی چند خصوصیات رکھتی ہے، جو اُس قوم کی فطنت (Genius) کے ماتحت ہوتی ہیں۔ فی الواقع ایک قوم کے تمام تر فنونِ لطیفہ اُس کی مخصوص ذہنیت و کردار، فطرت و فطانت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی موسیقی ہندوستانی موسیقی سے اس قدر مختلف ہے، اور مغربی شاعری مشرقی شاعری سے۔ یہ فرق دو زبانوں کی شاعری یا موسیقی کے مصطلحات اور طرزِ بیان اور اظہارِ جذبات (Expression) ہی میں بیّن ہوتا ہے۔ ہر چند کہ وارداتِ قلب اور رشحاتِ دماغی، یعنی موضوعات و جذبات، دو قوموں کے یکساں ہوں، ان کے اظہار اور اصطلاح (Expression and Technique) میں ہمیشہ اختلاف و بُعد رہے گا۔ بعض حضرات نے (جن میں بعض مشہور ہستیاں بھی شامل ہیں) ہندی، مراٹھی اور بنگالی نغموں (گیتوں) کو انگریزی راگوں میں منتقل کرنے کی مضحکہ انگیز کوششیں کی ہیں، اور بعض نے انگریزی گیتوں کو ہندوستانی راگنیوں میں۔ اُن کو شاید اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ ہندوستانی نغمے انگریزی راگوں میں ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں، جیسے اُردو کسی انگریز کی زبانی، اور انگریزی نغمے ہندوستانی راگوں میں ایسے جیسے انگریزی کسی اُلھڑ ہندوستانی کی زبانی۔ خیر! ان لطیف اختلافات کو محسوس کرنے کے لئے نہایت حسّاس گوش درکار ہیں!

نکتہ یہ ہے کہ ہندی اور اُردو کی فطنت (Genius) ایک نہیں ہے۔ اُن کی دو جُدا فطنتیں ہیں اور دونوں میں بُعد[۱] ہے مگر سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ آیا ان دونوں زبانوں کی فطنتوں میں ارتباط و اختلاط ہو سکتا ہے یا نہیں۔ جواب ہے، شاید، مگر کسی بڑی حد تک نہیں اور یہ میں ذاتی تجربہ سے کہتا ہوں، آگے اس نکتہ کی توضیح ہو جائے گی۔ اور یوں بھی قوموں، اُن کی تہذیبوں اور کلچروں کے باہمی تصادم و ارتباط اور پھر بعد کے ارتقا کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک قوم کی فطنت دوسری قوم کی فطنت کو اگر قطعی سلب نہیں کر دیتی، تو کم از کم اُسے ہمیشہ کے لئے مغلوب ضرور کر لیتی ہے، اور اُن کی کشمکش دیرپا نہیں ہوتی۔ اُردو زبان اِس قسم کی دست درازی کا ثبوت ہے۔ یعنی زبان کے حق میں عجمی فطنت نے ہندی فطنت کو قطعی مغلوب کر لیا۔ اس کے برعکس ہندوستانی موسیقی میں، ہر چند کہ خیال اور ٹھمری دونوں مسلم نژاد ہیں، ہندی فطنت نے عجمی فطنت کو بالکل سلب کر دیا۔

۴- ہندوستانی راگوں میں اُردو نغمے کہنا، اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ لَے اور تلفظ کی دشواریاں[۲] ایسی اور اتنی ہیں کہ ساعی یا تو پست ہمت ہو کر نغمہ نگاری سے دست بردار ہو جاتا ہے، یا مجبور ہو کر خود ہندی کی طرف آ پڑتا ہے۔ دو ایک نظیروں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، مثلاً :-

"تُوں محمد شاہ رنگیلے" (اڈانہ، تین تال)

---

[۱] یہ ایک موضوع ہے نہایت وسیع اور معرکۃ الآرا۔ اس مضمون میں اس پر مبسوط بحث نہیں کی جا سکتی۔

[۲] لفظوں کی ساخت، تالوں کی شکلیں، لَے کی چالیں، زیر و بم کی خصوصیات، عربی و فارسی حروف (ح۔ خ۔ ذ۔ ز۔ ژ۔ ش۔ ص۔ ع۔ غ۔ ف۔ ق وغیرہم) کا ہندوستانی موسیقی کی زبان میں فقدان ـــــ یہ چند دشواریاں ہیں، جن کا حل مشکل ہے۔

اس میں "محمد شاہ" کی جگہ "ممد شاہ" (ہائے ہوز مفتوح) باندھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ "شاعر مغنی" کو اپنے ممدوح کے نام کا صحیح تلفظ معلوم نہ تھا، بلکہ وجہ یہ تھی کہ "محمد" کا لفظ ہندوستانی موسیقی کے معیار پر چند وجوہ کے ماتحت پُورا نہیں اُترتا۔ (طوالت کے خوف اور عدیم الفرصتی کے باعث، مَیں اِن وجوہ کا ذکر اِس وقت نہیں کر سکتا)۔

ٹھمریوں اور خیالوں میں عموماً الفاظ مثل اَرَجَ (عرض)، گَرَجَ (غرض)، گَرَب نَوَاجْ (غریب نواز)، ہندی میں حرکات کا لحاظ فرمایئے، نَجَرَ (نظر)، سَپھَدَرَ (صفدر) وغیرہ کے بے شمار ملتے ہیں[1] ——— ٹھمریاں اور خیال، جن کے بیشتر مصنّفین مسلمان حضرات (منجملہ واجد علی شاہ، اختر پیا، شاہِ اودھ، نواب کلب علی خاں، سَندپیا، والیٔ رامپور اور چھمّن صاحب اور قدر پیا وغیرہم ایسی عظیم القدر ہستیوں کے) ہوئے ہیں جن کی تعلیم و تربیت تمام تر اسلامی تھی، اور جو مندرجہ بالا الفاظ کے صحیح تلفظ سے کما حقہٗ واقف تھے۔ چنانچہ آخر وہ کیا وجہ تھی کہ تصنیفِ نغمہ میں اُنھوں نے اپنی ہی زبان میں اس قسم کے تصرفات سے کام لیا، حتےٰ کہ اُن خیالوں اور ٹھمریوں میں بھی یہی تصرفات شروع سے آخر تک نظر آتے ہیں، جو نعتیہ ہیں۔ رسول اللہؐ یا امام حسنؑ و حسینؑ کی مدح میں کہی گئی ہیں۔ اس کی وجہ دراصل وہی دو مختلف فطرتوں کی کشمکش ہے جو ایک طرف تو خیال اور ٹھمری اور ٹپّہ ایسی دلکش اصنافِ موسیقی کا موجب ہوئی، اور دُوسری طرف اس قسم کے لفظی اور صوری تصرفات کا باعث۔ ہندی موسیقی کی فطرت، کسی صُورت میں بھی اسلامی فطرت سے فائدہ اُٹھانے کے باوصف، اس سے مغلوب نہیں ہوئی۔ راگ اور الاپ، تال اور لَے کی اساثی صُورتیں، اصول و آئین آج تک ویسے ہی قائم ہیں، جیسے "سارنگ دیو" کے زمانے میں یا اس سے قبل[2] تھے۔

ہر عمیق تجزیہ کے بعد خیال، ٹھمری، اور ٹپّہ کا مبداء و ماخذ ہندوستانی موسیقی ہی میں ملتا ہے۔ اِن تمام شعبوں میں جو بھی تصرفات اور ترقیاں نظر آتی ہیں وہ سب دراصل ہندی فطرت کے ماتحت ہیں! یہی واقعہ لَے اور تال کے ساتھ بھی ہوا۔ گو طبلہ اسلامی جدت کا نتیجہ ہے، مگر اس کی تالوں میں کوئی تال بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کا "ماخذ" "غیر ہندی" ہو۔ لَے (Musical rythum) تو قطعی طور پر ہندی ہی ہے۔ ہماری تال اور لَے کا دارومدار "سم" کے اوپر ہے، اور یہ وہ اُصول ہے جس کی نظیر دُنیا کی کسی موسیقی میں نہیں ملتی (مَیں افسوس کرتا ہوں کہ اس مضمون میں مَیں اس اصُول کی پیچیدگیوں اور باریکیوں پر روشنی ڈالنے سے معذور ہوں)۔

فی الجملہ، عربی و فارسی الفاظ کی توڑ مروڑ جو کچھ ہماری موسیقی میں ہوتی آئی ہے، وہ اس وجہ سے نہیں کہ مصنّفین کو صحیح تلفظ الفاظ کا نہیں آتا، بلکہ اس وجہ سے کہ ہندوستانی موسیقی کا "لحن و غنا" (Intonation and Modulation) اور تال اور لَے کسی قسم

---

[1] غور فرمایئے کہ ان الفاظ کے تمام آخری حروف مفتوح ہیں۔ اِس حرکت کو سنسکرت اور ہندی میں "شُنت" کہتے ہیں۔

[2] ہندوستانی کلاسکی موسیقی کی ابتداء، اس کا ارتقاء اور کمال تمام تر "شاستری" اصولوں پر مبنی ہے، جو آج تک جُوں کے تُوں قائم ہیں۔ یہ شاستر ہند میں ورودِ مسلم سے بہت قبل کے ہیں!

کی اجنبیت اور غیریت کے عناصر کو اپنے ہاں مداخلت کا موقع نہیں دیتی۔ خود ہندوستانی موسیقی کے دلدادہ حضرات کی طبیعت ایسے عناصر کو قبول نہیں کرتی۔ عربی و فارسی تلفظ کانوں پر بار ہوتا ہے۔ میرے زمرۂ احباب میں کتنے تعلیم یافتہ اور منصب دار مسلمان حضرات ہیں جنہیں ہندوستانی موسیقی سے عشق ہے۔ اِن حضرات میں سے جس سے بھی میں نے اس امر کے متعلق رائے لی، اُس نے یہی کہا کہ "طبیعت قبول نہیں کرتی" اور "کانوں کو ناگوار گزرتا ہے"۔

میرا اپنا تجربہ بھی یہی ہے۔ تقریباً سات سال ہوئے میں میرس میوزک کالج (لکھنؤ) میں ہندوستانی کلاسکی موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ مجھے اس زمانے میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ اُردو میں خیال اور ٹھمریاں کہی جائیں۔ چنانچہ خود میں نے اس میدان میں کوشش کی، قریب پچاس ساٹھ کے خیال اور ٹھمریاں اُردو میں کہیں، مگر بعدۂ خود اپنی ہی طبعِ مضطربانہ نے اِن چیزوں کو قبول نہ کیا، لہذا قطعِ مساعی پر مجبور ہو گیا۔ نمونہ کے طور پر اپنی ایک اُردو ٹھمری نقل کرتا ہوں جس کے لغات تمام تر فصیح اُردو کے ہیں، البتہ "چیز" کی شکل اور بحر ٹھمری کے اصولوں کے مطابق ہیں۔

ٹھمری (کافی)

(تین تال، مدھ لے)

استھائی

ساقی بھر دے جامِ شراب

دے ناب ——— شراب

ساقی بھر دے جامِ شراب

میرا رنگ پہ آئے شباب

ساقی بھر دے ——— !

انترہ

بحرِ محبت ہو متلاطم،

دل ہو رقصاں مثلِ حباب،

——— ہو نغمہ شباب،

ہر موجِ رباب ———

شراب ——— دے ناب

ساقی! ——— رنگ پہ آئے شباب،

ساقی! ——— بھو دے جامِ شراب،

ساقی! رنگ دے میرا شباب،

میرا بھر دے جامِ شراب!

۵۔ پانچویں چیز جو دشواری پیدا کرتی ہے وہ ہمارے تصورات (Conceptions) ہیں۔ خیال اور ٹھمری میں گل و بلبل، شراب و پیمانہ، مشک و عنبر، لیلیٰ و شیریں، قیس و فرہاد، محمود و ایاز وغیرہ ہم نہیں کھپتے۔ ہمارے ہاں تو "بسنت گرہا" "چمپے ہار" "امبوا کی ڈاری پہ کوئلیا" "مُرلا" اور "پپیہے کی بولی" "بنولہ کچے" "بھوا گدرانے کی مہک" "گھن شیام مرلی والے" اور "رادھکا کا اُکلایا ہوا جوبن" ہی ایسی چیزیں ہیں جو موسیقی میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بے شمار تصورات ایسے ہیں جو ہماری غنائی یا طربیہ شاعری کے جزو لاینفک ہیں، جن کی جگہ دوسرے تصورات کو نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً چند درج ذیل ہیں:—

۱۔ چڑیاں بھور کی، بولن لاگیں۔
۲۔ جاگو موہن پیارے۔
۳۔ پیہو کی بولی دبول۔
۴۔ کوئل بولن لاگی
۵۔ کانا مرلی بجائی۔
۶۔ گھن شیام مرلی والے
۷۔ برندابن کی کنج گلن میں
۸۔ لگوا برج دیکھن کو چلوری،
۹۔ برج میں دھوم مچی،
۱۰۔ گیلی گیلی، ابنڈی ابنڈی،
۱۱۔ گگری مھے بھرن ناہیں دے۔
۱۲۔ بھلوا کی گیند موہیکا ماری۔
۱۳۔ پھُل گندوا نہ مارو، لگت کلیجوا میں چوٹ۔
۱۴۔ موری بنّیاں دھونائے۔
۱۵۔ چھوم چھننا نانا بچھوا باجے
۱۶۔ چھن چھن چھن چھن پائل باجے
۱۷۔ بھلوالے کوُنت موہیکا۔
۱۸۔ برکھا رُت بیری ہمارے،
۱۹۔ گھر آئے بدرا کارے،
۲۰۔ رِم جھم، رِم جھم مینہا برسائے وغیرہ۔

یہ چند ایسی چیزیں ہیں جو ہماری طربیہ شاعری سے خارج نہیں ہو سکتیں، ان کا خارج ہو جانا گویا خود ہماری موسیقی کا ختم ہو جانا ہوگا اور ان کا اُردو میں ترجمہ کرنا بھی محال، گویا ان کا خون کرنا ہے۔ کر کے دیکھ لیجیے، نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ "چڑیاں بولن لاگیں" کی جگہ فصیح اُردو میں "چڑیاں بولنے لگیں" یا "موری بنّیاں دھونائے" کی جگہ "میری باہیں نہ مروڑو" یا "گھر آئیں بدریاں کاری" کی جگہ "کالی بدلیاں گھر آئیں" کہئے اور دیکھ لیجیے کہ اس طربیہ زبان کا سارا سحر مفقود ہو جاتا ہے۔ یہ تصورات فی الحقیقت ایسے ہیں جو طبعی طور پر اس

مخصوص زبان میں بے ساختہ تال اور سُر کے سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں ـــــ الفاظ جو گویا موسیقی ہی کے لئے معرضِ وجود میں آتے ہیں!

اگر آپ نے غور کیا ہے، تو آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ موسیقی میں ہندی الفاظ بھی اپنی اصلی صُورت قائم نہیں رکھ سکتے۔ نیم کی جگہ "بنولہ"، "آم یا امبہ کی جگہ "امبوا"، اسی طرح "مُرلا"، "چڑیاں"، "موہنیکا"، "مُرلیا"، "کوئیلیا"، "نیںہا"، "دُورُوا" وغیرہ غرض بے شمار الفاظ ہیں جن کے تلفّظ میں غنائی ضروریات کے ماتحت اضافے کیئے گئے ہیں۔ (اور پھر ہندی الفاظ میں "ہَشْذَتْ" لَے کی روانی میں کیا کیا لطافتیں پیدا نہیں کر دیتا!) مگر اُردو والے اس قسم کے تصرفات کی کب اجازت دیتے ہیں! ہر زبان کے شاعر کو ایسے اُمور میں آزادیاں حاصل، نہیں حاصل تو اِک غریب اُردو کے شاعر کو!

اُردو خیالوں اور ٹھمریوں کی تصنیف میں مجھے جن جن مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا، میں ہی بہتر جانتا ہوں اور آخر اب یہ کہنے پہ مجبور رہتا ہوں کہ پاکیزہ، فصیح اُردو میں خیال یا ٹھمری کہنا قطعی لغو بات ہے۔ اگر آپ کو ہندوستانی موسیقی کی تال اور لَے کو اُس کی دیگر "صوتی" خصوصیات کے ساتھ اُردو "چیزوں" میں قائم رکھنا ہے تو اُردو الفاظ کو بُری طرح توڑنا مروڑنا پڑے گا، ورنہ تال اور لَے کو قربان کر دینا ہوگا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خیال، ٹھمری اور ٹپّہ کی صنفوں کا دار و مدار تمام تر تال اور لَے پر ہے اور جب آپ نے انہیں کو قربان کر دیا، تو پھر خیال اور ٹھمریاں، اور ٹپّے کہاں! تھیٹر اور سینما کے نغموں کی طرح، ہمارے اُردو نغمے بھی، بالخصوص اپنے عجمی لحن و تصوّرات کے سبب، ایک جُدا صنف ہو جائیں گے ـــــ ہو جائیں ـــــ بہتر!

کیونکہ یہ کوئی ضروری امر تو ہے نہیں کہ خیال اور ٹھمریاں ہی کہی جائیں۔ ٹیگور کی طرح جدّتِ طبع سے کام لے کر نغموں کی ایک صنف اپنی زبان میں پیدا کر دیجئے۔ ہندوستانی موسیقی کی "صوتی خصوصیات" سے اس امر میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک صنف "سوز" کی موجود ہے۔ ہر سوز کسی راگنی میں بندھا ہوتا ہے۔ فقط اس میں تال نہیں ہوتی۔ اور لَے بھی اُس کی ہماری موسیقی کی مخصوص لَے سے مختلف ہوتی ہے۔ مگر بایں ہمہ وہ ایک چیز ہے قابلِ قدر، ایک صنفِ نغمہ، بہر صُورت مکمل۔ اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اِس کے اُصول کام میں لا کر نغمے کہے جا سکتے ہیں۔ تحقیق کرنے کے بعد میں قائل ہوں کہ اس میدان میں بہت کچھ امکان ہے۔ اس موضوع پر آئندہ کسی موقع پر، بالشرطِ فرصت، ممکن ہے کچھ لکھ سکوں ـــــ والسّلام

نصیب نصرانی

نوٹ:۔ اس مضمون (اُردو خیال اور ٹھمریاں) کے جملہ حقوق بحقِ حضرت نصیب نصرانی محفوظ ہیں۔

آزادی

مزے اگر لوٹنے ہیں آوارگی کے خانہ بدوش ہو جا
اگر ہے آزادیوں کی خواہش جنوں کا حلقہ بگوش ہو جا

وصالِ جاناں کی گر ہوس ہے تو زہد و طاعت سے باز آ تو
پہن کے صدق و صفا کا جامہ جہاں میں تو بادہ نوش ہو جا

اگر ہے اُلفت کا سر کو سودا تو راہِ اُلفت میں سر کٹا دے
اگر تمنّا ہے دردِ دل کی تو شوق سے دِل فروش ہو جا

اگر ہی سوزِ دروں سے جلنا تو بزمِ جاناں میں شمع ساں جل
نہ لب کو آلودہ کر شکایت سے اور جل کر خموش ہو جا

جو راہِ ہستی کے مرحلے ہیں بغیر ہمّت نہیں ہیں کٹتے
کڑی ہے منزل گراں ہے بارِ الم تو محوِ سروش ہو جا

بگاڑتا ہے کسی سے تو کیوں کہ بزمِ ہستی ہے چند روزہ
جہاں میں اچھوں کا ہو ثنا خواں بُروں کا تُو پردہ پوش ہو جا

رفو کہاں تک کریگا ناشاد اس کو تو سوزنِ خرد سے
اُتار دُنیا کے پیرہن کو گدا گرِ خرقہ پوش ہو جا

رام پرشاد گھونسلہ ناشادؔ

دیوانہ جلوس

آخری برسات تھی، میں اور للا بھیا ٹہلتے ٹہلتے بستی سے باہر آئے آفتاب لبِ بام، نیلے نیلے صاف ستھرے آسمان پر رنگ برنگے بادلوں کی دوڑ، سامنے اجیگڑھ کا پہاڑی قلعہ جس کے دامن دامن چھوٹی بڑی عمارتوں کا نظارہ، کنکوؤں کے بیچ کبوتروں کی اُڑانیں، جابجا دھوئیں کی ریل گاڑیاں سی رواں دواں، اس کے مخالف سمت ہوئے، ساگوان، نیم، ببول وغیرہ کا ہرا بھرا جنگل، گلگونۂ شفق سے دامانِ فلک لالہ زار بنا ہؤا، قصہ مختصر وہ دلفریب سماں تھا کہ انسان کو سب کچھ بھلا دے۔

کوئی چار ہی فرلانگ گئے ہوں گے، ایک پکا تالاب آیا، جس کی چوڑی چوڑی سیڑھیاں کچھ دُور جا کر پانی میں ڈوب گئی تھیں، صلاح ہوئی ذرا یہیں موج اُڑائیں۔ دونوں وقت ملنے والے ہیں، چراغ جلے پلٹ چلیں گے۔

ہم دونوں پانی سے دو سیڑھی اُوپر جا بیٹھے اور لگے مزے مزے سے غپّیں چھوڑنے۔

چند منٹ گئے ہوں گے، مینڈکوں نے ٹرٹرانا شروع کیا، گویا اس قدرتی نمائشگاہ میں ایک جیتا جاگتا بینڈ بجنے لگا۔

ادھر ان عجیب وغریب سُروں سے فضا معمور ہوئی، اُدھر سیڑھیوں کی درزوں اور تالاب کی دیواروں سے حشرات الارض نے خروج کیا، اب ہمیں وہاں سے ہٹ آنا چاہئے تھا، کیونکہ ایسے مقامات پر اکثر کنکھجورے، سنپولئے اور بچھو وغیرہ ہؤا کرتے ہیں مگر یہاں تو پرندوں کے شور وشغب، جھینگروں کی جھنکار، کوئل کی کوک، پپیہے کی "پی کہاں! پی کہاں!!" اور مینڈکوں کے ناقابلِ نقل نغموں نے وارفتہ کر رکھا تھا۔ پُروّیا کے ہوش رُبا جھونکے غارت گری پر آمادہ تھے، بھلا یہ لُطف کس دِل سے چھوڑا جاتا البتہ اِتنی دُور اندیشی ضرور کی، کہ ہم ذرا ایک صاف ستھرے بڑے سے پتھر پر سرک گئے۔

اس طرح بھی سکون نصیب نہ ہؤا، یہاں ایک اَور بلا نازل ہوئی، وہ یہ کہ نہ جانے کہاں کہاں سے چھپکلیوں کے بے شمار بڑے بڑے بچے نکل پڑے اور اُچھل اُچھل کر کیڑے مکوڑوں کا شکار کرنے لگے۔

خیال آیا، بھئی اب یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ . . لیکن خیر ذرا اور سہی . . . ابھی تو کچھ کچھ اُجالا ہے۔

پھر للا بھیا نے کہا:۔

کیوں صاحب! ہم تو جانیں اب چلیں نا!!

مگر تو یہ باتوں کی دلچسپی میں کسی سے ہلا جاتا تھا، سُنی اَن سُنی کر دی، ڈھیلی ڈھالی موری کا پائجامہ پہنے، اُسی طرح پیر لٹکائے دیے
آدھے غپّیں مارے گیا۔
ایک دفعہ کچھ سرسراہٹ سی ہوئی۔ اَنہہ! ہوگا کوئی پتنگا وتنگا، ذرا ٹانگ اُونچی نیچی کر کے پائنچا ہلا دیا، پر کیا مجال جو باتوں کا تار
ٹوٹنے دیا ہو۔
تنگ وقت تو پہنچے ہی تھے، تھوڑی دیر میں رات ہوگئی، اور ہم پلٹنے لگے، اُٹھتے اُٹھتے میری ٹُنڈی کے پاس کچھ مہین
مہین پنجے سے گڑے اور جیسے کوئی دُم سی چھوئی لگا تا ہوں جو گھبرا کر ہاتھ، تو ارے! چھپکلی کا بچہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
للّا بھیّا کی نظر بچا کر میں نے پھُرہری لینے سے پہلے اُوپر ہی اُوپر اُسے گرفت میں لے لیا، پھر وُہ کیا کیا تلملایا ہے، کیسی
کیسی دُم پھٹکاری، مگر میرے چنگل سے رہائی ہوئی پر نہ ہوئی۔

دس پانچ قدم تو خیر سے گزر گئے۔ پھر جو للّا بھیّا نے میرا ہاتھ ذرا الگ الگ دیکھا، تو اُسے کچھ شُبہ سا ہُوا، ۔ ۔ ۔ بولا:۔
یہ ہاتھ کیوں اُٹھائے ہوئے ہیں، آپ؟
کچھ نہیں، ذرا یوں ہی ۔ ۔ ۔ ۔ مَیں نے جواب دیا۔
اچھا! ۔ ۔ ۔ اور بدستور باتیں ہونے لگیں، لیکن مطلع صاف ہو جانے کی وجہ سے ایک تو چاندنی کافی تھی، دوسرے
وہ بالکل میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، جب بار بار دیکھنے پر وہ ہاتھ وہیں پایا، تو اُس سے نہ رہا گیا، بچّے والے بازو پر آ کر کہا:۔
اجی صاحب! ہاتھ نیچا کیجئے۔ مجھے اُلجھن ہو رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑی دیر سے!!
اور اِکدم میری کلائی پکڑ لی ۔ ۔ ۔ ۔
ہیں! ہیں!! ٹھیرو، ارے بھائی ٹھہرنا ذرا!!!
جوں ہی میری بدحواسی سے گھبرا کر اُس نے کلائی چھوڑی، کہ میں اُچھل کر چار قدم پیچھے۔
اب تو اُسے سخت بے چینی ہوئی، سب کچھ بھُول بھال، تہ دل سے اِس طرف رجوع ہُوا، اور لگا تحقیقات کرنے:۔
کیوں صاحب! میں نے کہا کیا سبب ہے، آپ ہاتھ کیوں نہیں ہٹاتے وہاں سے؟
اب جتنا میں پیچھے ہٹتا ہوں، اُتنا ہی وہ آگے بڑھتا ہے، جب چھُٹکارے کی کوئی صُورت نظر نہ آئی تو مجبوراً کہنا پڑا:۔
بھئی کیا بتاؤں، دراصل ایک چھپکلی کا بچہ میرے پائجامہ میں گھس گیا ہے، اُسے پکڑے ہوئے ہوں، فوراً اُدھر ہی ہو بھیّا!
ہائے ہائے ۔ ۔ ۔ ۔ پہلے سے کیوں نہ کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ارے اُتارو پاجامہ ۔ ۔ ۔ ہائے نکالو جلدی سے کمبخت کو ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے کاٹے کا منتر نہیں . . . . اجی جناب اس درخت کی آڑ لے کر نکال باہر کیجئے . . . . غضب کردیا آپ نے تو . . . . !

میں نے سوچا۔ اس وقت کی کیا ضرورت، یہ کچھ کر تھوڑی سکتا ہے، گھر پہنچ کر دیکھا جائے گا۔ اس لئے جواب دیا :-

کوئی بات نہیں، اچھی طرح سنبھالے ہوئے ہوں، بس چپ چاپ چلے چلو، خبردار کسی سے کہنا نہیں !

اس پر بیچارہ خاموش ہو رہا، اتنے میں بستی آگئی، میں اسی طرح چھپکلی کا بچہ ہاتھ میں لئے، بدن چرائے، کان دبائے، دل ہی دل میں دعا کرتا جارہا تھا، کہ الٰہی کوئی شناسا نہ مِل جائے !

یکایک آواز آئی :-

اجی جناب ! میں نے کہا، السلام علیکم !!

دھڑک گیا، وعلیکم السلام کہہ کر آگے بڑھنے کو تھا کہ شیخ جیون صاحب ٹیلر ماسٹر سنگر مشین چھوڑ دھم سے کود ے اور فرماتے کیا ہیں :-

کیوں صاحب ! یہ باتیں . . . . اچھا . . . . کچھ ناراض ہیں کیا . . . . اب تو آپ کبھی آتے بھی نہیں . . . . کہیئے خیریت تو ہے . . . . آیئے ذرا دو ایک کش حقّہ کے تو لگاتے جایئے . . . . ابھی تازہ کر کے تو رکھا ہے۔

اس وقت معافی چاہتا ہوں، پھر حاضر ہوں گا . . . .

جی ہاں، پھر حاضر ہوں گا . . . . بندہ "پھر" کا قائل نہیں . . . . آپ ہمیشہ یوں ہی داؤ دے جاتے ہیں، خیر فی الحال تھوڑی دیر بیٹھنا ہی پڑے گا . . . . آیئے ! . . . .

اور لگے میرا ہاتھ پکڑنے۔

اِدھر میں سمٹا، اُدھر للّا بھیّا چلّایا :-

ارے بھئی الگ ہی رہنا . . . . اِن کے پجامہ میں چھپکلی کا بچہ گھس گیا ہے !!

پہلے تو ماسٹر صاحب بھونچکا سے رہ گئے . . . . پھر ہمیں گھور گھور کر دیکھا . . . . اور متبسم ہو کر بولے :-

خوب ! بچّہ . . . . ارے بھئی چھپکلی کا بچّہ . . . . واہ کیا بات ہے . . . . ہی ہی ہی . . . . لو بھلا کہیں چھپکلی کے بچّے بھی پجاموں میں گھُستے ہوں گے۔

میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر :-

کیوں جناب ؟

مَیں ۔ جی ہاں! جب ہی تو عرض کرتا تھا!!
ماسٹر صاحب ۔ (قہقہہ لگا کر) بہت اچھے رہے ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا آپ نے بھی وہی چھوڑی ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرے کو بیوقوف بنانے کے
لئے ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں جی للّا بھیّا! ۔ ۔ ۔ ۔ ارے یار ذرا بیٹھ جاؤ گے تو کیا ہو گا۔
للّا بھیّا ۔ کہہ تو دیا آپ سے، کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ ورنہ کیا بات تھی۔
ماسٹر صاحب ۔ نہیں میری قسم، کیا واقعی؟
للّا بھیّا ۔ واقعی نہیں، تو کیا یُوں ہی، پھر اُنہیں یقین دلانے کی غرض سے تالاب پر بیٹھنے اور چھپکلی کا بچّہ پائجامہ میں چلے جانے تک کا مفصل حال کہہ سُنایا، دو ایک راہ چلتے اور آ کھڑے ہوئے، بھانڈا پھُوٹتے ہی، کسی نے اُچھل کر قہقہہ لگایا، کوئی ایک طرف ہو کر بچّہ نکالنے کا مشورہ دینے لگا۔ مَیں شکریہ کے ساتھ متواتر معذرت کر رہا تھا، کہ بابا بجنسو لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے، اِتنے میں ٹیلر ماسٹر صاحب نے لپک کر دوکان سے یہ بڑی قینچی اُٹھائی اور بولے:۔
لایئے صاحب! زیادہ تکلف نہ کیجئے، ایک ذرا سا پاجامہ کاٹے دیتا ہوں، کھڑے کھڑے اس مُوذی سے جان چھُوٹ جائے گی، جبتک آپ تہمد باندھ کر حقّہ وُقّہ ملاحظہ فرمایئے، چُٹکی بجاتے جوڑ میں جوڑ ملا دوں گا۔

آپ جانتے ہیں کہ شارعِ عام پر ذرا میں ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے ہیں، کہاں یہ کہ کسی بھلے آدمی کے پائجامے میں چھپکلی کا بچّہ گھُس جائے یار لوگ کیا کچھ نہ کر گزریں گے، مجھ غریب کو نرغے میں لے لیا گیا۔ ایک خُدائی ٹُوٹ پڑی، اب بھاگوں کدھر بھاگتا ہوں، مارے ہمدردی کے جسے دیکھو چڑھا چلا آتا ہے، اوسان خطا ہوئے جاتے ہیں، رائے زنی کا بازار گرم ہے، کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔
ہزار منّت خوشامد پر چند صاحبان "الگ رہو، الگ رہو" کہنے پر مامور ہوئے، بعض نے از خود آنے والوں کو اس مضحکہ انگیز حادثہ کی آگاہی بخشنے کا ذمّہ لے لیا، مگر گھیرے ہوئے ہیں شامتِ اعمال کی طرح مجھ کو، گویا باپ دادا کے وقت کی دشمنی نکالنے کا موقع ہاتھ آیا ہے، آج زندہ نہ چھوڑیں گے۔
ستم ظریف تماشائی اِنچ بھر نہ سرکے، مُنہ آئی بکتے رہے، مارے غیرت کے میرا یہ حال کہ زمین پھٹے اور میں سما جاؤں بمشکل تمام ذرا سانس دی گئی، اور میں نے گھر کا رُخ کیا، تو ڈھنڈورا پیٹنے والے بندۂ بے دام اردلی میں ہو لئے۔
خیر اِس پر بھی جبر کر لیتا، اگر چُپ چاپ چلے چلتے، مگر نہیں وہاں تو تالُو سے زبان لگانا گناہ تھا، پُوری قوت سے گڑبڑ مچاتے رہے، اس وجہ سے قدم قدم پر مردم شماری میں اضافہ ہونے لگا، جو دیکھتا "کیوں بھئی کیا ہُوا؟" کہنے سے پہلے آگا رو کتا۔

اور جوں ہی کسی کے مُنہ سے نِکلا :۔

اجی ان کے پائجامہ میں چھپکلی کا بچہ گھُس گیا ہے !

کہ بے اختیار ٹوٹا مجھ پر اور چیخا گھبرا کر :۔

کیوں جناب ! شاعر صاحب کیا سچ مچ ؛

اِدھر شور ہُوا :۔

اور نہیں تو کیا . . . ہاں ! ہاں !! . . . . . اجی ہم جو کہتے ہیں . . . سچ ہے بالکل . . . . . .

اس پہ وہ کہتا :۔

ارے ! . . . . ہی ہی . . . . اور جلدی سے کندے تول کر مجھ پر جھپٹّا مارنا چاہتا ، کہ اِکدم چیخ پکار مچتی :۔

ہائیں ! ہائیں !! خبردار . . . . وہیں رہنا . . . کہیں چھُوٹ چھاٹ نہ جائے . . . .

یہاں کا چھ سات مہینے رہنا ، اور اتنے دن کی صاحب سلامت رنگ لائی ، جدھر سے میں گزرتا ، اکثر روشناس گاہک اور دُوکاندار خرید و فروخت چھوڑ ، گز ترازو بٹک ، پُوچھ گچھ شروع کر دیتے تھے ، پھر اُن میں سے بعض تو اُلٹی سیدھی رائے دے کر پلٹ جاتے ، اور بعض شوقین جیوڑے ساتھ ہو لیتے تھے ، کہ بھئی یہ تو بڑے مزے کی بات ہے ، ذرا دیکھنا چاہئے ، چھپکلی کا بچہ کیونکر نکلتا ہے ، نہ جانے کتنا بڑا ہوگا ، کہیں اندر ہی اندر کاٹ کوٹ نہ کھائے ۔

اتفاقاً دو ایک پولیس والے بھی مِل گئے ، جو کبھی کبھی میرے پاس آیا جایا کرتے تھے ، وہ بھی ذرا انتظاماً ساتھ ہو لئے ۔ اور ہٹو بچو کرتے میرے دوش بدوش چلنے لگے ۔

آخر وہ گلی آئی ، جو بازار کے سیدھے بازو سے میرے میزبان قاضی محمد رسول خان صاحب کے گھر کو جاتی تھی ، سب اُس طرف مُڑے ، بمشکل آدھا راستہ طے کیا ہوگا ، غل غپاڑہ سُن کر ایک صاحب جو اپنے دروازے پر آئے ، اور مجھے اِن لوگوں میں گھِرا ہُوا پایا ، اِک دم چھُو ہوئے ، فوراً قاضی جی اور سوداگر صاحب کو مطلع کیا ، کہ لو صاحب گوالیار والے شاعر صاحب کو پولیس لا رہی ہے !

وہاں ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ، کہ خیر وہ شخص شاعر تو جیسا کچھ ہے سو ہے ہی ، مگر اکھڑ بلا کا ہے ، کر بیٹھا آج کسی سے سر پھٹول ، خدا خیر کرے پولیس تک نوبت پہنچ گئی ۔

قاضی جی کا گھر قریب تھا ، کہ سوداگر عبدالغفور صاحب اور قاضی جی کی قیادت میں اُن رپورٹر صاحب سمیت نہایت سُرعت سے چند جوان اس ہڑبونگ میں در آئے ، اور غضبناک ہو کر دھاڑے :۔

کیوں جی! کیا معاملہ ہے؟

ایک غُل مچا:۔

اجی معاملہ کیا۔ ۔ ۔ ۔ ہی ہی شاعر صاحب کے پجامہ میں چھپکلی کا بچہ گھُس گیا۔ آپ ٹہلنے گئے تھے ۔ ۔ ۔ تالاب پر ۔ ۔ ۔ ۔ بڑی دیر سے گھُسا ہوا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ للا بھیا سے پوچھ لو چاہے!

حمایت کا جوش ہمدردی میں تبدیل ہونا تھا کہ ان کا لہجہ ہی کچھ اور ہوگیا۔

ارے! یہ کیا۔ ۔ ۔ ۔ کیوں جناب شاعر صاحب ۔ ۔ ۔ لو ہم سمجھے کسی سے لڑائی ہوگئی ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا پھر نکلا بھی یا نہیں؟

کوئی صاحب ۔ نکلتا کدھر سے، اُنہوں نے نکالا ہی نہیں، وہ تو مزے سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہیں ابھی تک۔

دوسرے صاحب ۔ (مجھ سے مخاطب ہوکر) کیا زندہ ہے کیا؟

مَیں ۔ جی ہاں ہے تو!

تیسرے ۔ تو نکالئے کم بخت کو ۔ ۔ ۔ ۔ ہٹ جاؤ بھئی سب ایک طرف ۔ ۔ ۔ بچّہ نکلتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ہم نہیں جانتے ۔ ۔ ۔ ۔

مَیں ۔ ایسی گھبراہٹ بھی کیا ہے آخر۔

چوتھے ۔ لو اور سنو۔ حد کردی گندے پن کی، اَماں گھبراہٹ ہی نہیں، لاحول ولا قوۃ۔ گھن نہیں آتی آپ کو، چھپکلی کا بچّہ پکڑے پکڑے پھرتے ہیں، آپ بھی بڑے ویسے آدمی نکلے!

تو پھر اب کیا کروں میں؟

پانچویں تڑق کر بولے:۔

اجی جناب ہم بتائیں، وہاں کا وہیں مَسل کر چھوڑ دیجئے، اور نہیں تو لائیے مجھے بتائیے، ہاں کدھر ہے، دیکھوں تو ذرا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ حضرت لپکے ہی تھے کہ للا بھیا درمیان میں آگیا، سوداگر صاحب نے اُنہیں پکڑا، لوگ بیچ بچاؤ کرتے، ورنہ وہ تو چھوٹتے ہی ہاتھ مارنے والے تھے۔

پھر یہ جلوس وہاں سے اِس طرح بڑھا، کہ ؎

پیچھے پیچھے داغ آگے آگے رسوائی ہوئی

والی مثل مجھ پر صادق آرہی تھی۔ یعنی ہندو مسلمان پیرو جواں کے علاوہ تالیاں بجا بجا کر غُل مچانے والے ننگ منگے بچے تو موجود ہی تھے، عین خاتمہ پر گھروں کی بہو بیٹیاں بھی راستہ بچا کر ادھر اُدھر آ کھڑی ہوئیں کہ میری تشہیر کا نظارہ کرکے ٹھٹھے لگائیں

گھر پہنچنا اور لے لے لالٹینیں محلے والوں کا دوڑنا، ایک ہلڑ مچ گیا، میں پسینہ میں نہایا چھپکلی کا بچہ پکڑے کھڑا ہوں۔ گرد و پیش مخلوق حلق پھاڑ پھاڑ کر دم دیئے دے رہی ہے۔

سوداگر عبدالغفور صاحب ایک دُھلی دُھلائی چادر لائے، اب ضرورت تھی کہ بھیڑ چھٹے، میرا ایک ہاتھ رُکا ہوا ہے، کوئی صاحب آڑ کریں تو میں سنبھال کر چھپکلی کا بچہ نکالوں۔

بڑی التجاؤں کے بعد خدا خدا کر کے کچھ گنجایش نظر آئی، ایک صاحب صفیں توڑتے بڑھے اور فرمایا لایئے ہم آپ کے کندھوں کے گرد چادر لپیٹے دیتے ہیں!

مہربانی آپ کی، مَیں نے جواب دیا۔

جب وہ اُجلی اُجلی چادر لپیٹ کر ہٹے، تو معلوم ہوتا تھا، مُردہ کفن پہنے قبر سے نکل آیا۔ جوں ہی مَیں نے مجمع پر ایک نظر ڈالی، کہ ہاں ہوشیار نکالتا ہوں بچہ چھپکلی، یار لوگ تھے کہ اِک دم دو دو چار چار قدم پر دکھائی دیئے، اور فوراً پینترے جما جما کر کھڑے ہو گئے، اس وقت میری ہر نقل و حرکت پر اُن کی صُورتوں کے اُتار چڑھاؤ علم النفسیات کے مقالے بن بن جاتے تھے، اکثروں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، کہ ہائے وہ مُوذی کہیں نکلتے ہی ہم پر نہ چڑھ بیٹھے۔

اس خدائی لشکر میں چند نفر ایسے بھی تھے جن کے خیال میں بچہ وچہ کچھ نہیں، لوگوں کو بنانے کے لئے نری غپ چھوڑی گئی تھی۔ ہاں ہوشیار! ہاں ہوشیار!! کی پکاریں، جو مَیں نے کھسکا پاجامہ اور سنبھال چادر ہاتھ بڑھایا، ہُی مچ گئی، کوئی چیخا، کسی نے زور سے قہقہہ لگایا، بعض دَھم سے گلی میں کُودے، چند سامنا چھوڑ ادھر اُدھر ہو گئے۔

قدرے سکوت کے بعد کچھ جھڑ کتے بدکتے سے میری طرف بڑھے، پنجوں کے بل اُچک اُچک کر ذرا دُور سے ملاحظہ فرمایا، اور لگے بآوازِ بلند اعلان کرنے:-

واقعی ہے تو بچہ چھپکلی کا، لو بھئی دیکھو جسے دیکھنا ہو، بالکل لجلجا ہو گیا ہے، بیچارہ۔

بھلا یہ بھی کوئی تماشا تھا! مَیں نے دو قدم بڑھ کر گلی میں پاجامہ پھٹکار دیا، نہ جانے وہ کہاں گرا، کیا ہؤا۔

کھیل ختم ہو گیا، مگر تماشائی نہ ٹلے، دس دس بیس بیس قدم بھاگے ہوئے پلٹ کر بجلی کی طرح مجھ پر لوٹے، جسے دیکھو مفصل حالات معلوم کرنے کے جنون میں آپے سے باہر، ظالموں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا، ایک ایک بات ہزار ہزار بار پُوچھی گئی، آموختہ خوانی کرتے کرتے میرا ناک میں دم آگیا، پھر کچھ حاضر الوقت افراد پر ہی یہ معاملہ بے باق نہیں ہؤا، ٹھہر ٹھہر کر کتنے ہی گروہ آئے اور اِس سانحہ کی چھان بین کر کر کے رخصت ہوئے، مگر رستہ میں ملنے والوں کو مطلع کر کے ذرا ادھر روانہ کرتے گئے، کہ رہی سہی کسر

نکل جائے۔

اِن حضرات نے میرا روٹی پانی حرام کردیا۔ جی کھول کھول کر قہقہے لگائے، الواع و اقسام کے پند و نصائح سے مستفید فرمایا، آئندہ محتاط رہنے کی تنبیہ شدید کی، اظہارِ تأسف سے جی جلایا، اسی کِل کِل میں کم از کم رات کے بارہ بجا دیئے۔

کسی قدر ہنگامہ دھیما پڑنے پر میں نے چارپائی سنبھالی، وہاں تلے اُوپر چلمیں بدلتی رہیں، حقّہ بازی کا بازار گرم رہا، میں انگاروں پر لوٹا کیا، پھر ہوش نہیں کب جھپکی لگی۔

کچھ غنودگی کی سی حالت میں آواز آئی :-

کیوں صاحب! کل رات کو کیا ہُوا تھا ؟

کھولی جو آنکھ میں نے، تو مُنہ اندھیرا تھا . . . . اے! سویرا ہوگیا . . . . .

ایک صاحب سوداگر عبدالغفور صاحب کی طرف رُخ کئے پائے گئے، نظر ملتے ہی مجھ سے مخاطب ہوئے :-

آداب عرض! . . . . کہیئے مزاج شریف ؟

مَیں - نوازش آپ کی!

اب آپ مسکرائے، تلے اُوپر دیکھا، اور گلفشاں ہوئے :-

معاف کیجیئے گا . . . . . ہم نے کچھ اُور سُنا ہے . . . . . گھر کی علالت کے سبب سے رات کو نہ آسکے . . . . آپ کے پجامہ میں . . . . . ہا ہا ہا . . . . . . چھپکلی کا بچّہ گُھس گیا تھا . . . . . . آپ نے بڑا دہ کیا . . . . . جھرجھری لے کر ڈرے نہیں آپ . . . . .

ابھی ان حضور نے تمہید اُٹھائی تھی، ایک ایک دو دو کر کے دوسرے صاحبان کی آمد شروع ہوگئی، تانتا بندھنے لگا، جو شخص اِدھر سے گزرتا، پہلے والوں کے عجیب و غریب حُلیئے دیکھ کر، مجھ غریب پر کرم فرمائے بغیر نہ رہتا، کیونکہ قاضی جی کے مکان کا یہ حصّہ ایسا تھا، جس میں آڑ نہ کواڑ عین تیراہے کا ٹکڑا، جب ہی تو یار لوگوں نے اس کو غپّوں کا ریڈیو اسٹیشن بنا رکھا تھا، جہاں سے دن رات عجیب و غریب شُتونگڑے براڈکاسٹ کیئے جایا کرتے تھے۔

پھر آج تو خدا کے فضل و کرم سے واردات ہی ایسی پُرلطف ہوگئی تھی، کہ جواب نہیں رکھتی، بغیر دوڑ دھوپ کے گھر بیٹھے مراد پائی، بس تمام قوتیں اسی موضوع پر صرف ہونے لگیں۔

ریلوے سٹیشن سے پینتیس ۳۵ چھتیس ۳۶ میل مختصر سی لبتی، مہاراجہ رنجور صاحب (سٹرگباشی) ساہمہ صفت موصوف بیدار مغز رئیس، اجیگڑھ، کا وہ انتظام تھا، ادنیٰ ادنیٰ باتیں دربار تک پہنچتی تھیں، کسی کو چھینک آئی اور پرچہ گزرا، کوئی اندھیرے اُجالے کھانسا کھنکارا اور تفتیش شروع ہوئی۔

چھپکلی کے بچہ والا معاملہ رات کو ہی مہاراجہ کے حضور میں پیش کیا جا چُکا تھا، صبح سرکاری چوبدار نے پکارا لگایا:۔

مہاراج کیس بُلؤا ہوت ہے، دیوان خانہ ماں براجمان آہیں! (مہاراج کے ہاں طلبی ہے۔ دیوان خانہ میں تشریف فرما ہیں!)

اِس یاد آوری کی وجہ ذہن میں آتے ہی میرا دِل بیٹھ گیا، مگر حکمِ حاکم مرگِ مفاجات تعمیل حکم کے سوائے چارہ ہی کیا تھا، کلیجہ پر پتھر رکھ کر اُٹھا اور چوبدار کے ساتھ ہو لیا۔

دیوان خانہ میں پہنچ کر مہاراجہ کا سامنا ہوتے ہی، اِس سرے سے اُس سرے تک نرم گرم بوچھاڑیں شروع ہو گئیں، مجھے نقلِ محفل بنالیا گیا، مہاراجہ اور دیگر معززین کا تو ذکر ہی کیا، بینا، مونی درباری طوائفوں تک نے خوب خوب حوصلے نکالے اور آہ میں کسی کا کچھ نہ کر سکا

دربار سے واپسی پر میرا جو حال تھا، شاید بنلائے فساد یعنی چھپکلی کے بچے کا بھی نہ ہؤا ہوگا، کاش اِس درماندگی میں کوئی تسکین کی صورت نظر آتی، سو بہ خلاف اُس کے یہ ہؤا کہ قاضی جی کی بیٹھک میں ایک محفل میری دل آزاری کے انتظار میں چشم براہ نظر آئی نگاہیں چار ہونے کی دیر تھی، وہ آئے وہ آئے کہتے دوڑے آڑے ہاتھ لیا، اور جب تک ایک ایک بات نہ پُوچھ لی مجھے دم نہ لینے دیا۔

ابھی آب و دانہ باقی تھا، اس واقعہ کے چند مہینہ بعد تک مجھے اجیگڑھ میں رہنا پڑا۔ دو چار مرتبہ دربار کی حاضری کا بھی اتفاق ہؤا، کوئی دِن ہی ساتھ خیر کے گزرتا ہوگا، ورنہ سو سو بہانے وہی تذکرہ چھڑ جایا کرتا تھا۔

چھپکلی کا بچہ نہ ہؤا، وبالِ جان ہؤا، ذراسی غلطی پر مجھے نکو کر لیا گیا۔ پناہ کے دروازے بند ہو گئے۔

حد ہے کہ دوست احباب اور ملنے جُلنے والوں نے خوب رنگ چڑھا چڑھا کر یہ خبر پنّا، ضلع باندا اور چترکوٹ تک پہنچا دی، اس بات کا مجھے اس وقت علم ہؤا، جب ریاست اجیگڑھ سے نکلنے کے بعد ان مقامات کے شناسا ملے۔

یہ واقعہ ۱۹۱۵ء کا ہے، جب کبھی وہ باتیں یاد آتی ہیں سہم جاتا ہوں، کہ اُن واقعات کے جاننے والوں میں سے کہیں کسی کا سامنا ہو گیا، تو وہ چھپکلی کے بچے کی یاد دہانی کر کے میرے دِل پر ٹھوکا نہ لگا دے۔

میرزا فہیم بیگ، فہیم چغتائی

شاعر کا شاہکار

میں اپنے واسطے اِک دِلرُبا بناؤں گا

نسیمِ صبح کی شوخی، گلوں کی لے کے مہک
حسین کلی کا تبسم، کماں کی لے کے لچک
چُرا کے بربطِ ناہید کے حسین نغمے
دِلوں کے ساز پہ گائے ہوئے حزیں نغمے
کسی سے مانگ کے دوشیزگی کی انگڑائی
کسی کی اُٹھتی جوانی کی لے کے رعنائی
اثر دُعا کا، نگاہوں کا کیف، دِل کا گداز
شبِ وصال کی بھولی ہوئی سی اِک آواز
چُرا کے شعر کی نزہت، تخیلات کی رَو
کسی کی فکر کی مستی، تصورات کی ضَو
عروسِ نَو کی اُمنگیں، شبابِ نَو کا غرور
چُرا کے ساقیٔ گلرُو کی انکھڑیوں کا سُرور
شفق کی مانگ کے سُرخی، کشش ترنّم کی
ملا کے اُس میں حسین بجلیاں تبسّم کی
اُڑا کے ساقیٔ میخانۂ ازل کی جھلک
خلوص لے کے شرابی کا، ساغروں کی کھنک
چُرا کے نیند کے جھونکے نگارخانے سے
اُڑا کے عیش کے لمحے کسی زمانے سے

میں اپنے واسطے اِک دِلرُبا بناؤں گا

الطاف مشہدی

بے کاری

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

(ہندو ہوسٹل میں ۴۴ نمبر کا کمرہ، گندہ، خاک آلودہ، دو چارپائیوں پر میلے بستر، ایک میز پر بہت سی کتابیں، سگرٹوں کا ڈبہ، قلمدان اور تھوڑی سی نقدی، ایک چارپائی پر شیام سُندر بال بکھرے غمگین صُورت بنائے بیٹھا ہے اور سگرٹ کے کش لگا کر دھوئیں کے مرغولے سے ہوا میں چھوڑ رہا ہے۔ یکایک دروازے سے بھیالال داخل ہوتا ہے، لمبا، دُبلا، پتلا جوان ہے، گال اندر پچکے ہوئے، زرد رُو، ایم-اے پاس۔)

بھیالال۔ (چارپائی پر بیٹھ کر) آج وہ بدلہ لیا کہ وہ بھی ساری عمر یاد ہی رکھے گی، یہ اُونچے طبقے کے لوگ نجانے کیوں ہمیں کیڑوں مکوڑوں سے بھی بدتر خیال کرتے ہیں!

شیام سُندر۔ (ایک حزیں مسکراہٹ کے ساتھ) کیا بات ہوئی، کس سے بدلہ لیا، وہ بدقسمت کون ہے؟

بھیالال۔ وُہی تو ہے، ڈاکٹر گھنشیام لال کی بیوی جمنا، اوہ مگر تم اُسے نہیں جانتے، موٹی سانولی سی ہے، دو بچّے ہو جانے پر بھی ایف-اے میں پڑھتی ہے، مَیں آج تین مہینے سے اُسے تواریخ پڑھا رہا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا عورتوں کو تواریخ کی کیا ضرورت ہے، اُنہیں تو چُولہا چاہئے۔ خیر، ہمیں تو اپنے پیسوں سے کام ہے، دو گھنٹے پڑھاتا ہوں، پندرہ روپے ملتے ہیں۔

شیام سندر۔ غنیمت جانو!

بھیالال۔ (ایک نقلی آہ بھر کر) ٹھیک ہے، مگر . . . . میری شکل وصورت . . . . . مَیں اسی بارے میں تم سے مشورہ کرنے آیا تھا، کہ . . . .

شیام سندر۔ (بات کاٹ کر) مگر تم سے کس مسخرے نے کہہ دیا کہ مَیں "حسن" کا جرّاح ہوں،

بھیالال۔ (بات اَن سُنی کر کے) اوہ میں اپنی صُورت کو کیا کہوں، میرا رنگ قدرتی طور پر زرد ہے جس سے ہر شخص کو مجھ پر تپ دِق کا مریض ہونے کا شُبہ ہوتا ہے، اب بتاؤ مَیں کیا کروں، جس دن سنڈے ٹائمز میں اشتہار دیکھا، اُسی دِن عرضی لے کر ڈاکٹر گھنشیام لال کے پاس چلا گیا، وہ تو وہاں نہیں تھا، اور آخر پڑھنا بھی تو اُس کی بیوی ہی کو تھا، مجھے دیکھتے ہی گھبرا گئی،

کہنے لگی "آپ کچھ بیمار تو نہیں رہے ؟" اور یہ اُس نے کچھ ایسے ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا کہ مجھ سے انکار نہ ہو سکا، جھوٹ مُوٹ کہہ دیا، "جی ہاں" وہ اس پر کچھ گھبرا سی گئی، رُکتے رُکتے بولی" اوہ . . . . آپ . . . . آپ کو کیا بیماری تھی "، میں نے ایک قدم اس کے قریب بڑھ کر کہا" تپ . . . . محرقہ ، ٹائیفائیڈ " وہ یہ سُن کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ کہنے لگی" تپ محرقہ ؟" گویا اُسے اب بھی یقین نہیں آتا تھا کہ میرے جیسا متین صُورت بھی کبھی تپ محرقہ میں مبتلا ہو سکتا ہے ، میں نے سوچا، بچاری نہایت ہمدرد اور غریب نواز معلوم ہوتی ہے، آؤ لگے ہاتھوں اس کا فائدہ اُٹھا لیں ، چنانچہ میں نے اور بھی مسکین بن کر کہا " جی ہاں ، ٹائیفائیڈ ، وہ پچھلے چار مہینے بستر پر پڑا رہا ہوں ، اب کہیں جا کر افاقہ ہوا ہے ، آپ کا اشتہار پڑھا کہ آپ کو ایک اُستاد کی ضرورت ہے جو دو گھنٹے روزانہ تاریخ کا درس دے سکے ، اِسی لئے حاضر ہوا ہوں۔ فیس وغیرہ طے کر لیجئے۔ یہ رہے سرٹیفکیٹ ، باقی رہی ذہنی قابلیت ، تو اس کے لئے میرا صرف یہی کہہ دینا . . . . . "

مگر وہ جلد ہی بیچ میں بول اُٹھی " نہیں ۔نہیں " اُس نے پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا، اتنی جلدی کیا پڑی ہے ، آپ کو کم از کم دو تین ہفتے آرام کرنا چاہئے ، آپ . . . . آپ دو تین ہفتوں کے بعد ضرور تشریف لائیے "۔

"اے خیالِ یار کیا کرنا تھا اور کیا کر دیا ـــــ میں نے اپنے آپ کو بہت بہت کوسا، مگر اب لکیر پیٹنے سے کیا ہوتا تھا ، ناچار واپس چلا آیا اور پھر دوسرے دن ڈاکٹر گھنشیام لال کے ایک جگری دوست سے سفارش بہم پہنچائی "۔

"مگر وہ تو بیمار معلوم ہوتے تھے " (ڈاکٹر کی بیوی نے سفارش کے جواب میں کہا) " انہوں نے مجھے خود بتایا کہ اُنہیں تپ محرقہ تھا " میری سفارش کرنے والے نے ہنس کر کہا " میں نے تو اُسے آج تک کبھی بیمار ہی نہیں دیکھا ، اُس بیچارے کی شکل ہی ایسی ہے "ـــ اور یہ ہے بھی ٹھیک ـــ " میں اُسے مدت سے جانتا ہوں " ـــ یہ بھی ٹھیک تھا ـــ

" تو اب تین مہینے سے اُسے پڑھا رہا ہوں ، بالکل کوڑ مغز ہے ، دل میں مدت سے کسک تھی کہ اُس سے بدلہ لوں ، سو آج موقع مل گیا "۔

شیام سندر۔ کیا ہوا ؟

بھیالال۔ (جیسے اس نے سوال کو سُنا ہی نہیں) یوں تو اس میں اب مجھے بھی کچھ شک نہیں کہ صُورت سے میں تپ دق کا مریض دکھائی دیتا ہوں ، مگر کیا تم نے وہ انگریزی ضرب المثل نہیں سُنی کہ صُورتیں اکثر دھوکا دیتی ہیں ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں پانچویں جماعت میں تھا ، اس وقت بھی ایسا ہی دُبلا پتلا تھا اور جماعت میں ہمیشہ ہر مضمون میں اوّل رہا کرتا تھا ، چنانچہ حسب عادت پانچویں جماعت میں بھی اوّل ہی رہا ، جب سالانہ جلسہ پر انعام تقسیم ہونے لگے ، تو میرے حصہ میں بہت سے انعام آئے ، اُن دنوں میری جماعت میں ایک اور لڑکا بشنا اس بھی پڑھا کرتا تھا نہایت خوبصورت ، وجیہہ ، توانا تھا ، نہایت اچھا گلا پایا تھا کمبخت

نے، اُسے بھی موسیقی میں اوّل رہنے پر تمغہ ملا۔ مجھے یاد ہے وہ مجھے "تپ دقّی" کہا کرتا تھا۔ اُس دن جلسہ پر اُس کی خوبصورت بہنیں بھی آئی ہوئی تھیں اور میری دُبلی پتلی بہنیں بھی، اور جب میں بہت سے انعام سمیٹ کر لے گیا، تو لشنداس کی بہنوں نے میری بہنوں کو اُونچی آواز میں سُنا کر کہا "آہ بچارا بھیّا لال، یہ سب انعام اُس کے کس کام کے جبکہ اُسے تپ دق ہے؟" مجھے یاد ہے، میری بہنوں نے بہت بُرا مانا تھا، مگر قسمت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو، مَیں ابھی تک زندہ سلامت ہوں اور بچارا شکیل و توانا لشنداس آج دو سال ہوئے تپ دق سے بیمار ہو کر چل بسا۔ آہ صورتیں کس قدر دھوکا دیتی ہیں، وہ بہت اچھا آدمی تھا، اور جب کبھی مَیں پچھلے سالوں میں اپنے گاؤں کو گیا ہوں وہ ہمیشہ مجھ سے میری صحت، میری کھانسی، میری حرارت عزیزی کے متعلق سوال کیا کرتا تھا، اور یہ سوال تو ہر اُلّو کا پٹھا جو مجھے دیکھ لے ایکدم سے جڑ دیتا ہے، مثلاً اگر مَیں کسی ڈاکٹر کے پاس چلا جاؤں اور اُس سے کہوں کہ مجھے خفیف سی کھانسی ہے، تو وہ میری شکل دیکھ کر بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے:۔

"آپ کو رات کو پسینہ تو نہیں آتا؟"

"جی نہیں، البتہ دن کو ضرور آتا ہے خصوصاً جب کہ میں ورزش کرتا ہوں"۔

"کیا آپ کو کھانسی کے ساتھ خون بھی آتا ہے؟"

"نہیں جی، خون تو نہیں مگر بلغم ضرور نکلتا ہے"۔

"اوہ ــــ بُخار؟"

"ابھی تک تو نہیں ــــ لیکن اگر آپ کے سوالوں کی یہی رفتار رہی تو عین ممکن ہے کہ جلد ہی ــــ"

ڈاکٹر (قطع کلام کر کے) آپ کمرے سے باہر تشریف لے جایئے۔

بس تقریباً جس ڈاکٹر کے پاس جاؤ یہی حال ہے، اب میں صلاح کر رہا ہوں کہ ڈاکٹر یار محمد سے اپنی چھاتی اور پھیپھڑوں کا ایکس رے فوٹوگراف لے کر ہمیشہ پاس رکھوں تاکہ جب کوئی نیا ڈاکٹر یا پرانا حکیم سوال کرے "آپ کو پسینہ تو نہیں آتا؟ خون نکلتا ہے؟ بخار کب سے ہے؟" تو جھٹ یہی ایکس رے فوٹو اس کے ہاتھ میں دے دوں اور کہوں، پچھلے مانس کل میں نے ذرا اچار زیادہ کھا لیا تھا اس لئے صرف کھانسی کی دوا چاہئے۔

شیام سندر۔ نیک خیال ہے۔

بھیّا لال۔ بچارے ڈاکٹر لوگ تو الگ رہے، خود میرے اُستاد ــــ کیا کہوں ــــ بہت دنوں کی بات ہے، میں اُن دنوں نئی نئی ورزشیں سیکھ رہا تھا، چاہتا تھا کہ اپنے نحیف جسم کو فربہ بنا لوں اور چہرے کی زرد زرد رنگت کو گلاب کی سُرخی میں تبدیل کر دوں، چنانچہ خوب ڈنڈ پیلتا تھا اور دودھ پیتا تھا، تین چار مہینے یہی کیفیت رہی، اس کے بعد ہمارا جغرافیہ کا ٹیچر

جو ساڑھے تین مہینے کی چھٹی لے کر اپنی لڑکی کا بیاہ کرنے کے لئے جنڈیالہ گیا ہوا تھا، واپس آ گیا، اور مجھے پلے گراؤنڈ کے قریب مِلا،
مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا، "اوہ تم تو بہت کمزور ہو گئے ہو، کیا بیمار ہو گئے تھے؟"

میں نے دل میں سوچا بیمار تو نہیں رہا، البتہ ورزش ضرور کرتا رہا ہوں۔

اُس دن سے لے کر آج تک میں نے پھر کبھی ورزش نہیں کی، بھلا ورزش کا فائدہ ہی کیا ہے، جب یہ دوسروں کو مغالطہ میں ڈال دے، اور پھر مفت میں اپنے جسم کو تکلیف دینا قید بامشقت نہیں تو اور کیا ہے؟

شیام سُندر۔ نہیں آپ ورزش سے اپنے جسم کو صحت مند بنا سکتے ہیں، ورزش سے جسم میں چُستی آتی ہے، بہت ہلکا پُھلکا ——"

بھیّا لال۔ مجھے بناتے ہو شیام سُندر؟ تیسری جماعت کا سبق دُہرا رہے ہو اس میں تو اور بھی کئی نکمّی اور جھوٹی باتیں لکھی ہیں مثلاً "ورزش نہایت اچھی ہوتی ہے، جھوٹ بولنا گناہ ہے، دیانت داری بڑی نعمت ہے۔ دوسرے کی چیز پر نگاہ نہ ڈالو۔" سب بکواس، سفید جھوٹ!

شیام سُندر۔ تم ڈاکٹر گھنشیام لال کی بیوی کا ذکر کر رہے تھے جسے تم پڑھاتے رہے ہو!

بھیّا لال۔ ہاں میں جمنا کا ذکر کر رہا تھا، مگر تم نے کبھی سوچا کہ میری بدصورتی میں میرا کتنا قصور ہے۔ میرے ماں باپ بھی ایسے ہی تھے۔ قصور تو اُن کا ہے کہ اپنی بدصورتی کو جانتے ہوئے بھی مجھے جنم دیا۔

شیام سُندر۔ یہ تو محض "حُسنِ اتفاق" تھا۔

بھیّا لال۔ مجھے تو اس میں خاک "حسنِ اتفاق" بھی نظر نہیں آتا، اور یوں دیکھا جائے تو اس میں قباحت ہی کیا ہے، ذرا خیال تو کرو، قدرت نے دو کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں، نتھنوں اور ہونٹوں کے مجموعہ سے انسانوں کے کتنے نمونے ایجاد کئے ہیں، کہ ایک کی شکل دوسرے سے نہیں ملتی، بجائے اس کے کہ قدرت کی طبّاعی اور فن کاری کی داد دی جائے، لوگ مجھ پر ہنستے ہیں، کتنی بیوقوفی ہے۔ آج انسانوں میں کوئی بڑے سے بڑا آرٹسٹ قدرت کے اس شاندار تنوّع کی ایک مثال پیدا کر دے تو میں جانوں!

شیام سُندر۔ بے شک، بے شک، مگر وہ ڈاکٹر کی بیوی؟ ——"

بھیّا لال۔ ارے بھائی اب اُس کی بیوی کی کونسی بات رہ گئی، میں اُسے تین مہینہ سے پڑھا رہا ہوں، اور اس عرصہ میں وہ کوئی پندرہ بار بیمار پڑی ہو گی، اور کوئی دس بار ہی اُس کے ڈاکٹر خاوند کو موسمی بخار کا شکار ہونا پڑا ہے۔ کبھی دیکھو تو سر میں درد ہے کبھی پیٹ میں، کبھی بخار، کبھی نزلہ، اور مجھے دیکھو تو ان تین مہینوں میں ایک چھینک بھی نہیں آئی۔ آج میں جب پڑھانے کے لئے گیا تو کل کی طرح پھر کہنے لگی "مجھے زکام کی شکایت ہے۔" میں نے کہا "آپ کی بھی عجیب صحت ہے، آپ ڈاکٹر لوگ جب پرہیز نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ مجھے دیکھئے اپنی صحت کا خیال رکھتا ہوں، کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے پائی!

شیام سندر۔ خوب بدلہ لیا۔

(اظہر کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ درمیانہ قد، دُہرے بدن کا جوان ہے، ایک نیلا سُوٹ پہن رکھا ہے۔ ہاتھ میں ایک تار ہے۔)

اظہر۔ ہیلو شیام! ہیلو تپ دق!

شیام سندر، بھیّا لال۔ ہیلو اظہر! یہ تار کیسا ہے؟

اظہر۔ امجد نے بھیجا ہے، لکھا ہے کہ "بی۔ ٹی" کی ڈگری مل گئی ہے اور اب وہ الہ آباد جا رہا ہے، جہاں میونسپل سکول میں اُسے پینتیس ۳۵ روپے کی آسامی پیش کی گئی ہے۔

شیام سندر۔ مگر ایم۔ اے۔ بی ٹی اور صرف پینتیس ۳۵۔

اظہر۔ میں اُسے مبارکباد کا خط لکھ رہا ہوں، اِس دورِ بیکاری میں اَور تم کر بھی کیا سکتے ہو۔

بھیّا لال۔ کل مجھے کیلاش ناتھ مِلا تھا، وہ جو بی۔ اے میں ہمارے ساتھ پڑھا کرتا تھا اور فیل ہو گیا تھا۔ اب اپنے باپ کے کارخانے میں منیجر ہو گیا ہے، اپنی کار میں بیٹھا ہوا تھا، میری طرف ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا "آج کل کیا کرتے ہو؟" ـــــ اور یہ وہی شخص ہے جو انگریزی کا "جوابِ مضمون" مجھ سے خوشامدیں کر کے ٹھیک کرایا کرتا تھا۔

شیام سندر۔ (اُداس لہجے میں) جانے دو، ان باتوں کو، مجھے مسعود کا فکر ہو رہا ہے۔ تم جانتے ہو بیچارا دو مہینے سے میرے پاس رہتا ہے مگر ابھی تک نوکری کہیں نہیں ملی، کل سے واپس نہیں آیا۔

اظہر۔ واپس گاؤں کو چلا گیا ہو گا۔

شیام سندر۔ (رُکتے ہوئے) شاید! مگر اُس کا ٹرنک اور بستر تو یہیں ہیں۔

بھیّا لال۔ کوئی ضروری کام ہو گا ـــــ (زیادہ حوصلہ افزا لہجہ میں) ـــــ شاید کوئی نوکری مل گئی ہو اور آج تمہیں پتہ دینے کے لئے آ جائے!

شیام سندر۔ (رُکتے ہوئے) شاید!

اظہر۔ (سر ہلاتے ہوئے) کتنی بے کاری ہے! اور کتنی جہالت ہے! کل میں موتی ہال میں پروفیسر روچانند کا لیکچر سُننے گیا۔ فاضل مقرر جو ایک روئی کے کارخانے میں تین سو حصّوں کا مالک ہے۔ نہایت پرجوش لہجہ میں گریجوایٹوں کی کم عقلی کا ماتم کر رہا تھا، کہہ رہا تھا کہ موجودہ بے کاری اقتصادی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ طبقہ کی آرام پسندی کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اُس نے چند نہایت دردمندانہ تجاویز سامعین کے سامنے پیش کیں مثلاً یہ کہ گریجوایٹ چھوٹے موٹے کاروبار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں، بوٹ پالش کرنا،

ایک ٹھوک فروش سے جمتے اُدھار کر گلیوں میں چکّر لگا کر اُنہیں بیچنا، گھی کی دکان کھولنا، مونگ پھلی کی تجارت۔

شیام سندر۔ (تلخ لہجہ میں) چنا جور گرم!

بھیّالال۔ بے کاری دُور کرنے کے ایسے کئی گُر مجھے بھی یاد ہیں۔

اظہر۔ مثلاً

بھیّالال۔ (واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے) مثلاً تم اور شیام سندر انگریزی میں اچھا لکھ سکتے ہو، ایک اخبار نکال لو۔

اظہر۔ شیام سندر۔ مگر روپیہ —— ؟

بھیّالال۔ اچھا۔ کچھ اور سہی، ایک عمدہ سا ہوسٹل کھول لو، نفیس کمرے، عمدہ کھانے، تھوڑا کرایہ، واجبی نرخ۔

شیام سندر۔ اظہر۔ مگر روپیہ —— ؟

بھیّالال۔ (ہنس کر اور واسکٹ کی جیب سے ہاتھ نکالتے ہوئے) اچھا یہ بھی نہ سہی، لو اب میں تمہیں ایک ایسا گُر بتاتا ہوں جو کبھی خطا نہیں ہو سکتا۔

شیام سندر۔ وہ کیا ہے؟

بھیّالال۔ عورت!

شیام سندر۔ عورت؟

بھیّالال۔ ہاں، ہاں، عورت، ایک عورت کا انتخاب کر لو جو نہایت جاہل ہو، اور ایک نہایت مالدار آدمی کی اکلوتی بیٹی ہو۔

شیام سندر۔ پھر؟

بھیّالال۔ پھر اُس سے شادی کر لو۔

اظہر۔ بھئی کیا خوب، تم تو تاریخ جاننے کے علاوہ عقلمند بھی ہو۔

شیام سندر۔ (دونوں آنکھیں بھیچ کر) ہُوں —— ہُوں!

اظہر۔ بھیّالال۔ "ہُوں۔ ہُوں" کا کیا مطلب؟

شیام سندر۔ (آنکھیں بند کیے ہوئے) ایک ایسی عورت بالکل میری نگاہ میں ہے!

بھیّالال۔ (گہری دلچسپی سے) کیا وہ ایک مالدار آدمی کی لڑکی ہے؟

شیام سندر۔ (سر ہلاتا ہے) "ہاں تو ——"

بھیّالال۔ اور —— اور —— اکلوتی لڑکی؟

شیام سندر۔ ہاں، اکلوتی بیٹی، بالکل اکلوتی۔

بھیالال۔ ارے یار، بتاؤ اُس کی شکل کیسی ہے، خوبصورت ہوگی؟

شیام سندر۔ وہ نہایت خوبصورت ہے، حسین، جیسے چاند کی کرن، نازک جیسے کنول کی پتّی، حیا پرور جیسے لاجونتی کی ڈالی بس کامنی سی مورت ہے، مَیں اُس سے محبّت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے محبّت کرتی ہے اور اُس کا مالدار باپ اپنی ساری دولت مجھے جہیز میں دے دینا چاہتا ہے۔

بھیالال۔ (بہت دلچسپی اور رشک و حسد کے ساتھ) ارے بتاؤ وہ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے، اُس کا نام کیا ہے؟

شیام سندر۔ (یکایک آنکھیں کھول کر) اوہ۔ وہ کدھر چلی گئی؛ وہ کون تھی؟ اُس کا کیا نام تھا؟

(شیام سندر۔ اظہر، بھیالال، تینوں یکایک قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں اور ایک منٹ تک ہنستے رہتے ہیں۔)

(ایک باوردی پولیس کا سپاہی آتا ہے۔)

سپاہی۔ آپ میں سے شیام سُندر کون ہے؟

(شیام سُندر اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

سپاہی۔ (ایک لفافہ آگے بڑھاتے ہوئے) سول ہسپتال میں چل کر ایک لاش کو شناخت کر لیجیے، وہ ریل گاڑی کے نیچے آ کر مر گیا ہے۔ اُس کی جیب سے آپ کا پتہ نکلا ہے۔

شیام سُندر۔ مسعود ــــــ آہ!

(اپنے ہاتھوں سے مُنہ کو چھپا لیتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

(کردار فرضی ہیں) کرشن چندر، ایم۔ اے

*

آؤ سلمیٰ

آؤ سلمیٰ، آؤ، ہم تم سبزہ زاروں میں رہیں
اور اُفق سے جھانکنے والی بہاروں میں رہیں

زندگی کی اُلجھنوں سے بے خبر ہو کر، کہیں
نیلے نیلے، اُونچے اُونچے کوہساروں میں رہیں

مرغزاروں میں بکھیریں اپنی رُوحوں کے خمار،
دُور تک پھیلے ہوئے سادہ نظاروں میں رہیں

جب گھٹائیں جھوم کر چُومیں جبینِ کوہسار
وادیوں سے بھاگ نکلیں ابر پاروں میں رہیں

اپنی ناکامی کے داغوں کو مٹانے کے لئے
میکدوں میں جا بسیں اور میگساروں میں رہیں

صبح جب معصوم پیشانی سے سرکائے نقاب
ہم بھی اُٹھیں اور شفق کے نشہ زاروں میں رہیں

رات کی خاموشیوں میں جنگلوں کی چھاؤں میں
یا سفینوں پر بسیں اور جوئباروں میں رہیں

ہائے یہ ساون، یہ بھیگے کھیت، یہ نکھرے پہاڑ
آؤ سلمیٰ، آؤ، اِن فردوس زاروں میں رہیں

یا پہن کر جوگیوں کا پیرہن، اِس دیس کے
بھولے بھالے سیدھے سادے خستہ حالوں میں رہیں

اِن میں بھی جب رُوح اُکتائے تو اے جانِ ندیمؔ
اُڑ چلیں اور آسمانوں کے ستاروں میں رہیں

احمد ندیم قاسمی بی۔اے

"شغل"

(میکسم گورکی کی یاد میں)

ذیل کا افسانہ جو مسٹر سعادت حسن منٹو نے میکسم گورکی کے نام سے معنون کیا ہے میکسم گورکی ہی کی تقلید میں لکھا گیا ہے اور بلا شبہ اس میں اس رُوسی ادیب کی صناعی کا دلکش رنگ جھلک رہا ہے۔ "ہمایوں"

یہ پچھلے دنوں کی بات ہے جب ہم برسات میں سڑک کو صاف کر کے اپنا پیٹ پال رہے تھے۔

ہم میں سے کچھ کسان تھے اور کچھ مزدوری پیشہ۔ چونکہ پہاڑی دیہاتوں میں روپے کا مُنہ دیکھنا بہت کم نصیب ہوتا ہے اس لئے ہم سب خوشی خوشی چھ آنے روزانہ پر سارا دن وہ پتھر ہٹاتے رہتے تھے جو بارشوں کے زور سے ساتھ والی پہاڑیوں پر سے لڑھک کر سڑک پر آگرتے تھے۔ پتھروں کو سڑک پر سے ہٹانا تو خیر ایک معمولی کام ہے، ہم تو اس اُجرت پر اُن پہاڑیوں کو ڈھانے پر بھی تیار تھے، جو ہمارے گردوپیش سیاہ اور ڈراؤنے دیوؤں کی طرح اکڑی کھڑی تھیں۔ دراصل ہمارے بازو سخت سے سخت مشقت کے عادی تھے، اس لئے یہ کام ہمارے لئے بالکل معمولی تھا۔ البتہ جب کبھی ہمیں سڑک کو چوڑا کرنے کے لئے پتھر کاٹنا ہوتے تو رات کو ہمیں بہت تکان محسوس ہوتی تھی۔ پٹھے اکڑ جاتے تھے اور صبح کو بیدار ہوتے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ تمام پتھر جنہیں ہم گذشتہ روز کاٹتے اور پھوڑتے رہے ہیں، ہمارے جسموں پر بوجھ ڈالے ہوئے ہیں۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔

ہمارا کام ہر روز صبح سات بجے شروع ہوتا تھا، جب طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طلائی کرنیں چیڑ کے دراز قد درختوں سے چھن چھن کر ہمارے پاس والے نالے کے خشم آلود پانی سے اٹکھیلیاں کر رہی ہوتیں اور آس پاس کی جھاڑیوں میں ننھے ننھے پرندے اپنے گلے پھُلا پھُلا کر چیخ رہے ہوتے۔ یوں کہئے کہ ہم قدرت کو اپنے خواب سے بیدار ہوتا دیکھتے تھے۔ صبح کی ہلکی پھلکی ہوا میں شبنم آلود سبز جھاڑیوں کی دلنواز سرسراہٹ، نالے میں سنگریزوں سے کھیلتے ہوئے کف آلود پانی کا شور اور برسات کے پانی میں بھیگی ہوئی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو، چند ایسی چیزیں تھیں، جو ہمارے سنگین سینوں میں ایک ایسی لطافت پیدا کر دیتی تھیں جو زندگی کی اس دوزخ میں ہمیں بہشت کے خواب دِکھلانے لگتی۔

ہمیں ہر روز بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا، یعنی سارا دن ہم سڑک کی موریوں اور پتھروں کو صاف کرتے رہتے تھے۔ یہ کام دلچسپ نہ تھا مگر ہم نے اِس کی ناخوشگوار یک آہنگی کو دُور کرنے کے لئے ایک طریقہ ایجاد کر لیا تھا کہ جب ہم سب اُس پہاڑی

کے نیچے جمع شدہ ملبے کو اپنے بیلچوں سے ہٹا رہے ہوتے جس کے سنگریزے ہر وقت سڑک میں کھٹکتے رہتے تھے، تو ہم ایک سُر میں کوئی پہاڑی گیت شروع کر دیتے۔ ملبے کے پتھروں سے ٹکرا کر ہمارے بیلچوں کی جھنکار اس گیت کی تال کا کام دیتی تھی۔ یہ گیت وہ افسردگی دُور کر دیتا جو یہ غیر دلچسپ کام ہمارے دلوں میں پیدا کر دیتا تھا۔ جب تک اس کے سُر ہماری چوڑی چھاتیوں میں سے نکلتے رہتے ہم محسوس تک نہ کرتے تھے کہ اس دَوران میں ہم نے ملبے کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو صاف کر لیا ہے۔

موٹر لاریوں کی آمد و رفت سے بھی ہمارا دِل بہلا رہتا تھا، جو رنگ برنگ مسافروں کو کشمیر سے واپس یا کشمیر کی طرف لے جاتی رہتی تھیں۔ جب کبھی کوئی لاری ہمارے پاس سے گزرتی تو ہم کچھ عرصے کے لئے اپنی جُھکی ہوئی کمروں کو سیدھا کر کے سڑک کے ایک طرف کھڑے ہو جاتے اور زمین پر اپنے بیلچے ٹیک کر اُس کو سامنے والے موڑ کے عقب میں گم ہوتے دیکھتے رہتے۔ اِن لاریوں کو اتنی دُور تک دیکھتے رہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم تھوڑا سا سستا لیں، مگر بعض اوقات اِن لاریوں کی شاندار اسباب سے لدی ہوئی چھتیں اور اِن کی کھڑکیوں سے مسافروں کے لہراتے ہوئے ریشمی کپڑوں کی جھلک ہمارے دِلوں میں ایک ناقابلِ بیان تلخی پیدا کر دیتی تھی اور ہم اپنے آپ کو اُن پتھروں کی طرح فضول اور ناکارہ تصوّر کرنے لگ جاتے تھے جن کو ہمارے بیلچوں کے دھکے اِدھر اُدھر پٹکتے رہتے تھے۔ اُن مسافروں کے طرح طرح کے لباس دیکھ کر جن پر یقیناً بہت سے روپے صرف آئے ہوں گے، ہم غیر ارادی طور پر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے تھے۔

ہم میں سے اکثر کا لباس پٹّو کے تنگ پائجامے، گاڑھے کی قمیص اور لُدھیانے کی صدری پر مشتمل تھا۔ سب کے پائجامے یا تو گھٹنوں پر سے گِھس گِھس کر اتنے باریک ہو گئے تھے کہ اُن میں سے جسم کے بالوں کی پُوری نمائش ہوتی تھی یا بالکل پھٹے ہوتے تھے۔ قمیصوں اور صدریوں کی بھی یہی حالت تھی۔ اِن پر جگہ جگہ مختلف رنگ کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ قریب قریب ہم سب کی قمیصوں کے بٹن غائب تھے، اس لئے سینے عام طور پر کُھلے رہتے تھے، اور کام کرتے وقت اِن پر پسینے کی بوندیں صاف نظر آ سکتی تھیں۔

بارہ بجے کے قریب ہم کام چھوڑ کر کھانا کھانے کے لئے سڑک کے نیچے اُتر کر ایک پیڑ کے سائے تلے بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کھانا ہم صبح کپڑے میں باندھ کر اپنے ساتھ لاتے تھے۔ تین "ڈھوڈے" (مکّی کی موٹی روٹیاں)، اور عام طور پر سرسوں کا ساگ ہوتا تھا جس کو ہم اپنے بھوکے پیٹ میں ڈال لیتے تھے۔ کھانے کے بعد ہم پانی عموماً "نالے" سے پیا کرتے تھے اور جس روز بارش کی زیادتی کے باعث اس کا پانی زیادہ گدلا ہوتا تھا تو ہم دُور سڑک کے اُس پار چلے جایا کرتے تھے جہاں صاف پانی کا ایک چشمہ پھُوٹتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم فوراً کام شروع کر دیا کرتے تھے۔ گو ہمارا جی چاہتا تھا کہ نرم نرم گھاس پر لیٹ کر تھوڑی دیر کے لئے سستا لیں اور پھر کام شروع کریں مگر یہ کیونکر ہو سکتا تھا جب کہ ہمیں ہر وقت اس بات کا خیال رہتا تھا کہ پُورا کام کئے بغیر اُجرت نہ ملے گی۔ ہمارا مطمح نظر کام کرنا اور اس حیلے سے اپنا پیٹ پالنا تھا۔ اور چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ اگر ہم نے اپنے کام میں ذرا سی سُست

رفتاری یا بے دلی کا اظہار کیا تو تاش کی گڈی سے ناکارہ جوکر کی طرح باہر نکال کر پھینک دیا جائے گا، اس لئے ہم دل لگا کر کام کیا کرتے تھے تاکہ ہمارے افسروں کو شکایت کا موقعہ نہ ملے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارے افسر ہم پر بہت خوش تھے، یہ کیونکر ہو سکتا تھا، وہ بڑے آدمی ٹھیرے، اس لئے اُن کا جائز و ناجائز طور پر خفا ہونا بھی درست ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ لوگ ایسے ہی ہمارے کام کا معائنہ کرتے وقت اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے ہم پر برس پڑتے تھے، لیکن ہم جو اُن کی بڑائی کو خوبی سمجھتے تھے، مہاراج، مہاراج کہہ کر اُن کا غصّہ سرد کر دیا کرتے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ اُن کا غصّہ بالکل بے جا ہے، لیکن یہ احساس ہمارے دلوں میں نفرت کے جذبات نہیں پیدا کرتا تھا۔ شاید اس لئے کہ گورنمنٹ نے ہم کو بالکل مردہ بنا رکھا تھا یا پھر اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہم کو یہ خوف دامنگیر رہتا تھا کہ اگر ہم اپنے موجودہ کام سے ہٹا دیئے گئے تو ہماری روزی بند ہو جائے گی۔

ہم اپنے کام سے مطمئن تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہم تھوڑی مزدوری اور زیادہ کام کے مسئلے پر بہت کم غور کیا کرتے تھے، اس کی ضرورت بھی کیا ہے اس لئے کہ یہ کام پڑھے لکھے آدمیوں کا ہے اور ہم بالکل اَن پڑھ اور جاہل تھے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہماری دُنیا بالکل الگ تھلگ تھی، جس کی سرحد میں پتھر توڑنے یا اُن کو ہٹانے، بارہ بجے روٹی کھانے، اور پھر کام کرنے اور اس کے بعد اپنے اپنے ڈیروں میں سو جانے تک ختم ہو جاتی تھیں۔ ہمیں ان حدُود کے باہر کسی شے سے کوئی سروکار نہ تھا، دوسرے الفاظ میں اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پالنے کے دھندے میں ہم کچھ ایسی بُری طرح پھنس کر رہ گئے تھے کہ اس کے باہر نکل کر ہم کسی اور شے کی خواہش کرنا ہی بھول گئے تھے۔

ہمارے کام پر سڑکوں کے محکمے کی طرف سے ایک نگراں مقرر تھا جو دن کا بیشتر حصّہ سڑک کے ایک طرف چارپائی بچھا کر بیٹھا رہتا تھا۔ یہ ذات کا پنڈت تھا۔ اُونچے طبقے کا امتیازی نشان سیندور کے تِلک کی صُورت میں ہر وقت اُس کی سفید پیشانی پر چمکتا رہتا تھا۔ ہم اپنے نگراں کو احترام اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اوّل اس لئے کہ وہ برہمن تھا اور دُوسرے اس لئے کہ ہم اُس کے ماتحت تھے۔ چنانچہ اِدھر اُدھر کے دُوسرے کاموں کے علاوہ ہم باری باری دن میں کئی بار اُس کے پینے کے لئے حقہ تازہ کیا کرتے تھے اور آگ بنا کر اُس کی چلمیں بھرا کرتے تھے۔

پنڈت کا کام صرف یہ تھا کہ وہ صبح چارپائی پر اپنے گیرُوے رنگ کی کلف لگی پگڑی اور ریشمی کوٹ اُتار کر اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہماری حاضری لگائے اور پھر ایک بڑے سے رجسٹر میں کچھ درج کرنے کے بعد اِدھر اُدھر ٹہلتا رہے یا حقہ پیتا رہے۔ وُہ اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لیتا تھا، البتہ جب کبھی معائنے کے لئے کسی افسر کی موٹر اُدھر سے گزرنا ہوتی تھی تو وہ اپنی چارپائی اُٹھوا کر ہمارے پاس کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ اُس کی اس چالاکی پر ہم دل ہی دل میں بہت ہنسا کرتے تھے۔

ایک روز جب کہ صبح سے ہلکی ہلکی پھوار گر رہی تھی اور ہم بارہ بجے کھانا کھانے سے فارغ ہو کر حسبِ معمول اپنے کام میں مشغول

تھے، موٹر کے ہارن نے ہمیں چونکا دیا۔ لاریوں کی بہ نسبت ہم موٹروں کو دیکھنے کے بہت شائق تھے۔ اس لئے کہ ان میں ہماری بھوکی نظروں کے دیکھنے کے لئے عجیب و غریب چیزیں نظر آتی تھیں ـــــ ہم کمریں سیدھی کر کے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں موڑ کے عقب سے ایک سبز رنگ کی چھوٹی موٹر نمودار ہوئی۔ جب یہ ہمارے قریب پہنچی تو ہم نے دیکھا کہ اس کی باڈی بارش کے ننھے ننھے قطروں کے پیچھے چمک رہی تھی۔ یہ بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی، شاید اس لئے کہ پچھلی سیٹ پر جو دو صاحب بیٹھے ہوئے تھے، ان میں سے ایک اپنی رانوں پر گراموفون رکھے بجا رہے تھے۔ جب یہ موٹر ہمارے مقابل آئی تو ریکارڈ کی آواز سڑک کے ساتھ والی پہاڑی کے پتھروں سے ٹکرا کر فضا میں گونجی۔ کوئی گا رہا تھا:۔

نہ میں کسی کا، نہ کوئی میرا   چھایا چاروں اُور اندھیرا

اب کچھ سُوجھت ناہیں، موہے، اب کچھ۔۔۔۔۔!

آواز میں بے حد درد تھا۔ ایک لمحے کے لئے ایسا معلوم ہوا کہ ہم شاید بحرِ ظلمات میں ڈوب گئے ہیں۔ جب موٹر اپنی نیم وا کھڑکیوں سے اس گیت کے دردناک سُر بکھیرتی ہوئی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ہم سب نے ایک ایک آہ بھر کر اپنا کام شروع کر دیا۔

شام کے قریب جب سُورج کی سُرخ اور گرم ٹکیا پگھلے ہوئے تانبے کا رنگ اختیار کر کے ایک سیاہ پہاڑی کے پیچھے چھپ رہی تھی اور اُس کی عنابی کرنیں دراز قد درختوں کی چوٹیوں سے کھیل رہی تھیں، سبز رنگ کی وُہی موٹر اُس طرف سے واپس آتی دکھائی دی، جدھر وہ دوپہر کو گئی تھی۔ جب ہم نے اُس کے ہارن کی آواز سُنی تو ہم کام چھوڑ کر اُس کو دیکھنے لگ گئے۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ ہمارے آگے سے گزر گئی اور پھر دفعتہً ہم سے آدھی جریب کے فاصلے پر کھڑی ہو گئی، وہ باجا جو اس میں بج رہا تھا خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پچھلی سیٹ سے ایک نوجوان دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اپنی پتلون کو کمر پر سے درست کرتا ہوا ہمارے پاس سے گزرا اور آہستہ آہستہ اس پُل کی طرف روانہ ہو گیا جو سامنے نالے پر بندھا ہوا تھا۔ یہ خیال کر کے کہ وہ نالے کے پانی کا نظارہ کرنے کے لئے گیا ہے، جیسا کہ عام طور پر ادھر سے گزرنے والے مسافر کیا کرتے ہیں، ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

ابھی ہمیں اپنا کام شروع کئے پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو گا کہ پُل کی طرف سے تالی کی آواز بلند ہوئی۔ ہم نے مُڑ کر دیکھا، پتلون پوش نوجوان پُل پر سے سڑک کے ساتھ پتھروں سے چُنی ہوئی دیوار کے پاس کھڑا غالباً گھوڑ میں اپنے دو ساتھیوں کو متوجہ کر رہا تھا۔ اس سنگین منڈیر پر نوجوان سے کچھ دُور ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

ہم میں سے ایک نے اپنے بیلچے کو بڑے زور سے بوری کی گیلی مٹی میں گاڑتے ہوئے کہا "یہ رام دئی ہے!"

کالو نے جو اس کے پاس کھڑا تھا دریافت کیا۔ "کون رام دئی؟"

"سنتو چمار کی لڑکی اور کون؟" —— اُس کے لہجے میں بیلچے کے لوہے ایسی سختی تھی۔

ہم باقی چار حیران تھے کہ اس گفتگو کا مطلب کیا ہے۔ اگر وہ لڑکی جو منڈیر پر بیٹھی تھی سنتو چمار کی لڑکی تھی تو یہ کون سی اہم بات تھی کہ ہمارا ساتھی اس قدر تیز بول رہا تھا۔ ہم غور ہی کر رہے تھے کہ فضل نے جو ہم سب سے عمر میں بڑا تھا اور نماز روزے کا بہت پابند تھا، اپنی داڑھی کو کھجلاتے ہوئے نہایت ہی متفکرانہ لہجے میں کہا۔

"دُنیا میں ایک اندھیر مچا ہے . . . . . خدا معلوم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے!"

یہ سُن کر ہم باقی تین اصل معاملے سے آگاہ ہو کر سب کچھ سمجھ گئے، اور اس احساس نے ہمارے دلوں پر غم اور غصے کی ایک عجیب و غریب کیفیت طاری کر دی۔

تالی کی آواز سُن کر موٹر کی پچھلی نشست سے پتلون پوش کے ساتھی نے اپنا سر باہر نکالا اور یہ دیکھ کر کہ اُس کا دوست اُسے بُلا رہا ہے، وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ہمارے قریب سے گزرتا ہُوا ٹیل کی جانب روانہ ہو گیا —— ہم بے وقوف بکریوں کی طرح اُسے اپنے دوست کے پاس جاتا دیکھتے رہے۔

جب پتلون پوش نوجوان کا دوست اُس کے پاس پہنچ گیا تو وہ دونوں لڑکی کی طرف بڑھے اور اُس سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ یہ دیکھ کر کالو پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اور خشم آلود لہجے میں کہا:-

"آہ، یہ بدمعاش . . . . . . !"

فضل نے سرد آہ بھری اور مغموم لہجے میں کہنے لگا "جب سے یہ سڑک بنی ہے اور ایسے بابوؤں کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی ہے، یہاں کے تمام علاقوں میں گندگی پھیل گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سڑک بننے سے بہت آرام ہو گیا ہے، ہوگا، مگر اس قسم کے بے شرمی کے نظارے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آتے تھے —— خدا بچائے!"

اس دَوران میں پتلون پوش کے ساتھی نے لڑکی کو بازو سے پکڑ لیا اور غالباً اُس کو اُٹھ کر چلنے کے لئے کہا، مگر وہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ یہ دیکھ کر کالو سے نہ رہا گیا اور اُس نے رام پرشاد سے کہا "آؤ یہ لوگ تو اب دست درازی کر رہے ہیں۔"

کالو یہ کہہ کر اکیلا ہی اُس جانب بڑھنے کو تھا کہ ہم نے اُسے روک دیا اور یہ مشورہ دیا کہ تمام معاملہ پنڈت کے گوش گزار کر دیا جائے، جو اپنی چارپائی پر سو رہا تھا اور پھر جو وہ کہے اُس پر عمل کیا جائے۔ اِس تجویز کو معقول خیال کر کے ہم سب پنڈت کے پاس گئے اور اُسے جگا کر سارا واقعہ سُنا دیا۔ اُس نے ہماری گفتگو کو بڑی بے پروائی سے سُنا، جیسے کوئی بات ہی نہیں اور اُن دو نوجوانوں کی طرف دیکھ کر جو اب رام دئی کو خدا معلوم کس طریقے سے منا کر اپنے ساتھ لا رہے تھے کہا:-

"جاؤ تم اپنا کام کرو۔ میں اِن سے خود دریافت کر لوں گا۔"

یہ جواب سُن کر ہم بے چارگی کی حالت میں اپنے کام پر آگئے، لیکن ہم سب کی نگاہیں رام دئی اور اُن دونوں جوانوں پر جمی ہوئی تھیں جو اب پُل طے کر کے پنڈت کی چارپائی کے قریب پہنچ رہے تھے۔ لڑکے آگے تھے اور رام دئی تھکی ہوئی گھوڑی کی طرح اُن کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ جب وہ سب پنڈت کے آگے سے گزرنے لگے تو وہ چارپائی پر سے اُٹھا اور دو تین منٹ تک اُن سے کچھ باتیں کرنے کے بعد وہ بھی اُن کے ساتھ لیا۔

جب پنڈت رام دئی اور وہ دونوں جوان ہمارے پاس سے گزرے تو ہم نے دیکھا کہ نوجوانوں کے چہروں پر ایک حیوانی جھلک ناچ رہی تھی اور پنڈت بڑے ادب سے اُن کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ رام دئی کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

موٹر کے پاس پہنچ کر پنڈت نے بڑھ کر اُس کا دروازہ کھولا۔ پہلے پتلون پوش، پھر رام دئی اور اُس کے بعد دوسرا نوجوان موٹر میں داخل ہو گئے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے موٹر چلی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی اور ہم آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

"آہ، شیطان، مردود !!" کالو نے بڑے اضطراب سے یہ تین لفظ ادا کئے۔

اتنے میں پنڈت آ گیا اور ہم کو مضطرب دیکھ کر ایک مصنوعی سی آواز میں کہنے لگا "میں نے اُن سے دریافت کیا ہے، کوئی بات نہیں، وہ لڑکی کو ذرا موٹر کی سیر کرانا چاہتے تھے۔ انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں اور ڈاک بنگلے میں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دُور سے جا کر وہ اُسے چھوڑ دیں گے —— امیر آدمیوں کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں۔"

یہ کہہ کر پنڈت چلا گیا۔

ہم دیر تک خدا معلوم کن گہرائیوں میں غرق رہے کہ دفعتہً فضل کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ دو مرتبہ زور سے تھوک کر اُس نے اپنے ہاتھوں کو گیلا کیا اور بیلچے کو سنگریزوں کے ڈھیر میں گاڑتے ہوئے کہا "اگر امیر آدمیوں کے یہی شغل ہیں تو ہم غریبوں کی بہو بیٹیوں کا اللہ بیلی ہے !"

سعادت حسن منٹو

کبوتر!

حسبِ معمول وہی اپنے لوٹن نے پر تول کر فضا میں پرواز کی اور کچھ دیر میں نظر سے غایب ہوگیا۔ اُوپر ہی اُوپر ٹھنڈی ہوا کھا کر اور خوب جی بھر کر تفریح کرنے کے بعد وُہ تیر کی طرح صحن میں اُتر دانہ چگنے میں مصروف ہو گیا۔ مگر دیکھا تو کچھ غیر معمولی طور پر ہانپ رہا تھا۔ خیریت طلبی کے لئے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بجائے اُردو کے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں 'غٹرغوں' بول رہا ہے۔ یہ متحیر کُن بولی اور نیا لب ولہجہ تو مجھے پسند نہ آیا تعجب تھا کہ اپنی عام فہم بولی اور قدیم وضعداری کو چھوڑ کر کس طرح ایک غیر مانوس گورکھ دھندے میں پھنس گیا۔ تشویش یہ تھی کہ اگر اس کی ہذیانی کیفیت کا یہی عالم رہے تو اپنے لئے ایک آدھ اچھے اور ذرا چندیا صاف پنڈت جی کو بطور استاد ملازم رکھنا ہوگا۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ درپیش ہؤا تھا۔ سوال یہ پیشِ نظر تھا کہ آخر اِس غریب اور سیدھے سادے پرندہ کو کون سی ایسی صحبتِ ناجنس مِل گئی کہ اپنی قدیم چال کو چھوڑ کر کوے کی طرح ہنس کی چال چلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ خیال ہؤا کہ اگر کسی گردن توڑ یا دماغی بخار نے اس غریب پر حملہ کیا ہو تو بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ اس ہیبتناک خیال کے پیدا ہوتے ہی مریض کو ایک ہاتھ میں لے محلّہ کے حکیم جی کے پاس پہنچ کر عرض کی کہ حضرت ذرا نبض دیکھ کر بتلا دیجئے کہ اِس غریب پر کیا واردات گزر رہی ہے۔ آپ تو بڑے بڑے انسانوں کا حال نبض پر اُنگلی دھرتے ہی بتا دیتے ہیں۔

حکیم صاحب نے فرمایا۔ ہاں بات تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر اس پرندہ کی نبض ذرا مشکل سے ملتی ہے۔ خیر کوئی پروا نہیں صرف آنکھ مِلا کر حال بتائے دیتے ہیں۔

میں نے کہا۔ حضرت! حال وال کچھ نہیں مرض مہلک ہے کوئی اچھا سا جوشاندہ تجویز فرمایئے۔ حکیم صاحب نے اپنا ہاتھ بڑے زور سے ہلا کر فرمایا۔ آپ ٹھہریئے تو، میں دیکھ لوں کہ مرض نے کس عضو پر حملہ کیا ہے۔ حکیم جی کبوتر پر اس طرح جُھک گئے گویا اس کو زندہ کھا جانے کے فکر میں ہیں۔ کچھ دیر بعد چونکے اور اپنی گردن کو جو بڑی دیر سے جُھکی ہوئی تھی سنبھال کر رُکتے ہوئے فرمایا۔ بھائی، دل، دماغ، معدہ، جگر سب ہی تو ٹھیک ہیں۔ باوجود کرۂ اتی سردی کے اس کو زکام تک نہ ہؤا۔ مگر ایک چیز پر ہماری نظر پڑی ہے۔ وہ یہ کہ ذرا سی دیر کے لئے اس پرندہ کا شعور متاثر ہوا ہے۔ اس نئی بیماری کا نام سُن کر پہلے تو میں نے اپنی قوتِ کو کبوتر اور حکیم جی میں متوازن کیا اور پھر گزارش کی کہ حضرت آپ تو مسیحائے وقت ہیں، تشخیص کہیں اور نہ سہی اس محلہ میں تو ضرور مانی ہوئی ہے۔ ذرا اِس مرض کی تشریح کیجیے تاکہ ایک طرف تو میرے معلومات میں اضافہ ہو اور دوسری طرف اس کبوتر کے بچے جو آج کل میں انڈوں سے برآمد ہونے والے ہیں، تمام عمر آپ کی حکمت کو دُعا دیتے رہیں۔ اس درخواست کو سُن کر حکیم صاحب کچھ دیر تک تو غور وخوض میں مصروف رہے اور پھر کھونک کر پروفیسرانہ شان میں فرمایا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان اور حیوان دونوں میں شعور ہوتا ہے۔ اور اس

شعور کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک شعور لسانی بھی ہے۔ مختصر یہ کہ اس کبوتر کا شعور لسانی بُری طرح متاثر ہوا ہے۔"

میں نے گھبراہٹ سے کہا۔ "متاثر تو ہوا ہے لیکن اس مرض کی کوئی دوا آپ کے پاس ہے بھی یا نہیں"۔

کہنے لگے۔ "بھائی۔ اگر کہو تو تمہاری خاطر اس کا علاج شروع کر دوں مگر سمجھ لو کہ بیماری جدید قسم کی ہے اور بالکل غیر ملکی آب و ہوا سے پرورش پا کر پرانے امراض میں ایک نئے مرض کے اضافہ کا باعث ہو رہی ہے۔ علاج طبی ہے، چھ دن کے بعد دوا کا اثر شروع ہوگا۔ آپ کو تو جلدی ہے۔ اس لئے ڈاکٹر ہنٹ صاحب کے پاس لے جائیے۔ سُنا ہے کہ اس مرض کا ایک سریع الاثر انجکشن ان کے پاس موجود ہے"۔

میں نے کہا۔ "یہ صحیح ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انجکشن کا خرچ کبوتر کی قیمت سے زیادہ ہوگا یا کم؟"

جواب ملا۔ "یہاں اس سے کیا تعلق؛ فیس ڈاکٹر کی جیب میں اور کبوتر آپ کے ملازم کے ہاتھ میں"۔

ڈاکٹر صاحب کی ڈسپنسری کا پتہ پوچھ کر روانہ ہوا۔ اتفاق کہئے کہ موصوف دواخانہ ہی میں موجود تھے۔ ملاقات ہوئی۔ پورا حال سُنا۔ مختصر یہ کہ ہنٹ صاحب بڑے اچھے آدمی ثابت ہوئے، انہوں نے دوا کی قیمت اور اپنی محنت دونوں کو جمع کر کے تقریباً پونے پانچ روپیہ کا بل ایک ہاتھ میں اور نیم بیہوش کبوتر دوسرے ہاتھ میں دیا۔ اور اس سے پیشتر کہ میں بل کے غیر معمولی بوجھ کو اپنے ہاتھ پر محسوس کر سکوں، یقین دلایا کہ گھر پہنچنے تک پرندے کی اپنی اصلی زبان عود کر آئے گی۔ میں نے اس کو غنیمت سمجھا اور کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کا غیر معمولی شکریہ ادا کرنے کے بعد گھر پہنچا اور مریض کو ایک چھوٹے سے سٹول پر بٹھا کر حالات کے مطالعہ میں منہمک ہوگیا۔ بڑی دیر بیہوش رہنے کے بعد بیچارے کو کچھ ہوش سا آیا۔ اور آنکھیں کھولتے ہی پہلی آواز جو اس کے حلق سے نکلی غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کسی اجنبی زبان میں تھی، یعنی ڈاکٹر صاحب کی زبان میں! پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہوشیاری سے اپنی زبان کو گرم کر کے اس مکسچر کا ایک انجکشن دے دیا تھا۔ اور جناب والا ایک عرصہ سے اس طرح اپنی زبان کو پھیلا رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ پروپیگنڈا کی یہ قسم نہایت کامیاب و بے خطا رہی جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارا کبوتر آج کل انگریزی میں خوب فر فر اٹے سے "غٹرغوں" کیا کرتا ہے۔ اور نہیں معلوم اس کی آئندہ نسل کس زبان میں گفتگو کرے گی۔ اُردو میں۔ ہندی میں ہندوستانی میں یا انگریزی میں؛ یا زبانوں کی اس بھرمار سے دب کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گی۔

محمد منیر الدین

دو غزلیں

صدق جائسی

دل میں رہتے رہتے ربط آپس میں ایسا ہو گیا
جو ترا ارماں تھا وہ میری تمنا ہو گیا

دوست دشمن بن گیا، اپنا پرایا ہو گیا
آپ مجھ سے کیا کھنچے، دم بھی کشیدا ہو گیا

نجد پر کیا منحصر ہے، مصر ہو یا کوہِ طور
جس جگہ جلوت میں آیا حسن رسوا ہو گیا

روز اک تازہ قیامت سے ہے مجھ کو سامنا
دو قدم اُٹھ کر چلا وہ حشر برپا ہو گیا

بات کرنا اُن سے مشکل ہے کہ ہیں نازک مزاج
شکر ادا کرنے بھی میں بیٹھا تو شکوا ہو گیا

اک مجھی پر اب نہیں یا تھی مجھی پر وہ نگاہ
ابتدا کے رنگ سے فرق انتہا کا ہو گیا

لے چکے ہیں دل تو اب آنکھیں ملاتے ہی نہیں
کیا کہوں اے صدق، کیا سمجھا تھا میں کیا ہو گیا

فہیم گوالیاری

بہار آئی گلشن نکھارے گئے
گل و سرو و سنبل سنوارے گئے

خطا کار لاکھوں اُبھارے گئے
یہاں خیر خواہی میں مارے گئے

عجب چیز تھی آہِ آتش فشاں
سرِ عرش جس کے شرارے گئے

جو پہنچا چمن میں مرا گلعذار
ہزاروں ہی صدقہ اُتارے گئے

بہت سخت تھے ہجر کے چند روز
بڑی مشکلوں سے گزارے گئے

وہ عالم تصور میں ہے ہمنشیں
جہاں میری آنکھوں کے تارے گئے

نہ آنا تھا اُن کو نہ آئے فہیم
پُکارے گئے ہم، پکارے گئے

افسانۂ مبلغ علیہ السلام

میں اسٹرینڈ روڈ کلکتہ میں پیدا ہوا۔ اور لطف تو یہ کہ بالکل جوان۔ عہدِ طفلی کا حال نہ کچھ سُنا اور نہ گزارا۔ میرا چہرہ حسین اور نکھرا۔ اعضا متناسب، رنگ روپہلا اور آواز سُریلی اور دلکش تھی۔ میں اپنے دوستوں میں بہت ہی خوش و خرم تھا مگر لوگ مجھے بہت تنگ کیا کرتے تھے۔ کسی نے گن کر اُدھر کر دیا، کسی نے سجا کر دوسری طرف رکھ دیا۔ آخر میں ایک کاغذی پیرہن میں لپٹا لپٹایا پڑا رہا۔ میرے بہت سے ساتھی ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ چکے تھے۔ میری طبیعت واماندگی کی وجہ سے بہت مضمحل ہو گئی۔ اِس لئے میں نے بھی یہاں سے ہوڑہ پُل عبور کر کے بھاگ جانا چاہا ــــ اتفاقاً ایک دن ایک گرم گرم ہاتھ مجھ پر پڑا۔ میں اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے ساتھ باہر نکلا اور ایک جالی دار تھیلی میں شُکر کا کلمہ پڑھ کر بیٹھ گیا۔ تھیلی بہت ہی مَیلی کچیلی اور بدبودار تھی۔ مَیں نے اپنے ساتھیوں سے پُوچھا جانتے ہم لوگوں کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اُنہوں نے آہ بھر کے کہا "ابھی ہم لوگ جوان ہیں۔ بے فکری ہے وہ وقت بہت ہی قریب ہے کہ ہم لوگ جُدا کر دیئے جائیں گے۔ اپنی اپنی قسمت کا اُس وقت فیصلہ ہو جائے گا، کسی کی مزے میں گزریگی کوئی اس تھیلی سے بھی بدتر حالت میں رہے گا۔"

جونہی یہ جواب ختم ہوا۔ یکایک ایک آواز آئی "کیا آپ ایک نوٹ کے دس روپے عنایت کر سکتے ہیں؟" جواب ملا "آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں نوٹ کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مگر چونکہ آپ کلکتہ میں شاید نووارد ہیں اس لئے آپ کی خاطر منظور کی جاتی ہے۔" میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ تھیلی سے نکالا گیا اور میز پر سجائے جانے کے بعد اس نوجوان کی جیب میں تھا۔ وہاں سے میں روانہ ہوا، شام کے وقت وہ جوان گرانڈ ہوٹل میں پہنچا۔ ہیسٹنگ اسٹریٹ سے ایک دوشیزہ بھی اس کے ہمراہ ہولی تھی۔ جوان نے خوب جی کھول کر جامِ محبت لنڈھائے، مہ لقا شباب میں گلاب کی طرح بسی ہوئی تھی اور بڑی چنچل معلوم ہوتی تھی۔ آخر میں منیجر صاحب نے آٹھ روپے کے بل پیش کئے۔ جوان نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مگر چونکہ مَیں اب کلکتہ میں رہنا نہیں چاہتا تھا، جیب کے ایک کونے میں دبک گیا اور میرے ساتھی ہوٹل کی نذر ہو گئے۔ مجھے اس جوان کے پاس رہنا بہت ہی مرغوب تھا۔ یہ بھی جوان تھے اور مَیں بھی جوان۔ دوسرے ان کے عادات و خصائل بھی بہت ہی پاکیزہ تھے۔ ہوٹل سے وہ سینما کا قصد کر رہے تھے۔ مَیں بہت ڈرا اور فی الواقع میری جان خطرہ میں تھی بھی۔ مگر اس دوشیزہ کے انکار سے جان میں جان آگئی۔ رات بھر میری مزے میں گزری۔ صبح ہوئی تو میرا کلیجہ پھر دھڑکنے لگا۔ مگر خیر سے میری طرف اشارہ تک نہ ہوا۔ شام کو یہ جوان پٹنہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ان کا مکان بھی پٹنہ میں تھا۔ یہ کاروباری آدمی معلوم ہوتے

تھے۔ اور کاروبار ہی کے ضمن میں کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ ٹکٹ گھر کے سامنے میں از حد ڈرا مگر نہیں یہ صاحب پہلے ہی ٹکٹ خرید چکے تھے فوراً گاڑی پر سوار ہو گئے۔ اور دوسری صبح کو خیر و خوبی سے پٹنہ پہنچ گئے۔ مگر موٹر کے ٹھیک وقت پر نہ پہنچنے سے ٹانگہ ہی پر سوار ہو گئے۔ اب میری خیریت کی کوئی صورت نہ تھی۔ کیونکہ جیب میں صرف میں ہی میں تھا۔ ٹانگہ ایک عالیشان مکان کے پاس رُکا۔ جوان کے نازک اور گدگدے ہاتھ نے مجھ کو مَس کیا اور میں آن کی آن میں ٹانگے والے کی جیب میں تھا۔ یہ ایک گندی کوٹھڑی تھی۔ اس میلی کچیلی جیب کی بدبُو میرے دماغ کو پریشان کئے جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس میں بیڑی کے جلے ہوئے چھوٹے ٹکڑے اور دیا سلائی کی چند کانٹیاں جن سے کان بھی صاف کئے گئے تھے اور بھی ظلم ڈھا رہے تھے۔ یہاں میری تراش کے مگر مجھ سے چھوٹے سانولے رنگ کے کئی صاحب ملے۔ میں اُسی وقت تاڑ گیا کیونکہ جب میں کلکتہ میں تھا تو میرے پُرانے ساتھیوں نے جو وہاں مکرر ڈھلنے والے تھے اس کا پتہ بتایا تھا کہ اس قوم کی تعداد ہم لوگوں سے بہت ہی زیادہ ہے اور بڑے بے حیا اور دلیر ہوتے ہیں۔ میری طبیعت یہاں ذرا نہ لگی بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ جب ٹانگہ والا کسی غرض سے جیب میں ہاتھ ڈالتا میں اُچک کر اس کے ہاتھ میں چلا جاتا۔ اس پر طرہ یہ کہ گھر پہنچتے ہی ٹانگے والے کی بیوی نے خوب شرارت کی۔ مجھے ایک زنگ آلود ڈبے میں بند کر دیا اور اس پر بس نہ کی بلکہ ایک ٹین کے صندوقچہ میں جس میں صرف دو ایک پھٹے پُرانے کپڑے تھے رکھ کر قفل لگا دیا۔

یہاں رہتے رہتے جینا اجیرن ہو گیا۔ اور میں فرطِ غم سے نڈھال رہنے لگا۔ تقریباً ایک مہینہ اسی طرح گزرا تھا کہ ایک مزدور دروازے پر کسی کے پکارنے کی آواز سُنی "قرضہ ادا کرو قریب تین ماہ کے بیت گئے"۔ تانگے والے کی بیوی نے صندوقچہ کھول ڈبا نکالا۔ اور مجھے کئی ساتھیوں کے ساتھ سود خوار کو دے دیا۔ میں خوش تھا کہ اس ناپاک اور گندی جگہ سے نجات ملی۔ مگر انہوں نے بھی ہم لوگوں کو ایک تاریک غار میں لا دھکیلا۔ میں یہاں بھی بہت گھبرایا۔ مگر اس ٹانگے والے کے گھر سے نسبتہً یہ بہتر تھا۔ کیونکہ یہاں دُنیا کے حالات سے وقتاً فوقتاً آگاہی ہو جایا کرتی تھی۔ جب کوئی نووارد اس غار میں قدم رنجہ فرماتا تھا میرا بہت سا وقت آہ و زاری میں گزرتا۔ اس پر ایک دن ایک سال خوردہ نے کہا "بھئی تم کیوں اتنی آہیں بھرتے رہتے ہو۔ ابھی تمہیں یہاں آئے ہوئے کامل چھ ماہ بھی تو نہیں ہوئے۔ ارے ہم لوگوں کو دیکھو، قریب چھ سال کے ہو گئے۔ یہاں پڑے ہوئے سسک رہے ہیں اور کوئی پرسانِ حال نہیں"۔ اس نے مجھے بہت دلاسا دیا، مگر مجھے پھر بھی رونا آتا تھا۔ کیونکہ وہاں صرف بڈھے ہی بڈھے تھے اور جو جوان تھے ان کو بھی بوڑھوں نے ایسا دبا لیا تھا کہ بات کرنے کا موقع بھی نہیں میسر ہوتا تھا۔

یہاں مجھے کامل ایک سال بیت گیا۔ مگر باہر جانے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی۔ ایک شب کو ابھی روتے روتے چپ ہی ہوا تھا اور آنکھیں نیم وا ہی تھیں کہ کچھ کھڑکھڑاہٹ کی آواز اس خاموش فضا کو چیرتی ہوئی میرے کان میں آئی۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اور میں کانپ گیا کہ معلوم نہیں یہ کونسی بلا اس تاریک شب میں نازل ہو رہی ہو۔ یک بیک غار کا ڈھکنا کھلا اور ایک آہنی پنجہ میری گردن

پر پڑا میں نے اس کی گرفت سے بھاگنا چاہا اور بھاگ بھی گیا۔ مگر دوسری دفعہ پھر وہی کیفیت دیکھی اور آن واحد میں غار خالی ہو گیا۔
گھر کے باہر بہت سے دیو قد آدمی کھڑے تھے۔ اس منظر نے میرا کلیجہ اور بھی دہلا دیا۔ وہ سب ہم لوگوں کو لے کر بھاگے۔ مگر میں نے موقع پاتے ہی گھر سے ذرا دُور جا کر ایک چھلانگ ماری اور گھاس کی پتیوں کے دامن میں اپنا تن بدن چھپا لیا۔ میں نے بہت سوچا مگر یہ معما حل نہ ہو سکا کہ یہ لوگ کون تھے۔ صبح ہوئی تو بہت شور و شغب سنا کہ فلاں کے یہاں چوری ہو گئی۔ تب سمجھا کہ وہ سب چور ہی تھے۔ سو دل کھول کر خوب رویا۔ روتے روتے اس کی گھگی بندھ گئی۔ میں وہیں پڑا رہا۔ دن میں بیساکھ کی چلچلاتی دھوپ اور رات کو شبنم کی بارش سے بالکل اکڑ گیا۔ مگر میری حالت میں کوئی تبدیلی ہونا تھی نہ ہوئی۔ آخر ایک دن ایک شریف خوش پوش کی نظر مجھ پر پڑی۔ اُنہوں نے مجھے دوڑ کر ہاتھوں میں اُٹھا لیا۔ میرے چہرے کے بدنما داغ دھبوں کو غازہ مل کر دُور کیا اور جسم کو ایک خوبصورت لباس سے ڈھانک دیا۔
میں اب تاج محل آگرہ میں تھا۔ کیونکہ یہ شریف جوان سیاح معلوم ہوتے تھے۔ جب اُنہوں نے مجھے ایک خوشبودار ریشمی کمرے میں رکھا اس وقت وہاں میری قوم کے کئی اور لوگ موجود تھے۔ اُنہوں نے سب حال بتایا۔ میں بہت خوش ہوا۔ دل وفورِ مسرت سے اُچھل پڑا۔ مجھے ایسے ہی لوگوں کے پاس رہنے سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جونہی میں نے تاج کے دروازے پر قدم رکھا حیرت، خوشی اور افسردگی کی مجموعی کیفیت دل پر طاری ہو گئی۔ میں نے تاج محل کے گوشہ گوشہ کو اپنے مالک کے ساتھ چھان مارا۔ اس کے نقش و نگار اور پھول پتیوں کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کی چمک دمک نے میری آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ وہاں ہزاروں طرح کے صنعت و حرفت کے نمونے موجود ہیں اور یہ اتنا حسین ہے کہ اگر جنت کا ایک محل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آگرے کے قلعہ کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا۔ مگر اس وقت حسرت سے میرا کلیجہ شق ہو گیا اور مغل بادشاہوں کی موت پر عقیدت کے چند قطرے آنکھوں سے بہہ گئے۔ پھر موتی مسجد گئے۔ یہاں مجھ پر غفلت طاری ہو گئی۔ جب میں بیدار ہوا تو اپنے کو دہلی کی سڑکوں پر پایا۔ سامنے دہلی کا قلعہ تھا۔ یہاں مغل بادشاہوں کی بہت سی یادگاروں کو دیکھا۔ ان سب چیزوں کو دیکھ کر خود بخود آنسو اُبل پڑتے ہیں۔ میرا دامن اشکوں سے تر ہو گیا۔ میں قطب مینار پر چڑھا۔ وہاں سے ایک جھلملتی ہوئی نظر سارے شہر دہلی پر ڈالی۔ قطب مینار کے بعد میں نے اپنے کو دہلی کے چاوڑی بازار میں پایا۔ اس وقت کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں ان فاحشہ عورتوں اور بے حجاب رقاصاؤں کی تاک جھانک دیکھ کر سہم گیا۔ ابھی میں اِسی خیال میں مستغرق تھا کہ میرے شریف مالک کا قدم ایک دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ زینوں پر پاؤں رکھے کھڑے تھے اور میں اپنے ساتھیوں میں چہ میگوئیاں کر رہا تھا۔ اس وقت ایک پرانے ہمقوم سے معلوم ہوا کہ میرے مالک قدرے منچلے بھی ہیں۔ آخر ایسا ہی ہوا۔ میں طوائف کے حنائی ہاتھوں میں اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ یہاں نفاست کا تو کافی لحاظ تھا لیکن میری طبیعت بڑی متنفر ہو رہی تھی — مگر خدا کے فضل سے یہاں زیادہ دن تک مقیم نہ رہا۔ ایک ہفتہ بعد پارچہ فروش کی نذر ہو گیا۔ یہاں ہر طرح کے جوان بڈھے موجود تھے۔ میری ملاقات کئی کلکتے کے ساتھیوں سے بھی ہوئی۔ بڑی خاطر مدارات کی، ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اپنے جھرمٹ میں بٹھایا۔ یہاں میرا دل ذرا بہلا۔ مگر قسمت نے زیادہ دنوں تک ہم لوگوں

کو اکٹھا رکھنا نہ چاہا۔ دوسرے تیسرے دن میں پوسٹ آفس میں بھیج دیا گیا۔ یہاں میرے ایسے لاکھوں پڑے تھے۔ میری بڑی بے قدری ہوئی۔ مجھے ایک انبار میں اُٹھا کر پھینک دیا گیا۔

مجھے یہاں رہتے ہوئے بہت دن ہوگئے۔ کتنے ہی روز آتے اور کتنوں ہی کی روز روانگی ہوتی۔ مگر مجھے نہ ابھی جانا تھا، نہ گیا۔ میری طبیعت شور وغل سے بڑی پریشان رہتی۔ اور جی یہی چاہتا کہ گھُٹ کر مر جاؤں۔ آخر ایک دن ایک شخص آئے۔ وضع قطع سے یہ شریف النفس معلوم ہوتے تھے۔ اب میری روانگی کا وقت آگیا۔ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ راستے میں اِس بھلے مانس سے ایک صاحب کی ملاقات ہوگئی۔ اُنہوں نے مجھے ایک موٹے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ ایک تو گرمی کا موسم دوسرے اندر کی جیب —— میں پسینہ سے شرابور ہوگیا۔ مگر کیا کرتا وہیں صبر سے بیٹھا رہا۔

مگر اب میرا مقدر ہی خراب ہو چلا تھا۔ جونہی وہ مکان کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں ایک بدمعاش چھُری مار کر ہم لوگوں کو اپنے آہنی پنجوں میں دبا کر رفو چکر ہوگیا۔ ہم لوگوں کا چہرہ بلکہ سارا جسم لہولہان ہوگیا۔ گھر پہنچ کر اِس بدمعاش نے خوب رگڑ رگڑ کر ہم لوگوں کے داغ صاف کئے اور ہمیں ایک کاٹھ کے صندوق میں رکھ دیا۔ مگر ہمارا مالک چونکہ اس مجرم کو پہچانتا تھا۔ فوراً رپورٹ کردی۔ دُوسرے ہی روز میرا نیا بدمعاش مالک گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ بازی شروع ہوئی۔ اتفاق سے میں وکیل صاحب کی فیس میں دے دیا گیا۔ اس وقت تک میری جوانی بالکل غائب ہو چکی تھی۔ چہرہ بدنُما ہوگیا تھا —— پیرانہ سالی کی وجہ سے آواز بھی کچھ پست ہوگئی تھی۔ وکیل صاحب نے گھر آکر خوب اُٹھا اُٹھا کر پٹخا مگر مجھ میں اب اتنی تاب ہی نہ تھی کہ میں بولتا۔ آخر وکیل صاحب نے مال خانہ میں مجھ سے میرا ایک ہم جنس بدل لیا۔ یہاں میرے ایسے ہزاروں بُڈھے کھوسٹ قبر میں پاؤں لٹکائے اللہ آمین کر رہے تھے۔

یہاں مجھے تھوڑا ہی عرصہ ہُوا تھا کہ ایک دن ایک تھیلی میں بند کر کے کلکتہ روانہ کر دیا گیا۔ جب میں پھر کلکتہ پہنچا تو یہ بات معلوم ہوئی کہ ہم لوگ دوبارہ ڈھلنے والے ہیں :-

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے!

راز چاگل پوری

زندگی اور محبّت

مکرمی خان صاحب! "زندگی اور محبت" کے عنوان سے ایک مختصر سا مضمون بھیج رہا ہوں۔ یہ دو تین ماہ سے لکھا پڑا تھا اور بھیجنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ "ہمایوں" میں آپ کا "سارس" دیکھ کر جرأت پیدا ہوئی۔ "سارس" اور "زندگی اور محبت" ایک ہی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔ وہ جاپانی فضا کا پرتو لئے ہوئے ہے تو اس میں خالص ہندوستانی روایات کا عکس شامل ہے لیکن جو برتری "سارس" کو حاصل ہے وہ اسے کہاں حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک قابل ادیب کا شاہکار اور پھر ایک ممتاز زبان دان کا ترجمہ۔ اور اس کے مقابلہ میں "زندگی اور محبت" کو پیش کیا جائے۔ جو ایک مبتدی کی ناکام کوشش ہے۔ عبدالغنی

"ہمایوں" آپ کی کوشش بہت کامیاب ہے۔ اگر سارس کے ترجمے نے اس مضمون کی اشاعت کی تحریک کی تو وہ ترجمہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

دو معصوم صورت کبوتر میرے بالاخانہ کی منڈیر پر بیٹھے تھے۔ آسمان پر اِکّے دُکّے بادل کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ دن بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ چونکہ بہار کا آغاز تھا۔ اس لئے غروب آفتاب کے وقت یہ تمام باتیں بڑی جذبات انگیز بن رہی تھیں۔ ان لاویزیوں نے غیر محسوس طور پر ان کبوتروں کو مسحور کر لیا تھا، وہ محبت کی معصومانہ اداؤں سے کبھی گردن کو گردن میں حمائل کر لیتے، کبھی ایک دوسرے کے پر و بال نوچتے اور کبھی چونچ میں چونچ ڈال کر آنکھوں سے گفتگو کرتے۔ زندگی اُن کے لئے محبت اور خوش وقتی کا دُوسرا نام تھی۔ والہانہ جذبات اور سادہ حسن کے لحاظ سے یہ قدرت کے شاہکار معلوم ہوتے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بھیگی بھیگی شام سے اُن کے اُودے اُودے جسم کس قدر مناسبت رکھتے تھے۔

اچانک ایک کبوتر پھڑپھڑا کر پرواز کر گیا۔ اور دُوسرا چھت پر آگرا اور تڑپنے لگ گیا وہ گردن کو اُٹھا اُٹھا کر زمین پر دے دے مارتا تھا۔ پر و بال اُڑنے کے لئے بیتابانہ پھڑپھڑاتے تھے۔ مگر اُڑ نہ سکتا تھا۔ میں دوڑ کر گیا۔ کبوتر کو اُٹھا لیا۔ اُس کی دائیں آنکھ ایک بھر باہر لٹک رہی تھی، خون جاری تھا اور بے تو ہو چکی تھی۔ یہ کسی لڑکے کی شرارت تھی۔ آج لڑکے کبوتروں کے شکار کو غلیلیں لے کر پھر رہے تھے۔ کبوتر میں نے اُسی وقت نوکر کو بلا کر دے دیا جو اُس نے فوراً ذبح کر ڈالا۔

مَیں حیران تھا کہ جو کبوتر ابھی ابھی اپنی خوبصورتی اور بھولی اداؤں سے ماحول کی دلکشی میں نمایاں اضافہ کر رہا تھا اور قدرت کی ایک نادر مخلوق معلوم ہوتا تھا اب کہاں تھا؛ کیا ایسی بدیع المثال چیزوں کا انجام یہی ہونا چاہئے؛ اور پھر عین اُس موقع پر جب وہ مُرقعِ حسن بن رہی ہوں؛ شاید خالق کے دل میں اپنی مخلوق کا اتنا بھی احترام موجود نہیں جتنا ایک خوش فکر شاعر اپنے اشعار کا کیا کرتا ہے! —— حسین چیزیں ذرا سی ٹھوکر سے کیوں چُور چُور ہو جاتی ہیں؛

مَیں اِسی طرح افسوس کرتا اپنی سابقہ جگہ پر جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دُوسرا کبوتر اُڑتا ہُوا آگیا اور آکر منڈیر پر بیٹھ گیا۔ محبت کا بے پناہ جذبہ اُسے پھر اُسی جگہ کھینچ لایا تھا جہاں وہ اپنی جان کے لئے خطرہ دیکھ چکا تھا۔ وہ بڑے اضطراب سے اپنی گردن کو لوچ دے کر متجسسانہ نگاہیں اِدھر اُدھر ڈالتا، اور ہر نگاہ کے بعد اُس کے اضطراب میں افزونی ہوتی۔ آہستہ آہستہ اُسے یقین ہوتا چلا گیا کہ اُس کا رفیقِ زندگی ہمیشہ کے لئے اُس سے جُدا ہو چکا ہے۔ اُس کی آنکھوں کا یاس انگیز عالم اور اُس کے چہرے پر تاریک مستقبل کا پرتو کس قدر دردناک تھا۔ آخر وہ ہمہ تن یاس بن کر بلندیوں میں اس طرح پرواز کر گیا گویا زمین اُس کے جذبۂ غم کو پناہ دینے سے عاجز ہے۔

عبدالغنی بی۔اے

میر کے ایک شعر کی تضمین

ہوگا خیال آپ کا سرمایۂ نشاط
دُنیا اُلٹ چکی ہے مرے شوق کی بساط

درسِ ادیب دہر میں تعلیم یاس تھی
وا حسرتا کہ پڑھ نہ سکے حرفِ انبساط

ہے تجھ کو پاسِ وضع مگر اے خرد پرست!
ہے ترکِ احتیاط ہی اُلفت میں احتیاط

اے یادِ دَورِ عشق، یہ افسانہ چھوڑ بھی
ہم سے اور ایسے عہد فروشوں کا ارتباط!

اے اضطرارِ آرزوئے زندگی، دریغ
ایامِ آرزو ہیں مرے رُو بہ انحطاط

تائب سے تجھ کو چھیڑ کی لینے کا ہے دماغ
"کرتی ہے بُوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آہ میں تو موجِ نسیمِ وزیدہ ہوں"

(ملک) مراتب علی تائب

محفلِ ادب

شاید کوئی عبرت حاصل کرے

میرے ایک دوست کے خُسر جو رئیس بھی تھے، نواب بھی، اور "سر" بھی، تھوڑے دن ہوئے کہ ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت کے لئے گئے تھے۔ نواب صاحب کو ایک طرف تو قدرت نے ایک بڑی جاگیر کا مالک کیا تھا، دوسری طرف ذاتی اور ظاہری جاہت میں بھی کمی نہیں تھی۔ آدمی گورے چٹے اور خوبصورت تھے، چہرے مہرے سے ایک خاص وقار ٹپکتا تھا، منہ پر ڈاڑھی رکھتے تھے جو کافی شاندار تھی اور سختی کے ساتھ اوامر و نواہی کے پابند تھے۔

مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرتے ہوئے جب وہ قاہرہ پہنچے تو ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں قیام فرمایا ـــــ شام کا وقت تھا اور نواب صاحب اپنے احباب اور دیگر حضرات کے ساتھ سبزے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک مسلمان گداگر جس کی عمر ساٹھ ستر سے کم نہ ہوگی، کراہتا اور لاٹھی ٹیکتا اُن کے سامنے آیا جس کے چہرے کی بےشمار گہری جھریوں کے اندر رفاقوں میں گزرے ہوئے بےحساب ماہ و سال کروٹیں لے رہے تھے۔ اور آنکھوں کی بجھتے ہوئے چراغ کی سی دُھندلی روشنی، متواتر فاقوں کی غمازی کر رہی تھی۔

بوڑھے گداگر نے دانت نکال کر نواب صاحب کی طرف دستِ سوال دراز کیا۔ اُس کا بھیک میں اُٹھا ہوا ہاتھ، دھڑکتے ہوئے دِل کی سُست رفتاری کے باعث کانپ رہا تھا۔

نواب صاحب سے ضبط نہ ہو سکا، جیب میں ہاتھ ڈالا، اور پانچ روپے بوڑھے گداگر کے حوالے کر دیئے۔

گداگر نے شاید یکمشت پانچ روپے اور پھر اپنے ہاتھ میں کبھی نہ دیکھے ہوں گے، اُس کے کُملائے ہوئے چہرے پر خُون دوڑنے لگا۔ اِس طرح خُون دوڑنے لگا جیسے کائی سے ڈھکے ہوئے تالاب پر موسمِ خزاں کے ہلکے ابر کا سایہ ـــــ

فاقہ کش بوڑھے نے نواب صاحب کی طرف آنکھ اُٹھائی، اُس کے پاس شکریے کے الفاظ کا ذخیرہ نہ تھا، جس کے پاس روٹی نہیں ہوتی، اُس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا، اور اِس طرح نواب صاحب کو دیکھتا رہا گویا وہ کسی فرشتۂ رحمت کو خواب میں دیکھ رہا ہے۔

آخر کار اُس نے زبان کھولی، شاید ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں شکریہ ادا کیا، یا آنسوؤں کے سے رقیق الفاظ میں دُعائیں دیں، غرضکہ اُس نے کمزور آواز میں کچھ کہا، اور ایک بار پھر نواب صاحب پر نگاہیں جما کر رخصت ہو گیا۔

سچ ہے جذبات کی شدت ہونٹوں پر قفل لگا دیتی ہے۔ اور شرحِ حال کی انتہائی آرزو انسان کو گونگا بنا کر چھوڑتی ہے۔

لیکن ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہی گداگر پھر نظر آیا۔ اُس کا رُخ نواب صاحب ہی کی طرف تھا۔

نواب صاحب کو خیال پیدا ہوا کہ بوڑھا پھر سوال کرنے آرہا ہے - انہوں نے دِل ہی دِل میں غالباً کہا ہوگا کہ یہ گدا اگر بھی کس قدر غیر قانع اور بے حیا ہوتے ہیں۔

امارت مفلسی کو کس قدر حقارت آمیز اشتباہ کے ساتھ دیکھتی ہے۔

اس مرتبہ اِس کمزور بوڑھے کی رفتار میں ایک طرح کا زور، اور اُس کے چہرے پر ایک نوع کی سُرخی پائی جاتی تھی، ایسی سُرخی جو مُرجھائے ہوئے زرد پتوں پر ڈوبتے ہوئے سُورج کی آخری کرنوں سے پیدا ہو جاتی ہے۔

اس مرتبہ بوڑھا گداگر نواب صاحب سے احترام آمیز فاصلے پر ٹھٹک کر نہیں کھڑا ہوگیا، بلکہ وہ اُن کے قریب آگیا۔ اِس قدر قریب کہ اُس کا سایہ نواب صاحب پر پڑنے لگا ——— گویا شفق سے نکھری ہوئی ندی پر جلی ہوئی لکڑیوں کا دُھواں محیط ہوگیا۔

بُوڑھے نے نواب صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا "آپ کس مُلک کے باشندے ہیں؟" ——— نواب صاحب نے کہا "ہندوستان کا" اور اُسی کے ساتھ ساتھ اُس کو یہ بھی بتایا کہ "بحمداللہ مسلمان بھی ہوں"۔

یہ سنتے ہی گداگر نے نواب صاحب کے پانچوں روپوں کو اُن کے سامنے والی میز پر اس طرح گھبرا اور تلملا کر رکھ دیا گویا دھوکے میں اُس نے انگارے اُٹھا لئے تھے ———

نواب صاحب نے متعجب اور منفعل ہو کر نیم غضب آلود آواز میں پوچھا۔ "یہ کیا؟"

"آپ مجھ پر احسان کر چکے ہیں۔ اس لئے مَیں کچھ کہنا نہیں چاہتا" گداگر نے شریفانہ انداز میں جواب دیا۔

"نہیں، تمہیں بتانا ہوگا کہ اِس کے معنی کیا ہیں؟" نواب صاحب نے اس مرتبہ کسی قدر بگڑ کر کہا۔

"مجھے بتانا ہوگا؟" گداگر نے احسانمندی سے دبی ہوئی ترشی کے ساتھ جواب دیا "تو سنئے، میں کہنا نہ چاہتا تھا، مگر جب آپ مجھ سے کہلوانا ہی چاہتے ہیں تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے آج تیسرا فاقہ ہے، مجھے آپ کے یہ پانچ روپے بہت دن چلا سکتے تھے" یہ کہہ کر گداگر پھر خاموش ہوگیا، گویا کوئی اُس کا گلا پکڑے لیتا ہے۔

"کہو، کہو، صاف صاف کہو، کیا معاملہ ہے، مَیں تم سے ناخوش نہ ہوں گا" نواب صاحب نے بے صبری کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

"یہ عظیم الشان چاندی کے پانچ ٹکڑے" گداگر نے کھانستے ہوئے کہا "مجھے بہت دن چلا سکتے تھے اور آج ایک زمانے کے بعد میں قہوہ بھی پی سکتا تھا، مگر . . . . . . "

"ہاں ہاں کہو، جلد کہو" نواب صاحب نے تھوڑی سی اضطراب آمیز جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا۔

"لیکن" گداگر نے کہنا شروع کیا "میں غلاموں کی بھیک سے اپنا فاقہ توڑنا نہیں چاہتا . . . . مسلمان اور غلام ہو، یہ جھوٹ ہے، یہ رسول اللہ کی توہین ہے"+

(کلیم) (جوش)

مطبوعات

داستان پیرلوئی کی مشہور دلچسپ داستان "افروڈائیٹ" کا ترجمہ جناب پروفیسر عابد علی صاحب نے داستان کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب بہت دلچسپ اور بہت رنگین ہے۔ بلکہ بعض لوگوں کے لئے شاید ضرورت سے زیادہ رنگین ہے۔
عابد صاحب نے ترجمہ نہایت "قابلیت، خوش سلیقگی اور فن کاری" سے کیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت خود مترجم نے اپنے کام سے پورا لطف اٹھایا ہے۔ ہر باب کا آغاز بہت دلچسپ اشعار سے ہوتا ہے اور آغاز کی یہ رنگینی ہر جگہ انجام تک پہنچتی ہے۔ حجم ساڑھے چار سو صفحات۔ کاغذ اور کتابت و طباعت اچھی ہے۔ قیمت مجلّد دو روپے۔ ہاشمی بک ڈپو لاہور سے طلب کیجئے۔

قادیانی مذہب۔ یہ کتاب پروفیسر محمد الیاس برنی نے قادیانی مذہب اور اس مذہب کے بانی کے خلاف لکھی ہے۔ کتاب بہت تحقیق سے لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے جن لوگوں کو اس قسم کی مذہبی باتوں سے دلچسپی ہو ان کے لئے یہ کتاب بہت دلچسپ اور پُر از معلومات ثابت ہو سکتی ہے۔ تحقیق اور تنقید میں الیاس صاحب نے ایک خاص انداز قائم کیا ہے۔ قیمت تیے۔ کمال احمد صاحب فاروقی بیت السلام حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے۔

گلفروش:۔ دنیائے ادب میں مسٹر سید محمود مورخ ایم۔ اے کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ مورخ صاحب ایک ہونہار ادیب اور ایک قابل اخبار نویس ہیں۔ وہ گذشتہ تیرہ سال سے اردو اور انگریزی روزناموں اور رسائل میں کام کر رہے ہیں اور اگست ۱۹۳۵ء سے ایک ہفتہ وار اخبار "گلفروش" دہلی سے ان کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ گلفروش ایک دلچسپ اخبار ہے جو ہر ہفتہ ۲۴ صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ اس میں سیاسی، ادبی، علمی اور فلمی مضامین دلچسپ افسانے، عالم اسلام کی خبریں، دلچسپ معلومات اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ اخبار کا سالانہ چندہ تیے ہے جو زیادہ نہیں لیکن اس مہینے یہ اخبار ایک روپیہ کی رعایت سے دیا جا رہا ہے۔ ہم ناظرین ہمایوں سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر مورخ صاحب کی حوصلہ افزائی کریں۔ گلفروش کی لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجہ کا ہے۔ نمونہ کا پرچہ ایک ٹکٹ بھیج کر مینجر صاحب ہفتہ وار اخبار گلفروش دہلی سے منگوا لیجئے۔ گلفروش کا رعایتی اعلان ہمایوں کے بہرۂ اشتہارات میں دیکھئے۔

مسلم انڈیا۔ ہمیں ایک مطبوعہ پمفلٹ موصول ہوا ہے جس میں یہ اطلاع درج ہے کہ جارج ششم کی تخت نشینی کے موقع پر "مسلم انڈیا" کے نام سے ایک نہایت مفید کتاب شائع کی جائے گی۔ یہ کتاب ہندوستان میں اسلامی تمدن، تہذیب، علم، تجارت اور مذہب وغیرہ کی مکمل اور مفصل تاریخ ہو گی۔ اس کے علاوہ اس میں مسلمانوں کی موجودہ حالت پر بھی ایک سیر حاصل تبصرہ کیا جائے گا۔ مختلف موضوعات پر انسائیکلوپیڈیا کے رنگ میں تجربہ کار اہلِ قلم سے معاوضہ پر مضامین لکھوائے جائیں گے۔ اس کام کا بیڑا اسید برادرز پبلسٹی بیورو (رجسٹرڈ) لاہور نے اٹھایا ہے۔ اگر یہ کام عہد کے مطابق تکمیل کو پہنچ گیا تو یقیناً مفید ثابت ہو گا۔

مضامین فلک پیما
قیمت عہ
محصولڈاک ۱۱/
ہم مسرت سے اعلان کرتے ہیں۔ کہ "ہمایوں" کے مقالہ نگار خصوصی حضرت فلک پیما کے گراں قدر مضامین کا مجموعہ جو تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے چھپ کر تیار ہوگیا ہے۔ اس کا کاغذ اور کتابت و طباعت نہایت نفیس اور قیمت صرف دو روپے علاوہ محصولڈاک ہے "فلک پیما" کے مضامین کی تعریف تحصیل حاصل ہے۔
فرمائش جلد بھیجیے۔ تاکہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔
محصولڈاک ۱۱/
طلسم زندگی
نصف قیمت پر
میاں بشیر احمد صاحب کی مشہور کتاب "طلسم زندگی" جس پر ملک کے ادبا، اور جرائد اور رسائل نے نہایت حوصلہ افزا ریویو کئے ہیں اور جو اپنے بیش قیمت کاغذ اعلےٰ کتابت طباعت، گراں مایہ رنگین تصاویر، صفحات جمیل اور مطلا جلد کے لحاظ سے ہندوستانی مطبوعات کیا یورپ کی حسین ترین کتابوں کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہے۔
اس مہینے سے اس کی
بقیہ جلدیں نصف قیمت پر فروخت ہوں گی۔
ڈھائی روپے اس کتاب کی اصل لاگت سے بھی کم ہے۔ امید ہے کہ شائقین اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گے
مضامین فلک پیما
طلسم زندگی
مینیجر "ہمایوں" ۔ ۲۳ لارنس روڈ ۔ لاہور
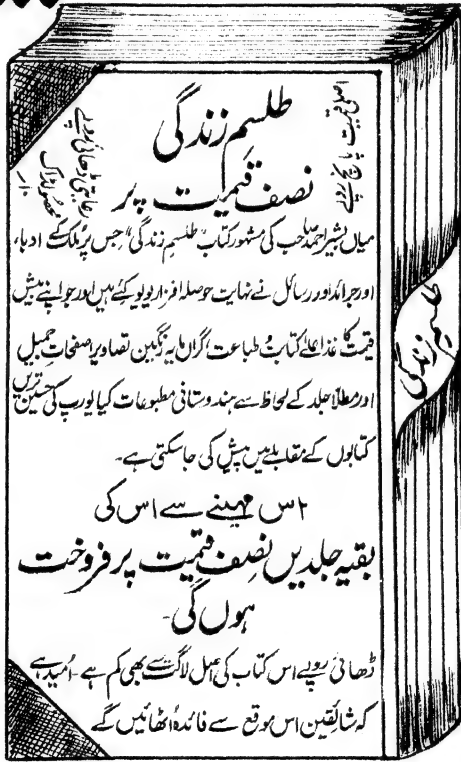
فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ جون ۱۹۳۷ء

تصویر:۔ مولانا منصور احمد مرحوم

چندہ سالانہ ۶ر ششماہی سے ۳ر مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے دفتر سے پروپیگنڈا کا ایک سلسلہ جاری کیا جا رہا ہے جس کا مقصد ملک کی مختلف جماعتوں کو ایک قومی رشتے میں پرونا ہے۔ کونسا بدبخت ہے جسے اِس مقصد کی خُوبی و اہمیت سے انکار ہو: خدا کرے یہ مقصد جلد سے جلد پورا ہو۔ لیکن نِری خواہش اور خالی حسرت اَور شئے ہے اور کامیابی بالکل اَور شئے۔ جب تک کسی مقصد کے حصُول میں خلوص اور صحیح طریقۂ کار کو دخل نہ ہو وہ محض ایک خواب سا بنا رہے گا۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ کانگرس ملک کی سب سے بڑی منظم جماعت ہے، ہم اقرار کرتے ہیں کہ بہ نسبت اَور جماعتوں کے اُسے اپنے کام میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ وہ کئی باتوں میں خلوص اور استقلال سے کام کر رہی ہے، ہماری کئی اُمیدیں اُس سے وابستہ ہیں اور اِسی لئے جہاں ہم اُن تحریکات کو جن میں پنڈت جواہرلال نہرو کا تعلق ہے عموماً شک و شبہ سے نہیں دیکھ سکتے وہاں ہمیں اس بات کا حق بھی پہنچتا ہے کہ ہم اُن کے دفتر کی کارروائی کو تنقیدی نظروں سے دیکھیں۔

اِس سلسلے میں ایک پمفلٹ "گاندھی جی اور اُردو" ہمیں بھیجا گیا ہے۔ اُس میں "ہندی ہندوستانی" کی اصطلاح کے جنم کی کہانی درج ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ گاندھی جی اپنے اور "ہندی سمیلن" کے پُرانے تعلقات کا واسطہ دے کر اپیل کرتے ہیں کہ ہم اُن کی خاطر ہندوستانی کی قومی ٹوپی کے ساتھ ہندی کا پھندنا لگا رہنے دیں۔ کیا ہم بھی گاندھی جی سے اپیل کریں کہ وہ اپنے ہندی پھُندنے کے ساتھ ہمارا اُردو پھُندنا بھی چپکا لیں اور "ہندی اُردو ہندوستانی" کی صلح پسند اصطلاح بن جانے دیں اور اگر ہندوستانی کے معنی اُردو ہی ہیں تو صرف اِک ہماری ضد پوری کرنے کو قومی زبان کا نام "ہندی اُردو" رکھ دیں۔ کاش وہ پنڈت جواہرلال کی طرح محض "ہندوستانی" کے لفظ پر اکتفا کرتے تو یہ دِل کی جلن پیدا نہ ہوتی۔

پھر ظلم یہ ہے کہ اُردو کے مقابل میں دیوناگری خط کی صوتی صلاحیت اور جامعیت کی تعریف کر کے گاندھی جی جن سے ہم اُردو رسم الخط والے بھی اتنی ہی محبت کرنا چاہتے ہیں جتنی دیوناگری والے اپنے آپ کو ہم سے دُور کھینچتے ہیں اور جانب داری ظاہر کرتے ہیں۔ اگر دیوناگری بہتر ہے تو آپ سے مشترک قومی لیڈر کو تو بہتر و کہتر کی کہانی نہ چھیڑنی چاہئے۔ آپ ہم دونوں کے ہیں، سو آپ یا تو دونوں سے علیحدہ رہئے یا بہتر یہ ہے کہ دونوں کو ایک سا سمجھئے اور ایک ہی نظر سے دیکھئے۔ باپ کے لئے ٹھیک نہیں کہ ایک بیٹی کی صوتی صلاحیت اور جامعیت کی تعریف کر کے دوسری کا دِل توڑ دے! گاندھی جی! حق کی خاطر اور بھارت کی خاطر اپنے رویے پر پھر دھیان کیجئے!

ڈاکٹر اشرف فرماتے ہیں کہ گاندھی جی جو ہندی رسم الخط کو اُردو رسم الخط پر ترجیح دیتے ہیں اس رائے رکھنے کا موصوف کو پورا حق ہے۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ حق تو ہر شخص کو بہت سی باتوں کے کرنے کا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا وہ باتیں کرنی چاہئیں ؛ اور ملک پر اُن باتوں کے کرنے کا کیا اثر پڑتا ہے ؛ اُدھر اقلیتوں کو کانگرس کا دیا ہوا حق حاصل ہے کہ اُن کی زبان اُن کا رسم الخط اور اُن کا کلچر محفوظ رہے گا

لیکن اِدھر گاندھی جی جن کا حق محض ہندوؤں اور ہندی کا لیڈر بننا نہیں بلکہ جن پر ہندوستان اور ہندوستانی کا علم بردار بننے کا اہم فرض عائد ہوتا ہے ایک جماعت کے رسم الخط کو دوسری جماعت کے رسم الخط پر ترجیح دیتے ہیں اور کانگرس کا دفتر اِس ترجیح دینے میں اُن کو حق دار بلکہ حق بجانب سمجھتا ہے۔

ہم آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے "ناظم شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشی" سے بہ ادب گزارش کرتے ہیں کہ وہ اُردو ہندی کے مسئلے میں گاندھی جی کی طرف داری کرنے کی بجائے اُن کو اس معاملے میں کانگرس کی پالیسی پر کاربند کرائیں یعنی گاندھی جی ہندوستانی کو ملک کی زبان مانیں وہ ہندوستانی جو اُردو اور ناگری دونوں حروف میں لکھی جاتی ہے !

اِدارے بڑے ہیں اور شخصیتیں بڑی سے بڑی بھی ہوں تو اُن کے مقابل میں چھوٹی ہیں۔ کانگرس گاندھی جی سے بڑی ہے عمر میں نہ سہی وسعتِ نظر یا وسعتِ اثر میں وہ ضرور بڑی ہے۔ اس حال میں اگر کانگرس اُردو والوں کا دل موہنا چاہتی ہے تو اُسے چاہئے کہ گاندھی جی کے دل کو بھی ذرا نرم کرے۔ مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ محض ہندی سمیلن کے پنڈال میں طے نہیں ہوسکتا۔ ہم نہیں کہتے ہمارے اکھاڑے میں آیئے بلکہ ہم تو عرض کرتے ہیں کہ دونوں اکھاڑوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیجئے وہاں محض خالص ادیب اپنے ڈنڈ پیلا کریں آپ بلند نظر پُرخلوص ملک کے فداکار رہنما ان اکھاڑوں سے الگ ان دونوں کے درمیان میں ایک میل جول کی جگہ بنایئے اور وہاں زبان و مذہب کے جھگڑوں سے الگ رہ کر باہمی محبت اور صحیح آزادی کا پرچار کیجئے !

بشیر احمد

انجمنِ اُردو پنجاب

تقریباً ایک سال ہوا کہ ۸ مئی ۱۹۳۶ء کو انجمنِ اُردو پنجاب قائم ہوئی۔ ۹ مئی کو مجلسِ عاملہ نے قواعد وضوابط مرتب کیے۔ ۱۲ مئی کو مجلسِ عامہ نے تین سال کے لئے انجمن کے عہدہ دار منتخب کئے، چھ شعبہ جات قائم کیے گئے۔ چندہ ہوا۔ اہم قرار دادیں منظور ہوئیں بڑے بڑے ارادے باندھے گئے۔ الگ الگ اور مل کر کام کرنے کی تجویزیں ہوئیں وعدے ہوئے غرض آغاز خاصا تسلی بخش تھا۔

کچھ عرصہ گزرنے پر راقم کو محسوس ہُوا کہ محض اس انتظار میں بیٹھے رہنے سے کہ بڑے بڑے واقعات ہو جائیں بہتر ہے کہ بعض چھوٹے چھوٹے کاموں کی ابتدا کر دی جائے۔ اخبارات میں پبلک سے اپیل کی۔ ایک اسسٹنٹ سکرٹری مقرر کیا گیا۔ اُردو میں دلچسپی لینے والے حضرات کو سکرٹری کی مطبوعہ اپیل اور انجمن کے قواعد وضوابط بھیجے گئے۔ اہلِ اُردو کی ایک فہرست مرتب کرنے کا کام شروع کیا گیا اہلِ اُردو سے مُراد وہ حضرات ہیں جو اُردو میں کچھ لکھتے ہیں یا اس زبان وادب کے کسی شعبے سے دلچسپی رکھتے ہیں ستمبر ۱۹۳۶ء کے آخر سے لاہور ریڈیو کی نشرگاہ سے انجمن کے زیرِ اہتمام ہر ہفتے یا ہر دوسرے ہفتے کبھی اُردو ادب اور کبھی دوسرے مضامین پر دلچسپ تقریریں کرانے کا انتظام کیا گیا۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہے چنانچہ آج تک تیئیس تقریریں ہو چکی ہیں۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو انجمن کے صدر اور سکرٹری نے آل انڈیا اُردو کانفرنس منعقدہ علی گڑھ میں انجمن کی طرف سے نمائندگی کی۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء سے اسسٹنٹ سکرٹری کا کام مسٹر حفیظ ہوشیارپوری ایم-اے کے سپرد کیا گیا جسے اُنھوں نے بہت اچھی طرح سرانجام دیا۔

باغبانپورہ میں انجمن کی ایک شاخ قائم ہوئی اور اُس کے چار پانچ کامیاب جلسے ہوئے۔ انجمن کے لائحۂ عمل سے متاثر ہو کر مقامی کالجوں کے چند طلبا نے مِل کر "انٹر کالجیٹ اُردو سوسائٹی" کی بنیاد رکھی۔ بہاولپور میں "عباسیہ لٹریری لیگ" قائم ہوئی اور ۲۵ فروری کو انجمن کے اسسٹنٹ سکرٹری نے وہاں جا کر ہندوستان کی قومی زبان پر علمی مقالہ پڑھا اور اُردو کی ترویج واشاعت کے لئے مفید مشورے دیئے۔ ۱۷ اور ۱۸ اپریل کو بزمِ اُردو جموں وکشمیر کا سالانہ مشاعرہ جموں میں منعقد ہُوا جس میں بزم کے اصرار پر انجمنِ اُردو پنجاب کے صدر نے صدارت قبول کی اور اسسٹنٹ سکرٹری نے بھی مشاعرہ میں حصہ لیا۔ یہ بزم پہلے ہماری انجمن سے ملحق تھی لیکن اب اہلِ اُردو کی باقاعدہ ملکی تنظیم کے پیشِ نظر ہماری درخواست پر وہ انجمن ترقیٔ اُردو کی شاخ بن چکی ہے۔ اسی طرح دائرۂ ادبیہ پشاور اور بزمِ ادب کوہاٹ بھی مرکزی انجمن سے ملحق ہو چکی ہیں۔ پنجاب کی بہت سی انجمنیں وقتاً فوقتاً سکرٹری اور اسسٹنٹ سکرٹری کو دعوت نامے بھیجتی رہتی ہیں لیکن مقامی مصروفیتوں کی وجہ سے بالعموم ان انجمنوں کو خط وکتابت کے ذریعے سے صلاح مشورہ دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

گزشتہ بارہ مہینوں میں انجمنِ اُردو پنجاب کے جو جلسے ہوئے اُن کا مختصر حال ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا:-

خاص جلسے :۔

(۱)	۸ر مئی ۱۹۳۶ء	انجمن قائم ہوئی
(۲)	۹ر مئی "	مجلسِ عاملہ نے قواعد مرتب کئے۔
(۳)	۱۲ر مئی "	مجلسِ عامہ نے عہدہ دار منتخب کئے اور چھ شعبہ جات قائم ہوئے۔
(۴)	۱۴ر جون "	شعبۂ ادب کا جلسہ
(۵)	۱۷ر اکتوبر "	مجلسِ عاملہ : متفرق کام
(۶)	۸ر دسمبر "	شعبۂ نسواں کا جلسہ
(۷)	۱۲ر فروری ۱۹۳۷ء	مجلسِ عاملہ نے انجمن ترقیٔ اُردو سے الحاق منظور کیا۔
(۸)	۱۴ر مئی ۱۹۳۷ء	شعبۂ نسواں کا جلسہ
(۹)	۱۵ر مئی "	مجلسِ عاملہ : سالانہ رپورٹ وغیرہ

عام جلسے :۔

(۱)	۲۱ر نومبر ۱۹۳۶ء	متفرق ادبی جلسہ زیرِ صدارت راجہ نرندر ناتھ، المنظر میں منعقد ہوا۔
(۲)	۱۳ر دسمبر "	مقالہ "تجزیۂ نفس" از بشیر احمد۔ صدر ڈاکٹر بھٹنا گر۔ مقام وائی ایم سی اے
(۳)	۱۳ر جنوری ۱۹۳۷ء	مقالہ "خیر و شر" از پروفیسر عابد علی۔ صدر خواجہ دل محمد پنجاب لٹریری لیگ
(۴)	۱۷ر جنوری "	متفرق ادبی جلسہ۔ صدر کیفی صاحب — کوٹھی ڈاکٹر بھٹنا گر صاحب
(۵)	۳۰ر جنوری "	مقالہ "چینی شاعری" از پروفیسر فیاض محمود۔ صدر سید امتیاز علی تاج۔ مقام وائی ایم سی اے۔
(۶)	۱۵ر فروری "	یومِ غالب :۔ مضامین نظم و نثر از مختلف اصحاب۔ صدر کیفی صاحب۔ " " "
(۷)	۳۰ر مارچ "	مشاعرہ — صدر جناب ساغر نظامی " " "
(۸)	۵ر مئی "	مقالہ "اُردو افسانہ نگاری" از جناب نسیم رضوانی۔ صدر خلیفہ عبدالحکیم " " "
(۹)	۲۷ر مئی "	مشاعرہ۔ شعراء نے اپنی اپنی بہترین نظم سُنائی۔ صدر مولانا تاجور " " "

اس میں شبہ نہیں کہ اگر شعبے اپنی اپنی جگہ کام کرتے تو بہت کچھ اَور بھی ہو جاتا لیکن موجودہ حالات میں انجمن کو تسلّی ہے کہ وہ اپنی بساط کے مطابق مختلف طرح کے امور سر انجام دے سکی ہے۔ سال بھر میں کُل ۱۸ جلسے ہوئے اور ۲۳ دفعہ ریڈیو پر تقریریں ہوئیں۔

اب بعض متفرق کاموں کی طرف توجہ کرنے کا بھی ارادہ ہے۔ اُردو زبان کی مستند تصنیفات کی ایک جامع اور کارآمد فہرست مرتب کرنے کے خیال سے ہندوستان کے تمام مطبعوں اور کتب خانوں کو خط لکھے گئے کہ وہ اپنی اپنی مطبوعات کی فہرستیں بھیجیں۔ چنانچہ تقریباً تیس ۳۰ فہرستیں موصول ہو چکی ہیں اور مذکورہ بالا فہرست کی ترتیب کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔

اُردو کے بہی خواہوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ (ایک روپیہ سالانہ) چندہ اور حسبِ استطاعت عطیہ دے کر انجمن کے کام میں اُس کا ہاتھ بٹائیں اور جس طرح اُن سے ہو سکے اپنے اپنے حلقے میں قومی زبان کی اشاعت ہر دلعزیزی اور تحفظ و ترقی میں عملی طور پر حصّہ لیں۔

بشیر احمد

منصور احمد کی یاد میں

اُردو کی دُنیا میں جو رنج و غم کی لہر منصور احمد کی ناگہانی موت سے دوڑ گئی ہے اُس کا صدمہ سب سے بڑھ کر "ہمایوں" کو پہنچنا چاہیئے اِس لئے کہ ہمایوں سب سے پہلا رسالہ تھا جس سے مرحوم کا تعلق پیدا ہوا۔

کِس طرح اُنہوں نے "ہمایوں" کے لئے برسوں دن رات محنت کی "ہمایوں" اِسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ کیسے اُنہوں نے ترقی کی، اُن کے قلم میں کیسا زور پیدا ہوا، اقتباس ترجمہ نظم تنقید کیونکر اِن تمام ادب کے شعبوں میں اُن کی طبیعت نے اپنا زور دکھایا اِن سب باتوں کا ایک گہرا نقش "ہمایوں" کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے موجود رہے گا۔ دن رات کی ادبی محنت اور غور و فکر نے ایک منحنی جسم کو اور کمزور بنا دیا۔ مجبوراً وہ "ہمایوں" سے علیحدہ ہوئے لیکن جب تھوڑی مدت آرام کرنے سے صحت بہتر ہوئی تو اُن کی حسّاس طبیعت کو پھر ادب نے اپنی طرف کھینچا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے کیا کچھ کیا" ادبی دُنیا" اور اُس کے شاندار سالنامے اس کے شاہد ہیں۔

"ہمایوں" اور "ادبی دُنیا" میں جو مشابہت نظر آتی رہی اُس کا باعث مرحوم کی ذات تھی لیکن یہاں ایک اَور نکتہ کم از کم میرے لئے قابلِ غور ہے۔ "ہمایوں" کے دائرے میں رہ کر مَیں نے دیکھا کہ میں اور وہ اکثر باتوں میں ہم خیال ہیں، ہم خیالی سے ہمدردی اور ہمدردی سے اُلفت پیدا ہوئی۔ پچھلے بارہ مہینوں میں "انجمن اُردو پنجاب" کے سلسلے میں جو میری اُن کی باتیں ہوئیں یا جب پچھلے سال وہ تیز بخار میں مبتلا تھے اور مَیں اُن سے ملنے گیا اور اُن کے مُنہ پر رونق سی آگئی یا پھر جب چند ماہ ہوئے ماڈل ٹاؤن میں کیفی صاحب کے جواں مرگ صاحبزادے کے جنازے میں مَیں اور وہ شریک ہو کر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر باہمی ہم خیالی کا اظہار کرتے رہے۔ آج یہ اور اُن کی بیسیوں اور باتیں "یاد آتی ہیں اِک ایک سب"! آہ آدمی چلے جاتے ہیں صرف یاد رہ جاتی ہے!

ایک حسرت رہ گئی، بدقسمتی سے اُن کی آخری علالت کا مجھے پتہ نہ چلا اور ایک افسوسناک غلط فہمی کی وجہ سے مجھے یہ معلوم نہ ہوا کہ اُن کا انتقال ماڈل ٹاؤن ہی میں ہوا، آخری دفعہ ایک دوست کا چہرہ نہ دیکھ لینے کی ندامت اور رنج بہت تکلیف دہ ہیں۔

اُردو ادب کے وہ سینکڑوں خدمت گزار جن کی خدمت کی بنیاد دلی شوق اور محبت کے درجے تک پہنچتی ہے جن کی اِس سیاست زدہ زمانے میں کماحقہٗ قدر نہیں ہو سکتی جن پر دُنیا کی نظریں کم پڑتی ہیں لیکن جن کا خلوص اَور یک سُوئی اُن کا ایمان ہے اُن سینکڑوں میں منصور احمد کی محبوب شخصیت کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ اُردو ادب کی راہ میں شہید ہوئے۔ یقین جانئے کہ وہ ادب جسے ایسے ایسے مخلص شہیدوں کا خون سیراب کرے کبھی فنا نہیں ہو سکتا!

بشیر احمد

آہ منصور احمدؒ!

گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش وناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

زندگی کی حقیقتیں کس قدر تلخ ہیں۔ رنج ومصیبت کی ہر منزل میں داخل ہو کر انسان سمجھتا ہے کہ میں غم والم کی انتہا کو پہنچ گیا اور اب کوئی نئی عقوبت میرے مقدر میں نہیں ہے لیکن یہ احساس دراصل خود انسانی تخیل کی کوتاہی کی دلیل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ درد وکرب کی کائنات بہت زیادہ وسیع ہے۔

۷ مئی تک میرا خیال تھا کہ موت کی وہ تمام الم انگیز کیفیتیں جن کی مصوری کا حق مذہب اور تخیل نے ادا کیا ہے، میرے دماغ پر روشن ہیں لیکن اُسی شام جب میں نے سُنا کہ موت اور منصور احمد ایک ہوگئے تو مجھے معلوم ہوا کہ موت کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع اور دردناک ہے جو میں نے سمجھ رکھا تھا۔

منصور کی طویل علالت نے اس کے جسد عنصری کو بے حد لاغر کر دیا تھا مگر آج اِس کے باوجود مجھے اُس کی موت "مرگِ ناگہاں" معلوم ہوتی ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ مجھے اس کے نحیف پیکر کی طاقتِ برداشت پر اعتماد تھا بلکہ میں شاید یہ سمجھتا تھا کہ جس بُردت ارادے اور پُرخروش عزم کی آگ اس مشتِ خاکستر میں سُلگ رہی ہے اس کو موت نہیں آسکتی۔ میرے اس خیال کی اصلیت کچھ بھی ہو زندگی کے ساتھ منصور کا تعلق اتنا گہرا تھا کہ اب بھی دُنیا سے اُس کی دائمی علیحدگی کا یقین کرنا دُشوار ہے۔ اگر عزم و جرأت اور ہمت و استقلال کی بنا پر زندگی عطا ہوتی تو منصور کو حیاتِ جاوداں مِل چُکی ہوتی۔ اس کی تمام زندگی ایک طویل اور خاموش جدّوجہد تھی جس سے وہ نہ کبھی تھکا اور نہ گھبرایا۔ اِس جدّوجہد کے جو پہلو دُنیا کی نظر کے سامنے آسکے وہ "خیالستان" "ہمایوں" اور "ادبی دُنیا" کے ساتھ منصور کے تعلقاتِ ادارت تھے۔ اس کے ذوقِ عمل کی یہ کیفیت تھی کہ وہ مایوسی کے نام سے ناآشنا تھا اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ پژمردگی و درماندگی انسان کی زندگی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ موت نے اُسے میدانِ جنگ میں گرا ہوُا نہ پایا بلکہ اُس وقت جب وہ گھمسان میں تلوار چلا رہا تھا، موت نے اچانک پیچھے سے آکر اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔

اُس کے احساسِ خودداری نے اِس کی گردن ہمیشہ بلند رکھی۔ اُس کے ہر کام میں اس کی عزّتِ نفس کی شان ہویدا تھی۔

اس کی نیت میں خلوص، قول میں راستی اور عمل میں بے باکی تھی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ اس کی شرافت اس کی پیشانی سے آشکار تھی۔ اخیر وقت تک اس نے اپنی آن اس طرح قائم رکھی کہ مرض کی شدت میں بھی کوئی کلمۂ اضطراب اس کے مُنہ سے نہ نکلا۔ آخری رات کو اس کے بستر سے تین مرتبہ کراہنے کی آواز آئی تو عزیزوں نے سمجھ لیا کہ اب واقعی عمر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

دُنیا کے لئے منصُور کی مَوت ایک نوجوان اور ہونہار ادیب کی موت ہے لیکن میرے لئے یہ ایک ایسے رفیق کی مفارقت ہے جس کے وجدان وذوق، عقل واحساس اور بُغض وحُب کی پرورش میرے ساتھ ایک ہی گھوارے میں ہوئی تھی۔ یہ ایسی رفاقت ہے جس کی مثال دُنیا میں کم ملتی ہے۔ اس حادثے نے میری دُنیا میں ایک ایسی جگہ خالی کی ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکتی۔

آج تک یہ راز نہ کھُلا کہ کیوں قدرت پہلے ایک دلکش نغمہ چھیڑتی ہے اور پھر سُر کو پُورا کئے بغیر ساز کو توڑ کر پھینک دیتی ہے۔ آہ اے سوزِ ناتمام!

حامد علی خاں

قطعۂ تاریخ

زباغ جوانی گُلے برنہ چیدہ — سُوئے خلد بشتافت منصور احمد!

بجاں آفریں داد جانِ عزیزش — حیاتِ ابد یافت منصور احمد!

حفیظ ہوشیارپوری

"انجمن اُردو پنجاب" کی مجلسِ عاملہ کے جلسہ منعقدہ ۱۵ مئی میں مندرجہ ذیل قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی:-

"انجمنِ اُردو پنجاب" کا یہ اجلاس مولانا منصور احمد صاحب ایڈیٹر "ادبی دُنیا" کی بے وقت اور ناگہانی موت کو اُردو ادب وصحافت کے لئے نقصانِ عظیم تصوّر کرتے ہوئے انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔"

قرار پایا کہ اس قرارداد کی نقل مرحوم کے پسماندگان اور اخبارات کو بھیجی جائے۔

آسیب زدہ مکان

۲۹ دسمبر ۱۸۹۲ء کو رہتک کی نائب تحصیلداری پر میری نامزدگی ہوئی، اس واسطے میں اپنے خدمتگار، بھنڈاری[1]، گھوڑا، سائیس وغیرہ سمیت سرائے میں جا اُترا، دوسری جنوری ۱۸۹۳ء کو منشی عبدالستار خاں صاحب سے چارج لیا، وہ ترقی پاکر تحصیل[2] سانپلا کی تحصیل داری پر چلے گئے اور میں اُن کی جگہ متعین ہو کر فرائض منصبی انجام دینے لگا۔

سرائے میں تو یوں ہی عارضی طور پر آ ٹھہرا تھا، چارج ملنے کے بعد مکان کی فکر ہوئی، یہاں میرے ایک خاص دوست رائے اشمبر دیال صاحب افسر خزانہ تھے، ان سے ذکر کیا، کہ آپ کی نظر میں کوئی ڈھنگ کا مکان ہو تو ذرا کرایہ پر دلا دیجیے!

اُنہوں نے کہا "ہاں بھئی ایک مکان ہے تو سہی ہمارے محلے میں"

"کس کا ہے، اور کتنے کرایہ تک ہو جائے گا؟"

بولے "میرے سرِ دفتر لالہ دینا ناتھ صاحب کا ہے، لالہ سری رام صاحب خزانچی والے مکان کے عقب میں، اگر دینا ناتھ صاحب رضامند ہو جائیں، تو مکان کچھ بُرا نہیں!"

تو پھر کہیے نا اُن سے، جب خالی ہی پڑا ہے، تو بھلا وہ انکار کیوں کرنے لگے۔

جی ہاں! خالی تو ہے ..... مگر .... چند قباحتیں ہیں .....

قباحتیں کیا؟ .... کیسی قباحتیں، میں نے پوچھا!

"اگر دیکھا جائے تو در اصل کچھ ایسی قباحتیں بھی نہیں، صرف اتنی بات ہے کہ سرِ دفتر صاحب کے سالے اس مکان سے ملے ہوئے مکان میں رہتے ہیں، خیر اس کی بھی کچھ پروا نہ تھی، مگر اُنہوں نے اس مکان کی مردانہ نشست میں ایک دوا خانہ کھول رکھا ہے، شاید وہ اپنی سہولتوں کو مدِ نظر رکھ کر بھانجی مار دیں ..... تاہم کروں گا کوشش!"

رائے صاحب کی معرفت آخر وہ مکان چار روپیہ ماہوار کرایہ پر ٹھہر گیا، میرے ذاتی نوکر شہر کے حالات سے ناواقف تھے، اس وجہ سے میں نے تحصیل کے اپنے اردلی کو حکم دیا کہ ان کو ساتھ لے جاؤ۔ اور مزدور لگا کر مکان کی صفائی کرا دو!

---

[1] باورچی۔ [2] اب یہاں تحصیل نہیں ہے۔

کچہری سے آکر جو نوکروں سے پوچھا، تو وہ کہنے لگے:۔

"حضور! مکان تو ویسے ٹھیک ہے، لیکن نہ جانے کن وقتوں سے خراب خستہ پڑا تھا، سارا دن صفائی میں لگے رہے مگر ابھی سیر میں پونی بھی نہ کتی۔"

بمشکل دو روز میں چار چھکڑے کوڑا کرکٹ نکال کر صفائی ہوسکی، تیسرے دن کچہری جاتے وقت میں کہتا گیا کہ ضرور سفیدی وغیرہ کرا کے اُس مکان میں سامان پہنچا دینا، شام کو وہیں آؤں گا ...... اچھا!

کچہری سے فارغ ہوکر بجائے سرائے کے اُس مکان کا رُخ کیا، جُوں ہی گلی میں پہنچا، محلے داروں نے آگھیرا، سب کے سب لگے اُس مکان کی بُرائیاں کرنے:۔

بولے "اجی صاحب! اور کہیں جگہ ہی نہ ملی، کس نے بہکا دیا آپ کو، جناب یہ مکان بڑا منحوس ہے، اُس میں ہرگز نہ رہیے خیر خواہی سے کہتے ہیں، ذرا دو چار روز صبر کریں، تو ہم معمولی کرایہ پر نہایت اچھا مکان دلا دیں آپ کو ...."

اور ان بہی خواہان رسول اللہ کے قائدِ اعظم کون تھے؛ وہی سر دفتر صاحب خزانہ کے سالار جنگ بہادر جناب لالہ شمبھو دیال صاحب!

مَیں نے اِن سب کا شکریہ ادا کیا، اور عرض پرداز ہُوا:۔

"افسوس! مجھے ان حالات کی خبر نہ تھی، لیکن خیر اب تو آگیا، کچھ تکلیف ہوئی تو آپ صاحبان سے گزارش کروں گا۔"

ان سے جان چھڑا کر مکان میں داخل ہُوا، تو نوکروں نے بھی یک زبان ہوکر وہی قصّہ چھیڑ دیا۔

"حضور! یہ مکان بڑا منحوس سُنا جاتا ہے، لوگ باگ کہتے ہیں، اس میں کسی کو بسنا نصیب نہ ہُوا، جو آیا تباہ ہوگیا جب ہی تو جُگوں سے ویران پڑا تھا، اس سے تو سرائے میں ہی اچھے تھے، کہیں کسی کو کچھ ہو ہَوا نہ جائے!"

مَیں نے اُنہیں نرمی گرمی سے سمجھایا بُجھایا، تسلّی تشفّی کی، اور کہا:۔

"اچھا فی الحال یہ جو سامان بکھرا پڑا ہے، اِسے ٹھور ٹھکانے لگاؤ، اگر ایسا ہی ہے تو خیر ہفتہ عشرہ میں کہیں اور چلے چلیں گے۔"

پہلی شب

جب اُن کی کچھ پیش نہ گئی تو اُنہوں نے موقع موقع سے سامان لگا دیا، اور ہنڈیا روٹی میں مشغول ہوگئے، کوئی آٹھ نو بجے سب نے کھانے پینے سے فراغ پایا، مجھے تحصیلداری کے امتحان کی تیاری کرنی تھی پڑھنے لکھنے لگا، وہ لوگ برتن بھانڈے سے نبٹ کر اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں پہنچ گئے، کچھ دیر حقّہ کی گُڑگُڑانے اور کھانسنے کھنکارنے کی آوازیں آتی رہیں، پھر سوائے گھڑی کی ٹِک ٹِک کے ہر طرف خاموشی تھی، خوب یکسوئی سے مطالعہ کیا جاسکا، حتّٰی کہ بارہ پر سوئیاں آگئیں، اور میں بستر پر دراز ہوگیا۔

تیزی سے گہری نیند آ رہی تھی، دفعتہً محسوس ہُوا جیسے کوئی چھت پر چل پھر رہا ہے۔ ہو گا کوئی، میں نے کچھ خیال نہ کیا، یوں ہی کروٹ بدل کر رہ گیا، مگر وہاں تو بار بار دھم دھم ۔ ۔ ۔ ۔ دھم دھم ہونے لگی، پھر بھی میرے کان پر جوں نہ چلی، ایک دفعہ زور زور سے جوتوں کے نعل بجے، خود بخود آنکھیں کُھل گئیں، دیکھا جو مُنہ سیدھا کر کے تو کسی قدر چھت ہل بھی رہی تھی، اور نعلوں کی کھٹ پٹ میری چارپائی کی پائینتی کے اُوپر تک آ کر ٹھہر گئی۔

وسوسہ اُٹھا، نیا نیا مکان ہے، کہیں چور چکار نہ آئے ہوں، اس وقت کاہلی دُور اندیشی کے خلاف ہے، اور ملازموں کو بھی آواز نہ دینی چاہیے، مکان کی نحوست کے وہم میں مبتلا ہیں، ڈر ڈرا جائیں تو بُرا ہو، اُن دنوں میرا شباب تھا، بے دھڑک اُٹھا، اور ڈنڈا سنبھال کر کمرے سے نکلا۔

صحن میں جو کچھ تھوڑا بہت کاٹھ کباڑ پڑا رہ گیا تھا، اُس کے قریب لالٹین جلتی پائی، نوکر اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں پڑے خرّاٹے لے رہے تھے، لالٹین لے کر دبے پاؤں زینہ طے کیا، ایک پٹ کواڑ کی کُنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی، دوسری طرف اندھیرا رکھنے کی غرض سے لالٹین نیچے رکھ کر روزن سے جھانکا، کہ کچھ خطرہ ہو تو یہیں سے انتظام کیا جائے، چھت پر کوئی نظر نہ آیا۔ ممکن ہے آنے والا روشنی دیکھ کر کمرہ میں چھپ گیا ہو، کُنڈی کھول چھت پر پہنچا، کمرے کے کواڑ چوپٹ کھلے پڑے تھے، زینہ سے لالٹین لایا، پھر بیک وقت ڈنڈا، سر اور لالٹین اندر کر کے دائیں بائیں کونے دیکھے، نہ کوئی انسان تھا، اور نہ دبک رہنے کی گنجائش، اندر چل پھر کر دیکھا، مگر کوئی ہو تو نظر آئے۔

شاید آہٹ پا کر چوٹّے فرار ہو گئے ہوں، اس شُبہ میں کمرے سے نکل کر چھت کے اِدھر اُدھر دیکھا، کہیں کوئی لاگ نہ پائی، میرے سونے کے کمرے کی چھت کے اُوپر والا یہ کمرہ محلّے کے مکانوں سے بالکل الگ تھا، یہاں تک کہ آس پاس کوئی درخت بھی نہیں جس کی ڈالیوں کے ذریعہ سے یہاں آیا جا سکے۔

خوب دیکھ بھال کر کمرہ بند کیا، باہر سے زینہ کی کُنڈی لگائی، اور کاٹھ کباڑ کے پاس لالٹین رکھ کر اپنے پلنگ پر آ لیٹا۔ دو تین منٹ بعد دوبارہ وُہی کھٹ پٹ شروع ہوئی، اور آہستہ آہستہ چھت ہلنے لگی، عین نیند کی آمد میں پھر اُٹھنا پڑا، اس مرتبہ اور بھی زیادہ احتیاط سے اوپر گیا، سب جتن کر لئے کچھ فائدہ نہ ہُوا، وہاں سے پلٹا تو دو بجنے والے تھے، رہ رہ کر دھماکوں اور چھت لرزنے کا مضمون دُہرایا گیا، اسی حال میں جھپکی لگ گئی۔

دوسری شب

گو رات کے واقعات حافظہ میں تازہ تھے، لیکن صبح میں نے کسی کو ہوا نہ دی، کہ بات کا بتنگڑ نہ بن جائے حسبِ دستور روزانہ کے کاموں میں مشغول ہو گیا، کچہری سے واپس آنے پر بھی بھاپ نہ نکالی، جیسے کچھ ہُوا ہی نہ تھا۔

حقّہ پیتے چراغ جل گئے، تھوڑی دیر بعد کھانے سے فراغت ہو کر میں نے کتابیں سنبھالیں، ورق گردانی کرنے لگا، نوکر جا کر اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں اوڑھ لپیٹ کر پڑے رہے۔

اِس رات گیارہ بجے ہی جھونکے شروع ہو گئے، نیند کی آندھی رو کے نہ رُکی۔ مجبوراً مطالعہ بند کرنا پڑا۔

گہری نیند میں کہ تن بدن کی سُدھ نہ تھی، کوئی چیز دھپ سے میری پٹی کے پاس گری، اُٹھا جو گھبرا کر تو شمع گل اندھیرا گھُپ، جلدی سے دیا سلائی جلائی، اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، پلنگ کے نیچے دیکھا، پلنگ کے نواڑ اور دیوار کی سفیدی کے سوائے کچھ نظر نہ آیا، میں تھا کہ فوراً ڈنڈا سنبھال تڑپ کر صحن میں، پھر صاحب مکان کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ مگر کیا مجال جو چوہے کا بچہ بھی دکھائی دیا ہو۔

پلٹ کر دوسری دیا سلائی جلائی، تو ابھی شمع بہت باقی تھی، اپنے آنسوؤں میں گڑی ہوئی، کچھ سمجھ میں نہ آیا کس نے خوش کی، اور کون میری پٹی کے پاس کُود کر صاف غائب ہو گیا۔

تیسری شب

اس کمرے کے آخر میں ایک کوٹھڑی تھی، کچہری جاتے وقت میں نے خدمتگار کو حکم دیا۔

"میرا پلنگ کوٹھڑی میں بچھا دینا، یہاں بڑی سردی لگتی ہے!"

وہ بولا:۔

"حضور! اس کوٹھڑی کو یوں ہی رہنے دیجئے! اسے کھولنا ٹھیک نہیں، سب کہتے ہیں اس میں کسی شہید مرد کا مزار ہے آج تک جو اس میں سویا برباد ہو گیا!"

میں نے کہا، "شہید مرد ہیں تو کیا کہنا، بہت اچھی بات ہے، ہم تو اور اُن کی حفاظت میں آ گئے، شہید مرد دُنیا کی مُرادیں پُوری کرتے ہیں، کسی کو ستاتے نہیں"

مجھے ہم خیال بنانے کی اس نے بہتیری کوشش کی، مگر بھلا کہیں میں ماننے والا تھا، ایک نہ سُنی، چلتے چلتے سخت تاکید کرتا گیا، کہ آج ضرور میرا پلنگ اس کوٹھڑی میں پہنچا دینا!

واپسی پر پڑھنے لکھنے کا سامان اور پلنگ وغیرہ سب کچھ وہاں ملا۔

رات کو مطالعہ کر کے بستر پر دراز ہُوا، کافی نیند لینے کے بعد جب کچھ کچھ حواس بیدار ہوتے جاتے تھے، سُنتا کیا ہوں:۔

غوں ..... غوں ..... غوں ..... اُوں ..... اُوں ..... اُوں ..... اُونہہ ....

لو بھئی اور سُنو، یہ کرشمہ ہی نرالا ہے، خدمتگار اس کوٹھڑی میں کسی شہید مرد کا مزار بناتا تھا .....

غوں ..... اُوں ..... غوں ..... اُوں ..... اُوں ..... اُوں

لالٹین کی تیز روشنی میں کوٹھڑی کا ذرہ ذرہ چمک رہا تھا، ہر طرف نظریں گھمائیں، پٹی کے نیچے سر لٹکا کر دیکھا، چند سے زمین پر نگاہیں گاڑے رہا، چھت پر ٹکٹکی باندھ کر کان لگائے، کسی کل چول نہ بیٹھی، کوئی قیاس شبہ کے اڑنگے سے نہ نکل سکا، میں فیصلہ کرنے سے قاصر رہا، کہ اس غوں غوں اوں اوں کا منبع شمال، جنوب، مشرق، مغرب میں سے کوئی سمت ہے، چھت گنگنانے لگی، زمین میں سُر پیدا ہو گئے، در و دیوار الاپ رہے ہیں، یا خاص میرے دل و دماغ میں کسی غیبی آواز کا ارتعاش ہے۔

پھر سوچا، اجی کچھ نہیں، شہید مرد وظیفہ پڑھ رہے ہوں گے، بھلا ایسے بزرگوار ہم گنہگاروں کو نظر کیسے آسکتے ہیں، یہی بہت سمجھو کہ اُن کی گنگناہٹ سنائی دے جائے۔

وہ غوں غوں عجیب ہی چیز تھی، ایک خاص اُتار چڑھاؤ سے شش جہت میں چھائی ہوئی، اس کے تار میں بارہا محسوس ہوا جیسے کوئی چھاتی پر چڑھا چلا آتا ہے، مگر یہ استقلال، کسی کو آواز نہ دی، جی کڑا کئے خاموش سُنتا رہا، یہاں تک کہ چڑیاں چہچہانے لگیں۔

چوتھا دِن

ناشتہ و اشتہ سے فارغ ہوا ہی تھا، کہ رائے شمبر دیال صاحب تشریف لے آئے، دو ایک منٹ بیٹھ کر بولے:۔

کیوں صاحب! یہاں کیا کر رہے ہیں، آج اتوار ہے کچھ کچہری وچہری تو جانا نہیں، آیئے ذرا شمس العلماء مولوی ضیاء الدین صاحب سے ہی مل آئیں!!

اچھی بات ہے، میں نے کہا، اور کپڑے وپڑے بدل کر ان کے ساتھ ہولیا۔

جب ہم مولوی صاحب کے یہاں سے واپس آ رہے تھے تو رائے صاحب نے فرمایا:۔

ابھی کھانے میں کسی قدر دیر ہے، آج کل لالہ سریرام صاحب خزانچی علیل ہیں، ذرا اُن کی مزاج پُرسی کرتے چلیں تو کیسا؟

ٹھیک ہے، مجھے خیال نہیں رہا تھا۔ (گھڑی دیکھ کر) ابھی تو گیارہ بجے ہیں، گھنٹہ پون گھنٹہ اُن کی عیادت بھی سہی!

محلہ تو آ ہی گیا تھا۔ جنوبی سڑک سے سیدھے ہاتھ والی گلی میں مڑ کر ہم خزانچی صاحب کے گھر پہنچے، ہمیں دیکھ کر اُنہیں بڑی مسرت ہوئی، ویسے بھی مرض میں افاقہ تھا، اب اور صورت پر بحالی آگئی، خوب باتیں کیں، کہنے لگے، اس بات سے مجھے بے حد خوشی ہوئی، کہ آپ میرے پڑوس میں آگئے۔

پڑوس، میں آپ کا پڑوسی کب سے ہو گیا، جناب! میرا مکان تو اس گلی میں ہے دوسری طرف۔

لالہ جی مسکرائے اور فرمایا:۔

جی، نئے نئے تشریف لائے ہیں، ابھی آپ کو یہاں کی سمتوں کا اندازہ نہیں، دیکھئے وہ سامنے والی دیوار کے پیچھے کس کا مکان ہے؟

اب جو غور کرتا ہوں، تو واقعی کچھ کچھ سمجھ میں آیا، کہ ٹھیک تو ہے، اس دیوار سے ملے ہوئے کمرے کی پشت پر (جو وہاں سے صاف نظر آرہا تھا) وہ کمرہ ہونا چاہیئے، جس میں جمعرات کی شب کو رہ رہ کر کسی کے پیروں کی آہٹ ہو رہی تھی، البتہ اُدھر کا کھلی چھت والا کمرہ چھوٹا اور میرا بڑا ہے۔

خاص کر اس بنا پر لالہ جی کے بیان کی اور بھی تصدیق ہوئی، کہ جس دیوار کے اِدھر اُدھر یہ کمرے تھے اس میں لالہ جی کے کمرے سے کوئی دو ڈیڑھ گز آگے ایک روشن دان نظر آیا، جس کے نیچے کوئی چار ایک انگل کی کنگنی نکلی ہوئی تھی، یقیناً اُسی روشن دان کے نیچے اس وقت میرا پلنگ تھا، جب دھماکے سے میری آنکھ کھلی اور پھر کوئی متنفس نظر نہ آیا۔

لالہ جی سے رخصت ہوتے ہوتے میں نے دیکھا، کہ اس کمرے کی چھت پر روشن دان کے رُخ انگیٹھی سے لڑکے نے دودھ کا برتن اُتارا، اور ایک لڑکا ہاتھ میں چلم لئے کھڑا ہے۔

میں رائے صاحب کے پاس دوسری گلی سے جایا کرتا تھا، انہیں گھر تک پہنچا آنے کے خیال سے جب شمالی تیرا ہے پر غربی سمت مڑنے لگا، تو اُنھوں نے فرمایا:-

کدھر؟ اجی جناب آپ کا گھر اس طرف ہے، آیئے میں آپ کو ایک نیا راستہ بتاؤں؛

چند قدم چلے تھے کہ اُنھوں نے اشارہ کر کے فرمایا:-

دیکھئے یہ ہے مکان آپ کا!

اپنے مکان کے پچھواڑے اِس رُخ ایک درخت کے نیچے کسی بزرگ کا مزار نظر آیا، وہاں چھوٹے سے گھر کی دہلیز کے پاس ایک بڑھیا چرخہ رکھ رہی تھی، وہیں کے ایک آدمی نے جھک جھک کر ہمیں سلام کئے اور ترقیِ عمر و اقبال کی دعائیں دینے لگا، ہم جواب دیتے ہوئے بڑھے چلے گئے، کچھ دُور جا کر رائے صاحب نے مسکرا کر فرمایا:-

کیوں صاحب! آپ گانا تو خوب سُنتے ہوں گے؛

کیسا گانا؟ میں نے پوچھا۔

رائے صاحب: میراثی ہے یہ پڑوسی آپ کا، کتنے ہی شاگرد ہیں اِس کے۔

مَیں نے کہا، خوب! میں نہیں جانتا تھا، کہ میرے پڑوس میں اِن ران گنوں کے آدمی رہتے ہیں۔

اتنے میں میرا دروازہ دکھائی دیا، میں رائے صاحب کو گھر تک پہنچانا چاہتا تھا، مگر اُنھوں نے زبردستی مجھے روکا، اور سلام کرتے ہوئے چلے گئے۔

یہاں کھانا تیار تھا، کھانے کے بعد اپنی کوٹھڑی میں جانے لگا، تو کمرے میں قدم رکھتے ہی ہلکے ہلکے دھمکوں کے ساتھ

آہستہ آہستہ چھت ہلنے لگی، پھر جوتے کے نعلوں کی آواز بھی سُنائی دی، یکسوئی سے غور کرنے پر اندازِ رفتار بھی اُس رات کا سا معلوم ہوا۔

اُفّوہ! خزانچی صاحب کا نوکر نعل دار جوتا پہنے ہوئے تھا، اچھا وہ اس کمرے کی چھت پر آیا ہوگا انگیٹھی سے چلم بھرنے، دونوں کمروں کی کڑیاں آخر رکھی تو ایک ہی دیوار پر ہیں، اُدھر کے دھمکوں کا اِدھر آنا ہی چاہئے، یقیناً اُس رات بھی یہی قصہ ہُوا ہوگا۔

کوٹھڑی میں پلنگ پر لیٹا حقہ پی رہا تھا، ناگہاں گذشتہ شب والی غوں غوں سنائی دینے لگی، اب تو دن کا وقت تھا، فوراً خیال پہنچا، پچھواڑے جو میراثی رہتا ہے، اس کی نانی چرخہ کات رہی ہوگی۔ اور پچھلی رات بھی اُسی نے یہ راگ شروع کیا تھا، میں سمجھا شہید مرد وظیفہ خوانی فرما رہے ہیں۔

دہشت انگیزی

رات کے ڈیڑھ ایک کا عمل ہوگا، دفعتہً اِس زور کی چیخ سنائی دی، آنکھ کُھل گئی، آیا جو گھبرا کر صحن میں تو معلوم ہُوا خدمتگار پر کوئی بلا نازل ہوئی ہے، اُس وقت سائیس اَور بھنڈاری بھی دَوڑ پڑے، جُوں ہی اس کی کوٹھڑی کے کواڑ کھولے، ہمیں دیکھ کر اور چیخا، بُری طرح بچارے کی گھگی بندھی ہوئی تھی، مارے بدحواسی کے پہچان نہ سکا ہم کون ہیں۔

کیا ہُوا، ارے کیا ہے، بولتا کیوں نہیں کم بخت، بتا تو سہی کیا ہُوا . . . . . ابے ڈرتا کیوں ہے

اُسے کھینچ کر اندھیری کوٹھڑی سے نکالا، ہم دونوں اس کو پکڑے رہے، سائیس کو لالٹین کے لئے دوڑایا، وہ فوراً میرے کمرے سے اُٹھا لایا، روشنی میں اس کا ڈکرانا تو بند ہُوا لیکن ہائے مرگیا، ہائے مرگیا کہہ کہہ کر بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

بڑی تسلی تشفی کے بعد بتدریج اس کی وحشت میں تخفیف ہوئی، اٹک اٹک کر لرز لرز کر کہنے لگا:۔

حضور! جانے کون . . . . میرے اوپر . . . . کودا تھا . . . . . بڑے زور سے . . . . جب میں اُٹھا تو کوا لڑکھڑاتا ہُوا بھاگ . . . . گیا . . . .

کیسی شکل کا تھا؟ وہ کُودنے والا!

حضور! کالا کالا تھا، یہ بڑا۔

بھنڈاری کو بے اختیار ہنسی آئی، بولا:۔

واہ بے وا، تو نے بھی حد کردی، ارے بلّے سے ڈر گیا، میں پیشاب کر رہا تھا، تیری کوٹھڑی سے نکل کر ابھی ابھی میرے پاس ہوتا ہُوا گیا ہے!

واقعی بِلّا ہوگا، کیونکہ جب میں کمرے سے نکلا ہوں، تو مَیں نے ایک سیاہ بِلّا منڈیر پر جاتا ہُوا دیکھا تھا۔

خدمتگار سے پوچھا، کہ وہ بِلا کودی کدھر سے تھی تیرے اوپر، تو بولا سرہانے کی طرف سے!

لالٹین سے کوٹھڑی دیکھی تو بے شک سرہانے کی طرف میرے کمرے کے روشن دان کی ساخت کا روشن دان موجود تھا۔

اب اس کی سمجھ میں آیا، کہ ضرور بِلّا ہی کودا ہوگا، لیکن کہیں پھر نہ آ کُودے۔ اس خوف سے فوراً ایک ٹوٹا ہُوا پایہ لاکر اُس روشن دان میں اَڑا دیا۔

میں جو اپنے کمرے میں داخل ہُوا، اور وہاں کا روشن دان دکھائی دیا، معاً خیال آیا، کہ اچھا پرسوں رات کو خزانچی صاحب کے مکان سے اس روشن دان کے راستہ وہی بِلّا میری پٹّی کے پاس دھم سے کُودا تھا۔ اسی کی ہوا سے شمع گُل ہوگئی ہوگی۔

حاضرات

ان واقعات کے بعد مجھ پر تو مکان کی نحوست کے بھید کُھل گئے۔ اچھی طرح سمجھ گیا کہ یوں ہی غپّیں اُڑائی گئی ہیں، مگر ان کوڑ مغز نوکروں کا وہم کس طرح دُور کیا جائے، سوچتے سوچتے ایک تدبیر سُوجھ گئی۔ مَیں نے ان سے کہا:۔

محلّے والوں کو اطلاع دے رکھنا کہ اس ہفتہ کی شام کو ہم حاضرات کر کے مکان کیلنے والے ہیں، اور اگر ضرورت ہوئی، تو ایک آدھ آسیب کو شیشے میں بند کر کے زمین میں دفنا بھی دیں گے۔

ہفتہ کی شام کو لوگ آگ جمع ہوئے، میں نے لیپی پُتی جگہ میں عطر پھلیل، پھُول پان، لیموں، سیندور، لونگ، سپاری اور شیرینی وغیرہ رکھ عود بتیاں سُلگائیں، پھر اُنگلی سے حصار کھینچ کر لگا دھڑا دھڑ منتر پڑھنے، اِس جتن سے کہ سمجھ میں کسی کی خاک نہ آئے مگر ہونٹ نہایت تیزی سے ہلیں، ساتھ ہی عجیب عجیب اشارے کئے، طرح طرح کی صُورتیں بنائیں، بار بار آنکھیں بند کر کر کے مراقبے میں گیا، کھوپڑی گھمائی، دیدے منکائے، حاضرین میری حرکات و سکنات سے سخت متاثر ہوتے رہے۔

آخر لوہے کی پانچ کیلوں پر دَم کر کر کے خوب دُھونی وونی دے کر حصار سے باہر آیا، چار کیلیں چاروں کونوں میں اور ایک مکان کے صحن میں گاڑ کر شیرینی تقسیم کی، نیز یہ بھی کہا کہ بھئی بڑے بھاری آسیب نے مکان پر قبضہ کر رکھا تھا۔ مَیں تو اسے گاڑ دیتا مگر ہاتھ نہ آیا۔ خیر اب کیلا بھی ایسا ہے کہ سَو سال تک تو وہ اِدھر کا رُخ نہ کرے گا۔

تعارف

دُوسرے روز صبح کو رائے صاحب سے ملنے گیا۔ وہاں ایک اَور صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ اِن سے تعارف کرانے کے بعد رائے صاحب نے دریافت کیا:۔

یہ رات کو شیرینی کیسی بھیجی تھی آپ نے؟

حاضرات کی تھی! میں نے جواب دیا۔
حاضرات، ہائیں کیسی حاضرات؟
یوں ہی ذرا مکان کیلنے کی غرض سے حاضرات کی تھی۔
جو صاحب رائے صاحب کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے؛ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے:۔
کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ کس بزرگ نے حاضرات کی تھی۔
جی میں نے ہی!
اچھا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس مکان میں کوئی خطرہ ہے، جسے دُور کرنا آپ نے ضروری سمجھا۔
خیر اس سے بحث نہیں کہ دراصل خطرہ ہے یا نہیں، بہر حال کی ضرور تھی حاضرات۔
آپ جو چاہیں کریں، باقی اس مکان کے خطروں اور نحوست کا حال میں خوب جانتا ہوں۔
اب تو مجھے اور رائے صاحب کو وہ حالات جاننے کا بے حد اشتیاق ہوا، جو مکان کی نحوست سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے ہم دونوں نے متفق ہو کر اُن صاحب سے درخواست کی کہ صاحب ذرا بتایئے تو یہ قصہ کیا ہے:
کسی قدر ردّ و کد کے بعد اُنہوں نے کہنا شروع کیا:۔

(انکشافات)

ریلوے کے ایک ٹھیکیدار صاحب نے جو یہاں کے رہنے والے نہیں تھے، دو ایک کچے مکانات خریدے اور اُنہیں منہدم کرا کے یہ مکان بنوایا، جب تیار ہو گیا، تو وطن سے اپنے اہل و عیال کو بُلا کر اس میں آ بسے، اتفاق کی بات جس دن سے وہ یہاں آئے بیچاروں کے کام میں گھاٹا ہوتا گیا، اور خیر سے ایک ششماہی نہ گزری تھی چار پانچ روز بیمار رہ کر انتقال کر گئے، ایک تو ان کے متعلقین کو یہ شہو لیسے بھی پردیس تھا، دوسرے سر دھرا نہ رہا، وہ یہاں کیا رہتے ایک اور شخص کے ہاں بیچ کھوچ اپنے وطن کو چلے گئے۔
اس اثنا میں لالہ دینا ناتھ صاحب کے سالے شمبھو دیال صاحب اس سے ملے ہوئے مکان میں آ رہے، اب یہ صُورت پیش آئی کہ جس نے یہ مکان خریدا تھا، اس کا لڑکا تھا سخت اوباش، چند ہی روز میں اس کی بدچلنی سے اڑوسی پڑوسی تنگ آ گئے جب دیکھو نئی شرارت اُٹھاتا۔ اس کے خوف سے محلے کی بہو بیٹیاں لرزا کرتی تھیں۔
سب ہی کچھ ترکیبیں کیں، اس آوارہ لڑکے سے بس نہ چلا، اتنے میں آئی برسات، اساڑھ کا ایک آدھ ہی چھینٹا پڑا تھا، ہیضہ سے وہ لڑکا جوانا مرگ ہو گیا۔
لڑکا اپنے ماں باپ کا تھا اکلوتا، گھٹنی کے پھرے وہ اس سانحہ کی تاب نہ لا سکے۔ مکان کو منحوس سمجھ کر بیچنے کی فکر میں ہوئے۔

ہمارے لالہ شمبھودیال صاحب جو ایک چلتی رقم ہیں، اپنا دواخانہ بنانے کو اس مکان کی مردانہ نشست پر تاک لگائے ہوئے تھے؛ اور بھی کوئی نہیں، خاص اپنے بہنوئی لالہ دینا ناتھ صاحب کو اُلٹی سیدھی پڑھا کر مکان خرید وادیا، اور کوئی پندرہ میں ہی دن میں دواخانہ بنا ڈالا۔

اِدھر یہ اُستادی کی، کہ جو محلے دار اُس لڑکے کی حرکتوں سے نالاں تھے، اُنہیں ہم خیال بنا کر افواہ اُڑادی، کہ یہ مکان بڑا منحوس ہے، اس میں جو آیا مرا۔

پھر بھلا کون اس طرف کا رُخ کرتا، کبھی کوئی پردیسی بھول بھی پڑا، تو محلے داروں نے جھوٹا سچا خوف دلا کر اُدھر سے اُدھر ہی اُچٹادیا، اور یہ پیچھے بلا فلّ وغش دواخانہ چلاتے رہے، ان حضرت نے اس مکان میں کسی کو نہ آنے دیا، ہر آنے والا نحوست کی دہشت سے اُلٹے پیروں پھرا۔

مدتوں بعد اب ملے ہیں سیر کو سوا سیر، خوب ڈٹ کر رہئے۔ اس میں کوئی آسیب ہے اور نہ یہ مکان منحوس، ساری کارستانیاں لالہ شمبھودیال صاحب کی تھیں، جنہوں نے دواخانہ کے رائج کرنے میں اپنے بہنوئی کا مکان نہ بسنے دیا۔

ان صاحب نے بڑے مزے سے یہ کہانی سنائی، میں اور رائے صاحب بے حد محظوظ ہوئے۔

لالہ دینا ناتھ صاحب سے پورا مکان ٹھہرا تھا، لہٰذا دوسرے اتوار کو میں نے مردانہ نشست خالی کرالی، جب تبادلہ پر میں نے وہ مکان چھوڑا ہے، تو اس کا کرایہ ڈبل ہوگیا، یعنی آٹھ روپیہ ماہوار پر اُٹھا۔

مرزا فہیم بیگ چغتائی

اقبال

"اقبال ہندوستان کے لئے سرمایۂ فخر و ناز ہے۔ اُس نے ہماری شاعری اور کلچر کو ایک نئی زندگی اور تابانی بخشی ہے۔ اور ہمیں خود شناسی اور خودداری کا وہ سبق دیا ہے جو ہمیں ایک زندہ معتمد، آزاد اور خود مختار قوم بنانے کے لئے کافی ہے"

(رائیٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو)

اپنی کوشش سے نہیں، ہے جو فلک سیر اقبال
اُس کو اُوپر لئے جاتا ہے زمیں سے کوئی!

(سید سجاد حیدر یلدرم)

راحل ہوشیارپوری

ذوقِ یقیں

مدت ہوئی اتنی مجھے نکلے ہوئے گھر سے
اب یہ بھی نہیں یاد کہ آیا ہوں کدھر سے!
اپنا مجھے آغاز بھی معلوم نہیں ہے!

آیا ہوں بہت دُور سے جانا ہی بہت دُور
اب گھر سے بھی مجبور ہوں منزل سے بھی مجبور
یہ بھی نہیں معلوم کہ منزل بھی کہیں ہے!

درماندہ و گم گشتہ و آشفتہ نظر ہوں
ہوں گرمِ سفر پھر بھی کہ مجبورِ سفر ہوں
مجروح دل و جاں ہیں کہ مجروحِ یقیں ہے!

مل جائے اگر ذوقِ یقیں کی مجھے دولت
پھر رشکِ دو عالم ہے مری رفعت و عظمت
یہ ذوقِ یقیں خاتمِ ہستی کا نگیں ہے!

آثر صہبائی

جمیع البدایع

مصنفہ

لطف اللہ مُہندس

فروری، مارچ اور اپریل ۱۹۳۶ء کے معارف میں "تاج محل اور لال قلعے کے معمار" کے عنوان سے مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے جو نہایت محققانہ، بسیط اور مسلسل مقالہ لکھا ہے، یہ مضمون اس کا ایک ضمیمہ ہے۔ لطف اللہ کی جن سات کتابوں کے نام مولوی صاحب کو ملے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) صور صوفی (۲) رسالہ خواص اعداد (۳) شرح خلاصۃ الحساب (۴) منتخب الحساب (۵) تذکرۂ آسمانِ سخن (۶) دیوانِ مہندس (۷) سحرِ حلال ٭

میں اپنے کتب خانے کی قلمی کتابوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ اتفاقاً لطف اللہ کی ایک اور کتاب ہاتھ آگئی جس کا پتہ مولوی صاحب کی تحقیق کے مطابق ہندوستان یا یورپ کے کسی کتب خانے میں نہیں ملتا۔ ملک میسور میں مہندس کی دو نایاب کتابوں کا دستیاب ہونا (دیوان مہندس اور جمیع البدایع) اس بات کا قرینہ ہے کہ ٹیپو سلطان شہیدؒ کی علم دوستی شمالی ہند کے علماء و فضلاء کو یہاں کھینچ لائی ہو گی اور وہ لازمی طور پر اپنے ساتھ اپنی کتابوں کو بھی لیتے آئے۔

آغاز سے ظاہر ہے کہ یہ رسالہ مجموع الصنایع سے ماخوذ ہے لیکن کہیں کہیں مہندس نے بطورِ امثال اپنا اور اپنے والد کا کلام بھی پیش کیا ہے۔ کُل رسالے سے میں نے ذیل میں ان مقامات کا استقصا کیا ہے:-

تقطیع "۶ × "۸، سطر ۱۷، صفحہ ۴۵، خط خفی و شکستہ

آغاز یہ ہے:-

"الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین اما بعد میگوید فقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار لاہوری کہ این رسالہ ایست مختصر در بدایع و صنایع موسوم بہ جمیع البدایع ماخوذ از مجموع الصنایع تالیف وزارت پناہ فضائل دستگاہ شیخ نظام الدین ابن شیخ محمد صالح سلمہ اللہ مشتمل بر مقدمہ و دو باب، مقدمہ در تقسیم کلام، کلام منثور است یا منظوم۔ منثور آن است کہ وزن و قافیہ معاً نداشتہ باشد و آن بر سہ قسم است، مرجز، مسجع و عاری . . . . . و منظوم بر دہ قسم است، غزل و قصیدہ و

تشبیب و قطعہ و رباعی و فرد و مثنوی و ترجیع و مسمط و مستزاد الخ"

باب اوّل در صنایع لفظی، اس باب میں حسب ذیل صنایع کا بیان ہے:۔

مرصع، تجنیس، معرب، مخرج، اشتقاق، ردالعجز علی الصدر، لزوم، تلون، ذو قافیتین، موشح، مشجر، مربع، مسجع نظم، حذف، منقوط، مروف، مرکب، تسمیط، مستزاد، عکس، مکرر، رقطا، خیفا، مقطع، موصل، مدور، ترجیع، ملمع، مصحف، تزلزل، تضمین، تاریخ، مقر، اللغتین ٭

باب دوم در بدایع معنوی۔ اس میں ان صنایع کا ذکر ہے:۔

ایہام، محتمل الضدین، حسن التعلیل، سوال و جواب، تجاہل العارف، تردید، اغراق، لف و نشر مذہب، قول موجب، سیاق عداد، تنسیق، ارسال مثلین، تدارک، تعجب، معما، لغز، جمع تفریق و تقسیم حسن طلب، مدح موجہ، کلام جامع، تجرید، ترجمہ، الہزل، تلمیح، اعتراض، کلام قبل تمام، التفات، استعارہ، متضاد، مراعات النظیر، ایہام، حسن قطع، حسن تخلص، مقطع، ابداع۔

تجنیس مکرر۔ فقیر لطف اللہ مہندس ابن معمار گوید ؎

بر سریر سلطنت چون ہست شاہنشاہ شاہ ۔۔۔ بادہ از ساقی طلب کن بوسہ از دلخواہ خواہ
چون تغافل می کنی جاناں بر غم دوستاں ۔۔۔ می تواں پرسید حال دوستاں را گاہ گاہ
گرچہ دارد اے سپہر در سینۂ خارا اثر ۔۔۔ در دل سخت تو تاثیرے ندارد آہ آہ
عقل صائب، دیدہ بینا، روز روشن، جادہ راست ۔۔۔ با دو صد مشعل نمی بینم من گم راہ راہ
پیش ازین ہر ہفتہ می دیدم مہندس سالہا ۔۔۔ شد کہ از جور فلک بینم پس از یک ماہ ماہ

تجنیس خط۔ الفاظے کہ در حرف اوّل متحد باشند۔ ۔ ۔ راقم رسالہ و محرر این مقالہ درین صنعت غزل گفتہ ؎

شین شکر شکر تو در کام من است ۔۔۔ عین عسل عشق تو در جام من است
غین غزل غبغب تو می خواہم ۔۔۔ طاے طلب طرّۂ تو شام من است
راے رقم رنج تو بر لوح دلم ۔۔۔ نون نمک نقش تو در نام من است
قاف قمر قدر تو بسیار بلند ۔۔۔ حاے حرم حسن تو احرام من است
فاے فلک فکر مہندس غالب ۔۔۔ میم مدد مہر تو اسلام من است

ولہ

فاے فلک فکر فنا فال من است ۔۔۔ قاف قلم قول قضا قال من است

داو ورق ورد وفا والدِ من	خاے خبر خلد خفی خالِ من است
راے رمق روح رند رفتن دِہ	باے بدل بوسہ بہ از بالِ من است
میم مدد مہر مہندس مطلب	دال دو ورد تو بہ دنبالِ من است

صنعت ردالعجز علی الصدر ...... وآن بر انواع است نوع اوّل آنکہ لفظے کہ در آخر مصرع است در اول ہمان مصرع واقع شود، وآن بر دو قسم است ...... نوع دوم آنکہ لفظے کہ در آخر بیت است در اول بیت واقع شود وآن نیز بر دو قسم است، و راقم این رسالہ غزلے دارد کہ در بیت اوّل نوع اوّل است واز ابیاتِ دیگر نوع ثانی وآن این ست ؎

صدرا بہ تو احتیاج صدرا	بدرا ز تو نور نیک وبدرا
قدرا خم اگر بود کند خم	در مجلس تو بلند قدرا
دورا سروکار با من افتاد	مشکل نہ کنی اگر مددرا
مدرا زحروف ہجر برداشت	صدگونہ ثنا کنم صمدرا
حدرا اشناختی مہندس	حد نیست عنایت احدرا

نوع سوم آنکہ لفظے کہ در آخر مصرع است دراوّل مصرع ثانی ولفظے کہ در آخر مصرع ثانی است در اول مصرعِ ثالث آرند، محرّرِ این رسالہ وراقمِ این مقالہ دو رباعی گفتہ است بہمیں صفت۔ رُباعی

مغرور مشو کہ تا نہ گردی مہجور	مہجور دلے بود کہ گردد بے نور
بے نور بود کسیکہ باشد مقہور	مقہورِ خدا نگشت الّا مغرور

رُباعی

منصور بود کسیکہ باشد معمور	معمور بود کسیکہ گردد مغفور
مغفور شود دلے کہ باشد منظور	منظور نظر نہ گشت الّا منصور

اسی کے ضمن میں لطف اللہ نے برہان نامی اپنے کسی رشتہ دار کی غزل لکھی ہے، مذکور عزیز یوں ہی تفریحاً شعر کہتے تھے یا شعرا کے طبقے میں ان کا شمار تھا اس کا علم نہ ہوسکا، ممکن ہے کہ مہندس نے آسمانِ سخن میں ان کا تذکرہ کیا ہو، مولوی صاحب سے استدعا ہے کہ وہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں۔

"برہان نام عزیز غزلے دارد کہ مرکب است از نوع ثانی وثالث وآن غزل اینست"

دربرم ہرگز نیاید اے دریغا دلبرم	دلبرم را تنگ می آید کہ آید دربرم

می برم صد آرزو ہر دم ز بہر روی او	روی او را گر نہ بینم داغ حسرت می برم
بنگرم گر روی آن مہ ہدیہ سازم جان و دل	جان و دل سازم فدا گر من بر ویش بنگرم
می درم اندر فراقش ہر شبے صد پیرہن	پیرہن ہر روز و ساتن تا گریبان می درم
از سرم ہرگز نہ خواہد رفت یاد عشق او	عشق او ہرگز رود گرچہ رود مغز از سرم
از کرم بر جانِ بر آہان کن نگاہے اے صنم	اے صنم بر جان زارش کن نگاہے از کرم

صنعتِ مربع :۔

تو شاہ جہانی	معلّی سریرت	شہ انس و جانی	مہینِ ظہیرت
معلّی سریرت	سکندر فقیرت	سلیمان وزیرت	محمد نصیرت
شہ انس و جانی	سلیمان وزیرت	مہ مہربانی	منور ضمیرت
مہینِ ظہیرت	محمد نصیرت	منور ظہیرت	مہندس اسیرت

صنعتِ حذف ۔ حرف الف ترک کردہ فقیر لطف اللہ مہندس استاد احمد معمار گفتہ ۔

ز بہرِ دیدن روی تو قرنے در بدر گشتم	ندیدم روئے تو ہر چند گیتی سر بسر گشتم
پیِ تحصیل برگِ خویش گشتم بر سرِ گیتی	ز مشرق سوئے مغرب گشتہ دیگر روز بر گشتم
بفرقم مدعی گر می زنی شمشیر معذورم	درختِ بے ثمر بودم کہ مقطوع تبر گشتم
درختِ پُر ثمر گردد ز سنگِ بد گہر خوگر	ز جورِ کس نہ رنجم چوں درختِ پُر ثمر گشتم

کاتبِ این رسالہ و محرر این مقالہ کتابے نوشتہ موسوم بہ سحر حلال مشتمل بر نظم و نثر و این چند بیت از آن کتاب است ۔ ابیات ؎

اکرم او را دسحر حمدِ او	واسطۂ سالکِ گہر حمدِ او
حامد او آمدہ ماہ و سمک	مادح او آمدہ حور و ملک
مادح او ہم مگس و ہم ہما	. . . .
حامد او سرو گل و لالہ ہم	مادح او مہر و ملک ہالہ ہم
کاسۂ گل را درم آمود کرد	آہ سحر را الم آمود کرد
کردۂ او کوہ و کہ و مہر و ماہ	دادۂ او ہم کمر و ہم کلاہ

صنعتِ تاریخ ۔ فقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار تاریخ طوبیٰ سلیمان ابن دارا شکوہ یافتہ ؎

کدخدا گشتہ باقبال بلند | پور دارائے زمان شاہ زمین
در زمانیکہ مرادات جہاں | بود در دست چو در دست نگین
گفت جبریل امیں تاریخش | بر سلیمان شدہ بلقیس قرین

و محررِ این رسالہ تاریخ عمارت شاہزادہ داراشکوہ یافتہ :۔

چون بنا کرد قصر جاہ و جلال | ظل حق پادشاہ عالی ملک
شمسۂ این عمارتِ والا | تافت چون مہر بر حوالی ملک
کرد معمار قصرِ تاریخش | قصرِ داراشکوہ والی ملک

(دوسرے شعر میں شمسہ کی جگہ معارف بن شبہ چھپ گیا ہے)

راقم این رسالہ تاریخ وفات جعفر خان مرحوم و مغفور گفتہ :۔

خان عالی شاں وزیر بادشاہ | در ریاض جنت فردوس خفت
گفتم اے ہاتف بگو تاریخ فوت | آہ جعفر خان بدادہ جاں بگفت

و تاریخ احسن اللہ خاں کہ در مدرسۂ میرزا محمد عادل ہمدرس این فقیر بود ؎

آخر الامر رفت از عالم | ہر کہ پیدا شد از بنی آدم
احسن اللہ برفت گفت خرد | احسن اللہ برفت از عالم

اس تاریخ سے یہ ظاہر ہے کہ لطف اللہ مہندس کی تعلیم مدرسۂ میرزا محمد عادل میں ہوئی۔ لہٰذا مولوی صاحب کا یہ جملہ کہ "اس نے تمام تر اپنے اسی بڑے بھائی (عطاء اللہ رشیدی) سے تعلیم پائی ہے" ترمیم چاہتا ہے۔ (معارف فروری ۱۹۳۶ء)

تاریخ والدِ مرحوم گفتہ :۔

در زمانِ سعید شاہ جہاں | شاہِ عالم پناہ جم مقدار
نادرِ عصر رفت گفت خرد | شد بفردوس احمدِ معمار

راقم این رسالہ عالی مقالہ گفتہ :۔

قصر مثمن کہ بنا کرد خان | ہست شکوہش چو شکوہ فلک
روح قدس از پئے تاریخ گفت | ہشت بہشت آمدہ بے ہیچ شک

صنعتِ متضاد۔ محررِ این رسالہ شیرین مقالہ در بیتِ چہارم این مصرع ہر چہار عنصر را درج کرد :۔

(۱)	دارا شکوہ شاہجہاں بانی جہاں	بر جملے مبارک است سلیمانی جہاں
(۲)	اے بانی جہاں کہ جہاں در ثنائے تست	یک لحظہ کو کہ شد ز ثنا خوانی جہاں
(۳)	پروردگار باد نگہبان دولتت	زاں رو کہ کار تست نگہبانی جہاں
(۴)	تا ز آب و آتش است نشاں در زمانہ باد	روشن ز خاک پائے تو پیشانی جہاں
(۵)	تا کے مہندس است پریشان چو زلف یار	اے وز تو دور گشت پریشانی جہاں

جمیع البدایع میں اس غزل کے اشعار اسی ترتیب سے لکھے گئے ہیں لیکن مولوی صاحب کے مقالے میں یہی شعر اس ترتیب سے لکھے ہیں، ایک، چار، دو، تین، پانچ۔ (۱-۴-۲-۳-۵)

حسن مطلع :-

مالدِ ذرۂ بے مقدار نادر العصر احمد معمار برائے اعظم خان کہ اوّل ارادت خان بود کتابے نوشتہ وابتدا بہ این بیت کردہ

چو قانونِ ارادت ساز کردم
باسمِ اعظمش آغاز کردم

مولوی صاحب کے مقالے کے پیشِ نظر احمد معمار لاہوری کی یہی پہلی تصنیف ہے جس کا اشارہ ملتا ہے، لیکن یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ لطف اللہ مہندس فقط "کتابے" کہہ کر خاموش ہو گیا اور اس کا نام نہ بتایا، خیر اس کتاب کا یہی ایک شعر جو تبرکاً ہاتھ آگیا ہے غنیمت ہے۔

صنعت ابداع :-

محرّر این رسالہ لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار گفتہ

روزِ اول ایاز خواستہ بود
کہ مرا باد عاقبت محمود

و بر ہمیں مصرع این باب را بلکہ این کتاب را ختم نمود، واللہ اعلم بالصواب۔

محمد خاں

تجدیدِ محبّت

یہ ابر یہ خُنکی، یہ ہواؤں کا تلاطُم — ہے ساز کہاں، جام کہاں اور کہاں خُم

میدان میں دیکھو تو برستا ہُوا پانی — یہ شور، یہ رِم جھم، یہ جھما جھم، یہ ترنُّم

یہ ابر کے دامن میں مچلتی ہوئی بجلی — یُوں جیسے ہو رقصاں لبِ لعلیں پہ تبسّم

پانی نہیں بادل سے برستی ہے جوانی — اِس رُت میں تم اَے کاش کرو مجھ پہ ترحّم

مانا کہ خفا ہو، مگر اِس فصل کی خاطر — مَن جاؤ کہ تجدیدِ محبّت کریں ہم تُم

کیا تُم کو نہیں عشق و جوانی کا ذرا پاس؟ — کچھ ناز ہو کچھ راز، کھُلے بابِ تکلُّم

اب آؤ بھی اِک ساغرِ مَے بھر کے پلا دو!

اور چھیڑ کے پھر ساز کوئی راگ سُنا دو!

مرزا یاور علی

"He and She"

ہی اینڈ شی

طالب علمی کا زمانہ موسمِ بہار کی طرح خوش آئند ہوتا ہے۔ خزاں اُس وقت نازل ہوتی ہے جب یونیورسٹی کے امتحانات قریب آ رہے ہوں۔ جس طرح باغ میں خزاں زدہ مُرجھائی ہوئی زرد زرد پتّیاں منتشر ہو جاتی ہیں اِسی طرح طلبہ جن کا رنگ روز و شب کے مطالعہ سے زرد پڑ گیا ہوتا ہے امتحانات سے سبکدوش ہوتے ہی منتشر ہو جاتے ہیں۔

بی۔ اے کا امتحان دیتے ہی ہم تینوں سے بھی یہی ہُوا۔ سعادت کا مکان تو لاہور ہی میں تھا، مَیں اور عتیق امتحان سے فارغ ہونے کے چار دن بعد اپنے اپنے وطن کو سدھارے۔ جی جانے کو نہ چاہتا تھا مگر گھر سے بلاوے آ رہے تھے کہ اب تمہارا لاہور میں کیا کام ہے، امتحان ختم ہو چکا ہے گھر آؤ۔ چار و ناچار ہم ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔ ریلوے اسٹیشن پر ایک ایک کی کامیابی کے لیئے دُعا مانگی گئی اور وعدے کیئے گئے کہ اگر تینوں کامیاب ہوں تو نتیجہ نکلنے کے فوراً بعد ہر ایک کو سٹفل ہوٹل میں ٹی پارٹی دینی ہوگی۔

چونکہ عتیق کے دو پرچے اچھے نہ ہوئے تھے اِس لئے اُس کو اپنی کامیابی کا یقین نہ تھا۔ شاید اسی لئے ریلوے سٹیشن پر اُس کا چہرہ اُداس سا معلوم ہوتا تھا، باتوں باتوں میں ہم نے اُسے تسلّی دینے کے لئے کہا کہ گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں، باقی مضامین کے زور پر تمہارے کمزور پرچوں کی کھپت ہو جائے گی۔ ابھی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گاڑی نے حرکت کی اور اُسے لے کر پل بھر میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ شام کو سعادت مجھے اسٹیشن پر پہنچانے آیا اور عتیق کی گاڑی کی طرح میری گاڑی بھی مجھے لاہور کی سرزمین سے دُور بھگا لے گئی۔

لاہور میں عتیق اپنے بھائی کے ساتھ ایک کرایہ کے مکان میں رہتا تھا۔ اُس کا بھائی ایم۔ اے پاس کر چکا تھا اور کالج نے اُسے ریسرچ کے کام پر لگا رکھا تھا۔ لاہور میں یہی عتیق کا سرپرست اور محافظ تھا۔ اُن کا مکان نسبتاً رونق جیسی بارونق جگہ پر ایک فراخ کوچے کے اندر واقع تھا۔ صرف دو ایک مسلمانوں کے اور مکان تھے باقی سب آبادی ہندوؤں کی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں ہوسٹل کی یکساں زندگی سے اُکتا کر عتیق کے یہاں چلا جاتا، وہاں کچھ گھریلو سا نقشہ دیکھ کر طبیعت میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہو جاتی اور سعادت بھی اکثر اندرونِ شہر کی تنگ و تار گلیوں سے گھبرا کر وہاں آ جاتا۔ اور جب شلم کی سیر کا اِرادہ کبھی کبھار فسخ ہو جاتا تو ہم بالکونی میں کُرسیاں نکلوا کر گپ شپ میں مشغول ہو جاتے۔ محلّے میں یوں تو سارا دن رونق رہتی مگر بالخصوص شام کے

وقت خوب چہل پہل ہو جاتی۔ زرق برق لباس اور بدن سے چمٹی ہوئی ریشمی ساریاں اکثر اتنی جاذب توجہ ہوتیں کہ ہم اپنا موضوع سخن بھول جاتے۔ عتیق کے بڑے بھائی نے ہارمونیم شوقیہ رکھا تھا اور ہم میں سے صرف سعادت کو گانے میں کچھ شُد بُد تھی سو وہ ہمارے کہنے پر کبھی کبھی تانیں اُڑا لیا کرتا۔ غرض کہ عتیق کا مکان ہماری تفریح کا بہت بڑا مرکز تھا۔

گھر پہنچ کر زندگی کی باقاعدگی اور باضابطگی مفقود ہو جاتی ہے۔ پہروں بستر میں پڑے رہنا، دیر سے غسل کرنا، کھانا پینا اور بہن بھائیوں کے جمگھٹوں میں گپ بازی کرتے رہنا گھر کی نعمتیں ہیں۔ بیس دن تک میں اسی ماحول میں جذب رہا کہ اچانک ایک دن سعادت کا خط آ پہنچا جس سے معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں مری میں مقیم ہے اور خط لکھنے میں میری بے توجہی کا شاکی ہے میں نے فوراً اُس کے خط کا جواب دیا اور ساتھ ہی ایک خط عتیق کو بھی لکھا جس کا جواب آٹھ دس دن کے بعد آیا کہ ہفتہ عشرہ تک میں لاہور جانے والا ہوں اور نتیجہ نکلنے تک اِس خوف سے وہیں رہنے کی کوشش کروں گا کہ اگر فیل ہو گیا تو گھر والوں سے تو دُور ہوں اور اس طرح ناکامی کے رنج و افسوس اور فیل ہونے کی ندامت کے دوگونہ عذاب کو اعزہ و اقربا کے درمیان رہ کر اور زیادہ تلخ تو نہ بنالوں۔ خط پڑھ کر میرے دل میں عتیق کے لئے زیادہ ہمدردی پیدا ہو گئی۔ مانا کہ وہ محنتی نہ تھا مگر ذہانت کے زیور سے مزین تھا۔ اُس کی باتوں میں علمیت جھلکا کرتی تھی۔ کالج کے خوش ذوق اور مہذب طلبہ میں شمار ہوتا تھا۔ ادبی مجالس کا ناگزیر رکن تھا۔ حاضر جوابی میں خاص ملکہ رکھتا تھا وہ اُن طلبہ میں سے نہ تھا جو کالج میں صرف کتابی کیڑا بننا سیکھتے ہیں۔ وہ کچھ اور بھی سیکھنا چاہتا تھا۔ پھر چند لمحہ بعد مجھے خیال آیا کہ اگر اُس نے درسی کتابوں پر محنت نہیں کی تو اُس کی ذہانت کیا کر سکے گی۔ ممکن ہے اُس کے پرچے زیادہ خراب ہوئے ہوں اور اُس نے ہمیں نہ بتایا ہو۔ میں نے خط کے جواب میں اُسے صرف ایک شعر لکھ کر بھیج دیا اور بے صبری سے نتیجہ کا انتظار کرنے لگا۔

وقت گزرتا گیا۔ نتیجہ نکلنے کی تاریخ قریب آتی گئی۔ جس طرح کسی ملزم قتل کے فیصلہ کی تاریخ قریب آرہی ہو، ذہنی سکون اور دل کا اطمینان خوف سے کانپنے لگے، خدایاد آنے لگا۔ ناکامی کے خیال سے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ وہ آنکھیں جو رات کو دس گیارہ بجے بے فکر نیند کے مزے اُڑایا کرتی تھیں اب دو بجے تک بیدار رہنے لگیں۔

نتیجہ نکلا ——— میں، ——— سعادت، ——— عتیق، ——— تینوں کامیاب۔ سہ گونہ خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُسی وقت مبارک باد کے تہنیت نامے لکھے گئے۔ اگلے روز پہلی ڈاک ہی میں سعادت اور عتیق کے خطوط مری اور لاہور سے موصول ہوئے کہ اس خوشی اور مسرت کے "سہ آتشہ" جام کا نشہ دماغ اور دل سے اُتارے نہیں اُترتا، کہو اب وہ وعدے جو لاہور میں کئے گئے تھے کب ایفا ہوں گے؟

سعادت کو صرف ایک ہفتہ اور مری میں مقیم رہنا تھا۔ عتیق نے لکھا تھا کہ میں بھی پانچ سات روز کے بعد واپس گھر چلا جاؤں گا دس بارہ دن کے بعد لاہور سے سعادت کا خط آیا کہ وہ مری سے واپس آگیا ہے۔ عتیق کے یہاں گیا تھا اُس کے بڑے بھائی

سے معلوم ہؤا کہ عتیق بیسویں تاریخ کو واپس چلا گیا تھا۔ کالج چونکہ ۸ جولائی کو بند ہو رہا ہے اس لئے اُس کا بڑا بھائی بھی چھٹی سات یں جولائی کو مکان چھوڑ کر وطن چلا جائے گا لہٰذا ہمیں ۸ جولائی سے پہلے پہلے ملاقات کی کوئی صورت پیدا کرنی چاہئے۔ سعادت کا خط پاتے ہی مَیں نے اس معاملہ کے متعلق عتیق سے مشورہ طلب کیا۔ آخر باہم فیصلہ کے مطابق یکم جولائی کو مَیں اور عتیق لاہور پہنچ گئے شام کو سعادت بھی آ گیا۔ سیر کے لئے نکلے۔ یا ہم بدلے ہوئے تھے یا لاہور۔ وہی سرزمین تھی وہی سڑکیں مگر ہمیں یوں معلوم ہو رہا تھا کہ فضا پر کامرانی برس رہی ہے۔ شادکامی ہمارے قدم چوم رہی ہے۔ وفورِ انبساط اور جوشِ کامیابی سے ہمارے چہرے تمتما رہے تھے، ہم گزرے جا رہے تھے اور فلک شگاف قہقہے ہماری ایڑیوں کے پیچھے عقبی فضا میں برابر گونج رہے تھے۔ ہم آج لاہور کی فضا کو ایسے بےفکر مسرور قہقہے عطا کر رہے تھے جن کی اہلیت ہم میں چار سال تک پیدا نہ ہوئی تھی۔ مال پر سے گزرتے ہوئے سٹفل کی طرف اُنگلی اُٹھا کر سعادت نے کہا "کل کی چائے؟ عتیق یا آصف؟"

"بھئی ایک بات ہے" عتیق نے کہا "اگر غور سے سنو تو"

مَیں اور سعادت بیک آواز بولے "ہاں، ہاں کہو۔"

"مجھے چوتھی تاریخ کو دوپہر سے پہلے واپس پہنچنا ہے اس لئے ـــــ"

"شیم" سعادت نے ماتھے پر بل ڈال کر اور آنکھوں میں مصنوعی غصہ لا کر کہا۔

بیساختہ میری ہنسی نکل گئی اور عتیق نے مسکرا کر طنزاً کہا "واہ ایکٹر"

سعادت بولا "ایکٹر و یکٹر کیا۔ جانے دوں گا تو کہنا"

عتیق نے میری طرف دیکھا۔ مَیں نے بھی ساتھ نہ دیا "ٹھیک کہتا ہے وہ۔ تمہیں کونسی مجبوری ہے اتنی؟"

"شاباش یک نہ شُد دو شُد ـــــ اچھا میری مجبوری تو سُن لو۔"

"ارشاد"

عتیق نے اپنے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "چوتھی کی شام کو خالو کے یہاں ہماری دعوت ہے۔"

"خالو کے یہاں دعوت ہے۔ کتنی بڑی مجبوری ہے آصف!!!" سعادت نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"خالو کی رخ پر زور نہ دو بلکہ ـــــ"

عتیق جھٹ تاڑ گیا بولا "ن پر؛ آصف جو تمہارے دل میں ہے سمجھتا ہوں"

ہم تینوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

مَیں نے شرارت کے لہجہ میں کہا "تو اچھا انلمی کے یہاں دعوت ہے آپ کی ـــــ"

سعادت نے بات کاٹتے ہوئے کہا "مگر نقلی تو تم سے چھپتی ہے۔ پھر ایسی دعوت کا کیا لطف؟"

"اس چھپنے ہی میں تو لطف ہے تمہاری جان نے بلا ــــ بخدا سعادت سچ کہتا ہوں بڑی مشکل سے آیا ہوں۔ والدہ کی تاکید ہے کہ چوتھی کو میں اور بھائی جان دوپہر سے پہلے پہنچ جائیں۔ پانچویں کو اتوار ہے اور چھٹی کو ویسے کالج ہی بند ہو جائے گا۔ کل اور پرسوں کا دن ہے ــــ میرے خیال میں اگر تم اتفاق کرو تو بجائے سنفل میں تین بار چائے پینے کے ایک ڈنر کیوں نہ اُڑایا جائے۔"

"عتیق ڈنر دے گا سعادت" میں نے تیقن آمیز لہجہ میں سعادت سے کہا۔

"بیشک یہ فیل ہوتے ہوتے پاس ہوگیا ہے۔ اسے ڈنر ہی دینا چاہئے تھا۔"

"مجھے انکار نہ ہوتا" جیب پر ہاتھ مار کر "مگر جیب خالی ہے۔ جب میں نتیجہ نکلنے سے پہلے ناکامی کے خوف سے یہاں چلا آیا تھا ان دنوں میری جیب وزنی تھی مگر ایک لڑکی نے لوٹ لی۔"

میں نے حیران ہو کر کہا "ایک لڑکی نے؟ وہ کیسے؟"

عتیق بڑی متانت سے بولا "وقتی جذبہ سے متاثر ہو کر میں نے سات روپے کی کتابیں ایک لڑکی کو بھیج دیں جس نے مجھے پاس کرایا ہے۔"

سعادت نے تعجب سے کہا "جس نے تمہیں پاس کرایا ہے؟"

"بڑی مزیدار کہانی ہے۔ بیٹھ کر سناؤں گا اگر تم میری رائے پر چلو تو۔"

میں نے کہا "ہمیں بناتے ہو۔ سعادت سنا! کہتا ہے اگر میری رائے پر چلو تو"

"بناتا ہے!" سعادت نے میری ہامی بھری۔

"خدا کی قسم میں بنا نہیں رہا۔ سچ بات ہے۔ میں کہتا ہوں آصف کے اور تمہارے پیسے جو سنفل میں چائے پر علیحدہ علیحدہ صرف ہوں گے ان کا ڈنر اُڑایا جائے اور میرے پاس چونکہ روپے کم ہیں اس لئے میری دعوت چائے مکان پر ہی نوش فرمائی جائے۔ سنفل کی چائے میرے ذمہ رہی۔ پھر کبھی سہی"

سعادت نے میری طرف دیکھ کر کہا "کیا صلاح ہے پھر؟"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اب مجبوری ہے کیا کیا جائے۔ چلو ڈنر ہی سہی۔"

"بس ٹھیک ہے۔ کل چائے میرے یہاں اڑے۔ برتن بخوبی استعمال ہو سکیں گے اور پرسوں اسباب باندھ لیں گے۔"

میں نے کہا "اور پرسوں شب ڈنر۔ اگلی صبح تم جا سکتے ہو۔"

سعادت نے عتیق کی پیٹھ ٹھونک کر کہا "خیر پروگرام برا نہیں۔" اور ساتھ ہی منہ پھیر کر نوجوان لڑکیوں کے اس جھرمٹ

کی طرف دیکھا جو خراماں خراماں ہماری طرف آ رہا تھا۔

عتیق نے اپنا پسندیدہ شعر اپنی خاص لَے میں پڑھنا شروع کیا ؎

ترسا بچۂ شوخے، شنگے سکر افشانے ‌ ‌ ‌ ‌ در رہِ خمِ زلف او گمراہ مسلمانے

اتنے میں لڑکیاں تو ہمارے پاس سے مسکراتی چہ میگوئیاں کرتی گزر گئیں مگر کئی لمحے ایشز آف روزز (Ashes of Roses) کی لپٹیں ہمارے گرد گھومتی رہیں۔ ہم پھرتے پھراتے نَو بجے کے قریب عتیق کے مکان پر پہنچے۔ مجھے سعادت کھینچ کر اپنے ہاں لے گیا۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت میں اور سعادت عتیق کے مکان پر پہنچے۔ میز پر برتن چُن کر ڈھک رکھے تھے۔ میں اُن کی طرف دیکھ کر مصنوعی طور پر کھانسا۔ سعادت نے آنکھ کے اشارے سے مجھے کپڑا اُٹھانے کو کہا۔ میں نے کپڑا اُٹھایا۔ پیسٹری، پھل اور مٹھائی سے بھری ہوئی رکابیاں پڑی تھیں۔ میں ابھی انہیں ڈھانک رہا تھا کہ ملحقہ کمرے سے عتیق صاحب مسکراتے ہوئے وارد ہوئے۔

"اچھے ہو تم بھی۔ سارا دن صورت نہیں دکھائی"

سعادت نے میری طرف اشارہ کر کے کہا "سارا دن تو ان کی شوپنگ (خرید و فروخت) میں گزر گیا"

میں نے عتیق کی طرف منہ پھرا کر کہا "یہ نہیں کہتا کہ رات ڈیڑھ بجے تک اپنے" کارنامے" سناتا رہا۔ کوئی نَو بجے گھر سے نکلے ہوں گے، ساڑھے گیارہ کے قریب واپس لوٹ آئے۔ یہ ہے سارے دن کی شوپنگ۔"

عتیق نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "میں بہت دیر انتظار کرتا رہا۔ مجھے بھی بازار جانا تھا۔ آخر جلدی جلدی فارغ ہو کر بھاگا کہ کہیں تم مکان پر میرا انتظار نہ کر رہے ہو۔"

"رمضان کہاں ہے؟" سعادت نے پیشانی پر رومال پھیر کر کہا۔

"کیوں؟"

"پانی پلائے، پیاس لگ رہی ہے۔"

"گیا ہے وہ سموسے لینے۔"

"شاباش! ہم نے میز پر نظر ڈالی تھی۔ سموسوں کے لئے واللہ میں تم سے کہنے ہی والا تھا۔"

عتیق نے اپنی ابروؤں کو اُوپر کھینچتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا "سعادت! تمہاری پسندیدہ چیز میز پر نہ ہو۔ کبھی ہو سکتا ہے۔"

سعادت بھی مسکرا کر بولا "مہربانی۔ کیا چائے بھی ہوگی عتیق۔ موسم نہیں۔"

"واقعی موسم تو نہیں" مگر عتیق نے میری طرف دیکھ کر کہا "دیکھتا کیا ہے کہہ دے کہہ دے اِس بلغمی مزاج کو گرمی ہی

راس ہے۔" عتیق کے اس چست فقرہ پر مختصر سا قہقہہ بلند ہوا لیکن اس خفیف قہقہے سے میری طبیعت مطمئن نہ ہوئی اور میں نے اُسے زیادہ بلند بنانے کے لئے فوراً جواب دیا "موسم نہیں تو کیا ہوا۔ گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔"

تیر نشانہ پر لگا اور ہم تینوں کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ کمرہ بلند قہقہوں سے گونج اُٹھا —— دیکھتے کیا ہیں کہ رمضان ہاتھ میں سموسوں کی رکابی لئے ہمارے کمرے میں کھڑا دانت نکال رہا ہے۔ سعادت نے اُس کے ہاتھ سے رکابی پکڑ کر میز پر رکھ دی اور عتیق سے مخاطب ہو کر کہا "صرف ایک پیالی چائے کی بنانا بس۔"

میں نے کہا "نہیں یہ نہیں ہوگا۔ اگر چائے پئیں تو سب ورنہ ایک پیالی کی بھی ضرورت نہیں۔ اگر تم دونوں کی صلاح نہیں تو نہ سہی۔ جیسے تمہاری مرضی۔"

عتیق نے کہا "رمضان نصف درجن لیمونیڈ لے آؤ۔ مگر جلدی، برف بھی" (مجھ سے مخاطب ہو کر) "کیوں ٹھیک ہے نا؟"

میں نے جواب دیا "بالکل۔"

سعادت نے اُس کپڑے کو پکڑ کر جس سے چیزیں ڈھکی ہوئی تھیں کہا "میرا خیال ہے۔ بسم اللہ کریں۔ سموسے ٹھنڈے ہو جائیں گے" ہمارے کہنے پر اُس نے کپڑا اُٹھا دیا —— سعادت نے سموسہ مُنہ میں دبایا۔ میں نے گلاب جامن اُٹھایا اور عتیق نے کیلا چھیلنا شروع کیا۔ اس طرح بتدریج رکابیوں میں پڑی ہوئی چیزوں کی مقدار آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی۔ پیسٹری کی پلیٹ میں صرف ایک کریم رول تھا وہ عتیق نے اُٹھا لیا۔

میں نے کہا "شاباش اُس ظالم کے لئے تو گرما گرم سموسے آئیں اور ہماری پسندیدہ شے کو تم اُڑا لو۔"

"اوہو بھول گیا۔ کہو تو اور لا دوں۔"

"اور ہیں کیا؟"

"ہاں" اُس نے کرسی پر اُٹھتے ہوئے کہا اور سامنے والی الماری میں سے تین نیلے رنگ کے ڈبے جو ڈوری سے بندھے ہوئے تھے نکالے اور ڈوری کو کھولتے ہوئے کہنے لگا "تمہارے لئے آصف، امانت میں خیانت کرنے لگا ہوں۔"

"پرائی چیز ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے دو کریم رول پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔ اتنے میں سعادت نے پوچھا۔

"کس کی؟"

اُس نے ڈبوں کو باندھتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا "آ کر بتاتا ہوں۔" اور پلیٹ کو ہماری میز پر آ رکھا۔ اُس وقت اُس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور بند لب متکلم معلوم ہوتے تھے۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا "نظمی کی۔"

سعادت اپنی جگہ پر اُچھلا اور اپنا پاؤں زور سے فرش پر مار کر ایک فیصلہ کُن آواز میں کہنے لگا "منگیتر کی چیز پرائی نہیں ہو سکتی" یہ کہہ کر اُس نے کُرسی پرسے جھوٹ مُوٹ اُٹھنا چاہا تاکہ پیسٹری کے ڈبوں پر تھوڑی سی لُوٹ مار کی جائے۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور عتیق سے پوچھا۔ "وہ اتنی پیسٹری کو کیا کرے گی؟"

عتیق نے بے تکلفانہ انداز میں کہا "دعوت پر صرف ہوگی۔ میری کامیابی کی خوشی میں اُس نے سہیلیوں کو چائے پر مدعو کیا ہے۔" ہمارے لبوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اُس سے ستفسرانہ کہا "تم تو شریک نہ ہو سکو گے؟"

"یہ باریابی حاصل نہیں۔ مگر شاید موقع ملے تو چھُپ چھُپ کے دیکھ لوں" سعادت نے پلیٹ میں سے بنگالی رس گُلا اُٹھاتے ہوئے میری اور عتیق کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا اُسے عتیق کے اِن الفاظ سے بڑا لُطف حاصل ہُوا ہے اور کہنے لگا۔ "چھپ چھپ کے دیکھنا۔ اپنی ہونے والی رفیقۂ حیات کو، اپنے آرزوؤں کے مرکز کو، اُس وقت جب وہ اپنی بنی ٹھنی سہیلیوں میں ایک نہایت مہربان میزبان کی طرح خاطر مدارات کا جذبہ دل میں لئے زرق برق لباس میں ملبوس ایک رنگین تیتری کی مانند گھومتی پھرے۔ کیوں آصف سچ کہنا کتنا بڑا رومان ہے" اور پھر سر دُھنتے ہوئے کہنے لگا ؎

چھُپ چھُپ کے دیکھتا ہوں کسی کی نظر کو میں ——— کرتا ہوں برقِ ناز کا خُوگر جگر کو میں

سعادت کے ان الفاظ نے میری طبیعت بھی اُکسائی اور میں نے اِس طرح لب کشائی کی "اور سعادت یہ رومان کیا کم ہے کہ انارکلی میں صرف نظمی کے لئے پیسٹری خریدتے پھرنا اور دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر اور نظمی کے سہیلیوں کو مدعو کرنے میں اپنی عزت افزائی پر خوش ہونا اور خیال ہی خیال میں نظمی کو اپنی بہت بے تکلف سہیلیوں کے ساتھ محوِ تکلم دیکھنا اور عتیق کا تقریباً اُن کے ہر مذاق کو اپنی ذات سے لپٹا ہُوا دیکھ کر مسکرا دینا اور اِس مسکراہٹ کو لبوں پہ لئے اور تخیل میں نظمی کو جہاں بازار میں سے گزرتے جانا ——— ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والے راہگیروں کو کیا علم کہ اِس لبست سالہ لڑکے کے لبوں پہ یہ نوجوان مُسکراہٹ کیوں ناچ رہی ہے ——— کیوں عتیق؟"

عتیق شاید اپنی شخصیت کو رومانیت سے لبریز سمجھ کر فخر یہ ہنسا، یا ہمارے مُنہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ میں اُسے اپنی زندگی کی واقعیت اور حقیقت نظر آئی اور وہ ہنس دیا۔ مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہر حال وہ ہنسا خوب ہنسا اور کہنے لگا "تم لوگ بھی عجیب ہو۔ کیا خوب حاشیہ چڑھاتے ہو۔ چھپ چھپ کے دیکھنے سے مجھے ایک بہت دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے گلاس میں سے لیمونیڈ کے چند گھونٹ پئے اور ہم بھی اُسے دیکھ کر غیر ارادی طور پر اپنے گلاسوں کو لبوں تک لے گئے اور انہیں ایک ہی سانس میں قریب قریب نصف کر دیا۔ اور پھر فراغت سے اپنی نظروں کو اُس کے چہرے پر گاڑ دیا۔

"چھپ چھپ کے دیکھنے کی عادت مجھے نظمی کے سبب پڑی تھی۔ جب کبھی میں اُن کے یہاں چلا جاتا تو واپس آنے

سے پہلے ایک آدھ بار غلطی کو کبھی کواڑ کی درزوں میں سے کبھی کسی دیوار کے روزن میں سے غرضکہ کبھی نہ کسی طرح دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا اور بارہا کامیاب بھی ہو جاتا۔ اور اسی طرح جب کبھی اُسے ہمارے مکان پر آنے کا اتفاق ہوتا تو بھی کسی دالان سے چھپ چھپا کے اُسے دیکھ ہی لیتا اور میں ہر بار اس خفیہ نظارہ میں ایک نیا کیف ایک نیا لُطف محسوس کرتا تھا۔ تم یہ سُن کر شاید حیران ہو گے کہ میں نے اِس خفیہ نظارہ کا تجربہ یہاں اپنے محلے میں بھی کیا اور یہ تمام واقعہ جو میں تم سے بیان کرنے والا ہوں اُسی خفیہ نظارہ کا شرمندۂ احسان ہے۔"

مَیں اور سعادت سامانِ اکل و شرب سے بے نیاز ہو کر مشتاقانہ نگاہوں سے عتیق کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس نے بھی لیمونیڈ کا ایک گھونٹ اور پی کر گلاس کو ذرا پرے سرکا دیا اور مطمئن انداز میں کہنے لگا "یہاں ہمارے مکان کے سامنے والے مکان کے ساتھ جو مکان ہے اُس میں کوئی ہندو رہتا ہے۔ اُس کے دو لڑکے ہیں اور تین لڑکیاں۔ بڑی لڑکی نے اِس سال بی۔اے کیا ہے۔ بارہا مجھے ایسا دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ وہ ایک چھوکرے کے ساتھ چند کتابوں کو بغل میں دبائے ہمارے مکان کے نیچے سے گزر جایا کرتی تھی۔ جہاں اور بے شمار طالب علم لڑکیاں صبح سویرے اس مکان کے سامنے سے گزر جاتی تھیں میں نے اُسے بھی اُن میں سے ایک سمجھا اور سوائے اس کے کہ "تک دیکھ لیا ــــــ" کبھی توجہ نہ دی تھی، مگر کئی بار ایسا ہوا کہ میں اتفاقاً بالکونی کے نکڑ میں کھڑا ہوں وہ کالج سے واپس آئی ہے اور مڑتے ہوئے اُس نے اُوپر دیکھا اور پھر خود گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ اُس کا اس طرح اُوپر دیکھنا پھر کچھ جھینپا سا جانا صاف بتاتا تھا کہ یہ دیکھنا غیر ارادی ہے۔ بہر حال اُس کی اِس مختصر حرکت میں جو آنکھ جھپکنے میں ختم ہو جاتی کم از کم مجھے ضرور لطف آجاتا۔ رفتہ رفتہ مجھے اُس کے چہرہ سے اتنی آشنائی ہو گئی کہ میں اب محلے کی دیگر لڑکیوں سے اس کا امتیاز کر سکتا تھا۔ ایک روز جب میں اپنا پاؤں بالکونی کے کٹہرے پر رکھ کر بوٹ کے تسمے باندھ رہا تھا تو وہ حسب معمول نیچے سے گزری، اُس کے ہاتھ میں دو چار کتابیں تھیں۔ میں نے یہ خیال کر کے کہ اُس کے ہاتھ میں دیکھوں تو کونسی کتابیں ہیں ذرا غور سے دیکھا تو اُوپر والی کتاب مجھے صاف نظر آئی۔ وہ ہملٹ تھی۔ مَیں تاڑ گیا کہ وہ بی۔اے میں پڑھتی ہے۔

فروری میں جب مجھے ٹینس کے میچوں سے فرصت ملی۔ امتحان میں اُس وقت بہت تھوڑا عرصہ اور باقی تھا اور میری تیاری کسی مضمون کے متعلق اتنی مکمل بھی نہ تھی کہ تھوڑی بہت ڈھارس بندھ سکتی۔ مَیں ایک دن بہت گھبرایا اور پڑھائی میں باقاعدگی پیدا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ایک روز جب میں اُوپر بیٹھا پڑھ رہا تھا مجھے سردی سی محسوس ہوئی اور مَیں اپنی کرسی کو دُھوپ میں کرنے کے لئے جو اُٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ لڑکی اپنے کوٹھے پر ٹہل رہی ہے۔ آنکھیں کتاب پر جھکی ہوئی ہیں اور بڑی توجہ سے مصروفِ مطالعہ ہے۔ مجھے اُس روز معاً خیال آیا کہ اُس کا بھی شاید بی۔اے میں آخری سال ہے اور وہ بھی میری طرح امتحان کی تیاری کر رہی ہے۔ اُس روز شام کو مَیں اُسے وَیسے ہی پڑھتے چھوڑ کر نیچے اُتر آیا۔ اگلے روز جب میں پڑھنے کے لئے اُوپر گیا تو اُسے پھر

رسی پر بیٹھے مصروفِ مطالعہ پایا۔ مجھے اُس روز پہلی مرتبہ اِس امر کا صحیح احساس ہُوا کہ لڑکیاں واقعی ہم لوگوں سے زیادہ پڑھتی ہیں۔ ج ماننا ہیں اُس روز رشک سے کتابیں کھولے شام تک پڑھتا رہا۔ میں نے یہ دل میں ٹھان لی کہ آج میری اور اس کی ضد ہے ں ہیں پہلے چلا گیا تھا اور وہ پڑھتی رہی تھی۔ آج مجھے اُس کو شکست دینا ضروری ہے۔ شفق پھُولی ہوئی تھی۔ تاریکی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور میں کتاب کو دیوار پر ایسی جگہ رکھے جہاں آفتاب کی ڈوبتی ہوئی کرنیں پہنچ رہی تھیں پڑھ رہا تھا اور وہ جھٹ پٹے کی ناکافی روشنی میں ٹہل ٹہل کر پڑھ رہی تھی۔ کبھی کبھی میں یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ ابھی گئی ہے یا نہیں اُس کو کن انکھیوں سے دیکھ لیتا تھا اور سے موجود پا کر پھر کتاب پر نظر جما دیتا تھا۔ ایک بار میں نے جو دیکھا تو وہ موجود نہ تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پانچ سات منٹ ور ٹھہرنے کے بعد کتابیں اُٹھا کر نیچے آ گیا۔ اگلے روز جب مَیں پھر اُوپر گیا تو اُسے موجود پایا۔ مجھے اُس پر بھی غصہ آیا اور اپنے آپ پر بھی۔ نہ جانے وہ کب سے پڑھ رہی تھی۔ میں نے اب یہ ارادہ کیا کہ اُوپر آ کر مطالعہ شروع کرنے میں بھی اُسے زک پہنچائی جائے۔ اُس روز بھی مَیں اُسے مرعوب کرنے کی خاطر شام کی تاریکی پھیلنے تک پڑھتا رہا اور وہ غریب آخر ہار کر نیچے چلی گئی۔ اُس سے اگلے روز میں نے ایک گھنٹہ پہلے آ کر پڑھائی شروع کر دی اور اُسے کوٹھے پر موجود نہ پا کر مجھے ایک خاص قسم کی خوشی محسوس ہوئی۔ اِس طرح بہت سے دِن گزر گئے اور بسا اوقات ایسا اتفاق بھی ہوتا رہا کہ اُوپر ٹہلتے ہوئے ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے دوچار ہو گئیں اور اُس نے فوراً اپنی نظر کو جھٹک کر اِدھر اُدھر پھیر لیا۔ جب وہ اپنی دوشیزہ نگاہ کو اس طرح چھپانے کی ناکام کوشش کرتی تو یہ منظر بہت قابلِ رحم ہوتا اور مَیں دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنے لگتا کہ کیوں میری گُستاخ نگاہ اُس سے جا اُلجھی تھی۔

مجھے آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر اُس سے کچھ لگاؤ سا ہوتا گیا یہاں تک کہ جس روز وہ اُوپر نہ آتی مجھے اُس کا انتظار رہتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہُوا کہ کالج بند ہونے پر بعض دوستوں نے خوش گپیوں کے لئے مجھے اپنے ساتھ ہوسٹل میں کھینچنا چاہا اور مَیں صرف اِس خیال سے کہ وہ پڑھ رہی ہو گی اور میں اُس کے مقابلے میں وقت کو اِس طرح ضائع نہیں کر سکتا، اُن سے پیچھا چھڑا کر بھاگ آیا۔ میں اُن دنوں ایسا محسوس کرتا تھا گویا میرا اور اُس کا مقابلہ ہے اور اِس مقابلہ میں یہ دیکھنا ہے کہ لڑکے زیادہ محنت کرتے ہیں، یا لڑکیاں۔ میرے دماغ میں یہ خیال جنون کی طرح گھُسا ہُوا تھا اور مَیں اپنے آپ کو اِس ضمن میں تمام لڑکوں کا نمائندہ تصور کرتا تھا اور یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ تمام نوجوان طالب علموں کی عزت صرف میری ذات سے وابستہ ہے جس روز میں ذرا دیر سے اوپر جاتا اور اُس کو وہاں اپنے سے پہلے بیٹھے ہوئے پاتا اُس روز مَیں یہ نہ سمجھتا کہ مجھے شکست ہوئی ہے بلکہ مجھے اِس امر کا یقین ہوتا کہ آج اِس لڑکی کے مقابلہ میں تمام "صنفِ کرخت" کو شکست ہوئی ہے۔ اِس طرح مَیں اس گراں بار ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اُٹھائے اُس لڑکی سے خاموش جنگ لڑتا رہا۔

ایک روز مَیں نے غسل خانے کے دریچے میں سے یہ دیکھنے کے لئے جھانکا کہ آیا وہ اب تک اُوپر آ چکی ہے یا نہیں تو مجھے

یہ دیکھ کر مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ وہ ہاتھ میں ایک نوٹ بک لئے اپنی چھت پر ٹہل رہی ہے اور منٹ دو منٹ کے بعد اپنی نوٹ بک سے آنکھیں ہٹا کر ہمارے مکان کی بالائی منزل کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اُسے میرا انتظار تھا۔ میں دو ایک کتابیں لے کر بڑی بے نیازی سے اوپر گیا جیسے میں نے اُسے دیکھا ہی نہیں اور کرسی کو ایک طرف بچھا کر مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ اسی طرح ڈیڑھ ایک ہفتہ اور گزر گیا اور مجھے اُس کے ساتھ ایک انوکھی سی رفاقت محسوس ہونے لگی۔ اُس میں بھی میں نے دیکھا کہ اب پہلا سا حجاب اور تکلف نہ رہا تھا اور اب وہ کبھی کبھی نہا کر اپنے کھلے ہوئے سیاہ بالوں کو دھوپ میں سکھانے کے لئے اوپر آ بیٹھتی تھی۔ اُس کے چہرے کو ممکن ہے تم خوبصورت نہ کہو مگر جوانی میں کونسا چہرہ ہے جو خوبصورت معلوم نہیں ہوتا۔ اُس کے چہرے کے نقوش علیحدہ علیحدہ اتنے اچھے نہیں مگر مجموعی طور پر انہوں نے اُس کے چہرے پر ایک خاص موزونیت اور بھولپن پیدا کر دی ہے۔ بالخصوص جب وہ اپنے لمبے گھنے بالوں کو کھول کر چمکتی ہوئی روشن دھوپ میں آ بیٹھے۔

کسی کسی دن شام کے دھندلکے میں جب الفاظ آسانی سے سجھائی نہ دیتے تو میں کتاب بند کر کے تفریحاً ٹہلنے لگتا اور چراغ جلنے کے بعد تک ٹہلتا رہتا۔ اُسے بھی ایسا ہی کرنا پڑتا اور شام کی تاریکی میں صرف ایک ملتا ہوا سایہ مجھے دکھائی دیتا۔ میرے اور اُس کے ٹہلنے میں فرق صرف اتنا ہوتا تھا کہ میں کسی روز صرف گنگناتا ہی رہتا اور کسی روز کوئی ایک آدھ شعر گا بھی لیتا تھا اور وہ بالکل خاموش ٹہلتی رہتی تھی۔ چند روز وہ اوپر نہ آئی۔ میں نے یہ سمجھا کہ شاید میرے گانے کی آواز اُس کے کانوں تک جا پہنچی ہے اور اُس نے یہ سمجھا ہے کہ میں نے عمداً اُس کو سنانے کی غرض سے یہ نازیبا حرکت کی ہے اور اُس نے اس نازیبا حرکت کو اپنے نسائی تقدس و احترام کے منافی سمجھ کر میرے گستاخانہ رویے سے تعبیر کیا ہے یا شاید اُس کے گھر والوں نے اُس کا میرے سامنے بیٹھ کر پڑھنا معیوب تصور کیا ہے مگر تیسرے روز میں نے اُس چھوکرے کو جو اُسے کالج پہنچانے جایا کرتا تھا دوا کی ایک شیشی لے جاتے ہوئے دیکھا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید وہ بیمار ہو گئی ہے۔ اگلے روز میں کالج سے واپس آ کر یونہی بالکونی میں کھڑا تھا کہ اُس لڑکی کی ماں اپنے مکان کے دروازہ سے نکلی اور جب وہ عین ہمارے مکان کے نیچے پہنچی تو دو عورتیں اُسے دوسری جانب سے آتی ہوئی ملیں۔ اُنہوں نے اُس سے دو چار باتیں کرنے کے بعد کہا "سنا ہے منورما بیمار ہے" میں تاڑ گیا کہ اُس لڑکی کا نام منورما ہے اور وہ بیمار ہے۔ اُس کی ماں نے جواب دیا "ہاں بخار ہو گیا تھا۔ شام تک اوپر بیٹھی پڑھتی رہتی تھی، کہیں سردی لگ گئی ہے۔"

اُن میں سے ایک نے کہا "اب کیا حال ہے؟"

اس کی ماں نے جواب دیا "صبح سے آرام ہے"۔ اور اُن عورتوں کو ساتھ لے کر اپنے مکان پر واپس چلی گئی۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اُن کے ساتھ چلا جاؤں اور منورما کو جا کر اپنے ہاتھوں سے دوا پلاؤں اور اُس کا حال پوچھوں۔

مجھے اُس سے ہمدردی سی ہوگئی تھی مگر اظہار کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ اُس رات میں نے دوبارہ دریچہ کھول کر اُس کے کمرہ کو دیکھا اُس میں روشنی تھی۔ تیسری مرتبہ پھر دیکھا۔ اب روشنی گل ہو چکی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ سو چکی ہے۔ میں بھی اپنے بستر میں جا گھسا اور اُس کی صحت کے لئے دُعا کر کے سو گیا۔ اگلے سے اگلے روز وہ ایک کتاب ہاتھ میں لئے اوپر آئی اور چند ایک گھنٹے دھوپ میں بیٹھ کر نیچے چلی گئی۔ آہستہ آہستہ صحت ہونے پر پھر وہ ویسے ہی دن کا زیادہ حصّہ بالائی منزل پر گزارنے لگی۔

وسطِ مارچ میں موسم تبدیل ہو گیا۔ دھوپ میں حدت پیدا ہو گئی اور پت جھڑ کی اُداس ہوائیں چلنے لگیں۔ ہم اوپر بیٹھ کر پڑھنا آہستہ آہستہ ترک کرتے گئے اور بالآخر اتنے گوشہ گیر ہوئے کہ کبھی کبھار ایک دوسرے کی صُورت دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ امتحان بالکل سر پر منڈلا رہا تھا۔ گذشتہ ڈیڑھ ماہ کی تیاری کا جائزہ لینے پر مجھے بے حد خوشی ہوئی کیونکہ میں نے اُمید اور توقع سے زیادہ بہت کچھ دیکھ لیا تھا اور میری اس محنت کا سہرا میں جانتا تھا منورما کے سر تھا جس نے میرے اندر ایک حاسدانہ شوق پیدا کر دیا تھا ورنہ تم جانتے ہو میں کتنا کام چور ہوں اور اگر یہ عجیب و غریب محرک میرا ممد و معاون ثابت نہ ہوتا تو میرا حشر جس نے فروری تک ایک دن بھی کتاب کو متانت اور سنجیدگی سے نہیں کھولا تھا خدا جانے کیا ہوتا۔ بعض اوقات قدرت خود اسباب پیدا کر دیتی ہے یہ بالکل صحیح ہے، میری کامیابی کا واحد سبب منورما کی ذات بابرکات ہے۔

امتحان کی تیاری چونکہ دیر سے شروع کی تھی اس لئے بہت سی چیزیں خام رہ گئیں جن کے سبب سے میرے دو پرچے کمزور رہے۔ نتیجہ کے روز جو میری حالت تھی کچھ میں ہی بہتر جانتا ہوں، جس وقت بھائی احسان نے مجھے میری کامیابی کا مژدہ سنایا مجھے اعتبار نہیں آتا تھا۔ میں نے اُن سے اخبار چھین کر بار بار اپنے نام کو پڑھا۔ پھر تم دونوں کا نتیجہ دیکھا۔ میں خوشی سے جامہ میں نہیں سماتا تھا۔ فوراً بجلی کی طرح میرے دماغ میں منورما کا خیال چمکا۔ میں اپنی اتنی بڑی محسن کو بھول گیا تھا۔ لڑکیوں کے کالج یکے بعد دیگرے میری نظر سے گزرتے گئے جب لاہور کالج فار ومن کی کامیاب لڑکیوں کے نام میں دیکھ رہا تھا تو منورما ساگر چند کا نام میری نظر سے گزرا۔ مجھے یہ علم تھا کہ اُس کے باپ کا نام ساگر چند ہے۔"

عتیق نے میری طرف دیکھ کر کہا "آصف کچھ نہ پوچھو۔ اِس مسرّت کی نوعیت کچھ عجیب سی تھی۔ یہ خوشی ہم تینوں کی کامیابی کی خوشی سے بھی کچھ نرالی قسم کی خوشی تھی۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں اب منورما کو دیکھوں کہ اس خوشی کے موقع پر اُس کے چہرہ کے کیا آثار ہیں۔ اگر وہ بہت مسرور ہوئی تو میں بڑھ کر اُسے مبارکباد کہوں گا۔ پھر یہ خیال حدِ یقین تک پہنچ جاتا کہ وہ میری اس غیر متوقع جسارت پر اتنا شرما جائے گی کہ "شکریہ" کا رسمی لفظ کمبخت بھی اُس کے مُنہ سے ادا نہ ہو سکے گا۔ اور میں اپنی اس بکی پر پانی پانی ہو جاؤں گا۔

میرے دماغ میں یہی کشمکش جاری تھی اور میں ابھی تک کسی فیصلہ پر نہ پہنچا تھا کہ اگلے روز میں نے اُسے نسبت روڈ پر آتے

دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے گوشۂ لب میں مُسکراہٹ چھپی بیٹھی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ کوئی چار گز کے فاصلہ پر ہوگی جب اُس کی نظریں مجھ سے چار ہوئیں۔ مَیں نے چاہا کہ مَیں خود ہی مُسکرا دوں اور بڑھ کر اُسے ہدیۂ تہنیت پیش کروں میں نے ہرچند مُسکرانا چاہا مگر لبوں نے اِنکار کر دیا۔ میں نے بڑھنا چاہا کہ وہ آنکھیں ملتے ہی کچھ شرما کر کچھ لجا کر میرے پاس سے نکل گئی اور میں اپنے دھڑکتے ہوئے دِل کو لے کر اپنی ہمّت پر حیران مکان پر آپہنچا اور آرام کُرسی پر لیٹ کر مزے لے لے کر یہ شعر گاتا رہا ؎

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے ہم نے اُس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

نتیجہ نکلنے کے تیسرے یا چوتھے دن میں نیچے لیٹر بکس میں سے خط نکال کر وہیں دہلیز پر کھڑا پڑھ رہا تھا کہ ایک تانگہ گزرا مَیں نے کاغذ سے نظر اُٹھائی تو اُس میں منورما کو دو برقع پوش لڑکیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا۔ تانگہ اُن کے مکان کے سامنے جا کر رُکا۔ منورما اور وہ لڑکیاں اُتریں اور مکان میں داخل ہوگئیں۔ اُسی شام جب میں سیر سے واپس آیا تو گلی میں داخل ہوتے ہی پہلے تو مَیں نے اُن کے مکان کے سامنے ایک خالی تانگہ کھڑا ہوُا دیکھا۔ کچھ قدم آگے بڑھا تو ہارمونیم بجنے کی آواز سُنی، مکان پر نظر ڈالی تو خلافِ معمول زیادہ کمروں میں روشنی پائی۔ اتنے میں ہارمونیم رُک گیا اور لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔ میں پانچ سات قدم آگے جا چکا تھا۔ جب اپنے مکان کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو مجھے خیال آیا۔ ہو نہ ہو اُن کے یہاں دعوت ہے اور وہ دعوت بھی منورما کی کامیابی کی تقریب پر۔ پھر سہ پہر کے وقت منورما کو دو مسلمان لڑکیوں کے ساتھ تانگے میں دیکھنا بھی یاد آگیا جن کے متعلق میں نے اُسی وقت قیافہ لگا لیا تھا کہ یہ اُس کی ہم جماعت سہیلیاں ہوں گی۔ جو تانگہ مکان کے سامنے کھڑا تھا وہ کرایہ پر چلنے والا نہ تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں بھی کوئی لڑکی آئی ہو۔

مَیں نے کھانا کھایا اور بالائی منزل کی چھت پر جا کر ٹہلنے لگا۔ اُس وقت میری نگاہوں کا مرکز منورما کا مکان بنا ہوُا تھا اور میرا دماغ اِس اُلجھن میں تھا کہ کاش ہم مشرقی لوگ عورتوں سے آزادانہ مل سکیں۔ کاش وہ ہمیں یا ہم اُنہیں بلا امتیازِ صنفی حیثیت کے اپنی ضیافتوں پر مدعو کریں۔ ہمارے دل بھی اُن کی عزت و حرمت کے جذبے سے معمور ہیں کاش انہیں بھی اظہار کا موقع دیا جائے۔ اِتنے میں منورما کی چھوٹی بہن نے کمرے کی چِک اُٹھا کر آواز دی "لچھو۔ بہن منورما کا نام لینا!"

منورما کا نام سُن کر میں نے نیچے دیکھا۔ صرف نچلی منزل میں روشنی تھی۔ اوپر بالکل اندھیرا تھا۔ تانگہ بدستور کھڑا تھا مگر اب راستہ سے ہٹ کر۔ نو بجنے کے بعد چکے تھے گلی میں سے اکّا دکّا آدمی گزرتا تھا۔ میں نے سوچا اگر منورما کی دعوت میں مَیں شریک نہیں ہو سکتا تو نہ سہی میری "چلمن شگاف" نگاہیں تو ہو سکتی ہیں۔ اِس خیال کے آتے ہی میں نیچے اُتر گیا اور اُن کے مکان کے دو چار چکر کاٹ کے یہ بھانپنا چاہا کہ منورما اور اُس کی سہیلیاں کس کمرہ میں کھانا کھا رہی ہیں۔ باتیں کرنے کی دھیمی دھیمی آواز مجھے پرلے کمرے سے

آئی ہیں اُس طرف بڑھا تو چینی کی پلیٹوں کی جھنکار نے یقین دلا دیا کہ مہمان نوازی اسی کمرہ میں ہو رہی ہے۔ اُس کی ایک کھڑکی چوپٹ کھلی تھی جس میں سے بجلی کی تیز روشنی باہر آ رہی تھی۔ مَیں نے دُور کونے میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ ایک میز کے گرد چار پانچ لڑکیاں بیٹھی ہوئی نظر آئیں۔ اِس کمرہ کی عقبی دیوار میں ایک کھڑکی نظر آئی جس کی درزوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی باہر نکل رہی تھی وہ کھڑکی ایک چھوٹی سی تنگ گلی میں جو خدا جانے دو مکانوں کے درمیان کس مصرف کے لئے بنائی گئی ہے کھلتی ہے۔ میں بڑی احتیاط سے کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے سے جھک کر گزرا اور اُس گلی میں جا کر کھڑکی کے بند کواڑوں کی درزوں کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ ایک درز میں تقریباً سب کچھ نظر آتا تھا۔ میز پر تھوڑا سا بچا کھچا پھل پڑا تھا۔ دو چار رکابیوں میں آم اور کیلے کے چھلکے پڑے تھے۔ میز کے گرد چھ کرسیاں تھیں، ایک طرف منورما، اُس کی چھوٹی بہن اور ایک مسلمان لڑکی جو ذکیہ کے نام سے مخاطب کی جاتی تھی بیٹھی تھیں۔ دوسری طرف دو ہندو لڑکیاں سوشیلا، رانی اور تیسری مسلمان امینہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ رانی ذرا پرے تیسری کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، اُس کو میں اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس وقت کسی اُستانی کا ذکر ہو رہا تھا کہ وہ گاتی بہت اچھا ہے۔ منورما نے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا "کیوں امینہ تم نے تو اُسی سے باجا سیکھا تھا نا؟"

"باجا تو میں نے پہلے سے سیکھ رکھا تھا۔ اُس نے صرف چند راگ نکالنے سکھائے تھے"

منورما کی چھوٹی بہن نے کہا "راگ نکالنے میں تو بہن سوشیلا ماہر ہے"۔

ایک لڑکی جو سامنے بیٹھی ہوئی تھی کہنے لگی "لو اور سنو"۔

اُس کی طرف امینہ نے مُنہ پھیر کر کہا "سوشیلا کو تو ابھی شوق پیدا ہوا ہے"۔

اُس لڑکی نے جواب دیا "خاک شوق۔ رانی سے پوچھ لو کوئی دو بار ہارمونیم کو ہاتھ لگایا ہوگا"۔

جو لڑکی مجھے نظر نہ آتی تھی اُس کا نام ہی رانی تھا شاید۔ اُس نے کہا "اور وہ بھی مسز گھوش کے کہنے پر"۔

منورما کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے کہا "مجھے زہر لگتی ہے وہ"۔

امینہ بولی "خیر وہ اتنی بُری بھی نہیں جتنا تم سمجھتی ہو"۔

منورما نے کہا "نہیں ذکیہ بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتی ہے۔ کہتی ہے مَیں نے گانے میں بڑے تمغے جیتے ہیں۔ آواز دیکھو جس طرح چیل بولتی ہے ـــــ"

ذکیہ نے منورما کی بات کاٹ کر کہا "اور تو اور کالج کی کسی پروفیسر کو خاطر میں نہیں لاتی۔ بڑی قابل سمجھتی ہے اپنے آپ کو"۔

رانی پرے سے بولی "چھوڑو کس بحث میں پڑ گئی ہو۔ امینہ سے کہو آج کچھ سُنائے"۔

جھٹ ذکیہ بولی "منورما کی کامیابی کی خوشی میں یا اپنی ـــــ" اور پھر مُسکرا کر منورما کی طرف دیکھا اور دونوں ہنس پڑیں

منورما نے مسکراتے ہوئے کہا "ہاں بابا اپنی شادی کی خوشی میں" کوئی ہنسی کوئی مسکرائی۔ ذکیہ نے کہا "سنا ہے میاں بھی ماشاءاللہ گانے کا شوق رکھتے ہیں"

منورما بولی "بس پھر جی بھر کے سُنے گی اُس سے"

امینہ نے جس پر مذاق کے حملے ہو رہے تھے گردن اُٹھائی اور منورما کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا "تم تو پہلے سُن لو جی بھر کے"

منورما نے کہا "میں سُن لوں؟"

اُدھر سے سوشیلا بولی "منورما کے سننے میں ابھی دیر ہے۔ اِس کے متعلق تو ہمارے کانوں میں بھنک تک نہیں پڑی۔ وہ کیا سُنے گی؟"

امینہ نے مذاق کے لہجہ میں کہا "منورما جانتی ہے وہ کیا سُنا کرتی ہے"

"سچ میں نہیں سمجھی تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"اب کاہے کو سمجھنے لگی تم۔ وہی باجا جو سامنے والے مکان میں بجا کرتا تھا"

یہ سُن کر میرے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ سامنے ہمارا ہی مکان تھا اور ہم ہی باجا بجایا کرتے تھے۔

منورما اس غیر متوقع حملے پر قدرے گھبرائی اور پھر جھٹ اُس نے سوشیلا کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا گویا وہ اپنی بات کی سچائی کے متعلق اُس سے داد طلب کر رہی ہے اور کہنے لگی "لو سوشیلا وہی بات ہوئی۔ اِس کا اُسی لڑکے کی طرف اشارہ ہے ــــ"

سوشیلا نے شاید مذاق سے کہا "میں نے تمہیں کہا نہیں تھا یہ بڑی شکی طبیعت والی ہے" اور پھر تینوں کھل کھلا کر ہنس دیں۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا اور میں بُت بنا ہمہ تن گوش ہو کر کھڑا تھا۔ میں نے دل میں کہا کیا یہ میری طرف اشارہ ہے۔ کیا منورما کو میری وجہ سے چھیڑا جا رہا ہے؟

امینہ نے ہنس کر منورما سے پوچھا "کیا سوشیلا کو معلوم ہے؟"

منورما کے لبوں میں مسکراہٹ جذب ہو رہی تھی اُس نے کہا "ہاں مگر تم شریر کی طرح ناگفتنی نہیں کہتی"

ذکیہ نے منورما سے پوچھا "بات کیا ہے؟ ہمارے پلّے بھی کچھ پڑے" مگر امینہ جھٹ بول اُٹھی "میں بتاتی ہوں۔ یہاں سامنے ایک لڑکا رہتا ہے ــــ"

منورما نے بے اختیار اپنی کرسی پر سے اُٹھ کر کہا "چُپ۔ لگی ہے اب جھوٹ بکنے"

"بہت مسالح لگاتی ہے یہ" سوشیلا نے ہنستے ہوئے کہا اور امینہ کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ منورما کرسی پر بیٹھ گئی اور ذکیہ کی طرف مُنہ پھیر کے بولی "بات کچھ بھی نہیں۔ ہمارے سامنے ایک لڑکا رہتا ہے۔ بڑا محنتی ہے۔ بس یہ سمجھو کہ ہر وقت وہ ہے اور کتاب۔ جس وقت

میں اُس کو دیکھتی تو مجھے یہ خیال آتا کہ واقعی لڑکے ہم سے زیادہ محنت کرتے ہیں۔ ہم لڑکیاں تو بس اِدھر اُدھر وقت ضائع کر دیتی ہیں۔ سو اُس کو دیکھ کر مجھے بھی محنت کا شوق چرّایا اور میں چند روز پڑھنے میں اُس کا برابر مقابلہ کرتی رہی مگر آخر بخار سے ایسی پڑی کہ تین دن ہوش نہ آیا میں اُس کی ہمت پر حیران تھی جو دن رات محنت کرتا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے دسمبر میں ایک روز امینہ میرے یہاں بیٹھی ہوئی تھی، تو سامنے والے مکان میں سے ہارمونیم بجنے کی آواز بلند ہوئی، ساتھ کوئی گا تا بھی تھا۔ امینہ پہلے غور سے سنتی رہی پھر کہنے لگی۔ بہت عمدہ غزل گا رہا ہے کون رہتا ہے یہاں؟ میں نے کہا دو سٹوڈنٹ رہتے ہیں۔ بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی باجا بجنے کی آواز آیا کرتی ہے۔ بس میں اتنا جانتی ہوں۔ کوئی ڈیڑھ ایک مہینہ کے بعد سوشیلا اور امینہ آئیں میں اُوپر دھوپ میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ ماما نے ان کے آنے کی خبر دی، میں نیچے آئی۔ باتوں باتوں میں جب پڑھائی کا ذکر آیا اور میں نے مختلف مضامین کے متعلق بتایا کہ میں اتنا اتنا پڑھ چکی ہوں تو یہ بہت حیران ہوئیں۔ ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ اُس لڑکے نے کُرسی سے اُٹھ کر انگڑائی لی اور ہاتھ میں کتاب پکڑے دیوار پر سے نیچے گلی میں جھانکا۔ امینہ کی نظر حق میں سے اُس پر جا پڑی۔ پوچھنے لگی یہ کون ہے؟ میں نے کہا وہی ہے نا جس کے گانے کی تم نے اس روز تعریف کی تھی۔ امینہ غور سے اسے دیکھ کر کہنے لگی وہ بار بار تمہارے مکان پر کیوں نظر ڈالتا ہے؟ میں نے کہا جانے بھی دو۔ میں اور سوشیلا نے حق کے قریب جا کر دیکھا وہ واقعی ٹہلتے ٹہلتے کبھی کبھی کتاب سے نظر اُٹھا کر ہمارے مکان کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ یہ دونوں مجھے چھیڑنے لگیں اور آخر کار شاید اُنہوں نے مجھ سے یہ منوا ہی لیا کہ میرے دل میں اُس کے لئے ایک لگن سی ہے مگر ایسی نہیں ——— دراصل بات یہ تھی کہ وہ لڑکا اور میں اُوپر پڑھا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی دیکھ لیتا ہوگا میں بھی یہ جاننے کے لئے اُسے کبھی کبھی دیکھ لیتی تھی کہ وہ پڑھ رہا ہے کہ نہیں۔ اُس لڑکے کو ہر وقت محنت کرتے دیکھ کر مجھے اپنی محنت بے حقیقت معلوم ہوتی تھی اور اگر اُس لڑکے کی وجہ سے میں متاثر نہ ہوتی تو تم مجھے آج امتحان میں کامیاب بھی نہ پاتیں رزلٹ (آزمائشی امتحان) میں جو میرا ریزلٹ (نتیجہ) تھا وہ تمہیں معلوم ہے ہی نا ——— اب اُس لڑکے کو اگر میں اپنے لئے ایک رہنما فرشتہ کہوں تو یہ جھوٹ نہیں۔ پرماتما جانے میرے دل میں اس کے لئے بڑا ریگارڈ (منزلت) ہے۔ میں نے کئی دفعہ رات کو اُس کے کمرے میں ایک ایک بجے تک روشنی دیکھی ہے۔ اب تم اگر یہ کہو ———"

"لچھو" ہم نے بھی سُنا یوں جیسے کسی نے گلی میں کسی کو آواز دی ہے مگر عتیق اُٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھا اور جھٹ پیچھے ہٹا اور ہم کو کھڑکی میں آنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ دھم دھم کرتے کھڑکی کی طرف لپکے۔

"یہ ہے منورما!!!!!" عتیق نے آہستہ سے کہا۔ ایک پتلی دُبلی سی لڑکی ملیح رنگ، صورت میں اپنی قسم کا اثر اور جاذبیت، دھانی رنگ کا سُوٹ پہنے، سر پر سے ذرا دوپٹہ سرکا ہوا بالکونی کے کٹہرے سے لگی ہوئی نیچے کھڑے ہوئے ایک آدمی کو بڑے دھیمے دھیمے کہہ رہی تھی "نہیں ——— وہ تو صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں، اگر ابھی بھی آ گئے تو میں کہہ دونگی۔ آپ تسلی رکھیئے" وہ آدمی چلا گیا، اس نے نظر اُٹھائی اور وہ اچانک ہم پر پڑی۔ ہماری نظروں کو اپنے چہرے پر گڑے ہوئے دیکھ کر وہ بہت گھبرائی، شرمائی، اور جھٹ حق اُٹھا کر اندر چلی گئی۔ میں نے مسکرا کر عتیق کی طرف دیکھا اور اُس نے مسکرا کر سعادت کی طرف ——— سعادت نے اپنی آنکھوں میں ایک نشہ سا لاتے ہوئے بڑے مزے میں گایا؛ ۔ برق کو . . . . . ابھی کے . . . . . دامن میں چھپا دیکھا ہے . . . .

بابر بٹالوی بی۔ اے (آنرز)

بیتے ہوئے دنوں کی یاد

کوئل کی کوک دل میں طوفاں اُٹھا رہی ہے / بیتے ہوئے دنوں کی یادیں دِلا رہی ہے
آنکھوں میں پھر رہی ہیں وہ صحبتیں کبھی کی / وہ پُرسرور گھڑیاں وہ جانِ زندگی کی
معمور اُس کے جلووں سے شام کی فضائیں / کیفیتوں میں یکسر ڈوبی ہوئی ہوائیں
افسونِ بےخودی میں کھوئے ہوئے مناظر / آغوشِ تازگی میں سوئے ہوئے مناظر
بزمِ سرود برپا ہر چار سُو چمن میں / رعنائیاں سی رقصاں پھولوں کی انجمن میں
ہر نو دمیدہ غنچہ اک جامِ ارغوانی / گلشن کا ذرہ ذرہ ترسی ہوئی جوانی

نغمے برس رہے تھے جادو بھری فضائیں
مستی سی آ چلی تھی ہر جنبشِ ہوا میں

جس نے مجھے دوبارہ درد آشنا کیا تھا / وہ جس نے میرے دل میں پھر سوز بھر دیا تھا
خوابیدہ جس کی آنکھوں میں عالمِ ترنم / صد گلستاں بداماں رنگینیٔ تبسم
وہ جس کی آرزو سے رنگیں مری جوانی / بیگانگی بھی جس کی فردوسِ کامرانی
وہ جس کی اک نظر بھی سیرابِ شوق کر دے / تلخابۂ الم میں رنگِ سرور بھر دے
وہ منتہائے اُلفت تکمیلِ جستجو کی / تعبیر میرے خوابِ شبہائے آرزو کی

جلووں سے اِس فضا کو رنگیں بنا رہا تھا
جانِ بہار بن کر دل میں سما رہا تھا

وہ دلنواز جلوے مستی لٹا رہے تھے / مستی لٹا رہے تھے بیخود بنا رہے تھے
وہ مدھ بھری نگاہیں، وہ جام پیارے پیارے / وہ رس بھری ادائیں، فردوس کے نظارے

شیریں لطافتوں میں ڈوبا ہوا تبسم / رنگین نکہتوں سے مہکا ہوا تبسم

وہ لب ذرا ہلیں تو پھولوں کی بارشیں ہوں / مستی میں ڈوب جائے جس پر نوازشیں ہوں

اٹھیں جدھر نگاہیں سیلاب نور آئے / جاں کو سکوں ہو حاصل دل کو سرور آئے

بیگانگی میں پیدا اندازِ آشنائی / سیرابِ کامرانی قسمت کی نارسائی

بے تاب ہوں پہ میری یکسر خموش رہنا / احساسِ غم نصیبی پر منہ سے کچھ نہ کہنا

اور پھر کبھی کبھی وہ آنکھوں کا مسکرانا / رنگِ بہار بن کر دل میں مرے سمانا

وہ مائل تلطف تسکین خیز نظریں / ڈوبی ہوئی سکوں میں وہ نغمہ ریز نظریں

یہ دلفزا مناظر سامانِ شادمانی
معمورِ صد تمنا دامانِ شادمانی

اب کی بہار میں وہ رنگینیاں نہیں ہیں / وہ دلکشی نہیں ہے، رعنائیاں نہیں ہیں

پہلی سی دلربائی باقی نہیں گھٹا میں / مستانہ لرزشیں وہ مفقود ہیں ہوا میں

صحنِ چمن میں ہر سو چھائی اداسیاں ہیں / جو جنتِ نظر تھیں وہ صورتیں کہاں ہیں

بے کیف ہیں مناظر بے نور ہیں فضائیں / آنسو بہا رہی ہیں افسردہ دل گھٹائیں

وہ دلفریب جلوے آنکھوں سے اب نہاں ہیں / دامانِ آرزو ہے اور غم نصیبیاں ہیں

پھر دل کو ہے تمنا روئے حبیب دیکھیں / پھر جلوہ گر کسی کو اپنے قریب دیکھیں

پردیس سے وطن میں وہ گلعذار آئے
پھولوں میں مسکراتی اپنی بہار آئے

بشیر ضیائی ایم اے

مَیں نے آج تک کبھی کسی کھیل میں حصّہ نہیں لیا۔ میں کتابی کیڑا نہیں ہوں بلکہ جب کبھی دوست میری کثرتِ مطالعہ کا ذکر کرتے ہیں تو مَیں کچھ چڑ سا جاتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے کبھی کتابوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ کھیل کود میں دلچسپی لے سکوں۔ اکثر اوقات احباب چاہتے ہیں کہ کوئی مشہور میچ دیکھنے ہی چلا جاؤں لیکن افتادِ طبیعت سے مجبور ہوں انکار کر دیتا ہوں۔

آج کل میں پڑھتا کم ہوں "آوارہ گردی" زیادہ کرتا ہوں۔ سکول کے دنوں میں مطالعہ کا شوق بہت زیادہ تھا لیکن طبیعت میں آوارگی نام کو نہ تھی۔ ان دنوں میں کبھی کبھی میچ دیکھنے کے لئے بھی وقت نکال لیا کرتا تھا۔ غالباً نویں جماعت کا ذکر ہے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ہمارے ہوسٹل (اگر انگریزی کا لفظ ناگوار گزرے تو دارالاقامہ کہہ لیجئے) کے لڑکے چاندنی راتوں میں کبڈی کھیلا کرتے تھے۔ گرمیوں میں رات کو پڑھنا ناممکن ہوتا ہے اور یوں بھی بہت کم طلبہ اُن دنوں اس "حرکت" کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لئے میں بھی کبھی کبھی کھیل دیکھنے کے لئے ہوسٹل کی طرف جا نکلا کرتا تھا۔

قمری مہینہ کی چودھویں پندرھویں تاریخ تھی۔ چاند کی زرد زرد روشنی عجیب منظر پیش کر رہی تھی۔ لڑکے کھیل شروع کیا ہی چاہتے تھے کہ اسلم بولا :-

"لطف تو جب ہے اگر آج آغا جان کے تکیے میں کبڈی کھیلی جائے "۔

اسلم پڑھنے لکھنے میں تو پھسڈی ہی تھا لیکن کم بخت نے ذہن بڑا رسا پایا تھا۔ اِسے جو سُوجھتی تھی نادر ہی سُوجھتی تھی۔ جماعت میں دوسرے لڑکے بھی شرارتیں کیا کرتے تھے مگر اسلم کی شرارتوں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی جدت ہوتی تھی۔ اس نے کبھی کسی سے بیہودہ یا فرسودہ مذاق نہیں کیا تھا۔ ایسی پتے کی بات کہتا تھا کہ لوگ حیران ہوتے تھے کہ ایسا ذہین اور طباع لڑکا تین پیسے کے ٹکٹ کی طرح نویں جماعت سے ہی کیوں چپکا ہوا ہے؟ وہ اس سے پہلے تین دفعہ نویں جماعت میں فیل ہو چکا تھا اور اس جماعت میں یہ اس کا چوتھا سال تھا۔ ابتدائی جماعتوں میں بھی ان بزرگوار نے کئی "سٹیشن بنائے" تھے۔ ہمارے سکول میں سب سے بڑے "خلیفہ" یہی تھے۔

آغا جان کا تکیہ دراصل ایک نہایت مختصر سا لٹا ٹوٹا ویران قبرستان تھا، جہاں کوئی فقیر بھی نہیں رہتا تھا۔ تکیہ میں پُرانے زمانے کی دس بارہ شکستہ قبریں اور ایک بہت بڑا بڑ کا درخت تھا جس کی چھاؤں میں دوپہر کو شہر کے بیکار تاش کھیلا کرتے تھے۔ اسلم کی تجویز تھی کہ اسی بڑ کے نیچے کبڈی کھیلی جائے۔ لڑکوں نے یہ تجویز سُنی تو ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ آغا جان کے تکیے میں کبڈی

رات کے وقت تکیے کے قریب سے گزرنے سے بڑے بڑے شریر لڑکوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ وہاں کبڈی کھیلی جائے۔ دو تین منٹ تک سب خاموش رہے۔ آخر شریف بولا" تمہاری اندھی کھوپری سے ہمیشہ ایسی ہی تجویزیں نکلتی ہیں۔ بھوتوں کا بھی کچھ خیال ہے تمہیں ؟"

اسلم نے قہقہہ لگا کر کہا" واہ رے بدھو! دس سال سکول میں ماسٹروں سے پٹتے رہے اور ابھی تک تمہیں یہ بھی معلوم نہ ہُوا کہ بھوت پریت کوئی چیز نہیں، محض ہمارے توہمات ہیں"

اس جواب سے شریف کی بڑی سبکی ہوئی۔ اس نے کہا" اچھا تو تم بھوت پریت کو نہیں مانتے ؟"

"میں کیا۔ کوئی شریف آدمی بھی نہیں مانتا۔ تمہارے متعلق میں کچھ کہنا نہیں چاہتا"

"بہت اچھا صاحب۔ ابھی دیکھے لیتے ہیں۔ تو تم یہ کرو کہ آج رات کے بارہ بجے آغا جان کے تکیے میں ہر قبر کے سرہانے ایک ایک بتاشہ رکھ آؤ۔ ہم صبح جا کر دیکھ لیں گے۔ اگر تم نے ایسا کر دکھایا تو کل ہم وہاں کبڈی کھیلنے چلے جائیں گے"

"منظور ہے۔ اس وقت نو بجے ہونگے میں اب گھر جاتا ہوں، بارہ بجے آغا جان جاؤنگا اور بتاشے رکھ آؤں گا۔ تم صبح آ کر دیکھ لینا"

یہ کہہ کر وہ تو چلتا بنا اور شریف نے لڑکوں کو اُبھارنا شروع کیا کہ اُسے کسی طرح ذلیل کیا جائے۔ شریف کی تجویز یہ تھی کہ ایک لڑکا کسی ٹوٹی پھوٹی قبر میں چھپ کر بیٹھ رہے۔ جب اشرف آئے تو اسے ڈرا دے۔ کم بخت کی ساری شیخی کر کری ہو جائیگی۔ لڑکے بھی ایک ہی کائیاں تھے سب نے کہا" میاں شریف تمہیں یہ کام کرو۔ ہم میں تو یہ ہمت نہیں۔ تم ہو بھی ہم سب سے زیادہ جری اور دلیر" شریف صاحب اس خوشامد سے اکڑ گئے۔ ہم نے تکیے میں جا کر انہیں ایک ٹوٹی پھوٹی قبر میں بٹھا دیا۔ اور خود تماشہ دیکھنے کے لئے باہر آ کر تکیے سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر بیٹھ رہے۔ تھوڑے عرصہ بعد دُور سے اسلم کے گانے کی آواز آئی۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے اسے تکیے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کی آواز یا چال سے مطلق کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں ظاہر ہوتی تھی۔ قبرستان میں پہنچ کر اس نے ہر قبر کے سرہانے ایک ایک بتاشے کی بجائے ریوڑیاں، بتاشے اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ رکھنا شروع کر دیا۔ قدموں کی چاپ سے شریف بھی سمجھ گیا کہ یہ ذات شریف آ پہنچے ہیں۔ ہاتھ کو قبر سے باہر نکال کر کہنے لگا" ایک مجھے بھی"

اس کا خیال تھا کہ اسلم یہ سنتے ہی چیخ مار کر اُلٹے پاؤں بھاگے گا لیکن اس نے نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ جواب دیا" ٹھہرو۔ ابھی تمہاری باری نہیں آئی"

سب قبروں کے سرہانے بتاشے وغیرہ رکھے اور پہلے کی طرح گاتا ہُوا باہر نکل آیا۔ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا ہم نے اسے گھیر لیا ہمیں دیکھ کر وہ مُسکرایا اور کہنے لگا" تم ایک ایک بتاشہ کہتے تھے میں نے ہر قبر کے سرہانے حلوائی کی دُکان لگا دی ہے۔ بدنصیبو ابھی جا کر لوٹ لو صبح تک کیا خبر کچھ باقی رہے نہ رہے" اس کے بعد اس نے ہمیں سارا واقعہ سنایا اور کہنے لگا" طمع کی عادت مرنے کے بعد بھی نہیں چھوٹتی۔ ایک مُردہ اتنا بے صبر واقع ہُوا تھا کہ اپنی باری سے پہلے ہی ہاتھ پھیلانے لگا" اتنے میں شریف بھی آ پہنچا۔ اسلم کی تصدیق تو اس نے بھی کی، مگر وہ آج تک یہی کہتا ہے کہ ہم میں سے کسی نے پہلے سے اسلم کو سب کچھ بتا دیا تھا +

حمید نظامی

نوائے سروش

خاک کا مرتبہ ہے کیا؛ مَس ہو حریمِ ذات میں
سایہ سا سجدہ ریز ہوں جلوہ گہِ صفات میں

نور کا شائبہ کجا میرے تخیّلات میں
میری نگاہ گرد ہے تیری تجلّیات میں

دیر و حرم کی جستجو توبہ کر آہ بے ادب
ارض و سما کا فرق ہے کعبہ و سومنات میں

میری نگاہِ تیز کیا؛ میرا عدم مرا وجود؛
میں تو ہوں غرق رات دن اپنے توہمات میں

مجھ کو مٹا کے دھر دیا آہ مرے غرور نے
مَیں ہی تو ایک زخم ہوں سینۂ کائنات میں

آغا شاعر قزلباش

نورِ عرفاں

وہ روشنی ہے دکھائی دیتی — افق ہیں دِل کے
وہ چمکی بجلی گھٹا کے اندر — نظر سے مِل کے
کسی کے چہرے کی چاندنی ہو — چھٹکتی دِل میں
کسی کے ملنے کی آرزو ہے — بلکتی دِل میں
اُمید کی جو کلی تھی دِل میں — ہنسی ہی کھِل کے
یہ لے تمنا ہے بانسری کی — جو بج رہی ہے
گلوں میں رنگ اِک ہوس ہو دل کی — جو سج رہی ہے
کوئی تو ہے جس پہ ہر کلی ہے — نثار کھِل کے
اُٹھا بھی دلبر! اُٹھا نگاہیں — نظر کو بھر دے
اُلٹ دے گھونگٹ پلٹ دے میرے — یہ دِل کے پردے
ہو روشنی دِل میں تیری آنکھوں — سے آنکھ مِل کے

ایم ضیاء الدین

سرودِ بہار

(۱)

پھر فصلِ بہار آئی، پھر کھلتا ہے میخانہ
پھر ساقیٔ فطرت کا ہے دَور میں پیمانہ

کہسار میں نکلے ہیں، پھر جام بکف لالے
گلزار میں کھلتی ہے، پھر نرگسِ مستانہ

ہُو حق کے ترانوں سے پھر گونجتا ہے گلشن
ندّی نے محبت کا، پھر چھیڑا ہے افسانہ

یہ فصل گلستانی، یہ فصلِ غزلخوانی
اِک آگ لگاتی ہے، کر دیتی ہے دیوانہ

اے شاعرِ ناسُوتی، اے بلبلِ لاہُوتی
اِک زمزمۂ شیریں، اِک نغمۂ مستانہ

وہ زمزمہ جو کر دے، اِس بزمِ محبت میں
فرزانوں کو دیوانہ، دیوانوں کو فرزانہ

(۲)

یہ نرگسِ مستانہ، یہ لالۂ جانانہ
اِک حُسن کا میخانہ، اِک عشق کا پیمانہ

یہ انجمنِ دوراں، یہ زندگیٔ انساں
یا حُسن کا ہے افسوں، یا عشق کا افسانہ

یہ حُسن بہاروں کا، یہ نُورستاروں کا
سب دوست کا ہے پرتو، سب جلوۂ جانانہ

یہ دوست کی محفل ہے، اِس محفلِ رنگیں میں
دیوانہ ہے فرزانہ، فرزانہ ہے دیوانہ

میں مستِ محبت ہوں، درکار نہیں مجھکو
یہ جامِ گدایانہ، یہ ساغرِ شاہانہ

اے جانِ جہاں ساقی! دے جامِ مئے باقی
اِک آگ لگا دل میں، کر بزم سے بیگانہ

محبوب کی محفل میں، پہنچاتی ہے عاشق کو
یا ہمّتِ مردانہ، یا جرأتِ رندانہ

محمد اکبر منیر

ایک خط

لب ساحل پر ایک پُر فضا مکان میں بوڑھا کرسچیراڈ اپنی زندگی کے آخری ایام کاٹ رہا تھا۔ ہر روز پانچ بجے کبھی اُس کا بیٹا اور کبھی بہو اُس سے ملنے کے لئے آجاتے تھے۔ وہ ایک ساتھ چائے پیتے۔ گھنٹہ دو گھنٹے باتیں کرتے اور شام کو واپس چلے جاتے جس دن اُن دونوں میں سے کوئی بھی نہ آسکتا تھا، اُس دن آیا کرسچیراڈ کے پنج سالہ پوتے اربین کو دادا سے ملانے کے لئے لے آتی تھی۔ کرسچیراڈ اُسے کہانیاں سنایا کرتا اور وقت اچھا کٹ جاتا تھا۔ بوڑھا کرسچیراڈ کبھی نہایت شوق سے جھک کر اربین کے خدوخال کو بغور دیکھتا اور جب اُس کے بُشرے پر اپنے ماں، باپ، دادا بلکہ اُن سے بھی پہلے بزرگوں کی مشابہت کے نقوش پاتا تو دل ہی دل میں نہال ہو جاتا تھا۔ کرسچیراڈ کے والدین کو سپردِ خاک ہوئے قریب قریب چالیس سال کا عرصہ ہو گیا تھا اور اب سوائے اکیلے اُس کے کسی کے دِل میں بھی اُن کی یاد باقی نہیں تھی۔ شاید اب جلد ہی وہ بھی اُن سے جا ملنے والا تھا۔ جب کبھی قبرستان کی طرف اُس کا گزر ہوتا تو وہ اپنے بزرگوں کی قبروں کی زیارت کو ضرور جاتا تھا اور وہ اس سوچ میں کھو جاتا تھا کہ نہ جانے اب کتنے ہفتے شاید مہینے یا سال رہ گئے ہیں جب وہ خود بھی یہیں آ لیٹے گا۔ جب انسان اپنے آخری سانس گن رہا ہوتا ہے تو اُس کا ربط زندوں کے معاملے میں مُردوں سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بوڑھے آدمی اپنے آخری ایام میں اکثر موت کے متعلق ہی بات چیت کرتے دیکھے جاتے ہیں اُن کے غور و فکر کی راہیں زندگی کی عام شاہراہوں سے دُور ہٹ جاتی ہیں اور وہ الگ تھلگ اپنے خیالات کی ایک نئی دُنیا آباد کر لیتے ہیں جس پر ہر وقت حزن، ملال اور افسردگی چھائی رہتی ہے۔

جب وہ اپنے لڑکے ایلی یا اُس کی بیوی مارتھا سے باتیں کرتا تھا تو اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے الفاظ اور فقرے اتنے گرانبار معانی لئے ہوتے ہیں جو اُن دونوں کی جوان سال اور مسرور عقل و فکر کے احاطے سے باہر ہیں۔ بعض اوقات اُسے رنج بھی ہوتا تھا۔ کہ وہ اُن کی مصروف زندگیوں اور اُن کے کام کاج میں کوئی دلچسپی نہیں لے سکتا تھا۔ وہ ایسے محسوس کرتا تھا جیسے اُس کے اور نوجوان طبقے کے درمیان ایک بلند دیوار حائل ہو گئی ہے۔

اُس کی عمر اب اسّی سال سے متجاوز تھی۔ عام طور پر اُس کی صحت اچھی رہتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی معمولی سی عارضی تکلیف ہو جاتی تھی لیکن وہ اپنی بیماری کو موضوعِ گفتگو بنانے سے ہمیشہ پرہیز کرتا تھا۔ آج وہ پُراسرار طور پر تھکا تھکا محسوس کر رہا تھا۔ باوجود اپنی پوری کوشش کے کہ مارتھا کو اُس کی اس کسلمندی کا احساس نہ ہو وہ اسے نہ چھپا سکا اور مارتھا نے پوچھا "ابا جان! آپ کی طبیعت تو اچھی ہے؟"

کریجیراڈ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا" ہاں بیٹی۔ اتنی ہی اچھی ہے جتنی اس عمر میں ہونی چاہئے"۔

نوجوان مارتھا کو اپنے خسر سے ایک خاص اُنس تھا۔ یُوں بھی وہ بڑی مہر و محبت والی اور نیک دِل عورت تھی۔ ہمدردی و رقتِ قلب کے وہ مخصوص نسائی اوصاف جو عام طور پر نظروں سے اوجھل رہتے ہیں لیکن گھر کی چار دیواری کو رشکِ فردوس بنا دیتے ہیں، اُس کی فطرت میں کُوٹ کُوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ ایک مدت سے اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے بُوڑھے خسر سے ایک بات پُوچھے لیکن چونکہ وہ خود بہت متین اور کم گو تھی اس لئے کسی دوسرے کے معاملات میں بے جا مداخلت سے اُسے قدرتی طور پر نفرت تھی۔ لیکن آج اُس سے نہ رہا گیا اور اُس نے پُوچھ ہی لیا" ابا جان۔ مَیں اکثر سوچتی ہوں کہ آپ کے لئے اپنے وقتوں کے لوگوں کے بغیر دن کاٹنے بہت دشوار ہونگے کیا واقعی دُنیا آپ کو سراسر ویران اور اُداس معلوم ہوتی ہے؟"

کریجیراڈ اس سوال سے کچھ ٹھٹک سا گیا۔ وہ کوئی ایسا جواب نہیں دینا چاہتا تھا جس سے اُس کی بہو کے جذبات کو ٹھیس لگ سکے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اُس نے جواب دیا" بیٹی! شاید میری حالت کو اُداسی نہیں کہنا چاہئے۔ کچھ تو اِس لئے کہ تم لوگ ہر روز مجھ سے ملنے کے لئے آجاتے ہو اور کچھ اِس لئے کہ میری عمر میں دوسروں کی رفاقت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ تم مانو گی نہیں لیکن میں حقیقت بیان کر رہا ہوں کہ بعض دن مجھے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ میرے حلقۂ احباب میں سے کون کون لوگ زندہ ہیں اور کون کون سے مر چکے ہیں۔ مَیں سوچا کرتا ہوں کہ فلاں دوست کی طرف سے مدت سے کوئی خط یا خبر نہیں آئی۔ اُسے خط لکھنا چاہئے پھر مجھے یاد آتا ہے کہ اُسے اِس جہانِ فانی سے کُوچ کئے تو دس یا پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ شام کو جب تک تم اور اَیبل یہاں سے چلے جاتے ہو تو میرے کھوئے ہوئے دوست ہی میرے رفیق ہوتے ہیں۔ یہ داستان بڑی غم انگیز ہے۔ لیکن مجھے اتنی ہی زیادہ عزیز ہے۔ تم ابھی یہ باتیں نہیں سمجھ سکتیں۔ تمہاری عمر میں حال ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ حقیقت۔ ٹھوس حقیقت ہی تمہارے لئے زندگی ہے لیکن ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب حقیقت اپنا سارا ٹھوس پن کھو بیٹھتی ہے اور زندگی محض ایک وہم، ایک حلقۂ دامِ خیال بن کر رہ جاتی ہے"

پھر اُس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے زیرِ لب کہنا شروع کیا" اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں مَیں مُدتیں ہوئیں کھو چکا۔ اُن کے متعلق مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہیں یا مر گئے۔ شاید جس طرح مجھے وہ یاد آتے رہتے ہیں اِسی طرح مَیں بھی اُنہیں یاد آتا رہا ہونگا لیکن یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا"۔

مارتھا اور اُس کے خسر کے درمیان آج تک اس قدر دِل کھول کر باتیں کرنے کا موقع نہیں آیا تھا۔ مارتھا ہمیشہ سے بوڑھے کو یجیراڈ کو کچھ خود پسند اور لاپروا سا سمجھتی رہی تھی لیکن آج اُسے اپنی غلطی کا احساس ہُوا تھا۔ اُدھر بوڑھا کریجیراڈ گھبرا رہا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ جذبات کے سیلاب میں کہیں وہ اپنا رازِ دل تو افشا نہیں کر گیا۔ چنانچہ اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے اُس نے مُسکراتے ہوئے پوچھا" کیوں بیٹی۔ آج اَیبل تمہیں واپس لے جانے کو آئے گا نا؟"

"کہہ نہیں سکتی۔ شاید نہ آ سکیں کیونکہ وہ کہہ رہے تھے کہ کام بہت زیادہ ہے اور فرصت ملنی مشکل ہوگی۔ ابا جان! آپ جانتے ہیں کہ آج کل کے زمانے میں کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کتنی محنت کی ضرورت ہے۔"

"ہاں بیٹی یہ بات تو درست ہے۔ ہمارے زمانے میں مقابلہ اتنا سخت نہ تھا۔"

"لیکن ابا جان بیچارے ایبل کو تو ذرا ذرا سی باتیں پریشان کر دیتی ہیں۔ مَیں نے بارہا کہا ہے کہ مفت میں اپنی جان ہلکان نہ کیا کرو۔ جو کچھ ہمیں حاصل ہے وہ ہمارے گزارے کے لئے کافی سے زیادہ ہے لیکن انہیں تو شہرت اور عظمت کی آرزو چین نہیں لینے دیتی۔"

بوڑھے نے بے دلی سے جواب دیا "وہ سچا ہے۔ دولت، محنت، شہرت سب جوانی کی باتیں ہیں۔"

اُس کے لہجے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وُہ ان سب چیزوں کو بھول چکا ہے۔ ایسے ہی جیسے ایک بوڑھا آدمی اپنے بچپن کے تمام کھیلوں اور تفریحات کو بھول جاتا ہے۔ ایبل اور اُس کے بوڑھے باپ کے درمیان اتنی ہی وسیع خلیج حائل تھی جتنی ایبل اور اُس کے ننھے بچے اربین کے درمیان۔ ہاں البتہ مارتھا کی زندگی وقت اور عمر کے تعینات سے آزاد معلوم ہوتی تھی۔ اِن تینوں کے درمیان اُس کی موجودگی ان دونوں خلیجوں کو پُر کر کے انہیں آپس میں ملا دیتی تھی۔

کو تجیراڈ کی گردن آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے سینے پر جھکنے لگی اور اُس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ یہ دیکھ کر مارتھا نے کہا "ابا جان! مَیں اب جاتی ہوں۔ شاید دیر تک باتیں کرنے سے آپ تھک گئے ہیں۔"

"نہیں بیٹی۔ باتیں کرنے سے بھی بھلا کوئی تھکتا ہے۔ میری حالت ہی اب ایسی ہے۔ مجھے اب یقین نہیں آتا کہ مَیں بھی کبھی توانا اور سرگرم انسان تھا۔ اور شاید اب اگر مجھے ویسا ہو جانے کا موقع بھی مِل جائے تو مَیں پروا نہ کروں۔ مَیں دُنیا کو بہت دیکھ چکا ہوں اور اب اس کی ساری دلچسپیاں میرے لئے ختم ہو گئی ہیں۔"

مارتھا جانے کے لئے اُٹھ بیٹھی اور کرتجیراڈ کے ہاتھ کو رُخصتی بوسہ دیا۔ کرتجیراڈ نے اُس کا ہاتھ ملتجیانہ انداز سے تھام لیا اور بولا "بیٹی، مَیں اب چراغِ سحری ہوں۔ تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں . . . . . ."

"ابا جان! آپ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ خدا دیر تک آپ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔"

"نہیں بیٹی۔ مَیں اپنے آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ موت سے کسی کو مفر نہیں۔ مَیں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم وعدہ کرو کہ میرے مرجانے کے بعد ننھے اربین کو میری یاد دلاتی رہو گی۔ مَیں جانتا ہوں کہ تم اسے بچوں والی بات سمجھو گی۔ لیکن خیال کرو کہ تمہاری اور ایبل کی یاد میں مَیں کتنا عرصہ رہ سکتا ہوں۔ چالیس برس میں تم دونوں بھی مجھ سے آملو گے۔ اگر اربین بھی مجھے یاد نہیں رکھے گا تو معاملہ ہی ختم ہے۔ وعدہ کرو کہ تم میرے الفاظ نہیں بھولو گی اور اِن پر عمل کرو گی۔"

"مَیں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کے ارشاد کی پوری تعمیل کروں گی۔"

"اچھا بیٹی جاؤ۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ جلدی کرو۔ ایل تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ ہاں آرتھین کو کل یہاں ضرور بھیجنا۔ اُس سے کہہ دینا کہ میں اُسے ایک ایسی چیز دوں گا جسے دیکھ کر وہ حیران رہ جائے گا۔"

"اباجان! آپ اُسے زیادہ لاڈ پیار سے بگاڑ رہے ہیں۔"

"نہیں بیٹی یہ سب اُس کے دل میں میری یاد قائم رکھنے کے لئے ہے۔ تم یقین رکھو کہ دُنیا اُسے بڈھے دادا کے لاڈ پیار کے باوجود بھی بگڑنے نہیں دے گی۔"

کوتجیراڈ اُٹھ کر بہ اصرار مارتھا کے ساتھ دروازے تک اُسے رخصت کرنے گیا اور پھر واپس آکر اپنی بڑی سی آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔

. . . .

بندرگاہ پر آہستہ آہستہ دھندلکا چھا رہا تھا۔ موسمِ خزاں کے وسط کی شام تھی جب فضا کو ہر طرف سے ایک سُنہری گہر ڈھانپ رہی تھی۔ شہر کی طرف آتشدانوں کی انگیٹھیوں سے دھواں کسی دیو کی آخری سانس کی طرح پیچ و خم کھاتا ہوا اُٹھ رہا تھا۔ سربفلک میناروں اور گنجان آبادی میں سے سر اُٹھائے ہوئے اونچے مکانوں کی کھڑکیوں کے رنگ برنگ شیشوں پہ آفتاب کی آخری شعاعیں عجیب عجیب شکلیں بنا رہی تھیں۔ چھتوں پر گیلے کپڑے جو لمبی لمبی رسیوں پر سکھانے کے لئے ڈالے گئے تھے، نوجوان انسانی جلد سے ملتا جلتا ہلکا ہلکا گلابی رنگ لئے ہوئے تھے اور ہوا کے نرم و نازک جھونکوں سے یوں ہل رہے تھے جیسے ساری فضا کسی نامعلوم سبب سے کانپ رہی ہو۔

کوتجیراڈ اپنی آرام کرسی سے جس پر بیٹھا ہوا وہ آدھ گھنٹے سے اپنے خوابوں کی دُنیا میں گُم تھا۔ اُٹھ بیٹھا اور کھڑکی سے کر ٹیک کر بندرگاہ اور سمندر کو دیکھنے لگا۔ اُس کے لبوں سے ایک آہ نکل گئی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے آج سے بہت عرصہ پہلے ایک جہاز روانہ ہوا تھا۔ جہاز اُس عورت کو لئے ہوئے جس سے اُسے محبت تھی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور ایک مُدت کے لئے اُس کی دُنیا کو ایک طویل و عریض ویرانے میں تبدیل کر گیا۔ اُس کے چلے جانے کے چند سال بعد کرتجیراڈ نے ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لئے شادی کر لی۔ وقت گزرنے پر اُس کے زخمِ دل تو مندمل ہو گئے تھے لیکن اُن ملکوتی لمحوں کی یاد کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکا تھا، آج اُس جگہ کے نظارے نے جہاں اُس نے اپنی محبوبہ کے رُخِ انور کو آخری بار دیکھا تھا اُسے ازخود رفتہ بنا دیا تھا۔

اسی بے چینی کے عالم میں وہ اپنے چائے کے کمرے سے نکل کر خوابگاہ میں آگیا۔ یہ ایک لمبا سا نیچی چھت کا کمرہ تھا جس میں گہرے آتشی رنگ کے پردے دروازوں پر لٹکے تھے۔ پلنگ پر چینی زربفت کی ایک قیمتی چادر جس کے کناروں پر خالص سونے کے تاروں سے کڑھے ہوئے گلاب کے پھول تھے، پڑی تھی۔ میز پر ایک بھاری کامدار صندوقچی رکھی تھی۔ کرتجیراڈ نے اس صندوقچی کو کھولا اور اُس میں سے کئی لڑکی کی تصویریں باہر نکالیں۔ - - - - سب تصویریں ایک ہی حسین چہرے کی تھیں۔ ایک خوبصورت

عورت کا چہرہ، سنہری گھنگھریالے بال۔ روشن مسکراتی ہوئی آنکھیں جن میں صدیوں کے اسرار چھپے ہوئے نظر آتے تھے۔ چہرے کے خدوخال ایسے متناسب اور دل نشین جن سے انسان مخمصے میں پڑ جائے کہ آیا پیشِ نظر تصویر کسی فانی انسان کی ہے یا کسی چابکدست سنگتراش کے لازوال شاہکار کی۔ کرو تجیراڈ دیر تک اُن تصویروں کو دیکھتا رہا۔

اس وقت وہ ماضی کے دُور اُفتادہ دھندلکے میں اپنی گزری ہوئی جوانی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اب کس طرح دِن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بغیر اُس کے دل میں کوئی نیا جذبہ، کوئی نیا ہیجان پیدا کئے تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ کس طرح وہ ایک ایسے نوجوان سے جس کا سینہ ہر وقت تازہ بتازہ آرزوؤں اور اُمنگوں کے پُرشور طوفانوں کی جولانگاہ تھا جو ہر طلوع ہونے والی صبح کو یہ عزم لے کر اُٹھتا تھا کہ اُسے دُنیا کا مقابلہ کرنا ہے اور اُس سے ہر ممکن مسرت حاصل کرنی ہے، ایک ناکارہ بڈھے میں تبدیل ہو گیا ہے جس کی زندگی سرتاپا اُداسی اور مایوسی ہے، جو اپنی بے رونق اور تھکی ہوئی آنکھوں سے دن رات اُن جہازوں کو جن پر اب وہ کبھی سوار نہیں ہو سکے گا، آتے جاتے دیکھتا رہتا ہے اور گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر کرکے ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے۔

اُس کے مکان کے عین سامنے کھلے میدان میں ایک شخص جہاز کا کوئی حصہ مرمت کر رہا تھا۔ ہتھوڑے کی ضربات کی آواز اُس کے گیت کے ساتھ مل کر جو وہ اُس وقت گا رہا تھا، فضا میں ایک عجیب تھرتھری پیدا کر رہی تھی۔ لکڑی کے بُورے کے ڈھیروں پر جہازوں کے کئی چھوٹے چھوٹے نمونے بکھرے پڑے تھے اور قریب ہی ایک بلی بیٹھی اپنا جسم کھجلا رہی تھی۔ بندرگاہ پر اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کرو تجیراڈ ان سب چیزوں پر کھوئی ہوئی نظریں جمائے، تصویریں ہاتھ میں لئے اپنے خیالوں کی دُنیا میں مستغرق بیٹھا تھا۔ ایک ضعیف العمر نوکر نے اندر آ کر لیمپ روشن کئے اور چلا گیا۔ دروازہ بند ہونے سے کرو تجیراڈ کے خیالات کی رَو یکایک رُک گئی اور اُس نے اُٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد اُس نے کُرسی میز کے سامنے کھینچ لی اور اُس پر بیٹھ گیا۔ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لئے کچھ مدت سوچنے کے بعد اُس نے قلم اُٹھایا اور اُسے ایک کشتی نما پُرانی چینی وضع کی دوات میں قلم ڈبو کر یہ خط لکھنا شروع کیا:۔

"میری پیاری۔ مدتوں سے میں نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا۔ لیکن کیا اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ میں تمہیں بھول گیا ہوں؟ جس دن تم یہاں سے روانہ ہوئی تھیں مجھے ایک غیبی آواز نے بتا دیا تھا کہ اس زندگی میں میں تم سے پھر نہیں مل سکوں گا۔ لیکن مجھے اس کا کبھی پورا یقین نہیں آیا۔ ہر آنے والے جہاز کو میں دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ شاید تم بھی اُترنے والے مسافروں میں سے ایک ہو۔ لیکن اب اُمید ہی منقطع ہوتی نظر آتی ہے۔ میری زندگی کے دن ختم ہو رہے ہیں اور اس وقت بھی جب میں ماضی پر ایک نگاہ واپسیں ڈالتا ہوں تو میری یاد ہمیشہ انہیں دنوں کے متعلق ہوتی ہے جب تمہیں تم میری دُنیا تھیں۔ میری زندگی کا دُوسرا حصہ یعنی تم سے جُدا ہونے کے بعد کا عرصہ، پہلے سے کہیں زیادہ مصروف اور آسودہ گزرا ہے۔ لیکن بستر مرگ پر جو چیز مجھے پیہم یاد آتی ہے وہ جوانی کے وہ چند دن ہوں گے جو تمہاری معیت میں بسر ہوئے۔ انسان ایک خاص عمر کو پہنچ کر نئی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ وہ

صرف اپنی گزری ہوئی زندگی کو دُہرا رہا ہوتا ہے۔ میرے علم میں چند ایسے اشخاص کے حالات ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا دُوسرا باب نہایت شاندار طریق پر بسر کیا۔ اُن کے لئے ماضی محض بے معنی تھا۔ لیکن میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں اُنہیں رشک کی نگاہ سے ضرور دیکھتا ہوں لیکن اُن جیسا ہو جانا میرے بس کی بات نہیں۔ مَیں اُن لوگوں میں سے ہوں جنہیں حقیقی زندگی صرف ایک بار نصیب ہوتی ہے اور پھر ہمیشہ کے لئے وہ گوشت و استخواں کا پتھرایا ہؤا مجسمہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

ابھی ابھی جب مَیں بندرگاہ کو دیکھ رہا تھا مجھے وہ دن یاد آگیا جب تم کبھی واپس نہ آنے کے لئے یہاں سے روانہ ہوئی تھیں جس وقت تمہارا جہاز مجھے ساحل پر کھڑا چھوڑ کر چین جانے کے لئے روانہ ہؤا تھا اس وقت مینہ مارچ کا تیز، وتند اور ہڈیوں تک کو منجمد کر دینے والا مینہ موسلا دھار برس رہا تھا۔ مَیں دیر تک وہاں کھڑا جہاز کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا اور مَیں تمہارے ملکوتی چہرے کو دیکھنے سے ہمیشہ کے لئے محروم۔ اس وقت تمہاری عمر چونتیس برس کی تھی اور میری پینتیس کی اور ہماری محبت کی عمر صرف دس سال۔ سارا سارا دن میں تمہارے خیال میں گم رہتا تھا اور میرے ہر کام کی تہ میں تمہارا ہی خیال ہوتا تھا۔ کاش یہ عرصہ لمبا ہوتا! ناگہاں تاریک دن آگئے۔ تمہارے خاوند کا کاروبار بند ہو گیا۔ تم نے اُس ابتلا میں اُس کا ساتھ چھوڑ دینے سے انکار کر دیا اور اُس کے ساتھ چلی گئیں۔ اس وقت جب کہ مجھے ایک طویل زندگی کا تجربہ حاصل ہے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ ایک عورت کا عاشق خواہ وہ اُسے کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو اُس کی ساری زندگی کا مالک نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا کچھ حصّہ وہ ضرور اپنے خاوند کے لئے مخصوص رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن اُس وقت میں ایک رومان پسند نوجوان تھا جس کا دماغ غلط سلط خیالات سے پُر تھا۔ میں کتنا ہی عرصہ تمہیں اپنی زندگی کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہراتا رہا لیکن یہ خیال کس قدر غلط تھا۔

"اُس وقت میں تنہا تھا، دل شکستہ اور غمزدہ۔ اتنا تنہا کہ مَیں نے تنہائی کی تاب نہ لا کر مجبوراً شادی کر لی۔ اُس کے کچھ عرصہ بعد تک ہم ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے۔ پھر خط مختصر ہونے لگے اور اُن کا درمیانی وقفہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا۔ کیا ہماری محبت ختم ہو گئی تھی؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ مَیں تو یہ محسوس کرتا تھا کہ لارنس۔ میری اپنی پیاری لارنس دُور دراز شنگھائی میں نہیں، میری رگ رگ میں بستی تھی۔ مجھے سارا سارا دن تمہارے تصوّر کی رنگینیوں میں بسر کرنے میں ایک عورت کو خط لکھنے کی بہ نسبت جو دُنیا کے دوسرے کونے پر روزمرّہ کی پریشانیوں میں گھری ہوئی بوڑھی ہو رہی تھی۔ بہت زیادہ تسکین نصیب ہوتی تھی۔ اگر تم کبھی یہ خط پڑھو گی تو خیال کرو گی کہ میں کتنا خود پرست تھا۔ تمہارا خیال صحیح ہو گا۔ سچی محبت ہمیشہ خود پرست ہوتی ہے۔ اگر اُس میں سے خودی کا عنصر نکال دیا جائے تو وہ ولایت کی ہم پلّہ ہوتی ہے۔ میرا گمان ہے کہ یہی حال تمہارا ہو گا۔ تم نے خط لکھنا اس لئے نہیں چھوڑا ہو گا کہ تم مجھے بھول گئی تھیں بلکہ اس لئے کہ تم اپنی یاد میں میرا وہ تصوّر محفوظ رکھنا چاہتی تھیں جب کہ مَیں جوان تھا اور ساری قیود سے آزاد۔

"کبھی کبھی تمہاری خیریت کی خبر تمہارے عزیز جیا فری سے معلوم ہوتی رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری لڑکی بیاہی گئی ہے

اور تمہارے قریب ہی رہتی ہے۔ اس وقت بھی اُس کے گھنگریالے بالکل تمہارے جیسے بال، وہی دلنشیں مسکراہٹ لئے ہوئے ننھا سا چہرہ میری نظروں کے سامنے ہے۔

"لارے کیا تمہیں وہ شام یاد ہے جب تمہارے جانے سے ایک روز پہلے ہم نے ہوٹل کے اُس کمرے میں جس کی کھڑکیاں سمندر کے عین اُوپر کھلتی ہیں، مل کر کھانا کھایا تھا۔ جُدائی! آہ ہمیشہ کی جُدائی کا تاریک سایہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ تمہارے وہ دو آنسو جو اُس روز باوجود تمہارے آہنی ضبط کے اُن گہرے نیلے سمندروں سے چھلک پڑے تھے مجھے کبھی نہیں بھول سکے۔

"کبھی کبھی عالمِ تصور میں مَیں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے مَیں جوان ہوں اور تم اب بھی میری محبوبۂ جاں نواز ہو۔ اِس عالم میں پہروں مَیں تمہارے آنے کا انتظار کرتا ہوں۔ کبھی کوئی دروازہ ہلتا ہے تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ شاید تم اُسی پُرغرور انداز سے، اپنی مخصوص کبھی نہ بھولنے والی مسکراہٹ لبوں پر لئے آ رہی ہو۔ مگر آہ میں ایسے لمحوں میں کتنی نادانی کا ثبوت دیتا ہوں۔ یہ تو قصّہ ہی ختم ہو چکا۔ اب مَیں کبھی تمہارا ہاتھ نہیں چُوم سکوں گا۔ اور میں نرگس کی اُس بھینی بھینی خوشبُو سے جو تمہارے جسم سے مخصوص ہے کبھی مشامِ جاں کو آسودہ نہ کر سکوں گا۔

"انسانی زندگی کس قدر گریز پا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی کل تم یہاں تھیں . . . . میرے پہلو میں، جب میرا ہر سانس کیفِ عشق میں ڈوبا ہوا ایک شعر تھا اور میری ساری ہستی سراپا نیاز۔ لیکن کل کیا یہ تو چالیس سال پہلے کی باتیں ہیں۔

"آہ! لارے میری جوانی اور اُس کی ساری شعریت تمہارے ہی دم سے تھی۔ جب تم چلی گئیں سب کچھ کھو گیا اور میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح محبت اور شعریت سے محروم ایک چلتی پھرتی نعش بن گیا جو انسان سے زیادہ ایک معاشرتی مشین سے مشابہ تھی۔ تمہارے چلے جانے سے میری زندگی میں پریشانیاں ہی پریشانیاں داخل ہو گئیں۔ یہ شاید ان دس سالوں کی شیریں راحتوں کے لئے قدرت کا انتقام تھا جو مَیں نے تمہاری بدولت محبت کی دُنیا میں، انتہائی اذیتوں اور ملکوتی خوشیوں کی دُنیا میں بسر کئے تھے۔ تمہاری جُدائی نے مجھے اس دُنیا سے بالکل علیحدہ کر دیا لیکن مسرت اور ابتہاج کی اُس رُوح کو جو تمہاری یاد سے آج بھی میری رگ رگ اور نس نس میں ناچنے لگتی ہے صرف میری موت ہی فنا کر سکتی ہے۔ وُہ وقت بھی اب قریب ہے اور مجھے اس بات کا انتہائی صدمہ ہے کہ میرے مر جانے سے تمہاری حسین ترین تصویر جو کسی انسان کے آئینۂ دل میں ہو سکتی تھی فنا ہو جائے گی۔

"لارے! تمہاری وجہ سے مجھے اذیتیں بھی پہنچیں اور تم نے مجھے ملکوتی خوشیوں سے بھی دوچار کیا۔ میں دونوں کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں۔ کیا تمہارا ہاتھ یہ خط پڑھتے وقت کانپے گا؟ کیا تمہیں وہ گزرے ہوئے لمحے یاد آئیں گے جو ہم نے باہم بسر کئے یا تم سب کچھ بھول گئی ہو؟ کیا تمہارے لبوں پر میری اور اپنی جوانیوں کی یاد پھر وہی رُوح پرور مسکراہٹ پیدا کرے گی؟ لارے جوانی ہی زندگی ہے۔ جب یہ گزر جائے تو ہمیں اُس کو شہنشاہوں کی ممیائی ہوئی لاشوں کی طرح شاداب و معطر یادوں میں ملفوف

رکھنا چاہیئے۔ خدا حافظ! اے ایمیں تمہارے ہاتھ پر بوسہ دیتا ہوں . . . . "

کریسجیراڈ کا سرمیز پر گر پڑا اور قلم اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

* * * * * * * * * *

جب ایمل اور اُس کی بیوی مارتھا بوڑھے نوکر سے ٹیلیفون پر اطلاع پاکر بھاگتے دوڑتے ہوئے پہنچے تو کمرے میں ڈاکٹر کھڑا تھا اور بوڑھے کریسجیراڈ کو پلنگ پر لٹا کر چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے انہیں دیکھتے ہی کہا "قلب کی شریان پھٹ گئی ہے اور زندگی ختم ہو چکی ہے"۔

ایمل نے چادر اُٹھا کر اپنے بوڑھے باپ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور مارتھا پٹی پر لگ کر رونے لگی۔

نوکر نے بیان کیا کہ کس طرح دیر تک کمرے سے کوئی آواز نہ آنے کی وجہ سے اُس کو شُبہ ہوا اور وہ دس بجے اندر جاکر کیا دیکھتا ہے کہ اُس کا بڈھا آقا میز پر ایک کاغذ کے اوپر سر رکھے بے حس و حرکت پڑا ہے۔ اور یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

آنسو پونچھتے ہوئے مارتھا بولی "آج سہ پہر کو تو وہ اچھے خاصے تھے۔ کسی خاص تکلیف کا ذکر تک نہیں کیا"!

ایمل نے فخر کے لہجے میں کہا "تکلیف کا ذکر کرنے سے انہیں عار تھی" اور یہ کہتے ہوئے اس بات کو جاننے کے لئے کہ اُس کا بڈھا باپ مَرنے سے عین پہلے کیا کام کر رہا تھا میز پر پڑے ہوئے کاغذات کو دیکھنے لگا۔ ورق اکٹھے کر کے اُس نے پڑھنا شروع کیا۔ اور جب وہ یہاں پہنچا "جب تم چلی گئیں سب کچھ کھو گیا اور مَیں بھی دُوسرے لوگوں کی طرح . . . . . " تو اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ مارتھا نے جو پیچھے کھڑی اپنے خاوند کے کندھے پر سے خط پڑھ رہی تھی پوچھا "یہ خط وہ کسے لکھ رہے تھے؟"

ایمل نے جواب دیا "مجھے کیا معلوم۔ ایک دفعہ بچپن میں مَیں نے امی جان کو یہ کہتے ہوئے سُنا تھا کہ ابا جان کو کسی زمانے میں ایک عورت سے بہت محبت تھی۔ ممکن ہے اُسی عورت کو لکھ رہے ہوں۔ یہ خط ہمیں جلا دینا چاہیئے۔ اس راز سے ہمارا کیا واسطہ ہے؟" یہ کہتے ہوئے ایمل نے سارے ورق آتش دان میں پھینک دیئے۔ شعلوں نے جلتے ہوئے کاغذوں کو اُوپر دُود کش میں چڑھا دینے کی کوشش کی لیکن نہ معلوم کیوں وُہ پھر زمین پر گر پڑے اور پاؤں سے مسل دیئے گئے۔

(ترجمہ) چوہدری محمد اقبال

بی۔ اے (علیگ)

نفسیاتِ اجتماعی

"انجمنِ اُردو پنجاب" نے فیصلہ کیا ہے کہ افسانوں اور ادبی تقریروں کے علاوہ عصرِ حاضر کے علوم سے متعلق مفید اور کار آمد مضامین پر بھی قابل حضرات سے عام فہم زبان میں تقریریں براڈکاسٹ کرائی جائیں۔ اس سلسلے میں قاضی محمد اسلم صاحب بی۔ اے (کنٹب) لکچرار نفسیات گورنمنٹ کالج لاہور "نفسیاتِ جدید" پر تقریر کر چکے ہیں۔ ۴ مئی ۱۹۳۷ء کی شام کو اُنہوں نے "نفسیاتِ اجتماعی" پر لاہور کی نشرگاہ سے ایک تقریر براڈکاسٹ کی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اس موضوع پر دو اور تقریریں ہوں گی۔ "نفسیاتِ اجتماعی" یعنی (Social Psychology) علومِ حاضرہ کی اہم ترین شاخ ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہم افراد و اقوام کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کے مختلف ذرائع سوچ سکتے ہیں۔ قاضی صاحب نے اِس موضوع کو نہایت سادہ اور آسان زبان میں پیش کیا ہے اور اس میں وہ صعوبتیں نظر نہیں آتیں جو بعض اہلِ قلم "اجنبی خیالات" کو اپنی زبان میں بیان کرتے وقت اپنے قارئین یا سامعین کے راستے میں حائل کر دیا کرتے ہیں۔

(حفیظ ہوشیارپوری ایم۔ اے۔ اسسٹنٹ سکرٹری "انجمنِ اُردو پنجاب")

نفسیاتِ اجتماعی میں کن اُمور کی تحقیق ہوتی ہے؛

جماعت کسے کہتے ہیں؛

جماعتوں کی کیا قسمیں ہیں؛

مختلف قسم کی جماعتوں کے کیا خواص ہیں؛

جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے انسانی زندگی کے دو اہم پہلو ہیں، انفرادی اور اجتماعی۔

نفسیات جو نفسِ انسانی کی علمی تحقیق کا نام ہے، انسانی زندگی کے ہر دو پہلوؤں کا مطالعہ کرتا ہے، انفرادی پہلو سے جو کچھ نفسیات میں بحث ہوتی ہے، اس کو نفسیاتِ عامہ یا نفسیاتِ انفرادی اور اجتماعی پہلو سے جو بحث ہوتی ہے اس کو نفسیاتِ اجتماعی کہتے ہیں۔

نفسیاتِ اجتماعی کی بنیاد اِس اصول پر ہے کہ ہر شخص انفرادی حیثیت میں جو کچھ کرتا یا کر سکتا ہے، اجتماعی حیثیت میں اس کے اعمال و افکار اُس سے بہت ہی مختلف ہو جاتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کو اکیلے چھوڑ دیا جائے تو وہ بُزدل، ایک بات پر قائم نہ رہنے والا اور بالکل غیر مستقل مزاج ثابت ہو لیکن اسی شخص کو ایک جماعت کے فرد کی حیثیت سے دیکھا جائے اور اس جماعت کے اثر کے ماتحت اس کی حالت کا مطالعہ کیا جائے تو وہ بالکل نڈر، بات کا پکّا اور استقلال اور وقار کا مجسمہ نظر آئے، پس نفسیاتِ اجتماعی سے

مراد اُن اُمور کی علمی تحقیق کرنا ہے، جو ایک فرد پر کسی جماعت میں داخل ہوجانے سے وارد ہوتے ہیں۔ نفسیاتِ اجتماعی ان کے علاوہ اُن اُمور کی بھی علمی تحقیق کرتا ہے جو دو مختلف جماعتوں کے باہم میل جول سے پیدا ہوتے ہیں۔ اَور یہ نہ صرف اس وجہ سے ضروری ہے کہ آج کل تقریباً ہر فرد متعدد جماعتوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے متعدد اجتماعی حیثیتیں رکھتا ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اجتماعی ترقی عام طور پر اُس وقت تک ظہور میں نہیں آتی، جب تک دو یا زیادہ جماعتوں کا آپس میں کوئی تعلق پیدا نہ ہوجائے۔ غرض نفسیاتِ اجتماعی میں دو بڑے سوالوں کی تحقیق ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ جماعت کا فرد پر کیا اثر ہوتا ہے؛ اور دوسرے یہ کہ جماعت کا جماعت پر کیا اثر ہوتا ہے؛ ان سوالوں کی تحقیق میں کئی دلچسپ مسائل زیرِ مطالعہ آجاتے ہیں، اجتماعی ترقی، لیڈری، رائے عامہ، تمدّن، زبانوں، قومی عادتوں کا بننا اور پھیلنا وغیرہم مسائل اسی تحقیق سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں شاید ہی کوئی انسانی مساعی ایسی ہوں، جہاں اجتماعی حالات سے سابقہ نہ پڑتا ہو۔ گھروں، سکولوں، ہوسٹلوں، کھیلوں، انجمنوں، جلسوں، جنگوں اور کارخانوں میں سب جگہ انسان کو اجتماعی زندگی سے سابقہ پڑتا ہے۔ ہر جگہ وہ خاص حالات موجُود ہوتے ہیں جن کے پیشِ نظر یا تو افراد کسی جماعت میں شامل ہونے کی وجہ سے اِس جماعت کے زیرِ اثر ہوتے ہیں یا دو جماعتیں ایک دوسری سے متاثر ہوتی ہیں۔ ایسے امُور کا مطالعہ علمی و عملی دونوں لحاظ سے مفید اور دلچسپ ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ جماعت کہتے کسے ہیں؛ شاید آپ کے دِل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جماعت کے لئے کسی ایک جگہ رہنا ضروری ہے۔ لیکن انسانی سوسائٹی سے تھوڑی سی واقفیت رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ اتحادِ مکانی سے جماعت، جماعت نہیں بنتی، اور جو حال تمدّن کا آج کل ہو رہا ہے اس سے تو یہ بات بخوبی روشن ہے۔ مدتوں ایک دوسرے کے پڑوس میں رہنے کے باوجود بعض افراد میں کوئی ذہنی اتحاد پیدا نہیں ہوتا۔ ریل میں بھی کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کئی لوگ گھنٹوں ایک دوسرے کی معیت میں سفر کرتے ہیں اور ان میں کوئی تعلق بجز جسمانی قرابت کے پیدا نہیں ہوتا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اخبار یا اپنی کتاب یا اپنے ذاتی افکار میں مست رہتا ہے، یہاں تک کہ سفر ختم ہوجاتا ہے اور ان میں کوئی اجتماعی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، لیکن اس کے برعکس کسی مشترکہ تکلیف یا خوشی کے مقصد میں ہمسائے متحد ہو جاتے ہیں تو جھٹ ان میں جماعتی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ ریل گاڑی میں بھی اکٹھا سفر کرنے والوں میں سے ایک کوئی بات شروع کر دیتا ہے اور دوسرے سننے لگتے ہیں تو وہی معیت جو اب تک محض جسمانی حیثیت رکھتی تھی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت رکھنے لگتی ہے، اور افراد کا ہجوم جماعت کہلانے لگتا ہے، خلاصہ یہ کہ جماعت کو جماعت کہلانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں تین علامتیں پائی جائیں۔ ایک یہ کہ اِس میں کچھ نہ کچھ ترتیب اور نظام ضرور ہو، اگر اس میں لیڈر اور اُس کے پیچھے چلنے والوں کا امتیاز نظر نہ آئے تو کم از کم "سُنانے والے" اور "سننے والوں" کا ہی تعلق پایا جاتا ہو، پس ہر جماعت میں کچھ نہ کچھ نظام ادنٰے ہو یا اعلٰے ضروری ہے۔ دوسری علامت جو ایک جماعت کو جماعت بناتی ہے یہ ہے کہ اس میں اتحاد کی کوئی نہ کوئی شرط

موجود ہو، تیسری علامت جو جماعت کو جماعت بناتی ہے یہ ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ حرکت بھی پائی جاتی ہو۔ جس جماعت کے افراد ایک دوسرے کے متعلق بالکل ساکن یا بے حس ہیں، وہ جماعت جماعت نہیں کہلا سکتی۔ جانوروں کے غول اور پرندوں کے جھنڈ جماعتی حیثیت رکھ سکتے ہیں، لیکن انسانوں کا وہ ہجوم جو ایک دوسرے کو یا اجتماعی حیثیت سے کسی اور ہجوم کو متاثر نہیں کر سکتا، وہ ہرگز جماعت کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جماعتوں کی کیا قسمیں ہیں؟ یہ سوال بہت اہم ہے، اور در اصل اسی سوال سے نفسیاتِ اجتماعی کا پہلا باب شروع ہوتا ہے، اور اس سوال کے حل کرنے سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ فرد پر جماعت کا کیا اثر ہے۔ کیونکہ اگر مختلف جماعتوں کی بنیادِ اتحاد کا علم ہو جائے تو پھر اسی بنیاد سے اس اثر کی نوعیت پر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے جو ایک جماعت اپنے افراد پر کر سکتی ہے۔ جماعتوں کی مختلف اقسام معلوم کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ انسانی فطرت کن کن میلانات سے مرکّب ہے، اس میں کیا کچھ پایا جاتا ہے، اور اس کے اجزا کے الگ الگ نام کیا ہیں؛ اگر یہ امور طے ہو جائیں تو جماعتوں کی تقسیم کا سوال آسان ہو جاتا ہے کیونکہ ہر قسم کی جماعت کی بنیاد فطرتِ انسانی کے کسی خاص حصّہ پر ہوتی ہے، اور جہاں کہیں بھی افرادِ انسانی، اپنی اپنی فطرت کے کسی ایک حصّہ میں مشترک ہو جاتے ہیں، وہیں ایک نوع کی جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ بس اصل سوال یہ ہے کہ فطرتِ انسانی کے بڑے بڑے حصّے کیا ہیں؛ فطرتِ انسانی کے دو بڑے حصّے ہیں، ایک حصّہ تو وہ ہے جو قدرت نے ابتدائے آفرینش سے انسان کو عطا کر رکھا ہے اور جب سے انسان پیدا ہوا ہے یہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا چلا جاتا ہے، دوسرا حصّہ وہ ہے جو قدرت کے عطیہ کو بیج کے طور پر استعمال کرتا ہے اور ماحول، موقع، محل کے اثر کے ماتحت پھلتا اور پھولتا ہے۔ پہلے حصّہ کی دو قسمیں ہیں، ایک حصّہ تو وہ ہے جس کے محرکات انسان کے اندر سے ہی پیدا ہوتے ہیں، جیسے بھوک، پیاس، شہوت وغیرہ۔ ہو سکتا ہے کہ انسانی فطرت کا یہ حصّہ کسی خارجی تحریک پر بھی اپنی کارفرمائی شروع کر دے لیکن جب تک داخلی شرائط موجود نہ ہوں خارجی محرکات بیکار ثابت ہوتے ہیں، اچھا کھانا دیکھ کر بھوک لگ سکتی ہے لیکن بھوک بھوک ہے اور اگر اس کے اندرونی شرائط موجود ہوں تو اس کے پیدا کرنے کے لئے اچھے کھانے کی ضرورت نہیں، اور اگر اندرونی شرائط موجود نہ ہوں تو اچھا کھانا بھی بھوک پیدا نہیں کر سکتا، دوسرا حصّہ انسانی فطرت کے قدرتی سرمایہ کا وہ ہے جس کے محرکات بھوک، پیاس اور شہوت کی طرح داخلی نہیں بلکہ خارجی ہیں۔ اس کی مثالیں خوف، غصّہ، بدلہ لینا، مقابلہ کرنا ہیں۔ ایسے جذبات کے لئے ضروری ہے کہ باہر کوئی محرک ہو اور اس کے جواب میں ان جذبات کا اظہار ہو، فطرتِ انسانی کے ان قدرتی اور بنیادی میلانوں کے علاوہ جو میں بیان کر چکا ہوں اور میلان بھی ہیں یہ میلان وہ ہیں جو فطرت کی جڑوں سے پھوٹ کر ماحول کے ہوا اور پانی سے پھلتے اور پھولتے ہیں۔ ایسے میلانوں کی نشوونما میں تعلیم و تربیت، اساتذہ اور بزرگوں کی صحبت، نیز زندگی کے واقعات کو بہت بڑا دخل ہے۔ ہر شخص ان میلانوں کے ماتحت کبھی نہ کبھی کسی وقتی اثر کے ماتحت کسی عارضی فیشن کا دلدادہ بن جاتا ہے یا اپنی استعداد اور حالات کے مطابق کسی ایک فن یا پیشہ میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے

یا بعض خاص اشیاء، مقامات، تاریخی مشاہیر، افسانوں کے بعض کرداروں اور مذہبی پیشواؤں سے زیادہ عقیدت و تعلق پیدا کر لیتا ہے، ہوتے ہوتے ہر شخص زندگی کا کوئی نہ کوئی مدعا یا منتہی بھی رکھنے لگتا ہے، جہاں جا کر اس کی ساری چھوٹی بڑی مساعی ختم ہوتی ہیں۔ اگر انسان کی فطرت کے ان تمام حصوں کو ایک ایک کر کے لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ انسانی سوسائٹی کی بنیاد انسانی فطرت کے ہر حصہ پر رکھی جا سکتی ہے تو انسانی جماعتوں کی بہیں کئی اقسام معلوم ہو جاتی ہیں۔

ایک قسم جماعت کی وہ ہے جس کی بنیاد کسی مشترکہ خواہش پر ہے، ایسی جماعت کی زندگی اُس وقت تک ہے جب تک کہ وہ خواہش قائم رہتی ہے۔ چونکہ خواہش ایک درجہ پر قائم نہیں رہتی اس لئے ایسی جماعت کی زندگی میں اُتار چڑھاؤ بہت نظر آتا ہے۔ ایسی جماعت کو قرار اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اُس کی بنیاد ہی قرار ہو اور جب تک اس کے اتحاد کی بنیاد ہی قرار اور استقلال نہیں اس وقت تک اس کی جماعتی زندگی میں کوئی قرار اور استقلال نہیں ہو سکتا۔ ایسی جماعت کے لیڈر بھی جلد جلد بدلتے رہتے ہیں، کبھی کوئی اور کبھی کوئی آگے آ جاتا ہے اور وُہی شخص لیڈر بنتا ہے جس میں جماعت کی "بنیادی خواہش" زیادہ شدت کے ساتھ موجود ہو۔ ہر ابتلا کے وقت اس جماعت میں ایک تزلزل پیدا ہو جاتا ہے اور پُرانا نقشہ تبدیل ہو کر ایک نئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایسی جماعت میں انفرادی آزادی بہت کم ہوتی ہے۔ ایک فرد کی ذرا سی لغزش اس کی موت کا باعث بن سکتی ہے۔ ڈاکوؤں اور قاتلوں کا اتحاد اسی قسم کا ہوتا ہے، فرقہ وارانہ فسادوں کے وقت جو ٹولیاں بن جاتی ہیں وہ بھی ایسے ہی محرکات کے ماتحت ظہور میں آتی ہیں + ایک دوسری قسم کی جماعت وہ جماعت ہے جس کی بنیاد کسی مشترکہ خوف یا مشترکہ غصہ پر ہو، ایسی جماعت کو بھی قرار اور استقلال نصیب نہیں کیونکہ خوف یا غصہ ایسے جذبات ہیں جن کے لئے خارجی محرکات ضروری ہیں۔ جہاں یہ محرکات ختم ہوئے وہیں اس قسم کی جماعت کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے، ایسی جماعت کو بھی قرار حاصل کرنے کے لئے اپنی بنیاد کو مستقل بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیڈر بھی اکثر بدلتے رہتے ہیں اور اس میں بھی عدم رواداری کا بازار گرم رہتا ہے + تیسری قسم جماعت کی وہ جماعت ہے جو کسی وقتی شوق کے ماتحت پیدا ہو جائے، ایسی جماعت بھی ایک عارضی شے ہوتی ہے اور نہ اس کے پیدا ہونے کا پتہ لگتا ہے نہ مرنے کا، اس کی بنیاد بعض نعرے یا مخصوص کلمات، ظاہری نشان اور خاص قسم کے لباس وغیرہ ہوتے ہیں، اور تھوڑی دیر کے لئے ان کا بہت چرچا رہتا ہے + چوتھی قسم جماعت کی وہ جماعت ہے جس کی بنیاد کسی مشغلہ یا کسی کاروبار پر ہے، ایسی جماعتوں کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی سوسائٹی کا نظام پھیلنے لگتا ہے اور انفرادی آزادی کی بنیاد پڑتی ہے۔ افراد اپنے اپنے تنگ دائروں میں ہی منقسم نہیں رہتے بلکہ ان دائروں سے نکل کر ایک بڑے دائرے میں شریک ہو جاتے ہیں + پانچویں قسم جماعت کی وہ جماعت ہے جس کی بنیاد عقیدت پر ہے عقیدت سے ہی وہ مستقل اور پائدار روایات پیدا ہوتی ہیں جو لیڈری سے بالا ہوتی ہیں اور جو جماعتوں کو شخصی لیڈروں سے مستغنی کر دیتی ہیں، جماعتی زندگی میں وہ قرار اور استقلال جو چوتھی قسم کی جماعت سے شروع ہوتا ہے، پانچویں قسم کی جماعت میں اور بھی بڑھ جاتا ہے + چھٹی قسم کی جماعت جس کا وجود سب سے زیادہ مستقل اور پائدار ہوتا ہے وہ جماعت ہے جس کی بنیاد اتحادِ مدعا یا اتحادِ منتہیٰ پر ہے، اور یہی وہ جماعت ہے جس سے نہ صرف افراد میں بلکہ خود جماعتوں میں بھی اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔

محمد اسلم بی۔ اے (کنٹب)

تخیّلات

انجمِ روشن جبیں گردوں کے شیریں خواب ہیں
اور گلِ رنگیں ضمیرِ خاک کے دلکش خیال

تیرا پیکر شاہدِ فطرت کا خوابِ دلفریب
اور مری تخییل کا معبود ہے تیرا جمال

دوڑتی ہے پیکرِ انساں میں جو بن کر لہو،
رنگ و بُو ہے لالہ و گل میں وہی موجِ حیات!

سینۂ گلشن میں جس کے دم سے ہی رُوحِ نسیم،
نغمہ ہے انفاسِ بلبل میں وہی موجِ حیات!

اپنی تنہائی سے نہ گھبرا تُو
مرد تنہا مقام کرتے ہیں

گر ترے پاس ہو دلِ آگاہ
تو حجر بھی کلام کرتے ہیں

بوسۂ یزداں

بندہ

اس سے پہلے میں کہاں تھا اے خدائے کُن فکاں؟
کونسی منزل تھی میری، کون سا میرا دیار؟

یزداں

تھا مرے بندے تُو میرے دِل کا سوزِ آرزُو،
لذتِ پیدائی تجھکو کر گئی ہے آشکار

سو رہا تھا پہلوئے امکاں میں تُو مانندِ طفل،
کر دیا ناگہ مرے بوسے نے تجھکو ہوشیار

سعید احمد اعجاز

اوسط

میرے ایک بحث باز دوست کی زبان پر "average man" یعنی "اوسط آدمی" کا جملہ اس قدر رواں ہے، کہ بعض دفعہ مذاق مذاق میں اور لوگوں سے تعارف کراتے وقت یہ کہنا پڑتا ہے کہ "آپ (یعنی میرا بحث باز دوست) بڑے بھاری موجد ہیں"۔ اس پر مجھ سے سوال ہوتا ہے کہ "آپ کی ایجاد کیا ہے؟" تو میں ہنس کر کہہ دیتا ہوں "انہیں سے پُوچھیئے!" اور پھر یہ میرے بحث باز دوست خود ہی فرما دیا کرتے ہیں کہ بقول "فلک پیما" "میں

"اوسط آدمی"

کا موجد ہوں"۔ آج تک میرا یہ دوست اتنا بھی نہیں سمجھ سکا کہ "اوسط" عنقا ہے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے اُس کے دماغ میں ایک "اوسط تول ترازُو" قائم کر دیا ہے کیونکہ بات بات پر میرا یہ دوست اوسط آدمی کی ضروریات، اوسط آدمی کے خیالات، اوسط آدمی کے جذبات، اوسط آدمی کے سیاسیات کا ترجمان بنتا ہے اور دوسرے لوگوں کے تخیّل کو یوں ٹھکرا دیتا ہے کہ گویا سوائے اوسط آدمی کے اور کسی کا ذکر ہی فضول ہے۔ بارہا محض تفریحاً اپنے دوست کو فرمائش کر چکا ہوں کہ پہلے میرے سامنے ایک ایسا ہندوستانی آدمی لاؤ جس کا قد پانچ فٹ سوا ایک اِنچ ہو جس کی روزانہ خوراک پانچ چھٹانک سوا دو تولہ اناج ہو جس میں ½ ۱ ماشہ خاک شامل ہو جس کا ماہوار خرچ ۷ روپیہ ½ ۱۳ آنہ ہو اور آمدنی ۷ روپیہ ⅗ ۱۲ آنہ ہو تب میں تمہاری بات سنوں گا اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کے ہمراہ اس کے ۲٫۵۷۷ بچے ہوں اور نقد ۱۱/۱۱ عدد بیوی ہو مگر میرے اس دوست کو حساب سے نفرت ہے اور وہ اپنی ہانک لگائے جاتا ہے کہ اوسط آدمی کے لئے ایک اوسط درجہ کا مولوی یا پنڈت اور ایک اوسط درجہ کا تھانیدار ضروریاتِ زندگی ہیں اور اس لئے موجودہ انگریزی حکومت جس میں یہ دونوں چیزیں میسّر ہیں اوسط تعریف کی مستحق ہے۔ میں لاکھ چیختا ہوں کہ انگریزی حکومت کا یہ اندھیر تو دیکھو کہ سندھ کے مقابلے میں پنجاب میں پیروں کا کال ہے اور وزارت کے اُمیدواروں کی افراط مگر وہ میری کب سُنتا ہے۔

ایک دن اسی "اوسط آدمی" کے جنجال سے تنگ آ کر اپنے دوست سے یوں ہمکلام ہُوا "سنو بھئی اوسط کے غلام! میں ہارا اور تم جیتے۔ میں اوسط آدمی پر ایمان لے آؤں گا بشرطیکہ تم ایک مشکل حل کر دو!"

دوست۔ وہ کیا؟

مَیں۔ سُن لو مگر خواہ مخواہ بیچ میں دخل نہ دینا۔

دوست۔ اوسط آدمی دُنیا کی بہت کم باتوں میں دخل دیتا ہے اور میں بھی اس کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔ کہو۔

میں۔ بہت غور کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تم جو کچھ کہا کرتے ہو اس میں واقعی حقیقت کا ایک عنصر ضرور ہے۔ جب ہم روزمرہ یہ کہتے ہیں اور سنتے ہیں کہ فلاں وکیل ایک اوسط درجہ کا وکیل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اوسط درجہ کا انسان کیوں نہ ہو البتہ . . . .

دوست۔ (بات کاٹ کر) پہلے تم اوسط وکیل کی تعریف تو کرو۔

میں۔ بڑے جاہل ہو، اوسط وکیل، اوسط لیڈر، اوسط استاد، اوسط بیوی جس کی کہو تعریف سنا دوں۔

دوست۔ ہاں تو سناؤ نا!

میں۔ اوسط وکیل وہ ہوتا ہے جو عدالت، ہوٹل، ایجنٹ سب کو یکساں گالی دے مگر ان کی عدم موجودگی میں عدالت کو بدمزاجی کے لئے ہوٹل کو کمی فیس کے لئے، ایجنٹ کو بے ایمانی کے لئے۔ صرف ساڑھے تین کتابوں کا مالک ہوتا ہے۔ وہ بھی پرانی، اس امید میں زندہ رہتا ہے کہ کبھی انکم ٹیکس ادا کرے گا۔ اوسط لیڈر وہ ہوتا ہے جو سب طرف چلے مگر کوئی بڑا چندہ نہ کر سکے نہ کھا سکے، ووٹوں کی تاک میں سرکار کو برا بھلا کہے اور عہدہ مل جانے کی امید میں انقلابیوں پر بھی وار کر جائے۔ بچارے کو فرصت نہیں ہوتی اور موقع نہیں ملتا۔ اوسط استاد وہ ہوتا ہے جو پڑھا دے مگر سمجھا نہ سکے۔ لائق شاگردوں پر جا و بیجا فخر کرتا ہے مگر یہ نہیں سمجھ سکتا کہ گو لیاقت کُش ہونا استاد کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے مگر اوسط استاد سے نہ علم میں ترقی ہوتی ہے نہ لیاقت میں کمی۔ اوسط بیوی وہ ہوتی ہے جو بچوں کا منہ ہاتھ دھلائے مگر جسے اپنے منہ ہاتھ کی خبر نہ ہو، ہر سینما اسٹار کو شیطان کی حقیقی نواسی خیال کرتی ہے اور حج کی آرزو میں شوہر کے تخیل کے ساتھ وہ سلوک کرتی ہے جو بدو لوگ جیو حال کے لئے جائز تصور کرتے ہیں۔ پیسے جوڑتی ہے زندگی گنواتی ہے۔

دوست۔ بہت ٹھیک۔ تو اب تمہیں اوسط انسان کے سمجھنے میں کیا دشواری ہے؟

میں۔ وکیل تو ہائی کورٹ بناتا ہے۔ لیڈر قوم ڈھالتی ہے، اخبار سنوارتے بگاڑتے ہیں۔ استاد اور بیوی سوشل تصانیف ہیں۔ اس لئے ان سب میں تو اوسط ہونا معمولی بات ہے۔ کوئی وکیل اچھا بنا، کوئی برا بنا کوئی اوسط رہ گیا۔ اسی طرح اخبار والوں نے کوئی اچھا لیڈر بنا دیا تو کوئی نکما سا لیڈر بھی تیار ہو گیا مگر

انسان

تو خدا بناتا ہے۔ خدا کے بنائے ہوئے کام کو اوسط کہنا کہاں جائز ہے اور اگر خدا بھی اوسط درجہ کے کام کرتا ہے تو پھر وہ خدائی کیا ہوئی اچھی خاصی بیگار ہوئی۔

دوست۔ تم اوسط درجے کے کوڑھ مغز ہو اور اسی لئے مجھے تم سے اوسط درجہ نفرت اور اوسط درجہ محبت ہے۔ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا۔

فلک پیما

کلامِ فراق

مجھ کو مارا ہے ترا درد اُٹھا کے پہلے
دی سزا عشق نے ہر جرم و خطا کے پہلے

مر لے کچھ روز اگر جامِ شہادت کا ہے شوق
پی لے زہرابۂ غم آبِ بقا کے پہلے

دل ہی قاتل بھی تھا مقتول بھی تھا مقتل بھی
مٹ گئے ہم تو فنا اور بقا کے پہلے

فتنے برپا ہوئے ہر غنچۂ سربستہ سے
کھُل گیا رازِ چمن چاکِ قبا کے پہلے

کیوں نہ ہوں رُکتے ہوئے عشق کے شکوے اے دوست!
کچھ کرم بھی تھے ترے جور و جفا کے پہلے

چال ہی بادۂ ہستی کا چھلکتا ہوا جام،
ہم کہاں تھے ترے نقشِ کفِ پا کے پہلے

موت کے نام سے ڈرتے تھے ہم اے شوقِ حیات
تُو نے تو مار ہی ڈالا تھا قضا کے پہلے

غفلتیں عالمِ فانی کی بتا دیں گی تجھے
جو مرا حال تھا احساسِ فنا کے پہلے

ہم اُنہیں پا کے فراقؔ اور بھی کچھ کھوئے گئے
یہ تکلف تو نہ تھے عہدِ وفا کے پہلے

فراقؔ گورکھپوری

گلمرگ

فطرت کی نعمتوں سے لدی پھندی پھولوں کی وادی۔ گلمرگ — کشمیر سے ۳۱ میل دور آرام فرما ہے۔

موٹر کی مدھم چال اور تیز پنکھے کی آواز سطحِ بحر سے بلندی کا اندازہ لگانے میں بآسانی ممد و معاون ہو سکتی ہے۔ راہ کی لطافتوں میں گھلی ہوئی ہوائیں، دُور دُور تک پھیلے ہوئے سبزے، کسی آنے والے فردوس فریب خطّے کا پتہ زبانِ حال سے دیتے ہیں! اِک مقام — ٹن مرگ — پر آ کر مشین زدہ انسان کو فطرت پھر اپنی پہلی سادگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور موٹر کو چھوڑ گھوڑوں پر سوار ہونا پڑتا ہے۔ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا راستہ ہولے ہولے بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ ہانپتے ہوئے گھوڑے کا گرم تنفس صاف کہہ رہا ہوتا ہے کہ فطرت کی بلندیوں کا صعود اور اس کے مہربستہ امن کی شکست آسان کام نہیں۔ نیچے — دریا اپنی تیزیوں کو بھول کر پھیل جاتا ہے۔ گویا تھک کر اب ذرا سستا رہا ہے۔ نکیلے، چوڑے مہیب پتھروں، متوسط انداز کے پتھریلے ٹکڑوں سے اِک دلچسپ کھنک پیدا کرتے ہوئے ٹکراتا نہیں کھیلتا ہے۔ سُورج کی کرنیں اس کے پانیوں سے کھیلتی ہیں۔ اور ان کے مِلے جُلے کھیل منظرِ فطرت کو دلچسپ تر بنا دیتے ہیں۔ اپنے دائیں نگاہ کیجیے تو چیل کے بیشمار درخت، قطار اندر قطار، اپنے عقبی منظر کو نگاہوں سے اوجھل کیے چُپ چاپ شاخیں پھیلائے کھڑے ہیں۔ ان کی جڑیں زمین سے یوں نکل آئی ہیں کہ جوئے سر کے تختے کا گمان ہو، یا کوئی جنون سا ہوتا ہے کہ ان میں جا کر اُلجھے، یہاں رپٹے، وہاں گرے اور گرتا سنبھلتا اِک غیر معین اور طویل عرصے تک، اس شے کو کبھی کھوتا کبھی پاتا مصروف رہے، جسے بچپن کہتے ہیں۔ معاً ایک اچھا خاصا نشیب اور پھر گلمرگ — بہشت کے آسمان کا ٹوٹا ہوا تابناک تارا۔ دُنیا کی بلند ترین غزل کا شاداب ترین شعر۔ ہوا کے خوفناک جھونکے کسی گم شدہ جنّت کا پتہ دیتے ہیں۔ مرغزار اور بہارستان آپ کو چاروں طرف گھیرے ہوتے ہیں۔ اللہ میرے! اس قدر بلند زمین کا پہاڑی ٹکڑا اور اس پر بھی زمین کی سی سطح — نہ ہموار بہت اور نہ نشیب و فراز بہت — سہانا نشیب سہانا فراز۔ اِدھر اُدھر خوشنما مخملیں ٹیلے جن پر چڑھنا سانس کو ذرا تکلیف نہ دے۔ سبزہ، سبزہ اور بے انتہا سبزہ! اسی سبزے میں انسانی راہیں جیسے کسی نے افشاں چُن رکھی ہو! وسیع کھلے میدان، پہاڑوں کے سلسلۂ دراز کے ساتھ یوں مِل گئے ہیں جیسے مُدّتوں کے بچھڑے ہوئے بیٹے مہجور ماں سے لپٹ جائیں۔ پہاڑوں پر درختوں کی لاتعداد گھنی قطاریں۔ درختوں کا رنگ گہرا سبز جس پر سیاہی مائل ہونے کا گمان ہوتا ہے، سبزہ جیسے کسی نے بہت احتیاط سے ابھی ابھی دھویا ہو۔ اُجلے، صاف ہلکے سبز رنگ کی دیدہ زیب پوشاک پہنے! رنگ اتنا دلاویز کہ گلستانی سبزہ بھی ماند

پڑ جائے ۔ نرم نرم دھوپ گویا زمین سے اُس کی پیداوار سے مزے مزے پیار کر رہی ہے ۔ ابر کے ٹکڑے جا بجا درختوں پر تاریکی کے بڑے بڑے دھبے نظر آتے ہیں ۔ وہ جو شہروں میں اودھم مچائے رکھتا ہے ، دُور دُور کہیں کہیں اِکّا دُکّا نظر پڑتا ہے ۔۔۔ انسان ! خداوند ہند کی حسین ترین مخلوق ۔۔۔ کشمیری ۔ پیٹ کی دوزخ بھرنے کی خاطر اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر خراماں خراماں گھروں کو لوٹتے ہیں شام کے وقت ۔ شام کا وقت ۔۔۔ ہواہیں برودت ، در و دیوار سے خنکی محسوس ہوتی ہے ۔ مئی جون میں آغاز دسمبر ! نیم گرم کمبل گھٹنوں پر ڈالے ، آرام کرسیوں پر نیم دراز شاعر کے خواب کی طرح حسین تخیل میں ، کہیں کا کہیں انسان پہنچ جاتا ہے ۔ لوگ باگ سیر کو قدم قدم چلتے ہیں ۔ زندگی کے فکر اور غم کی بندشیں یہاں ٹوٹ جاتی ہیں ۔ وادی کی فضائیں نشہ میں جھوم رہی ہوتی ہیں ۔ عجیب عالم کیف طاری ہوتا ہے ۔ اُوپر بلندئ کوہ پر سفید سفید برف ۔ اُور درخت اُور سبزہ اُور وسعت اُور سکوتِ مرگ ! سچ مچ ہم جیسے خواب میں چل پھر رہے ہوں ، اس دُور اُفتادہ بلند مقام پر ، اس خواب کی وادی میں ، جہاں تخیل کی سرحدیں بے پناہ ہو جاتی ہیں ۔ صرف ایک خیال کوندے کی تڑپ کے ساتھ قلبِ مضطر کو ، سکون کے متلاشی ، زندگی کے ہارے ہوئے کو رہ رہ کر چونکا سا دیتا ہے ۔

تم بھی یہاں ہوتے دوست ۔۔۔ اے کاش !

رحیم

تسکینِ قلب

اے لوگو ! آؤ اور اپنے معبود کے آگے عاجزی سے سرِ تسلیم خم کر دو !

خدا تمہیں جان اور مال کی تباہی کے موقع پر آزماتا ہے ۔۔۔ دیکھو ایسا نہ ہو شانِ عبودیت میں ذرہ بھر بھی فرق آ جائے !!

لوگو ! کیا تم بھولتے ہو کہ محرومئ محبوب انسان کی زندگی کا لازمہ ہے ؛

کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جس کا کوئی عزیز اس سے جُدا ہو کر اسے داغِ الم نہ دے گیا ہو ؛

جب تمہاری زندگی کی عزیز ترین شے تم سے چھین لی جائے تو

صبر کرو ۔۔۔ اور یہ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا ۔۔۔ صبر اور شکر بلاشبہ تمہارے معبود کی خوشنودی کا باعث ہونگے ۔

شاہد الغفور

اقوال

یاد کرکے ملول ہونے سے فائدہ : بہتر یہی ہے کہ بھول جاؤ اور مسکراؤ ! (روزیٹی)

ارادے کا تذبذب ، رنج و ملال کا بھائی ہے ۔ (سٹینلے ملز)

زبان ہمیں اس لئے عطا کی گئی ہے کہ ہم آپس میں خوشگوار باتیں کیا کریں ۔ (بوئز)

عقلمند وہی ہیں جو اپنی ناکامیوں سے بھی کچھ نہ کچھ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ (ہوبز)

مستحسن اور سعید کام پہلے پہل ناممکن نظر آیا کرتا ہے ۔ (ٹامس کارلائل)

اگر کوئی تمہاری بُرائی کرے تو تم یوں زندگی بسر کرو کہ لوگ اُس کا اعتبار ہی نہ کریں ! (افلاطون)

اگر آپ پیسہ کی قدر پہچاننا چاہتے ہیں تو اسے کسی سے اُدھار مانگئے ! (فرینکلن)

اگر کام نہ ہو تو زندگی خشک سی ہو جائے ! (ڈیوڈ گریسن)

جب ہم آہستہ آہستہ سہتے ہوئے عادی ہو جائیں تو ناقابلِ برداشت عمل بھی قابلِ برداشت ہو جاتے ہیں ۔ (جی میکڈانلڈ)

حلم اور ملائمت دلائل سے کہیں بہتر ہے ۔ بعض دفعہ آپ منوا نہیں سکتے ۔ لیکن مائل ضرور کر لیتے ہیں ۔ (ایچ ۔ ڈبلیو ۔ شا)

دوست محمد خاں

محفلِ ادب

وفاق

(جس کا نفاذ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے ہوگیا ہے)

دُھومیں مچی ہوئی ہیں نظامِ وفاق کی — ہندوستاں ہنوز ظلوم و جہول ہے

اِس نوحۂ خزاں کو سمجھنا نویدِ گُل — اِک بے پناہ چوک ہے، اِک سخت بھول ہے

یہ بوستانِ اہلِ سیاست کی "شاخِ گُل" — شیطاں کے پائیں باغ کی سوکھی ببُول ہے

یہ ہے نیا نکاح کہ دُولہا تو ہے خموش — قاضی یہ کہہ رہا ہے کہ "ہاں جی قبول ہے"

ہشیار اہلِ ہند، کہ پھر اِس زمین پر — گردوں سے ایک تازہ بلا کا نزُول ہے

کہتے ہیں جس کو "دولتِ بیدار" اہلِ غرب — وہ اِک متاعِ کاسد و جنسِ فضول ہے

ناداں اکڑ رہے ہیں کہ حاصل ہُوا وفاق
دانا سمجھ رہے ہیں کہ "اپریل فُول" ہے

(کلیم) — جوش ملیح آبادی

پُرانی شراب نئی بوتل میں

ہندوستان میں کتابوں کا کاپی رائٹ

حضور نواب گورنر جنرل بہادر سے اجلاس کونسل فورٹ ولیم میں بتاریخ ۸ دسمبر ۱۸۴۷ء ایک قانون واسطے حسنِ ترویج علم کے اضلاع ممالکِ محروسہ سرکار کمپنی بہادر میں بوسیلہ حق مصنفی کے نافذ ہوا ہے، جس کی رُو سے حکم دیا جاتا ہے کہ جو کتاب ممالک محروسہ سرکار کمپنی بہادر میں بعد جاری ہونے آئین پارلیمنٹ باب ۸۵ واقعہ سنہ ۳ و ۴ جلوس شاہ ولیم چہارم مغفور کے بحین حیات مصنف چھپی ہوگی حق مصنفی اس کا تا مین حیات مصنف اور بلکہ سات برس تک بعد ممات مصنف کے بنام مصنف اور اس کے وارثوں کے رہے گا لیکن اگر وہ سات برس درمیان بیالیس برس تاریخ انطباع کتاب مذکور سے آجائیں گے تو حق مصنفی بیالیس برس تک قائم رہے گا۔ اور جو کتاب بعد وفات مصنف اور اجرائے آئین پارلیمنٹ مذکورہ چھپی ہوگی حق مصنفی اس کا کتاب کی پہلی اشاعت سے بیالیس برس تک ہوگا اور اس وجہ سے کہ عوام الناس کتب مفید و کار آمد سے محروم نہ رہیں حکم دیا جاتا ہے اگر کوئی شخص شکایت پیش لائے کہ مالک

حق مصنفی فلاں کتاب کا جو اس قانون کے بعد اجرا چھپی تھی نہ تو خود دوبارہ چھاپتا ہے اور نہ دوسروں کو اجازت چھاپنے کی دیتا ہے، اس صورت میں نواب گورنر جنرل بہادر کو باجلاس کونسل اختیار ہے کہ اس کو بقیود و شرائط مناسب اس کتاب کے انطباع کی اجازت مرحمت فرمائیں اور وہ شخص بدستاویز اس اجازت نامہ کے اس کتاب کو شوق سے چھاپ ڈالے۔ (فوائد الشائقین ۲۴ جنوری ۱۸۴۸ء)

مقدونیہ میں بغاوت کی تیاریاں

بلغاریہ میں پرنس الگزنڈر کی معزولی کے بعد سے یورپ میں جو سیاسی خلفشار برپا تھا۔ اس سلسلہ میں بہت لوگ جرمنی، اٹلی اور آسٹریا ہنگری کے جدید اتحاد کو امنِ یورپ کی بہترین ضمانت سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دولِ یورپ کے نئے حلقہائے اتحاد میں منقسم ہو جانے سے ان کی قوتیں ایک حد تک متوازن ہو گئی ہیں اور ریاست میں کسی فوری جنگ کے رونما ہونے کا امکان نہیں ہے لیکن مشرقی یورپ کا مطلع اب بھی غبار آلود ہو رہا ہے اور یہاں کچھ خبر نہیں کہ شیرازۂ امن کب منتشر ہو جائے۔ بالفرض اگر بلغاریہ میں (جو اس وقت ترکی کے ماتحت تھا۔ ایڈیٹر) روس کے ساتھ علی الاعلان ہمدردی کے مظاہرے ترک بھی کر دیئے جائیں تو سلافی اتحاد کی ان علمبردار کمیٹیوں کا کیا علاج ہو گا جو ترکی کے خلاف مقدونیہ میں بغاوت کی تیاریاں کر رہی ہیں اور جہاں تک اطلاعات کا تعلق ہے موسم بہار تک بغاوت کے انتظامات مکمل ہو جائیں گے جب تک اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ اس صوبہ میں ترکی فوجوں کی بہ تعداد کثیر موجودگی فتنہ و فساد کا سدِّباب کرے گی۔ اس وقت تک مشرقی یورپ کے امن و امان کو محفوظ سمجھنا قبل از وقت ہے۔ علاوہ بریں امن و امان کی حفاظت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ بلغاریہ میں ایک مستقل حکومت قائم کر دی جائے اور اسے یورپین دولِ عظمیٰ تسلیم کر لیں۔ ("اسٹیٹسمین" ۲۲ اپریل ۱۸۸۷ء)

مرنے کے بعد رُوح سے گفتگو

ریورنڈ جے ایم سیوج نے حال میں جو اپنے روحانی تجربات قلمبند کئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک معزز عورت اپنے بہنوئی کے ساتھ ایک ماہرِ روحانیات کے پاس گئی اور اس سے اپنی چچی کا حال دریافت کیا جو تقریباً تین سو میل کے فاصلہ پر بیمار تھی۔ ماہرِ روحانیات نے تھوڑی دیر غور و فکر کے بعد جواب دیا کہ تمہاری چچی کا حال نہیں معلوم ہوتا۔ وہ معزز خاتون مایوس ہو گئی لیکن تھوڑی دیر بعد روحانی حلقہ ختم ہونے سے پیشتر ماہرِ روحانیات چلّایا "تمہاری چچی مر گئی، اس کی رُوح یہاں موجود ہے۔"

خاتون نے جواب دیا "یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اگر میری چچی کا انتقال ہو جاتا تو میرے پاس تار کے ذریعہ اطلاع ضرور پہنچ جاتی۔" ماہرِ روحانیت نے کہا "تم جو کچھ بھی قیاس آرائی کرو لیکن واقعہ یہ ہے کہ تمہاری چچی مر گئی۔ اس کی رُوح یہاں موجود ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے دو بجے رات کو اپنا قالب چھوڑ دیا۔"

ذرا دیر بعد ماہرِ روحانیات بولا "تمہاری چچی کی روح یہ بھی کہتی ہے کہ تار تمہارے نام بھیج دیا گیا ہے اور تمہیں اپنے گھر واپس جا کر تار ملے گا۔"

اس خاتون کا مکان ماہرِ روحانیت کے مکان سے تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ جب وہ واپس پہنچی تو ملازم نے اُسے ایک تار لا کر دیا جس میں اس کی چچی کے مرنے کی اطلاع تھی۔ ("قوم" دسمبر ۱۸۸۹ء)

"ریاست" دہلی

مطبوعات

شعرائے پنجاب :- از ملک محمد باقر صاحب نسیم رضوانی ایم۔ اے ضخامت تین سو صفحات، کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ قیمت مجلّد دو روپے، ملنے کا پتہ :- گجرات پرنٹنگ پریس گجرات۔

پنجاب کے عصر حاضر کے اُردو شعراء کا مختصر تذکرہ ہے جس میں تقریباً تیس معروف و غیر معروف شعراء کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُن کے کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔ مؤلف اور بعض شاعروں کی عکسی تصاویر بھی شامل ہیں۔ شروع میں "جدید اُردو شاعری کے رُجحانات" پر ایک مقالہ ہے۔ تذکرہ دلچسپ ہے اور انتخابِ کلام عمدہ لیکن شعراء کے حالات فراہم کرنے میں کہیں کہیں تحقیق اور احتیاط سے کام نہیں لیا گیا پنجاب میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب شائع ہوئی ہے اور اس لحاظ سے نسیم صاحب کی کوشش قابلِ قدر ہے۔ دُوسرا حصّہ زیرِ طبع ہے۔ اُمید ہے کہ اس میں وہ خامیاں نہیں ہوں گی جو حصّہ اوّل میں نظر آتی ہیں۔

شاعر کے سو شعر :- حضرتِ آغا شاعر دہلوی کے سو منتخب اشعار کا مجموعہ اُن کے صاحبزادہ مسرور آغا شاعر نے جیبی تقطیع پر نگارستان ایجنسی کشمیری بازار دہلی سے شائع کیا ہے جہاں سے چار آنے کے ٹکٹ بھیجنے پر مل سکتا ہے۔ آغا شاعر اپنی طرز کے کہنہ مشق اُستاد ہیں، چند شعر ملاحظہ ہوں :-

دو اجازت تو کلیجے سے لگا لُوں رُخسار　　　　سینک لوں چوٹ جگر کی انہیں انگاروں سے

پہرہ بٹھا دیا ہے یہ قیدِ حیات نے　　　　سایہ بھی ساتھ ساتھ ہے جاؤں جہاں کہیں

زندگی اور موت میں اِک عمر سے تھی کشمکش　　　　وقت پر دو ہچکیوں نے پاک جھگڑا کر دیا

اسباق العروض :- مولوی رشید احمد صاحب ایم۔ اے کی تصنیف ہے جو لطیف الحسن ناشر کتب چوک مولوی الٰہی بخش گوجرانوالہ نے درسی کتابوں کے سائز کے ۱۲۰ صفحوں پر شائع کی ہے۔ قیمت درج نہیں۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔

مضامینِ فرحت (حصّہ پنجم) :- مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب سشن جج گلبرگہ شریف (دکن) کے مضامین کے چار حصّے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ حال ہی میں انتظامی پریس دو مل گوڑہ حیدر آباد (دکن) نے اُن کے مضامین کا پانچواں حصّہ شائع کیا ہے۔ اس میں گیارہ مضامین ہیں۔ پہلے کا نام "بسم اللہ" اور آخری کا "الحمد للہ" ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت دو روپے۔ مرزا صاحب "مزاحیہ نگاری" میں قابلِ رشک شہرت کے مالک ہیں۔

مکتوبِ تُرکی حصّہ اوّل :- مصنفہ الغازی حاجی محمد زکریا بے آفندی تُرکی، ناشر عبدالمجید قریشی یونین ٹریڈنگ ہاؤس

فلیمنگ روڈ۔ لاہور۔ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۱۲؍۔ اس مختصر کتاب میں مصنف نے جمہوریۂ ترکی، دولتِ عثمانیہ، مقاماتِ مقدسہ عرب اور دیگر اسلامی ممالک کے علاوہ جنگِ عظیم کے حالات دلکش مکالمے کی صورت میں بیان کئے ہیں۔ کتاب مصور ہے۔

سیرِ کشمیر:۔ مولوی عبد المجید صاحب بی اے گورکھپوری نے اس دلچسپ کتاب میں اپنے "سفرِ کشمیر" کے حالات لکھے ہیں۔ تاریخی مقامات سے متعلق معلومات سیرِ کشمیر کے شائقین کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔ "بانگِ درا" کے سائز کے ۱۳۲ صفحات ہیں، کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت غیر مجلد ۱۲؍، مجلد سوا روپیہ، ملنے کا پتہ: قاضی محمد مسعود علی، قاضی پورہ خورد، گورکھپور۔

میر مشاعرہ:۔ ایک مختصر مگر نہایت دلچسپ مزاحیہ ڈراما ہے جو پروفیسر عشرت رحمانی نے ۸ فروری ۱۹۴۳ء کی رات کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر کیا۔ ہمارے رسمی مشاعروں کی خامیوں کو بے باکی کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔ مصنف کے اپنے الفاظ میں یہ کتاب "ادب سدھار کے سلسلے کی ایک کڑی ہے"۔ کتاب خان بہادر نواب احمد یار خاں دولتانہ کے نام سے معنون ہے۔ "بانگِ درا" کے سائز کے ۴۰ صفحات ہیں۔ خاکی کاغذ، قیمت درج نہیں۔ لیکن چار آنے سے کیا کم ہوگی۔ ملنے کا پتہ:۔ جدید بک ڈپو۔ نیرنگستان دریا گنج دہلی۔

لیونارڈ و گرٹروڈ:۔ جرمنی کے شہرۂ آفاق مفکر جوہان ہنرچ پستالوزی کا مشہور تعلیمی اور اصلاحی ناول ہے۔ جسے غلام حسن صاحب بی۔ ایس۔ سی معلم تعلیمیات ٹریننگ اسکول گلبرگہ نے اُردو کا جامہ پہنا کر "اپنے ملک کی خواتین" کے نام معنون کیا ہے۔ یہ کتاب لکھنے سے مصنف کا مقصد اُن سماجی کمزوریوں اور خرابیوں کی اصلاح تھا جو اس وقت جرمنی کی دیہاتی زندگی میں پائی جاتی تھیں۔ ہندوستانیوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی مفید ہوگا کہ ہمارے ہاں بھی اسی طرح کی خرابیاں نظر آتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جرمنی کو فرانس کے پنجہ سے چھڑانے میں اس کتاب کا بہت حصہ ہے۔ ترجمہ شستہ اور سلیس ہے۔ درسی کتب کے سائز کے دو سو صفحات ہیں۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی عمدہ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے، ملنے کا پتہ:۔ حیدرآباد بک ڈپو، حیدرآباد۔

"مجلۂ عثمانیہ" جشنِ سیمیں نمبر:۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے حضور نظام کے "جشنِ سیمیں" کی تقریب پر "مجلۂ عثمانیہ" کا خاص نمبر نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے جو انگریزی کے ۱۰۲ اور اردو کے ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر دو حصوں میں اساتذہ اور طلبہ کے اصلاحی، معاشرتی، سیاسی، علمی اور ادبی مضامین کے علاوہ دلکش نظمیں ہیں۔ شروع میں مشاہیرِ وطن کے پیغامات درج ہیں۔ بہت سی تصویریں بھی شامل ہیں۔ قیمت دو روپے۔

اختر۔ یہ ماہانہ رسالہ ابو العلا صاحب چشتی اور علی محمد صاحب برق کی ادارت میں "ہمایوں" کے سائز پر لاہور سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ مئی کا پرچہ (جو غالباً پہلا نمبر ہے) ہمارے سامنے ہے۔ نظم و نثر کے اچھے اچھے مضامین ہیں۔ قدردانانِ اُردو کو "اختر" کے کارکنوں کی پوری حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ سالانہ چندہ پانچ روپے، فی پرچہ ۸؍۔ ملنے کا پتہ: مسلم آباد، چاہ میراں روڈ۔ لاہور۔

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ جولائی ۱۹۳۷ء

تصویر:- جمائی

چندہ سالانہ ۶ر ششماھی ۳ر (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۱۰ر

بزمِ ہمایوں

بعض قارئین کے خط سامنے پڑے ہیں، بعض عزیزوں دوستوں کی باتیں یاد آ رہی ہیں اور بعض لوگوں کی سنی سنائی نکتہ چینیاں اور تعریفیں مثلاً

اُردو کے تحفظ اور اشاعت کی طرف جو توجہ آپ نے کی ہے وہ لائقِ صد تحسین ہے۔

انجمنِ اُردو پنجاب کا کام جو آپ کر رہے ہیں وہ نری مضمون نگاری سے بہت زیادہ مفید ہے۔

کئی ماہ سے اُردو اُردو اور انجمن انجمن کی جو رٹ آپ لگا رہے ہیں اُس سے ہم تنگ آ گئے ہیں۔

مہینوں سے آنکھیں آپ کے مضمون کو ترس گئی ہیں، اُردو، کانگرس، گاندھی، انجمنِ اُردو تنظیم، تخریب بھلا اس سے آپ کے قارئین کو واسطہ ؛

خدا کا شکر ہے کہ کچھ عرصے سے آپ راہ پر آئے ہیں، اور بجائے بھاری بھرکم بتھر یلے مضامین کے، افسانے، ہلکے پھلکے فطری خیالات اور ایسی ہی اَور کام کی چیزیں اہلِ ہمایوں کے لئے مہیا ہو گئی ہیں۔

آپ غضب کر رہے ہیں کہ اب ہمایوں میں بجائے ٹھوس مضامین کے زیادہ تر تفریحی مضمون نظر آنے لگے ہیں، تنقیدی، تاریخی، علمی مضمون اب کم ہیں۔ ہمایوں کو بجائے تفریح کے غور و فکر کا آلہ بننا چاہیئے۔

دن بھر کے کاموں اور فکر و تشویش کے بعد علمی و اصطلاحی مضامین کا مطالعہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے (معلوم نہیں ان حضرت نے جون کے "جمع البدائع" پر کتنی کچھ ناک بھوں چڑھائی ہو گی !)

غرض ایسی باتیں ہیں جو ہمیں سننی پڑتی ہیں اور سننی بھی پڑتی ہیں خندہ پیشانی سے۔ اور یہ نہیں کہ انہیں ہم اِس کان سُنتے ہیں اور اُس کان نکال دیتے ہیں اور نہ یہ ہے کہ یہ باتیں اکثر فضول ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اِن میں سے اکثر درست ہیں اور مفید اور ان سب پر کما حقہٗ عمل کرنے کا نتیجہ ہے ہمایوں جیسا کہ وہ ہے !

ہمایوں گوناگوں خیالات کا مجموعہ ہے، ہمارا مدعا ہے کہ اسے انسانی نفس کی مختلف کیفیتوں کا آئینہ دار بنائیں۔ اسے قوم و ملک کی مختلف ضرورتوں کا کفیل بنا سکیں۔ زندگی نام ہے مختلف باتوں کا، ایک نظاہرِ اختلاف کا ؎

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن ائے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

ہر زندہ شے تغیر پزیر ہے: "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں"۔ کبھی یہ خیال تھا کہ ہم جو کچھ ہیں سو ہیں لیکن گو اب بھی ہم انقلابی نہیں ہو گئے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو ہمیں لازم ہے کہ کچھ نہ کچھ حرکت کریں اور آج کچھ مختلف ہو جائیں اُس سے جو کل تھے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ قارئین کا حق ہے کہ وہ اپنے اپنے مزاج کے مطابق مفید یا دلچسپ مضمون پڑھیں لیکن آج کل کی زندگی میں فائدے کے معنی بہت وسیع ہو گئے ہیں اور دلچسپی بھی اپنے کونے میں بیٹھ کر حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ مضمون جو آپ پڑھتے ہیں نثر کے نظم کے، اُردو میں ہیں، انگریزی یا بنگالی یا ہندی میں نہیں، پھر غور فرمایئے کہ اگر اُردو زبان ہی خطرے میں ہو یا کم از کم اُس کی ضروریات ایسی ہوں جو زبانِ حال سے آپ کی فوری مدد اور ہمدردی کو پکار رہی ہوں تو کیا آپ اُس کی طرف سے کان بند کر کے اپنا پسندیدہ مضمون پڑھنے میں مصروف رہیں گے؛ گھر کو آگ لگے اور آپ بیٹھے اپنے کمرے میں پروازِ تخیّل کے مزے لیا کریں؛ یہ کیونکر ہو سکتا ہے اور ہو گا تو کب تک؛ اس لئے آپ میں سے ہر ایک کو اُردو کی بہبود اور ترقی میں کچھ نہ کچھ عملاً حصّہ لینا چاہئے۔

پھر دیکھئے کہ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے؛ اشتراکیت اور سرمایہ داری کیونکر ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ رہی ہیں، کہاں تک وہ راستی پر ہیں کہاں تک حد سے بڑھ گئی ہیں؛ آپ کی حالت کیا ہے؛ اگر آپ ان میں سے ایک کے یا دوسری کے علم بردار نہیں تو کہاں تک آپ کا فرض ہے کہ اعتدال کی راہ اختیار کریں، کچھ اس سے سیکھیں کچھ اُس سے۔ ہر زندہ علم و ادب کو موجودہ تحریکات سے متاثر ہونا چاہئے، محض گئی گزری باتوں کا تذکرہ یا مُردہ میلانات کا اظہار نہ صرف بے سُود ہے بلکہ زبان و ادب کے لئے اور روزمرہ کی زندگی کے لئے ضرر رساں بھی ہے۔

لیکن دُنیا کو دیکھنے میں اپنے ملک کو پہلے دیکھنا ہے۔ یہاں کیا ہو رہا ہے؛ کیا ہونے والا ہے؛ کس طرح غیر متمکن ہیں؛ کس طرح اپنے اپنوں سے لڑ رہے ہیں؛ ان مشکلات کا حل کیا ہے؛ وہ بھی ادب نہیں جو ان حقیقتوں سے یکسر مُنہ پھیر لے۔ غریبوں کی کیا حالت ہے؛ کسان کس مصیبت میں ہیں؛ توہمات نے کیسے زندگی کا گلا دبا رکھا ہے؛ اگر ادیب اور شاعر ان چیزوں کو غیر ادبی سمجھ کر اپنی دُھن میں لگے رہیں گے تو اُن کا ادب اور اُن کی شاعری بوسیدہ ہو کر رہ جائے گی۔

یہ نہیں کہ سیاسیات و معاشیات کے سوا ادب کا کوئی اور موضوع نہیں ہونا چاہئے۔ ادب کا موضوع تو زندگی ہے اور جو جو باتیں زندگی میں رونما ہوں ادب کو اُن سب کا ترجمان بننا ہے۔ سیاسیات معاشیات جمالیات تخیلات ادب کا سب سے واسطہ ہے انفرادی و اجتماعی آزادی، ہندوستان کے جھگڑے، جماعتوں کی کشمکش، گزری ہوئی تہذیبوں کی داستان، آنے والی تبدیلیوں کا اندازہ، فطرتِ انسانی کا نقشہ، قدرت کے نظارے، خوبصورتی اور بدصورتی، نیکی اور بدی اور ان کی بدلی ہوئی شکلیں یا اور بیسیوں اَور چیزیں ادب کو، اُردو کو، ہمایوں کو، ہمایوں کے لکھنے والوں کو، ہمایوں کے پڑھنے والوں کو، ان سب میں دلچسپی لینی ہے اور عملی طور پر دلچسپی لینی ہے۔ اِس کے لئے ضروری ہے کہ ہمایوں طرح طرح کے دلچسپ اور خشک مضامین کا مجموعہ بنا رہے۔ یہ تسلی رکھئے کہ ہم اُسے مفید اور دلچسپ ہی بنانے کی کوشش کریں گے مگر یاد رہے کہ اس میں آپ کی مدد کی بھی ضرورت ہے!

بشیر احمد

جہاں نما

ہندوستان میں تعلیم عامہ کا مسئلہ

امریکا کی ایک تعلیمی انجمن کے ایک فاضل رکن ڈاکٹر فرینک ۔ سی ۔ لباک نے ہندوستان کی جہالت کا ذکر کرتے ہوئے کہا، کہ یہاں کے لوگوں کی تعلیم سے محرومی کا سبب یہ نہیں کہ ہندوستانی من حیث القوم کودن ہیں ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ ہند دنیا کی ہر دوسری قوم کے برابر ذہین ہیں ۔ ہندوستانیوں کی اکثریت ان پڑھ کیوں ہے ؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے چھ وجوہ پیش کئے جن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

(۱) جب کوئی ان پڑھ شخص پڑھنا لکھنا سیکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے ایک ایسی زبان سے سابقہ پڑتا ہے جو اس کی عام بول چال کی زبان نہیں ہوتی ۔ ہندوستان کی کتابی زبانیں بول چال کی عام زبانوں سے بالکل مختلف ہیں ۔

(۲) ہندوستانی زبانوں کے حروفِ ہجا بہت عیب دار ہیں ۔ اگر حروفِ تہجی اصوات کے تابع ہوں تو کسی شخص کے لئے اپنی زبان کا دو ہفتوں میں سیکھ جانا دشوار نہیں ۔

(۳) تیسری مشکل یہ ہے کہ جب والدین ان پڑھ ہوں تو بچے بھی پڑھا لکھا سب کچھ جلد بھول جاتے ہیں ۔ اگر بزرگ پڑھے لکھے ہوں تو بچوں کے لئے پڑھنا لکھنا آسان ہو جاتا ہے ۔

(۴) ایک اور اہم مشکل یہ ہے کہ کتابوں اور اخبارات کی زبان عوام کی بولی سے مختلف ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حرف شناسی میں شد بد ہو جانے کے بعد بھی عوام کو پڑھنے کے لئے کوئی چیز نہیں ملتی ۔

(۵) پانچویں وجہ یہ ہے کہ ان پڑھ لوگ پڑھنے لکھنے کے یوں بھی مخالف ہیں ۔ ان کے دل میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کی ضرورت ہے ۔

(۶) چھٹا سبب یہ ہے کہ بڑی عمر کے ان پڑھ طبقے کی تعلیم کے لئے مناسب کتابیں موجود نہیں ہیں ۔ ایک جوان آدمی بچوں کے نصاب کی کتابوں کو دلچسپی سے نہیں پڑھ سکتا ۔ جوانوں کے لئے الگ نصاب تیار ہونا چاہیئے ۔ صحیح نصاب اور رضا کار مدرسوں کی مدد سے ہندوستان ۲۵ سال میں پڑھا لکھا بن سکتا ہے ۔ روس نے یہ کام ۱۵ ہی سال میں ختم کر لیا ہے ۔

ڈاکٹر لباک کی تمام تصریحات میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے لیکن تعجب ہے کہ انہوں نے اس سب سے بڑی صداقت
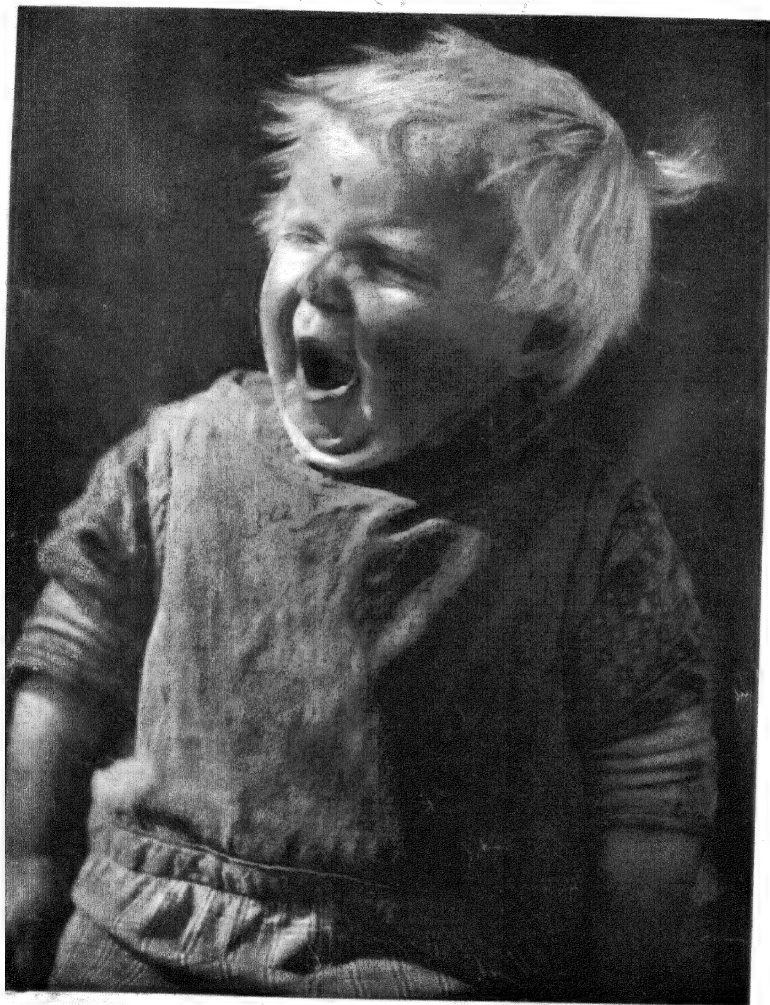
جمائی

یعنی ہندوستان میں تعلیم سے حکومت کی بے پروائی کا ذکر نہیں کیا جن مشکلات کا ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا ہے خطہ بہ خطہ اور صوبہ بہ صوبہ اُن کی نوعیت مختلف ہے ۔ ہندوستان میں کتابی اور بول چال کی زبان کے اختلاف پر بہت مبالغہ سے زور دیا گیا ہے حالانکہ انگلستان کے نصاب تعلیم میں انگریزی بچوں کے لئے جو کتابیں رکھی گئی ہیں ان کی زبان بھی عام انگریزی بول چال کی زبان سے مختلف ہے ۔ یہی حال کتابوں اور رسالوں کی زبان کا ہے ۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود انگلستان میں تعلیم کو ہمہ گیر حیثیت حاصل ہے ۔

باقی رہا حروفِ تہجی کا مسئلہ، سو چینی حروفِ تہجی ہندوستان کے تمام حروفِ تہجی سے زیادہ عیب دار ہیں لیکن جاپان جو چینی ابجد استعمال کرتا ہے اس کا فرد فرد تعلیم یافتہ ہے ۔

جاپان کی چھوٹی چھوٹی صنعتیں

جاپان میں چھوٹے پیمانے پر کئی صنعتی کارخانے چل رہے ہیں ۔ یہ کارخانے یورپی کارخانوں سے بہت مختلف ہیں یعنی بڑی صنعتیں کئی چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں منقسم ہو گئی ہیں ۔ اگرچہ ان کی حیثیت معمولی ہے لیکن اپنی جگہ ان میں سے ہر ایک مختلف ارتقائی منازل طے کئے ہوئے ہے ۔ بلاشبہ یہ صنعتیں ہندوستان کے لئے عبرت آموز ہیں ۔

چھوٹے پیمانے پر جو صنعتیں جاری ہیں ان میں سوتی اور اُونی مال تیار کرنے والے کارخانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ بجلی کے لیمپ بائیسکلیں صیقل کردہ آہنی اشیا، جلدسازی اور سمینٹ بنانے کی صنعتیں بھی اسی زمرے میں شمار ہوتی ہیں چھپائی کا کام بھی زوروں پر ہے، اور نواور جاپان کے ہوٹل بھی وہاں کے کاروبار میں ایک نمایاں حیثیت سے شمار ہونے لگے ہیں اس سلسلے میں ابھی تک صرف ۱۹۳۰ء تک کے اعداد و شمار دستیاب ہو سکے ہیں جن کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ چھوٹے پیمانے کے صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی ستر فیصدی تعداد ایسے کارخانوں میں کام کرتی ہے، جن میں پچاس سے زیادہ آدمی نہیں ہوتے ۔ ساٹھ فی صدی مزدور ایسے کارخانوں میں کام کرتے ہیں جن میں صرف دس مزدور کام کرتے ہیں ۔ اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی نصف تعداد ایسی دُکانوں میں کام کر رہی ہے جن میں صرف پانچ پانچ آدمی ہوتے ہیں ۔

زمانۂ قدیم سے جاپانی کسان اپنی محدود آمدنی میں چند دیگر ذرائع سے اضافہ کرتے چلے آئے ہیں ۔ مثلاً یہ لوگ کوئلے تیار کرتے ہیں اور ریشم کے کیڑے پالتے ہیں اس طرح انہیں کچھ زاید آمدنی ہو جاتی ۔ کتان کی صنعت نے ریشم کی صنعت پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے، لیکن اُمید ہے کہ اس کی وجہ سے تجارتی فضا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے دوسری نئی صنعتوں سے

جو روز بروز ملک کے زراعتی حصّوں میں رواج پا رہی ہیں پُر ہو جائے گا۔ مُلک کے ان حصّوں کے بعض باشندے اپنے گھروں میں رہنے کے عادی ہیں لیکن انہیں کام کرنے کے لئے اپنے کارخانوں تک سفر ضرور کرنا پڑتا ہے۔ جب انہیں فصل کاٹنے سے فراغت ہو جاتی ہے تو وہ چند ماہ کے لئے کسی بڑے شہر میں چلے جاتے ہیں یا کسی چھوٹے سے کارخانے میں ملازم ہو جاتے ہیں۔ گویا اگر یہ لوگ سفر بھی کرتے ہیں تو اس کے لئے بھی سال کا ایک مخصوص حصّہ مقرر ہوتا ہے۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ بعض جاپانی کسان اپنے مکان ہی میں ایک چھوٹی سی دُکان بھی کھول لیتے ہیں۔ یہ بجائے خود صنعتی سامان کا ایک چھوٹا سا کارخانہ ہوتا ہے۔

جرمن نوجوانوں کی تربیت

ایک جرمن صحیفے میں ولیم اٹربین کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے آج کل کے جرمن نوجوانوں کی نئی تحریکات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ تحریکات نہ تو نوجوانوں کو مذہب سے روگردانی سکھاتی ہیں اور نہ مادر پدر آزادی۔

ان تحریکات میں حصّہ لینے والے نوجوان خاص طور پر تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ ایک جرمن نوجوان اپنی تعلیم و تربیت کے پہلے چار سال جرمن ینگسٹرز آرگنائزیشن (ادارۂ تنظیم نوجوانانِ جرمنی) میں گزارتا ہے۔ اس کے بعد مزید چار سال اسے ایک اَور تربیت گاہ میں جس کا نام "ہٹلر یوتھ" ہے گزارنے پڑتے ہیں۔ اس تعلیم و تربیت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جرمن لڑکوں لڑکیوں کے کردار میں پختگی آجائے اور ان کے فکر و عمل میں ہر وقت اشتراکیت کی روح کارفرما رہے۔ بچوں کے دلوں سے یہ احساس محو ہو جائے کہ ہم بڑوں کی اولاد ہیں یا چھوٹوں کی۔ امیر والدین کے بچے جب غریب والدین کے بچوں سے مل کر کام کرتے ہیں تو اوّل الذکر کو عمر بھر کے لئے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ مؤخر الذکر کے لئے محض کپڑے حاصل کرنا کتنا ناممکن سا ہوتا ہے اور اسے اس مقصد کے لئے مہینوں پائی پائی جمع کرنی پڑتی ہے۔

عام طور پر بچوں کی تربیت کا پہلا سال جرمنی کے قائدِ اعظم اڈولف ہٹلر کی زندگی کے حالات پڑھنے میں بسر ہوتا ہے جس سے انہیں قومی اشتراکیت کا صحیح ذوق ہو جاتا ہے۔ دوسرے سال لڑکیاں اور لڑکے مختلف تاریخی مقامات کا دورہ کر کے مادرِ وطن کی دلکشی اور عظمت کا اندازہ کرتے ہیں۔ تیسرے سال انہیں ان جرمنوں سے جو غیر ممالک میں ہوں رشتۂ اتحاد قائم کرنے کی ضرورت کا احساس دلایا جاتا ہے۔ اس طرح ان کے دل میں جرمنی کی محبت پیدا کی جاتی ہے اور اس کی عظمت و شوکت کا احساس بیدار کیا جاتا ہے۔ چوتھے سال انہیں نازی تحریک کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن نوجوانوں کی دماغی تربیت

کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ قواعد، تیراکی اور شکار وغیرہ جسمانی تربیت کے پسندیدہ طریقے سمجھے جاتے ہیں۔

"صنعت و حرفت کی طرف توجہ کرو یا تباہ ہو جاؤ"

سر ایم وسویس ورایا نے بنارس کی ہندو یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کی تقریب پر خطبہ صدارت پڑھا جس میں انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ملک کا ہولناک افلاس اور بے روزگاری اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم اس مسئلہ پر سب سے زیادہ توجہ صرف کریں۔ ہماری ہر اصلاحی کوشش کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم غریبوں کی زندگی کا معیار بلند کریں اور اس کو مزید پستی میں گرنے سے بچالیں۔ معمولی زندگی بسر کرنے کے لئے چھ چیزوں کی ضرورت ہے، خوراک، لباس، مکان، تعلیم، مختلف تقریبات کے مصارف کے لئے روپیہ اور تفریحی خرچ۔ ہمارے ملکی بھائی بری اور ناکافی خوراک کھا کھا کر پلے ہیں۔ اوسطاً ہر شخص دو روپے سے لے کر تین روپے ماہوار آمدنی میں گزارا کر رہا ہے۔ ہمارے ملک کے کسانوں اور مزدوروں کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے اور اس وقت وہ انتہائی خطرے سے دوچار ہو رہے ہیں۔

برطانی ہند میں مزروعہ علاقہ ایک ایکڑ فی آدمی سے زیادہ نہیں۔ آج کل ایک ایکڑ سے پندرہ روپے سے لے کر پچیس روپے تک سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ اور کسانوں کے لئے زمین سے اس سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اس لئے افلاس کا سب سے بہتر علاج صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی ہے۔ ہر سچے ہندوستانی کو اس مسئلہ کی طرف پوری توجہ کرنی چاہیئے۔ پراپیگنڈے کا کام یونیورسٹیوں کو اپنے ذمے لینا چاہیئے تاکہ ناواقف لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور انہیں اپنا نقطہ نظر تبدیل کرنے کا احساس ہو۔

جب تک تجارت کی ترقی نہ ہو گی ہمارا معیارِ زندگی بلند نہ ہو سکے گا۔ کسی شہر، قصبے یا گاؤں کا معیارِ زندگی اس مقام کے باشندوں کے کاروبار پر ہے۔ اگر وہ زیادہ مال تیار کریں گے تو زیادہ خرید بھی سکیں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ معیارِ زندگی خود بخود بلند ہو جائے گا۔

اگر موجودہ حالت دیر تک قائم رہی تو ملک کی قسمت میں تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جان ڈی راکفیلر کا انتقال

مسٹر جان ڈی راکفیلر جو ایک بہت بڑے مخیر اور دنیا کے دو چار متمول ترین انسانوں میں سے تھے، ۲۳ مئی ۱۹۳۷ء کو ۹۷ سال کی عمر پا کر فلوریڈا (امریکا) میں انتقال فرما گئے۔ اپنی بے انتہا دولت و ثروت کے باوجود وہ نہایت سادہ اور پاکیزہ

زندگی بسر کرتے تھے؛ عمر بھر اُنہوں نے اپنی دولت خیراتی کاموں کے لئے وقف رکھی۔ اُن کے عطیوں کی مجموعی رقم پچاس کروڑ ڈالر یعنی ڈیڑھ ارب روپے تک پہنچتی ہے۔

لارڈ بیڈن پاول، اہلِ ہند اور ہندوستانی زبان

سکاؤٹوں کی تحریک کے بانی اور چیف سکاؤٹ لارڈ بیڈن پاول گزشتہ موسم سرما میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ حال ہی میں اُنہوں نے لنڈن کے اخبار نویسوں کی ایک مجلس میں ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اہلِ ہند کی ترقی کے راستے میں جو باتیں حائل ہیں اُن میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ ہندوستانی اعلیٰ اخلاق سے محروم ہیں۔ حالت یہ ہے کہ لفظ (Honour) کا مفہوم ادا کرنے کے لئے ہندوستانی زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں ؛

لارڈ بیڈن پاول کو اگر ہندوستانی زبان کا ماہر ہونے کا دعویٰ ہے تو اُن کا مندرجہ بالا قول خود اُن کے دعوے کے بادر ہوا ہونے کی دلیل ہے۔ باقی رہا اعلیٰ اخلاق سے ہندوستانیوں کی محرومی کے متعلق لاٹ صاحب کا قول تو اگرچہ اُس کا صاف صریح مطلب یہی ہے کہ اُن کی رائے میں اگر تمام ہندوستانی نہیں تو کم از کم اُن کی اکثریت یا ایک بہت بڑی تعداد اعلیٰ اخلاق سے ضرور محروم ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسٹر آرنڈیل نے کیبل کے ذریعے سے لارڈ بیڈن پاول کا صحیح صحیح بیان طلب کیا۔ لارڈ بیڈن پاول نے جوابی کیبل کے ذریعے سے اطلاع دی کہ "میں نے کبھی تمام ہندوستانیوں کو اعلےٰ اخلاق سے محروم نہیں کہا"۔ اس بیان سے لارڈ بیڈن پاول کا بالکل صحیح مفہوم واضح ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ملک میں کچھ لوگ اعلےٰ اخلاق سے محروم ہوتے ہیں لیکن اس بنا پر کوئی ہوشمند آدمی یہ نہیں کہے گا کہ تمام ملک اعلےٰ اخلاق سے محروم ہیں۔ جب کسی قوم کی سیرت کا اہم ترین پہلو زیر بحث ہو تو اس وقت البتہ کسی شخص کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس ملک کا ذکر اس طرح کرے جس طرح لارڈ بیڈن پاول نے ہندوستان کا ذکر کیا ہے۔

لارڈ بیڈن پاول کا یہ قول ہندوستانی غیرت کا امتحان ہے۔ اگر وہ اس توہین آمیز بیان کے لئے غیر مشروط طور پر معافی نہ مانگ لیں تو تمام ہندوستانی لڑکوں کو لارڈ بیڈن پاول کی بوائے سکاؤٹ مجالس سے اپنا تعلق منقطع کر لینا چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو ثابت ہو جائے گا کہ کم از کم وہ ضرور اعلےٰ اخلاق سے محروم ہیں۔

درصل بوائے سکاؤٹوں کی تحریک بھی شہنشاہیت پسندوں کی ایک تحریک ہے اور ہندوستانی لڑکوں اور نوجوانوں کو اس سے الگ رہنا چاہیے۔

حامد علی خاں

نفسیاتِ اجتماعی

"لیڈرشپ" یا "قیادت"

اس سلسلے کی پہلی تقریر جس میں بتایا گیا تھا کہ "جماعت کا اثر فرد پر کیا ہوتا ہے" جون کے "ہمایوں" میں شائع ہو چکی ہے دُوسری تقریر جس کا موضوع یہ تھا کہ "ایک جماعت کا دوسری جماعت پر کیا اثر ہوتا ہے" ۱۱ مئی کو لاہور سے براڈکاسٹ ہوئی اور ۱۰ مئی کے "انقلاب" میں چھپی۔ ذیل کی تقریر جو پروفیسر محمد اسلم صاحب نے "انجمنِ اُردو پنجاب" کی طرف سے ۱۸ مئی کی شام کو نشر کی، سلسلۂ "نفسیاتِ اجتماعی" کی تیسری اور آخری تقریر ہے جس میں لیڈروں کی اقسام اور اُن کے خواص پر بحث کی گئی ہے۔

(حفیظ ہوشیارپوری ایم۔اے۔ اسسٹنٹ سکرٹری "انجمنِ اُردو پنجاب")

"نفسیاتِ اجتماعی" کے باقی مسائل کی طرح لیڈروں اور "لیڈری" کے نفسیاتی اور ذہنی حالات معلوم کرنے اور بیان کرنے سے بہت سے علمی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اس کا مطالعہ ہمیں تاریخ پڑھتے وقت مشاہیر کا مقام جانچنے اور اُن کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔

لیڈری کا نفسیاتی مفہوم

ہر زمانے میں خواہ وہ امن کا زمانہ ہو یا جنگ کا انسانی جماعتوں کی زندگی چند نامور افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو دوسروں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ ان جماعتوں سے خود بھی تھوڑا بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر اُن کو متاثر کرتے ہیں۔ آج بھی دنیا کی سیاسی زندگی میں چند فائق اور ممتاز ہستیاں نظر آتی ہیں، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ لیڈری کے مفہوم میں صرف سیاسی لیڈر مثلاً ہٹلر اور مسولینی یا ہندوستان میں پنڈت جواہرلال نہرو اور مسٹر جناح شامل ہیں، بلکہ اس کے نفسیاتی مفہوم میں وہ ہر قسم کے لیڈر داخل ہیں جو چھوٹے یا بڑے پیمانہ پر امن کے زمانے میں یا جنگ کی حالت میں سیاسی، تمدنی یا تعلیمی امور میں بنی نوع انسان کے کسی نہ کسی حصّہ کی رہنمائی کرتے ہیں۔ لیڈری کے اس وسیع مفہوم کے پیشِ نظر بہت سے ان لوگوں کو لیڈر سمجھنا چاہئے جن کو عرفِ عام میں لیڈر نہیں کہا جاتا مثلاً کارخانے کا مینیجر، مزدوروں کا فورمین، سکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور سب ماسٹر، دفتروں کے سپرنٹنڈنٹ اور افسر، انجمنوں اور جلسوں کے صدر، محلّوں کے ذی اثر اصحاب۔ اسی طرح ہر گھر میں میاں اور ہر خاندان میں بزرگ ترین شخص لیڈر ہے، بچوں میں بھی بعض قدرتی طور پر لیڈری کا مقام حاصل کر لیتے ہیں، جیسے سکولوں میں ہر جماعت کا ایک

کپتان یا مانیٹر ہوتا ہے۔ اگر ہم لیڈری کی نفسیاتی حقیقت پر کسی قدر حاوی ہوجائیں تو زندگی کے ان بہت سے شعبوں پر بھی گہری نظر ڈال سکتے ہیں، اور اس نظر سے ہم نہ صرف اجتماعی زندگی کے سمجھنے کے لئے بلکہ اس کو سنوارنے کے لئے بھی مدد لے سکتے ہیں۔

لیڈروں کی تین قسمیں

اب سوال یہ ہے کہ لیڈری کے اس وسیع مفہوم کے لحاظ سے دُنیا میں کس کس قسم کے لیڈر پائے جاتے ہیں: لیڈر تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک بڑی قسم تو اُن لیڈروں کی ہے جن کو لیڈری کا مقام کسی شخصی جوہر کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ سوسائٹی یا کسی جماعت یا کسی فرد کی طرف سے کسی عہدہ پر فائز کئے جانے کے سبب سے وہ لیڈر بن جاتے ہیں۔ ایسے لیڈر کو لیڈری کے مقام پر قائم رکھنے والی چیز اس کا ذاتی یا شخصی اثر نہیں بلکہ وہ دستور یا روایت یا قانون ہے جس کی رو سے اس کو فوقیت کا مقام حاصل ہوجاتا ہے اور جو اس کے اس مرتبہ کی حفاظت کرتا ہے۔ جب کسی سوسائٹی میں ابتری پھیل جائے اور کوئی قانون یا دستور اس کا محافظ نہ رہے تو وہ لوگ جو قدرتی طور پر لیڈری کا جوہر رکھتے ہیں آگے بڑھ کر اپنی توفیق، استعداد اور نیت کے مطابق رہنمائی کا کام کرنے لگتے ہیں۔ امن کے زمانہ میں جب کوئی نہ کوئی دستور یا قانون موجود ہو کئی قسم کے چھوٹے بڑے عہدے دار ہوتے ہیں جو اپنے اپنے حلقوں میں لیڈروں کا کام کررہے ہوتے ہیں۔ ایسے لیڈروں کو روایتی یا دستوری لیڈر کہہ سکتے ہیں، اس کے علاوہ دو قسم کے اور لیڈر ہوتے ہیں جو شخصی طور پر لیڈری کے جوہر کے مالک ہوتے ہیں، ایسے شخصی لیڈروں میں سے ایک تو وہ ہیں جو اپنی اپنی جماعت پر غالب ہوتے ہیں اور عام طور پر اپنی باتیں اُن جماعتوں سے منواتے ہیں اور اپنے اشاروں پر اُن کو چلاتے ہیں، ایسے شخصی لیڈروں کو غالب لیڈر کہہ سکتے ہیں، دوسری قسم کے شخصی لیڈر وہ ہیں جو کسی جماعت پر غلبہ یا فوقیت کا مقام تو نہیں رکھتے لیکن جمہور کے احساسات پر نظر رکھنے کی وجہ سے اور اپنی قوتِ اظہار کی وجہ سے اپنے لئے لیڈری کا مقام حاصل کرلیتے ہیں۔ پبلک جلسوں میں، کانفرنسوں میں ایسے لوگ اپنے لئے نام پیدا کرلیتے ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے اُلجھنوں میں پڑ کر مختلف سوالوں کو آپس میں خلط ملط کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ایسے موقع پر سب لوگ چاہتے ہیں کہ کوئی اُٹھے اور ڈھنگ کی بات کہے، چنانچہ وہ لوگ جن میں عین اسی بات کی قابلیت ہوتی ہے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اکثریت کی رائے کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر اُس کے لیڈر بن جاتے ہیں۔ ایسے لیڈروں کو گفتاری یا لسّان لیڈر کہہ سکتے ہیں، اب میں دستوری لیڈر، غالب لیڈر اور لسّان لیڈر کے متعلق الگ الگ کچھ کہتا ہوں:۔

۱۔ دستوری لیڈر

دستوری لیڈر کا وجود اُس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کوئی جماعت ابتدائی تمدنی مراحل طے کرکے اپنے معاملات ایک

حد تک کسی قانون یا دستور یا بعض رسوم یا روایات کے ماتحت لے آتی ہے، جب تک ایسا نہ ہو دستوری لیڈر معرضِ وجود میں نہیں آسکتا۔ جب تک سوسائٹی اپنے معاملات کسی ابتدائی دستور کے ماتحت طے کرنا نہیں سیکھتی، اس کے لیڈر وہی ہوتے ہیں جو حرص و آز میں یا ادنےٰ شہوات میں باقی افرادِ جماعت سے بڑھ کر ہوتے ہیں، لیکن تمدن اور دستور کے ظہور میں آتے ہی دستوری لیڈر کا وجود بھی ظاہر ہو جاتا ہے، جیسا کہ میں نے کہا ہے، دستوری لیڈر یہ مقام شخصی جوہر کی وجہ سے نہیں پاتا اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ اُس میں شخصی جوہر بھی ہو۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ چونکہ دستوری لیڈر کی طاقت اثر اور رسوخ کسی خاص آئین یا قانون کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے اپنا مقام برقرار رکھنے اور اپنی طاقت بڑھانے کے لئے دستور کی طاقت کو بڑھانا اور دستور کے لئے عوام کے دلوں میں عزت اور احترام کے جذبات پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ آج کل عموماً حکومتیں قانون کے ماتحت چلتی ہیں اور جو لوگ حکومت کے کاموں پر فائز ہوتے ہیں وہ اپنا اپنا مقام قانون کے زور سے اور قانون کے ماتحت حاصل کرتے ہیں ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت کے نفاذ سے پہلے لیڈری کا کام زیادہ تر حکام کیا کرتے تھے۔ عوام میں سے وہ لوگ لیڈر کہلاتے تھے جو اپنی اپنی جماعتوں میں شخصی اقتدار کی وجہ سے یا مذہبی روایات کی بنا پر "پیری مریدی" کے رنگ میں کچھ اثر و رسوخ رکھتے تھے ہندوستان میں دستوری لیڈروں کا مخصوص و نمایاں وجود اب ظاہر ہوا ہے جب کہ حکومت خود اختیاری کے سلسلہ میں ایک مقررہ دستور کے مطابق بعض افراد کو حکومت کرنے کا حق دیا گیا۔ دستوری لیڈروں کی طاقت چونکہ دستور کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنی طاقت کے قیام کے لئے اور اس کے بڑھانے کے لئے دستور کی طرف رجوع کرتے رہیں اور عوام کی عقیدت، دستور سے بڑھاتے رہیں اور اُن حالات و واقعات کا اعادہ کرتے رہیں، جن میں سے نکل کر اور جن کی اصلاح کے لئے اس جماعت کا دستور معرضِ وجود میں آیا تھا، اسی غرض کے ماتحت دستوری حکومتیں اور دستوری ادارے، انجمنیں اور درسگاہیں اپنے لیڈروں کا احترام بعض رسمی طریقوں سے کرتی رہتی ہیں، زمانہ حال کی یونیورسٹیوں کے تقسیمِ اسناد کے جلسوں کا حال آپ کو معلوم ہے، کس قدر رسوم ہوتی ہیں۔ آج کل کی دستوری حکومتوں کے افتتاح کے وقت جو پیچیدہ رسمیں ادا کی جاتی ہیں، اور کمیٹیوں، انجمنوں، درسگاہوں کے جلسوں میں جو تکلف آمیز آداب بجا لائے جاتے ہیں اُن سب میں یہ بات پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اداروں کے عہدہ داروں کے حقوق اور طاقتیں اس دستور کی طرف سے ہوتی ہیں جس سے وہ معرضِ وجود میں آتے ہیں اور ان کے مقام کو معزز بنانے کے لئے کئی قسم کی رسوم کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ دستوری لیڈروں کو اپنا وقار قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں سے تکلف آمیز تعلقات رکھیں، تعلیمی اداروں خصوصاً کالجوں کے اساتذہ کے متعلق عموماً کہا جاتا ہے کہ ان میں اور طلبہ میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہونا چاہئے، اور اساتذہ کو طلبہ سے بہت میل جول رکھنا چاہئے۔ میرے نزدیک چونکہ اُستاد کی حیثیت کی بنیاد عموماً سکول یا کالج کے دستور اور اس کی روایات پر ہوتی ہے، اور شخصی اقتدا

بہت کم اُستادوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے عام حالات میں یہی بہتر ہے کہ اُستادوں اور طالب علموں کے تعلقات تکلف آمیز ہوں۔ اُستاد کا رعب اور اثر جو طلبہ کے ضبط اور تربیت کے لئے ضروری ہے اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے، اسی طرح اگر دوسرے دستوری لیڈر بھی اپنے دستوری فرائض سرانجام دیتے ہوئے عام لوگوں سے تکلف آمیز طریق سے پیش آئیں تو یہ نہ صرف تقاضائے فطرت کے عین مطابق ہے بلکہ دستور کی طاقت کو قائم رکھنے کے لئے بھی ازبس ضروری ہے۔

۲۔ غالب لیڈر

دستور اور حالات کے مطابق آئے دن نئے نئے دستوری لیڈر پیدا ہوتے رہتے ہیں اور تربیت گاہوں میں تربیت سے بھی ایسے لوگ پیدا کئے جاسکتے ہیں جو دستوری عہدوں کو کامیابی سے چلاسکیں لیکن غالب لیڈر جو اپنے شخصی جوہر کی وجہ سے غالب ہوتے ہیں روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ غالب لیڈر کا جوہر قدرتی ہے اور اس کی شخصی ملکیت ہے، وہ قدرتی طور پر دوسروں پر اثر ڈالنے کی قوت رکھتا ہے، اس کے فیصلوں میں ایسی سُرعت ہوتی ہے کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ اس کے سامنے مشکل سے مشکل معاملات لائے جاتے ہیں اور وہ فوراً ان کے متعلق اپنے احکام صادر کردیتا ہے، ممکن ہے کہ ان احکام میں غلطی بھی ہو جائے لیکن یہ جس تیزی سے جاری کئے جاتے ہیں وہ کبھی کبھار کی غلطیوں کو نمایاں نہیں ہونے دیتی۔ غالب لیڈر ہمیشہ فعال جماعتوں میں پائے جاتے ہیں، ایسی جماعتوں میں جن کا عملی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ غالب لیڈر اُن کاموں میں جو وہ اپنی جماعتوں کے سپرد کرتے ہیں خود سب سے پیش پیش ہوتے ہیں اور اُن کی طاقت کا راز اسی میں ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں جبکہ دوسرے لوگ کوئی فیصلہ یا کوئی اقدام کرتے ہوئے ڈرتے ہوں اور ذمہ داری کے احساس سے دبتے چلے جاتے ہوں اور کچھ کہنے یا کرنے سے گھبراتے ہوں غالب لیڈر دوڑ کر آگے آجاتے ہیں اور وہ ذمہ داری جو کوئی نہیں اُٹھاتا تھا خوشی سے قبول کرلیتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اُن سے غلطی بھی ہوسکتی ہے، لیکن انہیں غلطیوں کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ جانتے ہیں کہ اُن کی طاقت اُن کی شخصیت میں ہے اور اگر کوئی غلطی ہو بھی جائے تو اُن کی شخصیت اُس پر پردہ ڈال دے گی۔ جب کسی جماعت میں اصلاح کی ضرورت ہو تو غالب لیڈر ہی ایسا کام بسرعت کرسکتے ہیں، غالب لیڈر کے ماننے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اُس کے کاموں پر نکتہ چینی کرتے ہیں، لیکن کرتے وہی ہیں جو وہ کہتا ہے۔ غالب لیڈر دستوری لیڈر کی طرح اس بات کا پابند نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں سے تکلف کے تعلقات رکھے اور ہمیشہ رسوم کی رعایت سے ہی اُن سے ملے، وہ بے تکلفانہ میل جول رکھ کر بھی اپنا رعب قائم رکھ سکتا ہے۔ اِدھر اپنی مُسکراہٹ سے اپنے عقیدت مندوں کو لبھا سکتا ہے۔ اُدھر اپنی گرفت سے اُن کو پسینہ پسینہ کرسکتا ہے، غالب لیڈر کی طاقت کا انحصار اگرچہ اس کی اپنی شخصیت پر ہوتا ہے لیکن اس کے لئے علمی

معلومات سے واقفیت اور کسی فن میں مہارت رکھنا ضروری ہے، خصوصاً جب کہ اس کی اپنی جماعت یا اس کی ہم عصر جماعتوں میں یا علمی و فنی مشاغل پائے جاتے ہوں اور علمی و فنی فوقیت اجتماعی قوّت و فوقیت کا موجب ہو۔

۲۔ لسّان لیڈر

اب لسّان لیڈر کا حال سنئے۔ لسّان لیڈر کو بھی ایسا مقام حاصل ہے جو دوسرے لیڈروں سے ہرگز کم نہیں، وہ بھی اپنی شخصی قابلیت کی بنا پر لیڈر بنتا ہے۔ وہ دیکھتا رہتا ہے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں، ان کے قلوب پر اس کی نظر ہوتی ہے، اور وہ ان کے دلی احساسات سے ایسا واقف ہوتا ہے جیسے خود اپنے احساسات سے۔ جب لوگ کسی اُلجھن میں پیچ و تاب کھا رہے ہوں اور منتظر ہوں کہ کوئی اُٹھے اور فیصلہ کن بات کرے، لسّان لیڈر اپنا موقع پا کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ بات جو لوگوں کے دلوں میں ہوتی ہے اور جسے خوف کے مارے کوئی ظاہر نہیں کرتا اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو دوسروں کے دلوں میں نہ ہو، نہ کوئی ایسی بات منواتا ہے جو دوسرے ماننے کے لئے تیار نہ ہوں، وہ اوروں کے دل کی بات کو اپنی بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ بقولِ غالب ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

لسّان لیڈر نہ صرف کانفرنسوں اور جلسوں میں ناموری پیدا کرتے ہیں، بلکہ اگر حالات پُرامن ہوں، جماعتوں کے تعلقات عام طور پر دوستانہ ہوں اور معمولی مخالفت کی صورت میں سمجھوتے کا امکان باقی ہو تو ایسے لیڈر جماعتوں کے آپس کے تعلقات درست کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں، ہمارے زمانے میں بین الاقوامی زندگی میں اس قسم کے کئی لیڈر پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکار اسی نوع کے لیڈر ہیں۔ وہ عموماً جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔ جب تک مخالف جماعتوں میں سمجھوتے کی صورت باقی ہو، وہ مصروفِ کار رہتے ہیں لیکن جب اعلانِ جنگ ہو جائے اور مناقشہ ایک کھُلی ہوئی حقیقت بن جائے تو وہ میدان چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ایسے لیڈر حکومت کے کاموں کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دے لیتے ہیں، کیونکہ حکومت امن کی حالت میں ہی ہو سکتی ہے۔ لسّان لیڈر اُن باہمی اختلافات کو عموماً آسانی سے دُور کر دیا کرتے ہیں جو امن کی حالت میں بھی پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔

عصرِ حاضر کا لیڈر

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ تہذیب نے امن کی قدر بڑھا دی ہے، امن کا دور دورہ ہو رہا ہے اور آئندہ زیادہ ہوتا جائے گا۔ اس لئے غالب لیڈروں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور اب دستوری اور لسّان لیڈروں کا زمانہ ہے۔ اس میں

شک نہیں کہ اب ہم لوگ امن سے زیادہ مانوس ہو گئے ہیں اور اس بات کے باوجود کہ آج بھی قومیں ایک آنے والی جنگ کے لئے تیار ہیں۔ اور ہر ملک میں ایسی جماعتیں ہیں جو اندر ہی اندر ایک دوسری کے مقابلہ کی تیاری میں مصروف ہیں، ہم یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ اب زمانہ عموماً خونریزی کے بغیر ترقی کرتا چلا جائے گا، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ غالب لیڈر کا زمانہ ختم ہو گیا۔ غالب لیڈر کا وجود اس وقت ظاہر ہوتا ہے، جب دو جماعتوں میں مقابلہ ہو۔ اور یہ مقابلہ صرف جنگی اور سیاسی ہی نہیں بلکہ تمدنی اور تعلیمی بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر خونریزی پیدا کرنے والا یا سیاسی مقابلہ بھی باقی نہ رہے تو تمدنی اور تعلیمی مقابلہ ضرور رہے گا کیونکہ اُس کے بغیر اجتماعی ترقی ناممکن ہے۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ جنگی اور سیاسی مقابلہ سے ابھی کچھ تھوڑی ہی فرصت ملیگی کہ دُنیا میں ایک تمدنی اور تعلیمی مقابلہ شروع ہو جائے گا جب تک ایسے مقابلے کا امکان باقی ہے "غالب لیڈر" کا وجود بھی باقی ہے پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ دُنیا کی آئندہ ترقی کا دَور اب خونریزی سے نہیں بلکہ پُرامن طریقوں سے وابستہ ہوگا لیکن اس دَور میں بھی وہی "غالب لیڈر" رہنمائی کریں گے جو غالب فطرتوں کے مالک ہونے کے باوجود اپنے طریق ہائے کار پُرامن حدود کے اندر رکھیں گے ؂

محمد اسلم بی۔اے (کنٹب)

خیالات

کوئی تعلیم تعلیم کہلانے کی مستحق نہیں، جب تک وہ غور و فکر کو جلا نہ دے، جب تک وہ نفس کے پُراسرار روحانی اصُول تک پہنچ کر اُس میں تحریک اور نشوونما پیدا نہ کرے۔ (وہیل)

یا لوگوں کو بالکل اندھیرے میں رکھو اور یا پھر اگر تم سچائی کے پیرو ہو تو بہتر ہے کہ اُنہیں پوری روشنی میں لے چلو (وہیل)

دنیا کو وضع کرنے والا اور تعلیم دینے والا مرد ہے لیکن مرد کو تعلیم دینے والی عورت۔ (بیولو)

عقلمند سے عقلمند آدمی بھی جاہل سے جاہل کسان سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔ (پٹیٹ سین)

لالۂ طور (ترجمہ) کیلاش کنول

میں نے "پیامِ مشرق" سے "ہمایوں" کے لئے "لالۂ طور" کا ترجمہ علامہ اقبال کی اجازت حاصل کرنے کے بعد کیا ہے۔ براہِ کرم کوئی صاحب اسے میری اجازت کے بغیر شائع کرنے کا قصد نہ فرمائیں۔

مقبول احمد پوری

ترجمہ

جیون سبھا اسی کی گھائل
پریم کی بھگتی کے سب قائل
دیکھ، تلک سورج کی لگائے
اُشا بھی اُس بھگتی پر مائل[1]

[1] اس سے بہتر حسنِ تعلیل کی مثال آج تک نہ دیکھی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر صبح یا سحر کو ایک ذی حیات وجود تسلیم کر لیا جائے، جیسا کہ ہنود تسلیم کرتے ہیں تو اس کو حریمِ ناز کا عبادت گزار کہنے میں پس و پیش نہیں، کیونکہ سورج یعنی "مہرِ فلک تاب" "سیمائے سحر" یا جبینِ صبح پر سجدہ کا داغ ہے۔
سجدہ کے داغ کو سعادتِ دارین تصور کیا جاتا ہے۔ اسی باعث عرفِ عام میں اس کو جنت کا ٹیکا کہتے ہیں۔ گوالیار کے ایک شاعر "بتاشے والے بابا" نے اس مفہوم کو بخوبی نمایاں کیا ہے۔ سو وہ لکھ گئے ہیں ؎

ہے گو کہ عصیاں سے رو سیاہی — مگر جو تو چاہے یا الٰہی
سمٹ کے چہرے کی سب سیاہی — نشانِ سجدہ بنے جبیں کا (زمانہ)

(بقیہ بر صفحہ ۴۸۴)

(۲)

دلِ من روشن از سوزِ درون است
جہان بیں چشمِ من از اشکِ خون است
ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد
کسے کو عشق را گوید جنون است

ترجمہ

دل میں اُجالا دل کی تپن سے
انکھیاں دیکھیں جگت آنسوؤں سے
پریت کو جو پاگل پن سمجھے
وہ انجان رہے جیون سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۳) ۔ ہندو میں تلک کا عام مفہوم یہ ہے کہ پوجا پاٹ کے وقت تلک لگائی جاتی ہے ۔ بعض لوگ پوجا سے پیشتر تلک لگاتے ہیں اور پھر پوجا کرتے ہیں ۔ اکثر بھگت پوجا کے بعد لگاتے ہیں ۔ تلک عام طور پر ایک پجاری بھگت کی پہچان مانی گئی ہے جس طرح "جنت کا ٹیکا" ایک نمازی مسلمان کی پہچان ہے ۔ ہندی زبان کے مشہور شاعر کبیر نے اس مفہوم کو اپنے ایک دوہے میں اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

مالا تلک کی بہت بڑائی   کرنی ہو کے نہ رہے بھائی

اسی طرح ہندی کے مشہور شاعر "بہاری" نے ایک دوہے میں "جپ مالا ، چھاپا تلک" سے بھی اس مفہوم کو ظاہر کیا ہے ۔
لیکن ہندی زبان میں تلک کے اور بھی کئی مفہوم ہیں جن کو ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ۔ یہاں ترجمہ کا مفہوم یہ ہے کہ صبح کی دیوی اُشا جس کو اُوشا اور یوشا بھی کہتے ہیں جس کے لغوی معنے "مشرق" یعنی "پورب" کے بھی ہیں اور ہمارے برِّ اعظم "ایشیا" کے نام میں بھی اسی یوشا یا اُشا کی "شرقیت" شامل ہے ، وہی اُشا دیوی یہاں سورج کی تلک لگائے ہوئے ایک پجارن تسلیم کی گئی ہے (خاصکر صبح کے وقت سورج کی شکل ایک تلک یا ٹیکے سے زیادہ مشابہ ہوجاتی ہے) اور اس طرح "تلک" "داغِ سجدہ" کی ہندوانی تعبیر ہے ۔ چنانچہ اُشا دیوی اس انداز سے خالق بے نیاز کی تعریف و تقدیس کرنے اور اس کے بھجن گانے پر آمادہ ہے (ہندوؤں نے تو خود اُشا دیوی کی تعریف میں نہیں معلوم کتنے بھجن گا ڈالے ۔ اُشا خدا کی تعریف کے بھجن گائے اس سے بڑھ کر تمثیلِ تقدیس اور کیا ہوسکتی ہے جس کے ذریعے سے آوازِ اذان پردۂ ناقوس میں نہاں ہوا ۔
اور یہ ایک عجیب اتفاق کی بات ہے کہ دُنیا کے بڑے بڑے مذاہب اسی اُشا والے ایشیا ہی میں وجود پذیر ہوئے ——

مقبول

(۴۸)

به باغان باد فروردین دهد عشق
به راغان غنچه چون پروین دهد عشق
شعاع مهر او قلزم شگاف است
بماهی دیدهٔ ره بین دهد عشق

ترجمہ

ہوا بسنت کی پریت اپون[1] میں
پھل پھولوں کی جھالر[2] بن میں
پریت سے مچھلی جل کو چیرے
پریت جھلک ساگر[3] درپن[4] میں

[1] اپون۔ مشہور لفظ ہے۔ معنی باغ، پھلواری + [2] خوشہ۔ گچھا۔
[3] ساگر معنی سمندر + [4] درپن معنی آئینہ +

(۴۹)

به برگ لاله رنگ آمیزی عشق
بجان ما بلا انگیزی عشق
اگر این خاکدان را وا شگافی
درونش بنگری خونریزی عشق

ترجمہ

پریم کا رنگ کنول میں جھلکے
پریت ڈسے جیّیہ[1] ہلکے ہلکے
چیر کے یہ دل دیکھے کوئی
پریم کا جل[2] جیون سے چھلکے

[1] جان۔ جی
[2] پانی یعنی خون۔ اس کو جیون جل بھی بولتے ہیں۔

(۱۳۰)

تراشیدم صنم بر صورتِ خویش
بشکلِ خود خدا را نقش بستم
مرا از خود برون رفتن محال است
بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

ترجمہ

اپنے ہی رُوپ کی مُورت گھڑلی[1]
اپنے ہی روپ کو ہر[2] سے ملایا
چھوٹ سکے نہ سُروپ[3] سے اپنے
اپنے ہی چِتر[4] پہ بھوگ چڑھایا

(۱۳۲)

زجانِ بے قرار آتش کشادم
دلے در سینۂ مشرق نہادم
گِلِ او شعلہ زار از نالۂ من
چو برق اندر نہادِ او فتادم

ترجمہ

بیاکل[1] من سے آگ جلائی
پُورب[2] دیس کے دل میں لگائی
جوالا[3] بن کے اُڑی یہ مٹی
تن من میں بجلی دوڑائی

---

[1] گھڑلی" سنی بنالی ۔ [2] خدا ۔ ہری ۔ [3] خودی [4] شکل ۔ شبیہ ۔ تصویر ۔

[1] بیکل ۔ بے قرار ۔ [2] مشرق ۔ [3] شعلہ ۔

(۹۴)

خرد بر چہرۂ تو پردہ ہا بافت
نگاہے تشنۂ دیدار دارم
در افتد بیم زبان اندیشہ با شوق
چہ آشوب تمنی در جان زارم

ترجمہ

مُکھ پہ ہے تیرے گیان کا بانا[۱]

یہ انکھیاں درشن کی پیاسی

آس مری دُوبدھا[۲] میں جھولے

چھائے رہی جیون پہ اُداسی

[۱] بانا ـ معنی جالیدار پردہ ـ یعنی "تانا بانا"

[۲] "دُوبِدھا" معنی کشمکش ـ اندیشہ ـ شک ـ خواجہ الطاف حسین صاحب حالی لکھتے ہیں ؎

"حیرت میں ہے الٰہی "دُگدھا" میں ہے طبیعت"

یہ لفظ "دُگدھا" یعنی "دُوبدھا" ہے ـ عام طور سے رائج ہے ؞

مقبول احمدپوری

پنجاب میں بہن کے ترانے

چندی کا گیت کافی لمبا تھا۔ جب بھی وہ اپنی ہجولیوں کے ساتھ مل کر گاتی تھی۔ اس کے سُر ہمارے دِلوں میں گونج اُٹھتے تھے۔ اِس گیت کا ایک مصرع تو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا:-

"جیوے میرا ویر پیار" یعنی بھائی کے لئے میرا پیار ہمیشہ زندہ رہے۔

مجھے معلوم تھا کہ چنّن اپنی بہن کے اس گیت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتا بچپن کے اس شیریں زمانے میں چندی نے مجھے اور بھی کئی گیت سنائے تھے مگر بہن کے پاک پیار کا یہ پہلا ہی گیت تھا جس نے مجھے اپنا دلدادہ بنا لیا۔

اب بچپن کے وہ معصوم دن کبھی کے بیت چکے ہیں۔ اٹھارہ اُنیس سال کا لمبا عرصہ بیچ میں سے گزر گیا ہے۔ چندی کی شادی ہوئے نَو سال ہو چکے ہیں۔ عمر کے ساتھ ہی چندی کے شعر و نغمہ کا وہ دیس جس میں بہن کا پیار اپنی دلکشی، رنگینی اور تاثیر میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، اور بھی مقدّس ہوتا چلا جا رہا ہے۔

چندی خود نئے گیت تیار نہیں کر سکتی مگر میں نے یہ دیکھا ہے کہ وہ اپنی ماں سے سیکھے ہوئے گیتوں کو اس شوق سے گاتی ہے جس سے شاید کوئی شاعر اپنی کسی نئی چیز کو بھی نہ پڑھ سکتا ہو۔ اُس عورت کی طرح جو اپنی پڑوسن کے بچے کو اپنی گود کے لال سے بھی کہیں زیادہ پیار کرتی ہو، چندی ان گیتوں کے گاتے وقت شاید یہی محسوس کرتی ہے کہ یہ گیت تیار ہی اس کے لئے ہوئے ہیں۔ گیت تو اُس نے اور بھی بہت سے سیکھ رکھے ہیں مگر بہن بھائیوں کے گیت گانے میں تو ہمارے گاؤں کی اَور ایک بھی لڑکی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

چندی کے گیتوں میں بہن کا کھلا ہوا دل دیکھ کر مجھے چارلس لیمب کے وہ الفاظ یاد آ جاتے ہیں جو اُس نے اپنی بہن "میری" کے لئے استعمال کئے تھے:- "دُنیا میں جتنے بھی لوگوں کو میں جانتا ہُوں وہ سب خود غرض ہیں مگر "میری" کی سیرت خود غرضی سے بے انتہا بالاتر ہے۔ میں جنّت میں رہوں خواہ دوزخ میں، وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہن بننے کے لئے ہی "میری" کا جنم ہوا ہے"۔

جب بھی چندی بہن کے پیار بھرے ترانے چھیڑتی ہے مجھے یہ محسوس کرتے دیر نہیں لگتی کہ پنجاب کی لڑکی اپنے بھائی کو خودداری، جوانمردی اور بہادری کی کسوٹی پر ہی پرکھتی ہے۔ پنجابی زبان میں بھائی کے لئے "بھرا" یا "بھایا" وغیرہ الفاظ

تو ہیں ہی مگر گیتوں میں سب سے زیادہ موزوں لفظ "ویر" سمجھا گیا ہے۔ "ویر" خالص سنسکرت لفظ ہے اور اس کے لفظی معنی بہادر یا جوانمرد ہوتے ہیں۔ جب بھائی کے لئے "ویر" لفظ چنا گیا تب یقیناً ہر ایک نوجوان اپنی بہن کے لئے اپنی جان تک دے سکتا ہوگا۔ جب بھی بہن کی عزت کا سوال آتا ہوگا، بھائی اپنی جان کی بازی لگانے سے ذرا بھی گریز نہیں کرتا ہوگا۔

ابھی اُس دن چندی گا رہی تھی:-

"کالی ڈانگ میرے وِیر دی جتھے وھدی بدل وانگوں گجدی"

یعنی میرے بھائی کی لاٹھی کالے رنگ کی ہے۔ جہاں بھی وہ اس سے وار کرتا ہے وہیں یہ بادل کی طرح گرجتی ہے۔

میرے پاس کوئی کالی یا سفید لاٹھی نہیں ہے اور نہ میں نے دیہات کے جوانمردوں کی طرح لاٹھی چلانی ہی سیکھی ہے مگر بہن کی حفاظت کرتے ہوئے بھائی کی لاٹھی جس کی کچھ جھلک مجھے چندی کے گیت میں نظر آئی، مجھے زندگی کی ضروری شے معلوم ہوتی ہے۔

باپ کو پنجاب کے دیہاتی گیتوں میں اکثر "دھرمی بابل" کہا گیا ہے۔ غریب کی بیٹی نے بھی اپنے والد کو "لکھ داتا" (لاکھوں روپیہ خیرات کرنے والا) کہنے میں ہی اپنی اور اپنے والد کی شان سمجھی ہے۔ ماں وہ پسند کی گئی ہے جس کے روبرو بیٹی اپنے دُکھ سُکھ کی کہانی بلا تکلف سُنا سکے۔ ایسے والدین کی موجودگی میں بھی ماں جائے بھائی کے بغیر پنجاب کی لڑکی اپنی دُنیا کو سُونی ہی سمجھتی ہے۔ جوانمرد بھائی تو ہونا ہی چاہیئے۔

لڑکی سُسرال میں ہوتی ہے تو اپنے ماں جائے بھائی کی آمد کے جنتی خواب دیکھتی ہے۔ بچپن کی پُرلطف اور شیریں گھڑیاں کو وہ کیسے بھول سکتی ہے؛ بھائی کا مسکراتا ہؤا مکھڑا یاد کے پُرنور اور نشاط آگیں تاروں کو شعر و نغمہ کی طرف مائل کرتا رہتا ہے بہن کے معصوم پیار میں تصنع اور بناوٹ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ بہن کا پیار ایک عجیب جذبے کی ترجمانی کرتا ہے جو اکثر نامور شاعروں کے کلام میں نظر نہیں آتا۔

جب سُسرال کی زندگی آلام و مصائب کا شکار ہو جاتی ہے، جب چاروں طرف انتہا درجہ کا غم چھا جاتا ہے، بہن کی پُرحسرت نگاہیں اپنے ماں جائے بھائی کی طرف اُٹھتی ہیں۔ مگر بھائی کو بہن کے دردناک حالات کا پتہ کیسے چلے؛ کس کے ہاتھ بہن پیغام بھیجے؛ انسان کی دُنیا سے مایوس ہو کر وہ اکثر اپنے گیت میں اُڑتے ہوئے کوّے سے مخاطب ہوتی ہے:-

اُڈ داتے جائیں کانواں! بہندا بھی جائیں۔	ترجمہ:- اے کوّے! اُڑتے ہوئے تو جانا۔ بیٹھتے ہوئے بھی جانا۔
بہندا جائیں میرے پیو کڑے	بیٹھتے ہوئے میرے میکے تک جانا
اِک نہ دسیں میری ماں رانی نوں	میری ماں رانی سے میرے حالات نہ کہنا۔

رووگی اڑیا میریاں گڈیاں ویکھ کے میں واری
وہ بے چاری میری گڑیاں دیکھ دیکھ کر آنسو بہائے گی!

اِک نہ دسّیں میری بہن پیاری نوں
میری بہن کو بھی دُکھ درد نہ بتلانا۔

رووگی اڑیا بھریا ترنجن ویکھ کے میں واری
اپنی سکھیوں کے ساتھ چرخہ کاتتی ہوئی مجھے اپنے درمیان نہ پاکر وہ رو اٹھیگی

اِک نہ دسّیں میری بھابی نوں
میری بھاوج کو بھی نہ بتلانا میری باتیں

کھڑ کھڑ ہسوگی اڑیا پیوکڑے جاکے میں واری
وہ اپنے میکے جاکر بُری طرح میرا مذاق اُڑائے گی۔

اِک نہ دسّیں میرے دھرمی بابل نوں
میرے دھرمی باپ سے بھی کچھ نہ کہنا۔

رووگا اڑیا بھری کچہری چھوڑ کے میں واری
بھری کچہری سے باہر آکر وہ بیچارہ رو رو کر بے حال ہو جائے گا۔

دسّیں وے کانواں میرے ویر پیارے نوں
اے کوّے! میرے حالات تو میرے پیارے بھائی سے کہنا۔

آوے گا اڑیا نیلا گھوڑا پھیر کے میں واری
وہ نیلے گھوڑے پر سوار ہو کر میرے پاس پہنچے گا۔

انسان کی نام نہاد تہذیب سے نا اُمید ہوکر ہی پُرانے پنجاب کی لڑکی کوّے سے گویا ہوتی ہے۔ مگر بہت جلد اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ بیچارا کوّا یہ کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ اب اُسے اپنی حسرتوں کا پُرسوز پیغام اپنے خود دار بھائی تک پہنچانے کے لئے اپنے وطن کی طرف جاتے ہوئے کسی مسافر کا سہارا لینا پڑتا ہے:۔

بھائیا راہیا جاندیا! جانائیں توں کیہڑے دیس ہیں واری
لڑکی۔ "اے راہ چلتے بھائی مسافر! تم کس دیس کو جا رہے ہو؟"

جانائیں بی بی! تیرے پیوکڑے، دے سنیہاں لے جاؤں ہیں واری
مسافر: "میں تیرے میکے جا رہا ہوں بی بی! کوئی پیغام ہو تو دے دو۔"

جا آکھناں میری ماں رانی نوں دھیاں کیوں دتیاں دُور ہیں واری!
لڑکی۔ "میری ماں رانی سے پوچھنا کہ اُس نے اپنی بیٹی کو اتنی دُور کیوں بیاہ دیا ہے؟"

میں نہ دتیاں دُور، کدھرے دتیاں اُنہاں دے باپ ہیں واری!
ماں۔ "میں اپنی بیٹی کا بیاہ اتنی دُور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ تو اُس کے باپ کی مرضی سے ہُوا ہے۔"

بابل کرسی بیٹھیا وے دھیاں کیوں دتیاں دُور، ہیں واری!
مسافر "اے کرسی پر بیٹھے ہوئے باپ! تُونے اپنی بیٹی کو اتنی دُور کیوں بیاہ دیا؟"

ہیں نہ دتیاں دُور کدھرے، دِتیاں اُنہاں دے ویر ہیں واری
باپ۔ "میری مرضی بیٹی کو اتنی دُور دینے کی نہ تھی۔ یہ تو اُس کے بھائی کی رضامندی سے ہوا ہے۔"

سُنیں وے دیرا راجیا! بھیناں کیوں دتیاں دُور، مَیں واری
مَیں نہ دتیاں دُور کدھرے دِتیاں اُنہاں دے لیکھ، مَیں واری

مسافر:- "راجہ بھائی! ابا! تم نے اپنی بہن کو پردیس میں کیوں بیاہ دیا؟"
بھائی:- "بہن کو دُور بیاہنے کی ذمہ داری مجھ پر عاید نہیں ہوتی۔ بہن کی قسمت ہی ایسی تھی۔"

اج بناواں پِنّیاں، بھلکے سوہیاں چُنیاں، پرسوں بھیناں دے دیس، مَیں واری

"آج میں اپنی بہن کے لئے پِنّیاں بناؤں گا۔ کل کو اُس کے لئے سرخ چُنری رنگاؤں گا اور پرسوں میں بہن کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

جاندا وہڑے جا وڑیا، ڈُھل پئے بھیناں دے نَین، مَیں واری

"چلتا چلتا بھائی بہن کے آنگن میں جا پہنچا۔ بہن کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔"

سِر دا چیرا پاڑ کے پُونجھاں بھیناں دے نَین، مَیں واری

بھائی نے کہا میں قربان جاؤں اپنی بہن پر۔ سر کا چیرا پھاڑ کر اُس نے بہن کے آنسو پونچھ دیئے۔

سسّی پیہاوے چکیاں، سوہرا گھٹاوے بھنگ، مَیں واری

بہن۔ (کیا پوچھتے ہو بھائی) ساس مجھ سے چکی پسواتی ہے اور سُسر کے لئے بھنگ تیار کرنے سے بھی مجھے کبھی فرصت نہیں ملتی۔

بھنگ دا بُوٹا پُٹ سُٹاں، چکی دے ٹوٹے چار، مَیں واری

بھائی:- میں بھنگ کا بوٹا اُکھاڑ کر پھینک دیتا ہوں اور چکی کے چار ٹکڑے کئے دیتا ہوں۔

سسّ نے لاہ لئیاں چندوڑیاں، سوہرے نے لاہ لئے بند، مَیں واری

بہن۔ (کیا پوچھتے ہو بھائی!) ساس نے میرے سر سے چندوڑیاں (ایک زیور) اُتار لی ہیں۔ اور سسر نے میرے ہاتھوں سے "بند" اُتار لئے ہیں۔

نیلا گھوڑا ویچ کے بنا دیاں بھیناں نوں بند، مَیں واری

بھائی۔ اپنا نیلا گھوڑا فروخت کر کے میں اپنی بہن کے لئے "بند" بنوا دوں گا۔

گل دا کنٹھا ویچ کے بنا دیاں بھیناں نوں چند، مَیں واری

اپنے گلے کا "کنٹھا" فروخت کر کے میں اپنی بہن کے لئے چند بنوا دوں گا۔

پنجاب کی بیٹیوں کے پاس شعر و نغمہ کا ورثہ موجود ہے۔ زندگی کے شیریں و تلخ دونوں رُخ ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہمیں اپنے ساتھ ہنساتے اور رُلاتے ہیں۔ ہر ایک گیت براہِ راست ہمارے دِل تک پہنچتا ہے اور ہم یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ شعر و نغمہ کے

اِس ذخیرے کا دار و مدار صرف الفاظ پر ہی نہیں ہے۔ زندگی کی یہ حقیقی شاعری ہم پر اپنی اہمیت کا سِکّہ بٹھا لیتی ہے۔ پُرانے پنجاب کی رُوح، پُرانے زمانہ کی خوشگوار و پُردرد کہانی، لوگوں کے جذبات واحساسات کی تاریخ، اِن گیتوں کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہے۔

چندری یہ جان کر بہت خوش ہوئی ہے کہ ایسے گیت ہندوستان کے سبھی صُوبوں میں رائج ہیں۔ یُوپی کے ایک گیت کا ترجمہ سُن کر تو اُس پر بہت اثر ہُوا ہے۔ آخر بہن کا دل تو ایک ہی ہے۔ گیت ملاحظہ ہو:۔

بہن۔ کبھی میرے دیس میں تشریف لاؤ بھائی! آؤ اور میرا دُکھ سُکھ سُنو۔

بھائی۔ کیسے آؤں تیرے دیس میں بہن؟ تمہارے دیس میں تو ڈھاک کے گھنے جنگلات ہیں اور اِن میں شیر بستے ہیں۔

بہن۔ اپنے ہاتھوں میں ڈھال اور تلوار لے کر آؤ بھائی! پھر شیر تمہیں کیا کہہ سکیں گے؛

× × × × × × × ×

مَیں دو گھڑ سواروں کو اپنی طرف آتے دیکھ رہی ہوں۔ ایک گورا ہے دوسرا سانولا۔

گورا میرا ماں جایا بھائی ہے اور سانولا میری نند کا بھائی۔

ساس جی! بتاؤ ان کے لئے میں کیا کیا پکوان تیار کروں؛

ساس۔ کوٹھے میں گلی سڑی کودوں (معمولی قسم کا اناج) پڑی ہے اَور دیوار پر مسُوڑے کا ساگ پڑا ہے۔

دلہن۔ گلی سڑی کودوں کو آگ لگے ساس جی! اور مسُوڑے کے ساگ پر بجلی گرے۔

× × × × × × × ×

میدا چھان کر دُلہن نے لُوچیاں تیار کیں، بتھوئے کا ساگ بنالیا، مُونگ کی دال پکالی اور موتی جیسے چاول لے کر بھات پکا لیا۔

سونے کی تھالی میں بھوجن پروس کر اوپر سے اُس نے گھی ڈال دیا۔

سالا اور بہنوئی کھانے بیٹھے۔ سالے کی آنکھوں میں اچانک آنسُو آ گئے۔

× × × × × ×

بہن۔ ذرا تم مالن کے "اوسارے" میں تو جا کر بیٹھو بھیّا! مالن کی بیٹی تم سے میرا سب حال کہہ دے گی۔

وہ تمہیں بتائے گی کہ میں کے مَن اناج روز کوٹتی ہوں، کے مَن پیستی ہوں، اور کے مَن پکاتی ہوں۔

میری ساس بڑی ظالم ہے۔ وہ مجھے ٹوکرا بھر برتن صاف کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔

اُس کے حکم سے مجھے گہرے کنوؤں سے پانی لانا پڑتا ہے۔

ئیں سب کو کھلاتی ہوں، پھر جو بچ رہتا ہے میرے حصّہ میں آتا ہے؛ اس میں سے بھی چرواہا اپنا حصّہ الگ لے جاتا ہے
پہننے کی بھی کچھ نہ پوچھو، پھٹے پُرانے کپڑے جو گھر والے اُتار ڈالیں، مَیں پہنتی ہوں۔
بھائی۔ لوہا لوہار کی بھٹّی میں جل رہا ہے! میری بہن سُسرال میں جل رہی ہے!
بہن۔ میرا یہ دُکھ میری بھاوج سے نہ کہنا بھائی! وہ گھر گھر میرا مذاق اُڑاتی پھرے گی!
میری ماں سے بھی نہ کہنا، وہ بیچاری چھاتی پھاڑ کر جان دے گی!
میری چچی سے بھی میرے دُکھوں کا ذکر نہ کرنا۔ اُس کے طعنے میں نہ سہار سکوں گی۔
میرے بابا کو بھی اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ پنچایت میں بیٹھ کر وہ آہ و زاری کرے گا۔
میرا یہ دُکھ اُس سے کہنا جس نے یہ رشتہ طے کرایا تھا۔ اُس برہمن سے کہنا جس نے میرا بیاہ پڑھوایا تھا۔
مگر اچھا یہی ہو کہ میرا یہ دُکھ درد تُو کسی سے بھی نہ کہے بھائی! (اپنے ہی دل میں رہنے دے اِسے)
میرے دُکھ درد کو ایک گٹھڑی میں باندھ کر لے جا بھائی! راستہ میں یہ گٹھڑی دریا میں پھینکتے جانا۔

× × × × ×

پنچایت میں بیٹھا بابا دیکھ رہا ہے کہ پوتا تو آ رہا ہے مگر پوتی ساتھ نہیں ہے۔
بہن کے بھائی نے گھر آ کر کہا۔ جیسے جمنا اُمڈ کر بہتی ہے اُسی طرح میری بہن سُسرال میں رو رہی ہے۔
باپ۔ کیا تیری جانگھ تھک گئی تھی بیٹا؛ کیا تیرے بازوؤں میں ذرا بھی ہمّت باقی نہ رہی تھی۔
اپنی دُکھی بہن کو تو پیچھے ہی کیسے چھوڑ آیا؟

مظلوم بہن کا دل سُسرال سے میکے جانے کے لئے تڑپ اُٹھتا ہے جہاں وہ پیدا ہوئی، جہاں وہ خودداری کی آزاد ہوا میں کھیلی۔ والدین کے اُس سنہری وطن میں پھر سے ایک بار جا سکنے کا دھیان بھی کتنا شیریں ہو سکتا ہے! مگر بھائی کئی بار بہن کے پیار سے ذرا پیچھے رہ جاتا ہے۔ بہن کو اصلی گلہ نہ یہ ہے کہ ساس اُس سے سخت کام کراتی ہے اور نہ یہ کہ اُسے کھانے اور پہننے کو وہاں اعلیٰ درجہ کی چیزیں نہیں ملتیں بلکہ جب وہ دیکھتی ہے کہ وہ وہاں اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھ سکتی، وہ اپنے بھائی سے فریاد کرتی ہے۔

ایک گیت میں بھائی کو بہن کے دروازے کے سامنے سے اپنے دوستوں سمیت گزرتے ہوئے دکھایا گیا ہے؛ بہن اپنے بھائی کی یہ بے رُخی برداشت نہ کر سکی۔ بہن کا پیار بھرا دل بھائی سے مخاطب ہو گیا۔ بھائی نے بہت بہانے

کہئے مگر بہن نے ایک ایک بات کا جواب بڑے پیار سے دیا :-

ویرا! گھر گھر دھریکاں پھلیاں	بہن - بھائی ہر ایک گھر کے سامنے بکائن کے درختوں کی بہار ہے۔
چندا! گھر گھر دھریکاں پھلیاں	اے میرے چاند بھائی! ہر ایک گھر کے سامنے بکائن کے درختوں کی بہار ہے
اینہاں دھریکاں دی ٹھنڈی چھاؤں	کتنی ٹھنڈی اِن بکائن کے درختوں کی چھاؤں!
ویرا وے! توں آ گھرے	میرے ہاں آ جاؤ نہ پیارے بھائی!
لے چل ماں پیو دے دیس وے	مجھے والدین کے وطن کو لے چلو!
ویرا! آ گھرے	تو میرے ہاں آ جاؤ نہ بھائی!
کیکن آواں بھینے بھولئے؟	بھائی - بھولی بہن! کیسے آؤں میں تمہارے ہاں؟
کیکن آواں بی بی بھولئے؟	بھولی اور بی بی بہن! کیسے آؤں میں تمہارے پاس؟
میرے ساتھی تاں لنگھ گئے دُور	میرے ساتھی تو بہت دُور نکلے جا رہے ہیں۔
بھینے نی! تُوں رہ گھرے	اپنے گھر میں ہی رہ بہن!
رہ گھر سستوجی دے کول نی!	اپنی ساس کے پاس رہ
بھینے! رہ گھرے	اپنے گھر میں ہی رہ بہن!
تیرے ساتھیاں نُوں منجے پیڑھیاں	بہن - تمہارے ساتھیوں کو میں چارپائیوں اور پیڑھیوں پر بٹھاؤں گی۔
چندا! ساتھیاں نُوں منجے پیڑھیاں	اے میرے چاند بھائی! تمہارے ساتھیوں کو میں چارپائیوں اور پیڑھیوں پر بٹھاؤنگی۔
اپنے ویرے نوں پلنگ بچھاواں	تمہارے لئے میں پلنگ بچھائے دیتی ہوں۔
ویرا وے تُوں آ گھرے	میرے ہاں آ جاؤ نا میرے پیارے بھائی!
لے چل ماں پیو دے دیس وے	مجھے والدین کے وطن کو لے چلو
ویرا آ گھرے	تو میرے ہاں آ جاؤ نا بھائی!
تیرے ساتھیاں نُوں گھیو کھچڑی	بہن - تمہارے ساتھیوں کو گھی، کھچڑی کھلاؤں گی۔
چندا! ساتھیاں نُوں گھیو کھچڑی	اے میرے چاند بھائی! تمہارے ساتھیوں کو میں گھی کھچڑی کھلاؤنگی
آپنے ویرے نوں گری تے چھوہارا	تمہارے لئے میں بادام اور چھوہارے رکھے دیتی ہوں۔
ویرا وے توں آ گھرے	میرے ہاں آ جاؤ نا پیارے بھائی!

لے چل ماں پیو دے دیس وے	مجھے والدین کے وطن کو لے چلو
ویرا! آ گھرے	میرے ہاں آ جاؤ نا بھائی!
بھینے! اگے تاں دُھپاں کرڑیاں	بھائی۔ بہن! آگے وطن کے راستہ میں سخت دھوپ پڑتی ہے
بی بی! اگے تاں دُھپاں کرڑیاں	بی بی بہن! وطن کے راستے میں سخت دھوپ پڑتی ہے۔
اِک دُھپّ لگے مر جائیں	اگر تجھے گرمی لگ گئی تو تیری جان نکل جائے گی۔
بھینے نی! توں رہ گھرے	اپنے گھر میں ہی رہ بہن۔
رہ گھر سستوجی دے کول نی	اپنی ساس کے پاس رہ۔
بھینے! رہ گھرے	بہن! اپنے گھر میں ہی رہ!
ویرا! نمیاں بناواں میں چھتریاں	بہن۔ بھائی! میں نئی چھتریاں بناؤں گی۔
چندا! نمیاں بناواں میں چھتریاں	چاند بھائی! میں نئی چھتریاں بناؤں گی۔
اپنے ویرے نوں چھاؤں کراں	اپنے بھائی پر میں چھاؤں کر دوں گی۔
ویرا وے توں آ گھرے	میرے ہاں آ جاؤ نا پیارے بھائی!
لے چل ماں پیو دے دیس وے	مجھے والدین کے وطن کو لے چلو
ویرا! آ گھرے	تو میرے ہاں آ جاؤ نا پیارے بھائی!
بھینے! اگے تاں ندیاں ڈونگھیاں	بھائی۔ وطن کے راستے میں گہری ندیاں بہتی ہیں بہن!
بی بی! اگے تاں ندیاں ڈونگھیاں	وطن کے راستے میں گہری ندیاں بہتی ہیں بی بی بہن!
اِک ڈوب لگے مر جائیں	تم ایک بھی غوطہ کھا گئیں تو بس جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی
بھینے نی توں رہ گھرے	اپنے گھر میں ہی رہ بہن!
رہ گھر سستوجی دے کول نی	اپنی ساس کے پاس رہ۔
بھینے! رہ گھرے	اپنے گھر میں ہی رہ بہن!
ویرا! نمیاں بناواں میں بیڑیاں	بہن۔ بھائی! میں نئی نئی کشتیاں بناؤں گی۔
چندا! نمیاں بناواں میں بیڑیاں	چاند بھائی! میں نئی نئی کشتیاں بناؤں گی۔
اپنے ویرے نوں پار لنگھاواں۔	ان کشتیوں پر میں اپنے بھائی کو پار کیا کروں گی۔

ویرا! وے توں آ گھرے		میرے ہاں آجاؤ پیارے بھائی!
لَے چل ماں پیو دے کول وے		مجھے والدین کے وطن کو لے چلو۔
ویرا! آ گھرے		تو میرے ہاں آجاؤ نہ پیارے بھائی!
بھینے! اگے تاں سُولاں ترکھیاں	بھائی۔	بہن آگے وطن کے رستہ میں بڑے تیز کانٹے ہیں۔
بی بی! اگے تاں سُولاں ترکھیاں		بی بی بہن! آگے وطن کے رستہ میں تیز کانٹے ہوتے ہیں۔
اِک سُول چبھے مر جائیں۔		تمہارے ایک بھی کانٹا لگ گیا تو بس تمہاری جان کی خیر نہیں۔
بھینے نی! توں رہ گھرے		اپنے گھر میں ہی رہ بہن!
رہ گھر سستوجی دے کول نی		اپنی ساس کے پاس رہ،
بھینے! رہ گھرے		اپنے گھر میں ہی رہ بہن!
ویرا! نمیاں سلاواں میں جُتیاں	بہن۔	بھائی! میں نئی جوتیاں سلواؤنگی۔
چندا! نمیاں سلاواں میں جُتیاں		چاند بھائی! میں نئی جوتیاں سلواؤں گی۔
مَیں تاں ٹُھمّ ٹُھمّ کردی جاواں		انہیں پہن کر میں ناز و ادا سے چلوں گی۔
ویرا وے! توں آ گھرے		میرے ہاں آجاؤ پیارے بھائی!
لَے چل ماں پیو دے دیس وے		مجھے والدین کے وطن کو لے چلو۔
ویرا! آ گھرے۔		تو میرے ہاں آجاؤ نا پیارے بھائی!
بھینے! اگے تاں کُتّے بھونکدے	بھائی۔	بہن! وطن کے راستہ میں (ہر ایک گاؤں کے نزدیک) کُتّے بھونکتے ہیں
بی بی! اگے تاں کُتّے بھونکدے		بی بی بہن! وطن کے رستہ میں کُتّے بھونکتے ہیں۔
اِک دند لگے مر جائیں		تمہیں ایک بھی دانت لگ گیا تو تم مر جاؤ گی۔
بھینے نی! توں رہ گھرے		اپنے گھر میں ہی رہ بہن!
رہ گھر سستوجی دے کول نی		اپنی ساس کے پاس رہ۔
بھینے! رہ گھرے		اپنے گھر میں ہی رہ بہن!
ویرا! مٹھیاں پکاواں میں روٹیاں	بہن۔	بھائی! میں میٹھی روٹیاں پکاؤں گی۔
چندا! مٹھیاں پکاواں میں روٹیاں		چاند بھائی! میں میٹھی روٹیاں پکاؤں گی۔

ئیں تاں ٹُک ٹُک پاوندی جاواں	ان روٹیوں کے ٹکڑے میں کتوں کے سامنے ڈالتی چلوں گی۔
ویرا وے توں آ گھرے	میرے ہاں آ جاؤ نا پیارے بھائی!
لَے چل ماں پیو دے دیس وے	مجھے والدین کے وطن کو لے چلو
ویرا! آ گھرے	تو میرے ہاں آ جاؤ نا بھائی!
بھینے! اگے تاں بھابو لڑاکڑی	بھائی۔ میری بہن تمہاری بھاوج بڑی جھگڑالو ہے۔
بی بی! اگے تاں بھابو لڑاکڑی	بی بی بہن! میرے ہاں تمہاری بھاوج بڑی جھگڑالو ہے۔
اِک بول لگے مر جائیں	تمہیں اُس نے ایک بھی طعنہ مار دیا تو تم مر جاؤ گی۔
بھینے نی توں رہ گھرے	اپنے گھر میں ہی رہ بہن۔
رہ گھر سسّو جی دے کول نی	اپنی ساس کے پاس رہ
بھینے! رہ گھرے	اپنے گھر میں ہی رہ بہن،
ویرا! کُچھڑ لوانگی گیگڑا	بہن۔ بھائی! میں ننھے بچے کو گود میں لے لوں گی
چندا! کُچھڑ لوانگی بھتیجڑا	چاند بھائی! اپنے ننھے بھتیجے کو میں گود میں لے لوں گی
لوری گاواں تے چوہل کراں	لوری گاؤں گی اور اُس بچے سے چہل پہل کر کھیلوں گی۔
ویرا وے! توں آ گھرے	میرے ہاں آ جاؤ نا بھائی،
لَے چل ماں پیو دے دیس وے	مجھے والدین کے وطن کو لے چلو۔
ویرا! آ گھرے	تو میرے ہاں آ جاؤ نا بھائی!

عورت محبت کرنے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہے۔ ماں کی شکل میں وہ اپنی اولاد کے ساتھ باپ سے کہیں زیادہ محبت کرتی ہے، بیوی کی شکل میں ہوتی ہے تو اُس کی محبت اُس کے شوہر سے کہیں آگے نکل جاتی ہے۔ بہن کی شکل میں وہ اپنے بھائی سے بازی لے جاتی ہے۔ یہ گیت بہن کے پیار کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ بھائی نے بہت بہانے بنائے، بہن کو موت تک کا خوف دلایا مگر بہن نے ہر ایک بات کا حل بتا دیا۔ پتہ نہیں اتنے سوال جواب کے بعد بھی بھائی اپنی بہن کو اپنے ساتھ لے گیا یا نہیں۔ بھائی نے سوچا ہوگا کہ اُس کا آخری بہانہ بہن کو لاجواب کر دے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ بہن انسانی فطرت کا مطالعہ کر چکی تھی۔ اُس نے کہا کہ بھاوج کتنی ہی جھگڑالو اور گرم طبیعت کی کیوں نہ ہو، اگر ہم اُس کی گودی کے لال سے پیار کریں تو وہ جھٹ ہم پر مہربان ہو

جائے گی۔

چندی سے میں نے یہ گیت کئی بار سنا ہے۔ جی چاہتا ہے بار بار یہی گیت سُنے جاؤں۔ چندی سے میں نے اس گیت کی طرز بھی سیکھ لی ہے مگر اسے خود گانے میں مجھے ابھی وہ لُطف نہیں آتا جو چندی کی زبانی سننے میں آتا ہے۔

جب بھائی بہن کے ہاں آتا ہے، بہن کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں ہنستی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا دل چھاتی سے نکل کر اُس کی آنکھوں میں آبیٹھا ہے۔ اس خوشی میں آنکھوں سے چار آنسو بھی ٹپک پڑتے ہیں۔ اس موقع پر کتنے ہی گیتوں کا جنم ہوتا ہے۔

اُبل اُبل ولٹوہیئے نی! لپّ چولاں دی پاواں	اُبل اے گڑوے! اُبل۔ لپّ بھر چاول ڈالے دیتی ہُوں میں۔
جے وِیر ڈِٹھا آوندا، لپّ ہور وی پاواں	مَیں نے اپنے بھائی کو آتے دیکھ لیا ہے۔ لپ بھر چاول (اس گڑوے میں) اور ڈال دیتی ہوں
جے وِیر آیا رَوڑے، روڑے ہُونج سٹاواں	میرا بھائی گاؤں کے نزدیک آگیا ہے میں راہ سے اینٹ پتھروں کے ٹکڑے صاف کرائے دیتی ہوں
جے وِیر آیا گلیاں، پٹ دریائیاں بچھاواں	میرا بھائی گلیوں میں آگیا ہے، وہاں میں ریشمی کپڑے بچھوا دیتی ہوں۔
جے وِیر آیا وہیڑے، رتّا پلنگ ڈہاواں،	بھائی آنگن میں آتا ہے۔ میں اُس کے لئے سُرخ پلنگ ڈلوا دیتی ہوں۔
جے وِیر منگے پانی، بُوری مجّھ چُوآواں	بھائی پانی مانگے تو مَیں اُس کے لئے بُوری (بھُورے رنگ کی) بھینس کا دودھ دوہ دوں
جے وِیر منگے روٹی، گِری چھوہارا کِھلاواں	بھائی روٹی مانگے تو میں اُسے بادام کا مغز، اور چھوہارے کھلاؤں۔
جے وِیر بیٹھا چَونکے بھانڈیاں رِشماں چھڈیاں	بھائی رسوئی میں آیا تو برتن (اس خوشی میں) چمک اُٹھے۔
جے وِیر اندر وڑیا، دِیوا لٹ لٹ بلیا	بھائی کمرے میں داخل ہُوا تو (اِس خوشی میں) چراغ کی روشنی تیز ہوگئی۔
جے وِیر چڑھیا کوٹھے، بالا چند بھی چڑھیا	بھائی چھت پر چڑھا تو (اِس خوشی میں) آسمان پر دوج کا چاند نمودار ہُوا۔

سُسرال میں کسی لڑکی کی اُنگلی کٹ گئی ہے۔ بھائی کی خاطر تواضع میں وہ خوشی خوشی مصروف ہے۔ وہ اپنے بھائی کے دوستوں کو بھی خوب کھلاتی پلاتی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد بھائی نے اپنی بہن سے پوچھا کہ وہ اُس کے لئے کیا کر سکتا ہے بہن نے کہا کہ وہ ہر طرح سے خوش ہے مگر اُسے صرف ایک ہی گِلہ ہے اور وہ یہ کہ اُس کا بھائی اُسے بہت دیر سے ملنے آتا ہے۔ ایک گیت میں یہ مضمون باندھا گیا ہے:-

میری اُنگلی چیری نی، کوئی دسّو دارو؛	میری اُنگلی کٹ گئی ہے۔ کوئی سہیلی بتائے کہ یہ زخم کیوں کر اچھا ہو؛
ویر آوندا جو سُنیا، اُنگلی ہچھی ہوئی۔	میں نے سُنا کہ میرا بھائی آرہا ہے۔ میری اُنگلی اچھی ہوگئی۔

وِیرا کنک منگاؤنی آں سٹھ من	بھائی! میں ساٹھ من گندم منگوا لیتی ہوں۔
وِیرا بیہن کراؤنی آں موتیاں ورگا	بھائی! اس گندم کو میں موتیوں کی طرح صاف کراتی ہوں۔
وِیرا آٹا پہانی آں سُرمے ورگا	بھائی! میں سُرمے کی طرح باریک آٹا پسواتی ہوں۔
وِیرا آٹا گُنہاؤنی آں ملائی ورگا۔	بھائی! میں ملائی کا سا نرم آٹا گندھواتی ہوں۔
وِیرا پیڑے کراؤنی آں آڑواں جیڈے	بھائی! میں آڑوؤں جیسے پیڑے کر رہی ہوں۔
وِیرا پُچی تلاواں وے کوئی تھال جیڈی	بھائی! میں تھال جیسی (بڑی) لچیاں تل رہی ہوں۔
سدّو سہیلیونی! وِیر روٹی کھاوے۔	اے سہیلیو! میرے بھائی کو کھانا کھانے کے لئے بُلا لاؤ۔
وِیر کھان آیا نال سٹھ جنے۔	بھائی کھانا کھانے کے لئے آیا۔ اُس کے ساتھ ساٹھ دوست تھے۔
وِیر کھائے اُٹھیا۔ "کُجھ منگ بھینے!"	بھائی کھانا کھا کر اُٹھا تو بولا "بہن! کچھ مانگ"۔
"وِیرا! سب کجھ بتھیرا اوے وچھوڑا مندا"۔	بہن بولی۔ "میرے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ صرف تمہارا اتنی دیر سے ملنا ہی دو بھر ہے"۔

پچھلے سال میں اپنے گاؤں گیا تو چندی سے مِل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بولی ــ "مجھ سے تم گیت سُن لیتے ہو۔ کبھی مجھے بھی کوئی نیا گیت سنایا کرو۔ ایک تو ہم ملتے ہی بہت شاذ ہیں۔ مَیں یہاں میکے آتی ہوں تو تم یہاں نہیں ہوتے۔ پتہ نہیں تم کس کلکتہ یا بمبئی کی سیر میں مصروف ہوتے ہو تب؟" میں نے کہا ــ "گا کر سناؤں یا صرف بول کر ہی؟" چندی تیز آواز میں بول اُٹھی "بول کر سنانے کا کیا مطلب؟ گا کر سناؤ گا کر"۔

مَیں نے گیت شروع کر دیا:ــ

محلاں دے تھلے تھلے جاندیا	**بہن۔** اے محلوں کے نیچے نیچے جانے والے!
وے میریا راجیا وِیرا!	اے میرے راجہ بھائی!
بھیناں نُوں مِل گھر جا وے رام۔	پہلے اپنی بہن سے مِل لو، پھر گھر چلے جانا
سبھناں بھیناں دے وِیر مِل مِل جاندے	سب بہنوں کے بھائی مِل کر گھر جاتے ہیں۔
وے میریا راجیا وِیرا!	اے میرے راجہ بھائی!
مَیں پردیسن بیٹھی دُور وے رام۔	ایک مَیں ہی ایسی پردیسن ہوں جو اپنے وطن سے اتنی دُور بیٹھی ہوں۔
اُٹھ کے کنڈڑا کھول دے	**بھائی۔** اُٹھ کر دروازے کی کُنڈی کھول دے۔

نی میریئے رانیئے بھینیے!		اے میری رانی بہن!
باہر کھڑا تیرا ویرا وے رام!		باہر تمہارا پیارا بھائی کھڑا ہے۔
سس دا دتڑا نہ کھلّے،	بہن۔	یہ سانکل تو میری ساس نے لگا رکھی ہے (میں) اسے کیسے کھول سکتی ہوں؟)
وے میریا راجیا ویرا!		اے میرے راجہ بھائی!
کندھ ٹپتے گھر آؤ وے رام!		تم دیوار پھاند کر اندر آسکتے ہو۔
کندھاں تاں ٹپدے چور	بھائی۔	دیوار پھاندنا تو چوروں کا کام ٹھہرا۔
نی میریئے رانیئے بھینیے!		اے میری رانی بہن!
میں تے بھیناں دا ویر وے رام!		میں تو اپنی بہن کا بھائی ہوں۔

ایک گیت سُنا کر چندی سے چھٹکارا مشکل تھا۔ میں نے ایک اَور گیت شروع کر دیا۔

آؤ وے ویرا! چڑھیئے اُچڑی ماڑی	بہن۔	آ بھائی ہم اونچی منزل پر چڑھیں۔
میرے کاہن اُساری		یہ منزل میرے شوہر نے بنوائی ہے۔
دے میری ماں نوں سنیہڑے رام۔		وہاں بیٹھ کر میری ماں کا پیغام دینا۔
ماں تاں تیری بھیناں پلنگے بٹھائی	بھائی۔	اے بہن! تیری ماں کو تو میں نے پلنگ پر بٹھایا ہے۔
پلنگوں پیہڑے بٹھائی		پلنگ سے اُترتی ہے تو وہ پیہڑے پر بیٹھ جاتی ہے۔
ہتھ اٹیرن رنگلی رام۔		ہاتھ میں رنگین "اٹیرن" لئے ہوئے وہ اپنے کام میں مشغول رہتی ہے۔
آؤ وے ویرا! چڑھیئے اُچڑی ماڑی	بہن۔	آ بھائی! ہم اُونچی منزل پر چڑھیں
میرے کاہن اُساری		یہ منزل میرے شوہر نے بنوائی ہے۔
دے میری بھابو دے سنیہڑے رام!		وہاں بیٹھ کر میری بھاوج کا پیغام دینا۔
بھابو تاں تیری بی بی گیگڑا جایا	بھائی۔	تیری بھاوج کے بچہ ہوا ہے بہن!
نی بھتیجڑا جایا		اُس کا بچہ تیرا بھتیجا ہوا نا۔
اُٹھدی بہندی دیندی لوریاں رام!		اُٹھتی بیٹھتی وہ اس بچہ کو لوریاں سناتی رہتی ہے۔
آؤ وے ویرا! چڑھیئے اُچڑی ماڑی	بہن۔	آ بھائی! ہم اُونچی منزل پر چڑھ جائیں۔
وے میرے کاہن اُساری		یہ منزل میرے شوہر نے بنوائی ہے۔

دے میرہاں سئیاں نے سنیہڑے رام		وہاں بیٹھ کر میری سہیلیوں کے پیغام دینا۔
سئیاں تاں تیریاں بھینے! چھوپڑے پائے۔	بھائی	تیری سہیلیوں نے تو مل کر کاتنا شروع کر دیا ہے۔
ویہڑے چرخڑے ڈاہے		آنگن میں اُن کے چرخے ہیں۔
تونہیوں پردیس بیٹھی دُور نی رام		تم ہی یہاں (وطن سے دُور) پردیس میں بیٹھی ہو۔
چل وے ویرا چلئیے ماں دے کول	بہن	چل بھائی ماں کے پاس چلیں۔
بھیناں بھابیاں دے کول		چل مجھے میری بہن اور بھاوج کے پاس لے چل۔
چک بھتیجا لوری گاواں گی رام		میں اپنے بھتیجے کو گود میں لوں گی اور اُسے لوریاں سناؤں گی۔

میں نے یہ گیت ختم کیا تو دیکھا کہ چندی مسکرا رہی ہے۔ اُسے یہ دونوں گیت بہت پسند آئے تھے۔ اُس نے یہ گیت جھٹ سیکھ بھی لئے۔ نئے گیت سیکھنے میں تو میں اُس کا کیا مقابلہ کر سکتا ہوں۔

جب بھی چندی گیت گاتی ہے وہ علمِ موسیقی کے ماہروں کی طرح اپنے گلے سے کُشتی نہیں لڑتی مگر اُس کے گیتوں کی سادہ تانیں بہن کے جذبات و احساسات کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتیں۔ وہ اِن گیتوں کی تنقید نہیں کر سکتی۔ اُسے تنقید کی ضرورت بھی کیا پڑ سکتی ہے؛ وہ صرف گا سکتی ہے اور شعر و نغمہ سے اُسے رس ملتا ہے۔ کئی نقّاد شاید یہی کہیں گے کہ ہم اِن گیتوں میں جو کچھ خود ڈال سکیں وہی ان سے باہر نکال سکتے ہیں۔ چندی میں یہ لیاقت نہیں، وہ بہن ہے اور بہن کی حیثیت سے ان گیتوں کا نقادوں سے کہیں زیادہ لُطف اُٹھا لیتی ہے۔ میں نے بھی اُس کے روبرو اِن گیتوں پر بحث کرنے کی آزادی بہت کم لی ہے۔ جب کبھی میں بھول کر گیت کی کسی بات پر بحث کر بیٹھوں تو بے چاری چندی اپنے گیت کا اگلا بند ہی بھول جاتی ہے۔ ایک بار جھنجھلا کر اُس نے کہا تھا — "تم چُپ رہ کر اِن گیتوں کو سُن بھی تو نہیں سکتے؛ ان گیتوں کی انتڑیاں نکالنے کی عادت کہاں سے پڑ گئی تمہیں؛"

چندی شاید یہ نہیں جانتی کہ اب یہ گیت ہماری زندگی میں اپنی زندہ شکل قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ ٹھیک ہے، وہ خود اِن گیتوں کو اپنی ماں سے بھی کہیں زیادہ شوق سے گاتی ہے، مگر کیا اُس کی اپنی بیٹیاں انہیں اسی شوق سے گا سکیں گی؛

دوِندر ستیارتھی

جامِ طہور کا ایک ورق

(۱)

اک مستی و بیخودی ہے اک کیف و سرور
اک جلوۂ جمال ہے اک نغمۂ نور
کس عالمِ بے مثال میں ہوں یارب
ہستی سے بھی ہو رہا ہوں اپنے عالم سے بھی دور

(۲)

تیری ہی بہار رنگ و بو ہے مجھ میں
تیرا ہی جمال کو بکو ہے مجھ میں
مشکل ہے وصال میں بھی تمیزِ من و تو
میں تجھ میں ہوں اور تو ہی تو ہے مجھ میں

(۳)

گنجینۂ بے بہا ہے پنہاں مجھ میں
خمخانۂ لا فنا ہے پنہاں مجھ میں
آئینۂ دل میں ہیں خدا کے جلوے
کیا تجھ سے کہوں کہ کیا کیا ہے نہاں مجھ میں

(۴)

یارب ترے در پہ سر جھکایا ہم نے
دل تیری ہی ذات سے لگایا ہم نے
پاؤں میں پڑے ہوئے ہیں اسکندر و جم
کونین کی سلطنت کو پایا ہم نے

اثر صہبائی

"جامِ طہور" کا تعارف ہم اس سے پیشتر کرا چکے ہیں۔ حضرت اثر صہبائی کا یہ مجموعۂ رباعیات تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور شائع کر رہی ہے۔ کتاب طبع ہو رہی ہے۔ "ہمایوں"

آہ یہی دستورِ جہاں کا

مکرمی! سلام مع الاکرام

جون کے "ہمایوں" نے تو کلیجے کے ٹکڑے کر دیئے۔ وائے سخت جانی! بالیقین مانئے اب تک مجھے یہی مغالطہ تھا کہ پہلے میں مروں گا اور منصور کے دل کو دُکھاؤں گا۔ لیکن دُنیا بُری طرح زک دیتی ہے۔ کاش یہ پرچہ راستے ہی میں گم ہو جاتا۔ اب اس دُنیا سے کیا آرزو کی جائے۔ آہ۔ کسی نے جل کے کہا ہے ؎

طفلی و پیری، جوانی، دیکھ لی — تین دن کی زندگانی دیکھ لی
اب زمیں کا پیار باقی ہے نجیب — آسماں کی مہربانی دیکھ لی

ان پھوٹی آنکھوں کو بھی اسی وقت دُکھنا تھا۔ آشوبِ چشم میں مبتلا ہوں مفصّل خط پھر لکھوں گا۔ چند اشعار ساتھ ملفوف ہیں۔ جی چاہے تو شائع کیجیے گا۔ افسوس!

حرماں نصیب
مقبول

۱ ہو کے جُدا احباب سے رخصت تُم بھی ہوئے منصور
۲ آہ یہی دستورِ جہاں کا، آہ یہی دستور
۳ خیر خدا کی جو مرضی ہو، وہی ہمیں منظور
۴ ہم تو ابھی خاکی پیکر ہیں، تم ہو شعلۂ نُور
۵ شرطِ مروّت یہ تو نہیں، تم پاس رہو ہم دُور
۶ آہ یہی دستورِ جہاں کا!

۷ جتنی ہی دیر رہیں دُنیا میں، اُتنے ہی ہم مجبور
۸ جتنی ہی جلد یہاں سے چھوٹیں، اُتنا ہی دل مسرور
۹ آہ کوئی شے بھی ہو دُنیا، جس سے ہو دل رنجور
۱۰ یہ تو ہے اک معمولی مکتب، گھر تو ہے اپنا دُور
۱۱ چھوڑ کے ہم سب کو رنجیدہ، تم بھی گئے منصور
۱۲ آہ یہی دستورِ جہاں کا!

مقبول احمد پوری

سماج سے بغاوت

چندی چرن کا خاندان اپنے افراد کا نامناسب نام رکھنے میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ گو صرف تیس روپے ماہوار کا کلرک تھا مگر وہ اپنے بیٹے کو کوبر (دولت کا دیوتا) کہہ کر پکارتا تھا۔ شاید وہ اس ترکیب سے دیوتا کو پھسلانا چاہتا تھا۔ لیکن کوبر اپنے نام کے باوجود باپ ہی کی طرح غریب رہا۔ اُس کے لئے نام صرف نام ہی کی حد تک خوشگوار تھا اور کسی نہ کسی طرح گزر اوقات کر لینے پر وہ قانع تھا۔

لیکن وہ بھاری بھرکم نام رکھنے کی لذت سے اب بھی دست بردار نہیں ہوا۔ اس لئے جب کچھ بیٹوں کے بعد اُس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو اس نے فوراً اس بچی کا نام اِندرانی (بہشت کی ملکہ) رکھ دیا۔ پڑوس کی عورتوں نے اس کی اس پسند کو سراہا۔ ایک بولی "بہت بھلا نام ہے۔ خدا کرے بچی کی قسمت اس کے نام کی طرح ہو۔"

دوسری نے کہا "ہر شخص کی قسمت دیوتا کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن لڑکی بے حد خوبصورت ہے۔ اندرانی کا نام اس کے لئے بالکل موزوں ہے۔ کوئی بھی اسے ایک غریب بنگالی کی بیٹی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ بالکل میم معلوم ہوتی ہے۔"

بچی بے شک بڑی پیاری تھی۔ اس کے والدین نے اطمینان کا سانس لیا۔ انہوں نے دل میں سوچا "کچھ پروا نہیں اگر نوزائیدہ صرف ایک لڑکی ہے۔ اس شکل وصورت پر بیاہ آسانی سے ہو سکے گا۔ کبھی بیٹی باپ کے لئے بھاگوان بھی ہوتی ہے۔"

جب اندرانی کچھ سیانی ہوئی، اس کے ایک بھائی نے اس کی خبر گیری شروع کی، اور اُسے بہلانے کے لئے اِدھر اُدھر لے جانا شروع کیا۔ اِندرانی کی ماں کے پانچ بیٹے یکے بعد دیگرے ہوئے لیکن اب صرف دو بقیدِ حیات تھے۔ بڑا لڑکا اسکول جاتا تھا اور ننھی اِندرانی کے لئے اس کے پاس وقت نہ تھا۔ چھوٹا لڑکا سنیل پانچ سال کا تھا اور ابھی اُسے اسکول سے کوئی واسطہ نہ تھا، اس لئے دایہ کا کام اُس کے سپرد کیا گیا۔ اگرچہ وہ اس خدمت کو بہ حسن وخوبی انجام نہیں دے سکتا تھا اور اکثر بچی کو گھاس پر بٹھا کر بھاگ جایا کرتا تھا، تاہم وہ غریب اور مصروف ماں کے لئے ایک مددگار تھا۔ بیچاری ماں تمام دن کام میں لگی رہتی اور اسے ایک لمحہ کے لئے بھی فرصت نصیب نہ ہوتی۔ لیکن رات کو جب وہ اپنی بچی کا بھولا اور معصوم مکھڑا دیکھ لیتی تو مختلف خیالات اس کے دماغ میں در آتے۔ "کچھ ہی سال بعد" ماں سوچتی "یہی بچی میرے لئے ایک زبردست مددگار ثابت ہوگی۔"

لڑکی بڑی ہوتی گئی۔ وہ ایک حد تک لاغر تھی مگر اپنے دلاویز حسن میں سونے کی مورت معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنی عمر کے لحاظ سے ذہین بھی بے حد تھی۔ ماں اس پر بڑی نازاں تھی۔ وہ دل میں کہتی "کیا ہوا اگر ہم غریب ہیں۔ کسی راجہ کو بھی ایسی بچی

نصیب نہیں ہوتی۔ گلی کے اُس طرف دتس والوں کو دیکھو، دولت کی ریل پیل ہے، مگر ان کے بچے کتنے بدشکل ہیں! ان کی بیٹی گلپھڑے وار مینڈک معلوم ہوتی ہے۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ وہ لباس بہت اعلےٰ پہنتی ہے، وہ سوائے کمخواب، مخمل اور چکن کے کچھ زیب بدن کرتی ہی نہیں۔ وہ کبھی پیدل نہیں چلتی۔ اس کی اپنی گاڑی ہے اور ایک دربان اور خادمہ مصاحبت کے لئے بھی ہیں۔ لیکن مَیں اپنی لاڈلی کے لئے اب تک ایک نیا فراک یا ایک جُوتا خریدنے کے قابل بھی نہیں ہوئی، لیکن پھر بھی بھرے مجمع میں جس کی نظر پڑتی ہے، اِسی پر۔"

اِندرانی بڑی شوخ اور شریر تھی۔ اُس سے کبھی نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا۔ اس قصور پر اسے سخت سُست بھی سننا پڑتا تھا اور کبھی دو چار طمانچے بھی لگ جاتے تھے۔ "شریف گھرانے کی لڑکی کی ایسی خصلت! جب شادی ہوگی تو ساس کی جوتیاں نصیب میں ہوں گی۔ عورت ذات ہو کر ایسی شوخی!" ایسے ہی الفاظ کی اس پر بوچھاڑ ہوتی۔ لیکن اس کی جوشیلی طبیعت کو کوئی روک نہ سکا۔ کوسنے اور سخت سُست وہ ایک کان سے سنتی اور دوسرے کان سے اُڑا دیتی۔ اس کے بھائی اور اُن کے دوست اس کے دوست بھی تھے۔ وہ ان کے ساتھ فٹ بال اور کرکٹ بھی کھیلتی، بانس کا لگا لے کر کٹے ہوئے پتنگ لوٹنے جاتی اور قریب کے درختوں پر چڑھنے کی مشق کرتی۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ گلی کے اس سرے پر دتس والوں کے ہاں ایک بڑی تقریب تھی۔ شہنائی بج رہی تھی، بجلی کے قمقموں سے سارا مکان جگمگا رہا تھا، اور مہمانوں کی آمد و رفت سے ایک ہنگامہ سا بپا تھا۔ گلی ہر قسم کی گاڑیوں سے بھری تھی۔ وہ بدصورت موٹی لڑکی آج بیاہی جا رہی تھی اور یہ تمام ہنگامۂ نشاط اُسی کے لئے برپا ہو رہا تھا۔ اندرانی کی ماں نے یہ ساری چیزیں رشک بھری نگاہوں سے دیکھیں اور پھر افسردگی سے آگے بڑھ گئی۔ لڑکی کا باپ بے حساب روپے خرچ کر رہا تھا، اس نے دس ہزار کی ہنڈی صرف ایک انگلینڈ پلٹ دولہا کے لئے چکائی تھی۔ لڑکی زیورات سے لدی ہوئی تھی۔ لیکن غریب اندرانی! وہ بھی بیاہے جانے کے قابل ہوگئی تھی، اگرچہ اُس کے والدین مشکل ہی سے اس بات کا اقرار کرنے کے لئے تیار ہوتے۔ وہ اس کی عمر دس سال بتاتے تھے۔ لیکن وہ عرصہ سے اس جگہ رہتے تھے اور تقریباً سبھی نے اندرانی کو بچپن میں دیکھا تھا اس لئے انہیں فریب دینا مشکل تھا۔

سنل آخر تک کاہل رہا۔ اس کی آواز گانے کے لئے بہت مناسب تھی۔ اس لئے قرب و جوار کے ہر تھیٹر اور موسیقی کلب میں اس کی مانگ تھی۔ وہ باپ سے بے حد خوفزدہ رہتا اور جہاں تک ہو سکتا تھا اُس کی موجودگی میں آنے سے احتراز کرتا تھا۔ جب اس کا باپ دفتر چلا جاتا وہ ناشتے یا نہانے کے بہلنے مکان آتا اُس کی ماں اُسے کوستی اور جھاڑو پکڑ کے مارنے بھی دوڑتی۔ لیکن ان باتوں کے باوجود وہ اس کے لئے کھانا چنتی۔ سنل اپنی ماں کے تمام کوسنوں کو اپنا روز کا معمول سمجھ لیتا اور جب وہ گھر

سے باہر آتا تو سب باتیں بھول جاتا۔

اِندرانی پڑھ اور لکھ سکتی تھی۔ اس نے اپنے پتا سے تھوڑی سی تاریخ اور جغرافیہ بھی پڑھ لیا تھا۔ کوبر اپنی بیٹی کے پڑھانے میں زیادہ محنت نہیں کرتا تھا مگر جب وہ کوئی سوال کرتی یا کوئی مضمون اصلاح کے لئے دیتی تو وہ انکار بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ پچاس سال کی عمر ہی میں فکر سے چور اور سن رسیدہ معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کی جدّوجہد اسے بے حد گراں گزرتی تھی اور اُس میں کسی طرح کا جوش باقی نہ رہ گیا تھا۔ اسے کسی نہ کسی طرح دفتر کا کام کرنا اور گھر کے خرچ کو پورا کرنا ہوتا تھا۔ مگر اُسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بڑے لڑکے کو پڑھنے کا شوق تھا لیکن محض روپے کی تنگی کی وجہ سے اُسے یونیورسٹی کی تعلیم کی تمام اُمیدوں کو خیرباد کہہ دینا پڑی۔ اور وہ ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے ایک تاجر کی دوکان پر نوکر ہو گیا۔ کوبر کو کبھی یہ توقع نہ تھی کہ وہ لڑکا اُس کے کبھی کسی کام آئے گا، اُسے اِس وقت اِندرانی کے سوا کسی چیز کی فکر نہ تھی۔ عالمِ خواب میں بھی وہ اس کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

اُس صبح، اِندرانی اپنے باپ کے قریب کتاب لے کر بیٹھی ہی تھی کہ اس کی ماں بھی وہاں پہنچ گئی اور بولی "جاؤ، باورچی خانے میں چاول چولہے پر رکھے ہیں، دیکھو اِن کا کیا حال ہے۔ تم ہمیشہ سے کام چور ہو، تمہیں پکانا آخر کب آئے گا؟ جب دیکھو کتاب لئے بیٹھی ہے۔ بڑی ادیب بنی ہے۔ ایم، اے پاس کر لے گی گویا؟"

اندرانی کو مجبوراً اُٹھ کر جانا پڑا۔ اس کی ماں اپنے شوہر کے قریب ہو بیٹھی اور بولی "اس کی شادی کا کب بندوبست کرو گے۔ لکھنا پڑھنا سب ٹھیک ہے لیکن اس سے مطلب حل نہیں ہو گا؟"

کوبر نے چیں بجبیں ہو کر کہا "لیکن شور مچانے سے بھی کام نہیں ہو جائے گا۔ مَیں اس کے بَر کی تلاش میں ہوں، مگر ایک غریب شخص ایک لمحہ کی فکر سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتا۔"

اس کی بیوی نے پھر کہا "لیکن کیا کوئی نوجوان تمہارے ذہن میں نہیں ہے؟ تم سے تو کوئی کچھ نہیں کہتا لیکن ہمسائے سوالوں کی بھرمار سے میرا جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ لڑکی جوان نہیں بلکہ بوڑھی ہوتی جا رہی ہے۔ اب وہ تقریباً پندرہ سال کی ہو گی۔"

اس کے شوہر نے رنجیدہ ہو کر کہا "تمہیں اتنا چیخنے کی ضرورت نہیں، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ سولہ سال کی ہے پندرہ کی نہیں۔ میں دو یا تین خاندانوں سے "بات چیت" کر رہا ہوں۔ مگر کامیابی کی اُمید موہوم ہے۔ ان لوگوں کا مطالبہ[1] بے حد زیادہ ہے۔"

اس کی بیوی نے کہا "یہ سچ ہے کہ ہم غریب ہیں لیکن ہماری اِندرانی ایک بادشاہ کی ملکہ بننے کے لائق ہے۔ کیا لوگ اس کا خیال نہ کریں گے؟"

[1] بنگال میں لڑکی والوں کو لڑکے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

اس کا شوہر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "میری پیاری، حسن کی قدر نہیں۔ ایک معمولی گریجوایٹ پانچ ہزار طلب کرے گا۔ وہ حسن نہیں، زر چاہتے ہیں۔ ہم انہیں برا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ جب ہم اپنے بیٹوں کی شادی رچائیں گے تو ہم بھی روپے ہی کے خواہاں ہوں گے۔"

اس کی بیوی بولی "ہم لوگ اس قدر مفلس ہیں کہ کوئی آرزو نہیں کر سکتے۔ لیکن ہر شخص ایک ہی کشتی پر سوار نہیں ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں، جو خوبصورت بیوی پسند کرتے ہیں۔"

اس کا شوہر بولا "اوسط درجے کے خاندانوں میں نہیں، بڑے بڑے امرا یا راجاؤں کے ہاں ایسا ممکن ہو سکتا ہے کیونکہ انہیں اپنے فرزند فروخت کرنے نہیں ہیں۔ ایک اور جماعت بھی ہے جو حسین بیویوں کو چاہتی ہے۔ یہ بچوں والے رنڈوے ہیں۔ وہ کم عمر لڑکی چاہتے ہیں اور ہو سکے تو اچھی صورت والی بھی۔ اگر تم ایسا دولہا اس کے لئے پسند کرتی ہو تو میں آسانی سے ان میں سے ایک کا انتخاب کر سکتا ہوں، کوئی رقم درکار نہیں ہو گی۔"

اس کی بیوی بے چارگی سے بولی "نہیں نہیں، میں اس کی مسرتوں کا ہمیشہ کے لئے گلا گھونٹنا نہیں چاہتی۔ پہلے دوسری جگہ قسمت آزما دیکھو۔"

کوبر بولا "میں اس کے لئے کوشش تو کر رہا ہوں۔ لیکن اس کے چھیڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے عقدہ حل نہ ہو گا۔ جاؤ اندرانی کو یہاں بھیج دو۔ اسے کچھ دیر پڑھ لینے دو۔ اگر سنل میں اس سے آدھی ذہانت بھی ہوتی تو مجھے اس سے یوں ہاتھ نہ دھو لینے پڑتے۔"

اس کی بیوی بولی "اسے تو شرم چھو نہیں گئی۔ میں روز اسے سخت سست کہتی اور مارنے بھی دوڑتی ہوں مگر اس کے تو کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔"

کوبر مسکرایا "اس میں شک نہیں کہ تم اسے برا بھلا کہتی ہو، لیکن فوراً ہی تم اسے ناشتہ بھی دے دیتی ہو۔ اس لئے اسے غیرت کیوں آنے لگی۔ تم اسے ایک دو روز کچھ کھانے کے لئے نہ دو، پھر دیکھو اس کی آنکھیں کس طرح کھل جاتی ہیں۔ اسے کام کی قدر معلوم ہو جائے گی۔"

"یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کھاؤں اور میرا بچہ بھوکوں مرے۔ کچھ بھی ہو وہ میرا بیٹا ہے۔" سنل کی ماں یہ الفاظ کہہ کر چل دی۔ اندرانی واپس آئی اور پڑھنے بیٹھ گئی۔ اس کے باپ نے اس کی طرف دیکھا اور آہیں بھر کر اپنے دل میں کہا "بیشک یہ ملکہ بننے کے لائق ہے۔ مگر میں اس موتی کو کیچڑ میں ڈال دینے پر مجبور ہوں۔ غربت ہر جرم سے زیادہ سنگین ہے۔"

"تمہیں خبر ہے ابا! لوگ یہاں لڑکیوں کا اسکول کھولنے والے ہیں؟"

اس کے باپ نے جو اپنے گرد وپیش سے بالکل لاعلم رہتا تھا، پوچھا "کیا واقعی، کون اس کی بنیاد رکھے گا؟"

اندرانی نے کہا "کوئی دولت مند بیوہ خاتون، وہ بے اولاد ہے اس لئے اپنا تمام سرمایہ رفاہِ عام میں دے رہی ہے بہت سی لڑکیاں مفت تعلیم حاصل کریں گی۔ کیا میں بھی داخل ہو جاؤں، ابا؟"

اس کا باپ بولا "خیر، مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن پہلے اپنی ماتا سے پوچھ لو، ورنہ وہ خفا ہو جائیں گی۔"

اندرانی کی ماں سچ مچ بے حد خفا ہوئی۔ اگرچہ وہ اندرانی کو کام چور اور کاہل کہتی تھی پھر بھی لڑکی گھر کا بہت سا کام کرتی تھی۔ اُس کی موجودگی غریب ماں کے لئے ایک بہت بڑا سہارا تھی۔ لڑکی کو تعلیم سے کیا غرض؟ پھر، وہ جوان بھی ہو گئی تھی اور اُسے اپنی مرضی سے تنہا جانے دینا بہت بُرا تھا۔ اس طرح لوگوں کو گفتگو کا ایک موقع ہاتھ آجائے گا۔

کوبر گھریلو جھگڑوں میں بہت کم پڑتا تھا۔ لیکن اس دفعہ وہ اپنی بیٹی کا ہم خیال تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا "تم نہیں سمجھتیں۔ یہ اچھا ہے کہ وہ باہر جائے اور لوگوں سے راہ و رسم پیدا کرے۔ ممکن ہے کوئی لائق نوجوان اس کو بہ نظرِ پسندیدگی دیکھے، جو ہمارے لئے ایک رحمت ثابت ہوگی۔ میں نے ایسے واقعات مشاہدہ کئے ہیں۔ اُسے جانے دو۔"

اس طرح اندرانی کو اسکول جانے کی اجازت مِل گئی تاکہ وہ اپنے لئے ایک مناسب بَر تلاش کرے۔ تعلیم سے اس کے والدین کو کوئی خاص غرض نہ تھی۔ یہ لڑکی کے لئے قسمت آزمائی کا ایک ذریعہ تھا۔ گو اندرانی کو کوئی فیس نہیں دینی پڑتی تھی۔ پھر بھی اُسے صاف ستھرا رہنا پڑتا تھا اور کتابیں بھی خریدنی ہوتی تھیں۔ ماں رو کر کہتی "مَیں کہاں سے اس کے لئے روز نیا لباس اور چیزیں لاؤں۔ تم چاہتے ہو کہ تمہاری صاحبزادی میم صاحب بن جائیں لیکن تمہاری جیب خالی ہے۔"

کوبر ہنسا "سمجھ لو کہ یہ سب اس کی شادی پر خرچ ہو رہا ہے، اگر تم وقت پر دس روپے خرچ کرو تو ہزار بچا سکتی ہو۔"

اس طرح کچھ کم قیمت کپڑے کسی طرح مہیا کر لئے گئے۔ کوبر نے کچھ چیزیں اُدھار خرید لیں۔ اس شرط پر کہ تنخواہ ملتے ہی ادا کر دے گا۔

اندرانی کے لئے یہ چیزیں ایک دولت تھیں۔ اُس نے اِن چیزوں کو بہت بیش قیمت سمجھا اور بہ حفاظت اپنے چھوٹے سے بکس میں مقفل کر دیا۔ اس نے کتابیں اور دیگر چیزیں اپنی پڑوسن سے مانگ کر لیں اور اسکول جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ کوبر اس کو داخل کرانے اس کے ساتھ گیا۔

اندرانی مارے خوشی کے ہوا میں اُڑتی معلوم ہوتی تھی۔ اندرانی کی ماں کھڑکی سے اُن کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بیٹی کے حُسن سے تنگ و کثیف گلی بھی روشن دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دیوتاؤں سے دُعا کی کہ کوئی مناسب شخص اس کی بیٹی سے محبت کرنے لگے اور اس طرح اس کی زندگی کو مسرور بنا دے۔

لیکن اندرانی کسی اور خیال میں محو تھی۔ وہ اعلےٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ اپنے بھائیوں سے برابری سے بول سکے۔ اُنہیں اُس کی ذہانت کی کمی کا یقین تھا۔ اور وہ عورتوں کے متعلق حقارت سے گفتگو کرتے تھے۔ اس سے اندرانی کو چڑھ تھی۔ وہ ثابت کر دینا چاہتی تھی کہ ایک لڑکی ان جیسی بلکہ اُن سے بڑھ کر ہو سکتی ہے۔ سنل نے ایک فلم اسٹڈیو میں نوکری کرلی تھی اور وہ تقریباً ہر روز مصور کتابیں اور رسالے لایا کرتا تھا۔ اندرانی ان کا مطالعہ کرنا چاہتی تھی مگر اُسے انگریزی نہیں آتی تھی۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ اسکول میں جلد ہی انگریزی سیکھ لے گی۔ اسے شادی کی بالکل فکر نہ تھی۔ اس نے بہت سی شادی شدہ عورتوں کو اپنے اردگرد دیکھا تھا اور سب ہی بچوں اور کام کی زیادتی سے فکرمند اور دلگیر معلوم ہوتی تھیں۔ وہ خوش تھی کہ روپے کی تنگی کی وجہ سے اس کی شادی نہ ہو سکی۔ اگر وہ چند سال تنہا رہ سکی تو وہ روپیہ کمانے کے لائق ہو جائے گی اور اپنی اور اپنے والدین کی مدد کر سکے گی۔

اسکول میں اس نے جلد ہی نام پیدا کر لیا۔ ہر شخص اس سے التفات کرنے لگا، اس کے غیر معمولی حسن کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے۔ اُس نے اور لڑکیوں کے بہ نسبت پڑھنے میں زیادہ ترقی کی اور وہ بتدریج اونچے درجوں میں کامیاب ہوتی گئی۔ اس کی ماں اس کی قابلیت پر بڑی نازاں تھی اور لڑکی کی تعلیم کے خلاف جو کچھ اُس کے دل میں کدورتیں تھیں، سب دُور ہو چکی تھیں۔ کبھی کبھی اُسے یہ اُمید بھی ہوتی کہ اس کی لڑکی کالج کے درجوں تک تعلیم حاصل کرلے گی لیکن ہمسائے اس کے لئے زندگی اجیرن کئے دیتے تھے۔ "ایک لڑکی کو اعلیٰ تعلیم کی کوئی حاجت نہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اندرانی کا بیاہ ہو جائے اور وہ گھر بیٹھے۔ اگر اس کی شادی وقت پر ہوتی تو وہ کئی بچوں کی ماں ہوتی۔"

کوبر اپنی بیٹی کے لئے ایک مناسب بر کی تلاش میں اپنی ساری قوتیں صرف کر رہا تھا۔ لیکن ایسی چیزیں بغیر رقم خرچ کئے انجام نہیں پا سکتیں۔ یہ سُنکر کہ لڑکی بڑی موہنی ہے، دو چار نے آ کر دیکھنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آگے چل کر جب انہیں معلوم ہُوا کہ جہیز ملنے کی بہت کم اُمید ہے تو وہ سر و پڑ گئے اور پھر پھٹکے تک نہیں۔ کوبر اور ضعیف اور ناتواں نظر آنے لگا۔ اس کی بیوی کا پارہ اتنا چڑھ گیا کہ سنل بھی روبرو ہونے سے کتراتا تھا۔ وہ بغیر ناشتہ کئے چل دیتا۔ جب کبھی وہ گھر آتا ماں برس پڑتی "تم سؤر کی طرح ہڑپ کرنا جانتے ہو لیکن اپنی بہن کے لئے ایک مناسب شوہر تلاش نہیں کر سکتے؛ میں تمہیں خاک پھانکنے دوں گی! ہم لوگ اس کے بعد ذات سے خارج کر دیئے جائیں گے اور کوئی ہمارے مردہ جسم کو بھی چھونا گوارا نہ کریگا۔"

لیکن سنل فلم کی تیاری میں سرگرم تھا اور گھریلو واقعات میں وقت صرف کرنے کی اُسے فرصت نہ تھی۔ وہ جلد جلد کھانا ختم کرتا اور بڑبڑاتا ہُوا گھر سے روانہ ہو جاتا۔ اندرانی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھی کہ اس کی شادی کسی اچھے گھرانے میں نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ اس کے والدین غریب ہیں۔ یہ اس سے کہیں اچھا ہوتا، اگر وہ اپنا تعلیمی دَور ختم کر سکتی، اور

اس طرح ایک آزاد زندگی گزار سکتی - اگرچہ وہ جانتی تھی کہ شادی اس کے لئے بہت ضروری ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو اس سے آزاد رکھنا چاہتی تھی - ابھی وہ اسکول ہی میں تھی لیکن وہ سوچتی کہ اگر اس کے والدین کچھ اور توقف کرسکیں تو وہ کالج میں داخل ہوسکتی ہے - لیکن وہ خائف تھی کہ اسے ایک عرصہ تک تنہا نہیں رہنے دیا جائے گا -

ایک صبح اندرانی مطالعہ کے لئے بیٹھی ہی تھی کہ اس کی ماں آکر اُسے صلواتیں سنانے لگی " بڑی میم صاحب بنی ہے جب دیکھو پڑھ رہی ہے - میں یہ سارے کام نہیں کرسکتی - جاؤ اور فوراً رکابیاں دھو ڈالو "

اندرانی نے غصہ سے کتاب پھینک دی اور رکابیاں دھونے چلی گئی - وہ نل کے نزدیک بیٹھ کر رکابیوں کو راکھ سے مانجنے لگی ، وہ سارے برتن ٹکڑے ٹکڑے کردینا چاہتی تھی - اسکول میں ایک بھاری انعام کا اعلان ہوا تھا - سالانہ امتحان میں جو سب سے زیادہ نمبر پائے گا اُس کو یہ انعام ملے گا - اندرانی بہ آسانی یہ انعام حاصل کرسکتی تھی اگر اس کی ماں ہر وقت کی روک ٹوک کرنے سے احتراز کرتی - دفعتہً کسی نے عقب سے پکارا -

" کیا سنل بابو گھر پر ہیں ؟ "

اندرانی نے نظر اوپر کی اور ایک اجنبی نوجوان کو سڑک کے دروازے پر کھڑے اپنے بھائی کا نام پکارتے دیکھا - اندرانی اب تک غصہ میں بھری تھی ، وہ تیزی سے بول اُٹھی " سنل بابو یہاں نہیں ہیں - جاؤ اس کے اسٹڈیو میں دریافت کرو "

" میں اسٹڈیو سے آرہا ہوں - وہ وہاں نہیں ہیں ، مگر مجھے اُن کی سخت ضرورت ہے "

اندرانی بولی " تو پھر وہ اپنے موسیقی کلب میں ہوگا - اس کے جانے کی اور کوئی جگہ نہیں ہے "

نوجوان کچھ دیر یونہی کھڑا رہا اور پھر چلا گیا -

اندرانی کی ماں فوراً دالان سے نکل آئی " تم اس طرح ایک اجنبی سے کیوں گفتگو کررہی تھیں ؛ تمہاری حرکتیں بہت ناشائستہ ہیں - ایک نوجوان لڑکی کا یوں بے حجابانہ اور بے تکلفانہ غیر مردوں سے باتیں کرنا اچھا نہیں ہے "

" پھر میں کیا کروں ؛ " اندرانی غصہ سے بولی " اُس نے ایک معمولی بات پوچھی تھی اور جواب دینے والا کوئی تھا نہیں - پھر کیا مجھے دُم دبا کر بھاگ جانا چاہئے تھا ؛ "

اس کی ماں نے کہا " کیسی زبان دراز لڑکی ہے - معلوم ہوتا ہے اسکول میں یہی پڑھایا جاتا ہے - خیر ، جلدی کام ختم کرو کچھ لوگ تمہیں دیکھنے آرہے ہیں "

یہ سُن کر اندرانی کو اس قدر رنج ہوا کہ وہ ایک لفظ بھی نہ بولی - وہ جاکر پھر پڑھنے بیٹھ گئی - کوبر نے اس دن بیماری کی چھٹی لے لی - سنل آیا ہی نہیں - اندرانی بغیر ناشتہ کئے اسکول چلی گئی - اس کا دل بیمار معلوم ہوتا تھا -

شخص کی نیش زنی سے تنگ آکر کوبر نے اندرانی کا بیاہ ایک جگہ طے کرلیا تھا ۔ دولہا بچوں والا رنڈوا تھا ۔ وہ کوبر ہی کے دفتر میں کام کرتا تھا ۔ وہ ایک جوان دُلہن کی تلاش میں تھا جو اس کے بچوں اور گھر کی نگہداشت کرسکتی ہو ۔ جب اس کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی تو اس نے بلا تامل منظور کرلیا ۔ کوبر کو اس سے زیادہ مناسب شخص نہیں مل سکتا تھا ۔ اس کا دل اپنی بچی کی اس قربانی کا خیال کرکے کڑھتا تھا لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا ۔

شادی تقریباً طے ہوچکی تھی ، لیکن رسم کے بموجب دولہا اور اس کے اقربا آج شام کے وقت دُلہن کو دیکھنے آرہے تھے ۔ اندرانی اسکول سے آئی اور سارے گھر کو بدلا ہوُا پایا ۔ باہر کا کمرہ صاف ستھرا تھا ۔ کچھ چیزیں آرائش کے لئے مانگ کر لائی گئی تھیں ۔ اس کی ماں باورچی خانے میں ناشتہ طیار کرنے میں مصروف تھی ۔

وہ جوں ہی باورچی خانے کے دروازہ کے قریب پہنچی اس کی ماں ایک طشت میں کچھ کھانے کا سامان رکھ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی " پہلے کچھ کھالو ۔ تم بیمار سی معلوم ہوتی ہو ۔ اگر اُنہوں نے تمہیں اس حال میں دیکھ لیا تو کیا کہیں گے "۔

ماں کی باتوں پر اندرانی اور مشتعل ہوگئی لیکن اس نے کھانا لے لیا ۔ وہ دل ہی دل میں کچھ منصوبے باندھ رہی تھی ، جیسا کہ اس کے لب کی جنبش سے نمایاں تھا ۔

پاس والے مکان سے ایک لڑکی اس کو کپڑے پہنانے اور سنوارنے آئی ،

اندرانی نے جلد ہی کپڑے بدل لئے ۔ ہمسایہ کی لڑکی اندرانی کی اس رنجیدہ صورت کو دیکھ کر ہنس پڑی ۔ اور اس کی ٹھوڑی ہلانے لگی ۔ اندرانی نے غصہ سے اپنا مُنہ پھیر لیا ۔

دولہا والے جلد ہی آپہنچے ۔ ان لوگوں کی خاطر مدارات اور ناشتہ سے تواضع کی گئی ۔ اس عرصہ میں بہت سی عورتیں اور لڑکیاں گھر میں جمع ہوگئی تھیں ۔ وہ دولہا کو کواڑ کی آڑ سے دیکھ کر بولیں ۔

" وہ اندرانی کے لئے بالکل موزوں نہیں ہے "۔

اندرانی کی ماں پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی " آپ ہی بتائیں میں کیا کرسکتی ہوں ۔ غریبوں کی پسند ہی کیا ۔ اگر دیوتا کی مرضی ہوئی تو وہ اس کے ساتھ بھی خوش رہ سکتی ہے "۔

کوبر اندر آکر اندرانی کو باہر والے کمرے میں لے گیا ۔ اُسے اندرانی کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی ۔ بوڑھا دولہا اندرانی کی طرف حیرت سے تکنے لگا ۔ اُس نے یہ ضرور سُنا تھا کہ لڑکی صورت شکل کی اچھی ہے مگر اُسے یہ خبر نہ تھی کہ وہ اس درجہ حسین ہے ۔ آپس میں دستور کے مطابق باتیں ہوئیں اور آخر میں دولہا والوں نے دلہن کو آشیرباد دی ۔ اسی سلسلہ میں شادی کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی ۔

اندرانی واپس آگئی۔ غم وغصّہ کے آنسو اس کی آنکھوں میں بھر آئے۔ اس کی ماں جا کر اس کو تسلّی دینے لگی۔ لیکن اس نے ماں کے پھیلے ہوئے ہاتھ ہٹا دیئے اور بولی " ماں، کیا تم مجھے سچ مچ اس بڈھے کے حوالے کرنا چاہتی ہو؟ "

بیٹی کو روتا دیکھ کر ماں کے بھی آنسو نکل آئے۔ " آخر، ہم کیا کر سکتے ہیں، میری بچی! ہم لوگ غریب ہیں اور اس سے اچھا دُولہا تمہیں نہیں مل سکتا، گو وہ بوڑھا ہے مگر تمہیں اچھی طرح رکھے گا۔"

اندرانی سر جُھکا کر رونے لگی۔ اس کی ماں کو باورچی خانے میں اور بھی کام تھے، اس لئے وہ چلی گئی۔

دفعتہً سنل کمرے میں داخل ہؤا۔ اندرانی کو روتا دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا اور تشویش کے لہجے میں بولا۔

" اندرانی خیر تو ہے؟ رو کیوں رہی ہو۔ کیا تمہارے اُستاد نے تمہیں سخت سُست کہا ہے؟ "

اندرانی تیزی سے بول اُٹھی " لیکن کیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ میری تعلیم اب ہمیشہ کے لئے ختم ہونے والی ہے۔"

" کیوں، وجہ؟ " سنل اب بھی حقیقت کو نہ سمجھ سکا۔

" وہ کہیں سے ایک بڈھے کو پکڑ لائے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس سے میری شادی کر دیں۔" غصّہ کی وجہ سے اس کی آواز رُک گئی۔

سنل کھڑا سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا " بہن، ادھر دیکھو، میں تمہیں اب بھی تباہی سے بچا سکتا ہوں، اگر تم میرا کہنا مانو۔ ماتا پتا بیشک خفا ہوں گے لیکن تمہیں اس کی پروا نہ کرنی چاہئے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں بُرا نہ ہوگا۔"

اندرانی نے نظر اُوپر کی اور بولی " کہو مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں اُسی طرح کروں گی۔ اس بڈھے سے شادی کرنے سے ہر بات بہتر ہے۔ میں اس خیال ہی سے لرز جاتی ہوں۔"

سنل نے اس خیال سے کہ کوئی نزدیک تو نہیں ہے، اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر وہ اندرانی کے قریب آیا اور اس سے گوشیاں کرنے لگا۔ اندرانی پہلے زرد پڑ گئی، پھر وہ گلاب کی طرح کھل گئی۔ کچھ دیر چُپ رہ کر بولی " ماتا پتا کو اس سے کوئی نقصان تو نہ پہنچے گا؟ "

سنل نے اپنے سر کو جنبش دی " ہرگز نہیں۔" اس نے کہا " اس بڑے شہر میں ایک کو دوسرے کی فکر کرنے کی فرصت ہی نہیں ہے، اور اُن کے کوئی دوسری لڑکی بھی نہیں ہے۔ تمہاری عمر اٹھارہ سال کی ہے اور تمہیں اپنی قسمت سنوارنے کا حق حاصل ہے۔ پھر اس کے لئے کوئی مقدمہ کرنے تو جا نہیں رہا۔ پتا جی ابتدا میں خفا ضرور ہوں گے مگر بعد میں خوش ہونگے۔"

" وہ خوش ہوں یا نہ ہوں، مجھے اس کی پروا نہیں۔ اگر انہیں اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا تو میں مطمئن ہوں۔"

" انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا، اس کا اطمینان رکھو۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔"

"کچھ دیر یہاں توقف کرو۔ میں فوراً ہی واپس آتا ہوں . . . ."

اندرانی کی ماں کو باورچی خانے میں کسی کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس نے کئی بار اندرانی کا نام لے کر پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ آخر وہ غصہ میں اُٹھی۔ اس نے سمجھا، اندرانی جان کر انجان بن رہی ہے، وہ اس نوجوان چھوکری کو متنبہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ لڑکی آخر کہاں گئی؛ وہ اس سے پوچھے بغیر کہیں نہیں جاتی تھی۔ وہ کسی بُرے نتیجہ کی متوقع نہ تھی۔

کوبر مستعار چیزوں کو ہمسایوں کے گھر واپس کرنے گیا تھا۔ واپسی پر اُس نے اپنی بیوی کو کمرے میں کھڑا پایا اور اس کے چہرے پر اضطراب کے آثار نمایاں دیکھے۔

"بات کیا ہے؟" اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

اس کی بیوی نے جواب دیا "اندرانی نہیں ہے۔"

کوبر برق زدہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اور پھر اس نے مایوسی سے اپنی نظریں چاروں طرف دوڑائیں۔ اس کی نظر ایک خط پر پڑی جو اندرانی کے بستر کے قریب تپائی پر رکھا تھا اور جسے اُس کی بیوی نہ دیکھ پائی تھی۔ اس نے خط اُٹھا لیا اور آنکھوں کی راہ الفاظ کو نگلنے لگا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

"پتاجی! میں اندرانی کو اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں، میں کسی مصرف کا نہیں ہوں، یہ سچ ہے مگر پھر بھی میں اندرانی کو اس طرح قربان ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مسٹر گھوش، ہمارے فلم کمپنی کے ڈائرکٹر نے اُسے دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی خوبصورتی سے بے حد متاثر ہوئے تھے، وہ ان کے لئے بہت مناسب لڑکی ہے۔ اندرانی تمثیل نگاری کے لئے بھی تیار ہے۔ اُسے بڑی اچھی تنخواہ ملے گی، اس کے متعلق آپ تشویش نہ کیجئے۔ ہمارا ڈائرکٹر ایک بے حد دولتمند اور مہذب شخص ہے۔ وہ امریکہ کی سیاحت بھی کر چکا ہے۔ وہ اندرانی سے شادی کرنے کے لئے بھی آمادہ ہے، اگر اندرانی اُسے قبول کرے۔ مجھے اُمید ہے وہ اس بات سے مطمئن ہو جائے گی۔ جب ان کی شادی ہو جائے گی تو ہم سب آپ کی آشیرباد لینے حاضر خدمت ہوں گے۔"

"سنل"

کوبر اس طرح کھڑا تھا جیسے وہ ایک پتھر کی مورت ہو۔ "بدبخت لڑکی مر کیوں نہیں گئی؟"

اس کی بیوی رو کر بولی۔ "اس نے ہمیشہ کے لئے ہماری عزت خاک میں ملا دی۔"

(سیتا دیوی)

ابوالفتح سرمد جمالی

شمشیرِ سخن

مری شمشیر ہے پیکارِ ہستی میں سخن میرا
مَیں اِس شمشیر سے عالم مسخّر کر کے چھوڑوں گا

لیئے ہیں بال و پر ابلیس سے انسانِ حاضر نے
مَیں اِس انسان کو بے بال و بے پر کر کے چھوڑوں گا

مِٹادی رُوح آزادی تمدّن کی غلامی نے
غلامانِ تمدّن کو قلندر کر کے چھوڑوں گا

کُچل ڈالا ہے جورِ قیصری نے بے نواؤں کو
جہاں کے بے نواؤں کو میں قیصر کر کے چھوڑوں گا

عصائے موسوی ہے حق پرستی میں قلم میرا
اسے پیکارِ فرعونی میں اژدر کر کے چھوڑوں گا

وطن کی خاک کے ذرّے ہوئے محرومِ تابش سے
میں ان کو غیرتِ خورشیدِ خاور کر کے چھوڑوں گا

ہیں چوبِ خشک کی مانند بوٹے میرے گلشن کے
میں ان کو سرو و شمشاد و صنوبر کر کے چھوڑوں گا

مری محفل کے پروانے ہیں سوزِ دل سے بیگانہ

انہیں آتش نوائی سے سمندر کر کے چھوڑوں گا
جوانانِ وطن کو دے رہا ہوں درسِ حق گوئی
مَیں ان روبہ مزاجوں کو غضنفر کر کے چھوڑوں گا
سُخن میں صورِ اسرافیل کا ہنگامہ ہے پنہاں
مَیں پہنائے جہاں کو دشتِ محشر کر کے چھوڑوں گا
بناؤں گا جہاں کو باغِ جنت اپنے نغموں سے
ہر اک ندی کو مَیں تسنیم و کوثر کر کے چھوڑوں گا
مری آنکھوں نے دیکھی ہے نئی دُنیا محبّت کی
میں اس دُنیائے پنہاں کو اُجاگر کر کے چھوڑوں گا
محبّت سے کروں گا مست فرزندانِ آدم کو
انہیں بیگانۂ مینا و ساغر کر کے چھوڑوں گا
سپر کا کام بھی لُوں گا مَیں شمشیرِ محبّت سے
ہلالِ شوق کو بدرِ منوّر کر کے چھوڑوں گا
بناؤں گا نئی بستی، بساؤں گا نئے انساں
زمیں کو آسمانوں کے برابر کر کے چھوڑوں گا
جہانِ آب و گِل کیا ہے، سخن کی تیغِ برّاں سے
میں مہر و ماہ و انجم کو مسخّر کر کے چھوڑوں گا

محمد اکبر مُنیر

"قیدِ یاغستان"

گذشتہ سال جب ڈلہوزی میں مسٹر محمد اکرم صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آچکا ہے جس کے باعث اسے ایک افسانے کا درجہ حاصل ہے۔

اگر میں اُن سے مِل نہ چکا ہوتا، اور مجھے اس واقعہ کو محض اِس کتاب میں پڑھنے کا موقع مِلتا، تو میں یقیناً یہی سمجھتا کہ یہ محض ایک افسانہ ہے، ایک ایسا افسانہ جسے لکھنے والے کے کمال نے صحیح واقعے کی صُورت دے دی ہے۔ لیکن اُن سے ملنے اور خود اُن کی زبانی اس واقعے کا عجیب وغریب حال سننے سے اور بالخصوص اس حالت کے دیکھنے سے جو واقعے کو سناتے وقت اُن پر طاری ہوجاتی ہے، یہ سوال دل میں اُٹھ ہی نہ سکتا تھا کہ آیا یہ واقعہ اصلی ہے یا بناوٹی؟

یہ واقعہ اپریل ۱۹۱۰ء میں پیش آیا۔ کس طرح اکرم صاحب بائیس سال کی عمر میں سرحدی فراریوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے، کس طرح اُنھوں نے عذاب کے پینتالیس دن کاٹے جب ہر رات ان کے لئے ہلاکت کی رات اور ہر دن قیامت کا دن معلوم ہوتا تھا، انھوں نے کیا کیا کچھ دیکھا، وہ کس طرح بچ کے موت کے مُنہ سے نِکلے، اِس کا بیان خود انہیں کے قلم سے پڑھیئے۔

مجھے تو پچھلے سال اِس واقعہ کا مختصر حال سُنا کر جب اُنھوں نے چند بکھرے ہوئے ورق پڑھنے کو دیئے اور کہا کہ ان پر ادبی نقطۂ نظر سے ایک نگاہ ڈالوں تو میں اس دلچسپ کہانی میں اِس قدر محو ہوا کہ اس مقصد کو قطعاً بھول گیا۔ زندگی، زندگی کی اصلیت، اور اصلیت کا زور، میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ افسانوں سے ایک حد تک میں ہمیشہ گریز کرتا ہوں۔ اُن کا پڑھنا میرے لئے ایک مطالعہ ہوتا ہے، تفریح کا کام نہیں ہوتا، لیکن اصلیت سے گریز ناممکن ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ پچھلے سال جب میں دوستوں کو اس کتاب کا آخری حصّہ پڑھ کر سنا رہا تھا، تو ہم تینوں اس کہانی میں اس طرح محو تھے، گویا یہ ۲۶ سال پہلے کا واقعہ آج اور اب ہماری آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہے۔

اکرم صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں ادیب نہیں ہوں، لیکن میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ پھر ادیب کون ہوتے ہیں، اور ادب سوائے اس کے اور کیا شَے ہے کہ اس کے ذریعے سے زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آجائے؛

ایسے واقعات آج کل بھی ہوتے رہتے ہیں، آج صبح ہی میں اخبار میں دیکھ رہا تھا کہ ایک شخص مسٹر نوبت رائے کو ۲۰ مارچ

۱۹۲۷ء کو فراری لوگ اُٹھا کر لے گئے ہیں، اور وہ بڑی مشکل سے دو مہینے کی صعوبتوں کے بعد وہاں سے بھاگ کر واپس آئے۔

واقعات تو دُنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن انہیں محسوس کرنے والا، جو دوسروں کو بھی محسوس کرا سکے ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ زیر نظر داستان کی یہی خوبی ہے کہ وہ صحیح ہے، اور ایسے طور پر بیان کی گئی ہے کہ واقعے کی سب جزئیات بجنسہٖ ہماری آنکھوں کے سامنے آگئی ہیں۔

انگریزی میں ایک مقولہ ہے کہ حقیقت افسانے سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے۔ موجودہ کہانی اس بات کی تصدیق کرتی ہے وہ غائت درجہ دلچسپ ہے، عجیب و غریب ہے، یہ واقعہ ہے کہ اسے ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس میں ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو بعض وقت غیر متوقع ہوتی ہیں لیکن جو بالکل فطری ہیں۔

محاکات میں اکرم صاحب نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ ایک پہاڑ در پہاڑ علاقے کی تصویر اُنہوں نے خوب کھینچی ہے، اور جس طرح وہ جاتے، اور بالخصوص واپس آتے بھاگتے وقت چٹانوں اور چوٹیوں اور غاروں میں سے ہوتے ہوئے آئے، اس کا ایک طول طویل بیان، جو اس وجہ سے بھی کہ وہ ذرا تھکا دینے والا ہے، پڑھنے والے کے دل میں اس تکلیف اور تھکن اور اُداسی کا خوب نقشہ کھینچتا ہے، جو مصنف پر طاری تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"اِن خوفناک پہاڑوں کے درمیان، رات کے نو بجے عالمِ خاموشی میں جب کہ دُنیا و مافیہا آرام و استراحت کی تیاریوں میں مشغول ہے ہمارا نو آدمیوں کا گروہ ایک مسطح چٹان پر بیٹھا ہوا، زمانہ کے انقلاب کا ایک عبرت ناک منظر پیش کر رہا ہے۔ ان کے دلی جذبات کا اندازہ لگانا، اگرچہ رجم بالغیب ہے لیکن چنداں مشکل نہیں۔ چھ حاکم اور تین محکوم، چھ آقا اور تین غلام، چھ پاسبان اور تین قیدی، چھ بھیڑیے اور تین بکریاں۔ چھ ایسے ہیں جن کے دل آئندہ کی خوشگوار اُمیدوں کا گہوارہ بنے ہوئے ہیں اور چہروں پر مسرت برس رہی ہے۔ تین ایسے ہیں جن کے سامنے ایک غیر متعین مدت کے لئے مصیبتوں اور تکلیفوں کے دروازے کھلے نظر آرہے ہیں اور اپنے آقاؤں کی ضرب المثل بربریت کے تصور سے ان کے چہرے کملا رہے ہیں۔ غرض قسمت کی نیرنگیوں کا ایک طوفان اپنے سینے میں لئے یہ چھوٹا سا گروہ چوٹی پر بیٹھا ہوا ہے۔"

سونے کی انگشتری کا واقعہ ایک اچھا خاصہ ڈراما ہے۔ دیکھئے صفحہ ۵۸:-

"عورتیں ہیں تو ہماری گرفتاری پر مبارک باد دے رہی ہیں اور قہقہے لگا رہی ہیں۔ مرد ہیں تو خون کی پیاسی نگاہوں سے ہماری طرف گھور رہے ہیں۔ دسیم گل کی تقریر میں اس قدر لااُبالی پن پایا جاتا تھا گویا وہ اپنی کسی بھیڑ بکری کا ذکر کر رہا ہے۔ ہم دو غریب الوطن، بے یار و غمخوار ان کے رحم اور قہر پر منحصر بیٹھے ہیں۔ ہماری آہیں اندر ہی اُٹھتی ہیں، اور اندر ہی سرد ہو جاتی ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ مجھے اپنا وطن یاد آیا۔ اپنے والدِ بزرگوار اور اپنی پیاری ماں کی صورت آنکھوں کے سامنے

پھرنے لگی"۔

زمانۂ قید کی بعض کہانیوں سے ان لوگوں کی ذہنیت اور تمدن کا پتہ چلتا ہے :- (ص ۹۹)

"ایک روز میں نے ذکر کیا کہ میری عمر تیئیس ۲۳ سال کی ہے، تو ایک آدمی بڑا حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ تم اپنی عمر کا کیسے حساب رکھتے ہو میں نے جواب دیا کہ ہماری پیدائش کا روز لکھا ہوا ہوتا ہے، تو وہ تعجب سے پوچھنے لگا کہ تم ہر روز لکھ لیتے ہو کہ آج ایک دن گذر گیا آج دو روز گذر گئے۔ ایک روز لالہ سندر لال سے میں نے ذکر کیا کہ دھوبی کے پاس میرے کپڑے تھے وہ بھی ضائع ہو گئے۔ تو ایک نے بڑی حیرانی کے ساتھ دریافت کیا کہ بابو تمہارے ان کپڑوں کے علاوہ اور بھی کپڑے ہیں؛

تاریخوں اور دنوں کا حساب انہیں بالکل معلوم نہ تھا کئی اشخاص کو دنوں کے نام تک نہ آتے تھے۔ جمعہ کا دن دریافت کرنے کی مجھے بڑی تکلیف ہوتی کیونکہ میں خود شمار بھول جاتا اور ان کو تو جمعہ سے کچھ سروکار ہی نہ تھا۔

ہمارے دو چھاتے بھی اُن کو غنیمت میں ملے تھے۔ ایک تو خونے کے، اور دوسرا مغلم کے حصے آیا تھا مغلم اکثر دھوپ میں تانے پڑا رہتا، صرف اس خیال سے کہ میرے پاس چھاتا ہے۔ اور بارش میں تو خاصکر خونے اور مغلم چھاتہ لے کر باہر چارپائی پر بیٹھے رہتے، اور بڑے فخر کی نگاہ سے دوسروں کی طرف دیکھتے رہتے"۔

ذیل کی عبارت میں اندازِ بیان کی نزاکت قابلِ دید ہے :- (ص ۱۲۴)

"وقت کی نزاکت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کوئی لفظ زبان سے نہ نکل سکتا تھا۔ میں نے التجاؤں میں ڈوبی ہوئی نگاہ سے مدے کو دیکھا اور پھر وہی نگاہ لالہ صاحب کی طرف پھرائی۔ نگاہوں کا جواب نگاہیں دے رہی تھیں"۔

اس کے بعد جس طرح قیدیوں کو سزائیں اور عذاب دیئے گئے، اُسے پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"آہ سات بار کے داغ سے انسانی خون نے لوہے کو ٹھنڈا کر دیا، لیکن انسانی غصے کی آگ کو ٹھنڈا نہ کر سکا"۔

ان درد انگیز واقعات کے ساتھ ہی مصنف نے ایسی باتیں بھی بیان کر دی ہیں، جو دل بہلاؤ اور تفریح کا سامان بن جاتی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۱۶۵ پر لالہ سندر لال اور رسُلام کی مصنوعی جنگ ایک مزیدار کامیڈی ہے۔ یا یہ دیکھئے :-

"لالہ صاحب کی یہ عادت تھی کہ ان کی چیزیں چوری چوری کھایا کرتے تھے . . . . الخ (صفحہ ۱۵۶)

اپنے تجربے کی بنا پر فلسفیانہ نکتے بھی بیان کر گئے ہیں :-

ایسی مشکلات انسان کو بکثرت پیش آتی ہیں، جن کا حل اُس کی اپنی طاقت سے باہر ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے کلی نا اُمیدی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی"۔ (صفحہ ۲۷۰)

مشاہدے کی طاقت ملاحظہ ہو :-

"ساری ساری رات جاگ کر کتوں کا مجھے اچھا تجربہ ہوگیا تھا۔ وہ جو بھونکنے پر آتے تو گھنٹہ گھنٹہ بھونکتے رہتے۔ اور جو چپ ہو جاتے تو آدھ آدھ گھنٹہ پتہ ہی نہ تھا کہ یہاں کوئی کتّا بھی ہے۔ چنانچہ میں نے بھاگتے وقت اس امر کا لحاظ رکھ لیا تھا کہ کتے بھونک کر کب چپ ہوئے۔" (صفحہ ۲۷۷)

بھوک کی شدّت کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:۔

"آخر میں کنارے کے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ تھیلے سے زادِراہ یعنی گوبر نکالا، تھوڑا سا لے کر پانی میں بھگویا" وغیرہ وغیرہ۔

اس کے ساتھ دھوپ کی یہ حالت تھی کہ:۔

"سارا دن دھوپ کی تپش میں چلنے کے بعد اس برفاب کی خنکی اور لطافت بھی ایک عجب کشش اور جذب اپنے اندر رکھتی تھی اور ایسے لطیف اور ٹھنڈے پانی میں غرق ہو کر جان دینا بھی ایک عیش معلوم ہوتا تھا۔" (صفحہ ۳۲۷)

غربت کا زمانہ ختم ہونے پر لکھتے ہیں:۔

"اس وقت سورج غروب ہو کر میری مصیبت کے آخری دن کو ختم کرنے والا تھا۔" (صفحہ ۳۲۹)

"گاؤں کے نیچے دریائے قرم لہریں لے رہا تھا۔ ارد گرد سبز سبز کناروں اور چھوٹی چھوٹی فصلوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مخملی فرش پر سیماب لوٹ رہا ہے۔" (صفحہ ۳۳۱)

زبان سادہ اور طرزِ بیان موزوں و مؤثر ہے۔ اشعار کو بھی خوب چسپاں کیا ہے۔

کردار نگاری میں اکرم صاحب کی قابلیت لائقِ تحسین ہے۔ شروع میں "پانچ آدم خور انسانوں" کا بیان ہے۔ مدبیر خونے، مدّے، منلم اور گل قدم (صفحہ ۲۶) ہر ایک کا جُدا جُدا نقشہ ہے۔ یہ اپنی رائفلوں کے زور پر ہمارے مصنّف اور ان کے ہمراہی کو لئے جا رہے تھے۔ یہاں خوب لکھا ہے کہ:۔

"اللہ اکبر! میں اپنا چہرہ تو دیکھ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کا نقشہ کھینچوں۔ لالہ صاحب کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، چہرہ اُترا ہوا تھا، سانس بدن میں نہیں سماتا تھا۔ لب باوجود بار بار پانی پینے کے چمڑے کی طرح خشک تھے اور ٹھنڈی سانسوں کا تار بندھا ہوا تھا۔ آہ! میں بچارے کو چبان کو بھول گیا، خدا جانے اس کے دل پہ کیا گزرتی ہوگی۔ وہ قوم کا خٹک پٹھان تھا۔ اس کی زبان سے کوئی لفظ اضطراب کا نہیں نکلا۔" (صفحہ ۳۱)

مدّے کا کیرکٹر زبردست ہے۔ انگشتری والے واقعے کے لئے وہ نگینے کا کام دیتا ہے۔ (صفحہ ۵۸)

اور ایک نیک نامے کی سیرت میں ہمیں ایک نیک دل عورت کا وہ دل تڑپتا محسوس ہوتا ہے جو نوعِ انسان کی ہزاروں برائیوں کی دوزخ میں، گویا زندگی کو ایک جنت بنا سکتا ہے۔"

مدّے اور مدّا میر کی "عکسی" تصویریں خود بنانے میں اکرم صاحب نے کمال کر دیا ہے۔ دیکھئے اور داد دیجئے۔

کتاب کے اخیر میں جو تصویر کا دُوسرا رُخ دکھا کر اِن سرحدی وحشیوں کی فطرت کا تجزیہ کیا ہے۔ گویا ہمدردانہ نقطۂ نگاہ سے ان پر ایک نظر ڈالی ہے وہ نفسیاتی خیال سے کردار نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے:۔

سرحدِ آزاد کا پٹھان اپنے وطن کی آزادی کو جان و مال سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے اس کے سخت ترین دشمنوں کو بھی انکار نہیں۔ (صفحہ ۳۸۶)

" انگریزوں کو وہ باعزت دشمن سمجھتا ہے۔"

آزاد پٹھان اپنے علاقہ میں قوتِ لایموت حاصل کرنے سے قاصر ہے اور فطرتاً بہادر ہونے کی وجہ سے وہ کسی ایسی پُرخطر مہم کو اختیار کرنا چاہتا ہے جس میں اس کی بہادری کی آزمائش ہو اور اسے خزانہ بھی مِل جائے۔" . . . . .

"اس طرح وہ ڈاکے کو ایک کارِ شنیع سمجھ کر اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف عمل پیرا نہیں ہوتا، بلکہ اسے کارِ ثواب جان کر کرتا ہے۔ اس لئے عام ڈاکوؤں اور چوروں کی ذہنیت سے اس کی قلبی کیفیت بالکل مختلف واقع ہوئی ہے۔" (صفحہ ۳۹۲)

اخیر میں لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں کہ:۔

"اپنی طرف سے تو میں نے اپنے "قاتلوں" سے بھی پورا انصاف کیا ہے۔"

واقعی پڑھنے والے کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ باوجودیکہ سرورق پر مصنّف کو ایک میونسپل کمشنر اور آنریری مجسٹریٹ بیان کیا گیا ہے، وہ غلط بیانی اور خوشامد کے ہر دلعزیز گناہوں کا کہیں بھی مرتکب نہیں ہوا!

" قیدِ یاغستان" ایک نہایت دلچسپ و دِل آویز آپ بیتی ہے اور مصنّف نے باوجودیکہ وہ ایک باقاعدہ ادیب نہیں ہیں اس تصنیف میں ادبی قابلیت کے بعض حیرت انگیز نمونے پیش کئے ہیں جسے زندگی کے شیدائی اور اُردو ادب کے شائقین حقیقی قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

بشیر احمد

قیدِ یاغستان:۔ حجم تقریباً چار سَو صفحات۔ مجلّد۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ مسٹر محمد اکرم۔ آنریری مجسٹریٹ و میونسپل کمشنر لاہور چھاؤنی۔

قصیدہ در مدحِ ساحرِ بنگالہ وحشتؔ مدظلہ

حضرتِ وحشتؔ نے بنگال میں اُردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ جنابِ اشکؔ کلکتوی کا یہ مرصع قصیدہ اِن احسانات کے لئے بنگال کی سپاس گزاری کا ایک دلاویز مرقع ہے۔ "ہمایوں"

ہے ساون کا مہینہ جوش پر ہے طبعِ رندانہ
جماہی پر جماہی لے رہا ہے قلبِ دیوانہ

شفق کی ہے اِدھر لالی، اُدھر کھیتوں کی ہریالی
فضا دھانی، "گھٹا کالی" الا یا پیرِ مے خانہ

اُٹھا سجدے سے سر بہکی چلی آتی ہیں کاشی سے
ہوائیں دوش پر اپنے لئے فطرت کا خم خانہ

جنوں کا راز رسوا ہے، نمو کا فتنہ برپا ہے
تماشا ہے کہ اُٹھتی ہے نظر بے اختیارانہ

جھکی آتی ہیں یوں کالی گھٹائیں کشتِ دہقاں پر
ہوا سے جس طرح ڈھلکے رِدائے سبزِ جانانہ

بھری برسات موسم کی جوانی عقل دیوانی
ہوا پورب کی مستانی، ہر اک جھونکا ہے مستانہ

فضائیں بہکی جاتی ہیں، گھٹائیں بہکی جاتی ہیں
دعائیں بہکی جاتی ہیں عجب موسم ہے رندانہ

گھروں سے کرشن جی کی گوپیاں نکلی ہیں یوں باہر
زمیں سے کونپلیں جس طرح پھوٹیں بے حجابانہ

جوانی اور اُس کی دل رُبا رنگینیاں توبہ!
ادائیں بے قرارانہ، نگاہیں شرمسارانہ

سلونی سانولی صورت پہ بل کھائی ہوئی زلفیں
وہ زلفیں دیکھ کر زنجیر توڑے جن کو دیوانہ

وہ شوخی آنکھ میں جو کر سکے تخلیق افسوں کی
وہ سُرخی ہونٹ پر جو بن سکے عنوانِ افسانہ

جھکی آنکھیں جھکی آنکھوں میں اک ترکیبِ خودداری
کھنچے ابرو کھنچے ابرو میں اک اندازِ ترکانہ

ختن اندر ختن گیسو، چمن اندر چمن خوشبو
شکن اندر شکن ابرو، مزاجِ ناز شاہانہ

مے رنگیں ٹپکتی دیکھ کر متوالی آنکھوں سے
نظر میں میکشوں کے پھر گئی تصویرِ میخانہ

وہ آنکھیں جن میں اُٹھتی ہیں نشیلی مدھ بھری موجیں
وہ آنکھیں جن کو کہیئے بادۂ رنگیں کا پیمانہ

وہ آنکھیں جن میں آ کر مل گئی کیفیتِ موسم
وہ آنکھیں جن میں جا کر چھپ گئے اسرارِ میخانہ

غرض جوشِ نمو بن کر چمن کی آبرو بن کر
وہ پریاں جھومتی آئیں بنا گلشن پری خانہ

وہ آئیں کیا نئی دُنیا اُمنگوں کی چلی آئی
بنا "سندر نگر" وہ باغ جو اب تک تھا ویرانہ

کسی کافر ادا نے ناز سے شاخوں کو جنبش دی
گرے یوں پھول جیسے شمع پر گرتا ہو پروانہ

جو دل سینوں میں اُچھلے ہر طرف ڈالے گئے جھولے
جوانی کی اُمنگیں بن گئیں اندازِ طفلانہ

بڑھی ہیں پینگیں یوں دھانی دوپٹوں کی ہواؤں میں
محبت کی نظر جیسے بڑھے بے اختیارانہ

ہوئیں چپلیں کھلے جوڑے ڈھل آیا تا کمر آنچل
ہوا اسنکی لگیں گانے کسی کے دل کا افسانہ

کسی موسم کی متوالی نے گائے ساونی دوہے
کسی کافر نے وحشت کی غزل چھیڑی حریفانہ

وہ وحشت ساحرِ بنگالہ وحشت فتنہ گر وحشت
ہیں جس کے سحر کے چرچے حرم سے تا بہ بتخانہ

وہ وحشت وہ سخن پرداز وحشت جس کے جادو نے
کیا ہشیار دیوانوں کو، ہشیاروں کو دیوانہ

وہ وحشت جس پہ روشن ہیں رموزِ عشقِ روحانی
وہ وحشت جس کی غزلیں ہیں لبِ عاشق کا افسانہ

وہ وحشت جس کو "میرِ کاروانِ شاعری" کہیے
وہ وحشت جس نے میخواروں پہ کھولے رازِ میخانہ

وہ وحشت جس کو دُنیا "طوطیٔ بنگالہ" کہتی ہے
بعنوانِ غزل کہتا ہے جو "فطرت" کا افسانہ

زباں پر مدحتِ "پیرِ مغاں" بے ساختہ آئی
کدھر ہے میرے ساقی کھول دے اب بابِ میخانہ

ابھی ساقی نے کھولا بھی نہیں ہے بابِ میخانہ (مطلع)
ابھی سے اشک کی آنکھوں میں ہے اک کیفِ رندانہ

کہاں ہے اے مرے ساقی ہے شورِ العطش برپا
قسم ہے تجھ کو مستی کی لٹا دے آج میخانہ

نظر کی چوٹ کاری ہے دلوں پر حزن طاری ہے
مقامِ رستگاری ہے عطا ہو کوئی پیمانہ

وہ مے دے جس کو پی کر ہو وہ احساسِ خودی پیدا
کہ جذبہ دل کا فطرت سے اُلجھ جائے حریفانہ

قسم ہے تجھ کو ساقی بادۂ رنگیں کی تلچھٹ کی
وہ مے دے جس کی گرمی سے پگھل جاتا ہو پیمانہ

وہ مے دے جس کی سرمستی میں پنہاں ہوشیاری ہو
کہ کہتا ہے سرِ محفل حریمِ دل کا افسانہ

پڑھو اک مطلعِ نو مدحتِ اُستاد میں احسن
قلم قرطاس پر رقصاں ہو سرمستی میں رندانہ

ترے اشعار میں وحشتؔ ہے وہ تاثیرِ رندانہ (مطلع) تڑپ جاتے ہیں متوالے چھلک جاتا ہے پیمانہ
تری شانِ فقیری پر تصدق داب شاہانہ " دلوں پر بادشاہی کر رہا ہے تو فقیرانہ
تری شمعِ ہدایت سے چراغِ شاعری روشن ترے سوزِ محبت سے مکمل ذوقِ پروانہ
ترے جامِ سخن میں بادۂ عرفانِ شیرازی ترے رنگِ غزل میں مستیٔ آہنگِ میخانہ
کجا رنگِ سخن تیرا، کجا رنگینیٔ گلشن کجا کیفِ غزل تیرا کجا ساقی کا پیمانہ
ترے سازِ تکلم سے ہے حورِ شاعری رقصاں ترے موجِ ترنم سے ہے ربطِ قلبِ دیوانہ
تری جادو بیانی سے خجل ترچھی نظر والے حسینوں کے لئے دیوان تیرا آئینہ خانہ
تری فکرِ فلک پیما نے وہ تارے اتارے ہیں ثریا سر بہ زانو ہے جھکا ہے شرمسارانہ
ترے اشعارِ رنگیں سے حسینوں نے ادا سیکھی ادا سیکھی، وفا سیکھی چلیں چوٹیں حریفانہ
تری افسوں طرازی سے ہے سحرِ سامری باطل بتانِ آذری سجدے میں ہیں تبخانہ بتخانہ
تری "آتش بیانی" نے لگا دی آگ گلشن میں ترا کیفِ تغزل ہو گیا میخانہ میخانہ
شرابِ تند نے تیری دلوں میں میکدے کھولے مۓ تاثیر تیری بٹ گئی پیمانہ پیمانہ
حریفوں نے چرائی مے ترے مینائے معنی سے پلاتے ہیں سرِ محفل بنے ہیں پیرِ میخانہ؛
پریشاں تھے جو کاکل وہ سنوارے تیرے ہاتھوں نے غلط ہے "گیسوئے اردو" نہیں "منت کشِ" شانہ
قصیدہ ختم کرنا ہے دعا پر اس لئے احسنؔ کہیں مستی نہ بن جائے یہ کیفِ خاص رندانہ
مبارک زندگی تجھ کو نشاط و کامرانی کی رہے سر پر مریدوں کے ترا سایہ کریمانہ

ترے گلزارِ معنی کی نہ مرجھائیں کبھی کلیاں
نگاہِ شوقِ گلچیں کی بھرے جھولی حریصانہ

احسن احمد اشک
از کلکتہ

شائستہ پاسخ

شیخ عبدالرشید صاحب راحل جو ہمارے قلمی معاون مسٹر حفیظ ہوشیارپوری کے برادرِ اکبر ہیں مدت سے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ کا واحد شغل مطالعہ ہے اور مختلف عنوانوں سے "حاصلِ مطالعہ" کی ترتیب و تالیف کا آپ کو خاص ڈھنگ آتا ہے۔ "ہمایوں" کے چند پچھلے پرچوں میں آپ کی طرف سے جو انتخابات شائع ہوتے رہے ہیں وہ اس بات کے شاہد ہیں۔ ذیل کا انتخاب اپنی قسم کا پہلا انتخاب ہے۔ راحل صاحب اپنے گرامی نامہ میں لکھتے ہیں "سب سے پہلے داغ کے شعر سے کبھی یہ دل تماشہ گاہ تھا...... الخ نے انور کا شعر ایک روشن تو رہا دل میں چراغ...... الخ پیشِ نظر کر دیا۔ اس سے دوسرے اشعار کے انتخابات کا شوق پیدا ہوا۔ شعروں کے جواب عمداً تلاش نہیں کئے گئے۔ بلکہ عموماً ایک شعر پڑھتے ہی فوراً دوسرا شعر یاد آگیا جس میں پہلے شعر کے مضمون کا جواب تھا۔" موجودہ "انتخاب" میں دو تین شعر ایسے بھی ہیں جو گذشتہ انتخابوں میں آچکے ہیں۔ لیکن اس نئے عنوان کے ساتھ وہ "حرفِ مکرر" کے بجائے "قندِ مکرر" کا حکم رکھتے ہیں۔

مہاراجہ چندو لال شاداں

نور تھا یا شعلہ تھا، یا برق یا خورشید تھا
کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

صفدر مرزاپوری مرحوم

طور پر اُن کی نگاہِ گرم تھی، بجلی نہ تھی
کچھ نہ بولے ہم مزاجِ یار برہم دیکھ کر

حضرت سید شاہ الفت حسین فریاد بہاری

کعبہ و دَیر میں جلوہ ہے نمایاں اُن کا
دو گھروں کا ہے چراغ اِک رُخِ تاباں اُن کا

اُستاد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی مرحوم

شمعِ رُخ سے نہ چراغِ حرم و دَیر جلائیں
جلوہ پہچان نہ لیں شیخ و برہمن اُن کا

رام رتن مضطر

وہی اک رشتہ ہے زُنّار اور تسبیح میں مضطر
یہ کیا اہل سے جھگڑے پڑ گئے ہیں کفر و ایماں میں

مرزا یاس یگانہ

حجابِ نازِ بیجا یاس جس دن بیچ میں آیا
اُسی دن سے لڑائی ٹھن گئی شیخ و برہمن میں

شاد عظیم آبادی مرحوم

سامنے خُم ہے سمجھ بوجھ کے پینا اے مست!
کوئی گرتے ہوئے پکڑے گا نہ بازو تیرا

جوش ملیح آبادی

یہ سُن کر میں نے اپنا نام مے خانہ میں لکھوایا
جو مسکین لڑکھڑاتا ہے وہ بازو تھام لیتے ہیں

جوش ملیح آبادی

فنا ہو جا جھلک اُٹھے گا سینہ شمعِ عرفاں سے
ابھی تو دل کے آئینہ پہ غافل داغِ ہستی ہے

عیاں میرٹھی مرحوم برادر زادہ حضرتِ بیان مرحوم

جلا کرتی تھی جو دل کی، فنا ہو کر میں کر گزرا
لگا دو اب اس آئینہ کو خلوت گاہِ جاناں میں

ابوالحسن خاں مرحوم نبیرۂ نواب صدیق حسن خاں مرحوم

آلودۂ سرشکِ ندامت ہے چشمِ یار
یہ بھی ادا ستم کی ہے۔ عذرِ ستم نہیں

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم

تُو ہی نہیں ہے رمزِ محبت سے آشنا
ورنہ دیارِ حُسن میں رسمِ ستم نہیں

جگر مرادآبادی

حُسن سے بھی دل کو بے پروا کیا
کیا کیا اے عشق تُو نے کیا کیا

ذوقی بدایونی

غمِ حرماں اُڑا لایا ہے مجھ کو اس بلندی پر
جہاں سے حُسن کی صُورت بھی پہچانی نہیں جاتی

حفیظ ہوشیارپوری

مَیں راہروِ راہِ محبت ہوں جہاں میں
محبوب کی منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے!

ابر انصاری

ساتھ جس وادی میں جا کر روح تن کا چھوڑ دے
بس وہیں سے منزلِ محبوب کا آغاز ہے

غالبؔ

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

عبدالباری آسی

دُنیا اسیر ہے مرے دامِ خیال میں
اے بے خبر! مقیدِ دُنیا نہیں ہوں مَیں

اعلیحضرت میر عثمان علیخان شہریارِ دکن

اثر پیدا ہُوا کس کی فغاں میں[1]
تلاطم ہے زمین و آسماں میں

حفیظ ہوشیارپوری

یہ میری آہِ سوزاں کا اثر ہے
نظامِ دو جہاں زیر و زبر ہے

راحل ہوشیارپوری

---

[1] یہ شعر جس غزل سے لیا گیا ہے وہ رسالہ زمانہ بابت اپریل ۱۹۳۲ء میں اعلیحضرت شہریارِ دکن کے نام سے چھپی تھی۔ تعجب ہے کہ یہی غزل کچھ اختلاف کے ساتھ جگر مرادآبادی کے دیوان "داغِ جگر" میں بھی موجود ہے۔ رسالہ زمانہ کو توجہ کرنی چاہئے۔

نوائے زندگی

نمودِ زیست اک ایجاد ہے تیری محبّت کی
کہ خود بنیادِ جاں بنیاد ہے تیری محبّت کی

یہ درد و سوز، یہ کرب و الم، یہ حسرت و ماتم،
مری یہ زندگی فریاد ہے تیری محبت کی

ہوئی مدت جہنم بن گئی دُنیا مرے دل کی
مگر جنّت ابھی آباد ہے تیری محبّت کی

کھڑی ہے یوں ہی تیز و تند طوفانوں کی زد میں بھی
وہ سنگیں، آہنیں، بنیاد ہے تیری محبت کی

وہی لیلیٰ، وہی قیس اور وہی دیوانگی اُس کی
قیامت تک وہی اک یاد ہے تیری محبّت کی

حامد علی خاں

میں کبھی نہ بھولوں گا وہ یادگار واقعہ جو مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے میں پیش آیا۔

میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دے چکا تھا۔ نتیجہ کا اعلان اب تک نہ ہوا تھا مگر مجھے اپنی کامیابی کا ایک حد تک یقین تھا۔ میں اُن دنوں سخت مالی دقتوں میں مبتلا تھا۔ دوسرے امتحان کی تیاری اور شاید کلکتہ کی مسموم آب و ہوا نے میری صحت پر جو پہلے سے رو بہ انحطاط تھی بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔ اس لئے میں کالج کی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ ترک کر کے ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ انہی دنوں "اسٹیٹسمین" کی وساطت سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ کلکتہ کے کسی ہائی سکول میں ایک عربی مدرس کی جگہ خالی تھی۔ امیدوار کے لئے عربی کی تکمیل کے ساتھ میٹرک کی شرط بھی لگی تھی۔

میں دو سال پہلے عالم کے امتحان میں کامیابی حاصل کر چکا تھا، اور نہ صرف کامیاب ہوا تھا بلکہ سارے صوبۂ بہار و اُڑیسہ کے اُمیدواروں میں سیکنڈر رہا تھا۔ میرے پاس میٹرک کی سند تو نہ تھی، مگر اسکول کی ایک سال کی زندگی میں میرے تعلیمی نتائج بہت امید افزا تھے۔ میں میٹرک کلاس کے ہر امتحان میں اوّل رہا تھا، اور ٹسٹ کے کامیاب طلبہ کی فہرست میں بھی میرا ہی نام سب سے پہلے تھا۔ اس لئے مجھے یقین تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب مجھے ایک ایسا سرٹیفکیٹ دینے میں تامل نہ کریں گے جو میٹرک کی سند کا نعم البدل ثابت ہو ـــــ میں نے "اسٹیٹسمین" میں اشتہار پڑھا اور اسی دن اپنی درخواست کا مسودہ تیار کر لیا۔ چونکہ اتوار کا دن تھا اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملاقات اسکول ہی میں ہو سکتی تھی اس لئے ان سے ملنا دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دیا۔

اسکول صبح کا تھا، اس لئے دوسرے دن صبح کے ناشتہ کے بعد ہی ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے اپنی شیروانی کی داہنی اور بائیں جیب میں امتحانِ عالم کا سرٹیفکیٹ، اخبار کا کٹنگ، درخواست کا مسودہ، ایک پنسل، کچھ سادہ کاغذ، اور اسی طرح کی اور الابلا رکھی اور روانہ ہو گیا۔ مجھے اپنے ایک بزرگ سے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب اور اُس اسکول کے اربابِ حل و عقد میں دوستانہ تعلقات تھے۔ عالم کے امتحان میں شاندار کامیابی، میٹرک کے کُل امتحانات میں اوّل آنا، عربی کے دونوں پرچوں میں ہمیشہ امتیازی نمبر حاصل کرنا، اُردو مضمون نگاری سے شوق اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے تعلقات، مجھے یقین تھا کہ میں اس جگہ پر ضرور رکھ لیا جاؤں گا۔

میں نو بجے اسکول کی عمارت میں پہنچ گیا، اور دربان کے ذریعہ سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع دے دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی درخواست کی کہ میں آپ سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

آدھ گھنٹے کے بعد مجھے ہیڈ ماسٹر روم میں طلب کیا گیا۔

تمہید کے چند جملوں کے بعد میں نے اُن سے کہا:۔

"میں سب سے پہلے آپ کا قیمتی مشورہ حاصل کرنا چاہتا ہوں، اور پھر آپ کو ایک سرٹیفکیٹ مرحمت کرنے کی زحمت دینا چاہتا ہوں"۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اُردو میں کہنا شروع کیا "میں تمہیں سرٹیفکیٹ نہیں دوں گا، اور اگر میرا مشورہ چاہتے ہو تو میں تم سے کہوں گا کہ ملازمت کا خیال کم از کم بی اے کرنے تک اپنے دماغ سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دو۔ خدا کے واسطے اپنی زندگی تباہ و برباد نہ کرو، میرا مشورہ قبول کرو اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔ مجھے تمہاری ذات سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں . . . . . . میں جانتا ہوں کہ مالی مشکلات تمہاری راہ میں حائل ہیں اور شاید اسی دشواری نے تمہارے شوق کی بلندی کے باوجود تمہاری ہمتوں کو پست کر دیا ہے۔ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ تعلیمی انہماک اور علمی و ادبی مصروفیت نے تمہاری صحت کو بگاڑ دیا ہے اور کیا عجب ہے کہ اس مجبوری نے بھی تمہارے پائے ہمت میں تزلزل پیدا کر دیا ہو، مگر مسعود! تم لاکھ سمجھدار سہی، پر ابھی ناتجربہ کار ہو، بچوں کی طرح اُن چیزوں سے بھی ڈر جاتے ہو جو ڈرنے کی نہیں، تم میرے مشورے پر عمل کرو، نوکری کی اُلجھنوں میں کم از کم ابھی سے گرفتار نہ ہو جاؤ۔ آئی۔ اے میں داخل ہو جاؤ، میٹرک کے بعض خشک مضامین سے تمہیں نجات مل گئی ہے، اب انٹرمیڈیٹ میں خالص آرٹ کے مضامین تمہارے لئے بہت مناسب ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم آئی، اے اور بی، اے امتیاز کے ساتھ پاس کر سکو گے، پھر اگر حالات نے اجازت دی تو ایم اے میں عربی لے لینا . . . . . . تم کہو گے کہ ملازمت کے باوجود پڑھنے لکھنے اور امتحان دینے کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بالکل ناممکن ہے۔ مجھے پندرہ سال کی درس و تدریس کے تجربے نے یہ بتایا ہے کہ اسکول میں چار چار اور پانچ پانچ گھنٹے پڑھانے کے بعد دماغ میں اتنی صلاحیت نہیں رہتی ہے کہ پھر اس سے کچھ کام لیا جائے۔ دُور کیوں جاتے ہو! اپنے اسکول ہی میں دیکھو، دو صاحب جو اس اسکول میں ٹیچر ہیں، بی، اے کے امتحان میں شریک ہونا چاہتے ہیں، مگر اب تک کئی سال کی کوشش کے باوجود تیار نہ ہو سکے۔ میں خود اسکول کے فرائض کو انجام دینے کے بعد کچھ مطالعہ کرنا چاہتا ہوں مگر کامیابی نہیں ہوتی . . . . . آج کل ملک کے نوجوانوں میں یہ مہلک وبا عام ہو گئی ہے کہ پڑھ لکھ کر کیا ہو گا، اور شاید تمہارے دُکھے ہوئے دل و دماغ میں

بھی یہی ستم قاتل پرورش پا رہا ہے۔ یہ خیال ان معنوں میں تو بیشک صحیح ہے کہ کالج سے نکل کر فلم کمپنیوں کی سی بڑی بڑی تنخواہ، شاندار بنگلہ، قیمتی موٹر، اور گرمیوں میں شملے کی سیر میسر نہیں ہوتی۔ مگر اب بھی اہلِ کمال کے لئے عزت کے ساتھ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کا سامان ضرور موجود ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ آخر تم ہمیشہ یاس و ناکامی کا تاریک پہلو کیوں دیکھتے ہو؛ اگر تمہیں عالم کا سرٹیفکیٹ اور میٹرک کے ٹسٹ میں کامیابی کی بنا پر ہیڈ مولوی بن جانے کی اُمید ہے تو آج سے چھ سال کے بعد ایم۔ اے کے امتحان میں فرسٹ کلاس لاکر پروفیسر بن جانا کیا ناممکن ہے؛... میں تمہاری دشواریوں کے حل کرنے میں حتے المقدور تمہاری مدد کروں گا، جاؤ اور ملازمت کا خیال چھوڑ دو۔"

وہ بلا مبالغہ ایک گھنٹے تک تقریر کرتے رہے، اور میں اُن کی میز کے پاس کھڑا ہوا ہمہ تن گوش ہو کر ان کی تقریر سُنتا رہا۔ اتنے میں سکول کے چند ٹیچر کمرے میں داخل ہوئے اور میں ہیڈ ماسٹر صاحب کو ادب سے سلام کر کے رُخصت ہوا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کی تقریر نے میرے خیالات کی دُنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مَیں نے ملازمت کے لئے درخواست نہ دینے اور کالج میں داخل ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دل میں ایک روحانی مسرت جلوہ گر تھی۔ میں اسکول سے خالی ہاتھ واپس ہوا، مگر میں نے محسوس کیا کہ مجھے کوئی بیش بہا دولت ہاتھ لگ گئی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے اندھیری رات تھی، بادل گرج رہے تھے، جسم کو شل کر دینے والی ہوا کا سرد جھونکا تیزی سے چل رہا تھا، بارش بھی موسلا دھار ہو رہی تھی، اور میں ایک راستہ بھولے ہوئے مائوس مسافر کی طرح پہاڑ کی چٹانوں اور چٹانوں کے نوکدار پتھروں پر چل رہا تھا ——— چل رہا تھا اور پھسل رہا تھا کہ یکایک تیز ہوا رُک گئی، اور اُس کی جگہ ہلکی اور خوشبو میں بسی ہوئی ہوا نے لے لی، بارش تھم گئی، بادل ہٹ گئے، آسمان پر خوبصورت چاند نمودار ہوا، اور پھر دُور کسی جھونپڑی میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مدھم سی روشنی نظر آنے لگی۔

زندگی کا یہ واقعہ جو شاید مجھے چندن سے کندن بنا دے میں کبھی نہ بھولوں گا۔

مسعود حسن شمسی داناپوری
(کلکتہ یونیورسٹی)

محفلِ ادب

راج کماری اُردو

تم کو اے ہم وطنو! کیوں نہیں پیاری اُردو
کچھ عرب سے تو نہیں آئی ہماری اُردو

سچ جو پوچھو تو ہماری نہ تمہاری اُردو
برج بھاشا کی ہے اِک راج کماری اُردو

تھوڑی سی اس راج کماری کی کہانی سُن لو
پڑھ چکے ہو گے کتابوں میں زبانی سُن لو

ہوئے اس دیس میں جب ہندو و مسلم یکجا
ملنے جلنے سے ہوئی دونوں کے اُردو پیدا

دُور پہلا تھا دکن میں کہ پڑی اس کی بنا
پھر جنم بھوم بنا قلعۂ شاہی اس کا

کانگریس کو بھی ہے معلوم یہ شانِ اُردو
اپنے ہی دیس کا جھنڈا ہے نشانِ اُردو

تختِ ہندو کا یہاں ہے نہ مسلماں کا تاج
ہو بھلا دونوں غریبوں کا جو ملجائے سوراج

ایسے نسخے سے اطبا کریں دونوں کا علاج
جس سے اصلاحِ طبیعت ہو تبدیلِ مزاج

بگڑیں اُردو سے زباں کہہ کے مسلمانوں کی
ہے یہ نادانوں کی تجویز کہ فرزانوں کی

مشترک ہندو و مسلم کی زباں ہے اُردو
دو سپوت اس کے ہیں اور دونوں کی ماں ہے اُردو

مادرِ ہند کی اِک دُخترِ جواں ہے اُردو
باعثِ آبرو و عزت و شاں ہے اُردو

کیسے بیدرد ہیں دل اُس کا دکھانے والے
کتنے بے ننگ ہیں نام اسکا مٹانے والے

بولی جاتی ہے یہی ملک کے ہر حصے میں
سمجھی جاتی ہے یہی دیس کے ہر خطے میں

رائج الوقت کم و بیش ہے ہر صوبے میں
کہیں بٹّا نہ لگے اس کے کھرے سکّے میں

کھوٹے سکّے نہ چلیں گے کبھی آزادی کے
دیکھیو گاہک نہ بنو دیس کی بربادی کے

لکھنؤ، دہلی کی مشہور زباں ٹکسالی! شہر کیا جس سے نہ قصبہ ہے نہ قریہ خالی
باغباں اس کے جو مسلم ہیں تو ہندو مالی حیف ان پھولوں کی ڈالی کی جو ہو پامالی
مالوی کہتے ہیں اس مال کا کچھ مُول نہیں
مولوی کہتے ہیں بے مول کوئی تول نہیں

ہم یہ کہتے ہیں کہ لیڈر ہیں ہمارے ہشیار لیکن ایسے نہیں سمجھیں شعرا کے اشعار
چل بسے ہند سے چکبست و سرور و سرشار اُٹھ گئے آہ سخن سنجوں میں جن کا تھا شمار
نہ رہے زندہ وہ جاں بخش ترانے والے
تھے نئے سر سے جو اُردو کو جلانے والے

جیتے جی زندگیٔ ملک سے تو ہاتھ نہ دھو بہتی گنگا میں نہ یوں آبروئے قوم ڈبو
تھوڑی پت رہ گئی ہے اس کو بھی غفلت میں نہ کھو بارور تفرقے کی شاخیں ہوں وہ بیج نہ بو
پھوٹ کہتے ہیں جسے ہند کا ہے پھل گویا
زہر اس پھل کو سمجھ لے یہ ہے حنظل گویا

فارسی ہلکی تو اُردو کا ہے زیبا ملبوس سنسکرت اس کا ہے اِک پیرہنِ نامانوس
ایسی وہ کہنہ زباں تھی صفتِ دقیانوس تھا برہمن کے سوا اَوروں کو پڑھنا منحوس
یہ نہیں کہتے کہ اس کی ہمیں حاجت کیا ہے
مگر اُردو میں ملانے کی ضرورت کیا ہے

اک سبھا میں کوئی لیڈر ہوا لکچر کو کھڑا اس نے بھاشا کے کڑے بول کو فقروں میں جڑا
سننے والوں کو نئے شبد سے پالا جو پڑا جتنے تھے چھوٹے بڑے سب کو اچنبھا تھا بڑا
کوئی کہتا تھا کہاں کی ہے یہ کیسی اُردو؟
کس طرح بن گئی جنّات کی بولی اُردو؟

عرض ان سے بھی کروں گا میں جو ہیں مولانا؟ عربی کا جو لغت چھانتے نہیں وہ دانا!

مذہبی مسئلوں میں دخل کو اس کے مانا اور مضمونوں میں بہتر ہے کم اِس کا آنا

تُم سُنے جاؤ شفق سب جو کہیں، کہنے دو
رات چھوٹی ہے کہانی ہے بڑی، رہنے دو

(ندیم)

منگنی کا چھلّا اور اُس کا روزنامچہ (حوب)

پنجشنبہ ۲۳ر اپریل

میں یہاں اس خوبصورت ڈبیہ میں پڑے پڑے اُکتا گیا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ زندگی آرام دہ ہے۔ مگر بہت ہی غیر دلچسپ۔ میں ذرا دُنیا کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ کوئی مجھے خرید لے۔ وہ دیکھو ایک لڑکی ایک نوجوان کے ساتھ آرہی ہے ــــ وہ بحیثیتِ مجموعی خوبصورت معلوم ہوتی ہے ــــ اب مجھے اپنا روزنامچہ ایک لمحے کے لئے چھپا دینا چاہیئے اور سلیقے سے بیٹھ کر اپنی چمک دمک اور خوشنمائی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔

لڑکی نے مجھے پسند کرتے ہوئے نوجوان سے دریافت کیا "تمہارا کیا خیال ہے؟" جس کے جواب میں اُس نے دبی زبان سے کہا "پیاری پگی میں اتنی قیمت ادا نہ کرسکوں گا۔" بیچاری پگی نے پھر ایک ایسی انگوٹھی پسند کی جس میں صرف ایک ہی ہیرا تھا اور مجھے اس کی ذات سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔

جمعہ ۲۴ر اپریل

آج میں بہت ہی خوش ہوں۔ میں اب زیادہ دیر تک اس ڈبیہ کے اندر بند نہ رہوں گا۔ مجھے ایک خوبصورت لڑکی پگّی نے خرید لیا ہے۔ وہ اپنے محبوب نوجوان کے ساتھ آئی اور اُن دونوں کی نظرِ انتخاب مجھی پر پڑی۔ لڑکی نے کہا "میں فلاں انگوٹھی پسند کرتی ہوں جس میں ایک ہیرا اور کئی یاقوت جڑے ہوئے ہیں۔" نوجوان نے جواب دیا "اور پیاری میں بھی تو اُسی کو دیکھ رہا تھا۔" اس کے بعد اُن دونوں نے بغیر قیمت دریافت کئے ہوئے میرے خریدنے کا فیصلہ کرلیا، حساب طلب کیا اور قیمت ادا کردی۔

شنبہ ۲۵ر اپریل

آج جم، پگی اور ہم موٹر میں ہوا خوری کو گئے تھے۔ واہ کیا سُہانا دن تھا، لیکن مجھے بڑی خوشی ہے کہ میں کسی نرم دھات کا بنا ہوا نہیں ہوں۔ ورنہ اس قدر غیر معمولی رگڑوں سے آج مجھے سابقہ پڑا تھا کہ میرا تو دم ہی ہوا ہو جاتا۔ میں نہیں سمجھ

سکتا کہ کیوں۔ لیکن وہ نوجوان اُس لڑکی کا ہاتھ دبائے جاتا تھا اور وہ بھی کبھی چیخ اُٹھتی تھی۔ اس کے بعد میں نے چند مضحکہ خیز آوازیں سُنیں اور پگی نے کہا "بس پیارے! اب میں تھک گئی —— اب تعداد تقریباً پچاس تک پہنچ چکی ہے —— کیا اب بھی بس نہ کرو گے؟ میں حیرت میں ہوں کہ وہ کیا تھا؟

یکشنبہ ۲۶/ اپریل

میں آج جم اور پگی کے ہمراہ گرجا گیا تھا۔ پہلے پہل تو میں کچھ مایوس سا ہو چلا تھا کیونکہ مجھے مطلقاً کچھ نظر ہی نہ آرہا تھا۔ تم سمجھے کیوں؟ اس لئے کہ پگی کچھ پہنے ہوئے تھی جسے وہ دستانے دستانے کہتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اُنھیں اتار ڈالا۔ اور میں اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو دیکھ سکا۔ وہاں بڑا مجمع تھا۔ ابھی ہم گرجا کے باہر ہی تھے کہ ان میں سے بہتوں نے مجھے دیکھنا شروع کیا، ایک شخص نے —— جو مضحکہ انگیز لباس پہنے ہوئے ذرا بلندی پر کھڑا تھا —— کچھ کہنا شروع کیا۔ اُس کی گفتگو کا ایک ہی جز و میری سمجھ میں آیا۔ جب اُس نے کہا "تم اپنے پڑوسی کی بیوی کو بُری نظر سے نہ دیکھنا" تو جم، پگی کی جانب مُڑا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا "شکر ہے خدا کا کہ میں نے اپنے پڑوسی کی بیٹی پر نگاہیں ڈالیں، بیوی پر نہیں" جس پر پگی نے شرما کر کہا "ہوں جم، بدتہذیبی کی باتیں مت کرو۔"

دوشنبہ ۲۷/ اپریل —— جمعہ ۵/ جون

ان دنوں میں اس درجہ مصروف رہا کہ مجھے دم مارنے کی فرصت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ کچھ اور کام نہ تھا۔ ناچ رنگ، دعوتیں سیروں اور تصویر کشی کے سوا جب سے میں دوکان سے باہر نکلا ہوں۔ میں نے بہت کچھ دیکھ سُن لیا ہے۔ مگر اب ان تمام مسرتوں سے عاجز آ گیا ہوں۔ اب میں سمجھا کہ وہ مضحکہ خیز آوازیں جو پہلے دن میں نے سُنی تھیں، کیا تھیں، وہ بوسے تھے۔ جم اور پگی، اس مہینے کے آخر تک میاں بیوی ہو جائیں گے۔ تب مجھے ایک اور ساتھی مل جائے گا کیونکہ پگی کو ایک عقد کی انگشتری پہنائی جائے گی۔ لیکن وہ بالکل سادہ سادہ ہوگی۔ میری سی شاندار نہ ہوگی۔

شنبہ ۶/ جون

ہم لوگ آج تیرنے کے لئے گئے تھے۔ جم اور پگی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر پانی میں کود ے۔ مجھے کا ہے کو کبھی اتنے پانی میں جانے کا اتفاق ہُوا تھا وہاں اس قدر پانی دیکھ کر میرے حواس جاتے رہے، جس کی وجہ سے ایک ہیبت ناک واقعہ رُونما ہُوا۔ میں ڈر کے مارے پگی کی اُنگلی سے سرک گیا۔ اور اس قدر خوفزدہ ہُوا کہ پانی کی سطح پر بھی نہ ٹھہر سکا۔ سیدھا تہ میں جا لگا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ بس آج میرا خاتمہ ہو گیا، مگر فوراً ہی ایک گرداب نے مجھے اُچھالا، اُسی وقت پگی کو میں نے کہتے سُنا "ارے جم وہ دیکھو وہ وہاں ہے"۔ اور میرے اچھے جم نے مجھے بچا لیا۔ لیکن وہ کسی قدر منتشر سا معلوم ہوتا تھا اور مجھے پگی کی انگلی میں

پہنا تے وقت اُس نے کہا" اے پگ منگنی کے چھلّے کا اس طرح گر جانا شگونِ بد ہے"۔ پگی ہنسی اور کہنے لگی " دیوانہ مت بنو جم"
میرا ارادہ ہؤا کہ میں جم کو سمجھا دوں کہ" میں ہرگز گرا نہیں بلکہ خود ہی اُنگلی سے اُتر گیا تھا"۔ لیکن اُس نے میری سُنی ہی نہیں ۔

یکشنبہ ۷ ر جون

آہ! آج کا دن بھی کس قدر خوفناک تھا، مجھے اپنی قسمت بُری معلوم ہوتی ہے۔ کل وہ واقعہ پیش آیا۔ اور آج یہ۔ تم کچھ سمجھے؟ لو سنو! پگی اور جم میں آج کے دن ایک چاےخانہ میں ملنے کا وعدہ تھا۔ لیکن جب پگی اور میں وہاں پہنچے تو پگی مارے غصّے کے دیوانی ہو گئی اور یکایک کواڑوں کی آڑ میں چھپ گئی۔ میں بہت متوحّش تھا کیونکہ میں دیکھ ہی نہ سکا کہ کواڑوں کی آڑ میں کیا ہو رہا تھا۔ لیکن جم نے یقیناً ہم لوگوں کو دیکھ لیا، وہ ہماری طرف لپکا اور پوچھا" پگی کیا معاملہ ہے؟" لیکن پگی نے بہت ہی ترشروئی سے جواب دیا،" جی ہاں! آپ کو تو کچھ خبر ہی نہیں، لیکن یہ یاد رکھئے گا کہ میں نے سب کچھ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے" اور مارے غصّے کے گھر کی طرف چل کھڑی ہوئی ۔ وہ میرے ساتھ ایک علیحدہ گاڑی میں آئی۔ اور جم بعد کو روانہ ہؤا۔

جم اور ہم لوگ گھر پہنچے۔ پگی جم کی طرف بڑھی، اُس وقت اُس کا چہرہ سُرخ انگارہ تھا، وہ کہہ رہی تھی کیوں جم! یہ بھی ایک کھیل تھا، تم مجھ سے منسوب ہو اور پہلے ہی سے چاےخانہ میں پہنچ کر ایک خادمہ کا بوسہ لینے لگے۔ نہایت بے تکلفی سے بات چیت کرنے لگے، اچھی بات ہے، جاؤ پھر اُسی کے ساتھ شادی بھی کر لو"۔ اور قبل اس کے کہ جم بیچارہ کچھ جواب دیتا، اُس نے مجھے اُنگلی سے اُتار لیا اور جم کے چہرے پر پھینک مارا۔ اُس کے ہاتھ سے نکل کر میں ایک صوفے پر جا گرا، اور اس کے غلاف کی ایک شکن میں چھپ کر بیٹھ رہا۔ میں پھر کچھ دیکھ تو نہ سکا۔ لیکن پگی کو یہ کہتے ہوئے ضرور سنا" مجھے جانے دو" اور جم کہتا تھا" ہاں ہاں ابھی ایک لمحہ میں تم جا سکتی ہو، مگر میری اس بات کا ذرا جواب تو دے دو، کیا تم مجھے اتنا کمینہ سمجھتی ہو" جس پر پگی نے کہا" ہاں" تب میں نے جم کو کہتے ہوئے سنا کہ" میں قسم کھاتا ہوں کہ میں حقیقتِ حال تم سے بیان کر دوں گا، جس سے تم یقیناً مطمئن ہو جاؤ گی"، مگر پگی نے کہا" بس اب ایک لفظ سُننا نہیں چاہتی، تم بھی ویسے ہی نکلے جیسے کہ اکثر لوگ ہؤا کرتے ہیں۔ آج سے مجھے تم سے کچھ مطلب نہیں"۔ تب جم نے کہا" بہتر ہے" اس کے بعد جم نے مجھے اُٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ میں نے دیکھا کہ پگی چل کھڑی ہوئی تھی۔ جم کا خیال درست نکلا۔ کل اُس نے کہا نہیں تھا کہ میرا گرنا فالِ بد ہے۔

دوشنبہ ۸ ر جون

جم نے اپنی جیب سے نکال کر میز کے خانہ میں رکھ دیا۔ اب میں کسی چیز کو مطلق نہیں دیکھ سکتا۔ البتہ جم کو اپنی ماں سے اتنا کہتے سُنا کہ آج سارا قِصّہ ختم ہو گیا۔

سہ شنبہ ۹ ر جون ــــــ شنبہ ۲۷ ر جون

کیا زندگی ہے ۔ یہ تین ہفتے میرے تقریباً اُسی میز کے خانے میں بسر ہوئے صرف اس وقت باہر نکلنے کو ملتا تھا جب 'جم' دن میں ایک بار مجھے ہاتھ میں لیتا تھا ۔ ایک ریشمی رومال سے میرا مُنہ پونچھتا تھا اور مجھے بوسہ دیتا تھا ، اس وقت بھی مجھے صرف اُس کی سنگار میز کی سطح ہی دیکھنے کو ملتی تھی ، اور ساتھ ہی ساتھ پگی کی ایک بڑی سی تصویر بھی ۔ میرا خیال ہے کہ انسان بڑا ہی خود غرض ہے ۔ در اصل جم اور پگی کے اس قسم کے برتاؤ سے میں مایوس ہو چلا ہوں ۔

یکشنبہ ۲۸ ؍ جون

اب تمہارا خیال کیا ہے میں کہاں ہوں ؟ "پگی کی چھوٹی سی چھتری کے اندر" یہ کیونکر ہُوا ؛

سنو ! ایک روز جم ، حسبِ معمول گرجا گیا اور بالکل پگی کے پیچھے والی نشست پر بیٹھا ، میں اس راز سے پہلے ہی واقف تھا کیونکہ وہ اُس روز مجھے بھی اپنے ساتھ لیتا گیا تھا ۔ میں یہ تو نہ سمجھا کہ اس سے اس کا مقصد کیا تھا تاہم مجھے خیال ہُوا کہ شاید وہ اب پگی سے صفائی کرنا چاہتا تھا ، لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ان معاملات میں کس قدر سُست ہے ۔ اس لئے میں نے سوچا کہ صفائی کرانے میں میں بھی اس کی مدد کروں گا ۔ اتفاق کی بات کہ مجھے جم کی جیب میں ایک سوراخ بھی مِل گیا ۔ اُسی طرف سے ٹھیک اُس وقت جبکہ سب کے سب جُھکے ہوئے تھے ، میں چپکے سے کھسک گیا ، کہاں ؟ پگی کی چھتری کے اندر ، اُس نے اپنی چھتری ہم لوگوں کے سامنے اپنی کرسی کے نیچے رکھ دی تھی ۔ اس لئے میں وہاں آسانی سے پہنچ سکا ، جب اُس نے میری چھتری اُٹھائی تو میں بالکل ہی تہ میں جا پہنچا ۔ اس میں شک نہیں کہ خطرہ ضرور تھا ، اگر وہ بغیر جانے ہوئے اپنی چھتری کھولتی تو میں گر پڑتا ، پھر خدا معلوم مجھ پر کیا بیتتی ، لیکن چونکہ ابر و باد تھے اس لئے اُس نے چھتری کھولی ہی نہیں اور میں ابھی تک اُس کے اندر ہی ہوں ۔ معلوم نہیں جم کیا خیال کرتا ہوگا ۔

دوشنبہ ۲۹ ؍ جون

پگی کو میں مِل گیا ۔ اُس نے آج کہیں باہر جاتے ہوئے جیسے ہی اپنی چھتری کھولی ، میں گر پڑا ۔ اور لڑھک کر قصداً اُس کے سامنے جا پہنچا ، تاکہ وہ مجھے دیکھ لے ۔ اُس نے تھوڑی دیر تک تو مجھے گھورا پھر لپک کر اُٹھا لیا اور مجھے بوسہ دیا ، اس کے بعد وہ اپنے لکھنے کی میز پر گئی اور جم کو چند سطریں لکھیں ، چونکہ میں اس کے قریب ہی رکھا ہُوا تھا ، اس لئے سارا تماشہ دیکھ رہا تھا ، اُس نے ایک ایک کر کے تقریباً سات خط لکھے اور پھاڑے آخر میں یہ خط روانہ کیا ۔

ڈیر مسٹر فیرنٹ

میں نہیں سمجھ سکی کہ تم نے اس ہنگنی کے چھلّے کو میری چھتری میں کیوں ڈال دیا ۔ مہربانی کر کے آؤ اور اس کو واپس لے جاؤ ۔

تمہاری مخلص پی ، الیہی

(دیکھئے اُس نے مجھے خط کے ساتھ ہی ساتھ نہ بھیج دیا، بلکہ اُلٹے جم ہی کو میرے لے جانے کے لئے بُلا بھیجا ہے۔ (ہا ہا))

پگی باہر نہ گئی وہ اپنی اُنگلی میں مجھے پہنے ہوئے کمرہ میں بیٹھی انتظار کیا کی، اس کے سامنے میں نے جم کا ایک بڑا فوٹو بھی آج دیکھا جو اس سے پیشتر اُس کے کمرے میں نہ تھا۔ اسی سے تو میں انسان کو تماشا سمجھتا ہوں، تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی، پگی اُچھل پڑی، اُس نے مجھے اپنی اُنگلی سے اُتار کر میز پر رکھ دیا، اور اُس فوٹو کو میز کے خانہ میں جلدی سے چھپا دیا۔ تب اُس نے کہا "آ جاؤ"——— اور جم اندر داخل ہوا۔

(اب دیکھئے وہ خود ہی مجھے لینے کے لئے آیا۔ کیا کوئی اَور نہ تھا جس کو وہ بھیجتا، ہا ہا)

پگی نے مجھے اُٹھایا اور کہا کہ جم، یہ تمہارا چھلّا ہے ——— مجھے اپنی چھتری کے اندر ملا ہے۔ اتنا کہہ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اب اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آگے کیا کہنا چاہیئے۔ میں جم کی صُورت کو گھُور رہا تھا۔ اس کے چہرہ پر ایک رنگ آتا، اور ایک جاتا تھا۔ آخرکار اُس نے اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور کہا "پگی کیا تم اب پھر اس کو واپس کر دو گی؟" تب پگی نے چپکے سے کہا "مگر جم اُس خادمہ کا کیا قصہ ہے؟" اب جم نے مسکرا کر کہا "جب میں نے اس گتھی کو سُلجھا دینا چاہا تو تم سننے پر تیار نہیں ہوئیں" اور پگی کے ہونٹ تھرّانے لگے ——— کیا انسان تماشا نہیں ہے! ——— اور اُس نے گھن گھن کر کے کہنا شروع کیا "ہاں جم اب بیان کرو اس وقت میں ضرور سنوں گی۔ دیکھوں کیا قصہ ہے" جم نے بیان کرنا شروع کیا کہ وہ خادمہ جس کو اُس نے بوسہ دیا تھا دراصل اُس کی بہن تھی جو کہ ایک جریدہ نگار ہے، وہ آج کل کسی چیز کے بارے میں کچھ لکھ رہی ہے، اُس کے لئے مواد حاصل کرنے کی غرض سے اُس نے ہفتے عشرے کے لئے یہ جگہ قبول کر لی ہے ——— یہ ایک بڑا راز ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جم نے یہ بھی کہا کہ وہ اس بات کو ثابت کر سکتا ہے۔ لیکن پگی نے جم کی بات کا اعتبار کر لیا۔

تب پگی نے پھر مجھے پہنا ——— بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جم نے مجھے اُس کی اُنگلی میں پہنا دیا اور پگی نے مجھے محبت کے ساتھ بوسہ دیا ——— ان دونوں نے بھی مثل سابق کے ایک دوسرے کا بوسہ شوق لیا۔

سہ شنبہ ۳۰ جون ——— چہار شنبہ ۲۲ جولائی

دعوتوں اور ناچ رنگ کی وجہ سے لکھنے کا موقع نہیں۔

پنجشنبہ ۲۳ جولائی

حیرت ہوتی ہے کہ ابھی تین ماہ ہوئے جب سے میں نے اپنا روزنامچہ لکھنا شروع کیا۔ اُسی زمانہ میں میری نئی زندگی کا آغاز ہوا اور آج اُس کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ اب سے صرف میرے ذمہ اتنا ہی کام رہ گیا ہے کہ میں خوشنما نظر آیا کروں۔ کیونکہ آج سے پگی نے دوسری انگوٹھی بھی میرے ساتھ پہننا شروع کر دی ہے ——— جو کہ سادی سادی اور سونے کی ہے ———

اب ہم دونوں اُس کی اُنگلی میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور سب سے بڑی خوشخبری یہ ہے کہ اب جم اور پگی ساتھ ہی ساتھ ایک ہی مکان میں رہنے لگے، کیونکہ اب اُن کی شادی ہو چکی ہے۔

ہنسو لوگو ہنسو، خوشیاں مناؤ

(کلیم)

روسی ترکستان کے مسلمان شاعر کیا کہتے ہیں؟

سفری روزنامچہ کا ایک ورق

میں، ملّا، بیک، تاجر کچھ بھی ہونا نہیں چاہتا۔
اور نہ درویش، اندھا، مسخرا ہونا چاہتا ہوں۔
اور نہ کسی امیر کا لڑکا، جو سونے اور ریشم میں ملبوس ہو اور چہرہ پہ پوڈر لگا کر بد قوارہ بنا ہو۔
میں کسی کشتی کا ملاح بھی ہونا نہیں چاہتا۔
نہ کسی فربہ امیر کا ملازم بننا چاہتا ہوں۔
نہ کسی بُڑھیا کا معالج بنوں گا
اور نہ بازار میں پھیری کرکے چیزیں فروخت کروں گا۔
میں چاہتا ہوں کہ ایک آزاد خیال، ایک ڈاکٹر بنوں۔
ایک حرّیت پسند، ایک معلّم ہونے کی خواہش ہے۔
چاہتا ہوں کہ ایک ایسا شخص بنوں جو لینن کے الفاظ کو دماغوں میں اُتار دے۔
مرغزار میں ایک کسان بنوں گا . . . . . .
قوم کا نمائندہ بننا چاہتا ہوں . . . . . .

"باسماشی" کا خاتمہ

اگر تم ہمارے وطن میں دوبارہ واپس آنا چاہو
سڑک کا ایک ایک پتھر تمہاری مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑا ہوگا۔
راستہ کا ایک ایک درخت تمہاری آنکھوں میں اپنی ٹہنیاں چبھو دے گا۔

پہاڑ بھی جھرجھری لے کر برف کے بڑے بڑے تودے نیچے گرائیں گے اور دریا اپنی موجیں بلند کرے گا۔
عورتیں اپنے غیظ و غضب کا اظہار کریں گی ۔ ۔ ۔ ۔
بدخشاں میں اب واپس نہ آؤ
سمجھ لو کہ تمہاری خونی جماعت کے لئے یہاں نفرت و حقارت کے سوا کچھ نہیں ۔
(تاجیک کا قومی گیت)

اسٹالن آباد میں ایک بالشویک

ہمارے گھاس بھرے میدانوں میں کس نے نغمہ ریز خوشنما چشمے بہائے ؛
شورش افزا "پیانجی" کے خوف انگیز پانی کو کس نے رام کیا ؛
ہمارے غریب کسانوں کو کس نے مسرت و سکون کی نعمتیں عطا کیں ؛
شمال کے آدمیوں نے —— آزادی کے بڑے آدمیوں نے ۔
مارکس اور لینن کے آدمیوں نے —— بالشویکوں نے ۔
(علی بے ۔ ترکمانی شاعر)

دُشنبے بمقابلہ اسٹالن آباد

ہم نے سمرقند اور قندگر دونوں شہروں کو دیکھا ۔
صحرا کے "خواب" اور بازار کو بھی دیکھا ۔
اسلامی دُنیا کی ایک تہائی
اور اُونچے پامیر کی برف کو بھی دیکھا
میں نے نہریں کھودیں ۔ مٹی کے برتن بنائے ۔
پہاڑوں کی پیٹھ پر بوجھ لاد کر لے گیا ۔
ڈھلواں راستوں میں عرصۂ دراز تک لڑکھڑاتا ہوا
پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچتا رہا ۔
لیکن ابھی تک اس سے زیادہ حیرت انگیز شے نہیں دیکھی ۔
کہ دُشنبے تک ایک آہنی سڑک گئی ہے ۔
(حیرت انگیز چیزوں کے تاجیک گیت)

تناقض!

ان قدیم سڑکوں پر جنہوں نے بہت سی چیزیں دیکھی ہیں
چین سے ایران اور ہندوستان سے ترکستان تک
پوری دُنیا میں چھوٹے چھوٹے خودمختار سرداروں کا
سلسلہ اسی طرح تیزی اور سُرعت سے گزر جائے گا
گویا وہ ایک آہنی کارواں ہے
جو متحد و متفق ہو کر گزر رہا ہے
یہ قدیم سڑکیں ہماری بقائے دوام ہیں۔
انہی سڑکوں پر
آزادی کا طوفان بھی گزرے گا
اور اِس میں خُون کی بُو تک نہ ہو گی۔

ایک دردانگیز نغمہ

اگر گہرے کنویں میں ایک پتھر پھینکا جائے
تو اے میری پیاری ماں! وہ تہ تک چلا جائے گا۔
اگر تم اپنی نوجوان بیٹی کو اجنبیوں کے ہاتھ بیچ دو گی۔
تو تمہاری بیٹی رو رو کر اپنی آنکھیں پھوڑ لے گی . . . . .
وہ ہلاک ہو جائے گی۔ اے میری پیاری ماں!

اس راستہ پر جو میرے گھر سے باہر نکلتا ہے
کانٹے والی جھاڑیاں اور خاردار پودے نصب کر دیجیو۔
اور جب ان جھاڑیوں کو دیکھنا کہ ان کے سرے جُھک گئے ہیں
تو سمجھ لینا کہ میری زندگی کا چراغ بھی گُل ہو گیا
اے میری پیاری ماں!

(قبل انقلاب ایک ترکمانی لڑکی کا گیت)

(ہند)

مطبوعات

انمول جواہرات۔ مصنفہ ومرتبہ ہرچرن لال صاحب ورمن۔ قیمت فی جلد آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: سرن داس۔ پریم نگر، دیال باغ، آگرہ

اس مختصر مگر دلچسپ کتاب کی ضخامت ۴۸ صفحات ہے۔ اس کی ظاہری صورت ایک ماہوار رسالے کی ہے اور یوں بھی اس میں بہت سے ایسے مضامین ہیں جو ماہوار رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں گیارہ مضمون ہیں جو مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں مثلاً انقلاب افغانستان سے ایک سبق۔ خالص روحانی تعلیم، ہریجن تحریک، بُت پرست کون نہیں ہے؛ خوش قسمتی کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے؛ ہندو مسلم عیسائی اتحاد، جواہرات کی کان، اشارے۔

"خوش قسمتی کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے" ایک نہایت زندگی بخش اور اُمید افزا مضمون ہے جس کا مطالعہ ہر ہندوستانی کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ یہ ایک انگریزی مضمون کا چربہ ہے۔

"اشارے" بکھرے ہوئے خیالات ہیں جو خود ترجمہ کئے گئے ہیں یا دوسروں کے ترجموں سے ماخوذ ہیں۔

اس کتاب میں مشرقی اور خصوصاً ہندو روحانیت کا پرچار کیا گیا ہے۔ زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔ صرف بعض جگہ چند ایسے ہندی الفاظ ہیں جن کے معنی اگر فٹ نوٹ میں ظاہر کر دیئے جاتے تو بہتر ہوتا۔

ہم اپنے قارئین سے یہ کہتے ہوئے اس کتاب کی پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ بقول تقریظ نگار

کہاں ہیں ایسے مصنف اب اس زمانے میں　　　جواہرات لٹائیں جو آٹھ آنے میں!

(ب ا)

حیاتِ محسن:- یہ نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں منیر نواز جنگ بہادر مرحوم کی سوانح عمری ہے جسے مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی سابق مہتمم تاریخ ریاست بھوپال نے مرتب کیا ہے۔ نواب صاحب مرحوم کا نامِ نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کے سلسلے میں سرسید مرحوم کے رفیقِ کار کی حیثیت سے آپ نے جو شاندار خدمات سرانجام دی ہیں اُن کی وجہ سے آپ کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا۔

اس کتاب میں قابل سوانح نگار نے مرحوم کی قومی، سیاسی اور علمی خدمات کے علاوہ اُن کے ابتدائی حالات، عادات و اخلاق اور طرزِ معاشرت پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ہمارے موجودہ رہنماؤں کیلئے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔ زبان نہایت سادہ اور اندازِ بیان شگفتہ ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ وغیرہ عمدہ ہیں۔ مرحوم کی دو تصویریں بھی شامل ہیں۔ ضخامت ۲۵۰ صفحے۔ قیمت درج نہیں۔ محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی مہتمم مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے مل سکتی ہے۔

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ اگست ۱۹۳۷ء

تصویر:- علامہ اقبال

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

یہ ایک عام انسانی کمزوری ہے کہ انسان اپنی تعریف سُن کر خوش ہوتا ہے۔ راقم نے ہرچند کوشش کی کہ اس کا شکار نہ ہو لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ "ہمایوں" کے چند نمبروں میں انجمن اُردو پنجاب اور اُردو ہندی کا ذکر کر کے گزشتہ پرچے میں شاید ایک نیم سا وعدہ کیا گیا تھا کہ اب تھوڑے عرصے کے لئے اُن قارئین کے جذبات کا کچھ لحاظ کیا جائے گا جو اس رام کہانی سے "اُکتا گئے ہیں لیکن کیا کیا جائے خوش قسمتی سے قارئین میں ایک خاصی تعداد اُن لوگوں کی ہے جو اس موضوع سے عملی طور پر دلچسپی لیتے ہیں اور اپنی دلچسپی کے اظہار پر اصرار کرتے ہیں۔ اس ضمن میں پچھلے مہینے میں جو خطوط موصول ہوئے اُن میں سے دو ایک کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

پالوی صاحب نے جو راقم کی تعریف کی اُس سے خوش ہونا نظری امر تھا لیکن غور کیا تو معلوم ہوا کہ اگر اس تعریف کا عشرِ عشیر بھی درست ہوتا تو آج ہمیں اُردو کے مستقبل کا اس طرح رونا نہ ہوتا۔ کاش ہماری قوم ایسے افراد پیدا کر سکے! انجمن مذکور کے سکرٹری نے بعض دفعہ دوستوں کے حلقے میں لیکن اکثر اپنے جی سے کہا کہ افسوس پبلک اُردو کے کام کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں کرتی، ہمارے ہاں ایسی کوششوں کی صحیح قدر نہیں لیکن پالوی صاحب اور ایسے ہی بعض اور حضرات کی مبالغہ آمیز تعریفوں سے دل شرمندہ ہوگیا کہ کاش انجمن کی مساعی اس قابل ہوتیں کہ سکرٹری ایسی تعریفیں سُن کر مطمئن ہوسکتا۔ ہاں یہ دیکھ کر کہ سیاسیات و معاشیات کے اس زمانے میں ہر اچھی بُری شے پروپگنڈا کی محتاج ہے زبان و ادب بھی اگر اپنے لئے فلاح کی یہ راہ تلاش کریں تو کچھ ایسی معیوب بات نہیں، علاوہ بریں تنظیم زندگی کے اس دور میں اگر بعض ہم خیال قومی زبان کے بعض خیر خواہ کبھی کبھی مل بیٹھیں تو اُن کے اور قوم کے لئے یہ امر موجب تسلی اور باعثِ ترقی ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ اُن کے احساسات محض "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" پر ہی ختم نہ ہو جائیں۔

عطاء اللہ پالوی صاحب (ساکن سبزی باغ بانکی پور) جن کا مضمون اس پرچے میں درج کیا جاتا ہے۔ اپنے خط میں لکھتے ہیں:-

"بحیثیتِ مدیرِ ہمایوں" ہی آپ کے احسانات اُردو زبان پر کیا کم تھے کہ "انجمنِ اُردو" کی نہ صرف بنیاد رکھ کر بلکہ اُس کی اہم ذمہ داری بھی اپنے سر لے کر آپ نے مزید احسان کا بار" اُردو" کے کاندھوں پر ڈال دیا ہے۔ ایسی صورت میں کون ہے جو آپ کی اس خدمت سے منکر ہو اور کونسی صورت ہے جو اُردو زبان آپ کے اس احسان کا بار اپنے کمزور کاندھوں سے اُتارے تو کجا اس کا شکریہ بھی ادا کر سکے؛ اگر آپ جیسے دو چار لوگ اور بھی اس طرح خدمتِ ادب میں لگ جائیں تو پھر کوئی ایسی ہستی نہیں جو اُردو کو مٹا سکے۔

میں نہ تو اہلِ قلم ہوں اور نہ اس کا دعویٰ لیکن آپ لوگوں کی ہمت افزائیوں سے کچھ لکھ ضرور لیتا ہوں چنانچہ یہ چند اوراق بھی "اُردو زبان" کی ترقی کے سلسلے میں اسی اُمید پر سیاہ کیے گئے ہیں، موضوع کے لحاظ سے یہ مضمون مجھے تو اہم معلوم ہوتا ہے معلوم

نہیں دوسروں کے نزدیک یہ کیسا ثابت ہوگا۔ بہرحال ! مضمون جیسا کچھ بھی ہے حاضرِ خدمت ہے اور "ہمایوں" میں اسے بھیجنے کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ "بقائے اردو" کی چیخ پکار میں سب سے زیادہ پیش پیش ہے۔ میں نے یہ مضمون اپنے اس مضمون کے سلسلے میں لکھا ہے جو "ساقی" کے جون نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اس میں لوگوں کو اُردو زبان کی ترغیب دلا کر صرف مشورہ دیا گیا ہے کہ اُردو کے بلند پایہ رسائل و اخبارات خریدیں اور دوسروں کو اُن کی خریداری پر مجبور کریں بلکہ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ کسی قسم کے لحاظ کے بغیر ہر انجمن در میں شریک کار ہو کر خدمتِ زبان میں حصہ لیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک کہنے والا خود اس پر عامل نہ ہوگا اُس کی بات کی کوئی اہمیت نہ ہوگی لہٰذا پانچ روپے کی ایک حقیر رقم (منی آرڈر روانہ کیا جا چکا ہے) حاضرِ خدمت ہے۔ آپ اسے انجمن اُردو پنجاب کے سلسلے میں قبول فرمائیں۔

اُردو ہندی کے مسئلے کے متعلق ایک ہندو ادیب کا مندرجہ ذیل خط ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ہرچرن لال صاحب ورمن پریم نگر دیال باغ آگرہ سے لکھتے ہیں :-

"مکرم بندہ! تسلیمات۔ نوازش نامہ پہنچا۔ باعثِ مسرت ہوا۔ اُردو کے خلاف ہندوؤں کی جانب سے متعصبانہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے بالکل درست ہے اور اس کی وجہ ہندو مسلم کشیدگی ہے کہ جس نے ایک مدت سے ملکی فضا مکدر کر رکھی ہے اور اس کشیدگی کی تہ میں تعصب تنگدلی، سطحی نظر، نامعاملہ فہمی، ناعاقبت اندیشی اور خود غرضانہ حکمتِ عملی ہے۔

اِس غلط ذہنیت کا ذمہ دار اُردو و ہندی پریس ہے اور وہ اخبار نویس ہیں جن کا پیشہ ہی ہندو مسلم جذبات کو بھڑکانا ہے اور وہ ہی "فی الحقیقت لائق مذمت ہیں اس میں ہندوؤں مسلمانوں کا فرق نہیں"

اور وہ دن مبارک ہوگا جب کہ ہندو اپنی غلطی محسوس کر کے اپنی ذہنیت کی اصلاح کریں گے اُن کو خود اپنے فلسفہ، تہذیب، تمدن اور رشی مُنیوں، سنت مہاتماؤں کی تعلیم کی تبلیغ کے سلسلہ میں اُردو کی پناہ لینا ہوگی اور اُردو کے خلاف بیجا تعصب پھیلا کر وہ اپنی کمزوری اور غلط ذہنیت کا ثبوت پیش کر رہے ہیں اور اس طرح نادانستہ طور پر ملک و قوم کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ہندی زبان کو فروغ دینا قطعی علیحدہ بات ہے۔ اس سے ہندوؤں کو کون روک سکتا ہے اگر ہندو ہندی پرچار اس غرض سے کرتے ہیں کہ ہندی جلد ملکی زبان بن جائے اور انگریزی زبان کا رتبہ حاصل کر لے بالکل قدرتی ہے لیکن اُردو زبان کو جو یکساں ملکی زبان ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے غیر سمجھنا اور اُس کے خلاف متعصبانہ پروپیگنڈا کرنا اُن کی مجرمانہ غلطی ہے اور ہندی کے پرچار کے سلسلہ میں اُس کو فصیح و بلیغ بنانے کے نقطۂ نظر سے ایسا سخت بنانا کہ وہ سنسکرت کی بہن بن جائے خود ہندی کا گلا گھونٹنا ہے۔ ہندی زبان ایسی سلیس ہونی چاہیئے جسے ہندوستان کا ہر ایک باشندہ بلا تکلف لکھ پڑھ اور بول سکے اور ہندی اور اُردو میں فرق صرف رسم الخط کا رہ جائے۔

اگر یہ حقیقت ہے کہ عربی اور سنسکرت ملکی اور مادری زبان نہیں ہو سکتیں اور ہندی اور اُردو زبانیں ملکی زبان ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں تو اس مصلحت کے ذہن نشین ہونے میں دقت نہ ہونی چاہئے کہ ملک کا ہر فردِ بشر ہندی اور اُردو کو یکساں رُتبہ دے، اُس کے فروغ کے لئے یکساں مواقع بہم پہنچائے اور دو یکساں طور پر ہر دو رسم الخط سے واقف ہو۔ اگر مسلمان اہلِ قلم عبدالرحیم خان خاناں، جائسی اور دیگر مسلم ہندی سکالرز کے نقشِ قدم پر بلا تکلف چلنا پسند کریں اور ہندی سیکھنے میں کمال شوق کا اظہار کریں اور اُردو و ہندی کو فروغ دینے میں ہندوؤں کے ساتھ اتفاق کریں، تو ہندی اُردو کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو سکتا ہے جس قدر اُردو رسم الخط کے جاننے کی ہندوؤں کو ضرورت ہے اُس سے کم مسلمانوں کو ہندی سیکھنے کی نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنا فلسفہ، تہذیب اور تمدن کو اُردو و ہندی کے جامہ میں پیش کریں تاکہ ہندو مسلمانوں میں تبادلۂ خیالات کا دور قائم ہو جائے اور ایک قوم دوسری قوم سے اچھی طرح واقف ہو کر ایک دوسرے کے قریب تر ہو۔ اور ملک کی فضا میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہو کر اتفاق اور محبت کی ہوائیں ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلنے لگیں۔ اُردو یا ہندی کے متعلق ہر دو جانب سے کنارہ کشی مجرمانہ غلطی ہے اور ہر دو فریق کے لئے یکساں مضر ہے اور باعثِ عذاب۔ حقیقت شناسی، امن پسندی اور بہتر سلوک و رواداری کا یہی ایک رستہ ہے، اسی پر ہندو مسلم اتحاد کی مستحکم بنیاد قائم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ملک کے بہی خواہوں کو اس جانب توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہندو مُسلم روحانیت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں، بیان ضرور مختلف ہے اور لاعلمی کے سبب ضرور دو مختلف نظریے قائم ہو گئے ہیں لیکن تحقیقات کی جائیگی تو ضرور ہم اسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔

دیال باغ کے رہنے والے ہندو یا دیال باغ سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی اُردو ہندی کے سوال سے ناآشنا ہیں۔ یہاں کے ست سنگ کا تمام مذہبی لٹریچر اُردو و ہندی ہر دو زبانوں میں موجود ہے اور دونوں زبانوں کو فروغ حاصل کرنے کے یکساں مواقع مہیا ہیں۔ ہر ایک ست سنگی خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو، مولانا روم، حضرت معین الدین چشتی، شمس تبریز، حافظ وغیرہ دیگر صوفیائے کرام کا کلام نہایت ذوق و شوق سے پڑھتا ہے، ہم لوگ اُن کے کلام کو گرو نانک، کبیر صاحب اور دیگر سنت مہاتماؤں کے کلام سے کم رتبہ ہرگز نہیں دیتے۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ آپ روحانیت کے قائل ہیں اور یقین مانئے روحانیت صرف ایک ہے، اختلاف محض لاعلمی کے سبب محسوس ہوتا ہے اور محض سمجھ کی حدود کے اندر رہ سکتا ہے لیکن جہاں سے حقیقت کا تعلق ہے وہاں معاملہ قطعی واحد ہے۔

اُردو زبان کو آپ روحانیت کا آبِ حیات کیوں نہیں پیش کرتے اُس کو عوام میں مقبول بنانے کا یہ بہترین نسخہ ہے۔ ہم لوگ اُردو کی صحیح خدمت سے اُردو لٹریچر کو مالامال کر سکتے ہیں اور اس کو باعثِ کشش اور زیادہ سے زیادہ جاذبِ توجہ بنا سکتے ہیں۔ دل کی پیاس بجھانے کے لئے آبِ حیات درکار ہے، آبِ حیات پیش کیجئے خواہ وہ اُردو کے پیالہ میں ہو یا ہندی کے، پیاسے کہاں جائیں گے ٹکریں مار کر بالآخر آپ کا ہی دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ میں خود اُردو و ہندی دونوں زبانوں سے واقف ہوں مگر اپنے خیالات کا اظہار ہمیشہ اُردو میں ہی کرتا ہوں۔ اُردو سے بچپن کا تعلق ہے اور طبیعت بے حد مانوس ہے اور اس کی صحبت میں سہولت، دلچسپی اور لطف محسوس ہوتا ہے اور قدرتی ہے۔ کیا آپ ہندی کے متعلق ایسا خیال کر سکتے ہیں؟ خط بہت طویل ہو گیا مگر مضمون کی اہمیت کا تقاضا تھا۔ اُمید کہ آپ مزید اپنے خیالات کا اُردو کے سلسلہ میں اظہار فرمائیں گے۔"

بشیر احمد

جہاں نما

جنوبی ہندوستان میں ہندوستانی یعنی اُردو کی تعلیم

جنوبی ہند کی مسلم یوتھ کانفرنس کا چوتھا سالانہ جلسہ بیزواڈہ میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس کے شعبۂ اُردو کا ایک جلسہ ۱۹ر جون کو ہوا جس کے صدر مولانا عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمنِ ترقی اُردو اورنگ آباد تھے۔

مولانا نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اُردو یعنی ہندوستانی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کا عظیم الشان نتیجہ ہے اور یہ غلط ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے کیونکہ اس دَورِ نفاق میں بھی اُردو زبان کے ہندو شاعروں اور ادیبوں کی ایک زبردست جماعت موجود ہے۔

مولانا نے بتایا کہ وہ زبان جسے متعصب ہندو "ہندی" کا نام دیتے ہیں ہندوستان کی کوئی قدیم زبان نہیں بلکہ عہدِ حاضر کی ایک بدعت ہے کیونکہ چند ہی سال گزرے ہیں جب بعض کوتاہ اندیش ہندوؤں نے اُردو زبان میں سے عربی اور فارسی الفاظ نکال کر اُن کی جگہ سنسکرت کے غیر مانوس شبد رکھ دیئے اور اس نئی زبان کے لئے اُردو ہی کا ایک قدیم نام یعنی "ہندی" مخصوص کرلیا۔ یہ بالکل غلط خیال ہے کہ ہندی ہندوستان کی کوئی قدیم زبان ہے۔ جو زبانیں اُردو زبان کا سرچشمہ بنیں وہ موجودہ ہندی سے بالکل مختلف تھیں۔ مولانا نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ جنوبی ہندوستان کے اُن باشندوں کو جو اُردو نہیں جانتے ہندوستان کی یہ مشترکہ زبان سکھائیں۔ اُردو زبان میں مشرق و مغرب کے ادبیات اور قدیم وجدید علوم کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ ہندی کا تو ذکر ہی کیا، ہندوستان کی کسی دوسری زبان سے بھی معلومات کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ حاصل کرنا ناممکن ہے جتنا اُردو میں موجود ہے۔

اس جلسہ میں ذیل کی اہم قراردادیں بھی منظور ہوئیں :۔

یہ کانفرنس اندھرا اور چدمبرم کی یونیورسٹیوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ بھی مدراس یونیورسٹی کی طرح اُردو کا ڈپلوما دینے کے لئے امتحانات کا انتظام کریں اور کالجوں کے نصاب میں اختیاری مضمون کے طور پر اس زبان کو بھی شامل کریں۔

یہ کانفرنس ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل کمیٹیوں اور دوسری مقامی مجالس سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ہر ایسے مقام پر جہاں اُردو کے کم از کم بیس طلبہ موجود ہوں اس زبان کی تعلیم کا انتظام کردیں۔

قرار پایا کہ ایسے استادوں کی ایک جماعت تیار کی جائے جو جنوبی ہندوستان کی زبانوں میں "ہندوستانی" زبان کی تعلیم

دے سکیں۔

یہ بھی قرار پایا کہ مقامی زبانوں کے ذریعہ سے ہندوستانی زبان سیکھنے کے لئے ابتدائی کتابیں تابہ مقدور جلد تیار کی جائیں۔

اُردو کا نام

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ ہندی اور ہندوستانی اُردو ہی کے دو ابتدائی نام ہیں لیکن جب سے بعض فرقہ پرست ہندوؤں کی دُور اندیشی نے اپنی ایک مذہبی زبان کو نادانستہ طور پر ہندی کا عربی نام دے دیا اور اب ایک گروہ فارسی کا لفظ ہندوستانی بھی اسی ہندوانی زبان کے نام کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اُردو والے یعنی آزاد خیال اور اتحاد پسند ہندو اور مسلمان اس کشمکش و پیچ میں پڑ گئے ہیں کہ اُن کی زبان اپنے موجودہ نام ہی سے موسوم رہے یا از سرِ نو اس کے لئے ہندوستانی ہی کا نام اختیار کر لینا مناسب ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُردو کو ہندوستانی کا نام انگریزوں نے دیا ہے اور یہ نام دورِ غلامی کی یادگار ہے لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ علی گڑھ میگزین نے اُردو اور ہندوستانی کے مسئلہ پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آج سے صدیوں پیشتر ہندوستانی کا لفظ اُردو زبان کے لئے رائج تھا چنانچہ تاریخ فرشتہ میں سلطان علی عادل شاہ کے ذکر میں لکھا ہے "تا بہ ہندوستانی متکلم نمی شد"۔ یہی لفظ شاہجہاں کی درباری تاریخ بادشاہ نامے میں بھی موجود ہے۔ اُردو کا لفظ پہلے پہل میاں محمد حسین تحسین کی نو طرزِ مرصع (مصنفہ ۱۷۷۵ء) میں استعمال کیا گیا تھا اور ہندوستانی کے برعکس اُردو کے لفظ کی شہرت زیادہ تر انگریزوں ہی کی سرپرستی اور شاید حکمتِ عملی کی ممنونِ احسان ہے۔ کیونکہ فورٹ ولیم کالج ہی میں پہلے پہل اُردو کے مقابلہ میں ایک نئی زبان ہندی کھڑی کر دی گئی تھی۔ اُردو کے بجائے ہندوستانی کا نام استعمال کرنے کے حامیوں کی یہ دلیل قابلِ توجہ ہے کہ جب ہم خود ہندوستانی کہلاتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اپنی زبان کے لئے اس لفظ کے استعمال کو ہم باعثِ عار سمجھیں۔ اس کے علاوہ چونکہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی اور اُن کی مشترکہ کوششوں نے اسے پروان چڑھایا، مسلمانوں کا کوئی حق نہیں کہ وہ اسے ایک ایسے نام سے محروم کرنے پر اصرار کریں جس سے اِس کے ہندوستانیوں کا سرمایۂ مشترک ہونے کا پتہ چلتا ہو۔

حامد علی خاں

ہلکی پھلکی اور عام فہم ہندوستانی زبان (اُردو) کے بجائے سنسکرت کے بوجھل اور نامانوس الفاظ کا رواج وہی خود غرضانہ ذہنیت دینا چاہتی ہے جس نے کبھی سنسکرت کے دروازے عوام کے لئے بند کر دیئے تھے۔ صرف اُردو زبان ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔

اقبال

اقبال (علیہ الرحمۃ)

مبارک کائناتِ شعر کی پیغمبری تجھکو
دلوں میں احترامِ عشق پیدا کر دیا تُو نے

مبارک شاعرانِ خوشنوا کی سروری تجھکو
سخن کو دم میں ہمدوشِ ثریا کر دیا تُو نے

گراں خوابی ہوئی کافور تیری ضربِ پیہم سے
ہوئی سرسبز کشتِ ملتِ بیضا ترے دم سے

ترا ہر شعر دل کی سمت پورا وار ہے گویا
زبانِ پاک تیری تیغِ جوہر دار ہے گویا

ترے فیضِ نظر سے حریت کی بزم روشن ہے
تری ضربِ کلیمی سے غلامی لرزہ بر تن ہے

اشاروں میں دیا درسِ رموزِ بیخودی تُو نے
فنا کو بڑھ کے دکھلایا چراغ زندگی تُو نے

ترا سازِ خودی جس دم حقیقت پاش ہوتا ہے
مثالِ صبح رازِ زندگانی فاش ہوتا ہے

خرد واقف ہوئی آشفتگی کے آستانے سے
اِسے تُو راہ پر لایا جنوں کے تازیانے سے

جہاں میں نام پیدا کر لیا ہے ہمنشینوں نے
کئی خرمن بنا ڈالے ہیں تیرے خوشہ چینوں نے

اُسے کیا قحطِ مے ہو جس کو شاملِ لطفِ ساقی ہے
تجھے کیا غم ہے اے اُردو! ابھی اقبال باقی ہے

سکندر علی وجد۔ بی اے (عثمانیہ)

"اُردو کی بقا کے لئے کیا کرنا چاہئے"

دل سے اگر سُنو تو یہ سُننے کی بات ہے
ورنہ کسی پہ زور نہیں اختیار کیا! (آغا شاعر دہلوی)

"اُردو زبان" کی ترقی میں اُردو شعراء نے ہزار جد و جہد کی ہو اور وہ زمانہ ترقی کے سلسلے میں ہزار بہتر سمجھا جاتا ہو پھر بھی یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ موجودہ دَور "اُردو زبان" کا بہترین دَور کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس وقت ہر قسم کی طعن وتشنیع اور ہر طرح کی چوٹوں اور پھبتیوں کو برطرف کر کے تمام ہندوستان کی "اُردو دنیا" ایک مرکز پر آگئی ہے اور تمام اُردو دان و اُردو خوان طبقہ اس بات پر متفق ہے کہ "زبان کو ترقی دی جائے"۔ اس وقت نہ کوئی یہ کہتا ہے کہ ؂

نسیمؔ دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں
کوئی اُردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

اور نہ کوئی یہ دعوےٰ کرنے والا ہے کہ ؂

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہارِ بُوئے مشک غزالوں کے سامنے

اور نہ یہ کہ ؂

صحرائیانِ پُورب کیا جانتے ہیں اسکو
اے مصحفیؔ جُدا ہے انداز اس بیاں کا

بلکہ اب بقول حضرت ظریفؔ اس بات پر سبھی کا اتفاق ہے کہ ؂

لکھنؤ دہلی انہیں شہروں پہ کیا موقوف ہے
ہر جگہ اہلِ زباں ہیں، بے زباں کوئی نہیں

بلاشبہ یہ ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ اس وقت حال یہ ہے کہ ؂

اِک طرف انگلش زباں ہے اِک طرف ناگری
پس رہی ہے بے سبب بیچاری اُردو بیچ میں

غرض اس وقت "اُردو زبان" کی نہ صرف اصلاح کے اسباب و علل پر غور کیا جارہا ہے بلکہ اس کی ترویج و ترقی کے ذرائع بھی سوچے جارہے ہیں چنانچہ میں نے بھی اپنے ایک مضمون مطبوعہ ساقی (دہلی) جون ۱۹۳۷ء میں عرض کیا تھا کہ موجودہ اُردو زبان جس شکل و صورت میں ترقی کے مدارج طے کر رہی ہے یا جس پیچیدگی میں پڑی ہوئی ہے اُس کا اقتضا یہ ہے کہ ہم اُسے علی الحالہا بڑھائیں اور اُس کی صورت یہ ہے کہ :-

(۱) اُردو ادب کے سرمایہ میں خاطر خواہ اضافہ کریں۔

(۲) زبان کو جتنا ممکن ہو اغلاط و اسقام سے پاک کریں۔

(۳) غیر مانوس اور بھدی ترکیبیں اور تشبیہیں دور کریں۔

(۴) اُردو زبان کو جس قدر ممکن ہو وسعت دینے کی کوشش کریں۔

اس وقت اس مضمون میں ان ہی چاروں صُورتوں پر اظہارِ خیال کیا جا رہا ہے اور اپنی بساط کے مطابق بطورِ مشورہ یہ عرض کیا جا رہا ہے کہ ترقیٔ زبان کے سلسلے میں اس وقت کن چیزوں کا خیال اور لحاظ ضروری ہے۔

اُردو ادب کے سرمایہ میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے :-

"سرمایہ" سے مراد ٹھوس اور علمی و ادبی تصانیف ہیں۔ اس لئے حیدرآباد کے موجودہ اُردو ذخیرہ کے ساتھ اگر اُردو زبان کی اُن چند گنی گُنی علمی تصانیف کو جو اس وقت موجود ہیں ایک طرف کر دیجئے تو دوسری طرف جو کچھ بچتا ہے اُس میں بقول جناب رضا قاسم صاحب مختار بجز "عشق و محبت کے جذبات، ہجر و فراق کی بیتابیوں، رقابت کے شکووں اور حُسن کی دلفریبیوں" کے اور کچھ نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ چیزیں اُردو زبان میں تمام ارتقائی منازل طے کر چکی ہیں اور اس لئے ہم اسے دوسری زبانوں کے مقابلے میں پیش بھی کر سکتے ہیں مگر صرف اس چیز سے زبان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؛ نہ تو اس سے وہ کامیاب و پائدار ہو سکتی ہے اور نہ مستقل و کارآمد۔

اس جگہ ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ جناب رضا قاسم صاحب مختار نے اپنے ایک مضمون "ہماری زبان" مطبوعہ کلیم (دہلی) جنوری ۱۹۳۷ء میں تحریر فرمایا ہے کہ:-

"واقعات نگاری کی سحر بیانیاں مناظرِ فطرت کے دلفریب مشاہدات اور
جذبات کی زندہ تصویریں اُردو شاعری میں بقدر چاشنی پائی جاتی ہیں"۔

یہ صحیح نہیں، جہاں تک اعلےٰ درجے کی نظموں کا سوال ہے، اُردو زبان بھی اپنے اندر اس موضوع پر ایک وسیع اور گرانبہا ذخیرہ رکھتی ہے اور اس زبان میں بھی ایسی ایسی نظمیں موجود ہیں جو انگریزی و فارسی شعراء کی نظموں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ میں تو بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ "نظم کے سلسلے میں" اُردو زبان" اگر آگے نہیں ہے تو کسی طرح عربی، فارسی اور انگریزی سے پیچھے بھی نہیں ہے"

بہرحال آمدم برسرِ مطلب۔

ملٹن نے ایک جگہ کہا ہے کہ "عمدہ کتاب زندہ ہی نہیں بلکہ ایک غیر فانی چیز ہے"۔ لیکن اُردو زبان کے محققِ اعظم حضرت مولانا عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ "عمدہ کتاب خود ہی غیر فانی نہیں بلکہ اپنے لکھنے والے کو، اُن کو جن کا اس میں ذکر ہے اور بعض پڑھنے

خیالات میں عظیم الشان تغیر پیدا کیا ہے۔ توموں میں ہلچل اور انقلابات بپا کئے ہیں اور ملکوں کی کایا پلٹنے میں حیرت انگیز مدد دی ہے۔" اس لئے "جو لوگ فضول، معمولی اور ادنےٰ درجے کی کتابیں پڑھتے ہیں، وہ گویا معمولی، ذلیل اور ادنےٰ معلومات کو اپنے دماغ میں بھرتے ہیں تاکہ اعلےٰ معلومات کی گنجائش باقی نہ رہے۔"

بلاشبہ اس وقت اُردو زبان ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور اس میں اس قدر رُوح موجود ہے کہ اسے علمی و ادبی زبان کا بلند درجہ حاصل ہو جائے۔ ایسی صورت میں نہ صرف یہ ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دیگر غیر زبانوں کی اعلےٰ تصانیف، اچھی سوانح عمریاں اور بلند پایہ تاریخی سرمایہ اُردو زبان میں منتقل کیا جائے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے وہ مشاہیر جنہیں قدرت کی جانب سے تندرست دل و دماغ عطا ہوا ہے اپنی اعلےٰ استعداد کے اُن جواہر کو جو اب تک صرف اُن کے دماغ میں محفوظ ہیں، کاغذ و کتاب پر بکھیر دیں۔ مولانا عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو اورنگ آباد نے "مبادیٔ سائنس" مترجمہ جناب معشوق حسین خان صاحب کے مقدمہ میں کیا خوب لکھا ہے کہ:-

"اُردو زبان کی توسیع و ترقی کا بہت بڑا ذریعہ یہی ہے کہ اُسے علمی زبان بنانے کی کوشش کی جائے۔ اگر زبان سے صرف یہ مقصود ہے کہ روزمرہ کی بات چیت کھانے، پینے، بیٹھنے، اُٹھنے سونے، مُنہ دھونے کی کر لی جائے تو اتنا تو شاید جانور بھی آپس میں کہہ سُن لیتے ہیں۔ ایک ایسی زبان جسے ہندوستان سے عظیم الشان ملک کی عام زبان ہونے کا دعویٰ ہے، اُسے اسی قدر وسیع ہونا چاہئے جتنا وسیع اُس کا ملک ہے۔ اور اُس کی اسی قدر مختلف حیثیتیں ہونی چاہئیں جتنی اُس میں مختلف اقوام و ملل ہیں۔ اور یہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس میں مختلف علوم و فنون نہ آ جائیں۔ علاوہ اس کے ملک میں بھی تعلیم اُسی وقت پھیل سکتی ہے جب علوم و فنون کی کتابیں ملکی زبان میں ہوں، ہر شخص انگریزی یا یورپین زبانیں نہیں جان سکتا۔ فی صدی چند ہی ایسے آدمی ہونگے جو یہ زبانیں جانتے ہیں۔ باقی سارے ملک کی تعلیم کا دارو مدار دیسی زبان پر ہے۔ لیکن جب دیسی زبان میں سوائے دیوانوں، عشقیہ مثنویوں، ناولوں، تاریخی قصوں کے کچھ نہ ہو تو علم کی روشنی کیسے پھیلے۔ اور جب علم پڑھنے کے لئے ایک غیر زبان سیکھنی پڑے تو ہماری زبان کس مرض کی دوا ہے؟ آخر دوسروں کی زبان سے کب تک کام نکلے گا۔ اور ہم گونگے بنے کب تک دوسروں کا مُنہ تکتے رہیں گے؟"

شکر ہے کہ مولانا موصوف کی آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔ شاید انہیں کی کوشش کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے مشاہیر اہلِ قلم ہمہ تن اس طرف مصروف ہیں اور آئے دن نئی نئی کتابیں تصنیف، تالیف اور ترجمہ ہو رہی ہیں۔ پھر بھی ضرورت ہے کہ اس انہماک

کی رفتار میں برقی رَو پیدا کی جائے اور اس خدمت کو ایسی سرعت سے انجام دیا جائے کہ دُنیا حیران رہ جائے۔

اس سلسلے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے یا بیشتر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہماری "اُردو زبان" میں تخلیقی انشا پردازی کی کمی ہے یا بالفاظِ دیگر اُردو زبان میں "اورجنلٹی" نہیں پائی جاتی۔ یہ اعتراض ایک حد تک دُرست ہے مگر شاید معترضین اس بات پر غور نہیں کرتے کہ جب تک ہماری زبان میں دوسری زبانوں سے ہر قسم کے خیالات منتقل نہ ہوں یا جب تک ہمارے سامنے دوسری زبانوں کے خیالات موجود نہ ہوں، وہ کونسی صورت ہے جس سے ہم میں تخلیقی طاقت پیدا ہو؛ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر زبان میں پہلے دوسری غیر زبانوں کے شہ پارے اور اعلےٰ خیالات منتقل کئے جاتے ہیں تب جا کر وہ کہیں اس قابل ہوتی ہے کہ اُس میں اچھے لکھنے والے پیدا ہوں ورنہ بغیر کسی بڑی زبان کا سہارا لئے ہوئے آج تک یہ نہیں دیکھا گیا کہ کسی زبان نے ترقی کی ہو۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ ماں کے پیٹ سے کوئی "علم" یا "زبان" لے کر نہیں پیدا ہوتا بلکہ اُسے سکھایا جاتا ہے، اُسے تعلیم دی جاتی ہے اور اُسے بتایا جاتا ہے تب جا کر وہ کہیں اس قابل ہوتا ہے کہ اپنا خیال، اپنی خواہش اور اپنا ارادہ دوسروں پر ظاہر کر سکے۔ اسی طرح جب تک ہماری زبان میں دوسری غیر زبانوں کے اعلےٰ ادب منتقل نہ ہوں گے ہم میں کسی طرح تخلیقی صلاحیت یا اورجنلٹی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ بلاشک ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زورؔ قادری کا یہ قول صحیح ہے کہ :-

"جب تک اس قسم کا ادب ہماری زبان میں موجود نہ ہوگا نہ تو ہماری نظریں وسیع ہوں گی، نہ ہمارے خیالات میں گہرائی پیدا ہوگی اور نہ ہمارا ادبی ذوق صحت و رفعت حاصل کر سکے گا۔ یہی وہ خصوصیتیں ہیں جن کے بغیر اعلےٰ درجہ کی اُپچی انشا پردازی ممکن نہیں، اور جن کی کمی کی وجہ سے ہماری زبان میں بڑے بڑے لکھنے والے کم پیدا ہو رہے ہیں۔"

زبان کو جتنا ممکن ہو اغلاط و اسقام سے پاک کیا جائے :-

"اغلاط و اسقام" کے معنی آج کل یہ لئے جاتے ہیں کہ دوسری زبانوں کے جو الفاظ اُردو زبان میں باختلافِ اعراب مستعمل ہیں اُن کا شمار اغلاط و اسقام میں ہے۔ چنانچہ ہر صُوبے کے اُردو رسائل وغیرہ میں اکثر مضامین اسی قسم کے شائع ہوئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ فلاں فلاں لفظ فارسی، عربی، ترکی، بنگالی اور ہندی ہے اور اصل زبان میں فلاں اعراب کے ساتھ رائج اور مستعمل ہے اس لئے اُردو زبان میں بھی وہ الفاظ اُنہیں اعراب کے ساتھ استعمال کئے جائیں جو اصل میں ہیں؛ میری دانست میں اس جگہ نہ صرف حضرت تاجور نجیب آبادی مدیرِ شاہکار کا یہ لکھنا صحیح ہے کہ :-

"ہم نے جن الفاظ کو دوسری زبانوں سے لے کر جس تلفظ اور املا میں اُردو میں استعمال کیا اور فصحائے اُردو میں اس کا رواج ہُوا، اُردو میں صرف وہی تلفظ صحیح ہوگا۔ اصلی تلفظ اور املا سے ان الفاظ کو کوئی واسطہ نہ رہے گا۔ مختصر یہ کہ فصحا اور مستند ادبا کا استعمال ہی سندِ صحت و فصاحت ہے۔"

بلکہ حضرت جوش ملیح آبادی مدیر کلیم کے ایک استفسار کے جواب میں جناب عبداللطیف صاحب لکچرار اخلاقیات عثمانیہ کالج کے "دریائے لطافت" سے انشاء اللہ خاں کا یہ قول نقل کرتے ہوئے کہ:-

"مخفی نماند کہ ہر لفظے کہ در اُردو مشہور شد عربی باشد یا فارسی یا ترکی یا سریانی یا پنجابی یا پوربی از رُوئے اصل غلط باشد یا صحیح آں لفظ اُردو ست اگر موافق اصل مستعمل است صحیح است صحت و غلطی آں موقوف بر استعمال پذیرفتن در اُردو است زیرا کہ ہرچہ خلاف اُردو است غلط است گو در اصل صحیح باشد و ہرچہ موافق اُردو است صحیح باشد گو در اصل صحت نداشتہ باشد۔"

اور پھر مولانا عبدالحق کا خیال اس اقتباس کے متعلق ظاہر کرتے ہوئے یہ لکھنا کہ:-

"جو الفاظ بلا تکلف اُردو میں بولے جاتے ہیں اُن کو زبانِ اُردو میں اگر باقی رکھا جائے تو کوئی قباحت نہیں۔"

بالکل صحیح ہے۔ اس دَور میں جب کہ اُردو زبان کروڑوں ہندوستانیوں کی زبان ہے اور ہندوستان سے گزر کر دیگر ممالک میں بھی پہنچ چکی ہے یہ کہنا کہ فلاں لفظ اس طرح نہیں بلکہ اصل کی طرح یوں صحیح ہے، فضولِ محض ہے۔ جس لفظ کو جس طرح اُردو زبان نے توڑ مروڑ کر اپنا لیا ہے، جو لفظ جس جگہ جن اعراب کے ساتھ اُردو زبان میں بولا جاتا ہے اور جو لفظ اُردو میں جس جس طرح مستعمل ہے، وہی صحیح و درست فصیح و بلیغ اور معتبر و مستند ہے۔ چنانچہ آتش کا وہ جواب بہت مشہور ہے جو انہوں نے "بیگم" اور "انصاف" کے استعمال پر معترضین کو دیا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ جب مفتون نے رائے لچھمی نراین متخلص بہ شفیق و صاحب پر یہ اعتراض کیا تھا کہ انہوں نے "ختم" کو بفتحِ اوّل و دوم و بسکونِ سوم لکھا ہے جو غلط ہے تو صاحب نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ:-

گر "ختَم" کہوے "ختم" کو صاحب | ہے روا حرکتِ مقام کو دیکھ
ریختے کی زباں میں یہ غلطی | ابتدا سے ہے انتظام کو دیکھ
آبرو "زُلف" کو "زُلَف" بولا | اور الفاظِ ناتمام کو دیکھ
نقل ہے وقتِ مغرب اعظم شاہ | یوں کہا اپنے ایک غلام کو دیکھ
ہووے "اسواری" اس گھڑی تیار | سیر چاہے ہے جی یہ شام کو دیکھ
مولوی جیون استادِ شاہ | تب کہے یوں تو اس پیام کو دیکھ

لفظ "اسواری"، نہیں "سواری" ہے　　کچھ تو اِس حجتِ کلام کو دیکھ
شاہ نے تب تو یہ جواب دیا　　میری طرزِ سخن تمام کو دیکھ
یہ عبارت کہاں ہے "ہندی" میں،　　اس میں جائز ہے تو نظام کو دیکھ

مولانا عبدالحق صاحب نے "چمنستانِ شعراء" کے مقدمے میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"شفیق کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ عربی کے جو لفظ عام طور پر اُردو میں بہ تبدیلِ حرکت وغیرہ بولے جاتے ہیں اور جو زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں، وہ اُسی طرح فصیح ہیں خواہ وہ اصل لُغت کے اعتبار سے غیر صحیح کیوں نہ ہوں۔"

لاریب یہ صحیح ہے کہ جو زبان جس قدر وسیع اور جامع ہوتی جائے گی اُسی قدر اُس میں دوسری زبانوں کے الفاظ آئینگے اور آنے کے بعد وہ جس طرح منجھ جائیں گے وہی صحیح و فصیح ہوں گے۔ نیز اس کا تعلق زیادہ تر عوام کی زبان سے ہے، عوام جس طرح استعمال کریں گے وہ بہ نسبت خواص کے زیادہ لائقِ اعتناء اور قابلِ لحاظ ہوگا چنانچہ ایک ماہرِ لسانیات کا قول ہے کہ:۔

"تحریری اور ادبی زبان ایک مخصوص طبقہ کی زبان ہوتی ہے اور مکمل زبان کا صرف ایک خاص نمونہ۔ یہ اُن لوگوں کی زبان ہے، جو زبان کو قاعدوں اور اصُولوں کی مدد سے ہموار بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی ہمواری فطرت کا اصُول نہیں یہ انسان کا خود ساختہ قانون ہے۔ فطرت کے ترجمان وہی لوگ ہوتے ہیں جو اُن اصُولوں اور پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں، اُن ہی کی زبان، زبان کے فطری رُجحانات ظاہر کر سکتی ہے۔ اور وہی اُس زبان کا صحیح نمونہ پیش کرنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔"

یہ صرف اُردو زبان ہی پر منحصر نہیں بلکہ دوسری زبانوں کا بھی یہی حال ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ لئے گئے ہوں اور تلفظ یا اعراب میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی ہو، اس لئے اُردو زبان میں اس طرح کی چھان بین نہ صرف فضول بلکہ غلط اور لغو بھی ہے۔

"اُردو زبان" میں ایک اور چیز قابلِ خیال ہے، وہ یہ کہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کے اعراب تو اعراب معنی تک بدل جاتے ہیں۔ وہ دوسری زبان میں دوسرے معنوں میں مستعمل ہیں اور "اُردو" میں وہ کچھ اور معنی رکھتے ہیں۔ مثلاً "غلیظ" کے معنی عربی میں "دبیز" کے ہیں لیکن اُردو میں "غلیظ" گندے کو کہتے ہیں، یا "پنجرہ" کے معنی فارسی میں اُس کٹہرے کے ہیں جو قبر کے چاروں طرف لگایا جاتا ہے لیکن اُردو میں یہ لفظ بمعنیٰ "قفس" مستعمل ہے۔ اسی طرح "کُٹا" ہندی میں" پر اکھاڑے ہوئے کبوتر" کو کہتے ہیں لیکن اُردو میں یہ لفظ "ٹکڑے ٹکڑے" کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی کس طرح ممکن ہے کہ اُردو زبان میں کسی لفظ کو اُسی معنی میں استعمال کیا جائے جس معنی میں وہ اصل زبان میں مستعمل ہے؛

در اصل اغلاط و اسقام دُور کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جو لفظ جس ہجاء کے ساتھ صحیح ہے اُسی ہجاء کے ساتھ لکھا جائے۔ جو لفظ جس معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اُسی معنی میں استعمال کیا جائے۔ جو عبارت اُردو زبان میں بلا تکلف کہی جاسکتی ہے وہ خواہ مخواہ انگریزی یا غیر مانوس عربی و فارسی الفاظ کے استعمال سے کٹھن نہ بنائی جائے اور جو لفظ فرسودہ، پامال، کریہہ، غیر مہذب اور بیکار ہو اس کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ بس، ورنہ اگر تمام مروجہ الفاظ کو اغلاط و اسقام میں شمار کرکے اُن کی صحتِ استعمال کا لحاظ و خیال کیا جانے لگا تو پھر سمجھ لیجئے کہ نہ اُردو زبان "زبان" رہے گی اور نہ اس کا وجود۔

غیر مانوس اور بھدی ترکیبیں اور تشبیہیں دُور کی جائیں :-

یہ چیز اُردو زبان میں خاص طور سے قابلِ لحاظ ہے۔ آئے دن یہ دیکھا جاتا ہے کہ مشاہیر محض اس بات پر خنجر بکف نظر آتے ہیں، کہ فلاں ترکیب غلط، فلاں اصلاح نادرست اور فلاں تشبیہ مہمل ہے۔ حالانکہ اس وقت جب کہ اُردو زبان کی ترقی کا سوال درپیش ہے، دیکھنے کی چیز محض یہ ہے کہ آیا وہ ترکیب تشبیہ اور اصطلاح جو مصنف یا شاعر نے استعمال کی ہے، بھدی اور غیر مانوس ہے یا لطیف و ملیح، اگر بھدی اور غیر مانوس ہے تو زبان سے خارج کردی جائے اور اگر نہیں تو پھر محض اس وجہ سے کہ اس سے قبل دیکھی نہیں گئی ہے یہ کہہ دینا کہ غلط ہے یا اُس کا ثبوت تلاش کرنا اُردو زبان پر ظلم کرنا ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب کا "گلشنِ ہند" کے مقدمہ میں موجودہ صحافت پر یہ اعتراض بالکل بجا تھا کہ :-

> "اُردو شاعری کا اب تک وہی حال ہے۔ مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقررہ ہیں اور اب تک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں۔ کبھی نئی تشبیہ کا کہنا بڑی بہادری اور جرأت کا کام ہے کیونکہ ہمارے نکتہ سنج شاعر اس کے لئے سند طلب کرتے ہیں جیسے کوئی قانون دان کسی فوجداری جرم میں تعزیراتِ ہند کی دفعہ تلاش کرتا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ جب اُردو زبان کا دارومدار تقریباً کُل کا کُل عربی و فارسی زبان پر ہے اور ہمیں دن رات عربی و فارسی زبان سے اس طرح سروکار ہے کہ بقول نیاز صاحب :-

> "پیدائش سے لے کر جب کان میں اذان دی جاتی ہے، نزع کے وقت جب تک سُورۂ یٰسین سنائی جاتی ہے، مسلمان کا تعلق عربی و فارسی الفاظ سے اک ایسا غیر منقطع تعلق ہے کہ ہم اس کو علیحدہ کرکے اپنے قومی وجود کو قائم رکھ ہی نہیں سکتے۔"

تو یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ ہمارے شعراء، ادباء اور مشاہیر اہلِ قلم کی ہر نئی ترکیب و تشبیہ پر داروگیر اور ہر نئی اصطلاح پر صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے عام ازیں کہ وہ قطعی صحیح اور درست ہی کیوں نہ ہو؛ ہاں ایسی ترکیبات، تشبیہات اور ایسے الفاظ

واصطلاحات بیشک قابلِ گرفت اور لائقِ اعتراض ہیں جو غلط، غیر مانوس اور بھدے ہونے کے ساتھ ساتھ بالکل متضاد معنی بھی پیدا کریں ورنہ ہر نئی ترکیب و تشبیہ اور اصطلاح پر اُعمل پڑنا حماقت ہے۔ کیونکہ جب کبھی کسی ایسی موضوع پر قلم اُٹھایا جائے گا جس کا شمار مسائل دقیقہ میں ہے تو بالارادہ مصنف اور شاعر کو ایسے الفاظ و اصطلاحات اور ایسی ترکیبیں، تشبیہیں تلاش اور وضع کرنی پڑیں گی جو قرار واقعی اس مفہوم کو ظاہر کر سکیں۔ چنانچہ اگر ہم سیماب، جوش، اقبال وغیرہ شعرا، یا نیاز، آزاد وغیرہ ادبا کی تصانیف دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں نے حسبِ ضرورت نئی نئی قسم کی تشبیہیں اور تمثیلیں اور نئی نئی قسم کے الفاظ و اصطلاحات وضع کئے ہیں حیدرآباد میں جتنی تصانیف کا ترجمہ ہوا ہے، اُن میں ایسی ایسی ترکیبیں اور ایسی ایسی اصطلاحیں ملتی ہیں جو نہ کبھی دیکھی گئیں اور نہ سُنی گئیں۔ وجہ صاف ہے کہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اُردو زبان میں الفاظ موجود نہ تھے چنانچہ "مبادی سائنس" مترجمہ معشوق حسین صاحب کے مقدمہ میں مولانا عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :-

> "قابل مترجم نے نہایت تحقیق اور جانکاہی سے تمام اصطلاحات کا عربی میں ترجمہ کیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ حتےالامکان قدیم اور مروّجہ عربی اصطلاحات لکھی جائیں۔ جہاں کہیں کوئی عربی اصطلاح نہیں ملی وہاں موزوں اور مناسب اصطلاح عربی زبان میں بنالی گئی ہے۔ عربی زبان میں جدید الفاظ بنانے کی بہت کچھ گنجائش ہے اور سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اس وسیع اور بے نظیر زبان سے فائدہ اُٹھایا جائے۔"

بہرحال اُردو زبان کی سعیٔ وسعت ہمارے نقاد و مشاہیر سے اِسی بات کی متمنی اور متقاضی ہے کہ اُسے واجب حد تک آزادی دیں ورنہ جو چیز ابتدا ہی میں جکڑ دی جاتی ہے وہ کبھی نہیں بڑھتی اور جو کلی ابتدا ہی میں توڑ لی جاتی ہے وہ کبھی شگفتہ نہیں ہو سکتی۔

اُردو زبان کو جس قدر ممکن ہو وسعت دینے کی کوشش کی جائے :-

ملک کی ترقی کا سب سے بڑا راز زبان میں ہے اس لئے کوئی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جس وقت تک وہ اپنی "زبان" کو فروغ نہ دے اور "زبان" کی ترقی کے لئے یہ کافی نہیں کہ اُس میں ہر طرح کے مصنف پیدا ہوں یا ہر طرح کی تصنیفات وجود میں آئیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اُس میں اچھے اچھے اخبار و رسائل موجود ہوں کیونکہ "زبان" اُسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب کہ وہ زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچ سکے یا زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچائی جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے اخبار و رسائل سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ نہیں کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو نہ صرف اپنی "زبان" کو ترقی کے مدارج طے کراتی ہے بلکہ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے افراد تک ایک دوسرے کے احساسات و خیالات کو بھی پہنچاتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "زبان" "سکہ" اور "دریا" یہ تینوں ایسی چیزیں ہیں جن کا تمام تر دا[illegible]ت و روانی پر ہے۔ اگر ان کو ساکن کر دیا جائے

توان کا وجود نہ باقی رہے، مگر جس طرح قوم کی ترقی کا راز "زبان" میں ہے بالکل اسی طرح "زبان" کی ترقی کا مدار قوم پر ہے۔ اس لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ملک کے چند افراد اس کی خدمت میں اپنے اوقات، روپے، دماغ اور صحت برباد کریں بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ ملک کا ہر فرد چاہے وہ کسی طبقہ، قومیت اور صوبہ کا ہو ایسے لوگوں کا ہاتھ بٹائے جو اس طرف لگے ہوئے ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں دو زبانوں کا چرچا ہے۔ اُردو اور ہندی۔ چنانچہ دونوں زبانوں میں متعدد اخبارات و رسائل جاری ہیں مگر حقیقت ہے کہ اُردو یا ہندی کا کوئی اخبار اور رسالہ ایسا نہیں جو اپنے پیر پر کھڑا ہو کر غریب ایڈیٹروں کو تیس دن کے فاقہ سے آزاد کرے۔ پھر بھی بہ نسبت اُردو کے ہندی کا حال اچھا ہے۔ "ہندی" کا اگر کوئی اچھا اخبار یا رسالہ نکلتا ہے تو اس کے خریدار کم از کم چھ سات ہزار ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ اُن کی آبادی زیادہ ہے بلکہ محض اس وجہ سے کہ ان میں "زبان" کی خدمت کا جذبہ بہ نسبت اُردو والوں کے زیادہ ہے برخلاف اس کے "اُردو" کا شاید ہی کوئی رسالہ یا اخبار ایسا ہو جس کی اشاعت چار ہزار سے زائد ہو۔ حد تو یہ ہے کہ جو اُردو اخبار یا رسالہ "ہندو" نکالتے ہیں وہ بھی بہ نسبت مسلمانوں کے اخبارات کے اچھی حالت میں ہے چنانچہ پروفیسر سوم ناتھ نے "ہمایوں" ہی میں لکھا ہے کہ:۔

> "پنجاب میں اس وقت اُردو کے آٹھ مشہور روزانہ اخبار شائع ہوتے ہیں چنانچہ ہندوؤں کے چار اخباروں کی اشاعت کی مجموعی تعداد ساڑھے تیس ہزار ہے اور مسلمانوں کے اتنے ہی اخبار مجموعی طور پر ساڑھے سات ہزار کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں"۔

بہرکیف اُردو زبان میں اس وقت نئے، پرانے، اچھے، بُرے اور معیاری و غیر معیاری ہر طرح کے رسائل موجود ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ کوئی رسالہ ایسا نہیں جس کی اشاعت میں تمام منافع خرچ کرنے کے بعد بھی غریب ایڈیٹروں کو ایک گرانقدر رقم کا بار خود نہ اُٹھانا پڑتا ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی اقتصادی حالت بہت خراب ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ہندوستان کا متموّل طبقہ "زبان" اور "ادب" کے لئے مجروح، مفلوج اور مدقوق ہے، مگر سوال یہ ہے کہ اقتصادی حالت کے خراب ہوتے ہوئے بھی عوام اپنی زندگی کے دن اور اپنی عام ضرورتیں کس طرح پوری کر رہے ہیں؛ پھر یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہم "زبان" اور "ادب" کی خدمت اس وقت کریں جب کہ ہمارے پاس اپنی ساری ادنیٰ ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد روپے بچیں؛ بات یہ ہے کہ یہ محض ہماری شامت ہے، ہم "غریب" ہیں تو محض "ادب" اور "زبان" کی خدمت کے لئے، ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں تو صرف تصنیفات و تالیفات کے لئے اور ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں تو صرف اخباروں اور رسالوں کی خریداری کے لئے ورنہ دنیا کا کون سا ایسا کام ہے، جو ہم

نہیں کر رہے ہیں، ہماری کونسی ایسی خواہش ہے جو پوری نہیں ہو رہی ہے۔ اور ہمارا وہ کونسا ارادہ ہے جس میں ہم کامیاب نہیں ہو رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں چند غریب ایڈیٹر جو محض "زبان" و "ادب" کی خدمت کے سلسلے میں خون پانی ایک کئے ہوئے ہیں، کیا کر سکتے ہیں۔ بہرحال ہندوستان کی موجودہ اُردو فضا جس قدر مکدر ہو رہی ہے، وہ اس بات کی مقتضی ہے کہ تمام اُردو خواں اصحاب اپنی ساری ضرورتوں کے ساتھ خدمتِ زبان و ادب کو بھی اپنے فرائض میں شمار کرتے ہوئے اس طرف متوجہ ہوں اور "زبان" کی ترقی کے لئے اُردو زبان کے بلند پایہ جرائد و رسائل اور اخبارات نہ صرف خود خریدیں اور اُن کی توسیعِ اشاعت کی کوشش کریں بلکہ تمام ایسی انجمنوں میں بھی شریک ہو کر اُن کی دامے درمے مدد کریں جو اُردو زبان کی بقا کے لئے قائم کی گئی ہیں ورنہ وہ دن دُور نہیں جب "اُردو زبان" کرب و اضطراب کے دن گذار کر اپنی آخری ہچکیوں کے ساتھ یہ کہتے ہوئے دم توڑ دے کہ ؎

تو کہ از دستِ غیر نالہ کنی　　　سعدی از دستِ خویشتن فریاد

(عنوان زیرِ بحث ختم ہو گیا ہے مگر جب "اُردو" کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا جا رہا ہے تو اس سلسلے میں چند ایسی غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔ جو ممکن ہے آگے چل کر اُردو زبان کی ترقی میں رُکاوٹیں پیدا کر دیں۔)

"بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کے اجلاس کے بعد غیر مسلموں نے جس طرح ہندی کی ترویج کے ساتھ ساتھ اُردو کی بیخ کنی کو اپنے فرائضِ منصبی میں داخل کر لیا ہے اُس کا اندازہ جناب میاں بشیر احمد صاحب مدیر "ہمایوں" کے اُس مضمون سے ہوتا ہے۔ جو اُنہوں نے "ہندی کی نشر و تبلیغ کے لئے کیا کچھ ہو رہا ہے" کے عنوان سے شائع کیا ہے اس کے دیکھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ "ہندی" کو کامیاب بنانے کے تمام ممکن ذرائع بہم پہنچائے جا رہے ہیں مگر جو چیز سب سے زیادہ قابلِ لحاظ ہے وہ ذمہ دار افراد کی چال ہے جو وقتاً فوقتاً فدایانِ اُردو کو محض دھوکا دینے کے لئے خطوط و اشتہارات کی صورت میں چلی جاتی ہے۔

ساہتیہ پرشد کی غیر مناسب کارروائیوں کے بعد چند ایسے پمفلٹ، خطوط اور مضامین شائع ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان کے مخالف نہ تو جناب مہاتما گاندھی جی صاحب بالقابہ ہیں اور نہ جناب پنڈت جواہر لال نہرو صاحب۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے یا آئندہ ہو گا وہ ان ہی اصحاب کی ادنے جنبشِ لب یا ابرو کا نتیجہ ہے اور ہو گا۔ پھر ایسی صورت میں بچارے پنڈت سُندر لال صاحب یا پنڈت برج موہن صاحب دتا تریہ کی یہ کوششیں کہ غیر مسلم اصحاب حقیقتہً اُردو زبان کا ساتھ نہ چھوڑیں کس طرح اور کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہیں؟

ڈاکٹر اشرف صاحب نے گاندھی جی کی طرف سے اُردو دُنیا کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ گاندھی جی اُردو کے خلاف نہیں ہیں، جو پمفلٹ شائع کیا ہے اُس پر حضرتِ نیاز کافی لکھ چکے ہیں کیونکہ اس سے قبل گاندھی جی کی طرف سے ایک اور مضمون "غلط فہمیوں کے جالے" شائع ہو چکا ہے جس میں یہی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دراصل گاندھی جی "اُردو" کے خلاف نہیں ہیں بلکہ عوام کو محض دھوکا

ہوا ہے۔ مگر جب اُس میں بھی ناکامی ہوئی تو اُنہوں نے پنڈت سُندر لال کے خط کے جواب میں یہ چال چلی اور یہاں تک لکھا کہ جب وہ روزانہ ایک نہ ایک اُردو کتاب ضرور پڑھتے ہیں اور مسلمان بھائیوں کو اُردو ہی میں خط لکھتے ہیں تو وہ اُردو کے خلاف کیسے ہو سکتے ہیں؟ مگر افسوس ہے کہ وہ اس میں بھی ناکام رہے۔ جس کی وجہ محض یہ ہے کہ اُردو دُنیا نے ان کی باتوں کی حقیقت سمجھ لی ہے کہ کہیں اُن کی زبان کچھ کہتی ہے اور کہیں اُن کا "قلم" کچھ لکھتا ہے۔ اب یہ کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ اُن کی "تحریر" صحیح ہے یا "تقریر"؛ رہے پنڈت جواہر لال نہرو صاحب جن کے ہاتھ میں اس وقت ہندوستانیوں کی قسمت ہے تو افسوس ہے کہ وہ بیچارے بھی گاندھی جی کے قدم بقدم چلنے پر مجبور ہیں۔

جنابِ ساغر مدیر "ایشیا" (میرٹھ) نے ایشیا ستمبر ۱۹۳۶ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کے اُس خط کے جو اُنہوں نے ڈاکٹر محمود کو لکھا تھا بجا اقتباسات پیش کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال کی پوزیشن صاف کرنی چاہی ہے، مگر افسوس ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ شاید ساغر صاحب نے مولانا عبدالحق صاحب کے مضمون "بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت" کے اُس حصے کو غور سے نہیں دیکھا جس میں صاحب موصوف نے پرشد کی کارروائیوں کا بالتفصیل تذکرہ کرتے ہوئے اِس امر پر اظہار افسوس کیا ہے کہ جس وقت پرشد میں ۲۳ اپریل کی سہ پہر کو "ہندی ہندوستانی" کی بحث چھڑی ہوئی تھی اور گاندھی جی نے فرمایا تھا کہ:-

"میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ ساتھ چلنا ہے"۔

اُس وقت پنڈت جواہر لال صاحب (جو اس وقت اُردو کے زبردست حامی کی حیثیت سے پیش کئے جا رہے ہیں) تشریف فرما تھے مگر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بھلا جواہر لال کا سا شخص (جو سچی بات کہنے میں کسی بڑی طاقت سے آج تک نہ ڈرا) اگر وہ واقعی اردو کا بہی خواہ ہوتا تو کیا ایسے موقع پر گاندھی جی کی شخصیت سے مرعوب ہو کر خاموشی اختیار کر سکتا تھا؛ ہرگز نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہ بھی جیسا کہ ہونا چاہیئے اپنے گروہ سے الگ نہیں مگر اس وقت جبکہ اس کی ضرورت ہے اُنہیں کچھ نہ کچھ تاویل کرنی ہی ہے۔ بہر حال! اب اس قسم کی کوشش کہ اُردو دُنیا گاندھی جی یا پنڈت جواہر لال کی بابت مان لے کہ وہ واقعی "اُردو" کے مخالف نہیں ہیں، کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتی۔ نیز اُنہیں یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ بقول بزم آفندی صاحب ؎

ہفت اقلیم میں بجتا ہے اسی کا ڈنکا ۔۔۔ اب یہ نوبت ہے کہ ہرجا ہے زبانِ اُردو

اِس لئے: ع

اب مٹائے سے مٹے گی نہ زبانِ اُردو

عطاء اللہ پالوی

بانکی پور

لالۂ طُور ترجمہ "کیلاش کنول"

میں نے "پیامِ مشرق" سے "ہمایوں" کے لئے "لالۂ طُور" کا ترجمہ علامۂ اقبالؔ کی اجازت حاصل کرنے کے بعد کیا ہے۔ براہِ کرم کوئی صاحب میری اجازت کے بغیر شائع کرنے کا قصد نہ فرمائیں۔

مقبول احمدپوری

(۵۴)

عقاباں را بہائے کم نہد عشق
تدرواں را بہ بازاں سر دہد عشق
نگہ دارد دلِ ناخویشتن را
کمین از کمین نشین بر جہد عشق

(ترجمہ)

باز کا مُول گھٹا کے لگائے
باز سے پریم بئے[1] کو بڑھائے
پریم سے دل اپنے کو بچائے
گھات سے پریم جھپٹ کے آئے

(۵۶)

نہ ہر کس از محبت مایہ دار است
نہ با ہر کس محبت سازگار است
بروید لالہ با داغِ جگر تاب
دلِ لعلِ بدخشاں بے شرار است

(ترجمہ)

پریم کا دھن ہر کوئی نہ پائے
پریت ہر ایک کو راس نہ آئے
اُڈگے[2] کنول، بھر نین میں آنسو
آگ نہ لال رتن دکھلائے

---

[1] بیّا ایک چھوٹا زردی مائل چتلا پرند ہوتا ہے جو گورّے سے مشابہ ہوتا ہے۔ اسکے آشیانے ببول کے درختوں پر لٹکے رہتے ہیں اور بڑی کاریگری سے بنے ہوتے ہیں۔ بندر جب کبھی کبھی ان آشیانوں سے شغلِ حماقت کیا کرتے ہیں۔ لفظ بیّا اُردو میں بولا جاتا ہے۔ کسی بڑے شاعر کے شعر کا ایک مصرعہ ہے "برابر ہے بئے کا گھونسلا اور آدمی کا گھر"۔

[2] اُڈگے۔ جاگے۔

مقبول احمدپوری

(۲۸)

دلا نارائی پروانہ تا کے

نگیری شیوۂ مردانہ تا کے

یکے خود را بسوز خویشتن سوز

طواف آتش بیگانہ تا کے

(ترجمہ)

موہ پتنگ کا گھیرے کب تک

مرد کے ڈھنگ نہ تیرے کب تک

اپنی ہی آگ میں جل کے دکھا دے

غیر کی آگ کے پھیرے کب تک؛

(ترجمہ)

گیان کہے۔ اُسے آنکھ نہ دیکھے

آس لئے یہ انکھیاں ترسیں

طُور کا دُرشن[1] یاد ہے اب تک

نَین سے پریم کے آنسو برسیں!

مقبول احمد پوری

---

[1] روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر خدا سے دعا مانگی کہ بار الٰہا مجھے تو اپنی شکل دکھا دے یعنی آپ نے کہا "رَبِّ اَرِنِی" جواب ملا کہ "لَنْ تَرَانِی" یعنی تم نہیں دیکھ سکتے۔ مگر حضرت موسیٰؑ کے اصرار پر ایک برق آسا نور چمکا اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔ اس قسم کی کوئی مناسب روایت ہنود کے لٹریچر میں نہ ملی اسلئے ترجمہ میں اصل چیز قائم رکھی گئی۔ اگر کوئی چاہے تو تیسرے مصرعہ کی جگہ یہ مصرعہ کرلے یعنی "دھیان میں ہے کیلاش کا درشن"

مقبول احمد پوری

سُرخ گلاب

دُور ـــــ! مغرب میں، افق کی سُرخی کے درمیان، ڈوبتے ہوئے سُورج کا زرد رنگ، دلفریب منظر کے حسُن میں ایک عجیب رنگینی پیدا کر رہا تھا۔ اور شام کے پُرکیف جھٹپٹے نے پُرفضا گاؤں کی دل کشی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔

قدیم وضع کی ایک پُرانی گاڑی، پیچدار سڑکوں پر آہستہ آہستہ گزرتی ہوئی "شاہی سرائے" کے پھاٹک پر جا رُکی۔ اپنے ضعیف گھوڑے کی طرح خستہ حال کوچبان شکستہ کوچ بکس سے اُترا، جماہی لی اور اپنے سر سے میلی ٹوپی اُتارتا ہوا دروازہ کے پاس جا کر دستک دینے لگا۔ تیسری دستک پر سرائے کا بھاری دروازہ ایک جھٹکے اور آواز کے ساتھ کھُل گیا۔ بوڑھا کوچبان اپنی سواریوں کے اُترنے کا انتظار کرنے لگا ـــــ دو منٹ گزر گئے مگر گاڑی سے کوئی نہ اُترا۔ کوچبان سمجھا شاید گاڑی کے اندر ہی دونوں نوجوانوں کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے تھپک تھپک کر میٹھی نیند سُلا دیا۔

"شاہی سرائے آگئی جناب!" اس نے بلند آواز میں مؤدبانہ کہا۔ گاؤں کے ہر نو وارد کو قابلِ تعظیم اور باوقار خیال کرنا بوڑھے کوچبان کی فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا۔

اُس کی تیز اور کرخت آواز، سرائے کے اندر تک جا پہنچی۔ بل فلیمنگ، سرائے کا مالک، دوڑتا ہوا باہر نکل آیا اور اس کے عقب میں وہ لوگ بھی چلے آئے جو اندر بیٹھے اُس کی مشہور اور لذیذ شراب کے جام پر جام خالی کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے بل فلیمنگ کی سرائے میں آنے کی وجہ، اس کی کیف آور شراب کی شہرت تھی یا اُس کی حسُن و شباب کی رعنائیوں میں ڈوبی ہوئی اکلوتی بیٹی کا برق پاش تبسم؟ ـــــ یہ تو ایک بحث طلب سوال ہے لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ گاؤں کے زندہ دل اور عاشق مزاج نوجوانوں کا ایک جمِ غفیر مسٹر بل فلیمنگ کی سرائے میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔

اس وقت سرائے کے اندر سے آنے والوں کی نگاہوں نے پہلے تو سنسان سڑک کے طول و عرض کا جائزہ لیا اور پھر بوڑھے کوچبان کے چہرہ پر جم گئیں۔ مگر بوڑھے کے لٹکے ہوئے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہ نکلا اور جب میخوار مضحکہ اُڑانے لگے تو اُس نے ہاتھ کے اشارہ سے اُنہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ وہ چُپ ہو گئے اور بے چینی سے نووارد مہمانوں کے برآمد ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن گاڑی سے کوئی نہ اُترا۔ آخر بوڑھے کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ چلایا!

"میرے آقا! شاہی سرائے یہی ہے" ـــــ اور گاڑی کے نزدیک جا کر اپنی گردن کھڑکی کے اندر ڈال دی۔ کم و بیش

دو منٹ تک اُس کا سفید بالوں والا سر لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہا۔

"ہائیں! اس میں تو کوئی بھی نہیں!" آخر کوچبان نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ اور فوراً ہی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنالیا کیونکہ اس کی طبیعت بڑی وہمی واقع ہوئی تھی۔

کچھ دیر تک تو سب شرابی خاموش اور متحیر کھڑے رہے۔ پھر یکبارگی سب کے سب ہنس پڑے ——— خوب قہقہے مار کر ہنسے ——— اور بوڑھے ٹامس جیرو (کوچبان کا نام) کی ایک بھی سنے بغیر، بل فلیمنگ کی مدہوش کن شراب' اور نوخیز حسینہ کے مسحور کُن تبسموں سے لطف اندوز ہونے کے لئے سرائے کے اندر چلے گئے۔

لیکن ٹامس جیرو کا تعجب حد سے تجاوز کر چکا تھا۔ پُرانی گاڑی میں دو نوجوانوں کو سوار ہوتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور خود اپنے کانوں سے دراز قد اور دُبلے نوجوان کو کہتے سُنا تھا کہ "شاہی سرائے چلو مگر آہستہ آہستہ، کیونکہ ہم ان دلکش مناظر کا لطف اُٹھانا چاہتے ہیں" ——— اس نے ان کے پائیپ کے تنباکو کی بُو بھی سُونگھی تھی اور اُسے یہ بھی یاد تھا کہ تندرست اور میانہ قد نوجوان نے اس سے گاؤں کے متعلق چند سوالات بھی کیئے تھے۔ جن کا اس نے خاطرخواہ جواب دیا تھا۔ ٹامس کے حواسِ خمسہ کی غلطی کا کوئی امکان نہ تھا۔ کیونکہ ابھی اس نے زندگی کی صرف چھپتر ہی بہاریں تو دیکھی تھیں، اور وہ اپنے نزدیک ابھی شباب کے دَور سے گزر رہا تھا۔

اس نے اِن دونوں نوجوانوں سے اپنا کرایہ بھی چکا لیا تھا ——— ہاں! ٹھیک ہے۔ یقیناً یہی بات ہے۔ کرایہ بچانے کی خاطر وہ راستہ ہی میں چپکے سے اُتر گئے ——— بدمعاش! دغاباز! ——— لیکن اس طرح ٹامس جیرو کے ہاتھ سے بچنا محال تھا۔ اس نے بھی طے کر لیا کہ وہ اُن سے کرایہ لے کر ہی رہے گا، خواہ اس کے لئے اُسے ساری رات اُنہیں تلاش کرنا پڑے ——— یہ سوچ کر بوڑھا شکستہ کوچ بکس پر جا بیٹھا اور اپنے سُست رفتار گھوڑے کو ہانکنے لگا۔

بوڑھے کوچبان کی چھوٹی، مگر گدھ کی طرح تیز آنکھیں، باوجود انتہائی کوشش کے ان دونوں "دغابازوں" کو تلاش نہ کر سکیں۔ اُن کا تو سڑک پر کہیں پتہ نہ تھا ——— یکایک بوڑھا چونک پڑا۔ شام کے سکوت کو توڑتی ہوئی اس کے کانوں میں ایک آواز آئی ——— "ارے بڑے میاں!" ٹامس جانتا تھا کہ اس جملہ کا مخاطب وہی ہے پھر بھی وہ خاموش رہا کیونکہ ایسے ناشائستہ اور غیر مناسب الفاظ کا جواب دینا اس کے جیسے "جوانِ رعنا" کے شایانِ شان نہ تھا۔ خدا جانے گاؤں والوں کو کیا ہو گیا تھا کہ ہمیشہ اُسے "بوڑھا" ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

"سنو! اے بوڑھے!" یہ دوسری آواز تھی۔ اب کی مرتبہ بوڑھے کے جذبات بڑی طرح مجرُوح ہو گئے۔ اس نے اپنا سر ذرا اُونچا کر لیا اور ایک خودداری کی شان کے ساتھ اپنا گھوڑا ہانکتا رہا۔

"اے کوچبان! اے گاڑی والے!" —— پھر آواز آئی۔ اب کی بوڑھے نے گھوم کر دیکھا، دُور دو شخص تیزی سے قدم اُٹھائے اس کی طرف چلے آرہے تھے۔ بوڑھے نے گاڑی روک لی اور انتظار کرنے لگا۔ قریب آکر ایک شخص بولا:۔

"اُوہ! پکارتے پکارتے ہماری آواز پڑ گئی مگر تم نے نہیں سُنا۔"

"سُنا تو تھا، مگر میں سمجھا شاید تم کسی بوڑھے کو پکار رہے ہو" کوچبان نے اس طرح کہا، گویا وہ ابھی ایک اٹھارہ سالہ نوجوان ہے۔

دونوں نوجوان ہنس پڑے اور اُسے کرایہ مع انعام ادا کرنے کے بعد، اپنے راستہ پر پیدل قدمی کرتے ہوئے روانہ ہوگئے۔

وہ دونوں مصوّر تھے —— فرق صرف یہ تھا کہ ٹونی پتھر کو تراش کر تصویر بناتا تھا اور جیک الفاظ کے ذریعہ مصوّری کرتا تھا۔ بالفاظِ دیگر، ایک سنگ تراش تھا، اور دوسرا افسانہ نگار۔ طالب علمی ہی کے زمانہ سے وہ دونوں گہرے دوست تھے۔ اس گاؤں میں اُنہیں نئے نئے خیالات کے حصول کی اُمید کھینچ لائی تھی، اور اس وقت، گاؤں کی کیف پرور فضا سے لطف اندوز ہوتے، ان دونوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ عنقریب ان کی اُمیدیں حقیقت کا روپ اختیار کرنے والی ہیں —— ٹونی سمجھ رہا تھا کہ اُسے سنگ تراشی کے لئے ایک نہایت حسین ماڈل مل گیا اور جیک کا خیال تھا کہ اُسے ایک نئے افسانہ کے لئے بہترین مواد حاصل ہوا۔

بوڑھے ٹامس جیرو کی گاڑی سے چپکے سے اُتر پڑنے سے ان کا مقصد ہرگز مذاق کرنا نہیں تھا۔ بلکہ بات یہ ہوئی کہ گاڑی کی کھڑکی سے گاؤں کے مناظر دیکھتے دیکھتے جیک یک بہ یک بول اُٹھا: "سُرخ گلاب!" اور فوراً ہی دروازہ کھول کر گاڑی سے اُتر پڑا، اُس کی خاطر ٹونی کو بھی اُترنا پڑا —— اور اس عجیب حرکت کا سبب یہ تھا کہ ہوش سنبھالتے ہی نوجوان مصنّف کو چند واقعات نے یہ یقین دلا دیا تھا کہ اس کی قسمت کی راہ سُرخ گلابوں سے پٹی پڑی ہے۔ جس دن اس نے کپتان کی حیثیت سے اپنی کرکٹ ٹیم کو ایک معرکہ آرا ٹورنامنٹ جتوایا ہے، اس روز ریفری کے کوٹ میں سُرخ گلاب لگا ہوا تھا۔ جب کیمبرج میں اس نے انگریزی مضمون نویسی کا اوّل انعام حاصل کیا ہے، اس صبح کو اس کے مکان کی مالکہ نے اُسے سُرخ گلاب تحفۃً پیش کئے تھے۔ جب ڈاکیہ اس کے پہلے افسانہ کی منظوری کا اطلاعی خط لے کر آیا ہے، تو وہ بھی اپنی معشوقہ کے لئے سُرخ گلابوں کا ایک دستہ لئے جا رہا تھا۔

سُرخ گلابوں کے درمیان، افسانہ نگار کی پُرشوق نگاہیں "اُس" پر بھی جا پڑی تھیں —— ٹونی کے ماڈل، اور اپنے افسانے کے موضوع پر! —— ثریا والقمر! گاؤں کے ڈاکٹر کی اکلوتی بیٹی تھی —— نوخیز، حسین اور شوخ! —— اُس کی ستواں، چھوٹی سی ناک اور گلاب جیسے سُرخ گال بہت پیارے معلوم ہوتے تھے۔ اُس کی مخمور، چمکیلی آنکھیں، دل موہ لینے والے جادو سے بھری ہوئی تھیں اور اس کے سنہری بالوں کا گھونگر دیکھنے والے دل پر غضب ڈھاتا تھا۔

بڑی دیر تک دونوں نوجوان کھڑے اُسے دیکھا کیے —— اور دیکھتے رہے۔ آخر ٹامس جیرو کی گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ نے اُن کی محویت کا طلسم توڑا۔ اب اُنہیں خیال آیا کہ ابھی اُنہوں نے گاڑی بان کا کرایہ ادا نہیں کیا۔

اور اب، کرایہ ادا کردینے کے بعد، جب وہ دونوں خاموشی سے ساتھ ساتھ چل رہے تھے تو دونوں کو احساس ہو رہا تھا۔ کہ ان کی اُمیدیں عنقریب حقیقت کا جامہ پہن کر مژدۂ کامیابی بننے والی ہیں ——— ایک کو خوشی تھی کہ اُسے ماڈل مل گیا اور دُوسرا مسرور تھا کہ اُسے افسانے کے لئے موضوع ہاتھ آگیا۔

اس کے قدموں کی چاپ نے لڑکی کی نگاہوں کو کتاب سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا آپ ڈاکٹر واٹسم سے ملنا چاہتے ہیں ؟"

ٹونی نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا "جی ——— ہاں !"

"کیا شکایت ہے ؟"

"شکایت ؟" ٹونی قدرے گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ آخر جیک نے اُس کی مدد کی اور کہا۔

"اختلاج قلب"

حسین دوشیزہ نے جیک سے پوچھا "کیا آپ ان کے بھائی ہیں ؟"

"نہیں تو ! ہم دونوں دوست ہیں۔ اور اس گاؤں میں نووارد ہیں۔ آج ہی آئے ہیں"

"اچھا، تو آپ اندر تشریف لے آیئے۔ میں جاکر دیکھتی ہوں کہ والد نک سے فرصت پاچکے یا نہیں"

دونوں نوجوان اس کے عقب میں بنگلے کے اندر داخل ہوگئے اور ملاقات کے کمرے میں جا بیٹھے۔ ایک برتن میں گلاب کے تازہ تازہ پھول، اور دیوار سے آویزاں چند دلکش تصویریں ——— یہ تھی اس کمرہ کی سادہ سی آرائش۔

رٹیا کے چلے جانے کے بعد ٹونی نے جیک سے کہا "یہ سب تمہاری بدولت ہؤا"

جیک نے جواب دیا "غلط ! تمہیں نے تو اندر گھس کر معاملہ خراب کیا۔ مجبوراً مجھے بھی آنا پڑا"

ٹونی نے کہا "خیر ! اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب معاملے کو سنبھالنا چاہیئے"

جیک تصویریں دیکھنے لگا، اور آخر ایک تصویر کے سامنے جا کھڑا ہؤا۔ یہ ایک دُلہن کی تصویر تھی جو عروسی لباس پہنے، اور گلاب کے پھولوں کا ایک گچھا ہاتھ میں لئے عجیب اندازِ دلربائی کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں، اُس کے ہونٹوں پر مسرت رقص کر رہی تھی اور اس کے رُخسارے خوشی سے چمک رہے تھے ——— یہ تصویر رٹیسا کی معلوم ہوتی تھی۔ "شاید اس حسین لڑکی کی شادی ہوچکی ہے"۔ یہ خیال کرتے ہوئے جیک کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نہ معلوم کیوں ! ——— یکایک کوئی بولا،

"یہ میری ماں کی تصویر ہے"۔ جیک نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے رٹیسا کھڑی تھی۔

جیک نے کہا "یہ آپ کی والدہ ہیں ! میں تو سمجھا تھا شاید آپ خود ہیں"

"نہیں! میری تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

"آپ اپنی ماں سے بہت مشابہ معلوم ہوتی ہیں۔"

رٹیسا نے اقرار کیا "جی ہاں! میری اماں بہت خوبصورت تھیں" یہ کہہ کر وہ کچھ شرما سی گئی اور شرم کو ٹالنے کے لئے ٹونی سے مخاطب ہو کر بولی:۔

"مجھے افسوس ہے! آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ ابا ابھی نک کے معاینہ میں مشغول ہیں۔"

"اس موقع کو اظہارِ حقیقت کے لئے مناسب سمجھتے ہوئے جیک نے کہا" سچ پوچھئے تو ہم ڈاکٹر واتسم سے ملنے کے ارادے سے نہیں آئے ہیں۔"

"پھر ــــ"

ٹونی نے بیوقوفی سے کہا "ہم آپ سے گفتگو کرنے آئے ہیں۔"

جیک نے فوراً بات بنائی "ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہاں کہیں ہم مہمان کی حیثیت سے کرایہ پر رہ سکتے ہیں یا نہیں؟"

"آپ دونوں عجیب آدمی ہیں۔" لڑکی نے حیرت آمیز ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اتنی دیر تک اپنا مطلب کیوں نہیں بتایا ــــ کیا آپ میرے ہاں رہنا پسند کریں گے؟"

یہ سُن کر ٹونی تو مسرت سے اُچھل پڑا۔ اور جیک کے مُنہ سے خوشی کے مارے تھوڑی دیر تک تو ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ آخر اس نے جذبات پر قابو پا کر جواب دیا "بڑی خوشی سے۔"

رٹیسا نے کہا "ہمارے یہاں دو کمرے خالی ہیں۔ آپ آرام سے رہ سکتے ہیں۔"

جیک نے کہا "اس عنایت کا شکریہ۔"

ٹونی نے کہا "اچھا، اب ہمیں اپنا تعارف بھی کرا دینا چاہئے۔ میرا نام ہے ٹونی پالوے۔"

لڑکی نے پوچھا "ٹونی پالوے؟ کون؟ ــــ سنگ تراش؟"

"ہاں ــــ سنگ تراش۔"

"اوہو! آپ کے متعلق تو میں نے آرٹ جرنل میں بارہا پڑھا ہے۔"

"خیر ــــ اور یہ میرے دوست مسٹر جیک پیٹرسن ہیں۔"

رٹیسا نے پوچھا "کون جیک پیٹرسن؟ رنگین گناہ نامی افسانہ کے مصنف تو نہیں؟"

"جی ہاں وہی!"

"آپ سے مِل کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ مجھے آپ کے افسانہ کی ہیروئن بہت پسند ہے"۔

جیک نے پوچھا "کیا واقعی؟"

"میرے خیال میں تو وہ شاہکار ہے۔ مگر آپ نے افسانہ کو ٹریجڈی کیوں بنا دیا؟"

"اس لئے کہ زندگی بھی ٹریجڈی ہی ہے ——— آرزو، جستجو، یاس، ناکامی، درد، سوز ——— اسی مجموعہ کو کہتے ہیں زندگی، پھر بھلا ہیرو اور ہیروئن کو ملا کر مسرت ناک انجام بنانا اگر حقیقت کی پردہ پوشی نہیں تو اَور کیا ہے؛ ——— زندگی میں تو یوں کبھی وقوع پذیر نہیں ہوتا"۔

جیک کی یہ فلسفیانہ گفتگو سُن کر ٹرِیسا بہت متاثر ہوئی۔ اس کی کمان جیسی بھویں کھنچ گئیں اور حسین چہرہ پر فکر کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس نے آہستہ آہستہ کہا:۔

"شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر اس بارے میں مجھے ذاتی تجربہ حاصل نہیں"۔

گھنٹے دِنوں میں بدلے، اور دن ہفتوں میں تبدیل ہو گئے ——— اس دَوران میں ٹوَنی نے ایک نیا مجسمہ بنانا شروع کر دیا اور جیک ایک نیا افسانہ لکھنے میں مشغول ہو گیا۔

رفتہ رفتہ ان دونوں کے دلوں میں ایک تپش پیدا ہوتی گئی۔ جس نے تھوڑے ہی دنوں بعد سوزش کی صورت اختیار کر لی۔ یہ وہ سوزش تھی جو زندگی میں صرف ایک بار پیدا ہو سکتی ہے اور جو پیدا ہونے کے بعد کبھی مٹ نہیں سکتی ——— اِسے عرفِ عام میں سوزشِ عشق کے نام سے پکارتے ہیں۔

ایک شب وہ دونوں غیر معمولی دیر تک ساتھ بیٹھے رہے ——— خاموش، فکرمند، مغموم!

آخر ٹوَنی پکارا "جیک!"

جیک نے جبراً جواب دیا "کیا ہے؟"

ٹوَنی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "کچھ نہیں"۔

"عجیب آدمی ہو" ——— یہ کہتے ہوئے جیک کا لہجہ ذرا سخت ہو گیا کیونکہ وہ بہت اُداس تھا۔

کچھ دیر پھر خاموشی طاری رہی، آخر ٹوَنی اپنے عجیب وغریب جذبات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک نہ سکا اور بولا:۔

"جیک، اب میں تم سے کہے بغیر نہیں رہ سکتا، مجھے اُس سے محبت ہے"۔

نوجوان ادیب فوراً سمجھ گیا کہ ٹوَنی کا اشارہ کس طرف ہے۔ کیونکہ خود اس کے دل کا میٹھا درد بھی ٹرِیسا ہی کی محبت

کا عطیہ تھا۔ لیکن اس نے ٹونی پر یہ راز ظاہر کرنا مناسب نہیں خیال کیا۔

وہ بمشکل اپنے جذبات پر قابو پا کر کہہ سکا "بڑی خوشی کی بات ہے۔"

ٹونی نے پھر مایوسانہ لہجہ میں کہا "لیکن جیک، میں اس کے قابل نہیں۔"

جیک نے جواب دیا "کوئی بھی اس کے قابل نہیں۔"

پھر وہ دونوں سو گئے ——— اور رات بھر ٹونی خواب دیکھتا رہا کہ اس کی مسرت کا پیمانہ لبالب بھر جانے کے بعد اب چھلکنے ہی والا ہے۔

دوسرے دن سنگ تراش نے کانپتے ہوئے ہونٹوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ثریا پر اپنے کیف آور جذبات اور بیتاب تمناؤں کا اظہار کر ہی دیا۔ ثریا شادی پر رضامند نہ ہوئی اور ٹونی کی بیتابی حد سے تجاوز کر گئی۔ اپنے مچلتے ہوئے دل کو بہلانے کے لئے وہ گھر سے نکل کر پُر فضا میدان کی طرف چلا گیا ——— وہ چلتا رہا، یہاں تک کہ بادل کڑکا، بجلی چمکی، اور پانی کی بڑی بڑی بوندیں اس کے کھلے ہوئے سر پر پڑنے لگیں۔

شام تک جب وہ واپس نہیں لوٹا، تو ثریا جیک کے پاس گئی اور اس سے کہہ دیا کہ ٹونی غائب ہے۔

جیک نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "اور اس قیامت خیز طوفان میں؟ ——— خداوندا اُسے بچانا!"

"وہ لنچ کے بعد چلا گیا تھا، جب تم فسانہ نگاری میں مشغول تھے۔"

"ہاں، اب میرا افسانہ قریب قریب پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔"

ثریا نے پوچھا "اِس کو تو ٹریجڈی نہیں بناؤ گے؟"

جیک نے اُسے پُر شوق نگاہوں سے تکتے ہوئے جواب دیا "یہ تو تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔"

"اس افسانہ کا نام کیا ہے؟" ثریا نے جیک کا اصلی مطلب نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"سُرخ گلاب"

"تو پھر اس کا انجام بھی گلاب کی خوشبو کی طرح مسرت آگیں ہونا چاہئے۔"

"جو تمہاری مرضی ——— لیکن ٹونی کو دیکھیں ——— میں سمجھتا ہوں مجھے اس کی تلاش میں جانا چاہئے ——— خدا معلوم کیا ہوا!"

ثریا نے کہا "آج صبح اُس نے مجھے شادی کا پیغام دیا تھا۔ اس کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔"

جیک نے بیتابی سے دریافت کیا "پھر؟"

"میں نے انکار کر دیا۔"

جیک نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا "اچھا! میں اُس کی تلاش میں جاتا ہوں"۔

ثریا نے کہا "مگر پانی تو قیامت کا پڑ رہا ہے"!

جیک نے کھونٹی سے اپنا اوورکوٹ اُتارتے ہوئے کہا "کچھ بھی ہو مجھے جانا ہی چاہیے"۔

اور وہ چلا گیا ـــــ موسلادھار بارش میں آگے بڑھتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جب تک اس کے جسم کا دُھندلا سا خاکا بھی نظر آتا رہا، ثریا کھڑکی کے پاس کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔

ڈاکٹر واسطم کو مریض کے کمرے سے باہر آتے دیکھ کر اس کی اکلوتی بیٹی ثریا کرسی سے اُٹھی اور اپنے والد کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں ایک خاموش سوال تھا جس کے جواب میں ڈاکٹر نے اپنے سر کو نفی کے انداز میں جنبش دی اور ہلکی آواز سے کہا۔

"ڈبل نمونیا"

ثریا کا دل بیٹھ گیا اور اس کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا ـــــ آنسو کا ایک قطرہ، کچھ دیر اس کی کانپتی ہوئی پلکوں پر تھرتھرانے کے بعد اس کے سُرخ و سفید رُخسار پر ڈھلک پڑا۔ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی:۔

"ٹونی تو جیک سے کہیں زیادہ دیر تک بارش میں رہا ہے۔ اور وہ اچھا خاصہ ہے۔ پھر جیک کو یہ کیوں ہوا؟ ـــــ بتاؤ، ابا"!

ڈاکٹر نے جواب دیا "اگر میں فلسفی ہوتا تو کہہ دیتا کہ مشیتِ ایزدی میں کسی کا زور نہیں ہے، مگر میں ڈاکٹر ہوں، اس لئے یہی کہوں گا کہ جیک کے پھیپھڑے ٹونی سے زیادہ کمزور تھے"۔

"مگر ابا، کیا تم کچھ بھی نہیں کر سکتے؟"

ڈاکٹر نے اپنی چہیتی بیٹی کے سر پر مشفقانہ انداز سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:۔ "نہیں بیٹی! ـــــ ہر بات انسان کے اختیار میں نہیں ہوا کرتی"۔

ڈاکٹر اپنے کمرے میں چلا گیا ـــــ اور ثریا مریض کے کمرے میں داخل ہو کر، پلنگ کے پاس گھٹنوں کے بل کھڑی ہو گئی۔

اس نے آہستہ سے پکارا "جیک!"

جیک نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے مُرجھائے ہوئے چہرے پر ایک تھکی سی، مگر اطمینان آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ضعیف آواز میں کہنا شروع کیا:۔

"دیکھا، ثریا، میں نہ کہتا تھا کہ زندگی ٹریجڈی ہے؛ اگر میرا واقعہ کوئی افسانہ ہوتا تو یقیناً اس کا انجام موت کی حیثیت

سے نہیں، شادی کی صورت میں پیش کیا جاتا۔ لیکن حقیقی زندگی میں یہ سب کہاں؟ —— میں تم سے جُدا ہو جاؤں گا، ثریا، اس سے پہلے کہ میں تُم پر اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرسکوں۔ کاش! مَوت مجھے کچھ مہلت دیتی، تاکہ میں یہ ثابت کرسکتا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ ایسی محبت جو ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی مرد نے کسی عوَرت سے نہیں کی —— مگر آہ! مَوت مجھے نہیں چھوڑے گی!

"نہیں! نہیں! جیک، یہ نہ کہو!" ثریا نے آنکھوں سے نکلنے کے لئے بیتاب آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا:۔ "تم نہیں مر سکتے، ہرگز نہیں مر سکتے۔ تمہیں میری خاطر جینا ہی پڑے گا۔"

"نہیں! ثریا، پیاری، تم کیا جانو؛ قدرت کا قانون اٹل ہے۔ انسان کی پُرسکون زندگی میں تلاطم اور اس کے غم ناآشنا دل میں تڑپ پیدا کرنا، زمانہ کا ادنیٰ مذاق ہے —— کیا! کیا تم ایک مرنے والے کے لئے کچھ کرسکتی ہو؟"

"جیک! میں تمہاری خاطر کیا کچھ نہیں کرسکتی!" ثریا نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مجھے گلاب کا ایک تازہ سا سُرخ پھُول لا دو!"

وہ پریشان تیتری کی طرح گھبرائی ہوئی باغ میں گئی اور گلاب کی ایک نوشگفتہ کلی توڑ کر تیزی سے واپس آگئی۔

"شکریہ! یہ مجھے دے دو" مریض نے پھُول لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا —— دونوں کے ہاتھ ملے اور کانپنے لگے۔ گلاب کی نازک پنکھڑیاں بھی تھرتھرانے لگیں۔ پھُول گر پڑا —— جیک نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور گہری سانس لے کر آنکھیں بند کرلیں —— گرم اشکوں کے موٹے موٹے قطرے ثریا کی آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر گلاب کی پنکھڑیوں کو شبنم کی طرح تر کرنے لگے۔

یکایک دروازہ کھُلا اور ٹونی اندر داخل ہُوا۔ اس نے کمبل کے کونے سے اپنے مرحوم دوست کا چہرہ ڈھانک کر، اس کی مغفرت کی دُعا مانگی۔ مغموم و دلگیر ثریا کے آنسو پونچھے اور اُسے چمن میں لے گیا جہاں، سُرخ گلابوں کے درمیان وہ دونوں پہلو بہ پہلو چہل قدمی کرنے لگے —— یہ ہے دُنیا!

اگر یہ واقعہ کوئی افسانہ ہوتا تو اس کا انجام "ثریا" کی خودکشی کی صُورت میں پیش کیا جاتا۔

(ترجمہ بہ تصرف) مرزا یاور علی

کچھ بھی نہیں!

قطرۂ ناچیز ہوں میری بقا کچھ بھی نہیں
جذب کرلے۔ جب مجھے موجِ ہوا۔ کچھ بھی نہیں
میری ہستی اس چمن میں ہے برنگِ یک شرار
دیدنی ہے ایک جلوہ۔ دوسرا کچھ بھی نہیں
آفرینش سے مُراد اتنی ہے غنچے کی چٹک
صاف ظاہر ہے کہ غنچہ جب کِھلا۔ کچھ بھی نہیں
نُور جس دِن خاکِ تیرہ سے جُدا ہو جائے گا
شاعرِ رنجور۔ اِک عالم فنا ہو جائے گا

آغا شاعر قزلباش دہلوی

رُباعیّات

(۱)

باطن میں تو ہر سانس کا دمساز ہے تو
کُھلتا نہیں ظاہر میں عجب راز ہے تو
اے کاش ادھر ہم کو کوئی پہچانے
جو دل سے نکلتی ہے وہ آواز ہے تو

(۲)

کس سمت سے کل دھر کو اڑا لانے والے
اے صحن زمیں پہ گل کھلانے والے
ہم سے بھی کبھی ربط تھا، آنکھیں تو ملا
او وقت کے ساتھ دوڑ جانے والے

(۳)

اعمال کی ہر جنس کو لے لیتی ہے یہ
بہتا ہوا دریا ہے کہیں رکتی ہے یہ
جو آج یہاں بوؤ گے کل کاٹو گے
دنیا نہیں عاقبت کی کھیتی ہے یہ

(۴)

مانا کہ یہ لے تم کو نہیں بھائے گی
سن لو کہ یہ پھر آواز نہیں آئے گی
اب بھی مرے نغموں کو غنیمت جانو
یہ کنٹھ ری جنگل سے چلی جائے گی

آغا شاعر قزلباش دہلوی

کلامِ اصغر (گونڈوی)

اصغر مرحوم کے کلام پر ملک کے مایہ ناز ادیبوں نے خیال آرائی کی ہے۔ ان میں حضرت ابوالکلام آزاد، سر سپرو اور مرحوم کے دوست منشی نگم وغیرہم شامل ہیں۔ حضرتِ آزاد نے تو یہ لکھ کر کہ "تنقید لکھنے کے لئے اور لوگ موجود ہیں" صرف انتخابِ کلام ہی پر اکتفا کیا ہے۔ مگر موصوف نے جو انتخاب کیا ہے نازشِ صد تنقید ہے۔ منشی صاحب نے تو اپنے مختصر تبصرے میں مرحوم کے کلام و پیام کی رُوح نکال کے رکھ دی ہے، اس کے دیکھنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اب اگر کوئی لکھے تو کیا لکھے۔ لیکن راقم الحروف نے مرحوم کی زندگی ہی میں ان کے کلام سے مضامین شائع کرائے تھے، اس لئے ان کی وفات کے بعد ایک "ودعی ایڈریس" قدر دانانِ اصغر کے لئے ناموزوں نہیں۔ ہماری یہ کوشش محض ادبی ذوق اور مرحوم سے ارادتِ باطنی رکھنے پر مبنی ہے۔ اُردو زبان کو وسیع اور عمیق لٹریچر کی سخت ضرورت ہے، مرحوم نے اس ضرورت کو پورا کرنے کی حتے الوسع بہت کوشش کی اس لئے ان کی محنت کے پھل سے سب کو بہرہ اندوز ہونا چاہئے۔

اُردو غزل میں اصغر نے خود کو ایک فلسفی اور صوفی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کا موضوع حیرت و محبت ہے اور رنگِ تغزل کیف محبت۔ مگر وہ مذہبی عنصر کو باوجود آزادانہ تاویلات کے خارج نہ کرسکے اور اس طرح وہ ایک موحد کی شکل میں نظر آتے ہیں ان کی توحید کی تفسیر ذیل کا عربی شعر ہے ؎

وَمَا الْوَجْہُ اِلَّا وَاحِدٌ غَیْرَ اَنَّہٗ — اِذَا اَنْتَ عَدَّدْتَ الْمَرَایَا تَعَدَّدَا

ترجمہ:۔ شکل تو ہے ایک، لیکن اُس کی تشکیلیں بہت — تو نے جب دیکھا کئی آئینوں میں اُس شکل کو

اصغر صاحب ان کئی آئینوں میں سے خود کو بھی ایک آئینہ تصوّر فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

میرا آئینۂ فطرت ہے عجب آئینہ — نظر آتا ہے ترا چہرۂ زیبا مجھ کو

اور ایک جگہ تو زبان بہت ہی زیادہ آزاد ہے ؎

عکس کس چیز کا آئینۂ حیرت میں نہیں — تیری صورت میں ہے کیا جو مری صورت میں نہیں

اس خیال کو مرحوم نے ذیل کے نعتیہ شعر میں نہایت عمدہ طریقے سے ظاہر کیا ہے ؎

"اُے حُسنِ ازل اپنی اداؤں کے مزے لے — ہے سامنے آئینۂ حیرانِ محمدؐ"

غرض انسان "آئینۂ حیران" ہے اور "آئینۂ حیران" ہی بنے رہنے میں اس کی شان ہے۔ "تنگ ظرفیِ منصور" سے متعلق غالب کے شعر کی تاویل اصغر نے اس طرح کی ہے ؎

بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن پیدا — کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو

اس قسم کے تصوّف آمیز فلسفیانہ خیالات کو عرفِ عام میں "حقایق و معارف" بھی کہہ دیا کرتے ہیں مگر حقیقت اور اُس کے تعارف کو لاادریت اور تشکیک سے علیحدہ کرکے آج تک کسی نے نہ دکھایا، اس لئے بظاہر اس کا عقل سے کوئی تعلق نہیں۔ عقل سے تو اُسی شے کا تعلق ہوسکتا ہے جس کا رد ممکن نہ ہوسکے۔ شاعر کے خیالات متغاہوتے ہیں، ان کو حقیقت سے کیا نسبت۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ آخر یہ نام نہاد "حقایق و معارف" ہیں کیا چیز۔ مشرقی شعراء اور صوفیوں کے خیالات پر نظر ڈالی جائے تو اُن کی ہر قسم کی خیال آرائی کا خلاصہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ نظامِ کائنات ایک پنہاں قوت کے پنہاں مقاصد کی داغ بیل ہے۔ یہ پنہاں قوت یا کشش اپنے ایک جذبے سے مجبور رہے جس کا نام اُنھوں نے عشق رکھا ہے اور جس کی تمام بالذات شکل محبت ہے اور یہ مؤخر الذکر جذبۂ محبت اپنی سحر طرازیوں کے لئے مادّہ کا مرہونِ منت ہے۔ اس تاویل سے چند پہلو اخذ کئے جا سکتے ہیں جن کو حقائق و معارف کی شکل میں وقتاً فوقتاً برتا گیا یعنی نظامِ کائنات کا کوئی خاص مقصد ضرور ہے۔ اس مقصد سے انسان کی سعی کو باطنی مناسبت ہے اور انسان کے دلی جذبات اس مناسبت کی تاویل ہیں۔ یہ تاویل بذاتِ خود مجموعۂ اضداد ہے۔ اضداد کی آمیزش سے جو اعتدال پیدا ہوتا ہے اس میں ایک خاص مرغوبیت ہے اور غالباً یہی مرغوبیت آنکھوں کے سامنے حسن اور دل میں محبت ہے۔

نظامِ کائنات اور مقصدِ حیات سے متعلق فلسفیوں نے اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی نظر کی وسعت کے مطابق مختلف نظریے پیش کئے ہیں۔ ان کے متضاد عقائد اور خیالات سنتے سنتے اور پڑھتے پڑھتے طبیعت اُکتا گئی۔ مگر ایک بات غور طلب ضرور ہے وہ یہ کہ فرصت اور سکون کے لمحات میں خود انسان کا دل بھی اپنا نظریہ پیش کیا کرتا ہے۔ یعنی بعض اوقات خود انسان کے دل کے ایسے جذبات کا وفور ہوتا ہے جن کی رَو میں کون و مکان کے پردے کا کوئی نہ کوئی کونا ذرا سرک جاتا ہے اور حقیقت کے مینا بازار کی تھوڑی سی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ وہی جھلک ایک ایسی تعلیم ہے جس کو قدیم ہندو فلسفی "شُرتی گیان" کہتے تھے اور آج کل اس کا نام "حقائق و معارف" رکھ لیا گیا۔ ہر بڑے شاعر کا کلام اس حقیقی جھلک کا ایک ریکارڈ ہے۔ کلامِ اصغر میں اس قسم کے کیف آفریں نغمے کچھ تو ذاتی ادراک و احساس پر مبنی ہیں اور کچھ محض اکتسابی مساعی پر۔ اس اکتسابی سعی کو نقادانِ سخن کا ایک طبقہ "سرقہ" کے نام سے خواہ مخواہ بدنام کئے ہوئے ہے مگر میں اس قسم کی تاویل کا قائل نہیں۔ میں نے اصغر میں زیادہ تر غالب اور اقبال کے نغموں کی صدائے بازگشت پائی ہے مگر مرحوم نے اس انداز سے اس صدائے بازگشت کو نبھایا ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک

نئی چیز ہو گئی۔

اس وقت اصغر کی تصانیف میں سے "نشاطِ روح" اور "سرودِ زندگی" ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ان دونوں کا مطالعہ کرنے اور اشعار کا انتخاب کرنے میں زمین و آسمان کا فرق نظر آیا۔ کیفِ بے اختیاری دونوں میں ہے مگر "نشاطِ روح" میں اس کی "آمد" ہے اور "سرودِ زندگی" میں "آورد"۔ سرودِ زندگی میں جو خیالات و جذبات ظاہر کئے گئے ہیں وہ سنجیدگی اور متانت کے اعتبار سے زیادہ وزنی ضرور ہیں مگر سب ارادی ہیں غیر ارادی بہت کم۔ برخلاف اس کے نشاطِ روح میں خیالات زیادہ عمیق نہیں مگر جذبات کا دریا نہایت زود روی کے ساتھ سمندر کی طرف بہہ رہا ہے۔

متذکرۂ بالا تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد کلامِ اصغر میں ہم کو مندرجہ ذیل خصوصیات نظر آتی ہیں :-

معنوی محاسن :- ۱۔ نیاز تقدیس

۲۔ جذبۂ بے اختیاری

۳۔ نشاطِ تخئیل

اِن سب کی غرض و غایت "حقائق و معارف" کی تلاش ہے۔

صوری محاسن :- ۱۔ بلاغت

۲۔ فلسفیانہ مولویت

۳۔ انوار آفرینی - جس کے لئے ہندی لفظ "پرکاش پریم" یعنی "روشنی کی محبت" زیادہ مناسب ہے۔

صوری اور معنوی مندرجہ بالا خوبیوں کے علاوہ اُن کے تخئیلی پیام کا ایک خاص معیار بھی ہے جس کو ہم "عیش مایوسی" اور "سرودِ حرمان" وغیرہ متضاد الفاظ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

معنوی اعتبار سے اگر ان کا مقابلہ دوسرے شاعروں سے کیا جائے تو اُردو زبان میں غالب اور اقبال، انگریزی میں براؤننگ اور فارسی میں عرفی اور نظیری سے اُن کی روشناسی اچھی خاصی کرائی جاسکتی ہے، مگر اصغر صاحب نے باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کی تھی اس لئے اُن کے خیالات و احساسات میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔

ان کے کلام کا صُوری یا ظاہری پہلو آج کل کی عام روش سے جو زیادہ "تغزلانہ" ہے بالکل علیحدہ ہے۔ اُنہوں نے خود لکھا ہے کہ "مجھے نالہ و فریاد کی عادت کم ہے"۔ ان کے کلام میں فصاحت نہ سہی مگر بلاغت ضرور ہے۔ تعلیم شریعت نہ سہی مگر مولویانہ اخلاق کی جھلک کافی ہے جس کی وجہ سے خیالات میں ندرت قائم نہیں رہتی مگر یہ بات صرف چند اشعار میں ہے ان کا

زیادہ تر کلام تروتازہ ہے۔

اصغر کا معیارِ حسن کوئی نہیں سوء عشق کا دم نہیں بھرتے ۔ البتہ وہ حسن و عشق کے درمیان ایک ایسے "منطقۂ معتدلہ" میں محوِ حیرت کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں جس پر ایک طرف سے خورشیدِ حسن ضیا باری کر رہا ہے اور دوسری طرف سے سورج کی روشنی سے محروم منطقۂ بارِدہ یا قطبین کی سرد ہوائیں پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس عالم میں وہ ایک مرغوب کشمکش محسوس کر رہے ہیں اور اس سے لطف لے رہے ہیں۔

شاید اصغر نے عام زندگی کی ہوا کم کھائی اس لئے ان کا علم سب کتابی اور راکتابی ہے ۔ سوسائٹی سے انہیں کوئی واسطہ نہیں، نہ اخلاقیات سے۔ ان کا معیارِ زندگی ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہے، بجز مذہب کی بندش کے جس سے وہ آزاد نہیں ہے، ان کا وسیع ظرف مذہب کے قابو سے نہ نکل سکا۔ آہ سرمد نے خوب لکھا ہے۔

"بے دولتِ دیدارِ تو دیں ہم قفس است"

ترجمہ:۔ (تجھ بن پنتھ بھی پنجرا مجھ کو)

اصغر بیچارے کی وہاں تک رسائی کہاں اگرچہ انہوں نے یہ ضرور کہا ہے کہ ؎

بہ قیدِ نظر کی ہے وہ فکر کا زنداں ہے ۔۔۔ بچ حسنِ تعینّ سے ظاہر ہو کہ باطن ہو

نوجوانوں کے لئے اصغر کے پیام کا مفہوم یہی ہے کہ "آزاد" رہو اور آگے بڑھو۔ انگریزی شاعر براؤننگ کے ہم خیال رہ کر وہ یہی کہتے ہیں کہ خیال وادراک کی معرکہ آرائیوں اور علم و عمل کی دنیا میں "ٹٹ پونجیے" نہ رہو بلکہ "کروڑ پتی" بننے کی کوشش کرو اگرچہ اس میں محنت کرنا پڑے اور یہ مہم مرنے سے پیشتر ادھوری ہی کیوں نہ رہ جائے۔

ان کا فلسفۂ حیات بہت زیادہ وسیع نہیں ۔ وہ کہتے ہیں ؎

فرائض کا رہے احساس عالم کے مظاہر میں ۔۔۔ یہی عارف کا مقصد ہے، یہی شارع کا ایماں ہے

جو ہو للّٰہیت تو دین بن جاتی ہے یہ دنیا ۔۔۔ اگر اغراض ہوں تو دین بھی بدتر ز دُنیا ہے

لیکن باوجود اس تعلیم کے وہ زندگی کو "فریبِ عاشقی" مانتے ہیں۔ غالب نے ہستی کے "فریب" سے بچنے کی تعلیم دی ہے۔ اصغر نے خواہ مخواہ غالب کی تقلید میں یہ کہہ دیا کہ ؎

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ رمزِ عاشقی کے ۔۔۔ ہم مر کے کیا کریں گے کیا کر لیا ہے جی کے

لیکن خود ہی اس معاملے کو صاف کر دیا ہے کہ ؎

غرض یہ ہے کسی عنواں تجھے کریں مائل ۔۔۔ کرشمہ سازیِ ہر رند و پارسا معلوم

اوراس طرح اعترافِ عبودیت کرکے "تسکین حرماں" بھی کی ہے ؎

تیری ہزار برتری، تیری ہزار مصلحت   میری ہراک شکست میں میرے ہراک قصور میں

انگریزی شاعر "ڈرائیڈن" نے نہیں معلوم کس جذبے کے ماتحت لکھا ہے کہ:-

"زندگی تمام وکمال فریب ہے"

اور شیکسپئیر صاحب نے تو شاید کسی "Fool" یا احمق کا پارٹ لے کر یہ کہا تھا کہ ؎

"زندگی بھاگتی پرچھائیں ہے
اک کہانی ہے کہ احمق نے کہی
جس میں غوغا بھی ہے شورش بھی ہے
بات مطلب کی کوئی ایک نہیں"   (ترجمہ اقتباس ماخوذ از انگریزی مقالہ براؤننگ کا مذہب)

مگر بات پتے کی ہے۔ اس قسم کے مخبوط الحواس جذبات کے ماتحت انگریزی شاعروں نے زندگی کو دھواں، آندھی، طوفان اور کہر وغیرہ کہہ کے اپنے دل کا بخار نکالا ہے۔ ہمارے اقبال یا اصغر کا ہم نوا اگر کوئی ہے تو "براؤننگ" ہے۔ "ورڈزورتھ" میں بھی اس قسم کی استعداد ہے مگر وہ تو کسی کھوئی ہوئی چیز کو ٹٹولتا پھرتا ہے۔ براؤننگ علائقِ دنیا کے ذریعے سے آگے بڑھتا ہے اور ورڈزورتھ اس بات کا شاکی ہے کہ علائقِ دُنیا نے اس کے لاہوتی نُور کو چھین لیا اور ظلمت اور ناآگہی کے دھوئیں میں لا ڈالا۔ اس کی نظم "Ode to Immortality" کے دو اقتباسوں کا اُردو ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ ہندوستانی میں زیادہ کامیاب ترجمہ ممکن تھا مگر یہ مضمون چونکہ اُردو میں ہے اس لئے خامیوں کو درگزر کیا جائے ؎

یاد آیا میکہ میداں، جھیل، جنگل اور پہاڑ   یہ زمیں، اس کے مناظر، گھاس پودے اور جھاڑ
عالمِ لاہوت کی دُھندلی سی اِک تصویر تھے   ایک نُورانی فضا کے خواب کی تعبیر تھے
وہ شبِ مہتاب، وہ شام وسحر جاتی رہی   وہ منور روشنی ہر چیز پر جاتی رہی
اب ستارے مضمحل ہیں، چاندنی سوئی ہوئی   آہ وہ پہلی سی دُنیا بھی ہے اب کھوئی ہوئی

مگر فلسفۂ حیات کے اعتبار سے ورڈزورتھ مشرقی شعراء کا ہم نوا ہے اور اسی نظم میں آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ ؎

خواب دُنیاں کی طرح ہے زندگی اپنی یہاں   رُوح سیارہ ہے اور یہ جسم بُرجِ لامکاں
دُور سے آیا ہے وہ[1] اور دُور جائے گا ابھی   ڈوب کر یاں پھر کہیں جلوہ دکھائے گا ابھی
شرقِ پیدائش سے آگے عمر ہے اپنی رواں   یہ نہیں معلوم آخر اس کی منزل ہے کہاں؟

[1] یعنی "سیارہ"

بادی النظر میں یہ بحث آرائیاں یہاں بے موقع معلوم ہوتی ہیں مگر اصغر مرحوم کے کلام سے جو لوگ دلچسپی رکھتے ہیں، اُن کو اس ضمنی تمہید سے اتفاق ہونا چاہئے کیونکہ اصغر کا طائرِ خیال اسی قسم کی فضاؤں میں منڈلاتا رہا ہے۔
اب اصغر کے کلام سے متعلق متذکرہ بالا صوری و معنوی خصوصیات کے ماتحت چند مثالیں پیش کرنے کے بعد اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔

۱۔ نیازِ تقدیس:۔

ترا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے — مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں مَیں
خبر گئی نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں — اور بھی دُور ہو گئے آ کے ترے حضور میں
اگر خموش رہوں مَیں تو تُو ہی سب کچھ ہے — جو کچھ کہا تو ترا حُسن ہو گیا محدود
جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشمِ بشر سے — ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

۲۔ جذبۂ بے اختیاری۔ (اس عنوان سے متعلق تمثیلوں کی انتہا نہیں، صرف چند لکھی جاتی ہیں:۔

چلوں میں جانِ حزیں کو نثار کر ڈالوں — نہ دیں جو اہلِ شریعت جبیں کو اذنِ سجود
جو سب لیا ہے تو یہ سوز و ساز بھی لے لے — یہی رہا ہے کہ اب امتیاز بھی لے لے
بہار آتے ہی وہ یکبارگی میرا تڑپ جانا — وہ جا پڑنا قفس کا آپ سے آپ اُڑ کے گلشن میں
پھر میں نظر آیا، نہ تماشا نظر آیا — جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا
صہبائے تُند و تیز کو ساقی سنبھالنا — اُچھلے کہیں نہ شیشہ و ساغر لئے ہوئے
سرگرمِ تجلی ہو اے جلوۂ جانانہ — اُڑ جائے دھُواں بن کر کعبہ ہو کہ بُت خانہ
یہ دین، یہ دُنیا ہے، یہ کعبہ یہ بت خانہ — ایک اور قدم بڑھ کر اے ہمتِ مردانہ
موجوں کا عکس ہے خطِ جامِ شراب میں — یا خون اُچھل رہا ہے رگِ ماہتاب میں
مجھ پہ نگاہ ڈال دی اُس نے ذرا سرُور میں — صاف ڈبو دیا مجھے موجِ مئے طہُور میں
اُس نے مجھے دکھا دیا ساغرِ مے اُچھال کر — جانِ بلاکشاں بھی آج غرق ہے موجِ نوُر میں

۳۔ نشاطِ تخئیل یا عیشِ مایوسی وغیرہ:۔

کچھ اور عشق کا حاصل، نہ عشق کا مقصود — جز اینکہ لطفِ خلشہائے نالۂ بے سُود
نہ میرے ذوقِ طلب کو ہے مدعا سے غرض — نہ گامِ شوق کو پروائے منزلِ مقصود

ہزار جامہ دری صد ہزار بخیہ گری — تمام شورش و تمکیں نثارِ بے خبری
سکونِ شورشِ پنہاں ہے شغلِ جامہ دری — قرارِ سینۂ سوزاں ہے نالۂ سحری
چھپی ہے نیم نگاہی میں روحِ بے تابی — ملی ہے حسنِ تبسم کو ریزشِ شرری ......
تری نگاہ کے صدقے یہ حال کیا ہے مرا — کمالِ ہوش کہوں یا کمالِ بے خبری
مزہ الم میں ہے کچھ لطف خستگی میں ہے — غرضکہ نشو و نمائے روح کی اسی میں ہے
اللہ رے دیوانگیِ شوق کا عالم — اک رقص میں ہر ذرۂ صحرا نظر آیا
مجھی سے بگڑے رہتے ہیں مجھی پر ہے عتاب اُنکا — ادائیں چھپ نہیں سکتیں نوازشہائے پنہاں کی
حقیقت کھول دنیا میں جنوں کے رازِ پنہاں کی — قسم دے دی ہے لیکن قیس نے چاکِ گریباں کی
مستانہ کر رہا ہوں رہِ عاشقی کو طے — کچھ ابتدا کی ہے خبر نہ انتہا کی ہے
شعورِ غم نہ ہو فکرِ مآلِ کار نہ ہو — قیامتیں بھی گزر جائیں ہوشیار نہ ہو
دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوسِ حسن ہے — جو اس سے بےخبر ہیں وہی ہیں عذاب میں
ہم اُس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا
(فارسی) ز موجِ خونِ دل صد بار مَن رنگیں قبا گشتم — بہ خاکِ کربلا ہم صد بہارے کردہ ام پیدا

محاسنِ صوری کلامِ اصغر میں کافی ہیں، مگر غالب کے کمال تک باوجود کوشش کے ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ اور کہیں کہیں زبان کی خامیاں بھی رہ گئی ہیں۔ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ اصغر صاحب کو نورانیات سے بڑی دلچسپی تھی اس پر لکھنؤ والوں نے (جو پھبتیوں میں وحدہٗ لاشریک ہیں) ایک پھبتی بھی کہی تھی۔ لیکن باوجود پھبتیوں کے اہلِ لکھنؤ اصغر مرحوم کو اپنے وقت کا ایک بڑا شاعر تصور کرتے رہے۔ لکھنؤ کے ہر بڑے مشاعرے میں مرحوم ضرور مدعو کئے جاتے تھے اور اُن کی غزلوں پر واہ واہی خوب ہوتی تھی چنانچہ صوری محاسن سے متعلق چند مثالیں حسب ذیل ہیں:-

۱۔ **بلاغت۔** پورا کلام بلاغت کا نمونہ ہے۔ مثلاً:-

کہہ یہ عشق سے چھیڑ دے تو سازِ ہستی کو — ہر ایک پردے میں ہے نغمۂ "ہو الموجود"
ہاں وادیِ ایمن کے معلوم ہیں سب قصّے — موسیٰ نے فقط اپنا اِک ذوقِ نظر دیکھا
ہوش کسی کا بھی نہ رکھ جلوہ گہِ نماز میں — بلکہ خدا کو بھول جا سجدۂ بے نیاز میں
لذتِ سجدہ ہائے شوق نہ پوچھ — ہائے وہ اتصالِ راز و نیاز

پیری میں عقل آئی تو سمجھے کہ خوب تھی | ڈوبی ہوئی نشاط میں غفلت شباب کی
حسن ہزار طرز کا، ایک جہاں اسیر ہے | مُلحدِ باخبر بھی گم جلوۂ لاالٰہ میں
وہ نکہت سے سوا پنہاں وہ گُل سے بھی سوا عُریاں | یہ ہم ہیں جو کبھی پردہ، کبھی جلوہ سمجھتے ہیں

۲۔ فلسفیانہ مولویت :۔

توڑ کر دستِ طلب محوِ رضا ہو جائیے | سر سے پا تک ہمہ تن آپ دُعا ہو جائیے
جو شجر باغ میں ہے وہ شجرِ طُور ہے آج | پتّے پتّے میں جو دیکھا تو وہی نُور ہے آج
کس شان سے پردے کو ہٹایا ہے تڑپ کر | ناکامیِ پُر دردِ حجابِ بشری نے
شعلۂ طور کو دیکھا ہے تو اجد کرتے | شب کو گر رقص میں آجاتا ہے اول کوئی
نظامِ دہر کیا بیتابیوں کے کچھ مظاہر ہیں | گدازِ عشق گویا رُوح ہے ارکانِ عالم کی
ہے بہت اعلیٰ مقامِ خستگی و عاجزی | بے پروبالی سروشِ عشق کی آواز ہے
ضوابط دین کامل کے دیئے ہیں تیرے ہاتھوں میں | تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے

یہ راز ہے میری زندگی کا | پہنے ہوئے ہوں کفن خودی کا
ہاں سینہ گلوں کی طرح کر چاک | دے مر کے ثبوت زندگی کا
پھر ڈھونڈ رہا ہوں بیخودی میں | کھویا ہوا لطف آگہی کا
او لفظ و بیاں میں چھپنے والے | اب قصد ہے اور خامشی کا
یاس ایک جنونِ ہوشیاری | اُمید فریب زندگی کا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی | جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا
کامیابِ شوق کی ناکامیوں کو دیکھئے | صرفِ مطلب محو ہے جوشِ دُعا کے سامنے
(فارسی) من نوائے خویش را آوردم از جائے دِگر | در چمن ہنگامۂ محدود و نامحدود بُود
" زِ "لا" تسخیر کردم این جہانِ ماہ و انجم را | زِ جوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

۳۔ "پرکاش پریم" :۔ اصغر مرحوم "نورانیات" کے بہت شوقین تھے۔ نور، شعلہ، چمک، برق، تابانی، وغیرہ وغیرہ الفاظ سے ان کا کلام کہیں تو "بقعۂ نور" ہے کہیں "آتش کدۂ گبر"۔ چند مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ وہ مشعلِ ہدایت ہونے کے علاوہ عقل سوز بھی ہیں :۔

ہر نور پہ کچھ اور ہی اِک نُور کا عالم | اِس رُخ پہ جو چھا جائے مرا کیفِ نظر بھی

ضیائے حسن کا ادنیٰ سا یہ کرشمہ ہے　　چمک گئی ہے شبستانِ غیب و بزمِ شہود

جو مجھ پہ گزری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم　　چمک رہا ہے مژہ پر "ستارۂ سحری"

رخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی　　شعاعیں پڑ گئیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

جانِ بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی　　اب چمن میں نہ رہا "شعلۂ عریاں" کوئی

اک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے رقص آرا　　یہ نیستی و ہستی افسانہ ہے افسانہ

قلب پر اب تک تڑپتی ہے شعاعِ برقِ طور　　خون کے قطروں میں اب تک رقصِ منصوری بھی ہے

غزل کیا اک "شرارِ معنوی" ہے رقص میں اصغر　　یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

شاید کہ پیام آیا، پھر وادیٔ سینا سے　　شعلے سے لپکتے ہیں کچھ کسوتِ مینا سے

رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برقِ تبسم بھی　　لہریں سی جو اٹھتی ہیں کچھ چشمِ تمنا سے

خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لطف ہے　　اہلِ تپش کو آتشِ سینا نہ چاہئے

محو ہے ذوقِ دید بھی جلوۂ حسنِ یار میں　　ایک شعاعِ نور ہے اب یہ نظر نظر نہیں

تجلّی چہرۂ زیبا کی ہو کچھ جامِ رنگیں کی　　زمیں سے آسماں تک عالمِ انوار ہو جائے

مندرجۂ بالا مثالوں میں "ستارۂ سحری"، "شعلۂ عریاں"، "شرابِ معنوی"، "شعلے" اور "شعاعِ نور" وغیرہ سے قطرۂ اشک، پھول، شعر، ارمان اور روح مراد ہیں۔ اس قسم کی مجازی اصطلاحات اور شاعرانہ استعاروں کا شوق غالب کو بھی بہت تھا لیکن غالب نے شکوہ آمیز اور طنزیہ رنگ دے کر ان کو اس طرح نبھایا کہ جزوِ زبان ہو گئے۔ اصغر یہ بات پیدا نہ کر سکے۔ اس لئے یہ الفاظ جب تک ان کے اشعار میں ہیں اچھے ہیں، اشعار سے خارج ہونے پر ان کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔

اصغر مرحوم نے کہیں کہیں اقبال کے جذباتِ ملت اور ان جذبات کی کیفیت لئے ہوئے اسلامی روایات کا بھی چربہ اتارنے کی کوشش کی ہے مگر اپنے کلام میں نہ وہ بات پیدا کر سکے، نہ وہ کیفیت، اور اپنی مولویانہ خشکی کی وجہ سے وہ ناکام رہے۔

کلامِ اصغر کے دونوں مجموعے دیکھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی مضمون نگار "Bacon" شاعرانہ استعداد اور تصوف و معرفت کا سبق حاصل کرنے کے بعد محفلِ روحانیاں سے اٹھ کر اصغر کی شکل میں پھر دوبارہ دنیا میں نمودار ہوا۔ کیونکہ اصغر نے حقائق کی تشریح نہیں کی جس طرح اقبال نے کی یا اور تمام مغربی شاعر کرتے ہیں بلکہ صرف انکے نکات نمایاں کر دیئے، اور نکات تو میر صاحب نے بھی بیان کئے تھے اور غالب نے بھی، اس وقت تو تشریح و تفسیر کی ضرورت ہے۔

سید مقبول حسین احمد پوری

اصغر کی وفات سے مطلع ہونے پر

آہ! ابھی تم کچھ دِن جیتے
بھولے مسافر پریمی اصغر!

اُردو غزل میں عقل کی باتیں
تم نے کہیں دل ہاتھ میں لیکر
اور اشعار نے اکثر کھائی
غالبؔ اور اقبال سے ٹکّر
کِسی نے اُن میں امرت پایا
واہ کسی نے کی خوش ہوکر
کوئی تو سمجھا کوئی نہ سمجھا
کوئی ہوا آپے سے باہر
رُخصت تُم بھی ہوئے محفل سے
قبل از وقت ہی جا پہنچے گھر
ہم پردیسی اور مُسافر
بیٹھ نہ جائیں راہ میں تھک کر

آہ! ابھی کچھ دن تُم جیتے
بچھڑے مسافر پریمی اصغر!

سیّد مقبول حسین احمد پوری

اُردو ـــــ ہندی
ہندوستانی

اکتوبر ۱۹۳۸ء کی بات ہے کہ میں نے "ہمایوں" میں سرمایۂ مشترک کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا۔ اس کی صرف دو اقساط شائع ہوئی تھیں کہ یوپی کے اُردو کے اجارہ دار بگڑ کھڑے ہوئے اور مدیر "ہمایوں" کی صلح پسندی نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ اُن سے عذرِ گناہ کر کے اِس قصہ کو ختم کر دیں۔ افسوس کہ اس اعتراف سے قبل انہوں نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔ زیادہ صدمہ اس بات سے ہوا کہ میرزا محمد سعید صاحب جیسے حضرات بھی اس احتجاج میں ہم نوا ہو گئے اور بات کی تہ تک نہ پہنچے۔ میں نے کچھ کہا اُنہوں نے کچھ سمجھا۔ اس طرح میرا قلم رُک گیا اور "غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد" کا ورد کرتا رہ گیا۔ میں نے یہی کہا تھا کہ اُردو زبان تمام ہندوستان کی مشترکہ جائداد ہے کسی خاص جماعت کی ملک نہیں۔ فرمایئے میں نے کیا بُرا کیا۔ آج بھی یہی آواز ہے جو بلند سے بلند تر ہو رہی ہے۔ اُردو کے مخالف کان ہی نہیں دھرتے۔ پہلے اپنے اسے گوارا نہیں کرتے تھے تو آج غیروں کو کیوں ناگوار نہ ہو۔ میں نے وہ باتیں اجاگر کی تھیں جن کے باعث ہندوؤں کے دِل اُردو کی طرف سے کھٹے ہو گئے۔ اور اُنہوں نے اُردو کی ایک شاخ کاٹ کر اپنی پھلواڑی علیحدہ بنا لی۔ اگر اس وقت یہ بات ہندوؤں کی خاطر مان لی جاتی تو آج معاملہ اس قدر کٹھن نہ ہوتا۔

اب اُردو اور ہندی کے تنازع نے دنگل کی شکل اختیار کر لی ہے۔ دلیل بازی کا بازار گرم ہے۔ مگر افسوس کہ اصلیت کی طرف کوئی نہیں جاتا۔ اور یہ نہیں دیکھتا کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور کس طرح یہ خلیج پاٹ سکتے ہیں۔ اس وقت یہ صرف زبان کا قصہ تھا اور محض ادب کی چار دیواری تک محدود تھا۔ لیکن اب یہ قضیہ ایک سیاسی کھلونا بن گیا ہے اور عرصہ سیاسیات کے تھکے ہارے سپاہی اس سے دل بہلانا چاہتے ہیں۔ معمولی بول چال کا اختلاف خود بخود مٹ جاتا مگر ان حضرات نے اسے ایسا بانس پر چڑھایا کہ اچھا خاصا ہندو مسلم سوال بنا کر رکھ دیا۔ اُٹھائی گیرے رہنما اگر ایسا کرتے تو کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی کہ وہ اپنے وقار کے جھنڈے انہیں تنازعوں کے طفیل بلند کر سکتے ہیں۔ مگر تعجب ہے تو مہاتما گاندھی کی عقل پر کہ اُنہوں نے پراگندہ قوم کے ہاتھ میں افتراق کا ایک اور ہتھیار دے دیا اور ان کے باغ سے پھوٹ کا میوہ نکل کر ہندوستان کے بازار میں بکنے لگا۔ ایک دن تھا کہ مہاتما گاندھی نے کانگرس کے بھرے پنڈال سے اعلان کیا کہ "ہندوستانی" ہندوستان کی ملکی زبان اور کانگرس کی سرکاری زبان ہے۔ اس اعلان سے سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور لوگ مہاتما جی کی دُور بینی کے پہلے سے بھی زیادہ قائل ہو گئے کہ یہ انہیں کا دماغ ہے جس نے

ہندو مُسلم اتحاد کا سنگھم ڈھونڈ نکالا، لیکن اب یہ وقت ہے کہ خود مہاتماجی اس اتحاد کی جڑیں کاٹنے پر تُلے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہندوستانی سے ان کی مراد ہندی ہے۔ آج تک مہاتماجی کے متعلق لوگوں کا یہ عقیدہ چلا آتا تھا کہ وہ نڈر سپاہی ہیں۔ جو بات کہنی ہوتی ہے، ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں۔ لگی لپٹی کے روادار نہیں، لیکن اکھل بھارتیہ پرشد کے اجلاس میں حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے جس انداز سے اعلان کیا ہے۔ وہ ان کی روایاتِ بے باکی کی تائید نہیں کرتا۔ وہ پردہ ہی پردہ میں لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنا چاہتے تھے۔ لیکن خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق کا وہ اتفاق سے اِس جلسہ میں موجود تھے۔ اُنہوں نے ہتھے پر ٹوکا۔ پروفیسر مجیب نے دہلی سے مہاتماجی کو خبردار کیا۔ لیکن مہاتماجی ٹس سے مس نہ ہوئے اور ہندوستانی کے ساتھ ہندی کو جوڑ کر دم لیا۔ اس کے بعد جب پنڈت جواہرلال صاحب اور پنڈت سندرلال صاحب نے مہاتماجی کی آنکھوں سے وہ پردہ اُٹھایا جو ڈاکٹر مونجے کے قبیل کے رہنماؤں نے ان کی آنکھوں پر ڈالا تھا۔ اور بتلایا کہ اُردو میں ہندوستانی کہلانے کی زیادہ صلاحیت ہے، تو پھر بھی وہ صاف گوئی کی ہمت نہ کر سکے۔ انہوں نے کیا تو یہ کیا کہ لفظوں کا گورکھ دھندا بنا کر ملک کے سامنے پیش کر دیا، جسے لاکھ پڑھو مگر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکو۔ اس تحریر میں وہی منطق ہے جسے کہتے ہیں کہ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ لیکن یہ روک تھام کہاں تک۔ مہاتماجی کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے افریقہ سے مراجعت کرنے سے لے کر آج تک ہندی ہی کا راگ گایا۔ یہ ہندوستانی کی حمایت محض ایک چال تھی جس میں اُردو کے حامی پھنس گئے تھے مگر وقت پر ہوشیار ہو گئے۔ ممکن ہے کہ جمہور کے تقاضے سے متاثر ہو کر مہاتماجی اوپرے دل سے اسی سابق رائے سے رجوع کریں، لیکن جو اُن کے دل میں بس رہی ہے وہ ہندی ہے۔

ہندی اور اُردو کا تخالف افراط تفریط سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ابتدا میں ایک ہی زبان تھی جو ترک، افغان اور آریا نسل کے ہندوؤں کے میل ملاپ سے آپ سے آپ بن گئی۔ نہ قواعد تھے نہ حکم۔ اس طرح کچھ فارسی کے الفاظ ہندوستانیوں کی زبان پر چڑھ گئے اور اس طرح ہندی کے شبد ترک اور افغانوں نے بولنے شروع کر دیئے۔ ہندی الفاظ ترکوں اور افغانوں کو اس قدر مرغوب ہوئے کہ فارسی شعراء انہیں فارسی میں کھینچ لے گئے۔ "جھگڑا، کھچڑی، جھروکہ" آپ کو فارسی میں جابجا نظر آئیں گے۔ اس زبان کا اب کوئی نام رکھو۔ ریختہ، اُردو، ہندی کسی طرح پکارو۔ ہے وہی زبان جو اس طرح پیدا ہوئی۔ سیاست دان لاکھ جتن کریں مگر ہندوستان کی ملکی زبان یہی ہے اور یہی رہے گی۔ یعنی یہ وہ زبان ہو گی جس میں فارسی اور سنسکرت کے عام فہم الفاظ کو بغیر کسی روک ٹوک کے آنے کی اجازت ہو گی اور ایسے الفاظ نہ آنے پائیں گے جس کے لئے فارسی اور سنسکرت کے لغاتوں کی ورق گردانی کرنا پڑے۔ بلاشبہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے، دونوں کی مشترکہ کوشش سے تیار ہوئی۔ انہیں کی مشترکہ کوشش سے پروان چڑھی اور اگر ہندوستانیوں کے لچھن یہی ہیں تو انہیں کی مشترکہ کوشش سے گرداب میں ہو گی۔ شاباش میرے بھائیو! دیکھنا ہندو مسلم اتحاد کی یہ دھندلی سی یادگار بھی باقی نہ رہنے پائے۔ سوراج لینے والوں کے یہی کرتوت ہوتے ہیں۔ اس زبان میں جب فارسی الفاظ، فارسی ترکیبات، فارسی مصطلحات اور فارسی تلمیحات کو تکلّف سے داخل کیا جاتا ہے تو اسے اُردو کہہ سکتے ہیں اور جب سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ خرگیں کی بھرتی کی طرح آ ابراجتے ہیں اور ہندوستانی تلمیحات سے اوپر نظر نہیں جاتی تو اسے ہندی کہتے

ہیں جو ایک بالکل جدید چیز ہے جس نے ۱۹۱۶ء میں جنم لیا۔

پس ہندوستانی وہ زبان ہے جس میں فارسی اور سنسکرت کے وہ الفاظ جو روزمرہ میں داخل ہو چکے ہیں یا داخل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں استعمال ہوں، یہی زبان ہے جس کی خدمت میں انجمن اُردو نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ اگر مہاتما جی ہٹ دھرمی کے جال میں نہ پھنس جاتے تو وہ بھی اسی زبان کے حامی ہوتے، مگر یہ سعادت ان کی قسمت میں نہ تھی۔ تو کوئی کیا کرے۔ ہمیں نہ ٹھیٹ ہندی کی ضرورت ہے نہ نکھار اُردو کی۔ وہ زبان ہندوستانی ہے جسے اس کے گنگا جمنی لباس میں دیکھ کر اُردو یا ہندی نہ کہہ سکیں۔

رسم الخط کا سوال ایک بھاری پتھر ہے جس کا اُٹھانا دوبھر ہو رہا ہے۔ جس قدر یہ سوال کٹھن ہے اسی قدر اس کا علاج آسان مگر کسیلا کڑوا ہے اور وہ کونسی اصلاح ہے جس میں ذوقِ مرّوجہ کو قربان نہ کرنا پڑے۔ یہ میرا ایجاد نہیں بلکہ محض اتفاق ہے جو میں چند لسانیات کے واقفوں سے کر رہا ہوں کہ فارسی اور ناگری رسم الخط اُردو اور ہندی کے لئے چھوڑ کر ہندوستانی کے لئے رومن کیرکٹر اختیار کیا جائے کہ ایشیائی ممالک یکے بعد دیگرے اس خط کو اختیار کر رہے ہیں۔ جو کام ہمیں کل کرنا پڑیگا کیوں نہ آج اختیار کریں اور ہزاروں آفتوں سے نجات حاصل ہو جائے۔ رومن کیرکٹر میں ایک رسالہ اور اخبار جاری کر دیجئے پھر دیکھئے اس زبان کو کس قدر جلد بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی نہیں کہ اُردو اور ہندی کی مجالس قائم کی جائیں بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندوستانی زبان کو فروغ دینے کے لئے ایک سوسائٹی قائم کی جائے۔ ہندوستانی اکیڈیمی بھی راستہ بھول گئی اور اس نے ہندی اور اُردو کے علیحدہ علیحدہ شعبے بنا دیئے اور لسانی افتراق کی آگ اور بھڑکا دی۔ اکیڈیمی مذکور اپنے نام کی لاج رکھ لیتی، اگر وہ ہندوستانی زبان میں کتابیں لکھواتی۔ اُردو کو ہندوستانی کے نزدیک کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے املائی اصلاح کی جائے۔ گریمر کو عربی اصطلاحات کے بار سے سبکدوش کیا جائے۔ تذکیر و تانیث کی قیود کو ہلکا کیا جائے۔ اور متروکات پر نظرثانی ہو۔ یہ ہے مختصر خاکہ اس زبان کا جو میرے عندیہ میں ہندوستانی کہلانے کی مستحق ہے۔

ان امور پر مفصل بحث بہتر اہلِ قلم کی توجہ کی محتاج ہے۔ ورنہ غریب شہر کے سخنہائے گفتنی تو "ہمایوں" کے صفحات پر آ ہی جائیں گے۔

"ڈرامی"

یہ مضمون بہت اہم ہے لیکن جناب "ڈرامی" سے بعض باتوں میں بحالات موجودہ شاید اکثر لوگوں کو اتفاق نہ ہو۔

"ہمایوں"

تعمیرِ زبانِ اُردو

پھر نظر بزمِ ادب میں نئے ساماں آئے
پھر یہاں دوسرے ملکوں کے سخنداں آئے
پھر اضافہ کوئی تاریخِ ادب میں ہوگا
لیجئے ہندوؤں کے بعد مسلماں آئے

ہند میں اب نئی دُنیا تھی زباں دانوں کی
مشترک بزم تھی سب ہندو مسلمانوں کی

مشترک بزم سے ہوتا ہے اب آغازِ کلام
عربی، فارسی، بھاشا میں ہے پیغام وسلام
ترجمانی سے کوئی کام چلائے کب تک
کارِ آغاز سے پیدا ہوئی شکلِ انجام

اب نظر آتے ہیں اس سوچ میں اربابِ نظر
یک زباں ہونا ضروری تو ہے، لیکن کیونکر

کس طرح چند زبانوں کو ملائے کوئی
ایک دُنیائے ادب اور بسائے کوئی
پھول ہر ایک گلستانِ ادب سے چن کر
ایک گلدستۂ نوطرز بنائے کوئی
جمع کرنا ہو اگر بکھرے ہوئے پھولوں کو
وسعتِ دامنِ نظّارہ بڑھائے کوئی
ہاں عرب اور عجم کی کوئی تفریق نہ ہو
لیلیٔ نجد کو شیریں سے ملائے کوئی
نغمۂ مشرق و مغرب سے کوئی بحث نہیں
گیت جس دیس کا ہو، دیس میں گائے کوئی
ذوقِ نو کہتا ہے اب بادۂ شیراز کے ساتھ
ہند کے کیف واثر کو بھی ملائے کوئی

گُل و بلبل نہیں مخصوص تغزّل کیلئے گیت کچھ مُلکی بہاروں کے بھی گائے کوئی
بعد کو ملتے ہیں دل، پہلے زباں ملتی ہے پہلے تفریقِ لسانی تو مٹائے کوئی
ایک ہو ملک کی جب تک نہ زبانِ قومی کس طرح ملک کو اِک قوم بنائے کوئی

آرزو تھی تہِ دل سے یہ زباں دانوں کی
ایک ہی ہوتی زباں ہندو مسلمانوں کی

خواب یہ صورتِ تعبیر میں لایا ہی گیا گلکدہ حُسنِ تخیّل سے بنایا ہی گیا
نئے افعال، نئے ربط، نئی ترکیبیں نیا اعجازِ ادب تھا کہ دِکھایا ہی گیا

یہ ہے افسانۂ تعمیرِ زبانِ اُردو
خود ہی اُردو کی زباں پر ہے بیانِ اُردو

کام یہ کس نے کیا، یہ بھی بتانا ہے ہمیں اِک حقیقت کی طرف آپ کو لانا ہے ہمیں
بعض کہتے ہیں کہ اُردو ہے مسلمانوں کی ایسے افرادِ غلط گو کو دکھانا ہے ہمیں

جو زباں عام ہو، وہ خاص نہیں ہو سکتی
امتیاز اپنا کسی طرح نہیں کھو سکتی

قومِ مخصوص بنا سکتی نہیں عام زباں بعض افراد کی باتوں کا نہیں نام زباں
ہو سکی ملک کے جو عام اثر سے پیدا کیوں نہ کہلائے کسی ملک کی وہ عام زباں

کون کہتا ہے کہ اُردو کا زباں نام نہیں
کیا یہ اِس مُلک کی مقبول زباں عام نہیں

آپ سمجھے، یہ نیا باغ لگایا کس نے — مِل گئیں چند بہاریں تو بِلایا کس نے
صرف جو خون ہوئے ہیں کوئی اُن سے پُوچھے — ادب اُردو کو رنگین بنایا کس نے
کام تنہا تو نہیں ہے یہ مسلمانوں کا
شمع میں رنگ و اثر ہے سبھی پروانوں کا
باغ پایا جو نیا تو نئے مالی آئے — اُس طرف میرؔ، اِدھر غالبؔ و حالیؔ آئے
نہیں اِک میر حسن ہی کہ دیا شنکر بھی — لے کے گلزار ادب میں نئی ڈالی آئے
باغ اُردو تو کسی خاص جماعت کا نہیں
تذکرہ کوئی یہاں مذہب و ملّت کا نہیں
ملک والے! یہ تری ملکی زباں ہے اُردو — جزوِ واحد کی نہیں، کل کی زباں ہے اُردو
اور کیا چاہئے! کانٹوں سے اُلجھنا ہے عبث — آج اس باغ کے ہر گُل کی زباں ہے اُردو
ہائے افسوس، مگر قدر ترے دل میں نہیں
مرتبہ تیرا ابھی دیدۂ عاقل میں نہیں
یک زباں کاش کہ ہو جائیں سب اربابِ وطن — دِل سے ہو جائیں حقیقت میں سب احبابِ وطن
ایک ہونے دو انہیں آج زبان و دل سے — سچا ہو جائے گا پھر دوست! ہر اک خوابِ وطن
چاہئے ہے ہمیں تفریق مٹانا گویا
مشترک گیت ہو اُردو کا ترانہ گویا
آپ فرمائیں تو کچھ مشغلۂ دَور رہے — بعد اس نظم کے اُردو کی غزل اَور رہے

غزل

آنکھ کھل جائے گی، پیدا تو نظر ہونے دے
پردہ اُٹھ جائے گا، اے شمع سحر ہونے دے

کوئی تعمیر نہیں ہوتی، بغیر تخریب
دل بنانا ہو جسے خونِ جگر ہونے دے

چاند کا عکس سمندر سے یہ کہہ کر گزرا
وہ شناور ہے جو دامن بھی نہ تر ہونے دے

ہو کے بیخوف بھی یہ دیکھ کہ ہوتا کیا ہے
جو بھی ہونا ہو، کوئی خوف نہ کر ہونے دے

کر نہیں سکتا کوئی فطرتِ آزاد کو قید
جب ہے صیاد کہ پیدا ہی نہ پر ہونے دے

ہے وفاکیش تو رہ اپنی جگہ پر قائم
اِس زمانے کو یُونہیں زیر و زبر ہونے دے

تو اگر چاہتا ہو عین تلاطم میں سکون
پیدا اپنا دلِ سیلاب میں گھر ہونے دے

میری دُنیا ہے، میری بیخبری تک شاید
ورنہ ساقی نہ مجھے میری خبر ہونے دے

غیرتِ عشق اگر ہے تو یہ کچھ دُور نہیں
خطرۂ غیر کا دل میں نہ گزر ہونے دے

ضبط کر ضبط کہ ہو اشک کی قیمت کوئی
آنکھ میں رکھ ابھی قطرے کو، گُہر ہونے دے

بزمِ ساقی میں بھی ہے ساغر و مینا کی تلاش
کارِ دل کو تو نہ محدودِ نظر ہونے دے

اس تمنا میں عجب جذبۂ دل ہے گویا
کاش کوئی مجھے ممنونِ نظر ہونے دے

گویا جہان آبادی

تخلیقِ آدم

خدا ۔ فرشتے ۔ آدم (پہلا انسان)

چاند کی دُنیا کے اُس پار، نُور کی فضاؤں میں نیلگوں روشنیوں میں ڈوبا ہُوا ایک وسیع لیکن بے در و دیوار سا ہال ہے۔ فرشتے صف باندھے کھڑے ہیں۔ وسط میں ایک بڑی میز پڑی ہے۔ اس پر ایک طرف بلّور کی صراحیاں رکھی ہیں جن میں مختلف رنگوں کے جوہر بند ہیں۔ دوسری طرف سیماب کے قالب میں ایک مجسّمہ تیار ہو رہا ہے۔ فرشتوں کی نظریں میز سے بلند ہو کر سامنے نُور کی گہرائیوں میں کھوئی جا رہی ہیں۔ یہیں عرش اور کرسی ہے لیکن افراطِ نُور سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ فرشتوں کی پُرشوق نگاہیں غمازی کر رہی ہیں کہ کسی اہم کام کی طیاریاں ہو رہی ہیں۔

ایک فرشتہ۔ ربّ العزت! مجسّمہ تیار ہے۔
خدا۔ (نیلگوں گہرائیوں سے) اس میں جوہر بھر دو۔

وہی فرشتہ۔ خداوندِ عالم! کون کون سے جوہر؟
باقی فرشتے۔ سبھی جوہر!

فرشتے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے تکنے لگتے ہیں اور "سبھی جوہر" کی دبی ہوئی آواز چاروں طرف سُنائی دیتی ہے۔

خدا۔ ہاں سبھی جوہر! میں انسان کو اپنی صفات کا مظہر بنانا چاہتا ہوں۔ تم مجبور اور پابند ہو۔ لیکن انسان آزاد اور صاحبِ اختیار ہوگا۔
—— ہاں ایک حد تک صاحبِ اختیار اور آزاد —— آسمانوں پر میرا حکم چلتا ہے۔ زمین پر کم و بیش اُس کا حکم چلے گا۔ تم میں حُسن ہے لیکن کس قدر پھیکا! میں حُسن کا دامن عشق کے لہو سے رنگین کروں گا۔ میں انسان کو علم، تخییل، نغمہ، جرأت، ہمدردی اور دیگر سبھی جوہر بخشوں گا۔ میری یہ مخلوق تمام عیوب سے پاک ہوگی، مکمل ہوگی۔ سُنا تم نے؟

فرشتے۔ ہاں خدائے عزّ و جلّ! "عیوب سے پاک اور مکمل!"

خدا۔ (کارکن فرشتہ سے) بس ڈال دو سب جوہر!

فرشتہ۔ (ایک صُراحی اُٹھاتا ہے) یہ رہی آزادی اور اختیار۔

فرشتے بےچینی سے پر ہلاتے ہیں۔ پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے زنجیروں کی جھنکار کی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ (کارکن فرشتہ رعنائیوں سے بھری ہوئی صُراحی اُٹھا کر) یہ رہا حُسن! (اب فرشتہ ایک خونیں عرق کی صُراحی اُٹھاتا ہے) یہ رہی عشق کی رنگینی! مجسّمہ میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور قالب سے دھوئیں میں لپٹا ہُوا ایک شعلہ بلند ہوتا ہے۔ فرشتے جھک جھک کر عشق کی شعلہ آشامی دیکھتے ہیں۔ کارکن فرشتہ

برابر صراحیاں اُٹھاتا چلا جاتا ہے ـــــ یہ رہی دولت ـــ عقل ـــ طاقت ـــ علوم ـــ فنون ـــ جرأت ـــ تخیل ـــ نغمہ ـــ
اب وہ تارِ عنکبوت میں لپٹی ہوئی ایک صُراحی اُٹھاتا ہے۔ یہ رہا ـــــ

فرشتہ۔ خداوند!

خدا۔ ٹھہرو!

خدا۔ ٹھہر جا ـــ یہ کیا ہے؟

فرشتہ۔ سکون! رب العزت، یہ سکونِ دل ہے جس کے بغیر اب تک کسی جاندار کی تخلیق نہیں ہوئی۔

خدا۔ سوائے انسان کے!

فرشتہ۔ سوائے انسان کے باری تعالیٰ! یہ کیسے ممکن ہے؟

باقی فرشتے۔ (حیرت سے) یہ کیسے ممکن ہے!

(یہ کیسے ممکن ہے" کی دبی ہوئی آواز چاروں طرف سنائی دیتی ہے۔)

خدا۔ (اپنے آپ سے) ہاں ایسا ہی ہوگا۔ انسان کو یہ جوہر نہ ملنا چاہئے۔ اس کی آمیزش سے وہ مکمل ہو جائیگا۔ اُسے کسی چیز کی احتیاج نہ رہے گی
دولت کے نشہ میں، حُسن اور قوت کے نشہ میں اور باقی سب نعمتوں کے نشہ میں یہ اپنے خالق کو بھول جائے گا۔ یہ ہرگز کوئی پسندیدہ
صورت نہیں ہے۔ جب انسان کو کسی چیز کی احتیاج ہی نہ ہوگی، جب اُسے سکونِ قلب حاصل ہوگا تو اُسے مجھے یاد کرنے کی کیا ضرورت؛ وہ میرے
انعامات کی پرستش کرے گا۔ دولت اور حُسن کی پرستش، لیکن میری نہیں۔ اب بھی یعنی اس جوہر کے بغیر وہ حُسن اور دولت کی پرستش کرے گا۔ ہاں
جب ان چیزوں میں اُسے سکون حاصل نہ ہوگا تو اُس کی بھٹکتی ہوئی رُوح میرے آغوش میں پناہ لے گی۔ انسان میری طرف جُھکے گا (فیصلہ کرتے
ہوئے) ہاں ایسا ہی ہوگا! انسان کو یہ جوہر نہ ملے گا۔ انسان کو دُنیا میں دل کا سکون نہ ملے گا!

(فرشتوں کی صفوں میں سرگوشیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور یہ جُملے سُنائی دیتے ہیں۔)

بدقسمت انسان! ـــ "خدائی صفات کا مظہر!" ـــ "عیوب سے پاک اور مکمل"؟ ـــ
"سب انعام بے فائدہ!" ـــ دُنیا میں انسان کی روح بھٹکتی رہے گی؟ ـــ مگر عشق کی رنگینی
دلفریب تھی!

کارکن فرشتہ تارِ عنکبوت میں لپٹی ہوئی صُراحی پھر وہیں رکھ دیتا ہے۔ بیمار کے قالب سے انسان باہر نکل آتا ہے اور اپنے اردگرد
سے نگاہ ڈالتا ہے۔ فرشتے، میز، صراحیاں، نیلگوں روشنی مدھم نقوش کی طرح آہستہ آہستہ غایب ہو جاتے ہیں۔ فقط انسان لامحدود
فضاؤں میں کھڑا رہ جاتا ہے۔

(جارج ہربرٹ) ـــــــ **محمد حسین غازی**

سُوریہ پُوجا

وہ سامنے کچھ دُور،
آکاش کا پربت،
چُپ چاپ کھڑا ہے،
اور چوٹی پہ اُس کی،
ہے سُوریہ کا مندر!

اُور دھیان میں اپنے
خاموش پجاری
کچھ پیڑ کھڑے ہیں!

سُنسان سماں ہے
آواز کوئی بھی
آتی نہیں بالکل!

اُور پیڑوں کی اِس طور
ہے سندھیا جاری!

اِک گرم سی خوشبو،
پربت کی ہوا میں
ہے طاری و ساری!

یہ بھینٹ چڑھائے،
سُنسان سمے ہیں،
خاموش پجاری،
کچھ پیڑ کھڑے ہیں!

وہ اُونچا سا پربت
وہ اُونچی سی گھاٹی،
چُپ چاپ، مگن ہے!

اُور پھُولوں کے پودے
شاخوں کو جھکائے،
پھُولوں کی ہتھیلی—
آگے کو بڑھائے
(اُور اُوس کے آنسو)

ہیں منتظر اِس کے
مشکُور ہو پُوجا!

یُوں سامنے کچھ دُور
چُپ چاپ کھڑا ہے
آکاش کا پربت،
اور چوٹی پہ اُس کی
ہے سُوریہ کا مندر!

میراجی

برلن میں

قانونِ فطرت کے مطابق رنج ومحن کی یاد انسان کے دل سے رفتہ رفتہ محو ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگِ عظیم کی ہولناک تباہ کاریوں کا دور ختم ہوئے ابھی چند برس ہی ہوئے ہیں کہ یورپ کی مہذب اقوام ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے پھر زور شور سے تیاریاں کر رہی ہیں اور آج کل یورپ کی فضا میں ہر طرف جنگ کے خوفناک بادل اُمڈتے دکھائی دے رہے ہیں۔ میں ذیل میں گذشتہ جنگِ عظیم کی داستانوں کا ایک خونچکاں ورق اُس زہرہ گداز دَور کی یاد تازہ کرنے کے لئے مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں :-

---

برلن سے روانہ ہونے والی ٹرین میں عورتوں اور بچوں کی خوب بھیڑ تھی لیکن کوئی جوان اور صحیح وسالم مرد مشکل سے دکھائی دیتا تھا۔ تیسرے درجے کے کمرے میں ایک کمزور اور مریض بڑھیا کے پہلو میں ایک معمر سپاہی بیٹھا تھا۔ ٹرین کے شور وغل کے درمیان بیمار بڑھیا کی آواز تمام مسافر سُن رہے تھے " ایک - دو - تین " وہ محویت کے عالم میں گن رہی تھی۔ انہیں الفاظ کو وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دوہراتی " ایک - دو - تین " - اس غیر معمولی واقعہ کو دیکھ کر دو لڑکیوں نے بغیر سوچے سمجھے دبی زبان سے کچھ باتیں کیں اور کھلکھلا کر ہنس دیں۔ معمر سپاہی نے انہیں غصہ سے گھورا۔ کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔

گرد وپیش کے واقعات سے بے خبر بڑھیا نے پھر کہا " ایک - دو - تین " لڑکیاں بے اختیار ہنس پڑیں۔ معمر سپاہی نے اُن کی طرف جھک کر کہا :-

" خواتین ! یہ معلوم کر کے آپ کے لبوں پر مہرِ سکوت لگ جائے گی کہ یہ بیچاری میری بیوی ہے۔ اس وقت تک ہمارے تینوں لڑکے جنگ میں کام آ چکے ہیں۔ اور اب میدانِ جنگ میں جانے سے پیشتر میں اُن کی ماں کو دماغی ہسپتال میں داخل کرنے جا رہا ہوں "

کمرے میں تمام مسافر بے حس وحرکت اور خاموش بیٹھے تھے ٭

(ترجمہ) عتیق اللہ خاں

م۔ک۔ن۔ب

کچھ عرصے سے "ہمایوں" میں "م۔ک۔ن۔ب" کے عنوان سے مضمون شائع ہوتے ہیں۔ میں بڑے شوق سے ان کا مطالعہ کرتی ہوں۔ بعض دلچسپ ہوتے ہیں جنہیں پڑھ کر ہنسی آتی ہے اور بعض بہت دردانگیز ہوتے ہیں۔ دو سال کا گزرا ہوا ایک دردانگیز واقعہ مجھے بھی یاد آگیا جسے میں کبھی نہ بھولوں گی۔

ہمارے پڑوس میں ایک بلّی بچّے دے رہی تھی۔ ابھی وہ پوری طرح فارغ بھی نہ ہوئی تھی یعنی صرف ایک ہی بچّہ پیدا ہوا تھا کہ گھر کی مالکہ نے اُسے بچّے سمیت سڑک پر پھینک دیا۔ بچّے نے ابھی تک آنکھیں بھی نہیں کھولی تھیں۔ جسم پر بالوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ بلّی بچاری بلبلاتی ہوئی ماری ماری پھرتی تھی۔ بہت سے لوگ اسے دیکھ رہے تھے اور بے رحم عورت کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ معلوم نہیں اُس وقت بلّی کہاں گئی اور اُسے کس نے پناہ دی۔

اس واقعہ کے نو یا دس ماہ بعد گھر کی مالکہ کو ایسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا کہ خدا یاد آگیا۔ وہ اپنے بھائی کے مکان میں رہتی تھی۔ قضائے الٰہی سے عین عالمِ شباب میں اُس بچارے کا انتقال ہوگیا۔ سوتیلے بھائیوں نے اُسے مکان سے نکال دیا۔ کچھ دن وہ مکان کی تلاش میں سرگردان و پریشان پھرتی رہی۔ بڑی مشکل کے بعد عارضی طور پر ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر ملا لیکن وہاں سے بھی جانا پڑا۔ اب وہ دوسرے مکان میں مقیم ہے۔ خدا جانے یہاں سے بھی کس وقت نکلنا پڑے۔

جس طرح اُس نے بلّی کو گھر سے بے گھر کیا تھا اُسی طرح اب وہ دربدر اپنے بچّوں کو لئے پھرتی ہے۔ کاش اُس وقت اُسے یہ خیال آجاتا کہ جس طرح مجھے اپنے بچّوں سے محبت ہے اُسی طرح بلّی بھی اپنے بچّوں کو پیار کرتی ہے۔ دنیا میں کیسے کیسے سنگدل انسان ہیں جنہیں ایسے بے زبان اور معصوم جانداروں پر ترس نہیں آتا۔ ایسا کرنے والوں پر ضرور خدا کا غضب نازل ہوتا ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس کا خیال کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اُس وقت بلّی کے دل سے بددعائیں نکلتی ہونگی اور یہ ساری مصیبت انہی بددعاؤں کا نتیجہ ہے۔

جس وقت اس واقعہ کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو کانپ اُٹھتی ہوں۔ اس واقعہ کو میں کبھی نہ بھولوں گی۔

م۔ب

ہمشیرۂ حفیظ ہوشیارپوری

آزادی

جہاں ہر دل میں شوقِ آرزو کا ایک طوفاں ہو — جہاں ہر آنکھ میں رنگینیٔ لطفِ گلستاں ہو

جہاں گفتارِ حق پر ہوش پابندی نہ ہو کوئی — جہاں کفرِ محبت عنصرِ ارکانِ ایماں ہو

جہاں ہر ذی نفس کے دل میں ہو احساسِ خودداری — جہاں سینوں میں دائم جذبۂ غیرت پرافشاں ہو

جہاں ہر قطرۂ علم و معارف ایک دریا ہو — جہاں ہر ذرّۂ اخلاق وسعت میں بیاباں ہو

جہاں ہو جوشِ غمخواری کی ہر سو گرم بازاری — جہاں جنسِ اخوّت قدر ہونے پر بھی ارزاں ہو

جہاں چلتی رہے ہر دم نسیمِ صبحِ جاں پرور — جہاں مٹھی میں ہر غنچہ کی پنہاں اک گلستاں ہو

جہاں عنقا ہو استبداد باطل اور بدعہدی — جہاں مردانگی و سرفروشی حسنِ انساں ہو

جہاں چھائی نہ ہو عیش و سکوں کی چارسو ظلمت — جہاں جوشِ عمل کی شمع سے ہر دل فروزاں ہو

جہاں ہر عندلیبِ زار کو ہو اذنِ گویائی — جہاں ہر راست گفتاری کو شنوائی کا امکاں ہو

جہاں دیر و حرم میں کشمکش ہوتی نہ ہو باہم — جہاں شیخ و برہمن میں رواداری کا پیماں ہو

جہاں جذباتِ عصبیت سے خالی سینۂ دل ہوں — جہاں ہر لب محبّت اور شفقت کا ثناخواں ہو

جہاں ہر فرد ہو آزاد موجِ بحر کی صورت — جہاں انسان اپنے واقعی معنوں میں انساں ہو

جہاں نام و نشاں باقی نہ ہو آلام و کلفت کا — جہاں ہر غنچۂ دل پھول کے مانند خنداں ہو

جہاں چلتا ہو جامِ حریّت کا دور رندوں میں — جہاں پیرِ مغاں کا فیض ہر حالت میں یکساں ہو

خداوندا وہاں پہنچا دے مجھ کو اپنی رحمت سے
عطا کر دے وہ آزادی کی منزل فیضِ قدرت سے

محمد ابراہیم ہوش

سپاہی

یہ مختصر سی ایک باب کی تمثیل اوّلاً پنجابی زبان میں تھی بعدہٗ انگریزی زبان میں منتقل ہوئی اور ایک میگزین کے اوراق کی زینت بنی۔ جب اتفاقاً میری نظر سے گزری تو مجھے اس کا پلاٹ پسندیدہ معلوم ہؤا۔ میں نے اسے اُردو کے سانچے میں ڈھال لیا اور اپنی دانست کے مطابق مناسب مقامات پر خفیف خفیف سی تبدیلیاں بھی کردیں۔ اب یہ ٹریجیکل کامیڈی ہدیۂ قارئین ہے جس میں مزاح کی آمیزش اس زیادتی سے تو نہیں ہے کہ قہقہے گونجنے لگ جائیں تاہم "ملح فی الطعام" کی مقدار میں ضرور موجود ہے۔

افرادِ تمثیل

تارا۔ ایک نوخیز دیہاتی حسینہ۔

آنتی۔ تارا کی بوڑھی پڑوسن۔

شوہر۔ تارا کا شوہر جو پردیس میں ہے۔

مقام۔ مغربی پنجاب کا ایک گاؤں جہاں کے لوگ پولیس کے سپاہی کو دیکھتے ہی ڈر جاتے ہیں۔

وقت۔ سرِ شام

پہلا منظر

(پگڈنڈی:۔ تارا گیلے کپڑوں کی گٹھڑی سر پر رکھے ہوئے گھر واپس آرہی ہے۔ بائیں ہاتھ سے گٹھڑی کو تھام رکھا ہے اور دائیں ہاتھ میں کپڑے کوٹنے کی تھاپکی پکڑے ہوئے ہے۔ آہستہ آہستہ گنگناتی بھی جاتی ہے۔)

تارا۔ جب آنے والی صبح کی اُمید گاہ

—— یعنی پورب کی طرف سے

جہاں ابھی کچھ کچھ اندھیرے کی سلطنت

قائم ہو

سورج دیوتا کی چمکتی ہوئی پہلی کرن

دھرتی ماتا کو سلام کرنے کے لئے

آگے بڑھتی ہے اور جھک کر

اس کے قدم لیتی ہے

تو میں

بکھری ہوئی لٹوں

اور

اُداس چہرے کی غم آلود مسکراہٹوں کے ساتھ

اپنے سُونے بچھونے سے

اُٹھ کھڑی ہوتی ہوں

جس میں اے میرے سرتاج!

میرے دُکھتے ہوئے پہلوؤں نے

تمہاری ہم آغوشی نہ پاکر

تڑپ تڑپ کر درد بھری رات کاٹی

ہر روز اسی طرح سُورج کی پہلی کرن

دھرتی ماتا کو پرنام کرتی ہے

اور میں اُٹھ بیٹھتی ہوں

اُٹھنے کے بعد آنگن میں آتی ہوں

منڈیر پر دیکھتی ہوں

کہ کہیں کاگا نہ ہو

دہلیز پر دیکھتی ہوں

کہ کہیں ہرکارے کا پھینکا ہُوا خط نہ ہو

دُور سے پگڈنڈی پر دیکھتی ہوں کہ کہیں تم خود نہ آرہے ہو۔

لیکن مایوس ہو ہو جاتی ہوں

چلتے میں بکھرتے ہوئے بال

پیا کا سندیسا لانے پر

ہوا سے جھگڑتے ہیں

جب ندی پر پہنچتی ہوں

تو ندی آٹھ آٹھ آنسُو بہاتی ہے

اُبھرتی ہوئی لہریں

آہیں بھر بھر کر بیٹھ جاتی ہیں

ننھی ننھی مچھلیاں

سر نکال کر

اظہارِ غم کرتی ہیں

ان سب کو مجھ سے ہمدردی ہے

نہیں ہے تو ایک تمہیں کو نہیں ہے

اگر ہوتی تو تم پردیس سے

میری خاطر

آنہ جاتے!

(ایک باوردی سپاہی پیچھے پیچھے ہولیتا ہے۔ تارا اُسے دیکھتے ہی خاموش ہو جاتی ہے۔)

تارا۔ کون ہے یہ ملعون جو مجھے گھور رہا ہے؛ مردوے کی آنکھیں پھوٹ جائیں۔

(تارا زیادہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہے اور اپنی ساڑھی کو زیادہ حفاظت سے لپیٹ لیتی ہے۔)

سپاہی۔ (شرارت آمیز ہنسی سے) اے پیاری تم کتنی خوبصورت ہو۔ اپنی دلکش مسکراہٹوں پر احتیاط کی مُہر نہ لگاؤ اور نہ مغرور ہی بنو کیونکہ جوانی کا قیام فقط چند روزہ ہے۔

زندگی دو دن کی ہے اے جانِ من ہنس لے بول لے

حُسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

تارا۔ یہ اپنی ماں بہن سے جاکر کہہ۔ کیا تجھے پرائی عورت کے ساتھ بات کرتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟

سپاہی۔ تم غصّے میں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہو۔ ابھی تم اپنے شوہر کے فراق میں کچھ گا رہی تھیں جس نے تمہیں چھوڑ رکھا ہے۔ کیا میں اس سے کسی طرح کم ہوں۔ میری طرف دیکھو ــــــــ میرا چوڑا چکلا سینہ اور دمکتا ہوا چہرہ، میں اس جیسے سات مضبوط آدمیوں کو پچھاڑ سکتا ہوں۔

تارا۔ اپنی زبان روک۔ کیا تو اپنی راہ نہیں لگے گا ؟

سپاہی۔ تم شمشاد کے برابر قد آور ہو۔

تارا۔ (مارنے کے لئے ڈنڈا اُٹھاتے ہوئے) بدمعاش کہیں کا، میں تیرا سر اس ڈنڈے سے پھوڑ دوں گی۔

سپاہی۔ اے حسین لُٹیری تُو نے ایسا حُسن اور ایسی جوانی کہاں سے لُوٹی ہیں۔

(تارا ضرب لگانے کے لئے اس پر پل پڑتی ہے۔ سپاہی بروقت ایک طرف ہٹ جاتا ہے اور پھرتی سے تارا کو کلائی سے پکڑ لیتا ہے)

تارا۔ تجھے موت لے لے۔ کُتّے کا بچہ !

سپاہی۔ اے میری آنکھوں کی روشنی، میں تمہاری سیج ہر روز سب سے زیادہ تازہ پھولوں سے سجایا کروں گا۔

تارا۔ (کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) جا اپنی ماں کے لئے سجا۔ اپنی بہن کے لئے سجا۔ جس کے گھر والے کو مالک تباہ کرے۔

سپاہی۔ (دھمکاتے ہوئے) ایسی ہٹ ؟

(اسی کشمکش میں تارا کے سر سے کپڑوں کی گٹھڑی گر جاتی ہے۔ تارا آزاد ہاتھ سے سپاہی کے بازو پر دو تین ضربیں وحشیانہ پن میں لگاتی ہے۔ سپاہی اپنی گرفت ڈھیلی کر دیتا ہے)

تارا۔ (کانپتے ہوئے) تو نے یہ جرأت کیسے کی۔ شاید یہ سمجھ کر کہ میں عورت ذات تھی اور اکیلی تھی۔

سپاہی۔ میں گڑگڑاتا رہا۔ اسی لئے تم دلیر ہو گئیں اور اب میرے سر پر سوار ہو رہی ہو۔ تم جانتی ہو میں کون ہوں ؟ میں سپاہی ہوں (مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے) میرا کافی اختیار ہے۔ میں جسے چاہوں حالات میں ڈال سکتا ہوں اور جو چاہوں کروں مجھے کون روک سکتا ہے۔

(تارا غضبناک ہو کر ایک ضرب اور لگاتی ہے اور موقع پا کر گاؤں کی طرف بھاگ جاتی ہے)

سپاہی۔ (پھسلانے کی غرض سے) ٹھہر ٹھہر اے سفاک حسینہ!

تارا۔ (گردن پیچھے کی طرف موڑتے ہوئے) چپ ہو سؤر کی نسل کے درندے!

سپاہی۔ ٹھہر و پیاری ! میں تمہیں سنہری کڑے اور ہار بنا دوں گا۔ میرے پاس آؤ۔

(تارا جوں جوں گاؤں کے نزدیک جاتی ہے زیادہ نڈر ہوتی جاتی ہے۔)

تارا۔ اب بھی آگے آ ہمت ہے تو۔ ڈرتا کیوں ہے ؛ بُزدل۔ کمینہ ! (سپاہی واپس لوٹ جاتا ہے کہ کہیں لوگ نہ جمع ہو جائیں) اس بدذات کو کیڑے کھا جائیں۔

(تارا مکان تک پہنچ جاتی ہے)

دوسرا منظر

(تارا گھر میں داخل ہوکر اندر سے کنڈی لگاتی ہے اور صحن میں بکائن کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتی ہے۔)

تارا۔ (سسکیاں بھرتے ہوئے) اے مالک! تو نے مجھے عورت کیوں بنایا؟ ان شیطانوں کو اتنا خیال نہیں ہے کہ ان کی بھی مائیں بہنیں ہیں۔ بادشاہ انہیں تنخواہیں کیوں دیتا ہے (روتی ہے اور ساتھ ساتھ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو باندھتی جاتی ہے) میری گٹھڑی وہیں رہ گئی۔ جانے کپڑے کون لے گیا ہوگا؟ بھلا ایک مدت کے بعد جب میرے سرتاج آج پردیس سے گھر واپس آئیں گے تو میں ان سے کیا کہوں گی؟ یہ تو نے کیا غضب کیا اے میرے مالک! (باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے تارا خوف سے کانپتی ہوئی اٹھتی ہے۔)

تارا۔ تم کون ہو؟

آواز۔ میں ہوں تارا۔ تیری آنتی۔

تارا۔ اوہ آنتی تم ہو۔

(تارا دروازہ کھولتی ہے۔ آنتی کپڑوں کی گٹھڑی کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔)

آنتی۔ یہ کیا تو نے کیا؟ لے پکڑ اپنے کپڑے!

تارا۔ (خوش ہوکر) مالک تمہاری عمر دراز کرے۔

آنتی۔ لیکن بیٹی تو نے کیا کیا؟ انہیں پگڈنڈی پر کیوں پھینک آئی؟

تارا۔ آنتی تمہیں کیا بتاؤں۔ ایک کمینہ حرامی لعنتی میرے پیچھے ہولیا۔ میں خوف سے بھاگ آئی اور کپڑے میرے سر سے گر گئے

آنتی۔ تیری ساڑھی دھول سے بھری ہے اور یہ کیا؟ تیرا ہاتھ سوج رہا ہے۔

تارا۔ (ہاتھ چھپاتے ہوئے) نہیں یہ کچھ نہیں۔ بھاگتے میں ٹھوکر کھا کر گر گئی۔

آنتی۔ ہوا کیا تھا؟ معاملہ تو بتا

تارا۔ (آنتی کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے) ایک سپاہی....
(رو پڑتی ہے)

آنتی۔ (بداخلاقی کے بدترین پہلو کا تصور کرتے ہوئے) آہ وہ کیسی قانون شکنی کرتے ہیں۔ مالک ان کے سروں پر خاک ڈالے۔

تارا۔ (ہنوز رو رہی ہے) اگر گاؤں نزدیک نہ ہوتا تو کیا کچھ نہ گزر جاتا؟

آنتی۔ کیا میں نے تجھے انتظار کرنے کے لئے نہیں کہا تھا ہم دونوں مل کر اکٹھے آجاتے لیکن تو نے ایک نہ سنی۔ اتنی بے پروائی کی۔

تارا۔ مجھے خبر جو نہ تھی۔ میں نے اپنے سرتاج کی خاطر جلدی کی تمہیں تو علم ہے کہ آج وہ بڑی مدت کے بعد پردیس سے آرہے ہیں۔

آنتی۔ بھگوتی دیوی لائق ثنا ہے جس نے تیری رکھوالی کی۔ اُٹھ۔ اب اس طرح سسکیاں نہ بھر۔ جھٹ سے تیاری کرلے اور جب تیرا سرتاج آئے تو اُسے مسکراتے ہوئے چہرے سے ملنا۔

تارا۔ آنتی! مالک تمہیں زیادہ دے۔ میں تیاری بعد میں کرونگی۔
پہلے ان کپڑوں کو پانی میں کھنگال لوں۔

آنتی۔ انہیں یہیں چھوڑ دے۔ میں باہر سے کھنگال لاتی ہوں۔ تو کپڑے بدل لے۔ جانے تیرا پتی کب آ جائے۔

تارا۔ اچھی میری آنتی! . . . . . .

(آنتی کپڑوں کو لے کر کھنگالنے کے لئے باہر چلی جاتی ہے تارا کپڑے بدلنے لگ جاتی ہے۔)

تیسرا منظر

(تارا تیاری کر چکتی ہے۔ آنکھوں میں کاجل کی آخری سلائی لگا رہی ہوتی ہے کہ اس کا شوہر اندر داخل ہوتا ہے تارا ہاتھ باندھ کر اس کی خدمت میں پرنام کرتی ہے۔)

شوہر۔ اچھی تو رہی ہو تم تارا؟

تارا۔ ہاں سرتاج۔ اپنی سنائیے آپ کیسے رہے؟

شوہر۔ میں دن رات تمہیں یاد کرتا رہا۔

تارا۔ میں آپ کے بغیر بے چین رہتی تھی۔ بھلا آپ اتنی مدت کے بعد کیوں آئے؟ شہر میں جا کر شہر ہی کے ہو رہے۔

شوہر۔ تم جانتی ہو پیٹ بڑی بلا ہے۔ یہ سب کو نگنی کا ناچ نچواتا ہے لیکن شکر ہے اس مالک کا سب تکلیفیں کٹ گئیں مجھے بڑی اچھی نوکری مل گئی ہے۔ اب میں تمہیں اپنے ساتھ لینے آیا ہوں۔ ہم دونوں شہر میں رہیں گے۔

تارا۔ سائیں جی نے بھی یہی بتایا تھا۔ نوکری کاہے کی ہے؟

شوہر۔ بوجھو تو بھلا!

تارا۔ میں کیسے بوجھوں!

شوہر۔ سائیں جی سے جا کر پوچھو۔

تارا۔ مذاق میں بات نہ اڑائیے۔ یہ بتائیے کہ نوکری کاہے کی ہے؟

شوہر۔ "اچھا تو لو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ اتنی جلدی خفا نہ ہو جاؤ۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے چودھری کا لڑکا شہر میں ہے۔ یہ سب اسی کی مہربانی ہے۔ وہ مجھے کپتان صاحب کے پاس لے گیا اور اس نے میری سفارش کی۔ کپتان صاحب نے مجھے بھرتی کر لیا، اور اب میں سپاہی ہوں۔ (تارا خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ شوہر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیتا ہے) تم کس بات سے ڈرتی ہو؟ میں سپاہی ہوں (مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے) میرا کافی اختیار ہے جسے چاہوں حوالات میں ڈال سکتا ہوں۔ کسی کی مجال نہیں کہ تمہیں چھو سکے یا تمہارا بال بیکا کر سکے۔

(تارا شوہر سے چمٹ جاتی ہے۔ سامنے سے آنتی کپڑے لے کر داخل ہوتی ہے۔ دونوں اس کی طرف دیکھنے لگ جاتے ہیں۔)

پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔

رحمٰن مُذنِب

کویل

کوہ مری اور گلیات کے جنگلوں میں اگر کبھی آپ کا گزر ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جنگل کے کسی نامعلوم گوشے سے یکلخت کُو کُو کا نغمہ پھُوٹ پڑتا ہے اور جنگل کا سنسان سنّاٹا اس نغمہ کے زیر و بم سے محفلِ طرب بن جاتا ہے جنگل کی سوئی ہوئی رُوح بیدار ہو جاتی ہے اور کائنات کا ازلی جمود موجِ زیست سے لبریز۔
یہ کویل وہی ہے۔ آم والی نہیں۔

کویل کی بن میں کُوک سنو
جنگل کے من کی ہُوک سنو

بن کے سنّاٹوں میں کویل	شاکی ہے قیدِ ہستی کی
تھرّا اُٹھا سارا جنگل	سنسان فضا میں ہیجاں ہے
سے مست ہواؤں کے آنچل	رقصاں احساسِ زیر و بم

جی اُٹھا جنگل نغموں سے
جنگل میں منگل نغموں سے

پربت، وادی کی گہرائی
ہر سمت یہی کُو کُو چھائی

اور کویل کے اس نغمے میں
سارے عالم کی پہنائی

اس میں پربت کی اونچائی
اس میں وادی کی گہرائی

ناکامی، پسپائی، پستی
خونِ عالم کی سرمستی

رفعت کا احساسِ رفعت
پستی کا احساسِ پستی

ندی کا "کل کل" راگ یہاں
سنسان سا اک ویراگ یہاں

کُو کُو کُو سازِ ہستی پر
بَن کی رفعت پر پستی پر

اِمکاں کے دل کی ہُوک سُنو
کویل کی بن میں کُوک سنو

"واش"

طائرانِ صحرا

اے درخت!

اے سوکھے ہوئے تنہا درخت!
تیری مشرقی ٹہنی پر بیٹھ کر
ایک فاختہ رویا کرتی تھی
تجھے معلوم ہے وہ کہاں گئی؛
اے سوکھے ہوئے تنہا درخت!

سُرخ اور زرد پھولو!

گھنٹی کی شکل کے ننھے ننھے سُرخ اور زرد پھولو!
اُس چھوٹی سی سفید تتلی کا گھر
کِس جنگل میں ہے
اے اُداس پھولو!

پیپل کے تلے

جب چاند کی کشتی آسمان کے نیلے سمندر میں تیرتی ہے
جب جنگل کی ہوائیں گیت گاتی ہوئی اس طرف آتی ہیں۔
میں اس وادی میں تمہارے قدموں کی آواز سنا کرتا ہوں۔

مہدی علی خاں

سے کلام کرنا پڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کی پراکرت زبان کے بولنے پر مہاراج بھی مجبور ہو گئے اور یہ سب بہنیں یعنی ہندوستان کی معمولی زبانیں میرے ساتھ کھیلنے لگیں۔ اس بات نے میرا مرتبہ گھٹا دیا اور مجھے برج بھاکا کہنے لگے۔

پھر جب مسلمانوں کے قدم ہندوستان میں آئے تو میں نے ایرانی لباس پہنا اور فارسی عربی کے الفاظ بھاکا میں شامل ہونے لگے ہونہار لڑکی سمجھ کر شاہجہان نے مجھے اپنی گودی میں لیا اور اپنے دربار میں جگہ دی کیونکہ بغیر میری مدد کے مسلمانوں کو ہندوستان میں حکومت کرنا دشوار تھا۔ لشکر میں میرا گزر ہو چکا تھا اور ساری فوج میرے اشارے پر کام کرتی تھی۔ حقیقت میں تو میں سنسکرت ہوں لیکن لباس بدلنے سے مجھے برج بھاشا کہنے لگے اور ایرانی پوشاک نے میرا نام ہندی رکھوا دیا۔

ہندوستان کے تمام جواہرات میرے انگ کے زیور ہیں یعنی پنجابی زبان کے الفاظ، بنگالی زبان کے لغت، کشمیری بولی پشتو کے اسما، مارواڑی زبان، تلنگی گجراتی، مرہٹی اور دیگر زبانوں کے الفاظ مجھ میں شامل ہو گئے۔

شعراء نے میرے چہرے پر فارسی اور عربی سے کچھ خط و خال بنائے جس سے میرے حسن میں اور چار چاند لگ گئے۔

تخمیناً سو برس کا زمانہ ہوا کہ لوگ مجھے ہندی کہتے تھے چنانچہ ایک مصنف لکھتا ہے کہ میں نے اس کتاب کو فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا۔

رفتہ رفتہ نئی پود مجھے اردو کہنے لگی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ لوگوں نے مجھے ہندی حرفوں میں لکھنا شروع کیا۔ ناگری کی طرزِ تحریر کا نام ہندی تھا۔ ناگری اور ہندی میں یہی فرق ہے جو انگلش اور رومن میں ہے، شاہی دربار میں مجھے فارسی حرفوں کا خلعت پہنایا گیا اور وہی مجھ پر زیب دیتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ میرے لئے ہندی حرفوں کا لباس موزوں تھا مگر مشکل یہ ہے کہ اس کا طرزِ تحریر حرفوں کا جدا جدا لکھنا اتنا وسیع اور مضبوط نہ تھا کہ میری خوبیوں کو جدا جدا دکھا سکے اور دخیل الفاظ کے رسم الخط کو برقرار رکھ سکے اور بہت سے حرفوں کو ملا کر ایک میں لکھ سکے اس لئے مجھے اپنا چولا چھوڑنا پڑا اور علمی زبان بننے کے شوق نے مجھے نئی پوشاک پہنائی۔

ہندوستان کے نیک نصیب تھے جو میرے لئے ایسے قوانینِ خطاطی تجویز ہوئے جو ہر طرح مکمل ہیں اور ث س ص کی مختلف شکلیں نمایاں کرتے ہیں۔ زبر زیر کی قید سے آزاد ہیں، میرا سیاق عبارت ان کو اعراب بتا دیتا ہے۔ میرے قوانین املا نویسی سخت رسیوں سے جکڑے ہوئے ہیں۔

جو لوگ میری معنوی خوبیوں سے بے بہرہ ہیں وہ ہمیشہ اس جوئے کو اپنی گردن سے اُتارنا چاہتے ہیں اور اس کے متعلق کمزور تاویلیں پیش کرتے ہیں۔

کچی زبان والوں نے میرا نام ہندی رکھ لیا ہے اور چاہتے ہیں کوئی ہماری اصلاح نہ کرے۔ خود لکھتے ہیں اور ایسے حرفوں

میں لکھتے ہیں جسے وہ خود نہیں پڑھ سکتے۔

اس سے میری وقعت پر بدنما داغ آتا ہے میرے لئے فارسی کے حرف بہتر ہیں اور اس پوشاک نے مجھے بادشاہوں کے دربار تک پہنچایا یعنی جب دہلی کی سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا تو میں وزیر اودھ کے دربار میں آئی اور میرا دارالسلطنت بجائے دہلی کے لکھنؤ قرار پایا۔ سب شاعر، سب اہل علم، سب شہزادے میرے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں چلے آئے نواب آصف الدولہ بہادر نے مجھے اپنے دربار میں جگہ دی اور میرے صدقے میں شعراء کی ایسی ایسی عزت ہوئی کہ قابل رشک ہے۔

میری بدقسمتی سے وہ تختہ اُلٹ گیا ہندوستان میں انگریزوں کے قدم آئے۔ انہوں نے یہ دیکھ کر کہ بغیر اس کی مدد کے ہم ہندوستان میں قدم نہیں جما سکتے پہلے تو میری بہت عزت حرمت کی اور اپنے دربار میں مجھے جگہ دی، کچہریوں میں میرے نام سے دفتر قائم کئے۔ حکام کے اجلاسوں پر میری پکار ہوئی۔

جوڈیشل کمشنر، ڈپٹی کمشنر، مجسٹریٹ بغیر میری مدد کے دفتر میں جگہ نہیں پاتے تھے۔ قانون میری زبان میں ترجمہ کئے جاتے تھے۔ ممالک مغربی اور شمالی میں میرے نام کا سکّہ جاری تھا۔

پھر اس وجہ سے کہ میں ہندوستان کی دیوی ہوں مجھ سے رشک کرنے لگے اور میری جگہ ہندی کو دینی چاہی۔

جا بجا اسکول جاری کئے جب بیشتری دو طالب علم انگریزی کے ماہر ملنے لگے تو اپنی آسانی کے لئے مجھے نکال باہر کیا اور میری بہنوں کو بھی خارج کیا۔ ہر ایک دفتر میں انگریزی کو جگہ دی۔

"شفق" مدراس اکتوبر ۱۹۲۲ء ——— اُردو رانی

اُردو کے متعلق مغربی فضلاء کی رائیں

فیلن لکھتا ہے "جب پٹھانوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ اور اقتضائے وقت کے بموجب ان دو اجنبی قوموں کے درمیان معاملات کے افہام کے لئے ایک جدید اور مرکب زبان کی بنیاد پڑی اور مفتوح قوم نے فاتح قوم کی زبان کو حاصل کیا۔ ہندو مسلمانوں کے ربط ضبط اور روزانہ مراسم نے جنوبی ہند میں بھی ایک زبان کی بنیاد ڈالی۔ جسے دکنی کے لفظ سے یاد کرتے ہیں" (ماخوذ از دکن میں اُردو)

جے بیمس "میں اُردو کو ایک نہایت ترقی کرنے والی اور شائستہ صورت بڑی اور وسیع زبان کی طرح سمجھتا ہوں جو ہندوستان میں رائج ہے"۔

فرنچ مستشرق گارساں دتاسی "اُردو کی ہندوستان بھر میں وہی پوزیشن ہے۔ جو فرنچ کی یورپ میں۔ یہی وہ زبان ہے

جو ملک میں بکثرت مستعمل ہے۔ عدالتوں اور شہروں میں جاری ہے۔ اربابِ ادب اپنی تصانیف اسی زبان میں لکھتے ہیں۔"

جارج کیمبل "میرے نزدیک یہ بہت مناسب ہے کہ تمام سرکاری سکولوں میں ہندوستانی زبان ایک عام زبان کی حیثیت سے کر دی جائے اور دیسی زبان بھی بشرطِ ضرورت رکھی جائے۔ انگریزی کو ہندوستان کی عام زبان بنانا محال ہے۔ لہٰذا ہندوستانی ہی کو یہ فخر ملنا چاہئے۔ اُردو ہندوستان بھر کی زبانِ عام (لنگوا فرینکا) کہی جانے کی مستحق ہے۔" (ماخوذ از تاریخ ادب اُردو سکسینہ)

ونسنٹ سمتھ مؤرخ "زبانِ اُردو جو ہماری انگریزی سے باعتبار اپنی سادگی اور قواعدِ صرف و نحو کی نرمی اور کثرتِ الفاظ کے بہت مشابہ ہے۔ ضرور اس قابل ہے کہ تمام مطالب عام اس سے کہ وہ ادبی ہوں یا فلسفیانہ یا سائنٹیفک اس میں ادا کئے جائیں"

"ھند"

اُنیس ہزار فٹ کی بلندی پر

زمین پر رہ کر ۱۹ ہزار فٹ کی بلندی کا خیال خواہ کتنا ہی خوفناک معلوم ہوتا ہو۔ مگر اُنیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر اتنا خوفناک نہیں معلوم ہوتا۔ جتنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔

مَیں بہنوں کی دلچسپی کے لئے اپنی ۱۹ ہزار فٹ کی پرواز کے مختصر حالات لکھتی ہوں۔

ایک دن میں نے انسٹرکٹر سے حتی الامکان بلندی پر اُڑنے کی اجازت طلب کی۔ اُنہوں نے بخوشی اجازت دی اور کہا کہ بلندی پر پہنچ کر اس طرح اُڑیئے جیسے چیلیں آرام سے اُڑتی اور لُطف اندوز ہوتی ہیں۔ وہ نہ گھبراتی ہیں اور نہ کوئی خطرہ محسوس کرتی ہیں۔ صرف ہوائی جہاز کے پُرزوں پر نظر مت رکھئے بلکہ اطراف کے منظر سے لُطف اندوز ہونا سیکھئے۔

چنانچہ، مئی کی صبح میں بہت اُونچا اُڑنے کی تیاری کر کے فلائینگ کلب پہنچی۔ صبح نہایت گرم اور چمکیلی تھی لیکن پھر بھی میں اپنا بالوں والا کوٹ ساتھ لے گئی تھی۔ کیونکہ معلوم تھا کہ اوپر بہت سردی ہوگی۔

جہاز میں ضروری چیزیں مثلاً نقشہ وغیرہ رکھا اور کوٹ پہن کر بیٹھ گئی۔ کوٹ کی گرمی سے دم گھُٹا جا رہا تھا۔

تین ہزار فٹ کی بلندی پر بھی ہوا خنک نہ تھی لیکن سات ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر کوٹ کی گرمی آرام دہ معلوم ہونے لگی۔

فضا چُپ چاپ تھی۔ جہاز بتدریج اوپر کو چڑھ رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا۔ اب سَم اچانک بدل چکا تھا۔ سردی شدید تھی اور ہوا بے حد خنک۔ یہ بلندی عام پہاڑوں کی بلندی سے تقریباً دُگنی تھی۔ لہٰذا سردی بھی بلندی کے مطابق ہی تھی۔ یقین نہ آتا تھا کہ جس زمین سے میں اُڑی ہوں، وہاں اس وقت بھی گرمی اپنے پورے شباب پر ہوگی۔

چودہ ہزار کی بلندی پر موت کا سا سناٹا تھا اور دل دہلانے والی تنہائی اور اُداسی تھی۔ ویرانی کی یہ کیفیت۔ کہ دل پاگل سا

ہُوا جاتا تھا۔ کوئی رفیق نہیں۔ کوئی آواز نہیں۔ قدموں کے ہزاروں فٹ نیچے زمین اور سر کے ہزاروں فٹ اوپر آسمان! ان بلندیوں اور وسعتوں کے درمیان ایک بے حقیقت جہاز جس پر ایک تنہا انسان! ان باتوں کا خیال آنے سے دل دھڑکنے لگتا۔ صرف اس بات سے ہواس قایم رہتے اور دل کو تقویت پہنچتی کہ زمین اور آسمان کے درمیان اس سکوت زار میں وحشی ہوا پر بھی ایک ایسی زبردست پاک طاقت حکمراں ہے۔ جو ہر وقت اپنے بندوں کی مدد اور محافظت کے لئے مستعد رہتی ہے۔ اپنے معبودِ حقیقی کا خیال دل کو بے حد تقویت پہنچاتا تھا!

اب سرد ہُوا کے تیز جھونکے رخساروں کو چھید رہے تھے۔ سُورج کی طلوع ہوتی ہوئی روشنی میں سُنہرے ذرّات ناچ رہے تھے۔ کچھ بادل قدموں کے نیچے تھے۔ کچھ دھوُاں سا سر کے اُوپر چھا رہا تھا۔ حدِ نظر تک کسی پرند کا پتہ نہ تھا البتہ کچھ دیر بعد میرے جہاز سے کئی ہزار فٹ نیچے رائل ایرفورس کا ایک بڑا جہاز تنکے کی طرح نظر آیا جو اپنے پر پھیلائے تیزی سے راستہ کاٹتا کہیں چلا جا رہا تھا۔ اس ہوائی ہمسائے کو دیکھ کر کچھ ہمت سی بندھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ فضا میں غائب ہوگیا۔

اگر راہ نما نقشہ میرے آگے کُھلا ہُوا نہ ہوتا تو میں نیچے ریلوے لائن اور گرانڈ ٹرنک روڈ کو کسی طرح بھی نہ پہچان سکتی۔ ان ہی کی رہبری میں مَیں گوجرانوالے کی طرف جا رہی تھی۔ ریلوے لائن اور گرانڈ ٹرنک روڈ بہت باریک لکیروں سے زیادہ معلوم نہ ہوتی تھیں۔

سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر سردی ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاز ہاتھوں سے اب چھوٹا کہ اب چھوٹا۔ دماغ میں فتور سا محسوس ہو رہا تھا۔ لُطف کی بجائے اذیّت سی محسوس ہونے لگی۔ تیز ہوا ناک میں اس طرح جا رہی تھی کہ زکام کا اندیشہ محسوس ہو رہا تھا۔ کانوں کی عجب حالت تھی۔ باوجود اہتمام کے معلوم ہوتا تھا کہ سُن اور بہرے ہو گئے ہیں۔

بادلوں اور سُنہرے ذرّوں کی سرزمین کا یہ سفر اگر سردی کی تکلیف اور بلندی و تنہائی کی یہ وحشت نہ ہوتی تو بے حد پُرلطف ہوتا۔ ۱۹ ہزار کی بلندی پر انسانی زندگی اتنی حقیر معلوم ہوتی ہے، جیسے سمندر میں کاغذی ناؤ۔

اب میں تھک گئی تھی۔ اس لئے واپسی کا ارادہ کیا۔ ایک دفعہ اِدھر اُدھر سر پھیر کر ان اُداسیوں کو دیکھا۔ جو چاروں طرف مسلط تھیں۔ اے اللہ! وہ دُنیا کی رونق کیا ہوئی۔ کیا اسی فضا کے نیچے۔ اسی فضا کی تہ میں دُنیائے رنگ و بُو آباد ہے؟ شُبہ سا ہو رہا تھا!

میں واپس ہونے لگی۔ کچھ دیر کی جدّوجہد کے بعد آخر فلائینگ کلب کی عمارت نظر آنے لگی۔ میں نے فلائینگ کلب سے سات میل کے فاصلے پر انجن بند کر دیا۔ اور اُترنا شروع کیا۔ چڑھائی میں ڈیڑھ گھنٹہ لگا تھا۔ اُترنے میں سات آٹھ منٹ لگے۔ جہاز ہوا میں چکر کھاتا اور دم توڑتا ہُوا ایروڈروم پر آ رہا۔

جہاز کے زمین پر اُترتے ہی میری حالت عجیب ہوگئی ۔ مجھ سے ہلا تک نہیں جاتا تھا ۔ گرمی اس شدت کی تھی کہ دم بند ہو رہا تھا ۔ اچانک تبدیلیٔ موسم کی وجہ سے سر میں خفیف سا درد اور کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں آرہی تھیں ۔ زندگی کا الناک راگ سُنائی نہیں دے رہا تھا ۔ صرف ہوا کی وحشی آواز کانوں میں گونج رہی تھی ۔

رائل ایرفورس کے سکوئڈرن سوئن کا نام آپ نے سُنا ہوگا ۔ اُنہوں نے بلندی پر اُڑنے کا ریکارڈ قائم کیا تھا ۔ وہ اپنا جہاز ۴۹ ہزار فٹ کی بلندی پر لے گئے تھے ۔ مگر ایک اور کپتان نے معجزہ ہی کر دکھایا ۔ ۱۹۳۵ئہ میں کیپٹن سینٹونس نے تمام دنیا کی بلند پروازی کے ریکارڈ کو توڑ دیا ۔ یہ عالی ہمت آدمی ۴ ، ہزار فٹ کی بلندی پر اپنے ایروپلین میں گیا ۔ اور صحیح سلامت واپس آگیا ۔

ہندوستان بھی اب روز بروز ہوائی فن میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہے ۔ اور وہ دن دُور نظر نہیں آتا جب ہندوستانی ہوابازوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جائے گی ۔

"تہذیب نسواں" (حجاب امتیاز علی)

پھُولوں کی سازِش

باغ میں جتنے پھُول تھے رب کے سب باغی ہوگئے ۔ گلاب کے سینے میں بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی ۔ اس کی ایک ایک رگ آتشیں جذبہ کے تحت پھڑک رہی تھی ۔ ایک روز اس نے اپنی کانٹوں بھری گردن اُٹھائی اور غور و فکر کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوُا :-

"کسی کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ ہمارے پسینے سے اپنے عیش کا سامان مہیا کرے ــــ ہماری زندگی کی بہاریں ہمارے لئے ہیں اور ہم اس میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کر سکتے !"

گلاب کا مُنہ غصہ سے لال ہو رہا تھا ۔ اس کی پنکھڑیاں تھرتھرا رہی تھیں ۔

چنبیلی کی جھاڑی میں تمام کلیاں یہ شور سُن کر جاگ اُٹھیں اور حیرت میں ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگیں ۔ گلاب کی مردانہ آواز پھر بلند ہوئی ۔

"ہر ذی رُوح کو اپنے حقوق کی نگرانی کا حق حاصل ہے اور ہم پھُول اس سے مستثنےٰ نہیں ہیں ۔ ہمارے قلوب زیادہ نازک اور حساس ہیں ۔ گرم ہوا کا ایک جھونکا ہماری دُنیائے رنگ و بُو کو جلا کر خاکستر کر سکتا ہے اور شبنم کا ایک بے مقدار قطرہ ہماری پیاس بجھا سکتا ہے ۔ کیا ہم اُس کانے مالی کے کھُردرے ہاتھوں کو برداشت کر سکتے ہیں جس پر موسموں کے تغیر و تبدل کا کچھ اثر ہی نہیں ہوتا ؟"

موتیا کے پھُول چلّائے " ہرگز نہیں ۔" لالہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور کہنے لگا " اس کے ظلم سے میرا سینہ داغدار

مطبوعات

مبادیٔ سیاسیات جلد اوّل (مملکت) مؤلفہ جناب ہارون خاں شروانی ایم۔اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ صدر شعبۂ تاریخ وسیاسیات جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ مطبوعہ ۱۹۳۷ء۔ حجم ۱۹۶ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: غلام دستگیر اینڈ کو، کتب فروش۔ جامعۂ عثمانیہ۔ حیدرآباد (دکن)۔

سیاسیات یا پالیٹکس کی آج کل جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔ آج کل کے اکثر تعلیم یافتہ نوجوان بلکہ اہلِ سیاست بھی اُردو میں سیاسی مسائل کو بخوبی ادا نہیں کر سکتے۔ زیرِ نظر تالیف اس ضرورت کو کما حقّہ پورا کرتی ہے۔ یہ جلد مملکت یعنی سٹیٹ سے متعلق ہے۔ اس کے بعض ابواب کے عنوانات یہ ہیں: سیاسیات کی تعریف اور اُس کا تعلق دیگر ہم جنس علوم سے۔ مملکت اور اُس کے ہم جنس ادارات، خواہشِ تعامل، اقتدارِ اعلیٰ، قانون، حقوق و آزادی، حکومت کا دائرۂ عمل، حکومت کا مطمحِ نظر۔

اخیر میں ایک فہرستِ اصطلاحات ہے جس میں بہت سی ضروری انگریزی سیاسی اصطلاحات اور اُن کے اُردو مترادف حروفِ تہجی کے لحاظ سے درج ہیں۔ اس کتاب کے بعض ابواب ہمایوں میں شائع ہو کر قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

ادیب اور اہلِ سیاست ہر دو گروہ اس کتاب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ شروانی صاحب کا اندازِ تحریر عالمانہ ہے اور زبان صاف ستھری ہے۔ ہم اس دلچسپ اور مفید کتاب کی طرف اپنے قارئین کو خاص طور پر توجہ دلاتے ہیں۔ (ب۔ا)

سالنامۂ کابل ۳۷-۱۹۳۶ء:۔ کابل فارسی زبان کا ایک بلند پایہ رسالہ ہے جو ہر مہینے افغانستان کے دار السلطنت کابل سے بڑے حسنِ اہتمام کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ ہمیں اس کا سالنامہ برائے ۳۷-۱۹۳۶ء موصول ہوا ہے جو کتابی صورت میں مجلد حسبِ معمول مصری ٹائپ میں شائع ہوا ہے اور چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ اعلیٰ قسم کا ہے۔ کابل کے آثارِ قدیمہ، جدید عمارات، موجودہ و گذشتہ مشاہیر اور مختلف اداروں کے اراکین کی تین سو سے زیادہ تصویریں بھی شامل ہیں۔ افغانستان نے گذشتہ چند سالوں میں جو سیاسی، معاشری، صنعتی، علمی اور تعلیمی ترقی کی ہے اُس کے متعلق معلومات حاصل کرنے والوں کو شاید اس سے بہتر کتاب نہ مل سکے گی۔ مختصر یہ کہ سالنامۂ کابل ایک آزاد اسلامی سلطنت کے عروج و ترقی کی قابلِ رشک داستان ہے۔ قیمت درج نہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ ہیئت انجمنِ ادبی کابل

حفیظ ہوشیارپوری

مطبُوعات

مبادیٔ سیاسیات جلد اوّل (مملکت) مؤلفہ جناب ہارون خاں شروانی ایم۔اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لاء صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ مطبوعہ ۱۹۳۷ء۔ حجم ۱۹۶ صفحات۔ مجلّد۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: غلام دستگیر اینڈ کو، کتب فروش۔ جامعۂ عثمانیہ۔ حیدرآباد (دکن)۔

سیاسیات یا پالیٹکس کی آج کل جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔ آج کل کے اکثر تعلیم یافتہ نوجوان بلکہ اہلِ سیاست بھی اُردو میں سیاسی مسائل کو بخوبی ادا نہیں کر سکتے۔ زیرِ نظر تالیف اس ضرورت کو کما حقّہٗ پُورا کرتی ہے۔ یہ جلد مملکت یعنی سٹیٹ سے متعلق ہے۔ اس کے بعض ابواب کے عنوانات یہ ہیں: سیاسیات کی تعریف اور اُس کا تعلق دیگر ہم جنس علوم سے۔ مملکت اور اُس کے ہم جنس اِدارات، خواہشِ تعامل، اقتدارِ اعلیٰ، قانون، حقوق و آزادی، حکومت کا دائرۂ عمل، حکومت کا مطمحِ نظر۔

اخیر میں ایک فہرستِ اصطلاحات ہے جس میں بہت سی ضروری انگریزی سیاسی اصطلاحات اور اُن کے اُردو مترادف حروفِ تہجی کے لحاظ سے درج ہیں۔ اِس کتاب کے بعض ابواب ہمایوں میں شائع ہو کر قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

ادیب اور اہلِ سیاست ہر دو گروہ اس کتاب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ شروانی صاحب کا اندازِ تحریر عالمانہ ہے اور زبان صاف ستھری ہے۔ ہم اس دلچسپ اور مفید کتاب کی طرف اپنے قارئین کو خاص طور پر توجہ دلاتے ہیں۔ (ب ل)

سالنامۂ کابل ۳۷-۱۹۳۶ء:۔ کابل فارسی زبان کا ایک بلند پایہ رسالہ ہے جو ہر مہینے افغانستان کے دارالسلطنت کابل سے بڑے حُسنِ اہتمام کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ ہمیں اس کا سالنامہ برائے ۳۷-۱۹۳۶ء موصول ہوا ہے جو کتابی صورت میں مجلّد حسبِ معمول مصری ٹائپ میں شائع ہوا ہے اور چھ سَو صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ اعلیٰ قسم کا ہے۔ کابل کے آثارِ قدیمہ، جدید عمارات، موجودہ و گذشتہ مشاہیر اور مختلف اداروں کے اراکین کی تین سَو سے زیادہ تصویریں بھی شامل ہیں۔ افغانستان نے گذشتہ چند سالوں میں جو سیاسی، معاشری، صنعتی، علمی اور تعلیمی ترقی کی ہے اُس کے متعلق معلومات حاصل کرنے والوں کو شاید اس سے بہتر کتاب نہ مل سکےگی۔ مختصر یہ کہ سالنامۂ کابل ایک آزاد اسلامی سلطنت کے عروج و ترقی کی قابلِ رشک داستان ہے۔ قیمت درج نہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ ہیئتِ انجمنِ ادبی کابل

حفیظ ہوشیارپوری

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ ستمبر ۱۹۳۷ء

تصویر:- .... ایلین

چندہ سالانہ ۵ر — ششماہی ۳ر مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

مجھے واردھا سے یہ خط آیا ہے :-

واردھا سی - پی ۲۵ جولائی ۳۷ء

جناب بشیر احمد صاحب - آداب - مجھے واردھا میں آئے کچھ عرصہ گزر چکا ہے - ہندی ہندوستانی کی تحریک ہندوستان میں گو ایک عرصہ دراز سے جاری ہے لیکن پنجاب میں رہ کر مجھے اس کی طرف کبھی رغبت نہ ہوئی تھی - البتہ یہاں آکر میں نے کاکا صاحب کالیلکر و دیگر حضرات سے مل کر اُن کے خیالات سے مستفید ہونے، اس تحریک کے مقاصد میں دلچسپی لینے اور اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی - ناگری رسم الخط میرے لئے اتنا ہی دشوار اور اجنبی سا ہے - جتنا کہ کسی اور اُردو داں صاحب کے لئے ہوگا - مجھے قطعاً اس کی طرف رغبت نہیں ہوتی - اس لئے نہیں کہ مجھے اس سے نفرت ہے - یا اسے میں ہندوستان میں رائج العام ہونے کے ناقابل سمجھتا ہوں بلکہ اس لئے کہ میں نے آج تک اُس کی طرف پیٹھ پھیرے رکھی اور سیکھنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی - ابتدا سے کالج چھوڑنے تک میں اُردو، فارسی کا طالب علم ہی رہا ہوں - اس خط کے لکھنے سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ناگری یا اُردو رسم الخط کے بارے میں میں آپ سے کسی بحث میں پڑنا چاہتا ہوں - یا میں ناگری رسم الخط کو فارسی رسم الخط پر کسی قسم کی فوقیت دینے کے حق میں ہوں بلکہ میرا مقصد محض یہ ہے کہ جو غلط فہمی کہ آپ کے مضمون کے "ہمایوں" میں نکلنے سے پیدا ہوگئی ہے یا اور بھی ہونے کا امکان ہے - اُس کا ازالہ ہونا چاہئے - ماہ جنوری کا ہمایوں کا پرچہ میری نظر سے گزرا - میں نے شوق سے آپ کے مضمون کو پڑھا اور خصوصاً آپ کی کاکا صاحب سے ملاقات کے بارے میں خاص دلچسپی لی - میرا خیال تھا کہ آپ کسی خوشگوار نتیجہ پر پہنچے ہوں گے - مگر یہ پڑھ کر میری حیرانی کی حد نہ رہی کہ کاکا صاحب نے آپ کی رائے سے متفق ہونا نہ چاہا اور معاملہ ادھورا چھوڑ دیا گیا - میں حیران تھا کہ گاندھی جی یا کاکا صاحب کو آپ کی حسب منشا ایک ہفتہ وار اخبار کے اجرا میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے - اگر اس سے یہ اُمید ہو کہ ایک اچھا طبقہ اس قومی زبان کی ساخت کی تحریک کے زیادہ نزدیک آنے کو رضامند ہے - مجھے تو اس میں کچھ قباحت نظر نہ آئی تھی - پس میں وہ ہمایوں کا پرچہ اُٹھا کر کاکا صاحب کی خدمت میں گیا - اور اس کے متعلق اُن سے سوال کیا - اُنہوں نے مجھے یہ بتلایا کہ بشیر احمد صاحب نے ہماری گفتگو کے ایک حصے کو پردے میں رکھ کر پبلک میں غلط فہمی کے پیدا ہونے کا اندیشہ پیدا کر دیا ہے - اُنہوں نے کہا کہ میں نے اُن کی تجویز پر صرف انکار نہیں کر دیا تھا بلکہ اس سے بھی کچھ آگے بات چیت ہوئی تھی جو کہ بشیر صاحب نے پرچہ میں شائع کرنی گوارا نہیں فرمائی - اور وہ یہ ہے کہ میں نے بشیر احمد صاحب کو بتلایا تھا کہ پرچے کی اشاعت دو ہی صورتوں میں ہو سکتی ہے - پہلی تجویز یہ ہے کہ ایک ہی پرچے کے دو کالموں میں سے ایک ناگری اور دوسرا فارسی رسم الخط کے لئے مخصوص کر دیا جائے اور دوسری یہ کہ دو پرچے ایک ناگری اور دوسرا فارسی رسم الخط میں شائع کئے جائیں - اور اُن کا مضمون ایک ہی ہو - دوسری چیز اس لئے زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے کیونکہ پہلی صورت میں ایک زبان جاننے والا دوسرے رسم الخط کے لئے زیر بار ہونا پسند نہ کرے گا - اور دوسری تجویز کے لئے کاکا صاحب نے آپ سے یہ کہا تھا کہ اگر آپ اُردو رسم الخط کے پرچے کے لئے خریدار مہیا کر دیں تو

ہمیں ایسا پرچہ نکالنے میں کسی قسم کا اعتراض نہ ہوگا۔ جس کا جواب کہ آپ تسلی بخش نہ دے سکے۔

اب کاکا صاحب پر میں نے سوال کیا کہ آپ نے اُن سے خریدار کیوں مانگے؛ جس پر کہ اُنہوں نے اپنی پوزیشن ہندی اور اُردو کے بارے میں نہایت ہی واضح طور پر رکھی کہ ہم اُردو کو فروغ دینا اپنا فرض نہیں سمجھتے لیکن اس کو نابود کرنے کا خیال بھی نہیں رکھتے۔ ہاں اگر یہ مقبول ہوتی ہے تو ہو۔ اگر کوئی طبقہ اس کے لئے پرچار کرتا ہے اور اسے مقبول بنانا چاہتا ہے تو ہمیں اس میں کسی قسم کا اعتراض نہیں۔ بلکہ اسے اپنے ساتھ جگہ دیتے ہیں لیکن اس کے فروغ کا کسی قسم کا فرض ہم پر عائد نہیں ہوتا۔ ہم ایماندارانہ طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندی ہندوستانی ہی ہندوستان بھر کی زبان ہوگی جسے ہندوستان کی ایک کثیر تعداد ناگری رسم الخط میں لکھے اور پڑھے گی کیونکہ ایک بہت بڑی بھاری اکثریت اسی رسم الخط سے واقف ہے۔ لیکن چونکہ ایک طبقہ ایسا ہے جو اُردو رسم الخط پر زور دے رہا ہے تو ہم اسے بھی باقاعدہ ناگری رسم الخط کے ساتھ جگہ دیتے ہیں۔

اُن کی پوزیشن صحیح یا غلط جو کچھ بھی ہے انہایت ہی واضح اور صاف تھی۔ لہٰذا میرے لئے اب اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ کاکا صاحب نے تو یہاں تک بھی کہا کہ اگر اُردو کو میری ذات سے کچھ فیض پہنچتا ہو تو میں انجمن ترقیِ اُردو کا ممبر بننے کو بھی تیار ہوں لیکن میرے پاس اب اس قدر وقت نہیں کہ میں اُردو رسم الخط کو خود سیکھنا شروع کروں لیکن اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ اُردو رسم الخط ہی ہندوستان بھر کے لئے ہو تو میں کسی ایسی انجمن کا ممبر بننے سے دریغ کروں گا اور اُردو پرچار کا کسی قسم کا کام ہم اپنے ذمہ لینے کو تیار نہیں ہیں۔

بعدازاں میں گاندھی جی کی خدمتِ اقدس میں گیا کہ شاید وہ اس سوال پر کچھ مزید روشنی ڈال سکیں، اُن سے میری ایک کافی لمبی گفتگو ہوئی جو کہ یہاں لکھنی موزوں نہ ہوگی کیونکہ میں نے اس کے لئے اُن سے اجازت طلب نہیں کی ہے لیکن اتنا میں نہایت ہی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی طرح بھی اُردو کو نابود کرنے کی نیت نہیں رکھتے۔ آپ گاندھی جی کا ۱۷ جولائی کے ہریجن میں ایک مضمون صفحہ نمبر ۱۷۱ پر (Weekly Letter) کے نیچے پڑھیں تو آپ پر عیاں ہو جائے گا کہ اس مسئلہ پر اُن کے کیا خیالات ہیں۔ گاندھی جی نے بغیر میری کاکا صاحب سے گفتگو کو جانے یہی کہا کہ اگر اُردو رسم الخط کے حق میں کہنے والا طبقہ ہمیں خریدار دے دے تو ہمیں اس پرچے کی اشاعت میں کوئی انکار نہ ہوگا، اور ہندی اُردو کے بارے میں بھی انہوں نے اپنی پوزیشن ٹھیک کاکا صاحب کی طرح ہی واضح کی جس سے کہ میری تشفی ہو گئی۔

اب سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے تو آپ کو اُس غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہئے جو کہ آپ کے مضمون سے پیدا ہوئی ہے اور کاکا صاحب سے اپنی صحیح گفتگو شائع کیجیے۔ اور بعدازاں اس مسئلہ کو حل کرنے کی خلوصِ دل سے کوشش کریں، چاہے ہندی اُردو کے بارے میں اُن کی پوزیشن کچھ بھی ہو لیکن اس قدر تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر نیک نیتی سے ایک قومی زبان کی ساخت میں اُن سے اُردو کے لئے بھی کچھ امداد طلب کی جائے تو مایوسی نہ ہوگی، بلکہ وہ بہ کمال خوشی ایسا کرنے کو تیار ہوں گے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اُنہوں نے جو یہاں ایک قومی بھاشا پرچارک ٹریننگ سکول کھولا ہے اُس میں اُنہوں نے اُردو کو ایک لازمی مضمون قرار دیا ہے۔ اور اس کے لئے جو گاندھی جی نے اپنی رائے دی ہے وہ ۱۷ جولائی کے پرچے سے ظاہر ہوگی اور ساتھ ہی یہاں کے نو بھارت ہائی سکول میں جہاں پہلے صرف ہندی اور مرہٹی فریق تھے اب انجمن اسلامیہ وردھا کی درخواست پر اُردو فریق کو بھی اپنے سکول کا باقاعدہ طور پر جزو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مزیدبراں اسی فریق کو سکول کمیٹی کی طرف سے بارہ سو روپے کی گراں قدر رقم بھی بطور امداد دی جاتی ہے۔

آپ اِن حالات سے اندازہ لگائیے کہ قومی زبان کی ساخت کے لئے وہ کس قدر کوشاں ہیں۔

اُمید ہے کہ آپ اپنے خیالات سے مستفید فرما کر ممنونیت کا موقع بخشیں گے۔

آپ کا مخلص

امرت لال بترا۔ معرفت اے آئی ایس اے، واردھا

کاکا کالیلکر صاحب کی ساری گفتگو اس لئے درج نہ کی گئی تھی کہ ایسا کرنا غیر ضروری سمجھا گیا تھا۔ اب اُسے پڑھ کر ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ میرا نقطۂ نگاہ کیا تھا اور کاکا جی اور گاندھی جی کا کیا خیال ہے: "میں خوش ہوں کہ کاکا جی نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم اُردو کو فروغ دینا اپنا فرض نہیں سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ہندی ہندوستانی ہی ہندوستان بھر کی زبان ہوگی جسے ہندوستان کی ایک کثیر تعداد ناگری رسم الخط میں لکھے اور پڑھے گی۔ اور گاندھی جی نے میری تجویز کے متعلق یہ فرما دیا کہ "اگر اُردو رسم الخط کے حق میں کہنے والا طبقہ خریدار دے تو ایسے پرچے کی اشاعت میں ہمیں انکار نہ ہوگا"۔ اور یہ بھی کاکا جی یا گاندھی جی کی عنایت ہے کہ اُنہوں نے واردھا کے سکول میں اُردو کو بھی جگہ دی لیکن میں پھر عرض کروں گا کہ یہی اپنے محترم رہبرِ وطن گاندھی جی سے ہمیں شکایت ہے کہ اُن کے رویے سے صاف طرفداری ٹپکتی ہے۔ کاکا جی ہندی کو لاڈ پیار سے پالا کریں ہمیں شکوہ نہیں لیکن گاندھی جی کی طرف سے یہ رُو رعایت ٹھیک نہیں کہ وہ ہندی کے متعلق فرمائیں کہ دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہئے۔ (دیکھئے مضمون "ہریجن" بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۷ء)۔ اُردو ناگری رسم الخط بُرے بھلے ہوں تو ہوا کریں گاندھی جی کو دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھنا چاہئے کیونکہ ہم اُن کو ہندو مسلمانوں دونوں کا مشترک رہبر سمجھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے میں نے کاکا جی کے ذریعے سے اُن سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ پنڈت جواہر لال کا سا منصفانہ رویّہ اختیار کریں اور اس کے ساتھ ایک ایسے ہفتہ وار اخبار کا اجرا کریں جس میں ایک ہی مضمون اُردو اور ناگری دونوں رسم الخطوں میں شائع ہو۔ ہندی کا حمایتی اور اُردو کا مخالف وادار ہونا اُن کی شان کے شایاں نہیں۔

اخیر میں مَیں پنڈت جواہر لال صاحب کے اُس قیمتی مقالے کی طرف اُردو ہندی کے لڑنے جھگڑنے والوں کو توجہ اور غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں جو صاحب موصوف نے گزشتہ ماہ ایک رسالے کی صُورت میں شائع کیا ہے اور جس کے متعلق خوشی کا مقام ہے کہ گاندھی جی نے بھی فرمایا ہے کہ وہ ان تجاویز سے متفق ہیں۔ اس میں صدر کانگرس نے ہندوستانی کو ملکی زبان قرار دیتے ہوئے صراحت کی ہے کہ اُردو اور ناگری رسم الخط دونوں سرکاری طور پر تسلیم کئے جائیں گے اور حکومتِ ہند کے کاغذات ان دونوں میں شائع ہوا کریں گے۔ یہ قابلِ غور بات ہے کہ اُنہوں نے ناگری پسندوں کی اکثریت کا ڈنکا نہیں بجایا۔

اِن تجاویز پر کسی آئندہ اشاعت میں تبصرہ کیا جائے گا۔

ہمیں اُمید ہے کہ بہار اور مدراس کی کانگرسی حکومتیں جو اس وقت تعلیمی اور عدالتی شعبوں میں اُردو ہندی کے مسئلے پر غور کر رہی ہیں پنڈت جی کے اصولوں پر فراخ دلی کے ساتھ عمل کریں گی۔

بشیر احمد

جہاں نما

نواب مسعود جنگ ڈاکٹر سر سید راس مسعود مرحوم

گذشتہ مہینے کا پرچہ چھپ چکا تو ہمیں یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ ۳۰ر جولائی ۱۹۳۷ء کو تین ہفتوں کی علالت کے بعد بھوپال میں نواب مسعود جنگ بہادر کا انتقال ہوگیا۔ نواب مسعود جنگ کی عمر ۴۸ سال کے قریب تھی۔ اُن کی بے وقت موت سے مسلمان اپنی قوم کے ایک نہایت قابل اور ذی اثر فرد سے محروم ہو گئے ہیں۔

نواب مسعود جنگ ۱۵ر فروری ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ سر سید احمد خاں کو اپنے پوتے کی پیدائش سے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس خوشی میں دوسرے مسلمان بھی اُن کے شریک تھے۔ سر سیّد مرحوم اپنے کمسن پوتے کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اور اپنے ساتھ سُلاتے تھے۔ وہ ان سے کھیلا بھی کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ مسعود لحاف میں چھُپ جاتے اور سر سیّد اُن کو ڈھونڈا کرتے۔ میر ولایت حسین بی اے علیگ جو سر سیّد احمد خاں کے خاندان سے بہت زیادہ وابستہ رہے ہیں لکھتے ہیں کہ سر سید نے اپنی کوٹھی کے احاطے میں "مسعود کا مکتب" کے نام سے ایک مکان بنوایا تھا جس میں اُن کے پوتے نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اخیر وقت میں جب جسٹس محمود مرحوم کی "سوء مزاجی" کی وجہ سے سر سیّد احمد اپنی کوٹھی چھوڑ کر حاجی اسمٰعیل خاں صاحب کی کوٹھی میں منتقل ہوئے اس وقت بھی پوتا ساتھ تھا۔ اپنی موت سے چند گھنٹے قبل بھی سر سید بار بار اپنے پوتے کے متعلق پوچھتے رہے۔ سر سیّد کے انتقال کے بعد ڈیڑھ دو سال تک مسعود اپنے والدین کے پاس رہے لیکن جسٹس محمود کی "سوء مزاجی" کی وجہ سے بیگم جسٹس محمود برابر یہی کوشش کرتی رہیں کہ "مسعود" بورڈنگ ہاؤس میں منتقل ہو جائیں کیونکہ بدقسمتی سے جسٹس محمود کے مزاج کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ بیٹے کا اُن کے پاس رہنا مناسب نہ تھا۔ سر سید کے بڑے بھائی کے صاحبزادے بھی مسعود کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر محمود بیگم صاحبہ نے یہ بھی مناسب سمجھا آخر خوش قسمتی سے والدین راس مسعود کو مسٹر ماریسن اور اُن کی میم صاحبہ کے سپرد کرنے پر رضامند ہو گئے۔ مسٹر ماریسن ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ اس شریف انگریز اور اس کی نیک دل بیوی نے سید راس مسعود کو بغیر کسی معاوضہ کے اپنا بچہ سمجھ کر اپنے پاس رکھا اور اُن کے لئے اپنی کوٹھی میں دو کمرے بھی اپنے خرچ سے تعمیر کرا دیئے۔

مسز ماریسن بچے کی تربیت کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ وہ مسعود کو نماز اور روزے کی تاکید کرتیں اور اُن کو سحری کھانے کے لئے اُٹھاتیں۔ ان دونوں میاں بیوی کو اس کے بعد بھی ہمیشہ سید راس مسعود کا خیال رہا۔

۱۹۰۶ء میں راس مسعود ولایت چلے گئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے تاریخ میں بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری لینے کے بعد بیرسٹری کی سند لی اور ۱۹۱۱ء میں ہندوستان واپس آئے ۔ ۱۹۱۲ء میں وہ پانسو روپے ماہوار پر گورنمنٹ ہائی سکول پٹنہ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ اس کے کچھ عرصہ

بعد ترقی پاکر وہ گورنمنٹ کالج کٹک کے پروفیسر تاریخ مقرر ہوئے۔ اس عہدے پر ترقی پاتے ہوئے بہت عرصہ نہ گزرا تھا کہ اعلیحضرت نظام نے حکومتِ ہند سے اُن کی خدمات مستعار لیں اور انہیں حیدرآباد کے ناظمِ سررشتۂ تعلیمات کا عہدہ تفویض کیا۔ سرراس مسعود نے حیدرآباد میں بہت سی تعلیمی اصلاحات کیں لیکن اُن کا سب سے بڑا کارنامہ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہے جو سر اکبر حیدری اور نواب مسعود جنگ وغیرہم کی متفقہ مساعی کا نتیجہ ہے۔

حیدرآباد کے زمانۂ ملازمت ہی میں سرراس حکومتِ ہند کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے تھے۔ اس لئے حیدرآباد سے دس سال کی ملازمت کے بعد حسبِ معاہدہ ایک ہزار روپے ماہوار پنشن لے کر وہ علی گڑھ چلے آئے اور کچھ عرصہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ مسلم یونیورسٹی کی اُنہوں نے شاندار خدمات انجام دیں۔ چنانچہ ایک موقع پر اس کے لئے حضور نظام سے دس لاکھ روپے کا عطیہ لائے مگر افسوس ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے عہدے پر زیادہ عرصے تک فائز نہ رہے اور بعض مشکلات کی وجہ سے استعفا دے کر بھوپال چلے گئے اور وہاں مشیر المہام تعلیمات و معالجات و تعمیرات اور رکن کابینۂ عالیہ مقرر ہوئے۔

افسوس ہے کہ موت نے انہیں یہاں زیادہ عرصے تک رہنے کی مہلت نہ دی۔ انتقال کے بعد اُن کا جنازہ علی گڑھ پہنچایا گیا اور ۳۱ جولائی ۱۹۳۷ء کو وہ اپنے باپ اور دادا کے مقبروں کے درمیان دفن ہوئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مشرقی عورتوں کی بیداری

موجودہ صدی کا ایک اہم ترین واقعہ مشرقی عورتوں کی بیداری ہے۔ نسوانی بیداری کی مشرقی تحریکات کا آغاز جنگِ عظیم سے قبل ہُوا تھا لیکن جنگ کے بعد ان تحریکات نے نہایت حیرت انگیز رفتار سے ترقی کی ہے۔ پردے کا رواج ٹرکی سے قطعاً اُٹھ گیا ہے اور ہندوستان، مصر، ایران، شام اور عراق میں بھی بہت سی عورتوں نے برقع کے ظلم سے نجات حاصل کر لی ہے۔ تمام مشرقی ملکوں میں عورتوں کے الگ کلب، مجالس اور اخبارات موجود ہیں۔ وقتاً فوقتاً نسوانی کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں جن میں عورتوں کی معاشری اور تعلیمی ترقی کے وسائل سوچے جاتے ہیں۔ ہر ملک میں تعددِ ازدواج کے رواج کو مٹانے کی تحریک بہت ہمہ گیر ہے۔ اب تمام مشرقی ممالک کی عورتیں اپنے اپنے ملک کے امورِ عامہ میں دلچسپی لینے لگی ہیں۔ ہندوستان کی سینکڑوں عورتوں نے مہاتما گاندھی کی تحریک میں حصہ لیا اور ملک کی خاطر جیلوں میں گئیں۔ مصر کی عورتیں بھی ۱۹۲۱ء سے اپنے ملک کی تحریکِ آزادی میں حصہ لیتی رہی ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں طہران کی عورتوں نے جبری فوجی بھرتی کے خلاف ایوانِ حکومت کے سامنے ایک زبردست مظاہرہ کیا۔ چینی عورتیں اپنے ملک سے غیر ملکی اقتدار کو مٹانے کے لئے ۱۹۲۵ء سے چینی مردوں کا ساتھ دے رہی ہیں۔ گذشتہ سال تین سو سے زیادہ شامی عورتوں نے فرانس کے خلاف جہاد کرتے ہوئے اپنی جانیں وطن پر قربان کر دیں۔

اگر کوئی شخص اس صدی کے آغاز میں مشرقی عورتوں کی بیداری کے متعلق اس قسم کی پیشینگوئی کرتا تو لوگ اُسے سِڑی سمجھتے لیکن

اب مشرقی عورتیں حکومت کے محکموں میں کام کر رہی ہیں، تجارت میں حصّہ لے رہی ہیں اور بہت سے ایسے کام اختیار کر چکی ہیں جو پہلے صرف مردوں کے ہاتھ میں تھے۔ اب مشرق میں ڈاکٹر، بیرسٹر، مجسٹریٹ، جج، وزیر، ہواباز اور کارخانہ دار عورتیں مل سکتی ہیں لیکن ہندوستانی اور جاپانی ترقی پسند عورتیں دوسرے مشرقی ملکوں کی ترقی پسند عورتوں سے بعض باتوں میں مختلف ہیں۔ دوسرے ملکوں کی عورتیں ہر بات میں مغرب کی تقلید کو اپنے لئے ضروری سمجھتی ہیں لیکن ہندوستانی اور جاپانی عورت نے اپنے بعض ملی خصائص کو برقرار رکھا ہے شلاً جاپانی عورت نے مصری، ترکی، چینی اور ایرانی ترقی پسند عورتوں کی طرح اپنا ملکی لباس ترک نہیں کیا، یورپ جاکر کوئی جاپانی عورت یورپین لباس پہن لے تو پہن لے، جاپان میں وہ اپنے قومی لباس ہی میں ملبوس نظر آتی ہے، اور ہندوستانی عورت تو ہر جگہ نہایت وفاداری کے ساتھ اپنی ساڑھی کو برقرار رکھتی ہے۔ ہندوستانی عورتوں نے بھی جاپانی عورتوں کی طرح اپنے معاشری، اخلاقی اور روحانی خصائص کو یورپ کی تقلید میں خیرباد نہیں کہی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کی عورتیں انتہا پسندی کے سیلاب میں اندھا دُھند نہیں بہ گئیں۔

شور اور صحت

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ شور و غوغا صحت کے لئے بہت مضر ہے۔ یہ نہیں کہ صرف وہی شور جس کی طرف ہم متوجہ ہوں یا جس سے ہم ظاہری طور پر تنگ آجائیں صحت پر بُرا اثر ڈالتا ہے اور جس کی طرف ہم متوجہ نہ ہوں اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ شور ہر حالت میں ہمارے اعصاب کو متاثر کرتا ہے اور ہماری صحت کو تباہ کرتا رہتا ہے۔

لارڈ ہورڈر نے جو ایک نہایت قابل ڈاکٹر ہیں۔ لکھا ہے کہ موجودہ زمانے میں شور و غوغا بہت بڑھ گیا ہے لیکن صحت کو نقصان پہنچائے بغیر اس کو "ہضم" کرنے کی طاقت کم ہوتی جارہی ہے۔ ریل، موٹر، ہوائی جہاز اور شور انگیز سامانِ تفریح کی زیادتی کے ساتھ ساتھ ہمارے اعصاب کو تباہ کرنے کا سامان بھی بڑھتا جارہا ہے۔ اعصاب کو اس بلا سے نجات دلانا صحت کے لئے ویسا ہی ضروری ہے جیسا کھلی ہوا اور صاف پانی کی بہم رسانی یا بیماریوں کے جراثیم سے جسم کی حفاظت۔ شور جسم کو یوں تباہ نہیں کرتا جس طرح ہیضہ یا تپ محرقہ وغیرہ بلکہ یہ ہمارے اعصاب کو مضمحل کر دیتا ہے اور اعصاب کا اضمحلال انسان اور حیوان کے امتیازی خصائص کا اضمحلال ہے کیونکہ اعصاب ہی کی مدد سے انسان اپنی حیوانیت پر غالب آتا ہے۔ زندگی میں انسان کے اعصاب پر اور بھی کئی قسم کا بار پڑتا رہتا ہے۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ یہ مزید بار بھی اُن پر ڈالا جائے۔

لازم ہے کہ ہر مہذب انسان اپنے ہم جنسوں کو غیر ضروری شور و شغب سے بچانے میں دوسروں کا مددومعاون ہو +

حامد علی خاں

الین

ٹینی سن نے نیم تاریخی روایات کی بنا پر انگلستان کا "شاہنامہ" لکھا ہے جو بادشاہ آرتھر اور اس کی مشہور گول میز کے سرداروں کے قصص و حکایات پر مشتمل ہے۔ انہیں قصوں میں لینسلاٹ اور الین کا قصہ بھی ہے۔

لینسلاٹ آرتھر کا سب سے بہادر سردار تھا۔ سپہ گری کے ہر مقابلے میں وہ دوسرے تمام سرداروں سے بازی لے جایا کرتا تھا۔ اس قسم کے آخری اور سب سے زبردست سپہ گرانہ معرکے کے موقع پر لینسلاٹ بیماری کا بہانہ کرکے گھر پر ٹھہرا رہا اور بادشاہ اور دوسرے سرداروں کے چلے جانے کے بعد بھیس بدل کر خفیہ طور پر مقابلے کیلئے روانہ ہوا۔ سپہ گری کے یہ مقابلے کیملاٹ میں ہوا کرتے تھے۔ اس دفعہ لینسلاٹ نے تن تنہا ایک دوسرے راستے سے کیملاٹ کا رُخ کیا۔ راستے میں اُسے ایک رات کے لئے اسٹولاٹ کے جاگیردار کے ہاں بھی ٹھہرنا پڑا۔ پہلے وہ کبھی ادھر نہ آیا تھا۔ اس لئے اس نے جاگیردار سے گول میز کے ایک سردار کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں سپہ گری کے مقابلہ میں شامل ہونے کے لئے کیملاٹ جارہا ہوں۔ اس جاگیردار کے دو لڑکے تھے اور ایک لڑکی جس کا نام الین تھا۔ لڑکی کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ تھی اور وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔

لینسلاٹ کی ڈھال پر اپنا خاص نشان کندہ تھا اس لئے اُس نے یہاں سے ایک سادہ ڈھال اس خیال سے عاریتہً لے لی کہ بادشاہ اور دوسرے سردار ڈھال کے نشان سے اُسے پہچان نہ لیں۔ لینسلاٹ نے جاگیردار سے وعدہ کیا کہ میں معرکے کے بعد اپنا نام بتادونگا۔ باتوں باتوں میں جاگیردار نے ہنس کر کہا کہ "میری لڑکی بھی اُس لعل کے خواب دیکھ رہی ہے جو اس مقابلہ میں اوّل رہنے والے بہادر کو ملے گا۔ اس کے نوعمر بھائی سرگوین نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اگر میدان میرے ہاتھ رہا تو میں اس لعل کو تمہارے سر کی زینت بناؤں گا۔"

اس پر سرگوین نے شرمندگی سے معذرت کی کہ "میں کیا اور میری اوقات کیا۔ مجھے تو صرف مقابلہ میں شامل ہونے اور گول میز کے سرداروں کو دیکھنے کا شوق ہے۔ والد مجھے ناحق شرمندہ کرتے ہیں۔"

دُوسرا بھائی جو ذرا تلخ کلام اور مُنہ پھٹ واقع ہُوا تھا بولا، "اس قسم کے لعل بادشاہوں کی بیگموں کو زیب دیتے ہیں سیدھی سادھی لڑکیوں کو ان کے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔"

اس پر لینسلاٹ نے ازراہِ اخلاق مگر پورے خلوص کے ساتھ کہا "فقط حُسن ہی خوبصورت زیور کا حق دار ہے۔ کیا صرف بادشاہوں کی بیگمیں ہی حسین ہوتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو میں سخت غلطی پر ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس خاتون کا حُسن خوبصورت ترین لعل و جواہر کا حقدار ہے۔"

الین نے آنکھیں اُٹھا کر اس عظیم الشان سردار کے چہرے پر نظر ڈالی جس نے اس کی تعریف کی تھی۔ یہ چہرہ پُرعظمت ضرور تھا لیکن

الین

یہ ایک حسین نوجوان کا چہرہ نہ تھا بلکہ دھوپ سے جلا ہُوا تھا اور ایک گال پر تلوار کے ایک گہرے زخم کے نشان کے علاوہ عمر، غور و فکر اور تفکرات نے اس چہرے پر بہت سے نشان چھوڑ رکھے تھے لیکن ایلین کو یوں محسوس ہُوا کہ اُس نے اس سے زیادہ پُرشکوہ چہرہ آج تک نہیں دیکھا اور اُس کا دل لینسلاٹ کی محبت سے بھر گیا۔ پھر جب لینسلاٹ نے آرتھر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سے بڑا سردار آج تک پیدا نہیں ہُوا تو ایلین نے دل میں کہا "میرے سردار یہ سچ ہے مگر اُس کا درجہ ضرور تیرے بعد ہی ہوگا۔"

دوسرے دن جب لینسلاٹ گوین کو ساتھ لے کر کیملاٹ کو روانہ ہُوا تو وہ اپنی ڈھال ایلین کی تحویل میں چھوڑ گیا۔ لڑکی نے اس ڈھال کے لئے ایک خوبصورت غلاف بنایا اور روز اُسے نکال کر دیکھتی اور پہروں اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں سوچتی رہتی۔

لینسلاٹ اور گوین جلد ہی کیملاٹ پہنچ گئے۔ اس دفعہ مقابلہ واقعی بہت سخت تھا۔ دوسرے علاقوں کے سردار اور بادشاہ بھی مقابلے کے لئے آئے تھے۔ وہ گھمسان کا رن پڑا کہ لینسلاٹ بھی زخمی ہوگیا لیکن زخموں کے باوجود وہ اس طرح جان توڑ کر لڑا کہ میدان اسی کے ہاتھ رہا۔ زخموں کی شدت کے باعث بازی جیتنے کے بعد اُسے انعام لینے کا ہوش بھی نہ رہا اور سرگوین اس کی ہدایات کے مطابق خاموشی سے اسے ایک راہب کی جھونپڑی میں لے گیا جہاں وہ ایک عرصے تک بیمار پڑا رہا۔

بادشاہ کے آدمی اُس کی تلاش میں ہر طرف پھر رہے تھے۔ ایلین کو جب اُس کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی تو وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ گئی اور پوری تن دہی سے اس کی تیمارداری کرتی رہی۔ آخر تندرست ہونے پر یہ لوگ لینسلاٹ کو ساتھ لے کر اسٹولاٹ آئے۔ یہاں سے اُسے اپنی ڈھال بھی لینی تھی۔

اسٹولاٹ سے روانہ ہونے سے پہلے لینسلاٹ نے ایلین سے کہا "میں تمہارے احسانوں کا معاوضہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی مجھے بتاؤ کہ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ تم مجھ سے جو فرمائش کرو گی میں اُسے سچے دل سے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ آج مجھے رخصت ہو جانا ہے اس لئے اپنی خواہش کے اظہار میں زیادہ ڈھیل نہ کرو۔"

ایلین نے جواب دیا "آہ میں کہہ نہیں سکتی لیکن اگر میں نے چند الفاظ کہنے کی جرأت پیدا نہ کی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ میں کیا کہوں میں دیوانی ہوگئی ہوں۔ مجھے آپ سے محبت ہے۔"

لینسلاٹ نے گھبرا کر کہا "میری بہن یہ تم نے کیا کہا؟"

ایلین نے جواب دیا "مجھے اپنی بیوی بنا لیجئے۔" اور یہ کہتے ہوئے بے اختیارانہ اپنے بازو اس کی طرف پھیلا دیئے۔

چونکہ لینسلاٹ کو ایک اور عورت سے محبت تھی جس سے اس کی شادی نہ ہو سکتی تھی اس لئے اُس نے عمر بھر شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا "پیاری بچی میں تو کبھی شادی نہ کروں گا۔ میں نے اپنے دل میں یہ عہد کر رکھا ہے۔"

اس پر ایلین نے کہا "تو پھر مجھے اپنی خادمہ بنا لیجئے۔ جہاں آپ جائیں گے میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے جاؤں گی۔"

لینسلاٹ نے کہا "یہ تو تمہارے باپ اور بھائیوں کی مہربانی کا کوئی اچھا بدلہ نہ ہوگا۔"

آخر الین نے مایوس ہو کر کہا "آہ اب میرے اچھے دن گزر گئے ہیں"۔

لینسلاٹ اسے بہت دیر تک سمجھاتا رہا کہ "یہ محض تمہارا طفلانہ وہم ہے یہ محبت نہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ تم کو کسی ایسے سردار سے محبت ہوگی جس کی عمر میری طرح تم سے تگنی نہیں ہوگی۔ پھر میں اپنی جاگیر کا ایک بہت بڑا حصّہ بلکہ اپنی نصف جاگیر تمہیں دے دوں گا"۔

الین نے کہا "مجھے اِن چیزوں کی ضرورت نہیں" اور بیہوش ہو کر گر پڑی۔ لینسلاٹ نے اُسے سنبھالا اور سہارا دے کر اس کے کمرے کی طرف لے گیا۔ لڑکی کے باپ نے اتفاق سے یہ تمام باتیں سُن لی تھیں۔ اس نے علیحدگی میں لینسلاٹ سے کہا "سر لینسلاٹ مجھے ڈر ہے کہ جس کو آپ طفلانہ وہم کہتے ہیں یہ اس کی جان لے کر چھوڑے گا۔ آپ اُس کے ساتھ ذرا زیادہ درشتی سے پیش آیئے تاکہ یہ خیال اُس کے دل سے نکل سکے"۔

ایک بہادر سردار کے لئے ایک خاتون سے درشتی کے ساتھ پیش آنا ممکن نہ تھا مگر پھر بھی لینسلاٹ دوسرے دن اپنی ڈھال لے کر الین سے ملے بغیر استولاٹ سے رخصت ہو گیا۔ اس سے زیادہ درشت طرزِ عمل وہ اختیار نہ کر سکتا تھا۔

ڈھال چلی گئی اور اس کا خالی غلاف شکستہ دل الین کے پاس باقی رہ گیا۔ اس کو دیکھ دیکھ کر وہ ان دنوں کی یاد تازہ کرتی رہتی جب لینسلاٹ اُن کے ہاں رہا تھا لیکن اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی اور وہ لینسلاٹ کے رخصت ہونے کے بعد پورا ایک مہینہ بھی زندہ نہ رہ سکی۔ سچ ہے یکطرفہ محبت کا علاج موت کے سوا اور کچھ نہیں۔

آرتھر کا محل دریا کے کنارے واقع تھا۔ مرنے کے بعد الین کی لاش اس کی وصیت کے مطابق ایک ناؤ کے ذریعہ سے آرتھر کے محل کے سامنے پہنچا دی گئی۔ ناؤ کو کھینے والا استولاٹ والوں کا ایک گونگا ملازم تھا۔ آرتھر، لینسلاٹ اور دوسرے سرداروں نے اس کشتی کو حیرت اور افسوس سے دیکھا لیکن گونگا آدمی اُن کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکا۔ پھر اُنھوں نے لاش کے ہاتھ میں ایک خط دیکھا اور لے کر اُسے پڑھا۔ خط کا مضمون یہ تھا:۔

"سر لینسلاٹ میں استولاٹ کی الین جس سے ملے بغیر آپ چلے آئے تھے آخری بار آپ سے ملنے اور رخصت ہونے کے لئے آئی ہوں۔ مجھے آپ سے محبت تھی لیکن آپ کو مجھ سے محبت نہ تھی اس لئے میں مرگئی۔ بادشاہ ملکہ اور گول میز کے سردار مجھ پر رحم کھائیں گے مگر میں بے مثال سردار لینسلاٹ سے بھی اپنی روح کی تسکین کے لئے دُعا کرنے کی التجا کرتی ہوں"۔

لینسلاٹ نے بادشاہ اور سرداروں کو تمام واقعہ سنایا جسے سُن کر سب کے دل بھر آئے۔ پھر الین کی لاش بادشاہ کے حکم سے بادشاہوں کے ساتھ شاہی قبرستان میں دفن کی گئی۔

اس کے بعد لینسلاٹ بجھے ہوئے دل کے ساتھ تنہا دریا کے کنارے چلا گیا اور گھاس پر لیٹ گیا۔ دریا کی سطح پر دُور ایک سیاہ دھبا نظر آتا تھا۔ استولاٹ کی کشتی واپس جا رہی تھی۔ اس وقت لینسلاٹ کا دل بھی غم و اندوہ کے ایک سیلاب میں بہ رہا تھا ❖

حامد علی خاں

ہمارا ادب اور ہماری زندگی

ذیل کا مضمون انجمنِ اُردو پنجاب کے ادبی جلسے میں جو آنریبل میاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم پنجاب کی صدارت میں راقم کی کوٹھی پر ۱۸ جولائی سنہ ۱۹۳۷ء کو شملے میں منعقد ہوا پڑھا گیا۔ ب ۔ ا

موجودہ صدی میں بالخصوص جنگِ عظیم کے بعد متمدن انسان کی زندگی میں بہت سی نہایت اہم تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور چونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اس لئے لازم تھا کہ ادب میں بھی بہت سی تبدیلیاں ہوں۔ زندگی میں ہر طرف جمہوریت کی لہر دَوڑ گئی ہے اور جمہوریت بھی اب وہ محض اُنیسویں صدی کی جمہوریت نہیں رہی کہ پارلیمنٹ نے کچھ اٹل سے قاعدے مقرر کئے اور کچھ قوانین طے کئے اور اُن کے مطابق مملکت کے کاروبار چلتے گئے۔ نہیں اب نہ کوئی شے اٹل ہے اور نہ دیر کے لئے طے شدہ۔ پرانے رسم ورواج بوسیدہ ہو رہے ہیں، اُن کی وہ قدر و قیمت نہیں رہی جو پہلے تھی بلکہ سرے سے ہر اُس شے کو جو پرانی ہو جو مقرر ہو جو معرز ہو نہ معتبر سمجھا جاتا ہے نہ معرز اور یہ اس لئے کہ اب عزت کا معیار بدل گیا ہے اور اعتبار بھی محض سُنا سنایا نہیں رہا۔ انسانیت کا تختہ اُلٹ گیا ہے، تہذیب نے نئی کروٹ لی ہے، زندگی اَور کی اَور ہو گئی ہے۔ اِس حال میں اگر ادب وہی رہے جو تھا تو وہ زندگی سے بیگانہ ہو جائے گا، وہ زندہ نہ رہے گا مُردہ ہو جائیگا، وہ کسی عجائب خانے یا زیادہ سے زیادہ کسی چڑیا گھر میں معمولی تفریح کا کام دے سکے گا، وہ زندگی کے چمن میں زندگی کا گلچیں نہ بن سکے گا!

دُنیا کی نئی تحریکات نے ہندوستان کے نیم مُردہ جسم میں بھی ایک نئی زندگی کی رَو دوڑا دی ہے۔ یہ ابھی تک سونے کی چڑیا سہی لیکن اب اس سونے کی چڑیا میں بھی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ پچھلے بیس پچیس برس میں ہمارے دیکھتے دیکھتے ہمارا ماحول کچھ اَور کا اُور ہو گیا ہے سیاسی فضا میں وہ حاکمانہ رعب کے بادل اب نہیں چھائے رہتے، معاشری حلقے میں وہ حضرتِ دقیانوس کے زمانے کی بندشیں ٹوٹ رہی ہیں۔ وُہ دن ہمیں یاد ہیں کہ کوئی انگریز گزرتا تھا تو اکثروں کے بدن میں کپکپی سی دَوڑ جاتی تھی، ابھی چند ہی سال ہوئے لارنس باغ لاہور میں ہندوستانی خال خال نظر آتے تھے۔ آج وہاں سوراج کا یہ عالم ہے کہ شام کو جاؤ تو جمخانہ والے اپنی ٹینس کھیل کر جلد جلد اپنے تلے کپڑے باندھ کلب گھر کی چار دیواری کے اندر گھُسنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُدھر باہر ہندوستانی عورتیں جو صدیوں سے اپنی چار دیواری میں بند تھیں۔ گلزاروں اور لالہ زاروں میں اپنی ساڑیاں پہنے اپنے بچوں سمیت بے تکلف گھوم رہی ہوتی ہیں۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں ہمارے قومی شاعر نے کہا تھا "زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا"۔ اب یہ بے حجابی اس قدر عام ہوگئی ہے کہ دیدار بھی بیکار سا ہو کر رہ گیا ہے۔ اب ایک قسم کا دیدار ہو تو کوئی اُس کے پیچھے پڑے۔ اب تو حُسن و تناسب کی بھی گویا ہزاروں قسمیں ہو گئی ہیں اور نظر بازوں کی توجہ بٹ جانے کی وجہ سے اُن کے دل میں کسی اصلی یا فرضی محبوب کا حُسن دیر تک وہ ہیجان یا طوفان برپا نہیں کرتا جو کبھی کیا کرتا تھا۔ اب کشش کے معنی محض جمالی حُسن کی کشش نہیں رہے

اب دل ہزاروں طرف کھچا چلا جاتا ہے ۔ غالب کی پکار" دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے" آج کل ایک نئے معنی رکھتی ہے ۔ سیاسی آزادی، معاشری آزادی، معاشی آزادی! اب اِن کے مطالبات ہیں اور ہم!

سب سے پہلے ۱۹۰۵ء میں جنگِ روس وجاپان نے ہندوستان پر آزادانہ خیالات کا اثر ڈالا۔ تقسیم بنگال کے سلسلے میں سودیشی تحریک کا آغاز ہؤا۔ پھر اور بیرونی واقعات نے بھی اپنا اثر کیا لیکن جنگِ عظیم ہی وہ زلزلہ تھا جس نے دُور دُور تک ہندوستان کو ہلا ڈالا۔ اِدھر ایک اندرونی تحریک بھی پیدا ہوئی ۔ ہندوستان گاندھی جی کا یہ احسان بھی نہیں بھول سکتا کہ اُنھوں نے ہر کہ ومہ کے دل سے سفید لوگوں کا ڈر نکال دیا۔ عدم تعاون کی تحریک سے اور کوئی فائدہ ہؤا یا نہ ہؤا لیکن ایک یہ عظیم الشان انقلاب اُسی تحریک سے ظاہر ہؤا کہ انگریز کو دیکھ کر ڈر جانا دبک جانا سہم جانا یہ جاتا رہا ۔ یہ آزادی کا پہلا قدم تھا ۔ مہاتما نے سچ کہا ہے کہ اصلی آزادی اپنے نفس کی آزادی ہے ۔ ہم سوراج انگریزوں کو یہاں سے نکالے بغیر حاصل کر سکتے ہیں ۔ انگریز اگر ہندوستان کے مفاد کو پیشِ نظر رکھیں اور یہاں کے ہو کے رہیں تو اُن کا یہاں رہنا شاید کسی انتہائی سوشلسٹ کو بھی بُرا نہ لگے ۔ انگریزوں کے تسلط، انگریزوں کی تعلیم، انگریزوں کی صحبت ہی سے ہم میں وہ خیالات پیدا ہوئے جو آج ایک اجنبی حکومت کے خلاف کام کر رہے ہیں ۔ خود انگلستان کی تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ کس طرح ہم ہندوستان کے لئے آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔

معاشی تبدیلیوں نے اس قسمت کے مارے ملک میں بھی ایک نئی معاشیات کی داغ بیل ڈالی ہے ۔ معیارِ زندگی بڑھا، پھر ۱۹۲۹ء کی معاشی طغیانی اُٹھی، ساتھ وہی روس کے نئے تجربوں اور نئے قوانین اور نئی باتوں نے معاشرت اور معیشت کی کایا پلٹ دی ۔ نچلے طبقے میں ترقی کا احساس پیدا ہؤا ، غریبوں کو معلوم ہؤا کہ ہم قسمت کے مارے ہوئے نہیں لپنے ہی بھائی بندوں کے روندے ہوئے ہیں ۔ پردہ اُن کی نظروں سے اُٹھ گیا اور اُٹھ رہا ہے اور ہم امیروں پر واضح ہو کہ اُٹھ کے رہے گا ۔ دیکھئے شاعر کی پیشین گوئی "بے حجابی" کے متعلق کہاں کہاں اور کس کس طرح پوری ہو رہی ہے ۔ وہ جو ہم زندگی کے باغ میں بے دھڑک گلچینیاں کیا کرتے تھے اُس کے متعلق ہمارے اسی شاعر نے تنبیہ کی ہے کہ خبردار "خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی" اور اخیر میں ایک نہیں ہزاروں تبدیلیوں کو آتے دیکھ کر وہ پکار اُٹھا" محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی"!

دُنیا کیا سے کیا ہو چکی اور ابھی خدا جانے کیا سے کیا ہو گی ۔ جن آنکھوں نے بجلی اور گراموفون اور ہوائی جہاز اور سینما اور بے تار اور ریڈیو دیکھا ہے وہ ابھی کیا کیا اور نہ دیکھیں گی ۔ لیکن ان سب ایجادوں اور تماشوں سے ہزار گنا بڑھ کر وہ عظیم الشان، وہ ساری دُنیا کو ہلا دینے والا انقلاب ہے جو دلوں کے خیالات میں انصاف پسندی اور برابری اور آزادی کے برقی جذبات نے پیدا کر دیا ہے ۔ وہ پرانے ادارے جن کے بل پر بزرگی لُطف اُٹھاتی رہی جو بھینس والی لاٹھی کے نام لیوا رہے وہ ادارے اب نئے نوجوان ولولوں کے مسلسل صدموں سے کمزور ہو رہے ہیں ۔ دُنیا عدل اور انصاف اور مساوات کو پکار رہی ہے اور ان کے جوابی نعرے غافلوں اور آرام پسندوں کو

بھی سُنائی دے رہے ہیں اور اُنہیں رہ رہ کر بیدار کئے دیتے ہیں۔

دیکھیے دُنیا میں اور ایک حد تک ہمارے وطن میں بھی اب پہلے کی سی عورتوں مردوں کی علیحدگی نہیں رہی۔ یہاں بھی وہ انگریزوں کا رُعب نہیں رہا پہلے کی سی امیروں کی فوقیت کچھ کم ہوئی ہے اور وہ قسمت کی جکڑ بند بھی شاید ذرا ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ بڑوں چھوٹوں میں عورتوں مردوں میں گوروں کالوں میں عالموں جاہلوں میں وہ بناوٹی نہ ہٹ سکنے والا فرق کم ہو رہا ہے اور کم ہو کے رہے گا۔ جب یہ سب کچھ نہیں رہا اور نہ رہے گا تو ہمارا علم ادب کس طرح اپنے اُسی حال پر قائم رہ سکتا ہے ؟

نرے زلف و خال کے قصے اِن سانپوں اور مکھیوں کے قصے اب کام نہ دیں گے۔ "گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر"۔ اور اب گئے گزروں کے لئے رونے پیٹنے کا زمانہ بھی نہیں رہا۔ ہماری عندلیب کو بھی اب اگر زندہ رہنا ہے تو اُسے زار کا تخلص چھوڑنا پڑے گا اور بجائے عندلیب زار یا بلبلِ زار کے بلبلِ زندہ دل بننا پڑے گا ورنہ گلہائے رنگا رنگ اُس سے یکسر منہ پھیر لیں گے اور فرضی معشوقوں فرضی نظاروں فرضی رنجوں اور فرضی تکلیفوں کی مبالغہ آمیز تصویروں سے اب دل نہ بہلے گا۔ اب تو جو کچھ کسی کا ذاتی تجربہ یا مشاہدہ ہے اُس کا سیدھا سادہ بیان جو حقیقت کو آنکھوں کے سامنے لے آئے وہ کام دے گا، وہی مؤثر ہوگا، وہی دلچسپ ہوگا، اُسی کی طرف توجہ ہوگی۔ بلبل اور صنوبر اور کنار رُکنا آباد کی بجائے اب کوئل اور آم اور راوی اور گنگا جمنا کا ذکر پسندیدہ ہوگا اور ہونا بھی چاہئے اور صرف یہی نہیں بلکہ اب اگر عناصر اربعہ کا ذکر کیا جائے گا تو زمانہ ہم پر ہنسے گا۔ ہم سائنس کے دریافت شدہ تقریباً بانوے [۹۲] عناصر کے ہوتے ہوئے اب کس طرح چار عناصر کا ذکر کر سکتے ہیں ؟ دُنیا بدل گئی ہے اب ہمیں آہستہ آہستہ اپنی بعض تشبیہوں اور استعاروں کو بھی بدلنا پڑے گا کم از کم اُن میں بہت کچھ اضافہ کرنا پڑیگا۔ اور اپنے لفظوں کے ذخیرے کو بھی ہمیں غور سے دیکھنا اُس میں اضافہ کرنا اور اُس کو سمجھداری سے استعمال کرنا ہوگا۔

لفظوں کے ذخیرے سے اپنی پیاری زبان یاد آگئی۔ آج کل لفظوں کی بہت بحث جاری ہے۔ یوں تو سب بحثیں لفظوں میں ہوتی ہیں، لفظوں کی ہوتی ہیں لیکن ہماری قومی زبان کے لفظوں کے متعلق جو بحث جاری ہے، اُن کو لکھنے کے طریقے کی بابت جو بحث جاری ہے اُس نے بھی ایک ملی صورت اختیار کر لی ہے۔ بحث کا، لڑائی جھگڑے کا، ہم ہندوستانیوں کو ایسا چسکا پڑ گیا ہے اور ملّی تفریقات کی ہمیں ایسی عادت ہو گئی ہے کہ اب ہندو پانی اور مسلمان پانی کے ساتھ ساتھ ہندو لفظ اور مسلمان لفظ بھی وجود میں آ گئے ہیں۔ اس لفظ پر تو کے گلے میں جنیؤ ہے یہ ہندو ہے، اُس لفظ لیکن کے گلے میں قرآن لٹکا ہے یہ مسلمان ہے۔ بھلا کوئی پوچھے کہ پھر ہندوستان کیا ہے ؟ ہندو کہ مسلمان ؟ اس کے معنی ہیں ہندوؤں کا ملک لیکن یہ لفظ ہے ایک مسلمانی زبان سے بنایا ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ سارا جھگڑا، یہ سارا تفرقہ یہ ساری تُو تُو مَیں مَیں کس قدر مصنوعی ہے ! یہ ملک نہ ہندوؤں کا تھا نہ مسلمانوں کا۔ پہلے ہندو یہاں آئے، صدیوں یہاں رہے سہے، اُن کی تہذیب نے یہاں علم و ہنر کا دیا جلایا۔ پھر مسلمان آئے وہ بھی صدیوں یہاں رہ چکے ہیں اُن کے تمدن نے یہاں شائستگی کا چراغ روشن کیا۔ پھر انگریزوں نے "گڈ ایوننگ" کہا، انہیں آئے بھی ایک عرصہ گزر چکا ہے، اُن کی سولیزیشن نے یہاں سائنس کا برقی

لیمپ بلکہ کئی آنکھیں چندھیا دینے والے برقی لیمپ جلا دیئے۔ جو پہلو بس گئے اُن کا نکلنا نکالنا اب ناممکن ہے۔ اب تو ہم سب کو ایک دوسرے سے نباہنی ہی پڑے گی۔ یہاں ہندو سنسکرتی زبانیں بولتے تھے مسلمان آئے تو اُنہوں نے عربی فارسی بولنی شروع کی۔ اکٹھے رہتے سہتے ان کی کھچڑی جو پکی تو اُردو بن گئی۔ نہ یہ مسلمانوں کی زبان تھی نہ ہندوؤں کی۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہندو مسلمان دونوں کی زبان تھی اور ہے اور ہونی چاہئے!

ملی اختلافات کے اس نیم پاگل زمانے میں اُردو ہندی کا جھگڑا خواہ مخواہ شروع کر دیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ مہاتما جی بھی اِس اکھاڑے میں اُتر آئے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ یہ کام اُن کی شان کے شایاں نہیں۔ اُنہیں تو اس بدقسمت ملک میں صرف وہی بڑے بڑے کام کرنے چاہئیں جو اُن کے بغیر کوئی اور سرانجام نہیں دے سکتا۔ جس طرح اُنہوں نے انگریز کا ڈر ہمارے دلوں سے نکالا اسی طرح وہ مغرب کی بعض مصنوعی چیزوں اور اجنبی عادتوں سے بھی ہمیں رہائی دلا سکتے ہیں اور امیروں کے دلوں میں غریبوں کی محبت کا خیال پیدا کر کے صحیح قسم کی مشرقی اشتراکیت کا بیج بونے میں وہ مُلک کے رُوحانی لیڈر بن سکتے ہیں۔ زبان کے معاملے میں پنڈت جواہر لال کا فیصلہ خوب ہے اور درست ہے۔ اس ملک کی قومی زبان ہندوستانی ہے جو فارسی اور ناگری دونوں حروف میں لکھی جاتی ہے۔

اُردو ہندی کا بنگالی اور ملیالم سے کوئی جھگڑا نہیں تو ایک دوسرے سے کیوں ہو؟ اُردو ہندی بنیادی طور پر ایک زبان ہیں لیکن علمی طور پر فی الحال کسی قدر مختلف ہیں اور مختلف رہیں بھی تو کیا حرج ہے؟ بھارت ماتا کے گلے میں کیا ضرور ہے کہ صرف ایک ہی مالا ہو، ایک ہار پچلڑا اور دوسرا ستلڑا دونوں ہی رہیں تو اور بھی اچھا ہے۔ اُردو ہندی کی علمی اصطلاحات بڑی حد تک مختلف ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ساری کی ساری زبان ایک سے دوسری بالکل مختلف ہو۔ ہم بہت سی باتیں ایسی زبان میں کہہ سکتے ہیں جسے اُردو ہندی والے دونوں آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ایسی باتیں ایسی ہی مشترک زبان میں کہی جانی چاہئیں۔ عربی اور سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ صرف اُسی حد تک استعمال ہونے چاہئیں جس حد تک ضروری ہوں۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہ ہونے چاہئیں کہ عربی اور سنسکرت کے الفاظ کے خلاف بہرا اٹھا دیا جائے۔ ایسا کرنے سے اُردو اور ہندی دونوں کمزور ہو جائیں گی۔ نہیں ان دونوں زبانوں کو اپنی اپنی جگہ پھلنے پھُولنے دیجئے جس کسی سے بھی ہو سکے وہ دونوں کا رسم الخط سیکھ لے ضرور سیکھے اور ہندو مسلمان کے سوال کو دل سے بھُلا دے۔ اس سلسلے میں مَیں یہ عرض کرنا نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ شمالی ہندوستان کے ہندو شوق سے ہندی سیکھیں لیکن اس کے ساتھ یہ لازم ہے کہ جس طرح وہ اب تک اُردو سیکھتے آئے ہیں، اُسی طرح آئندہ بھی بدستور خاص طور پر اُردو پڑھیں لکھیں۔ کیونکہ اگر اُنہوں نے بعض انتہا پسندوں کے پیچھے لگ کر اُردو کو چھوڑ دیا تو یہ بات ہماری قومی ترقی کے لئے بلکہ بقول بعض ہندوؤں کے خود اُن کے لئے بھی سخت نقصان دہ ثابت ہوگی۔ یقیت پرستی کے اس عہد میں لے دے کے اِک اُردو زبان رہ گئی ہے جو ہندو مسلمانوں کا مشترک سرمایہ ہے اور گویا اُن کی حُبّ الوطنی کے شہر کا پُر رونق چوک ہے جہاں دونوں ملتوں کے لوگ بے دھڑک ملتے جلتے ہیں، اپنے جی کی کہتے ہیں اور دُوسرے کی سُنتے ہیں۔ محبت اور

پریم کے جھنڈے یہیں لہراتے ہیں ! اے اہلِ وطن! اپنے اپنے اندھیرے گلی کوچوں میں بھٹکتے نہ پھرو بلکہ یہاں اِس کھُلی جگہ میں آؤ. یہاں فطرت کی روشنی اور ہوا میں قومی زندگی کا لُطف ہے !

لفظوں کے ذخیرے کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً زبان کی بات چھڑ گئی اور لمبی ہو گئی لیکن اس کا ذکر میں نے ذرا پھیلا کر اس لئے کیا کہ اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلاؤں۔ مختصر یہ کہ ہماری قومی زبان کے دروازے پر فارسی اور ناگری دونوں خطوں میں اوم اور بسم اللہ لکھا ہونا چاہئے اور اُس کے الفاظ کے ذخیرے کے بڑھانے میں کسی طرح کا تامل نہ کرنا چاہئے۔ ہاں کونسا لفظ کہاں استعمال کیا جائے۔ اِس کا ہر وقت دھیان رکھنا چاہئے۔

شاید اس بات پر حیرت ظاہر کی جائے کہ ہماری زندگی اور ہمارے ادب کے سلسلے میں مَیں کن کن اَنمل بے جوڑ باتوں کا ذکر کر رہا ہوں لیکن اسے کیا کیا جائے کہ زندگی ہے ہی ایک اَنمل بے جوڑ چیز جس کی ترکیبی چیزوں کو بخوبی ملانے اور جوڑنے کی کوشش کرنا ہی ہم انسانوں کا اہم ترین فرض ہے اور ہمارے لئے خوشی کا ایک نہ ختم ہونے والا ذریعہ۔ ہماری زندگی میں یہ سب کچھ ہے جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ عجیب و غریب تبدیلیاں ایجادیں، انقلاب، معاشری معاشی سیاسی قومی بین الاقوامی، قسم قسم کے طرح طرح کے خیالات یہ سب ہماری آج کل کی زندگی کا جزو ہیں نہ ہم ان سے چھوٹ سکتے ہیں نہ یہ ہم سے۔ مدعا ساری گفتگو کا یہ ہے کہ ہمارے ادب کو ان نئی اِن نت نئی چیزوں کا آئینہ بننا چاہئے۔ اُسے محض گزرے ہوئے پر قناعت نہ کرنی چاہئے۔ صرف پُرانی لکیر کا فقیر نہ بنے رہنا چاہئے۔

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمارا سارا پُرانا لٹریچر بے کار ہے؛ زُلف و خال، گُل و بلبل، دُنیا کی بے ثباتی، زمانے کی گردش، قسمت قدرت وغیرہ کے قصّے محض لغو ہیں؛ اور اس سرمائے کو بھاڑ میں جھونک دینا چاہئے؛ اور پھر ایک نیا ایک ترقی یافتہ علم ادب تیار کرنا چاہئے؟ ہمارے بعض نوجوانوں کا بعض نہایت نیک نیت باعمل جوشیلے نوجوانوں کا یہی خیال ہے؛ میں اس جگہ اِس بحث میں نہ پڑوں گا کہ آیا یہ خیال درست ہے یا نہیں؛ صرف یہ عرض کروں گا کہ طبعاً یا حالات کی وجہ سے بعض لوگ انقلاب پسند واقع ہوئے ہیں بعض اعتدال پسند انقلاب پسندوں کو اپنی راہ پر چلنا چاہئے، اعتدال پسندوں کو اپنی راہ پر۔ نتیجہ خود ظاہر کردے گا کہ کون راستی پر تھا اور یہ بھی بہت ممکن ہے شاید اغلب ہے کہ انجام یہ ثابت کردے کہ ان دونوں کا وجود انسانی ترقی کے لئے لازم ہے اور مفید!

بہرحال میں اعتدال پسندوں میں ہوں اور جہاں تک ہمارے ادب اور ہماری زندگی کا تعلق ہے میں کہوں گا کہ ہمارے ادب کو اپنی بعض بنیادوں پر قائم رہ کر جذبات و خیالات کی ایک نئی عمارت تعمیر کرنی چاہئے، ایسی عمارت جس میں نئی دُنیا کی تحریکات کا ظہور ہو، جس کے دیوانوں میں فطری زندگی اور برابری اور آزادی کا بول بالا ہو، جو پُرانے اور نئے کے مناسب ملاپ سے زندگی کی نئی خوشنما تصویریں پیش کرے اور انسانوں کی بستی کو امن و ترقی کی دُنیا بنادے +

اُردو ادب کا کچھ حصّہ اُس زمانے کی یادگار ہے جو ہمارے زوال کا زمانہ تھا۔ ادب زندگی کا مظہر ہے اس لئے وہ ادب بھی

زوال کی ایک تصویر ہے۔ ہمیں ترقی کرنی چاہئے لیکن اس غرض سے زوال کی اس تصویر کا تباہ کر دینا ضروری نہیں۔ میر اور میر حسن اور انیس اور غالب اور شرر اور سرشار وغیرہ کی نظم و نثر میں پرانے خیالات کے ہزاروں نمونے ہیں جو ادب کی بہترین نشانیاں ہیں۔ انسانی فطرت کی جیسی انوکھی تصویریں ان اُستادوں نے کھینچی ہیں وہ اکثر قابلِ دید ہیں۔ اور آزاد اور حالی اور چکبست اور اقبال نے معاشری و قومی ترقی کی جیسی راہیں دکھائی ہیں وہ ہمیں بھولنی نہ چاہئیں۔

اور خوشی کا مقام ہے کہ جوش اور ساغر اور کئی اور نوجوان شاعر عام انسانی اور قومی زندگی کے نئے خیالات کا نئے طریقے سے پرچار کر رہے ہیں۔ نثر میں بھی اصلاحی و انقلابی خیالات کی کمی نہیں بعض مصنّفوں کی ظرافت وہ کام کر رہی ہے جو کبھی اصلاح پسندوں کی متانت کیا کرتی تھی۔ مثال کے طور پر دیکھئے فلک پیما کا "اللہ میاں"، فرحت اللہ بیگ کا "نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر"، بخاری کا "کتے" ساتھ ہی بے قافیہ نظمیں، ریڈیو کے نئے ڈرامے، ہندوستانی زندگی کے طبع زاد افسانے اُردو ادب کی نئی روش کو ظاہر کرتے ہیں۔

لیکن ہاں اس ذخیرے پر بھروسہ کر کے مگن ہو رہنا بھی سخت غلطی ہوگی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ "جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی" تو وہی علم ادب زندگی کا صحیح آئینہ دار ہوگا جو اسی طرح مسلسل ترقی کا ثبوت پیش کرتا رہے اور جس کا منتہائے کمال یہ ہو کہ اُس کے جامِ جہاں نما میں تمام پرانی اور نئی لیکن بالخصوص تمام نئی چیزوں کا گنگا جمنی عکس نظر آئے!

حضرات! یہ عظیم الشان کام اُسی وقت سرانجام پا سکتا ہے جب ادیب اور غیر ادیب دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔ ادیب قومی و انسانی زندگی کے ہر شعبے میں دلچسپی لیں اور غیر ادیب اپنے قومی ادب سے بے پروائی نہ برتیں بلکہ اُس سے محبت کرنا سیکھیں اور اُسے ترقی دیں!

بشیر احمد

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی! دلِ ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی!

(اقبال)

آزادی کی ہے دھوم

مستوں میں مل کر جھوم

آکاش کے رتھ کو چوم

ہر اک رقص آزاد ——— آزاد ——— دل شاد

ہم آج سے ہیں آزاد ——— آزاد ——— آباد

(ساغر)

اجنبی' انجان عورت رات کی

میں دھندلی نیند میں لپٹا تھا سو پردوں سے وہ جاگ اٹھی

ہلکے ہلکے بہتی آئی اور چھائی میٹھی خوشبو سی!

باریک دوپٹہ سر پہ لئے، اور آنچل کو قابو میں کئے،

چنچل نینوں کو اوٹ دیئے، شرمیلا گھونگٹ تھامے تھی!

نردوش بدن اک چندر کرن، اٹھتا جوبن بس من موہن،

میں کون ہوں، کیا ہوں، کیا جانے، من بس میں کیا اور بھول گئی!

جب آنکھ کھلی اور ہوش آیا تب سوچ لگا، الجھن سی ہوئی،

پھر گونج سی کانوں میں آئی، وہ سندر تھی سپنوں کی پری!

"میراجی"

ہوائی قلعے

اس وقت تک مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے کے متعدد مضامین "ہمایوں" میں شائع ہو چکے ہیں۔ صاحب موصوف ایک نہایت قابل اور نیک نفس نوجوان ہیں۔ اب تک اُن کے جو مضامین ہم نے شائع کئے ہیں اُن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مسٹر کرشن چندر کا شمار اُردو کے موجودہ ادبا کی صفِ اوّل میں ہو سکتا ہے۔ اس نوجوان ادیب کی نفیس اور زوردار زبان، سیرحاصل اور رنگین تخیل اور گہرا النفسیاتی مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ یہ شخص ہماری زبان کا ایک زبردست ادیب ثابت ہوگا۔ "ہمایوں"

کیا آپ نے کبھی ہوائی قلعے[1] بنائے ہیں؛ میں بچپن کی بات نہیں کرتا جب ساری زندگی ہی ایک ہوائی قلعہ معلوم ہوتی ہے، ماں کی گود میں جا بیٹھے اور پھر اُونگھتے اُونگھتے ایک دم پھُر سے چڑیا بن کر باغ میں سیب کے سفید سفید پھولوں پر جا بیٹھے اور وہاں سے چونچ نکال کر ماں کو ڈرانے لگے۔ دیکھو، دیکھو، اماں میں کتنی اونچی جگہ پر جا بیٹھا ہوں!

اور اماں ہنس کر پڑوسن سے کہتی ہیں "کس قدر بھولا ہے، نادان میری گود میں بیٹھا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بہت اونچی جگہ بیٹھا ہوں ——" اس کے بعد تمہیں پیار سے تھپک کر کہتی ہیں، "سو جاؤ، میرے ننھے۔"

—— اور تمہارا ہوائی قلعہ ٹوٹ جاتا ہے

یا یوں کہ رینگتے رینگتے آنگن میں چلے گئے، دیوار کے ساتھ تین اینٹیں لگا لیں، ایک تو ہے کالا کوا، وہ دیو سا جانور جو منڈیر پر بیٹھ کر اپنی خوفناک آواز میں چلایا کرتا ہے اور جو کبھی کبھی تمہیں اکیلا پا کر تمہارے ننھے ننھے ہاتھوں سے بسکٹ چھین لیا کرتا ہے، دوسری اینٹ بے شک تمہاری بڑی بہن ہے جو تمہیں ہر وقت چومنے پر مُصر رہتی ہے، جو تمہیں میٹھی بھی لگتی ہے اور تلخ بھی، میٹھی اُس وقت جب کھیلتے کھلاتے، ہنستے ہنساتے تمہیں ایک بارگی زور سے گلے سے لگا لیتی ہے اور تمہیں عجیب عجیب، پیارے پیارے ناموں سے بلاتی ہے، اور تلخ اُس وقت جب وہ تمہیں نہلانے کے لئے پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں ڈال دیتی ہے، یقیناً تمہیں پانی پسند نہیں، آخر تم ایک خشکی پر چلنے والے جانور ہو نہ کہ پانی کی مچھلی، اور پھر وہ صابن کا نمکین جھاگ جو ناک کے نازک نتھنوں میں، آنکھ کے پپوٹوں کے اندر پہنچ کر مرچیں سی لگا دیتا ہے! —— پھر کس سختی سے وہ ایک کھُردرا تولیہ لے کر تمہارے چھوٹے سے جسم کو صاف کرتی ہے حتّٰے کہ تمہارا سارا جسم لال ہو جاتا ہے، اور اس عمل کے دوران میں وہ برابر گنگنائے جاتی ہے، کوئی بے معنی گیت۔ اور پھر کوئی تھوڑا سا خوشبودار تیل لے کر تمہارے چھوٹے سے سر پر اس زور سے مالش کرتی ہے کہ تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی یہ نازک سا سر ٹوٹ جائے گا۔ مگر یہ بھی تم برداشت کر لیتے ہو، لیکن وہ اس پر بھی بس نہیں کرتی، بلکہ لکڑی کی ایک غاردار چپٹی سی شے لے کر وہ اُسے بار بار تمہارے گھنگر والے بالوں میں پھیرتی ہے

[1] "ہوائی قلعے" "خیالی پلاؤ" کا انگریزی مرادف ہے۔ "ہمایوں"

حتٰے کہ درد کی شدت سے تم بلبلا اُٹھتے ہو، اور حیران ہوتے ہو کہ وہ میری میٹھی بہن کہاں گئی، اور یہ کون ہے جسے مجھے رُلانے میں مزہ آتا ہے۔

تیسری اینٹ، تمہارا سب سے بڑا بھائی ہے، وہ تمہیں شاذ ہی دکھائی دیتا ہے، اکثر اُس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب ہوتی ہے اور آنکھوں پر ایک چمکتی ہوئی عینک، وہ تمہیں اُس وقت پیار کرتا ہے جب تم بالکل اکیلے ہوتے ہو، پہلے وہ اِدھر اُدھر دیکھ لیتا ہے کہ تم بالکل اکیلے ہونا اور پھر تم ابھی دل ہی دل میں حیران ہو رہے ہوتے ہو کہ یہ میرا اتنا اُونچا بھائی کیا کر رہا ہے اور اُس کی آنکھوں پر وہ دو گول گول سی چیزیں کیا چمک رہی ہیں کہ وہ تمہیں یکایک زمین سے اتنا اُونچا اُٹھا لے جاتا ہے گویا تم آسمان سے جا لگے ہو۔ وہ تمہیں ہوا میں پھینک دیتا ہے بہت اوپر کہ تم یکایک ڈر جاتے ہو، پھر وہ باہیں پھیلا کر تمہیں جھٹ آغوش میں لے لیتا ہے کہ تم خوشی سے ہنسنے لگتے ہو، تمہیں ہنستا دیکھ کر وہ خود بھی ہنسنے لگ جاتا ہے، وہ تمہیں گدگداتا ہے اور تم زور زور سے ہنسنا شروع کر دیتے ہو جس پر وہ تم سے بھی زیادہ زور سے قہقہے لگاتا ہے۔ اس شور و غل کو سُن کر گھر کے چار پانچ افراد اکٹھے ہو جاتے ہیں، خالہ، امّاں، باورچن، بڑی بہن اور اُس کی سہیلی، پھر وہ سب مل کر بڑے بھائی پر ہنستے ہیں اور بڑا بھائی شرمندہ سا ہو کر تمہیں جھٹ زمین پر اُتار دیتا ہے اور بھاگ کر اپنے پڑھنے کے کمرے میں چلا جاتا ہے اور کھٹ سے دروازہ بند کر دیتا ہے۔

اب ان تین اینٹوں ہی سے تم دن بھر کھیلتے ہو، تم بڑے بھائی کی عینک اُتار لیتے ہو اور اُسے ایک گائے بنا کر بہن کی چوٹی سے باندھ دیتے ہو، تم بڑی بہن کو صابون کے جھاگ سے بھرے ہوئے ٹب میں ڈال دیتے ہو، وہ چیختی ہے تم خوش ہوتے ہو اور کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہو، آنگن میں ایک طرف، کونے میں بیٹھی ہوئی اماں تمہیں دیکھ دیکھ کر مُسکراتی ہیں اور پھر تکلی پر سُوت چڑھا کر اُسے گھماتی ہیں۔ اتنے میں وہ پہلی اینٹ جسے تم گڑیا سمجھتے ہو، تمہارے ہاتھ سے بسکٹ چھین لے جاتی ہے، اور تم غصہ میں آکر اُسے دیوار سے ہٹا کر ایک طرف پھینک دیتے ہو اور بسورنے لگ جاتے ہو۔

اور امّاں پوچھتی ہیں "اُوں اُوں کیوں کرتے ہو۔ ابھی تو ہنس رہے تھے؟"

× × × × × × × × × ×

نہیں، نہیں، میں بچپن کے ہوائی قلعوں کی بات نہیں کرتا۔ میں تم سے لڑکپن اور جوانی اور بڑھاپے کے ہوائی قلعوں کا حال پوچھتا ہوں۔ کیا لڑکپن کی شرارتوں میں بھی تم نے بچپن کے پرانے کھیل کا اعادہ کیا ہے، بچپن کی زندگی تو ایک مسلسل حیرانی کی زندگی تھی ابا جان کے حقّے لے کر کونین کی پہلی پُڑیا تک ہر چیز حسین نظر آتی تھی۔ تم ایک مٹی کی گڑیا میں جان ڈال دیتے تھے، ایک لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہو کر تمام دُنیا کی سیر کر آتے تھے، ایک کاغذ کی ناؤ میں بیٹھ کر سات سمندر پار چلے جاتے تھے لیکن کیا لڑکپن میں تم اپنے اُس پرانے محبوب کھیل کو بھول گئے تھے؟ سچ کہنا، تم نے اپنے شرِ تخیّل کی مدد سے کتنی بار سکول کی عمارت کو آگ لگائی ہے حتٰے کہ اُس کے شعلے آسمان تک پہنچ گئے ہیں۔ کتنی بار اُس موٹے منحنگنے اُستاد کو کہ جو تمہیں تاریخ پڑھاتے وقت تمہارے بازوؤں میں

زور زور کی چٹکیاں لیا کرتا ہے، ایک اونچے کھجور کے درخت کے ساتھ اس طرح اُلٹا لٹکا دیا ہے کہ دُنیا بھر کی کوئی کوشش اُسے نیچے اُتارنے میں کامیاب نہیں ہوئی، اور پھر سکول کے سب اُستاد، ہیڈ ماسٹر سمیت (اور یہاں تم مسکراتے ہو!) تمہارے پاؤں پڑتے ہیں اور تم ایک دم اُچھل کر اُس اونچی کھجور کی آخری ٹہنی پر پہنچ جاتے ہو اور اپنے اُستاد کو چشم زدن میں نیچے اُتار لاتے ہو اور پھر وہ عمر بھر تم سے تاریخ کے سوال نہیں پوچھتا۔

یکایک تمہیں ہوش آجاتا ہے اور تمہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ تم اُسی موٹے ٹھنگنے تاریخ پڑھانے والے اُستاد کے عین سامنے بنچ پر جماعت میں بیٹھے ہو۔ اُس نے غالباً تم سے کوئی سوال پوچھا ہے مگر تم اُس کا کوئی جواب دینے سے قاصر ہو، کیسے دے سکو گے۔ جب کہ تم ایک دل خوش کن ہوائی قلعہ بنانے میں مصروف تھے کہ جس میں ایک کھجور کے درخت پر تم نے اِسی اُستاد کو اُلٹا لٹکا دیا تھا۔ تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس نے کیا سوال کیا ہے، تم لازماً خاموش رہ جاتے ہو،

پھر وہ تمہارے بازوؤں میں چٹکیاں لیتا ہے!

یا پھر ورزش کے میدان میں کھیلتے کھیلتے تمہیں یکایک احساس ہوتا ہے کہ تم سکول کے سب سے اعلیٰ کھلاڑی بن گئے ہو، تم ہاکی کھیل رہے ہو اور مخالف ٹیم پہ گول پر گول کر رہے ہو، چاروں طرف شامیانے لگے ہیں اور لوگ تمہیں دیکھ کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ اب آدھا وقت ختم ہو چکا ہے اور تمہیں چائے اور زنگترے، آڑو اور کیک پیش کئے جا رہے ہیں، تمہارا ہیڈ ماسٹر تمہیں شاباش کہتا ہے، یکایک سیٹی بجتی ہے اور اب تم ہاتھ میں کرکٹ کا ایک بلا لئے جا رہے ہو اور وکٹ پر پہنچ کر خوب زور سے ہٹ (Hit) لگاتے ہو، وہ مارا، گیند آسمان کی طرف اُچھلتی ہوئی میدان کو پار کر جاتی ہے اور لکڑی کے اُس بڑے سے تختے پر جو میدان کے باہر لگا ہے تمہارے نمبر کے آگے "چھ" کا ہندسہ لگ جاتا ہے اور تمہارے دوست حیران ہوتے ہیں، چھ! ارے ایک ہٹ (Hit) میں چھ! توبہ یہ لڑکا بھی ایک آفت ہے، ارے یہ تو چھپا رستم نکلا (اور یہاں تمہارے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے) اور تم اس طرح ہٹ پر ہٹ لگاتے ہو کہ مخالف ٹیم میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے اور تم لڑکوں کے کندھوں پر سوار ہو کر ———

ایں یہ کیا؟ یہ گیند کدھر چلی گئی، یہ شور و غل کیسا؟ یہ کپتان کیوں مجھ پر خفا ہو رہا ہے، اور اب تمہیں شرمندگی سے احساس ہوتا ہے کہ جب تم گول پر کھڑے کھڑے اپنے تخیل کی زریں دُنیا میں کھیل رہے تھے یکایک گیند تمہاری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر کر گول کو پار کر گئی!

کیا تم سو رہے تھے؟ (کپتان تم سے خفا ہو کر پوچھتا ہے)

تم سر جھکا لیتے ہو اور تمہارا ہوائی قلعہ مسمار ہو جاتا ہے۔

یا پھر یوں ہوتا ہے کہ تمہارا امتحان ہو چکا ہے اور نتیجہ نکلنے والا ہے، اور تم اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہو اور یقین کر لیتے ہو کہ تم

ہر مضمون میں اوّل ہو، نہ ہر مضمون ہی میں بلکہ ہر جماعت میں اوّل نکلتے ہو، آٹھویں سے نویں، نویں سے دسویں، ایف اے، بی اے، ہر جماعت میں وظیفہ حاصل کرتے ہو، اُس کے بعد آئی سی ایس، یا اپنے شہر کا سپرنٹنڈنٹ پولیس، وردی پہنے ہوئے، گھوڑے پر سوار، لوگ چاروں طرف سے سلام کر رہے ہیں اور تمہاری دستار کا سفید براق طرّہ ہوا میں لہرا رہا ہے، گھر پہنچتے ہو تو بینڈ بجتا ہے، والد فرطِ مسرت سے گلے لگا لیتے ہیں اور وہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا دُبلا پتلا لڑکا جو تمہاری جماعت میں تم سے اوّل رہا کرتا تھا اب تمہیں کیسی حاسدانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

مگر دوسرے دن جب نتیجہ نکلتا ہے تو تمہارے ہر ہم جماعت کو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ تم تو محض اپنے والد کے اثر و رسوخ سے پاس ہوئے ہو۔

× × × × × × × ×

آہ، میں تم سے جوانی کے ہوائی قلعوں کا حال کیونکر پوچھوں، میں جانتا ہوں وہ کتنے خوبصورت ہوتے ہیں، سیپ کے موتیوں کی طرح، کتنے نازک ہوتے ہیں، پانی کے شفاف بلبلوں کی طرح، کتنے پیارے ہوتے ہیں، محبوب کی نگاہوں کی طرح، اُن کی امنگیں تمہیں عرش کی بلندیوں پہ لے جاتی ہیں۔ اور دوسرے لمحہ میں زمین پر اُگی ہوئی حقیر گھاس کے قریب پہنچا دیتی ہیں۔ وہ دل میں سوئے ہوئے نغموں کو بیدار کر دیتے ہیں، جذبات کے دبے ہوئے سوتوں کو اُبلتے ہوئے چشموں کی صورت میں بہا دیتے ہیں، اور لرزتی ہوئی ناکام حسرتوں کو بجلیاں بنا دیتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ تم خارزار میدان میں اپنے بے ہوش محبوب کو اُٹھائے ہوئے چل رہے ہو، ہر قدم پر ایک نیا کانٹا تمہارے پاؤں میں چبھ جاتا ہے اور ایک نیا گھاؤ پیدا کر دیتا ہے، مگر تم ہو کہ پروا نہیں کرتے، سامنے اِک آگ کا دریا ہے، تم اُس میں سے بھی گزر جاتے ہو، تمہارے بال جھلس گئے ہیں، جسم پر آبلے پڑ گئے ہیں مگر تم اپنے محبوب کو اپنے دل میں چھپائے صحیح و سلامت، صاف بچا لے جاتے ہو، اب ٹھنڈی ہوا ہے، ایک خوشنما چمن ہے، پھولوں کی روشوں میں ایک مرمریں مسہری پر تم اپنے محبوب کو لٹا دیتے ہو، پھر تمہیں ایک سانپ ڈس لیتا ہے۔ محبوب کو ہوش آ جاتا ہے اور تم اُسے دیکھتے ہوئے مر جاتے ہو!

جوانی کے ہوائی قلعے کتنے عجیب ہوتے ہیں، اور بچپن اور لڑکپن کے قلعوں سے کتنے مختلف کئی پرانے ہوائی قلعے تھے کہ بچپن اور لڑکپن کے زریں عہدوں کی یادگار رہتے مگر ناساز گاریٔ زمانہ سے جوانی میں آ کر معدوم ہو گئے۔ وہ بچپن کا ساتھی، گُلّی ڈنڈا کھیلنے والا ہمجولی، جس کے ساتھ بیٹھ کر اپنے مستقبل کے متعلق ہوائی قلعے تعمیر کئے تھے، وہ آج کہاں ہے؟ بچپن سے لڑکپن تک وہ ساتھ دیتا آیا اب یکایک عنفوانِ شباب میں کیوں اس دُنیا سے رُوٹھ گیا اور یکایک سارے قلعوں کو مسمار کر گیا۔ وہ الھڑ، اینلی لڑکی جس سے بڑے چاؤ چاؤ سے چھوٹی عمر میں جھوٹ موٹ بیاہ رچایا تھا کیوں عین شباب کی سرمستیوں میں ایک بالکل انجان، ناواقف آدمی کی بیاہتا بن کر چلی گئی اور تمہارے کلیجے میں ناسور پیدا کر گئی، ہاں، جوانی میں آدمی بہت سے پرانے ہوائی قلعوں کو لوٹتا دیکھتا ہے، اور اُن کے

ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ اُس کے بچپنے کی معصومیت اور لڑکپن کی شوخی اور شرارت بھی رخصت ہوتی جاتی ہے۔

لیکن جہاں تم نے جوانی میں کئی پرانے قلعوں کو چشمِ پُرنم خیرباد کہی، وہاں تم نے بہت سے نئے نئے قلعوں کی تخلیق بھی کی، تم نے اپنی سانولی محبوبہ کی رنگت کو چنبیلی کے پھولوں کی طرح حسین بنا دیا، اپنی گرتی ہوئی پسماندہ قوم کو یکایک دُنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ طاقتور قوموں کے زمرے میں بٹھا دیا۔ اپنے غریب ملک کے جھنڈے کو اتنا بلند کر دیا کہ کائنات کی کُل وسعتیں اُس کے سائے تلے آگئیں، اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے کی جگہ ایک جگمگاتا ہوا زمرد و لعل و جواہر کا محل تعمیر کیا اور اپنے کیرکٹر کو اتنا سنوارا کہ نوعِ انسان نے متفقہ ووٹ سے تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کیا۔ تم دُنیا کے سب سے بڑے شاعر، ادیب، افسانہ نویس، سیاست داں، سپاہی، حکیم اور مصلح کہلائے اور شہرتِ دوام کا تاج تمہارے سر پر رکھا گیا!

لیکن ان سب باتوں کے باوجود تمہاری آنکھ اُس وقت کھُلی جب تم ایک حقیر سے دفتر میں ایک حقیر سی نوکری حاصل کر کے، ایک حقیر سے مشاہرے پر ملازم ہوئے، تمہارے ماں باپ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور تمہارے پلّے ایک چڑچڑی اور بے حد وفادار بیوی باندھ گئے۔ محبت کے سوتے خشک ہو گئے، پھونس کے جھونپڑے جل گئے، اور تمہارے ملک و قوم غریب تر ہوتے گئے!

× × × × × × × × × × ×

مگر اتنا کچھ ہونے پر بھی ہوائی قلعوں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے، جوانی کے بعد پیری آئی، اب پچھلے سب قلعے معدوم ہو چکے، اپنے لئے کچھ باقی نہیں، اب توجہ دوسروں کی طرف ہے، بوڑھے باپ نے قلعے بنائے اپنے جوان بیٹے کے لئے۔ بوڑھی ماں نے اپنے لرزتے ہوئے تخیل میں اپنی جوان بیٹی کے خاوند کو دیکھا کہ اُس کے گھوڑے کی رکابیں موتیوں سے گندھی ہوئی ہیں، آسمان سے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے، اپسرائیں ناچ رہی ہیں اور اُس کے خوبصورت داماد نے اپنا سر ساس کے پیروں میں رکھ دیا ہے۔

نوجوان پوتے نے دادا کے نام پر ایک بہت بڑا ہسپتال تعمیر کیا ہے جس میں دُنیا بھر کے گنٹھیا کے مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے، کیونکہ دادا کو خود گنٹھیا کا مرض ہے اور وہ ڈاکٹروں کو فیس دیتے دیتے تنگ آ گئے ہیں۔

خدائے برتر نے ستّر سال سے زیادہ عمر کے بوڑھوں کے سب گناہ بخش دیئے ہیں، ان میں بوڑھے دادا بھی شامل ہیں، وہ خوشی سے ناچنا چاہتے ہیں مگر گنٹھیا کی وجہ سے نہیں ناچ سکتے، وہ گانا چاہتے ہیں مگر زبان پر لکنت طاری ہو جاتی ہے، سُننا چاہتے ہیں مگر ساری کائنات پر یکایک ایک بسیط خاموشی چھا جاتی ہے، پھر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا یا روشنی ہی روشنی، یا پانی ہی پانی، پھر اُنہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمٹ رہے ہیں، سکڑتے ہوئے، سمٹتے ہوئے، صرف ایک ذرہ بن کر رہ گئے ہیں، اندھیرے کا ایک ننھا سا ذرہ، روشنی کی ایک چھوٹی سی کرن، پانی کی پتلی سی لہر! ——

اس طرح ہوائی قلعے بناتے بناتے زندگی گزر جاتی ہے۔

کرشن چندر۔ ایم۔ اے

آغازِ جوانی

سبز کھیتوں کے کنارے جھاڑیوں کی آڑ میں
مَیں خدا جانے پڑا رہتا ہوں کس کی تاڑ میں

جب کسی وادی میں سُن لیتا ہوں چرواہوں کے راگ
میرے سینے میں بھڑک اُٹھتی ہے کیوں میٹھی سی آگ

پَو پھٹے دہقان جب جاتے ہیں اپنے کھیت میں
کیف سا محسوس کیوں کرتا ہوں ٹھنڈی ریت میں

دوپہر کو جب خموشی چھا رہی ہو چار سُو
کیوں اُبل کر مضطرب کرتا ہے رگ رگ کو لہُو

دِن ڈھلے جب سو رہے ہوں لوگ بڑ کی چھاؤں میں
کیوں پھرا کرتا ہوں آوارہ سا اپنے گاؤں میں

شام کو پنگھٹ پہ جب جاتے ہیں حوروں کے پرے
مَیں کھڑا رہتا ہوں کیوں ہاتھوں کو سینے پر دھرے

گاؤں کی معصوم دوشیزائیں جب آئیں کہیں
غرق ہو جاتی ہے کیوں میری پسینے میں جبیں

نیند اُڑ جاتی ہے کیوں آنکھوں سے کالی رات میں
دِل مرا انگارہ بن جاتا ہے کیوں برسات میں

جب شفق کی دھندلی دھندلی سُرخیاں آئیں نظر
کیوں سمٹ کر ٹوٹنے لگتا ہے سینے میں جگر

اِس میں اِک بے نام سی امید ہے شعلہ طراز
آہ میں خود بھی سمجھ سکتا نہیں اِس دِل کا راز

زندگی میں دیکھیے آئیں گے کیا کیا انقلاب !
ابتدا یہ ہے تو کیا ہوتا ہے انجامِ شباب !

احمد ندیم قاسمی بی اے

ادائے فرض

وہ مسکرا کر گردن ضرور ہلا دیتے، لیکن اپنے جی میں بہت بیچ و تاب کھایا کرتے تھے۔" ابھی کل کا رنگروٹ ہے، لیکن مجھ خرانٹ سب انسپکٹر کو بنانا چاہتا ہے، نہیں جانتا کہ میرا نام صلاح الدین ہے، میں وہ ہوں جس کی دھاک پانچ ضلعوں میں بندھی ہوئی ہے، جہاں گیا لوگوں کو ہلا دیا، جنرل صاحب تک میری خدمات کا اعتراف کرتے ہیں، پولیس گزٹ میں مجھے کامیاب سب انسپکٹر لکھا گیا تھا، لیکن یہ لونڈا مجھے بناتا ہے، جہاں ملتا ہے، جتنی مرتبہ ملتا ہے، تن کر کھڑے ہو کر مجھے سلامی دیتا ہے!"

جس وقت کانسٹبلی کی تین خالی آسامیوں کے لئے درخواستیں طلب کی گئی تھیں، تو تین ہزار اُمیدواروں نے اپنی عرضیاں پیش کی تھیں انہیں اُمیدواروں میں سے ایک یوسف بھی تھا، یونیورسٹی کی سند حاصل کر چکا تھا، اپنے نام کے بعد بی۔اے لکھتا تھا، اول درجے میں کامیاب ہوا تھا، بایں ہمہ جس شعبے، جس محکمے، جس ادارے میں ملازمت کی اُمید لے کر جاتا تھا، وہاں سے خشک جواب پاکر اپنی مایوسیوں میں اضافہ کر لیتا تھا۔ اس کے والد شیخ ہدایت تحصیل کے مذکوری تھے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر تعلیم دلائی تھی۔ ہمیشہ اُمید کرتے رہتے تھے کہ میرا لڑکا نائب تحصیلداری پر ضرور فائز ہوگا لیکن کمشنر صاحب نے یوسف کو نائب تحصیلداری کے لئے منتخب ہی نہ کیا۔ اسی واسطے اٹھارہ روپے کی کانسٹبلی کے لئے اُمیدوار کھڑا ہوا۔ اور اس کا نام عرض گزاروں کی فہرست میں سے چُن لیا گیا۔ وہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے روبرو پیش کیا گیا، دوڑ میں سب سے اول رہا۔ درخت پر سب سے تیز چڑھا۔ تیراکی کے مقابلے میں اپنے کمالِ فن کی سب سے داد لی۔ ہاکی کھیلنے میں بھی اوّل نمبر رہا۔ اسی طرح سینے کی کشادگی، قامت کی طوالت دیکھ کر تو سپرنٹنڈنٹ مسٹر ڈیوس بہت مطمئن ہو گئے۔ اور اسے پولیس نہیں بلکہ فوج کے قابل بتایا۔

پہلے دن جب اس نے پولیس کی خاکی وردی اور لال ٹوپی ناصافہ سر پر رکھا تو اسے بہت حجاب آیا، اور وہ اپنی بدقسمتی کا ماتم کر ہی رہا تھا کہ صلاح الدین صاحب ادھر آ نکلے اور اس سے کہا ـــــ " اماں یوسف! ذرا میرا گھوڑا مل دینا۔ اسے برش اور کھرا کر دینا!" اگر وہ دو چار دن بعد کہتے تو یوسف گھوڑا مل بھی دیتا، کھریرا بھی کر دیتا، گھوڑے کو تالاب پر نہلانے کے لئے، اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر لے بھی جاتا۔ لیکن نوگرفتار تھا، گریجوایٹ تھا، اسے اپنے کانسٹبل ہونے ہی پر جھینپ آ رہی تھی، وہ بھلا کیسے ان کا گھوڑا مل سکتا تھا اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ صلاح الدین صاحب خاص مجھ ہی سے جو یہ کام لینا چاہتے ہیں اس میں ان کا حُسنِ نیت شامل نہیں ہے چنانچہ اس نے سلامی تو ضرور دی، مگر گھوڑا نہیں ملا، اور ان کا حکم ٹال دیا۔

دوسرے دن اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے صرف رام توکل سے علیحدگی میں کہا تھا کہ "ہم سائیس تھوڑا ہی ہیں، ہم تو سرکاری ڈیوٹی کرنے آئے ہیں، نجی کام کرانا ہے تو اور نوکر رکھ لیں۔ الاؤنس بھی تو ملتا ہے۔" چنانچہ علی الصباح قواعد لیتے وقت صلاح الدین انسپکٹر نے یوسف سے کہا ——— مسٹر یوسف ذرا ٹانگیں سیدھی کر کے کھڑے رہئے۔ ٹیڑھی ٹانگیں کر کے یہ سرکاری ڈیوٹی نہ کیجئے، یا یہ بھی میرا نجی کام ہے جس کے لئے میں اور نوکر رکھ لوں!"

اس کے بعد پھر کبھی یوسف سے سرکاری ڈیوٹی کے علاوہ نجی کام کے لئے نہیں کہا گیا۔ جاڑوں کی رات کے آخری حصے میں شہر کا گشت تو اس کے واسطے پیٹینٹ ڈیوٹی ہو چکی تھی۔ ضلع کا صدر مقام اور چالیس میل مربع کا جنگلی علاقہ اسی تھانے سے ملحق تھا، لہٰذا دُور دراز موضعوں میں جو بدمعاش اور سزا یاب نگرانی یافتگان رہتے تھے اور جن کے اسمائے گرامی پولیس کی اہم کتاب یادداشت میں آب زر سے لکھے ہوئے تھے، اُن کی جانچ کرنے، انہیں سوتے سے جگانے کی سرکاری ڈیوٹی یوسف کو بیش از بیش تفویض ہوتی تھی ہولناک صحرائیت، پیادہ پا سفر، سوائے خدا کے کوئی رفیق نہیں، بارہا شیر راستہ کاٹ کر چلا گیا، بارہا سانپ کو روندتے روندتے رُک گیا، بارہا بخیالِ خویش آسیب نظر آئے، لیکن وہ بکا جی کر کے چلا ہی جاتا تھا۔

حکم منگا لیا گیا تھا۔ اس کے بموجب تھانے کے حدود کی گھاس چھیلنے کا کام یوسف کو کرنا پڑتا تھا۔ صبح اس کے ہاتھ میں کھرپی ہوتی تھی اور وہ جھکے جھکے گھاس چھیلا کرتا تھا۔ وہ بندوق سیدھی طرح اُٹھانا نہیں جانتا، اس کے کوٹ کے بٹن میلے رہتے ہیں اور اگر میلے نہیں بھی رہتے تو چمکدار نہیں رہتے۔ اس کی گرانڈ گھوڑی ٹھیک نہیں رہتی۔ اسی قسم کے اعتراضات اس کی کتاب میں انسپکٹر صاحب قلم بند کرتے رہتے تھے۔

(۲)

ہیڈ کانسٹبلی کا امتحان سر پر آ پہنچا۔ وہ چپکے چپکے ضابطہ فوجداری، تعزیرات ہند اور پولیس مینویل ازبر یاد کرتا رہتا تھا۔ اسے اُمید تھی کہ وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ اور پھر وہ پولیس ٹریننگ میں سب انسپکٹری کی تربیت کے لئے بھیجے جانے کی ضرور درخواست دے گا لیکن جس دن کا اسے سخت انتظار تھا جب وہ دن آیا، اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ہاں کا آیا ہوا لمبا پیلا لفافہ چاک کر کے ہیڈ کانسٹبلی کے امتحان میں بھیجے جانے والے کانسٹبلوں کے نام کے حکمنامے سنائے گئے تو ان میں یوسف کے نام کوئی حکم نہیں تھا، باوجودیکہ صلاح الدین صاحب نے شیخ ہدایت کے جھک جھک کر سلام کرنے اور عاجزانہ التجائیں کرنے کے جواب میں بارہا تشفی دی تھی کہ بے شک یوسف میرا بچہ ہے اور میں ضرور اس کا خیال رکھوں گا، اور ان کے بقول امتحان میں بھیجے جانے والوں کی جو سفارش لکھی تھی، اس میں سب سے اوّل یوسف ہی کا نام لکھ کر بھیجا تھا، مگر خدا جانے کیوں اس کا نام ڈی۔ ایس۔ پی صاحب نے خود ہی حذف کر دیا، جس کا صلاح الدین صاحب کو بھی بڑا صدمہ ہے۔ البتہ جن کے نام حکم صادر ہوا تھا وہ تھے، جمنا پرشاد، رام توکل اور غیرہ۔

اس دن جب یوسف اپنے گھر کھانا کھانے گیا تو اسے کھانا اچھا نہیں لگا۔ اپنی سب سے چھوٹی بہن بتول کے واسطے بازار سے جو مٹھائی لے گیا تھا وہ چپ چاپ گھر میں رکھ دی، خود نہیں کھلائی، اور باہر آ کر اس پتھر پر بیٹھ گیا جو چھ فٹ طویل تین فٹ عریض اور ایک فٹ دبیز تھا، اور تمام اہلِ محلہ کے فرصت کے اوقات میں حقہ پینے اور ایک دوسرے سے خبریں سننے سنانے کے لئے بیٹھنے کے بنچ کا کام دیتا تھا۔

اب آئندہ سال پر بات گئی، چاند ماری میں اس کا نشانہ کتنا بہترین تھا! خود صدر انسپکٹر صاحب نے اول نمبر کا سرٹیفکیٹ دیا تھا۔ بھوندو قزاق کو مع اس کی بندوق کے گرفتار کرا دیا تھا، لیکن صلاح الدین صاحب نے "تابعدار کی کوششوں سے" کا فقرہ لکھ کر بھوندو کی گرفتاری کا کارنامہ اپنی جانب منسوب کر دیا تھا، تاہم اس اُمید پر یوسف نے چون وچرا نہیں کی تھی کہ ان کی سفارش کی ضرورت پڑے گی۔ اور اس طرح وہ انعامی رقم سے بھی محروم رہ گیا تھا۔ جمنا پرشاد، رام توکل اور عبدو کی قابلیت سے وہ اپنی حالت کا مقابلہ کرنے لگتا تو اسے ٹھنڈے سانس بھرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا تھا، جمنا پرشاد ایک وقت سرکاری کام میں اغماض برت لیتا تو کوئی مضائقہ نہیں تصور کیا جاتا تھا۔ البتہ تھانیدار صاحب کے دونوں بچوں کو جو بڑھاپے کی اولاد ہونے کے باعث انہیں نہایت عزیز تھے، گود میں لئے لئے پھرتا تھا۔ بلاناغہ بازار لے جاتا تھا۔ اور واپسی کے وقت ان کی جیبوں میں گاجر، کشمش، چلغوزے اور اخروٹ بھروا کر لے آتا تھا اور تھانیدار صاحب ہی کے سامنے پہنچ کر اگر بچے نہ کھاتے ہوتے تو خود نکال کر چھیل چھیل کر کھلایا کرتا تھا۔ رام توکل کی ماں سے تھانیدارن صاحبہ جن کو تمام پولیس لائن "مائی جی" کہتی تھی، بہت خوش رہتی تھیں۔ اور وہ خوش کیوں نہ رہتیں جب کہ برتنوں کی منجھائی، جاروب کشی، ننھے کے پوتڑوں کی دُھلائی سے لے کر مائی جی کی جوئیں دیکھنا، نہاتے وقت مائی جی کی پیٹھ کی جھاویں سے مالش کر کے میل کی موٹی موٹی بتیاں نکالنا، گیہوں چن دینا اور دال دلنا، آٹا پیسنا انجام دیتی تھی۔ عبدو کی عورت صبح وشام دس گھڑے پانی کنوئیں سے بھر کر لا دیتی تھی۔ اور یوسف یا اس کے کوئی عزیز داروغہ صاحب کی لکڑیاں تک نہ چیرتے تھے، رام توکل کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ جب داروغہ صاحب کے ساتھ دورے پر جاتا تو یوسف یا اور سپاہیوں کی طرح ان کے پیسے خرچ نہ ہونے دیتا تھا۔ بلکہ پہنچتے ہی تحقیقات کی جگہ تحقیقات رہنے دیتا۔ دودھ، گھی، مرغی اور باریک سے باریک، خوشبودار سے خوشبودار چاول کی بہمرسانی کا پہلے بندوبست کرتا، اور داروغہ صاحب کو کروٹ لیتے وقت چارپائی کے بان نہ چبھیں اس لئے بستر کے نیچے بہت اونچا پیال بچھا دیتا تھا۔ نہ محض یہ بلکہ جب دورے سے واپس آتے تو رام توکل سے کہنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ کسی گاؤں کے چوکیدار کے سر پر دودھ کا پیتل والا برتن رکھا لیتا۔ دوسرے گاؤں کے چوکیدار کے سر پر گنے کے رس کا گھڑا رکھواتا، کیونکہ مائی جی نے چلتے وقت کہہ دیا تھا کہ "ارے رام توکل آتے آتے رس تو لائیو! اب کی بار رساول کھانے میں نہیں آئی ہے! ماٹی ملا دو پیسے کو انڈا شہر میں بکتا ہے، درجن دو درجن انڈے لیتے آنا۔ ایک آدھ مرغی کا بچہ بھی مل سکے تو کمی نہ کیجو کیونکہ نگوڑا کمر میں ہمیشہ درد رہتا ہے، حکیم جی نے چوزہ بتایا ہے۔"

رام توکل مائی جی کے تمام احکام کی متابعت کرتا ہے۔ لیکن یوسف کو وہ طریقے بھی نہیں معلوم جن پر کاربند ہونے سے ایک پولیس والا کامیاب پولیس والا بن سکتا ہے۔ اسی لئے رام توکل یوسف کی چھیڑ خانی کرتے کرتے کہہ اُٹھتا تھا ـــــ پڑھے پھارسی بیچے تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل!

(۳)

ملک کے تمام اہم مقامات میں انارکسٹوں کی کارروائیوں کے باعث بہت سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ ڈپٹی کمشنر کے مشورے سے مسٹر ڈیوس سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اپنے ماتحت افسروں کو پروانہ بھیجا ہے کہ ضلع کچہری میں جہاں خزانہ رہتا ہے، ہوشیار پہرے دار مقرر ہوا کریں۔ شب گشت کے لئے جو انسپکٹر نکلیں وہ خزانے کے پہرے دار کو دیکھیں، اگر ٹہلتا ہوا نہ پایا جائے، اگر آیند و روند کو اپنے مخصوص جملے کے لئے ذریعہ نہ ٹوکے، اگر بندوق بھری ہوئی کاندھے پر نہ رکھے ہو تو اس کی فوری رپورٹ کی جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حکم نافذ کیا گیا تھا، جس کے لئے غالباً لوکل گورنمنٹ کی منظوری منگالی گئی ہوگی کہ جو مشتبہ اشخاص ٹوکنے پر بھی نہ بولیں، ان پر فیر کر دیا جائے۔

صلاح الدین سب انسپکٹر نے رپورٹ کی تھی، سب سے قابل اور تعلیم یافتہ یوسف ہے جو آنے جانے والوں کو عمدگی سے ٹوک سکتا ہے اور بہت شب بیدار ہے لہٰذا حکم عطا فرمایا جائے کہ اسے مستقلاً ایک ماہ کے لئے رات کے آٹھ بجے سے تین بجے تک پہرہ دار خزانہ مقرر کر دیا جائے۔ جب کپتان صاحب نے صلاح الدین انسپکٹر کو بلا کر، مسکراتے ہوئے صرف یوسف ہی کو ایک ماہ تک یہ ڈیوٹی ادا کرنے کے بارہ میں دریافت کیا تھا تو انسپکٹر نے اپنے مخصوص بھولپن کے ساتھ کہا تھا ـــــ حضور یوسف گریجوایٹ ہے، انگریزی داں ہے۔ اور سپاہی ہرچند سمجھانے کے باوجود "ہالٹوکم سنٹیر" ہی کہتے ہیں اور وہ کہتا ہے "ہالٹ ... ہو ... کمز ... ڈیئر!"

یوسف کا تقرر ہو گیا۔ جب سارا عالم سائیں سائیں کرتا، وہ کاندھے پر بندوق رکھ کر ادھر سے اُدھر تک اُدھر سے اِدھر تک ٹہلتا رہتا تھا جو لوگ پاس سے گزرتے وہ اتنی بلند آواز سے ٹوکتا تھا کہ خزانے کے آہنی سلاخوں والے مقفل دروازہ، اندر کی تجوریاں، اور کچہری کی عمارت تک گونج اُٹھتی تھی۔ اس کے جواب میں لوگ کہتے جاتے تھے "رعایا" یا "رعیت"۔ تین بجے کے وقت بدلی والا پہرے دار آتا اور چارج لے کر خود ٹہلنے لگتا تھا۔ رات کو انسپکٹر صلاح الدین کبھی گیارہ بجے، کبھی دس بجے، کبھی دو بجے، گشت کرتے ہوئے خزانے کے پہرے دار کے قریب ضرور آتے تھے۔ لیکن تین بجے کے بعد وہ بھلا کیا گشت کر سکتے تھے؛

یوسف شام کو تو مونگ پھلی، پینڈ کھجور یا بھُونے ہوئے چنے پھیری والے سے لے کر کھا لیتا تھا، لیکن کھانا رات کے نو بجے سے پہلے نہیں کھاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گھر میں بجز اس کی ضعیف والدہ کے کھانے پکانے والا اور کوئی نہیں تھا۔ اور پھر ان ضعیف والدہ کو بھی شب کوری کا مرض تھا۔ یوسف کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ پھر یوسف کا چھوٹا بھائی، شام کو ہاکی کھیل کر آتا، اسکول کا سبق یاد کر چکتا جب کہیں بصد مشکل "اے بیٹا کھانا دے آ، ارے بیٹا کھانا دے آ"! پر جھنجھلا کر منہ بنا کر اُٹھتا۔ جھٹکے کے ساتھ بندھا ہوا کھانا اُٹھاتا اور

خزانے جاکر کھانا لے آتا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں ہاکی کھیلنے سے نہیں بلکہ کچہری تک جانے آنے سے ہمیشہ درد ہوا کرتا تھا، اسی لئے شیخ ہدایت سے اس نے سائیکل کی فرمائش بھی کی تھی، لیکن قلیل تنخواہ میں سے بمشکل روپیہ پس انداز ہوتا تھا، اس لئے "اب کی مرتبہ نہیں آئندہ ضرور سائیکل لادوں گا بیٹا!" کہہ کر شیخ ہدایت اسے ٹال جاتے تھے۔

بڑوں کو دیکھ کر چھوٹے بھی پیروی کرتے ہیں۔ اس اصول پر چھوٹا سا ضلع بھی چل رہا تھا۔ دسہرے کا موقع، کالی کا جلوس مسجدوں کے سامنے سے باجا بجاتے نکلنا، اور صرف باجا بجتے نکل جانا جن کی مسجدوں کے احترام کو صدمہ پہنچاتا تھا، ان سے آویزش ہوگئی وکیلوں کا طبقہ ساتھ چل رہا تھا۔ ان کے پیچھے باجا بجتا جا رہا تھا۔ باجے والوں کے عقب میں کالی کی مورت ایک سنگھاسن پر بیٹھی ہوئی تھی، اور اس مورت کے گرد و پیش ہزاروں شیدائیوں کا جلوس تھا۔ "جگدمبا دیوی کی جے!" تک تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن خالص مذہبی جلوس میں جب بندے ماترم اور مہاتما گاندھی کی جے کے نعرے لگائے گئے تو مسجد والوں کے کان اور بھی کھڑے ہوگئے تھے۔ پھر جب انہیں حنائی داڑھی والے پشاوری ملا گل محمد خان نے بھڑکایا تو "یاعلی، یاعلی! دین! دین!" کہہ کر گلے میں چاندی کے چوڑے چکلے تعویذ ڈالے ہوئے نوجوان پینترے بدل بدل کر سڑک پر آگئے اور باجے والوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ جگدمبا مائی کا سنگھاسن مارے خوف کے گر پڑا اور جب دودھ پانی کی ہوچکی تو مجمع بھاگ کھڑا ہوا۔ مولوی گل محمد خان آگے تو نہیں آئے، البتہ مسجد کے مینار پر سے "کاپر مارو! کاپر مارو!" کی رٹ لگا دی۔ اب صدائے احتجاج کس طرح بلند کی جائے: اخباروں کو تار دیئے جائیں، گورنر کو اپنے غم و غصے کا علم و یقین پیدا کرانے کے لئے عین مسجد کے سامنے کالی کی مورت، بانس کا کاغذ منڈھا ہوا سنگھاسن، ملگجے پھول ہار، سب پڑے رہنے دیئے جائیں، موٹر، سائیکل، ٹانگے اس تودے کے باعث رکیں گے تو آپ ہی گورنمنٹ کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھل جائیں گی! خود گورنمنٹ اسے ٹھنڈا کرنے کی کارروائی عمل میں لائے گی۔

ہنومان اکھاڑے اور علی غول کی جب نیند اچاٹ ہوئی تو باہم زور آزمائی ہونے لگی۔ اور وہ اپنے کمالِ فن کی داد دینے لگے۔ ہندو محلے، مسلمان محلے کی قدرتی تقسیم کے بموجب اکا دکا راہگیر پٹنے لگے، اور اس طرح رستم و سہراب کی یاد دس دن تک تازہ ہوتی رہی۔

پولیس کے انسپکٹر جنرل صاحب دورے پر آئے ہوئے تھے۔ اور کمشنر صاحب ملک کے دونوں بچھڑے ہوئے بھائیوں کو گلے ملانے کا اہم فریضہ اپنے ذمے واجب سمجھ کر سرکٹ ہاؤس میں تشریف فرما تھے۔ اس وقت ہندو مسلم اکابر سرکٹ ہاؤس میں ایک مصالحتی بورڈ کے قیام کے سلسلے میں مدعو تھے، چھوٹا سا سول لائن، چھوٹی بستی، چھوٹی کچہری، اس لئے تمام لوگ خزانے کے پاس ہی گزر رہے تھے، یوسف ہر ایک کو ٹوکتا جاتا تھا۔

ادھر جلسہ ہو رہا تھا۔ دھواں دھار تقریریں اور پُرزور خطابیات سے سرکٹ ہاؤس کے در و دیوار گونج رہے تھے۔ ادھر یوسف کمر بستہ بندوق کاندھے پر رکھے ٹہل رہا تھا۔ چاندنی کہر آلود تھی، جیل کا گھنٹہ ساڑھے نو بجا رہا تھا۔ اسی وقت کوئی شخص سیاہ لبادہ اوڑھے ہوئے سیدھا خزانے کے رخ چلا آرہا تھا۔ جب وہ دو سو گز کے فاصلے پر تھا تو یوسف نے کہا —— "ہالٹ ہوکمز دیئر!" لیکن اس نے

کوئی جواب نہیں دیا۔ جب وہ ڈیڑھ سو گز پر پہنچا تو پھر یوسف نے اپنے انتباہی نقرات کا اعادہ کیا، لیکن اسے جواب نہ ملا۔ سو گز پر پہنچنے کے بعد بھی اس نے ٹوکا مگر آنے والے انسان نے خاموشی میں جواب دیا۔ تین مرتبہ سے زیادہ ٹوکنے کا حکم نہیں تھا لیکن یوسف کا دل نہ مانا اور اس نے ایک مرتبہ پھر اُردو میں کہا —— "کھڑا رہ کون آتا ہے؟" اور اتنی زور سے کہا کہ سرکٹ ہاؤس میں اہلِ جلسہ نے بھی سُن لیا ہوگا۔ مگر اس پُراسرار شخص نے مطلق التفات نہ کیا۔ وہ چلا ہی آرہا تھا۔

یوسف نے چند سیکنڈ تک تامل کیا۔ اسی درمیان میں اس کے ذہن میں ہزاروں خیالات گردش کر گئے۔ اپنی زندگی میں آدمی پر بندوق چلانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ایک طرف تھا رحم اور درگزر اور دوسری جانب ادائے فرض۔ آئندہ پیش آنے والے ہولناک نتائج سوچ کر یوسف کانپ اُٹھا۔ جب اس نے بندوق چھتیائی تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، حواس بجا نہیں تھے، وہ نہیں سوچنا چاہتا تھا کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں۔ زور سے دھماکا ہوا، بندوق چل چکی تھی۔ اسی کے ساتھ انسانی چیخ سنائی دی۔ پھر آنے والا انسان فرشِ خاک پر پڑا ہاتھ پاؤں پٹک رہا تھا۔

تمام سول لائن میں تہلکہ مچ گیا۔ سرکٹ ہاؤس کا جلسہ درہم برہم ہوگیا۔ اور سب دوڑ پڑے۔ پولیس کے روند والے انسپکٹر اور سپاہی پے در پے سیٹیاں بجاتے جاتے تھے اور قریب تر ہوتے جا رہے تھے، یوسف اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہٹا۔ وہ اسی مقام پر ٹہل رہا تھا جو اُس کے لئے مخصوص تھا۔ وہ بندوق کاندھے پر رکھے رکھے ہر شخص کو "ہالٹ ہُو کمز دیر" کہتا جاتا تھا۔

تھوڑی دیر میں کمشنر، انسپکٹر جنرل، ڈپٹی کمشنر، اسسٹنٹ کمشنر، تحصیلدار، سرکل انسپکٹر، سب انسپکٹر وغیرہ اور چند ہندو مسلم لیڈر وہاں آکر جمع ہو چکے تھے۔ مجروح کو اُٹھا کر خزانے والے پہرے دار کے قریب لایا گیا۔ اور جونہی کمشنر صاحب کی بیٹری کی شعاع اس کے چہرے پر پڑی، تحصیلدار نے چونک کر کہا —— "ہیں شیخ ہدایت ہماری تحصیل کا مذکوری!"

یوسف پر گویا بجلی گر گئی ہو۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑا ہی رہ گیا۔ ہر شخص متالم بھی تھا اور یوسف کے ادائے فرض کے احساس کا معترف بھی۔

(۴)

سول سرجن نے عمل جراحی کیا۔ شیخ ہدایت کی بائیں ٹانگ میں سے گولی برآمد کی۔ لیکن چونکہ ہڈی ریزہ ریزہ ہوگئی تھی، اس لئے ٹانگ کاٹ دی گئی۔

پائنیر کے نامہ نگار نے ادائے فرض کی حیرت انگیز مثال کے عنوان سے اپنا برقیہ شائع کرایا۔ کمشنر اور انسپکٹر جنرل نے یوسف کی تعریف کی اور تمام ہندو مسلم زعما نے اسے سراہا۔ دوسرے ہی دن تمام شہر کے گلی کوچوں میں، دُکان دُکان پر، گھر گھر میں، یوسف کا واقعہ زباں زد تھا۔ صلاح الدین انسپکٹر سے مائی جی نے بھی پوچھا تھا —— تو انہوں نے حقہ پیتے پیتے بگڑ کر کہا تھا —— "ہاں جو کچھ تم

گھر میں بیٹھنے والی عورتوں نے سُنا ہے سب درست ہے؟"

شیخ ہدایت کو کم سنائی دیتا تھا، اس دن ان کا چھوٹا لڑکا کھانا لے کر نہیں گیا تھا۔ اس لئے وہی گئے تھے۔ اور یہ سانحہ رُونما ہُوا۔

انہیں بوجہ ناکارہ ہوجانے کے پنشن دے دی گئی اور کچھ انعام بھی ملا۔ لیکن یوسف کی طبیعت پر اتنا اثر ہُوا کہ وہ بیمار ہوگیا، اور دو ماہ تک صاحبِ فراش ہی رہا۔ اس نے پولیس ہسپتال میں پڑے پڑے اپنا استعفا بھی داخل کردیا تھا، لیکن خود ڈسٹرکٹ پولیس سپرنٹنڈنٹ پولیس اس کا استعفا لے کر بیمار پُرسی کو آئے تھے، اور کہا تھا ــــ یہ کیا بیوقوفی کرتے ہو۔ لڑکپن کی باتیں کر رہے ہو! لو اپنا استعفا واپس لو۔ تمہاری ترقی کی راہیں کُھل چکی ہیں"۔

یوسف آبدیدہ ہوگیا تھا ــــ اور کہتا تھا ــــ "حضور والا! میرے دل پر سے اس گناہ کا بار ہلکا نہیں ہوسکتا۔ جو اپنے باپ کو زندگی بھر کے لئے اپاہج کرنے سے عائد ہوتا ہے۔ میری والدہ اور والد سے آنکھیں چار کرتے ہوئے انتہائی ندامت محسوس ہوتی ہے"۔

اس کی گریہ وزاری سُن کر سپرنٹنڈنٹ صاحب کی طبیعت بھی بھر آئی تھی۔ لیکن شیخ ہدایت نے زہرخند کے ساتھ کہا تھا ــــ حضور بھلا یہ پاگل نہیں تو کون ہے! کیا اس نے جان بوجھ کر مارا تھا؟ اے یوسف بخدا اگر تو سرکار کی ڈیوٹی ادا کرتے ہوئے مجھے مار بھی ڈالتا تو میں بُرا نہ مانتا۔ قصور تو میرا ہی تھا"۔

یوسف کی بوڑھی اماں پردے کی آڑ میں بیٹھی سُن رہی تھیں۔ ان سے نہ رہا گیا وہ بولیں ــــ "اب حضور ہی مائی باپ ہیں۔ میرا بچہ اس دن سے بہت ہراساں ہے۔ اس نے بھلا کاہے کو ایسے تماشے دیکھے تھے"۔

پھر سپرنٹنڈنٹ صاحب، سول سرجن، سرکل انسپکٹر وغیرہ نے استعفا یوسف کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیا، اور کہا "تم ایسی بے وقوفی ہرگز نہ کرنا"۔

اس کی علالت ہی کے دَوران میں یوسف کے لئے شاہی پولیس میڈل آیا۔ جنرل صاحب نے کمشنر صاحب کے مشورے سے طے کیا اور حکم بھیجا کہ یوسف کا رویہ انتہائی وفادارانہ دیکھتے ہوئے لوکل گورنمنٹ ازرہِ خوشنودی اسے سب انسپکٹر ٹریننگ کے لئے فی الفور بھیجنا منظور کرتی ہے، اور وہاں سے فارغ التحصیل ہوتے ہی اسے انسپکٹری کا موقع دینا چاہتی ہے"۔

جس دن وہ ٹریننگ کے لئے روانہ ہونے لگا۔ پولیس کے تمام عملے نے اسے پارٹی دی، پھول ہار پہنائے، اور الوداع کہنے ریلوے اسٹیشن تک گئے۔

(۵)

تماشا گاہِ عالم میں ہزاروں تعجب انگیز واقعات رونما ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ وہی یوسف جو کل ایک معمولی کانسٹبل تھا آج سنہاپور تھانے کا انچارج اور سینیئر سب انسپکٹر مقرر کیا گیا ہے۔ جونیئر سب انسپکٹری پر صلاح الدین فائز ہیں۔ جن کا سرکل

انسپکٹر ہونے کا ضرور موقع تھا لیکن بے بیان فروغ باقوں نے کسی موضع میں صرف پندرہ روپے کی رشوت ان پر ثبوت کردی تھی جس کے باعث چند ماہ معطل رہے، پھر رحم کی درخواست دی تو جونیر سب انسپکٹر بنائے گئے، اور چھبیس سالہ ریکارڈ خراب ہوگیا عبدو اور رام توکل بھی مدت سے ہیڈ کانسٹبل تھے۔ اپنے افسروں سے ناخوشگوار تعلقات رکھنے کے سبب سے تبدیل ہوکر یوسف کی ماتحتی میں آئے تھے۔

شیخ ہدایت اور ضعیف والدہ بھی ہمراہ تھیں۔ چھوٹا بھائی الہ آباد میں ایم اے پڑھ رہا تھا۔ یوسف کی شادی ہوچکی تھی۔ دلہن بھی گھر میں آگئی تھی۔

وہ تمام پولیس کے سپاہیوں سے انتہائی ہمدردانہ برتاؤ کرتا تھا لیکن خبر نہیں کیا بات تھی جو عبدو، رام توکل اور صلاح الدین کو ایک جگہ اکٹھا نہیں ہونے دیتا تھا۔ حوالدار شیخ عبدو صاحب! آج کرناپور کی مرگِ زہر خورانی کی رپورٹ آئی ہے تفتیش کر آیئے" "مسٹر رام توکل! آپ شیخ عبدو کی واپسی تک اسٹیشن ہاؤس ہی میں رہئے گا!" "سید صاحب! آپ ملزموں کو صدر لے جایئے اور چالان پیش کیجے گا!" یہ تینوں آپس میں ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بہت تڑپتے تھے لیکن یوسف انہیں نہ ملنے دیتا تھا۔

ایک دن علاقے کی جانچ کر کے جب یوسف واپس آیا تو گھوڑا بندھوایا، اور باہر آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔ آنکھیں بند تھیں۔ مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔ صلاح الدین صاحب کو بلوایا تھا۔ وہ خضاب لگا رہے تھے۔ خضاب لگانے کے بعد آئے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ یوسف ماتحت لونڈا تھا اسے بھلا وہ کیا سلام کرتے۔ لیکن یوسف اس کا خیال نہیں کرتا تھا۔ آج وہ بری طرح بھرا بیٹھا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی گرجنے لگا ــــ دیکھئے جناب سید صاحب! آپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ میں فراموش نہیں کرسکتا۔ میرے والد کی ٹانگ آپ ہی کی بدولت ضائع ہوئی تھی۔ آپ نے موضع مدن پور میں جو پچاس روپے مسماۃ راج کنور بیوہ جگدیش پرشاد سے لئے ہیں ان کا ثبوت مل چکا ہے۔ اگر میں ابھی رپورٹ کردوں تو آپ پھنس جائیے گا۔ لہٰذا آج ہی آپ تبادلے کی درخواست دے دیجئے۔ تمام علاقہ آپ کی رشوت ستانی اور بے جا ستم آرائیوں کا شاکی ہے، کہئے آپ درخواست دیتے ہیں یا تحقیقات چاہتے ہیں؟ ــــ بولئے؟" صلاح الدین نیچی نظریں کئے بیٹھے تھے۔ ان پر ایک رنگ آتا، ایک جاتا تھا، بہت دیر کے بعد انہوں نے صرف اتنا کہا ــــ آپ خدا اور خدا کے رسول کے واسطے مجھے معاف کیجئے اور میرے دو بچوں کا خیال کیجئے"۔

یوسف کا تمام غصہ فرو ہوچکا تھا۔ اس نے تبسم کے ساتھ کہا ــــ "لیکن سید صاحب شیر کے منہ کو جب خون لگ جاتا ہے تو وہ مردم خوری سے باز بھی تو نہیں رہتا۔ آپ اوّل سے بدنام رہے ہیں۔ مسٹر ڈیوس ایک شریف انسان ہے لہٰذا پردہ پوشی ہوتی رہی۔ آپ کا سرکل انسپکٹری کا موقع چلا گیا۔ آپ معطل رہے ہیں، تنزل کر کے یہاں میرے ماتحت بنائے گئے تاہم عادت نہیں سدھری"۔ صلاح الدین نے چاروں طرف دیکھا، کوئی نہیں تھا وہ ذرا جھکے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ "آپ کا بھروسا ہے۔ چشم پوشی کیجئے۔ اور خدارا رپورٹ نہ کیجئے گا"۔

شام کو شیخ ہدایت نے بھی یوسف سے کہا ــــ "بیٹا! نیکی نیک را اور بدی خویش را" انہوں نے سب کچھ کہا لیکن آج وہ میرے پاس معافی کی شفاعت کرانے آئے تھے۔ میں بھی کہتا ہوں کہ ذرا ان کے بڑھاپے کا خیال رکھنا۔ خدا پرہیزگاروں اور رحم کرنے والوں کا انجام بخیر کرتا ہے۔

حسن عزیز جاوید

غزل

چارۂ دردِ جگر ہونے لگا

دشمنِ جاں چارہ گر ہونے لگا

پھر مری آنکھوں کی قسمت جاگ اُٹھی

پھر طوافِ بام و در ہونے لگا

بند کر آنکھوں کو اے عشقِ غیور

حُسن وقفِ رہگزر ہونے لگا

جس کے جلووں کو ترستی تھی نظر

خود وہ محتاجِ نظر ہونے لگا

جان کر میرا تغافل آشنا

حالِ دل سے بے خبر ہونے لگا

منزلِ مقصود آپہنچی حفیظ

قصۂ غم مختصر ہونے لگا

حفیظ ہوشیارپوری ایم اے

طائرانِ صحرا

شورِ قیامت

میں کوئی دس دن سے سو رہا تھا
قیامت آ گئی
اسرافیل نے گلا پھاڑ پھاڑ کر
صور پھونکنا شروع کیا
سب مُردے سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے
مَیں نے اپنے میلے اور پھٹے ہوئے لحاف سے
اپنی ایک آنکھ باہر نکال کر کہا
ارے شور مت مچا!
اور پھر سو گیا۔

دو فلسفیوں کی رُوحیں

بارش کے بعد فضا دُھل کر نکھر گئی تھی
ہلکی ہلکی پھوار کے فوارے چل رہے تھے
ہوائیں گیت گا رہی تھیں
اور لوگ سیر کے لئے باہر نکل آئے تھے
میں نے دیکھا کہ سرسبز جنگل میں
ایک ٹنڈ منڈ درخت پر

دو بُڈھے گِدھ، آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔

محبّت

محبت پہاڑوں کو چیرتی
دریاؤں کو پھلانگتی
سمندروں کو پیچھے چھوڑتی
محبوب کے قدموں سے جا لپٹتی ہے
صرف ایک پل میں۔

میری تمنّا

سُورج کی رتھ شفق کی سہانی وادیوں میں
ایک جھیل پر پھسلتی جا رہی ہے
آہ یہ رنگ برنگ کی وادیاں جھیلیں اور دلکش پہاڑیاں
کتنی خوبصورت ہیں
میری تمنّا ہے کہ میں
اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر وہیں جا پہنچوں
ہم دونوں کسی جھیل کے کنارے
ایک چٹان پر بیٹھ جائیں
اور حشر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہیں۔

ننھی لڑکی کی دعا

اے خدا! آج تُو اس تنہا جنگل میں مجھے نظر آجا
کوئی دیکھ تو نہیں رہا

اگر تُو آج بھی مجھے نظر نہ آگیا
تو ایک چھوٹی سی لڑکی
تجھ سے خفا ہو جائے گی
اَور پھر نہ مانے گی، اے خدا!

گزرا ہُوا ایک دن

شبنم کے جن درختوں کے نیچے
مَیں نے اور میرے دوستوں نے
مسرّت کا ایک دن گزارا تھا
وہاں پہنچ کر میں نے گزرے ہوئے زمانے کو
زور زور سے آوازیں دیں۔

تصویر

تم نے مجھے اپنی تصویر کیوں نہیں بھیجی
کیا اس لئے کہ اسے دیکھتے دیکھتے
میری آنکھوں کا نُور اس میں
جذب نہ ہو جائے :
کیا اِس لئے کہ اسے دیکھتے دیکھتے
میں اس میں کھو نہ جاؤں ؛
کیا اِس لئے کہ میں تمہاری تصویر نہ بن جاؤں ؛

مہدی علی خاں

لالۂ طور ترجمہ کیلاش کنول

مَیں نے "پیامِ مشرق" سے "ہمایوں" کے لئے "لالۂ طور" کا ترجمہ علامۂ اقبال کی اجازت حاصل کرنے کے بعد کیا ہے۔ براہِ کرم کوئی صاحب میری اجازت کے بغیر شائع کرنے کا قصد نہ فرمائیں۔

مقبول احمد پوری

۷۔ دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم — نمی دانم چہ می خواہم چہ جویم
بر آید آرزو یا بر نہ آید — شہیدِ سوز و سازِ آرزویم

ترجمہ

پھروں ہیں جیسے باس چمن میں — پتہ نہیں کیا ڈھونڈوں بن میں
آس بھرے یا جی گھبرائے — مٹا ہوا ہوں دل کی تپن میں [1]

[1] راقم الحروف کے برادرِ محترم چودھری شیخ بدرالزماں صاحب نے جیل خانے میں ہندی پڑھی تھی علی گڑھ کالج میں ان کا انتخابی مضمون فلسفہ تھا۔ اس ہندی اور فلسفے سے راقم کو بھی مدد ملی۔ موصوف نے کیلاش کنول کے پورے مسودہ کو بغور کئی دن تک مطالعہ کیا ہے اور اپنی رائے گرامی سے راقم کو بعض جگہ مستفید فرمایا ہے۔ کئی جگہ موصوف کے مشورہ پر کافی غور کرنا پڑا۔ چنانچہ اس رُباعی کا ترجمہ موصوف نے دیہاتی زبان میں کرکے تمثیلی نمونہ مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے مطابق عمل کیا گیا۔ اگر کل رباعیات ہر حرف لب و لہجہ میں ہوتیں تو یہ ترجمہ نمونۂ کمال تھا۔ اصل میں لب و لہجہ کی تبدیلی کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ موصوف کا یہ ترجمہ راقم شکریے کے ساتھ درج ذیل کرتا ہے ؎

"منڈلات پھروں جس باس چمن ماں — کن چاہوں کا ڈھونڈوں بَن ماں
آس بھرے یا جیرا کلپے — مٹا رہوں پر جی کی تپن ماں

۸۔ جہاں مشتِ گل و دل حاصلِ اوست — ہمیں یک قطرۂ خوں مشکلے اوست
نگاہ ما دو بیں اُفتاد ورنہ — جہانِ ہر کسے اندر دلِ اوست

ترجمہ

جگ مٹی دل اُس کا کارن [1] — یہی لہو کی بوند کٹھن [2] دھن

[1] غرض و غایت [2] مشکل (کردی دکھائی)

نَین اپنے لیں راہ دو رنگی   نہیں تو دل میں رکھے جگ ہر جن[۴۳]

۴۳ جن: آدمی شخص۔ جیسے آدمی جن

۹۔ سحر می گفت بلبل باغباں را   دریں گل جز نہالِ غم نگیرد

بہ پیری می رسد خارِ بیاباں   ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

ترجمہ

بھونرا سویرے یہ مالی سے بولا   دُکھ ہی کی پَود یہ بھومی[۴۱] اُبھارے

بن کا شول[۴۲] تو بڑھ کے ہو بوڑھا   پھُول جواں ہوتے ہی سدھارے

۴۲ شول بمعنی کانٹا

۱۱۔ نوائے عشق را ساز است آدم
کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید ایں خوب تر ساخت
مگر با ایزد انباز است آدم

ترجمہ

پریم کی دُھن انسان کا جیون
بھید کو کھوجے، بھید کا کارن
اُس نے بنایا جگ، یہ سنوارے
آدمی باندھے خدا سے بندھن

۴۶۔ گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور
کہ جانِ تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

ترجمہ

مَن کیلاش گیا درشن کو
چھوڑ کے اِس جیون درپن[۴۳] کو
جا کوئی آدمی ڈھونڈ لے گیانی
خُدا بھی ڈھونڈے آدمی جن کو!

مقصود احمد پوری

رازِ تسکین

خوگرِ ہنگامہ جویائے سکوں ؛ یا للعجب !
مطرب اور میلِ شکستِ ارغنوں ؛ یا للعجب !
موج اور آغوشِ ساحل کی کشش ؛ واحسرتا!
شاہباز اور درپئے صیدِ زبوں ؛ یا للعجب !

(۲)

بیقراری میں ہیں پنہاں بے قراری کے مزے
جانسپاری میں ہیں مضمر جانسپاری کے مزے
درد کی افراط ہی سے دردِ دل ہے خوشگوار
سوزِ دل سے پُوچھئے ناسازگاری کے مزے

(۳)

رنج یہ دل میں کہ یوں ہوتا ہے یُوں ہوتا نہیں
یعنی جو کچھ چاہتے ہیں آپ کیوں ہوتا نہیں ؟
اور بظاہر کس قدر معصوم بن کر کہدیا
ہائے زیرِ آسماں حاصل سکوں ہوتا نہیں

(۴)

کامگاری کے تصوّر کو سکوں سمجھا ہے تُو
اور اس کے عکس کو حالِ زبوں سمجھا ہے تُو
ہے سرور انگیز خوابِ خوش سکوں پرور نہیں
خاک سمجھا ہے جو مستی کو جنوں سمجھا ہے تُو

(۵)

بے نیازِ این و آں ہونے میں ہے تسکینِ دل
ہے یہی روزِ ازل سے دینِ دل آئینِ دل
یا تو کر تسخیر ، یا ماحول سے ہو بے نیاز
اُس میں ہے تحسینِ دل اس میں ہے تمکینِ دل

امین حزیں سیالکوٹی

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

میں نے کالج میں زندگی کے چھ بہترین سال گزارے ہیں مگر اب سوچتا ہوں تو یہ طویل مدت ایک لمحۂ خواب معلوم ہوتی ہے۔ ان بیتے ہوئے دنوں کی یاد کبھی خوشگوار ہوا کرتی تھی مگر اب یہ حالت ہے کہ کبھی کالج کا ذکر ہوتا ہے تو کلیجہ پر چھریاں چلنے لگ جاتی ہیں۔ ان دنوں کسی بات کا فکر ہی نہ تھا۔ طالب علم کو صرف ایک بات کا ڈر ہوا کرتا ہے اور وہ یہ کہ زندگی کی دلچسپیوں میں محو ہو کر کہیں امتحان میں ناکام نہ ہو جاؤں۔ امتحان کو طلبہ ہوّے سے کم نہیں سمجھتے لیکن میں اس فکر سے بھی آزاد تھا۔ میرا معمول یہ تھا کہ امتحان سے ہفتہ عشرہ پہلے کتابوں کو ایک نظر دیکھ لیا۔ اور امتحان دے ڈالا۔ اکثر لڑکے ہر وقت کتابوں سے چمٹے رہتے تھے۔ اب اسے یا تو میری قابلیت سمجھ لیجئے یا دوسروں کی نالایقی کہ محنت کے فقدان کے باوجود ہر امتحان میں اوّل میں ہی آیا کرتا تھا اور کتابی کیڑے مُنہ دیکھتے رہ جایا کرتے تھے۔

میں کالج کی علمی و ادبی سوسائٹیوں میں بہت زیادہ حصّہ لیا کرتا تھا۔ کالج میں میرا ابھی سالِ اوّل تھا کہ میں کالج میگزین کا مدیرِ معاون بنا دیا گیا۔ میرا شمار ہمیشہ کالج یونین کے مقتدر ارکان میں ہوتا رہا۔ اور میں ایک سال تک اس مجلس کا سکرٹری اور ایک سال تک نائب صدر رہا۔ یہ سب سے بڑا اعزاز ہے جو کالج کے کسی طالب علم کو نصیب ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی ایسی سائیٹیاں تھیں جن کے نیم مردہ پیکر میں میں نے اپنے جوشِ عمل سے روح پھونکی۔ اس قسم کی سرگرمیوں میں حصّہ لینے والے طلبہ تعلیمی لحاظ سے بالکل ناکارہ ہوا کرتے ہیں مگر میں ہمیشہ ہر امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوتا رہا۔ یہی بات تھی کہ کالج کے طلبہ میرا احترام کیا کرتے تھے اور اگرچہ پروفیسروں سے ہمیشہ میری لڑائی ہی رہی تاہم وہ میری قابلیت کے معترف ضرور تھے۔ ان سب چیزوں نے مِل مِلا کر میرے دل و دماغ کو ایک نامعلوم نشہ سے مخمور سا کر رکھا تھا۔ اور کالج کی زندگی کے چھ سال کے دَوران میں کبھی مجھے مستقبل پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

دوستوں کے معاملہ میں بھی مَیں اکثر لوگوں سے خوش قسمت واقع ہوا تھا۔ مجھ میں ایک بُری عادت یہ تھی کہ میں اپنے آپ کو عام سطح سے بلند خیال کرتا تھا۔ اور دوسروں سے بھی مجھے یہی توقع رہی کہ وہ مجھے عام سطح سے بلند ہی خیال کریں۔ ظاہر ہے کہ میرا حلقۂ احباب زیادہ وسیع نہیں ہو سکتا تھا۔ اکثر لڑکے جو مجھے اچھی طرح نہیں پہچانتے تھے مجھے مغرور سمجھا کرتے تھے۔ لیکن اس کے

باوجود مجھے چند ایسے دوست مل گئے جن کی دوستی پر میں ان دنوں فخر کیا کرتا تھا۔ ہمارا ہم مذاق ہونا ہی ان دوستیوں کی سب سے بڑی وجہ تھی اس لئے یہ کالج کی اکثر دوستیوں سے جو کالج کی چار دیواری ہی میں ختم ہو جایا کرتی ہیں زیادہ پایدار ثابت ہوئیں۔ میرے احباب کا شمار بھی کالج کے اچھے اور با اثر طلبہ میں ہوا کرتا تھا اسی لئے ہم لوگ کالج کی ہر سوسائٹی پر آسانی سے قبضہ کر لیا کرتے تھے۔

ایم۔اے کے بعد میں نے کالج کو خیر باد کہی تو زندگی کے تلخ حقائق ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آنے لگے والد کی وفات کی وجہ سے چھوٹے بھائیوں کی پرورش اور تعلیم کا بوجھ میرے سر پر آ پڑا۔ لیکن مجھ میں خود اعتمادی کا وصف پایا جاتا تھا، اس لئے میں زیادہ نہ گھبرایا۔ اسی سال میں پی۔سی۔ایس کے امتحان مقابلہ میں شامل ہؤا اور اول آیا۔ اس سے مجھے خوشی تو ضرور ہوئی لیکن میں جامے سے باہر نہ ہؤا کیونکہ میرے نزدیک یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ میں امتحانات میں اول رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ میں نے سول سروس کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔ کالج کے دنوں میں مَیں بڑا بھاری سوشلسٹ اور آزاد خیال سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب میں اسی حکومت کی مشینری کا ایک پُرزہ بننے والا تھا جسے توڑنا کبھی میرے نزدیک ایک ہندوستانی نوجوان کا اہم ترین قومی فرض تھا جب مجھے وہ تقریریں یاد آتیں جو میں کالج یونین کے مباحثوں میں ملوکیت کے خلاف اور اشتراکیت کے حق میں کیا کرتا تھا تو ضمیر اس روش پر ہلکی سی سرزنش کرتا۔ لیکن میں یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا کہ میں اس ملازمت میں بھی خدمتِ خلق کو آقایانِ ولی نعمت کی خوشنودی پر ترجیح دوں گا۔ لیکن میرے یہ خیالی قلعے دھڑام سے زمین پر آ گرے۔ نظر کی کمزوری کی وجہ سے مَیں طبی معائنہ میں کامیاب نہ ہو سکا ــــ میری قابلیت میرے کسی کام نہ آسکی ــــ لیکن نظر کی کمزوری سے زیادہ میری اس ناکامی کا سبب میری مالی حالت کی کمزوری تھی۔ اس تلخ تجربہ نے میرا دل توڑ ڈالا۔ مجھے سرکاری ملازمت سے نفرت سی ہو گئی۔ اب میں وہی پُرانا اشتراکی تھا!

لیکن گھر کے حالات ایسے تھے کہ میرے لئے کہیں نہ کہیں ملازم ہونا ضروری تھا۔ مجھے صحافت سے فطری مناسبت تھی اس لئے میں نے اسی پیشہ کو منتخب کیا۔ دوست کہا کرتے تھے کہ میرے قلم میں بے پناہ زور ہے۔ کالج کے دنوں میں بھی میرے مضامین کی بڑی دھوم ہؤا کرتی تھی۔ اس لئے مجھے ملازمت تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ میں نے "ــــ ت" کے دفتر میں کام کرنا شروع کر دیا۔ لیکن عملی صحافت میں قدم رکھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے پاؤں اس وادیٔ خارزار کے لئے بالکل ناموزوں ہیں تنخواہیں وقت پر نہیں ملتی تھیں۔ اخبار کی پالیسی کی خاطر اکثر اوقات ضمیر کو کچل کر ان لوگوں کی شان میں قصیدے شایع کرنے پڑتے تھے۔ جنہیں ہم بدترین انسان کہتے تھے۔ مالکانِ اخبار کا ناجائز پروپیگنڈا کرنا پڑتا تھا۔ ہم لوگ ان رہنماؤں کو گالیاں دینے پر مجبور تھے جن کی قابلیت کا ہمیں ذاتی طور پر اعتراف تھا۔ ہم سے نظمیں لکھوائی جاتی تھیں اور فرضی ناموں سے شایع کر دی جاتی تھیں۔ لیکن

سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ ہر تین مہینے کے بعد اخبار کی پالیسی بدل دی جاتی تھی۔ آج کانگرس کی حمایت ہو رہی ہے تو کل اس کی مخالفت۔ کبھی حکومت کو بے نقط سنائی جا رہی ہیں اور کبھی اس کے وجود کو آیۂ رحمت کہا جا رہا ہے۔ یہ بات مجھے سخت ناپسند تھی۔ ایک ہی قلم سے ایک شخص کو فرشتہ اور شیطان کہتے ہوئے مجھے شرم آتی تھی۔ میں نیا نیا کالج سے نکلا تھا۔ جوان خون رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ اس لئے میں ان بے اصولیوں پر جھنجلا اٹھتا۔ مجھ میں یہ مرض شروع سے چلا آتا ہے کہ میں اختلاف رائے کو چھپایا نہیں کرتا۔ میں اخبار کے دفتر میں بیٹھے ہوئے اخبار کی پالیسی پر بڑے تلخ انداز میں نکتہ چینی کر دیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ مجھے فوراً استعفےٰ دینا پڑتا۔ میں "ـــت" "اے" "ـــم" کے دفتر میں آیا، وہاں سے مستعفی ہوا تو "ـــن" کی ادارت سنبھالی یہاں بھی نباہ نہ ہو سکا "ـــب" کے دفتر میں چلا گیا۔ لیکن یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ میں نے حمام میں سبھی کو ننگا پایا۔ ادھر اخبارات کے مالکوں کو بھی میری طبیعت کا پتہ چل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "ـــب" کی ادارت سے مستعفی ہونے کے بعد کوشش کے باوجود مجھے کہیں ملازمت نہ ملی۔

انہیں دنوں دہلی سے مسلمانوں کا ایک نیا روزنامہ انگریزی زبان میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ اخبار ایک لمیٹڈ کمپنی کے زیر اہتمام شایع ہوتا تھا۔ ایک دن میرے ایک دوست رشید نے مجھ سے پوچھا کہ میں "ہ ـــ" کے ادارہ میں کیوں نہیں چلا جاتا؛ رشید میرا کالج کے زمانے کا بے تکلف دوست تھا۔ مجھے بھی ایک آدھ دفعہ یہ خیال آیا تھا کہ "ہ ـــ" کے دفتر میں ملازم ہو جاؤں۔ کم از کم تنخواہ تو باقاعدہ ملے گی۔ لیکن میری خود داری مجھے اجازت نہ دیتی تھی کہ میں "ہ ـــ" کے ادارہ میں کام کروں۔ "ـــ انڈیا پبلسٹی لمیٹڈ" کے منیجنگ ڈائرکٹر خواجہ نصیر الدین اور میں ایک ہی کالج میں پڑھتے رہے تھے۔ وہ مجھ سے دو سال جونیئر تھے۔ کالج میں میرے ان سے معمولی دوستانہ تعلقات تھے۔ میں ان دنوں "کالج میگزین" کا مدیر ہوا کرتا تھا۔ نصیر کو شروع سے مضمون نگاری کا شوق تھا۔ وہ ہر مہینے ایک آدھ مضمون اشاعت کے لئے بھیج دیتے تھے۔ ان کے اکثر مضامین ناقابلِ اشاعت ہوتے تھے لیکن ان کے اصرار سے مجبور ہو کر میں انہیں ضروری تصحیح کے بعد شایع کر دیا کرتا تھا۔ یہی تعلقات بڑھتے بڑھتے دوستی کے درجہ پر پہنچ گئے۔ ایم۔ اے کے بعد وہ بیرسٹری کے لئے لندن گئے مگر والد کی ناگہانی موت کی وجہ سے انہیں سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے واپس ہندوستان آنا پڑا۔ ان کے والد بہت بڑے زمیندار تھے اور کافی جائداد چھوڑ کر مرے تھے۔ خواجہ نصیر نے اپنے فطری ذوق کی مناسبت سے چند اور سرمایہ داروں سے مل کر "ـــ انڈیا پبلسٹی لمیٹڈ" کی بنیاد رکھی۔ اور اس کمپنی کے ماتحت دہلی سے ایک بلند پایہ انگریزی روزنامہ "ہ ـــ" کے نام سے جاری کیا۔ میری وضعداری اجازت نہ دیتی تھی کہ اب نصیر کے پاس ملازمت کی درخواست لے کر جاؤں۔ خواجہ نصیر کے علاوہ میرے ایک اور عزیز دوست اس کمپنی کے ڈائرکٹر تھے۔ ان کا نام ڈاکٹر افضل حسین تھا۔ وہ نام کے پی۔ ایچ۔ ڈی اور برائے نام بیرسٹر تھے کیونکہ گھر میں خدا کا دیا بہت کچھ تھا اور پریکٹس نہیں کرتے تھے۔ افضل میرے ہم جماعت تھے۔ ہم چھ سال تک

ایک ہی کالج میں پڑھتے رہے۔ ان کا شمار میرے بہترین دوستوں میں ہوتا تھا۔ کالج کی سیاسیات میں انہیں نمایاں جگہ حاصل تھی۔ ان کی توجہ پڑھنے لکھنے کی طرف بہت کم تھی۔ ہنگاموں میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ اور کالج کی ہر سوسائٹی کے کسی نہ کسی عہدہ پر انہوں نے قبضہ جما رکھا تھا ہم مذاق ہونے کی وجہ سے ہم پہلے سال ہی ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے تھے۔ بعد میں تو ہماری دوستی اس درجہ پر پہنچ گئی کہ ہماری سیر، ہمارا کھانا، ہماری تفریح غرضکہ ہر چیز مشترکہ ہوتی تھی۔ ایم۔ اے کے بعد انہوں نے بھی ولایت کا رُخ کیا۔ اور میں نے طبی معائنہ میں ناکامی کے بعد اخبارات کے دفتروں کی خاک چھاننی شروع کر دی۔ لیکن اس کے باوجود ہماری دوستی میں زیادہ فرق نہیں آیا۔ مجھے کیمبرج سے ان کے خطوط باقاعدہ آتے رہے۔ انگلستان سے واپسی کے بعد بھی جب کبھی مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ ہمیشہ بڑے خلوص اور تپاک سے پیش آتے۔ نصیر کے مجبور کرنے پر اُنہوں نے بھی اس کی کمپنی کے بہت سے حصے خرید لئے تھے۔ اگر یہ بورڈ آف ڈائرکٹرز کے رکن نہ ہوتے تو مجھے "ا ---- " کے ادارہ میں کام کرنے میں کچھ زیادہ تامل نہ ہوتا لیکن ان کے ہوتے ہوئے مجھے یہ ہمت نہ پڑتی تھی کہ کمپنی کو ملازمت کے لئے درخواست بھیجوں۔

میں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد رشید سے کہا۔

"میں وہاں کام نہیں کر سکتا؟"

"آخر کیوں؟"

"خواجہ نصیر اور افضل کی کمپنی میں کام کرنا میری خودداری کے منافی ہے۔"

"لعنت بھیجو اس جھوٹی خودداری پر۔ بھوکے ننگے کہاں اور خودداری کہاں؟"

"لیکن میرے ان سے دوستانہ تعلقات ہیں"

"اسی لئے تو میں وہاں کام کرنے کو کہتا ہوں۔ تم کیا ایسی جگہ کام کرنا چاہتے ہو جہاں تمہارے دشمن اخبار کے مالک ہوں؟"

"بھئی شرم آتی ہے مجھے تو اب ان سے یہ کہتے ہوئے کہ مجھے "ا ---- " میں ملازمت دلوا دیجئے۔"

"بیکاری کی وجہ سے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ دُنیا کی طرف دیکھو۔ لوگ تو معمولی دوستوں سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے لیکن تمہیں اپنے ایک بہترین دوست کی کمپنی میں حلال روزی کماتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔"

دلیل معقول تھی۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ تاہم میں "ا ---- " کے دفتر میں کام کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ میرا رویہ معقولیت پر مبنی ہو یا غیر معقولیت پر میں اسے بدلنے کا روادار نہ تھا۔ رشید اپنے دلایل سے مجھے قایل کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ آخر وہ کہنے لگا۔

"ذرا چھوٹے بھائیوں کا خیال کرو۔ ان کی تعلیم کی ذمہ داری تم پر عاید ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کو کیوں برباد کرتے ہو۔ خدا کے لئے اپنی وضعداری پر ان کا مستقبل نہ قربان کرو۔"

میرا کمزور ضمیر پہلے ہی بہانہ جو تھا۔ رشید نے بیکاری اور افلاس کا جو بھیانک نقشہ اپنے الفاظ سے کھینچا تھا میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ افلاس اور غربت میں ضمیر کی نحیف آواز سنائی نہیں دیتی۔ میرا بھی یہی حال ہوا۔ میں نے کہا کہ آخر اصول پرستی کا اجارہ میں نے ہی تو نہیں لے رکھا؟ اور پھر افضل اور نصیر میرے دوست ہیں۔ آخر میں ان سے جائز فائدہ کیوں نہ اُٹھاؤں؟ میں نے رشید سے وعدہ کر لیا کہ میں اس سلسلہ میں افضل سے ملوں گا۔

اگلے ہفتہ میں افضل کے پاس پہنچا۔ وہ ان دنوں اپنے آبائی گاؤں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ افضل میرے ساتھ بڑے تپاک کے ساتھ پیش آیا۔ میں چار دن تک وہیں ٹھہرا رہا۔ کالج کی صحبتوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ قندِ مکرر کے طور پر ہم پُرانی داستانیں لطف لے لے کر دہراتے رہے۔ ہر وقت پروفیسروں سے جھگڑوں، طلبہ سے چھیڑ خانیوں اور کالج یونین میں بحث مباحثوں کا ذکر رہتا۔ افضل کہتا کہ کاش اب بھی کوئی مجھ سے ساری دولت لے لے اور کالج کے وہ خوشگوار ایّام واپس دے دے۔

مجھے یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ حرفِ سوال زبان پر لاؤں۔ افضل کے خلوص کے باوجود مجھے اس کے رویہ میں ایک تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ اس کے اندازِ تکلم اور لب و لہجہ سے اس بات کا اظہار ہوتا تھا کہ اسے اپنے تفوق اور میری بے چارگی اور کم مائگی کا احساس ہے۔ کئی بار میں نے اسے اپنی آمد کا مقصد بتانا چاہا مگر الفاظ میری زبان پر آ کر رُک جاتے۔ جس دن مجھے رخصت ہونا تھا ہم افضل کے باغ میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ باتوں باتوں میں افضل پوچھنے لگا۔ تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے۔ میں نے شرماتے ہوئے ہچکچاتے ہوئے اور ڈرتے ڈرتے اسے اپنی آمد کے مدعا سے آگاہ کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا "میں ہفتہ عشرہ تک نصیر کو اس بارے میں خط لکھ دوں گا۔ اسی دن میں تمہیں بھی اطلاع بھیج دوں گا۔ تم فوراً دہلی چلے جانا۔"

اسی دن شام کو میں واپس چلا آیا اور افضل کے خط کا انتظار کرنے لگا۔

سات آٹھ روز کے بعد مجھے ایک خط موصول ہوا۔ لفافہ پر افضل کے گاؤں کی مُہر تھی اور پتہ بھی اسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

مَیں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنا شروع کر دیا۔ خط انگریزی میں تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا:۔

"سعید میرے پاس آیا تھا اور چار دن تک یہیں رہا۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ وہ آج کل بیکار ہے۔ اس کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ اسے "ہ ——" کے ادارۂ تحریر میں لے لیا جائے۔ سعید کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات اتنے پُرانے اور گہرے ہیں کہ میں اس کی کسی بات کو رد نہیں کر سکتا۔ اس کی قابلیت سے بھی کسی شخص کو انکار نہیں۔ وہ پیدائشی صحافی ہے۔ اس کے زورِ تحریر سے تم تو اچھی طرح واقف ہو۔ اسے اس میدان میں تجربہ بھی اچھا خاصا حاصل ہے

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس شخص کا مزاج اتنا آتشیں ہے کہ اس کے لئے کسی جگہ کام کرنا ناممکن ہے۔ کالج کے دنوں میں بھی اس کے دماغ میں خود رائی بہت زیادہ تھی۔ اور یہ چیز اب بھی اسی طرح قائم ہے۔ سعید کسی کے آگے جھکنا بالکل نہیں جانتا۔ اس کی رائے غلط ہو یا درست وہ اسی پر اڑا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی اخبار میں بھی چھ ماہ سے زیادہ کام نہیں کر سکا۔ میرا خیال ہے کہ "N ——" میں بھی اس کا زیادہ دیر تک نباہ نہیں ہو سکے گا اور ممکن ہے یہ چیز بعد میں ہماری دوستی پر بھی اثر انداز ہو۔ میں اس وقت عجیب کشمکش میں ہوں۔ مجھے اس سے دلی ہمدردی بھی ہے اور اس کا دوست ہونے کی وجہ سے مجھ پر یہ فرض بھی عاید ہوتا ہے کہ میں اس کی ہر ممکن امداد کروں۔ لیکن دوسری طرف سعید کے آتشیں مزاج پر غور کرتا ہوں تو مناسب یہی سمجھتا ہوں کہ اسے اس کے حال پر رہنے دیا جائے۔ بہر حال میں نے تمام حالات تمہارے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ وہ غالباً کل یا پرسوں تک تمہارے پاس آئے گا۔ میں نے آج ہی اسے بھی ایک خط لکھا ہے۔ میں فیصلہ تمہیں پر چھوڑتا ہوں۔ جو مناسب سمجھو کرو۔ لیکن اگر اسے کورا جواب دینا مناسب سمجھو تو اسے اس طرح ٹالنا کہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔"

یہ خط افضل نے نصیر کو لکھا تھا۔ اور غلطی سے لفافے بدل جانے کی وجہ سے میرے پاس چلا آیا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد میں نے دہلی جانا مناسب نہ سمجھا۔

حمید نظامی

وہ

کیا آپ نے!

کبھی سوسن کے پھول کی شگفتگی کا نظارہ کیا

اس سے پیشتر کہ دستِ گلچیں اُسے چھوئے؛

برف باری کے منظر پر دھیان دیا

پیشتر اس کے کہ مٹی اور کیچڑ اُسے سیاہی مائل بنا دیں؛

او دبلاؤ کی نرم و نازک لُون کو دستِ نازک سے محسوس کیا؛

یا راج ہنس کو بستی کی جانب پرواز کرتے دیکھا؛

یا کسی کانٹے دار جھاڑی کے غنچے کی خوشبو سے مسرت حاصل کی؛

یا آگ میں جلتی ہوئی مالتی کی خوشبو سے لُطف اندوز ہوئے؛

یا کبھی مکھیوں کے چھتے کا شہد دیکھا؛

بس وہ!

اتنی ہی سفید

اتنی ہی نرم و نازک

اور اتنی ہی شیریں ہے

(بن جانسن)

گُل سعید

غزل

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیٔ کرم فرما بھی گئے
اِس سعیٔ کرم کو کیا کہیے، بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیٔ وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسّم پا بھی گئے

رودادِ غمِ اُلفت اُن سے ہم کیا کہتے کیونکر کہتے
اِک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہئے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ اُلفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
نیری محفل سونی نہ ہوئی کچھ اُٹھ تو گئے کچھ آ بھی گئے

اُس محفلِ کیف و مستی میں، اُس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

اسرار الحق مجاز
بی۔ اے (علیگ)

مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

اپنے چھوٹے سے گھونسلے میں بیٹھے ہوئے جب میں اپنے والدین کو پر پھیلائے وسعتوں میں اُڑتے ہوئے دیکھتا میرے ننھے سے دماغ کو عجیب عجیب باتیں سوجھا کرتیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جب میری ماں دانہ دُنکا لا کر میرے مُنہ میں ڈالنے کی کوشش کرتی تو میں مُنہ کھولنے کی بجائے آنکھیں وا کر کے بڑے رشک سے اپنی ماں کی اُس تازگی کا نظارہ کرنے لگ جاتا جو اس تازہ پرواز نے اُسے عطا کی تھی۔ اتنے میں میرا دُوسرا ساتھی بڑی بے تابی سے اپنا مُنہ کھول دیتا اور ماں بڑے فخر سے تمام خوراک اُسے کھلا دیا کرتی۔

اس طرح میرے ماں باپ آتے جاتے رہتے تھے میں اسی طرح خیالات کی دُنیا آباد کرتا جاتا تھا۔ اگرچہ خوراک کا زیادہ حصہ میرے دوسرے ساتھی کے پیٹ میں جاتا تھا لیکن میرا جسم اگر اُس سے زیادہ پھرتیلا اور طاقتور نہ تھا۔ تو کم کسی طرح نہ تھا۔ ہم دونوں گوشت کی ننھی ننھی بوٹیوں کے سوا کچھ نہ تھے۔ اور جب میں کسی موقع پر اپنی اس کوتاہ قامتی اور اُن عظیم ارادوں کا مقابلہ کیا کرتا جو میرے دِل میں موجود تھے۔ تو مجھے کچھ شرم سی محسوس ہونے لگتی تھی۔

ہمارے ماں باپ اکثر ہماری حفاظت کیلئے متفکر نظر آتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو کسی جانور کی معمولی سی جرأت پر اس شدت سے چُوں چرا کرتے کہ میرے دل میں خیال پیدا ہوتا انہیں میرے ارادوں کی قیمت معلوم ہے۔ اِسی لئے میری زندگی انہیں اس قدر عزیز ہے۔ اور اِسی لئے یہ غیر معمولی طور پر گھبرائے سے رہتے ہیں۔

میرا بھولی بھی عجیب تھا۔ جب اُس کی ننھی سی توند نرم ولطیف کیڑوں، اور تازہ بیجوں سے بھر جاتی تو میں سو جاتا۔ اور اس طرح کہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر اور جب پیٹ خالی ہو جاتا اپنی چونچنی سی کھول کر چی چی، شروع کر دیتا۔ لیکن میری حالت اس کے بالکل برعکس تھی۔ میں اُن دنوں کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ جب مجھے جوان ہو کر پرواز شروع کرنا تھی۔ ہر نیا دن جہاں اُس مبارک وقت کو قریب تر لا کر مجھے مسرُور بنا دیتا تھا وہاں میرے دل میں تازہ آرزوئیں پیدا کر کے وقتِ اضطراب بھی کر دیتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد اپنے گھونسلے کی تنگیوں سے رہائی پا کر کھُلی فضاؤں میں اُڑتا پھروں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُس نیلی نیلی فضا سے بھی پرے پہنچنا چاہتا تھا جو حدِ نگاہ تک ہر طرف محیط تھی +

یہ خیالات ہی شاید میرے بازوؤں کو قوت عطا کر رہے تھے۔ اور میرے جسم کو زیادہ سے زیادہ چست و چالاک بنا رہے تھے

میرا نیند کا متوالا ساتھی بھی جسم میں بڑھ رہا تھا۔ مگر وہ ہر وقت بے حس سا نظر آتا تھا۔ میری حالت تو یہ تھی کہ جب رات کے وقت میرے ماں باپ ہمیں اپنے گرم گرم پروں میں لے کر سو جاتے تو میں چپکے سے باہر کھسک آتا۔ اور اِدھر اُدھر اُن فضاؤں پر حسرت آمیز نگاہیں ڈالتا جہاں میری آرزوؤں کو تکمیل کا طغرائے امتیاز حاصل کرنا تھا۔ تاریک راتوں میں ننھے ننھے چمکتے ہوئے تارے مجھے اپنے جیسے دلیر پرندے معلوم ہوتے جو اپنے ارمان نکالنے کے لئے اُوپر ہی اُوپر چلے جاتے تھے۔

وہ وقت میرے دل میں ایک فرحت انگیز تڑپ پیدا کر دیتا تھا جب میرے والدین بیٹھے بیٹھے خوراک کی تلاش میں پرواز کر جاتے یا جب وہ ایک کامیاب اُڑان کے بعد اپنے پروں کو فاتحانہ انداز میں کھولے ہوئے گھونسلے میں واپس آتے۔ واپسی پر جب وہ ہمارے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے یا پھدک کر کبھی یہاں کبھی وہاں جا بیٹھتے۔ اُن کی زبان چُوں چُوں کے نغمے الاپتی اُن کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ اور اُن کے پر و بال اور دُم ایک برقی قوت کے ساتھ رقص کی جولانیاں دکھاتے تو یہ منظر اور بھی مسرور کن ہوتا۔

وہ دن بھی آ گئے جب میری آرزوؤں نے پر و بال کی صُورت اختیار کر لی۔ اب میں زیادہ بیتاب رہنے لگا۔ میرے ماں باپ ہر روز پرواز کی "بسم اللہ" کرانے کا وعدہ کرتے۔ میں بڑا مصر تھا۔ آخر ایک روز مجھے ساتھ لے گئے اور ایک مختصر سا چکر دلا کر واپس لائے۔ واپسی پر میں اپنے بدن میں تازہ قوت کی بجلی پاتا تھا۔ کئی روز اس طرح گزرے کہ میں اپنے والدین کی حفاظت میں باہر چلا جاتا اور لوٹ آتا۔ لیکن اب یہ حفاظت میرے لئے بارِ گراں بن رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو کسی طرح بھی اپنے والدین سے کم نہ پاتا تھا۔ بلکہ ایک بات میں میں اُن سے فائق بھی تھا۔ اِرادوں نے جو آگ میرے تن بدن میں لگا رکھی تھی۔ اُس سے وہ نا آشنا اور بے بہرہ تھے اور اِسی لئے میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں نے کئی بار اُن سے شکوہ بھی کیا۔ وہ جب میرے خیالات اور میری خواہشات سے آگاہ ہوئے تو ہکا بکا سے رہ گئے۔ میں نے اُنہیں کہا کہ چڑیوں کی نسل میں مجھ جیسے بچے کم پیدا ہوا کرتے ہیں۔ آپ کے پر و بال اتنے سخت کوش اور بلند پرواز نہیں جتنے کہ میرے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی جگہ بھی ایسی رہ جائے جہاں میں نے پر کشائی نہ کی ہو۔

ایک روز جب میرے ماں باپ موجود نہ تھے۔ میں نے پروں کو خُوب تول کر اُڑنا شروع کر دیا۔ میں ایک ہی سمت میں سیدھا اُڑتا جاتا تھا۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ درخت میرے تلے پیچھے کی طرف بھاگتے جاتے ہیں اور وادیاں پیچھے رہتی جاتی ہیں۔ میں خوش تھا۔ کہ حصُولِ مقصد کے لئے سرگرم پرواز تھا۔ کبھی کبھی فرطِ انبساط سے اُڑتے ہوئے گانے بھی لگ جاتا۔ دُوسرے پرندے میرے سبک سیر ہونے پر حیران تھے اور تعجب آمیز نگاہوں سے تکتے ہی رہ جاتے تھے۔ اُڑتے اُڑتے میرے پروں نے کسی نامعلوم احساس کے زیرِ اثر یک لخت مجھے ایک درخت پر بٹھا دیا۔ مجھے بیٹھے تھوڑا ہی عرصہ ہُوا تھا کہ میرے ماں باپ چڑیوں کے ایک جھنڈ کے ساتھ اُڑتے ہوئے اچانک آ پہنچے۔ مجھے وہاں دیکھ کر سخت برہم ہوئے۔ غصّے میں میرے سر پر دو ایک زور کی چونچیں بھی لگائیں جو ٹھینگوں کی طرح

پڑیں ۔ مجھے سانڈیا اور گھونسلے میں پہنچا دیا ۔ اب تو پابندیوں کی انتہا ہوگئی ۔ والدین میں سے ایک نہ ایک ہر وقت میرے ساتھ تھا ۔ میرے لئے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت تھا ۔ آخر مجھے تنہا اُڑنے کے لئے کیوں نہ آزاد کر دیا جاتا ۔ کیا میرے خواب بے حقیقت تھے ؛ میری پہلی پرواز کتنی کامیاب تھی ۔ اور اگر میں یونہی درخت پر نہ بیٹھ جاتا تو یُوں گرفتار نہ ہُوا ہوتا ۔ اب مَیں اُوپر کی طرف اُڑنا چاہتا تھا میرے بال و پر میرا حوصلہ بندھاتے تھے اور اشارہ کرکے کہتے تھے کہ ہم تجھے اُس نیلگوں فضا میں پہنچا دیں گے ۔ ــــ میرا ہمزاد واقعی بڑا کم کوش تھا ۔

ایک رات جب کہ میرے ماں باپ اپنے نرم نرم گھونسلے میں میٹھی نیند سو رہے تھے ، میں نے بلندیوں کی طرف پرواز شروع کر دی ۔ اتنی تیزی اور جوش کے ساتھ کہ جب میں نے کچھ دیر کے بعد نیچے نگاہ ڈالی تو ہر چیز مجھے کئی گُنا میں گہرائی میں نظر آتی تھی ۔ خوشی سے میرے پر اُور بھی سبک پرواز ہو گئے ۔ میں تاروں کی محفل میں پہنچ جانا چاہتا تھا ۔ مَیں نے جب تاروں کی طرف نظر کی تو وہ مجھے اُتنے ہی دُور نظر آئے جتنے کہ اپنے گھونسلے سے ، بلکہ اُس سے بھی دُور ۔ میں کچھ گھبرا سا گیا ۔ لیکن بلندیٔ عزم نے ڈھارس بندھائی اور زیادہ مستقل مزاجی سے اُڑنے لگ گیا ۔ نیچے کی طرف تو اب کوئی چیز دکھائی بھی نہیں دیتی تھی ۔ ایک بڑا وسیع سیاہ کرہ تھا جو ہولناک سا معلوم ہوتا تھا ۔ تارے اُتنے ہی دُور نظر آتے تھے اور مجھے دیکھ کر شاید حقارت کی ہنسی ہنس رہے تھے ۔ اب میں مایُوس ہوتا جاتا تھا اور پرواز میں بھی اضمحلال پیدا ہو چکا تھا ۔ میرے پر و بال بڑے سُست پرواز تھے ۔ اچانک میری آنکھیں بند ہوگئیں اور خبر نہیں کیا ہُوا ۔

دوسرے روز میں نے اپنے آپ کو زمین پر پایا ۔ جوڑ جوڑ میں درد تھا ۔ ہلنے جُلنے کی سکت نہ تھی اور ایک پر ٹُوٹ چکا تھا ۔ بہت دنوں تک میں زمین پر ہی اُس شکستہ پر کو سنبھالے جھاڑیوں میں چھپتا پھرا ۔ اُڑنا محال تھا اور اب تو ہمت بھی جواب دے چکی تھی ۔ ایک عرصے کے بعد میں معمولی سی پرواز کے قابل ہو گیا ۔ احساسِ ندامت نے اپنے گھونسلے کی تلاش کے قابل نہ چھوڑا ۔ آہستہ آہستہ میرے ساتھ ایسے ہم جنسوں کی ایک بڑی تعداد رہنے لگی جن کی کہانی اتنی ہی ناگفتنی تھی جتنی میری ۔

عبدالغنی بی اے

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

شاعرِ اور دریا

شاعر

وقفِ خروش ہر دم ہر دم رواں دواں ہے
اے بے قرار دریا! منزل تری کہاں ہے
چلتا نہیں ہے شب کا افسونِ خواب تجھ پر!
طاری ہے کس بلا کا یہ اضطراب تجھ پر!
تیرے جہاں میں کوئی شام و سحر نہیں ہے
تیرے سفر پہ ان کا کچھ بھی اثر نہیں ہے
گو بے قرار ہے تو، لیکن حزیں نہیں ہے
رنگیں ہے تیرا نغمہ اندوہگیں نہیں ہے
کتنے ہی پتھروں سے ٹکرائے جا رہا ہے

فرطِ طرب سے پھر بھی تو گائے جا رہا ہے

سینے میں تیرے برپا اک شورِ ہاو ہو ہے

اے اضطرابِ پیہم! کیا تیری آرزو ہے

دریا

رکھتی ہے بیقرار مجھے آرزوئے دوست
ہر دم رواں دواں ہوں کہ ہے جستجوئے دوست

ہے کلفتِ سفر میں بھی اک تازگی اگر
آئینۂ خیال میں ہو عکس روئے دوست

ہوں بے نیاز فکرِ نشیب و فراز سے
جاتا ہوں برق وار کہ جاتا ہوں سوئے دوست

رنگینیوں کی جان ہے وہ نغمۂ شباب
جس نغمۂ شباب میں ہو رنگ و بوئے دوست

کتنی بلندیوں سے میں آیا ہوں سر کے بل
ہے عرش سے عزیز مجھے خاکِ کوئے دوست

اک حسنِ لازوال ہے میرے شباب میں
اس آئینہ میں رہتی ہے تصویرِ روئے دوست

اتنی بھی تجھ سے کی کہ تجھے ذوقِ عشق ہے

ورنہ کسی سے کرتا ہوں کب گفتگوئے دوست

اثر صہبائی

(جون گولز وردی کی ایک مشہور تمثیل)

افراد :- ایک افسر، ایک لڑکی

جنگِ عظیم کا زمانہ ———— شام

(ایک خالی کمرہ ۔ کھنچے ہوئے پردوں، مدھم روشنی اور فرنیچر سے ہلکی سبزی عیاں ہے ۔ بائیں جانب آتشدان، صوفہ، اور ایک چھوٹی میز ہے ۔ پشت کی دیوار میں ایک دریچہ ہے جس پر پردہ پڑا ہؤا ہے ۔ میز پر گلدان میں ہری بھری شاخوں سے گندھا ہؤا ایک گلدستہ ہے ۔ دائیں طرف کے دروازے سے ایک لڑکی اور خاکی کپڑوں میں ملبوس ایک افسر داخل ہوتا ہے ۔ لڑکی کے کپڑے، ٹوپی اور نقاب سیاہی مائل ہیں ۔ افسر دراز قد ہے اس کا کھلا کھلا چہرہ تروتازہ، نیلی آنکھیں ترحم آمیز، اور پاؤں میں کسی قدر لنگ ہے ۔ لڑکی دریچے کا پردہ ہٹا کر اسے کھولتی ہے اور چاند کی تیز اور شفاف روشنی اندر آتی ہے ۔ باہر سے چند درخت نظر آ رہے ہیں اور وہ اُنہیں دیکھنے میں محو ہو جاتی ہے لیکن فوراً ہی خود بخود ایک کپکپی کے ساتھ اس طرف مُڑتی ہے ۔)

نوجوان افسر ۔ جب میں نے تم سے پہلے پہل بات کی تو تم رو کیوں رہی تھیں ؛

لڑکی ۔ یونہی ذرا کچھ یاد کر کے طبیعت بھر آئی تھی ۔ (وہ نقاب اور ٹوپی اُتار دیتی ہے ۔ اس کے بال سنہری اور گھنگریالے ہیں ۔)

افسر ۔ (دریچے تک لنگڑاتا ہؤا پہنچتا ہے) میں کہتا ہوں، تم نے یہ ——— ایسی زندگی کیوں اختیار کی ۔ کیا یہ شرمناک نہیں ہے ؛

لڑکی ۔ ہے تو سہی ۔ تم زخمی ہو گئے ہو ؛

افسر ۔ ہسپتال سے آج ہی نجات مِلی ہے ۔

لڑکی ۔ آہ ! یہ تمام تباہ کاریاں جنگ ہی کی بدولت ہیں ۔ یہ کب ختم ہو گی ؛

افسر ۔ (دریچے پر جھک کر اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) تم کس قوم سے تعلق رکھتی ہو ؛

لڑکی ۔ (جلدی سے) روسی ۔

افسر ۔ اچھا ! میری کبھی کسی روسی لڑکی سے ملاقات نہیں ہوئی ۔

لڑکی۔ (افسر کے بازو میں اپنا ہاتھ ڈال کر آہستہ سے مسکراتی ہے) تم یہاں اس لئے آئے ہو کہ میں مغموم ہوں، دوسرے اس لئے آتے ہیں کہ میں مسرور ہوتی ہوں مگر میں مردوں کی بالکل شائق نہیں۔

افسر۔ تم مردوں سے واقف نہیں ہو، وہ بڑے بہادر ہوتے ہیں۔

لڑکی۔ تم بھی کچھ کم نہیں معلوم ہوتے۔

افسر۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ سچ جانو جب ہم نے حملہ کیا ہے (جہاں میں زخمی ہوا تھا) تو ہم میں سے ہر شخص اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔

لڑکی۔ (حیرت زا آواز میں) شاید ــــــ دشمن بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔

افسر۔ ہاں، بیشک۔

لڑکی۔ کم ظرف لوگ دشمن کی بہادری کا اعتراف نہیں کرتے۔ اس لئے مجھے اُن سے نفرت ہے مگر تم بہت اچھے لڑکے ہو، ہیں نا؟

(افسر یہ طرز تخاطب پسند نہیں کرتا اس لئے اس کی تیوری پر ہلکا سا بل آجاتا ہے)

لڑکی۔ (اس سے قریب ہوتے ہوئے) ہیں تو تمہیں اسی لئے پسند کرتی ہوں۔ اچھے آدمی سے ملاقات ہونی خوش نصیبی ہے۔

افسر۔ اس لئے کہ تم تنہا ہوں؟ کیا تمہارے رُوسی دوست نہیں ہیں؟

لڑکی۔ (فوراً ہی) روسی؟ نہیں۔ شہر بھی تو کتنا بڑا ہے۔ مجھ سے ملنے سے پہلے کیا تم تماشے میں تھے؟

افسر۔ ہاں۔

لڑکی۔ میں بھی وہیں تھی۔ مجھے موسیقی سے بہت محبت ہے۔

افسر۔ شاید سب ہی روسیوں کو ہوتی ہے۔

لڑکی۔ میرے پاس جب بھی پیسے ہوتے ہیں، میں وہاں ضرور جاتی ہوں۔

افسر۔ ہیں؟ کیا تم اس قدر مفلس ہو؟

لڑکی۔ ہاں۔ میرے پاس اس وقت صرف ایک شلنگ ہے۔

(وہ ہنستی ہے اور اس کی ہنسی جو تلخی آمیز ہے افسر کو پریشان کر دیتی ہے۔ وہ دریچے کی سِل پر بیٹھ کر اس کی طرف جھک جاتا ہے)

افسر۔ تمہارا نام کیا ہے؟

لڑکی۔ مے۔ مگر میں تمہارا نام پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔

افسر۔ (ہنستے ہوئے) معلوم ہوتا ہے تمہیں کسی پر اعتماد نہیں ہے۔

لڑکی۔ نہیں۔ لیکن اس کی کچھ وجوہ بھی ہیں۔

افسر۔ ہونگی۔ تم ہم مردوں کو درندے ہی سمجھنے پر مجبور ہو۔

لڑکی۔ (دریچے کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ چاندنی میں اس کے غازہ ملے ہوئے رخسار دمک رہے ہیں) کچھ ایسی ہی وجوہ ہیں جو میں ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں اور کسی پر بھروسا نہیں کر سکتی۔ تم نے بہت سے جرمنوں کو جان سے مار دیا ہوگا؟

افسر۔ یہ تو صرف اس وقت معلوم ہو سکتا ہے جب لڑائی دست بہ دست ہو اور یہ نوبت ابھی تک نہیں آئی۔

لڑکی۔ لیکن جرمنوں کو قتل کر کے تمہیں خوشی تو بہت ہوتی ہوگی

افسر۔ نہیں۔ ہم صرف اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔

لڑکی۔ اُف! کس قدر خوفناک وقت ہے۔ میرے بھائی تو شاید مارے جا چکے ہوں گے۔

افسر۔ کیا اُن کے پاس سے کوئی خبر نہیں آتی؟

لڑکی۔ خبر؟ نہیں، میرے وطن والوں کی خبریں یہاں نہیں آتیں۔ اور میرا تو اب کوئی وطن بھی نہیں ہے۔ میرا باپ، ماں، بہنیں، بھائی سب مر کھپ چکے ہیں۔ آہ! وہ صورتیں اب کہاں نظر آئیں گی! دیکھو تو یہ مہیب جنگ دلوں کو توڑے دیتی ہے۔ جانتے ہو، جب تم میرے پاس آئے تھے تو میں کیا سوچ رہی تھی؟ مجھے اپنا وطن یاد آ رہا تھا۔ جہاں چاندنی رات میں دریا گنگناتا ہے۔ کیا تم کبھی اپنے وطن سے جدا ہوئے ہو؟ کیسا دُکھ ہوتا ہے! —— یہاں سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں، کیا خبر ایک دن یہ لوگ مجھے قید بھی کر دیں۔

(اس کے سینے کے زیر و بم سے اس کے دماغی انتشار کا پتہ چلتا ہے)

افسر۔ (تسلی دیتے ہوئے) نہیں، نہیں، فکر مت کرو۔

لڑکی۔ تم پہلے آدمی ہو جس نے اس طویل عرصے میں پہلی بار مجھ سے ہمدردی کی ہے۔ مجھے تم سے سچ سچ کہہ دینا چاہیے —— میں روسی نہیں ہوں —— جرمن ہوں!

افسر۔ تو کیا ہُوا، ہم عورتوں سے نہیں لڑ رہے۔

لڑکی۔ (اس کی طرف دیکھتے ہوئے) ایک اور آدمی نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا لیکن اُسے محض اپنی دلبستگی کا خیال تھا۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔ مجھے تم سے مل کر جتنی خوشی ہوئی ہے، کہہ نہیں سکتی —— اچھا، فرض کرو میں اب بھی باعصمت ہوں —— جیسے کہ پہلی تھی —— اور تم مجھے اپنی ماں بہنوں میں لے جا کر کہو "یہ بیچاری ایک مفلس جرمن لڑکی ہے جس کا دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔" معلوم ہے کیا جواب ملے گا، یہی کہ "جرمن لڑکی! خیر، افسوس۔" اور اس کے بعد مجھے ناپاک سمجھ کر وہ اپنے ہاتھ ضرور دھوئیں گی۔

(افسر خاموش ہے اور اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے)

لڑکی۔ سمجھے تم! وہ ایک جرمن کا جا ہے وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، اپنے گھر میں گھُسنا بھی پسند نہیں کریں گی ـــــ اور میں اب اچھا ہونا بھی نہیں چاہتی۔ زمانے نے مجھے بُرا رہنا سکھا دیا ہے۔ کیا تم مجھے پیار نہیں کرو گے؟

(وہ اپنا چہرہ اس کے قریب لاتی ہے لیکن اس کی نظریں افسر کے خیالات پراگندہ کر دیتی ہیں اور وہ پرے ہٹ جاتا ہے)

لڑکی۔ (اس کو گھورتے ہوئے) کیا تم ہم لوگوں سے اتنی نفرت کرتے ہو؟

افسر۔ (فوراً ہی) نفرت؛ نہیں تو۔

لڑکی۔ میں تو انگریزوں تک سے نفرت نہیں کرتی ـــــ ہاں اُنہیں حقارت سے دیکھتی ہوں۔ اپنی قوم کو بھی حقارت سے دیکھتی ہوں بلکہ زیادہ حقارت سے، کیونکہ جنگ شروع اُنہوں ہی نے کی تھی۔ مجھے سب ہی قوموں سے نفرت ہے۔ آخر اُنہوں نے دُنیا میں یہ ہلڑ بلڑ کیوں مچا رکھی ہے؛ اور یہ قتل و غارت کیوں کیا جا رہا ہے؛ کتنی ہزاروں اور لاکھوں جانیں اس لڑائی کے بھینٹ چڑھ چکی ہیں اور وہ بھی بے فائدہ! اُنہوں نے دُنیا کو کس قدر خوفناک اور گھناؤنا بنا دیا ہے! حقارت و عداوت کے چشمے پھوٹ پڑے ہیں اور ہر چیز تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ اور مجھے بھی انہوں ہی نے برباد کیا ہے۔ اب میرا ایمان بھی سلامت نہیں رہا۔ ایمان کس پر لاؤں؛ خدا پر؟ کیا اس کا کہیں وجود ہے؛ نہیں۔ اور یہ نمازیں ـــــ کیا مضحکہ خیز نہیں ہیں؛ کبھی میں مسیح کو بھی جانتی تھی۔ اب تو عیار اور احمق کے سوا اُسے کوئی نہیں مان سکتا۔ میں چاہتی ہوں کہ ہسپتال میں تم جیسے غریب لڑکوں کی مدد کروں لیکن ـــــ چونکہ میں جرمن ہوں، اس لئے وہ مجھے نکال باہر کریں گے۔ یہ تعصب یہاں ہی نہیں، جرمنی، روس، فرانس، غرض ہر جگہ ہے۔ تو کیا پھر بھی میں خدا اور یسوعؑ پر ایمان لاؤں؛ ـــــ کبھی نہیں۔ میرے خیال میں ہم سب درندے ہیں اور بس! ـــــ تم یہ نہ سمجھنا کہ میری مایوس زندگی مجھ سے یہ سب کچھ کہلوا رہی ہے۔ لوگ اپنے آپ کو اب مہذب اور عالی ظرف سمجھنے لگے ہیں اور پھر بھی جنگ کا باعث ہوتے ہیں، چنانچہ قتل و خون اور تباہی و بربادی شروع ہو جاتی ہے۔ جوان موت کے گھاٹ اُتارے جاتے ہیں، بے گناہوں کو جیلخانوں میں سڑایا جاتا ہے اور ہم میں منافرت پیدا کی جاتی ہے۔ اور یہ خود غرض وحشی بھی، جو اخبار نویس اور افسانہ نگار بنتے ہیں ـــــ میرے وطن میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے ـــــ اس قابلِ نفرین عمل میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو کہتی ہوں کہ ہم سب درندے ہیں۔

(افسر زچ ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ لڑکی اس پر نظریں جمائے رہتی ہے)

لڑکی۔ میری باتوں کا بُرا نہ ماننا۔ میرا کوئی اور نہیں ہے جس سے بات کر کے دل کی بھڑاس نکال سکوں۔ اگر تمہیں ناگوار گزرتا ہے تو میں اب کچھ نہیں کہوں گی۔

افسر۔ نہیں، نہیں، جو تمہارا دل چاہے کہو۔ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ میں تمہاری ہر بات سے متفق ہوں۔

(وہ دیوار سے الگ کھڑی ہوگئی ہے اور اس کے سیاہ لباس میں چاند کی کرنیں جھلملا رہی ہیں۔ اس کی آواز نرم، آہستہ، اور تلخ ہے۔)

لڑکی۔ اچھا تم ہی بتاؤ اس دنیا کا آخر انجام کیا ہوگا جہاں لاکھوں آدمی بے گناہ عذاب میں مبتلا کئے جاتے ہیں۔ کیا تم ایسی دنیا کو خوبصورت کہہ سکتے ہو؟ جب مجھے اپنے ہموطنوں کا خیال آتا ہے کہ وہ دکھ اور مصیبت میں گرفتار ہیں تو میں کانپ اٹھتی ہوں اور اسی طرح جب میں یہاں کے قیدیوں اور اُن لوگوں کے متعلق سوچتی ہوں جو اپنے چہیتوں سے جُدا ہو گئے ہیں تو مجھے بڑا رنج ہوتا ہے۔ کیا میں ان سب کو بھول جاؤں؟ اور اگر نہیں تو پھر اس دُنیا کو خوبصورت اور اچھا کیسے مان لوں؟

(افسر خاموش کھڑا اس کی طرف تک رہا ہے)

لڑکی۔ ہر شخص کی زندگی جلد ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد کچھ بھی نہیں۔

افسر۔ کیوں نہیں؟

لڑکی۔ تم سمجھتے ہو کہ جنگ مستقبل کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے! تم اپنی جانیں اس اُمید میں لڑاتے ہو کہ دُنیا بہتر ہو جائے! ہے نا؟

افسر۔ ہاں، جب تک فتح حاصل ہو، ہمیں لڑتے رہنا چاہئے۔

لڑکی۔ جب تک نہیں فتح حاصل ہو! میری قوم بھی یہی سمجھتی ہے۔ تمام قومیں یہی سمجھتی ہیں کہ اگر وہ جیت جائیں تو دُنیا کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوگا، دُنیا اور بھی بدتر ہو جائے گی لیکن یہ کبھی نہیں ہوگا، دُنیا اور بھی بدتر ہو جائے گی۔

(وہ ٹوپی اُٹھا کر جانے لگتا ہے۔ لڑکی کی آواز اس کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔)

لڑکی۔ میری طرف سے کوئی جیتے! میرا ملک اگر ہار بھی جائے تو مجھے پروا نہیں۔ مجھے سب سے نفرت ہے — درندے! — وحشی! مگر تم جا کیوں رہے ہو۔ اچھا لو میں بالکل خاموش ہو جاتی ہوں۔

(افسر اپنی جیب میں سے کچھ نوٹ نکال کر میز پر رکھتا ہے اور اس کے قریب جاتا ہے۔)

افسر۔ خدا حافظ۔

لڑکی۔ (غمگین ہو کر) کیا تم سچ مچ جا رہے ہو؟ کیا تم مجھے پسند نہیں کرتے؟

افسر۔ کیوں نہیں، میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔

لڑکی۔ تو کیا اس لئے جا رہے ہو کہ میں جرمن ہوں؟

افسر۔ نہیں۔

لڑکی۔ تو پھر تم ٹھیرتے کیوں نہیں ؟

افسر۔ جاننا چاہتی ہو؟ —— تم نے میرا دماغ مختل کردیا ہے۔

لڑکی۔ کیا تم مجھے ایک بار بھی پیار نہیں کروگے؟

(وہ اپنے لب اس کی پیشانی پر رکھ دیتا ہے)

لڑکی۔ (ہنستے ہوئے) تم کتنے اچھے ہو! مجھ سے تھوڑی دیر باتیں کرو، کوئی اور شخص مجھ سے بات نہیں کرتا۔ ہاں، کیا تم نے بہت سے جرمن قیدیوں کو دیکھا ہے۔

افسر۔ (ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے)۔ ہاں۔

لڑکی۔ اُن میں کچھ رائین کے بھی تھے؟

افسر۔ شاید؟

لڑکی۔ کیا وہ بہت رنجیدہ تھے؟

افسر۔ بعض رنجیدہ تھے، بعض خوش بھی۔

لڑکی۔ تم کبھی رائین گئے ہو؟ آج رات وہ دیکھنے کے قابل مقام ہے۔ ایسی ہی چاندنی وہاں بھی ہوگی اور جس طرح یہاں درخت خوشنما معلوم ہو رہے ہیں وہاں بھی بڑے دلفریب معلوم ہو رہے ہوں گے . . . . یہ جنگ کیا حماقت کا ثبوت نہیں ہے؟ گویا زندہ رہنا کوئی جرم ہے!

افسر۔ تم زندگی کی حقیقت اس وقت تک نہیں سمجھ سکتیں جب تک کہ تمہیں موت سے دوچار ہونا نہ پڑے، اور جب تم دوسروں کے لئے اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہوجاؤ تو اس وقت جو لطف محسوس ہوتا ہے اس کے آگے بڑی سے بڑی عمر ہیچ ہے۔

(وہ رُک جاتا ہے اور اس لڑکی کے آگے ایسی باتیں کرتے ہوئے جن کو وہ ڈھکوسلا سمجھتی ہے، شرم محسوس کرتا ہے)

لڑکی۔ (آہستہ سے) تمہارے یہ چوٹ کس طرح لگی تھی؟

افسر۔ حملہ کرتے وقت۔

لڑکی۔ جب اُنہوں نے تمہیں حملے کا حکم دیا تو کیا تمہیں قطعی کوئی خوف نہیں معلوم ہوا؟

(وہ سر ہلا کر انکار کرتا ہے اور ہنستا ہے)

افسر۔ واہ، یہ تو ایک کارنامہ تھا۔ اس روز ہم نے خوب خوشی منائی۔

لڑکی۔ خوشی منائی؟

افسر۔ ہاں۔ ملک کی خاطر قربان ہو جانا خوش بختی ہے ۔

لڑکی۔ میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔ میرا دل مرچکا ہے۔

افسر۔ صرف تمہاری رائے میں۔ اگر یہ دراصل مرچکا ہوتا تو مجھ سے ملاقات کے وقت تم روتیں نہیں۔

لڑکی۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اگر دل مُردہ نہ ہو چکا ہوتا، تو میں اس طرح زندہ نہیں رہ سکتی تھی کہ ـــــ راتوں کو گلیوں میں ماری ماری پھرتی رہوں، ہر اجنبی شخص پر جھوٹی محبت کا اظہار کروں، کبھی کسی سے ہمدردی کا ایک لفظ نہ سنوں اور اس خیال سے ہمیشہ منہ بند رکھوں کہ کوئی مجھے پہچان نہ لے کہ میں جرمن ہوں۔ صرف آج رات میں اپنے آپ کو سمجھ رہی ہوں ورنہ مجھے کبھی اور کسی کی پروا نہیں رہتی۔

افسر۔ اور ابھی جو تم اپنے ہموطنوں اور قیدیوں وغیرہ کو یاد کر کے کڑھ رہی تھیں ؟

لڑکی۔ ہاں، اس لئے کہ وہ رنج و الم میں مبتلا ہیں اور جو رنج و الم میں مبتلا ہے وہ میری طرح ہے ـــــ مجھے اپنے پر بھی تو ترس آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور محبت و خلوص تو اس دُنیا میں بے معنی ہیں۔ ہم صرف اپنے تئیں سے محبت کرتے ہیں اور اس کے علاوہ ہمیں کسی کی پروا نہیں رہتی۔

(یہ تلخ اور تکلیف دہ باتیں سُن کر وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک اخبار فروش آواز لگا رہا ہے۔ لڑکی کی اُنگلیاں اس کی اُنگلیوں میں پھنس جاتی ہیں۔ وہ مڑ کر اس کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ باوجود مصنوعی آرائش کے اس کا پُرمعصیت حُسن دلکش ہے۔)

افسر۔ کیوں نہیں۔ ہم صرف اپنے آپ ہی سے محبت نہیں کرتے۔ دُنیا میں اس سے کچھ زیادہ بھی ہے۔ میں اس کو بتا نہیں سکتا لیکن کوئی عظیم ترین وصف ہے ضرور، ہمدردی اور ـــــ اور ـــــ

(اخبار فروشوں کی آوازیں تیز ہو رہی ہے مگر ان کی گرمجوشی اور بہت سی چیخوں کی وجہ سے الفاظ صاف نہیں سُنائی دیتے۔ افسر سننے کے لئے کان ایک طرف لگا دیتا ہے۔ اس کے بازو کے گرد، لڑکی کے ہاتھ کی گرفت ـــــ مضبوط ہو جاتی ہے۔ چاند کی روشنی میں بہت سی صُورتیں نظر آتی ہیں، کوئی بھاگ رہا ہے، کوئی پکار رہا ہے، کوئی خوشی سے شور مچا رہا ہے۔ وہ بھی سُن رہی ہیں، آوازیں قریب آ رہی ہیں " فتحِ عظیم ـــــ فتحِ عظیم ـــــ ہماری فتح! دشمن کو شکستِ فاش !" خبر آناً فاناً پھیل جاتی ہے، وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور اپنا دھڑ دریچے سے باہر نکال کر پاگلوں کی طرح ٹوپی اُچھالتا ہے۔ پھر باہر نکل جانا چاہتا ہے کہ کسی نرم و نازک شے سے ٹکر ہوتی ہے۔ لڑکی مٹھیاں بند کئے کھڑی ہے اور اس کے چہرے پر کرب و پریشانی کے آثار ہیں۔ وہ اس کے ہاتھ کو بوسہ دینے کے لئے جھکتا ہے۔ لڑکی اُن نوٹوں کا بٹوا لیتی ہے جو افسر نے میز

پر رکھے تھے اور ہاتھ میں لے کر اس کی طرف بڑھاتی ہے۔)

لڑکی۔ ان کو واپس لے لو —— میں تمہاری انگریزی دولت نہیں لینا چاہتی —— ان کو لے لو۔

(یکایک وہ ان نوٹوں کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیتی ہے اور ان کو فرش پر بکھیر کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے وہ اس کی طرف کھڑا دیکھ رہا ہے لیکن فوراً ہی دروازے کا رُخ کرتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ خاموش کھڑی ہے۔ اس کی ٹھوڑی اس کے سینے پر لٹک آئی ہے اور اس کے کانوں میں بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ کوئی چیخ چیخ کر خوشی سے کہہ رہا ہے "شکستِ فاش!" وہ نوٹوں کے پُرزوں میں گھری ہوئی چاند کی روشنی کو دیکھ رہی ہے۔ لیکن وہ اپنے گرد و نواح کو نہیں دیکھ رہی بلکہ اس کی نگاہوں میں جرمنی کا ایک پھلوں والا باغ ہے جہاں وہ اپنی چھوٹی سی عمر میں سیب توڑتی پھر رہی ہے اور ایسی ہی اور بہت سی تصویریں۔ پھر وہ فرش پر گر پڑتی ہے اور اس کی پیشانی خاک آلود قالین پر ڈھلک آتی ہے۔ یکبارگی وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور اُن پھٹے ہوئے نوٹوں کو جمع کرتی ہے۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہ رہے ہیں۔)

لڑکی۔ شکست! اے میرے غریب وطن! شکست! ...... ایک شلنگ!

(دفعتہً چمکتی ہوئی چاندنی میں وہ اپنی پوری طاقت سے ایک پُرسوز اور رنج و الم میں ڈوبا ہوا نوحہ گانے لگتی ہے —— اور باہر لوگ گاتے ہوئے گزر رہے ہیں) : ——

"برطانیہ زندہ باد!"

(پردہ گرتا ہے)

(ترجمہ بہ تصرّف) **صادق الخیری**

یوں درد و کرب سے نہ رہوں بیقرار میں

پروانہ وار اگر ہوں وطن پہ نثار میں

رُباعیات

۱

جب میں نے کہا کہ پہلے ہنستے میں آنسو چھپا کے دیکھ

نازک ہے وہ شیشہ مرے ہاتھ سے تو اٹھا کے دیکھ

جب دل کو گرا دیا نظر سے تو نے

کیا حال ہے اس کا دیکھنے والے دیکھ

۲

امید وفا سے یار نا ممکن ہے

پایا کوئی عمر بھر سراب نا ممکن ہے

دنیا والوں نے یہ دیے ہیں دھوکے

اپنا بھی اب اعتبار نا ممکن ہے

۳

افسانۂ کلفتِ انسانی سن لے

عشق کی کہانی سن لے

سوزِ غم ... بیزار

میں تجھ سے نشاط آرائی کی ... سن لے

میرا قصہ مری زبانی سن لے

۴

دل میں رکھوں تو روح گھبراتی ہے

کہتے ہوئے خود زبان شرماتی ہے

مجھ کو کیا جانے تم سے کیا کہنا ہے

آ آ کے لبوں پہ بات رہ جاتی ہے

پربھان شنکر

(خلف چودھری جگت موہن لعل [illegible])

چچا "سوانچہ خمری" نے سائیکل چلانا سیکھا

یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ چچا سوانچہ خمری کب، کن حالات اور قدرت کی کن کن ضرورتوں کے پیشِ نظر کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں تشریف لائے۔ مگر ایک بات یقینی ہے کہ چچا سوانچہ خمری کے نہ ہونے سے دنیا ایک ایسے باکمال انسان کے وجود سے محروم رہ جاتی جس کا ثانی ملنا ناممکنات میں سے ہے۔

بچپن میں چونکہ آپ "سوانح عمری" کو نامعلوم وجوہ کی بنا پر "سوانچہ خمری" پڑھا کرتے تھے اس لئے اب ہر کس و ناکس انہیں اسی نام سے یاد کرتا ہے۔

بیٹھے بٹھائے چچا کو خیال آیا کہ تمام دُنیا سائیکل چلاتی ہے۔ ایک ہمیں ہیں کہ باوجود باکمال ہونے کے اس ہُنر سے ناآشنا ہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ چچا نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا عزم بالجزم کر لیا۔ اعجاز سے بائیسکل عاریتہً منگا بھیجا کہ "میاں تم لوگ جب بائیسکل پر چڑھتے ہو تو مجھے رشک آتا ہے۔ آج ہم نے بھی پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ بائیسکل چلانا سیکھیں۔ اس لئے ذری ہمیں اپنی بائیسکل بھیج دینا۔ حرجے خرچے کے ہم ذمہ دار ہوں گے"۔ نوکر یہ پیغام لے کر روانہ ہوا تو آپ کو فکر ہوئی کہ شلوار کا بائیسکل کے پہیوں میں پھنس کر پھٹ جانے کا خدشہ ہے۔ اس لئے عقلمندی اسی میں ہے کہ برجس پہن کر بائیسکل چلانا سیکھا جائے۔ مگر یہاں یہ مشکل آن پڑی کہ آپ کے پاس برجس ایک بھی نہ تھی۔ بہت غور و فکر کے بعد اس گتھی کو یوں سُلجھایا کہ اپنے ایک بزرگ کی فوجی برجس غائب کی جائے۔ فوراً اس بات پر عمل کیا گیا اور ایک عدد برجس حاصل کر لی گئی۔ جب پہننے لگے تو معلوم ہوا کہ برجس بہت ہی لمبی ہے۔ اپنی محنت پر جی ہی جی میں کُڑھتے ہوئے آپ نے شلوار ہی کے ساتھ بائیسکل چلانا سیکھنے کا ارادہ کر لیا۔

اعجاز کے ہاں سے بائیسکل آ گیا تو آپ نے ہر کہ ومہ کو مدعو کیا "کہ میاں بائیسکل سیکھنے چلے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو تا کہ ہمارا حوصلہ بندھا رہے۔ آخر بائیسکل سیکھنا ہے، کچھ ہنسی کھیل نہیں، جان جوکھوں کا کام ہے، جان جوکھوں کا۔ اگر غلطی سے بھی اپنا پاؤں بجائے سائیکل کے پیڈل کے کہیں اُس کے پہیوں میں جا پڑے تو خدا جانے کیا حشر ہو۔ اللہ قسم ہمیں تو اس بات کا خیال کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ وہ معلوم ہے نا حمید کا قصہ، بیچارے کا ہاتھ آٹا پیسنے کی مشین کے پہیہ میں آ گیا تھا۔ کیا حال ہوا غریب کا۔ جانتے ہو چربی نکل آئی تھی چربی"۔

بھلا چچا سوانچہ خمری کوئی بات کہیں اور اس پر عمل نہ ہو یہ ناممکن تھا۔ سب کے سب ساتھ ہو لئے۔ چچا ایک جلوس کی صورت

میں اپنے محلہ سے باہر آئے۔ نوکر کو آواز دی کہ "بائیسکل ادھر لاؤ، ہم خود پکڑ کر چلیں گے۔ تم جیسے گاؤدی کو کیا معلوم کہ بائیسکل کس جانور کا نام ہے۔ کہیں توڑ کے رکھ دو تو تمہارے باپ کا کیا جائے گا۔ حرجہ خرچہ تو ہمیں ہی دینا پڑے گا۔"

پھر داد طلبی کے لئے سب کی طرف مُنہ پھیر کر بولے "کیوں جی؟"

سب نے یک آواز ہو کر جواب دیا "جی ہاں چچا آپ درست فرما رہے ہیں۔"

نوکر سے بائیسکل لے کر آپ اس شان سے چلے جیسے ابھی نورٹ ولیم فتح کر کے آ رہے ہیں۔ ابھی دو ہی قدم چلے ہونگے کہ آپ کی شلوار کا پائنچہ بائیسکل کے پیڈل میں اُلجھ گیا اور آپ اڑ۔ اڑ۔ ۔ ۔ ۔ اڑ۔ ۔ ۔ دھم زمین پر آ رہے۔ ایک فرمائشی قہقہہ فضائے بسیط میں بلند ہوا اور چچا کی نگاہوں میں گم ہو گیا "نالائق۔ پاجی۔ گدھے کہیں کے۔ ذرہ بھر بھی تو تمیز نہیں ان لونڈوں کو۔ یہاں تو جان پر بن گئی تھی۔ وہ تو یوں سمجھو کہ اللہ میاں نے مولائے علی کے صدقے ہمیں ہتھیلی دے کر بچا لیا ورنہ یہ جو بائیسکل ہم پر آن پڑتا تو نہ جانے جان پر کیا بن جاتی۔ اور یہ لوگ ہنس رہے ہیں۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔ گلدم کہیں کے۔"

اب چچا سوانچہ خمری کا جلوس پھر ایک دفعہ حرکت میں آگیا اور "یا علی مدد" کے فلک شگاف نعروں کے درمیان سب کھلے میدان کی طرف چل نکلے۔ وہاں پہنچ کر چچا نے شلوار کو رانوں تک اوپر چڑھا لیا۔ اور اس خدشہ سے کہ مبادا کھلی قمیص ہوا کے شوخ و شریر تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر کہیں پہیہ میں جا پھنسے، اُسے اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر ڈنڈ پیلتے ہوئے اور "یا علی مدد" کا ورد کرتے ہوئے چچا پہلوانوں کی طرح خم ٹھونک کر بائیسکل کی طرف بڑھے۔ قریب جا کر پہلے بائیسکل کے ایک پہیے کو ہاتھ لگایا۔ اور اُسے اپنے ہونٹوں اور آنکھوں سے مس کیا۔ پھر یہی عمل بائیسکل کے دُوسرے پہیے، ہینڈل، پیڈل اور گدی کو چھُو کر دُہرایا۔ اس کے بعد بائیسکل کی گھنٹی بجا کر تشفی کر لی کہ درست حالت میں ہے یا نہیں۔ پھر سب کی طرف مُنہ پھیر کر کہنے لگے "کہ اب ہم بالکل تیار ہیں۔ شفیع، رفیع، ریاض، مختار، کریم خدا کے بعد تم سب کا آسرا ہے، ہماری مدد کرو۔ اور باقی چھوٹے لڑکے گراؤنڈ کے جنگلے سے باہر کھڑے ہو جائیں۔" پھر یہ دیکھ کر کہ کوئی بھی گراؤنڈ سے باہر جانے کو تیار نہیں۔ بولے "بھئی کتنے نادان ہو تم لوگ۔ میں تو تمہارے بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ آخر بائیسکل ایک شیطانی چرخہ ہے۔ کوئی ہمارے باپ دادا کا نوکر تو نہیں کہ جب ہم کہیں ٹھہر جاؤ یہ ٹھہر جائے۔ کوشش تو ہم کریں گے مگر جو یہ نہ رُکا تو کہیں یہ نہ ہو کہ تم میں سے کوئی نیچے دب جائے۔ ہاں اگر ایک وعدہ کرو تو ہمیں تم لوگوں کے یہاں کھڑے رہنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا اور وہ یہ کہ اگر کسی کو کوئی چوٹ ووٹ آگئی تو ہم حرجہ خرچہ کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔"

شرط مان لی گئی اور چچا بائیسکل پر سوار ہوئے اور اس طرح کہ بائیں طرف سے سوار ہوئے اور دائیں طرف زمین پر آ رہے۔ اُٹھ کر کپڑوں (یعنی شلوار) کو جھاڑا اور شفیع، رفیع، ریاض، مختار اور کریم کو بھی جھاڑا کہ "ہم جو کہہ رہے تھے کہ تم سب

گیدی ہو۔ ہنسنا آتا ہے۔ کھیلنا آتا ہے۔ کام کرنا کسی کو نہیں آتا۔ رفیع تم ہینڈل کا بایاں ہاتھ تھامو۔ اے توبہ! کیسے بیوقوف ہیں۔ یہ لوگ۔ میں کہہ رہا ہوں دایاں ہاتھ اور حضرت بائیں کو پکڑ رہے ہیں۔ شفیع تم بائیں ہاتھ کو تھامو۔ مختار بھیا تم ذری گدی کو پیچھے سے تھام رکھنا اور کریم تم ہمارے داہنے ہاتھ پر ساتھ ساتھ چلو۔ ریاض تم بائیں طرف چلو۔ شاباش۔ بہت خوب۔ تم لوگ بڑے عقلمند ہو۔ تو ہاں بھیّا اب ذری ہمیں بائیسکل پر بیٹھنے دو۔"

جب بیٹھ چکے تو ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر آپ نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ پوچھنے پر کہنے لگے "داناؤں کا قول ہے کہ جب بائیسکل چلانا سیکھنے لگو تو اپنی ناک کی سیدھ پر دیکھتے رہو۔"

خیر آدمی مستقل مزاج تھے۔ بعد از "خرابیٔ شلوار" ایک ہفتے کی مشق کے بعد اُنہیں اس قدر مہارت ہوگئی کہ چڑھ کر گدی پر بیٹھ جاتے اور سیدھے چل دیتے لیکن اُترتے اُس وقت جب کہیں سائیکل خود بخود کم رفتار ہو کر گر جاتا۔ ایک دفعہ خدا کا کرنا ایسا ہوُا کہ آپ ایک سڑک پر سوار ہو کر چلے جا رہے تھے۔ اچانک سامنے سے ایک کار ہارن بجاتی ہوئی نظر پڑی۔ دوسری طرف سے تانگہ آگیا۔ بس پھر کیا تھا حواس باختہ ہوگئے اور اپنی پوری کوشش سے سائیکل کا رُخ ایک طرف کر دیا۔ اب جو غور فرماتے ہیں تو سامنے گندے پانی کا نالہ بہہ رہا ہے۔ مگر سائیکل آٹھ دس میل کی رفتار سے مسافت طے کر رہا تھا اور آپ اس پر بالکل بےبس بیٹھے جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کا ورد فرما رہے تھے۔ جس وقت کنارہ قریب آگیا تو مارے خوف کے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کیا تھا مع سائیکل کے دھڑام سے گندے نالے میں جا گرے۔ پانی زیادہ تھا دو تین غوطے آگئے۔ اب شرم وخجالت کے باعث باہر نہ نکلتے کہ لوگ دیکھ کر ہنسی نہ اُڑائیں۔ شومیٔ قسمت سے دو چار آدمی قریب تھے۔ یہ ماجرا دیکھ کر دوڑے آن کی آن میں اور بہت سے لوگ اکٹھے ہوگئے۔ اب کیا تھا دو چار آدمیوں نے ہاتھ دے کر باہر نکالا اور دریافت کرنا شروع کیا کہ ہوُا کیا؛ کیسے گر گئے۔ یہ چپ تھے کہ نظر نہ ملاتے تھے۔ اور دل میں دعائیں کر رہے تھے کہ یا اللہ کوئی واقفکار نہ پہنچ جائے۔

اُسی روز صدقِ دل سے توبہ کی کہ اب اِس شیطانی چرخہ کا خیال تک بھی دل میں نہ لاؤں گا۔ اور اب تک یہ عالم ہے کہ جب کبھی کوئی سائیکل سوار سامنے سے گزرتا ہے تو آنکھیں دوسری طرف پھیر لیتے ہیں۔ ایک دفعہ تو سائیکل کو دیکھ کر بےساختہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہہ اُٹھے "بہت بےآبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے"۔

اکبر ہما

تاج محل (از ساحر لدھیانوی)

"یہ روضہ منجملہ اُن شاذ اسلامی عمارتوں کے ہے جو انگریزوں کی عادتی دست بُرد سے بچی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ محض ایک اتفاقی امر تھا چونکہ اس عمارت سے کسی قسم کی آمدنی نہ تھی لارڈ بنٹنک نے جو ہندوستان کا گورنر تھا یہ تجویز کی تھی کہ اس عمارت کو توڑ کر اس کی کُل چاندی لے لی جائے اور اس کا مال مصالحہ نیلام کر دیا جائے۔

یہ تجویز ایک ایسی عمارت کی بابت تھی جس کی نسبت کسی نے کہا ہے کہ محض اس کے دیکھنے کے لئے ہندوستان تک سفر کرنا جائز ہے اور جو عمارت فی الواقع اس درجہ کامل ہے کہ اُس کے مثل انسان کے ہاتھوں نے کبھی نہیں بنایا۔

مگر یہ خیالات تو قدر دانانِ کمال کے ہیں جن کو تجارت کا مطلق مذاق نہیں ہے۔ یہ تاجر تو عنقریب تمام دنیا پر قبضہ کرنے والے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ وہ زمانہ بہت جلد آجائے کہ میلو کی بنائی ہوئی وینَس کی مُورت یک کر اس قیمت سے پتھر توڑنے کا ہاون دستہ بنایا جائے۔

(از تمدنِ عرب صفحہ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ مترجمہ سید علی بلگرامی)

انسانی تخیّل کی مرمریں تصویر!
سیلِ نور نے جامد ہو کر مقبرہ کی شکل اختیار کر لی ——
یہاں، ملکہ کے لئے صدیوں سے زیرِ زمین ایک پُردرد راگ گایا جا رہا ہے
مَیں محبت کے ایک ادنیٰ پجاری کی حیثیت سے سربسجود ہو کر
عقیدت کے یہ چند پھُول نذر کرتا ہوں،
"عشق ہی حُسن کا بہترین خالق ہے"
ہم سب شاہجہان کے ہم نوا ہو کر
حُسن کی بارگاہ میں محبت کی راگنیاں الاپ رہے ہیں،

ملکۂ تاج محوِ خواب ہے
صبحِ حُسنِ لایزال کی پہلی کرن اسے اپنی رحمت میں لے!
تاکہ وہ محبت کے آغوش میں ایک ابدی و شیریں نیند کے مزے لیتی رہے،
میرے ہر تارِ نظر کو خواب کی مضراب سے چھیڑا جا رہا ہے، اور ——
میرے خواب مجسّم حُسن بنتے جا رہے ہیں،

یہ ایک روشن خواب ہے جو ایک حسین و خوابیدہ نغمہ میں جلوہ گر ہو رہا ہے

——— ایک رنگین و شیریں خواب جو ایک رومانی دُنیا سے آ رہا ہے۔

——— ایک دِل آویز خواب جو اپنی سرخوشی کی وجہ سے (جو بےخودی سے قریب تر ہے) اور زیادہ دل خوش کُن معلوم ہو رہا ہے۔

اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ ایک غیر حقیقی حُسن ہے جو میں دیکھ رہا ہوں لیکن باوجود اس کے حقیقی و غیر حقیقی حُسن میں کون فرق بتا سکتا ہے؟

باغ میں نہر کے دورویہ سرو کے درخت اس کی پاسبانی کر رہے ہیں اور اپنا تابناک سایہ سطحِ آب پر ڈال کر زیرِ زمین کسی اشرف و عجیب دُنیا کی طرف اشارے کر رہے ہیں۔

دُور ——— نہر کے اُس طرف، چبوترے پر تاج محل کی عمارت اپنی تمام حُسن کارانہ ہم آہنگی کے ساتھ ایستادہ ہے۔

اللہ اللہ! یہ کیسا دل آویز اور عجیب احساس مجھے ہو رہا ہے جو میری رُوح کو سرمست کئے دیتا ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ ایک مکمل اور قُدسی حُسن کی بدولت ہے۔

"انسان کی بےعیب صنّاعی" ——— اس محبت کی مجسم یادگار کو دیکھ کر میرا تخیل اب اس سے زیادہ پرواز نہیں کرسکتا۔

اس شیریں مدہوشی سے جو میں اس کی ہم آہنگیٔ مطلق سے متاثر ہو کر محسوس کر رہا ہوں ——— میرے لئے بچ نکلنا کتنا محال ہے!

ان مرمریں دیواروں کے عقب میں ملکہ خواب نوشیں کے مزے لے رہی ہے ———

یعنی بیگم قصرِ دُرّیں میں مقید ہے

خاموش ——— کہیں وہ اپنے خوابِ شیریں سے چونک نہ اُٹھے!

محبت ——— اسے اپنی حفاظت میں لے!

تیرے محفوظ گنبد میں ہمیشہ خاموشی چھائی رہے تاکہ تو اپنے خواب سے بیدار نہ ہو جائے!

ملکہ سو رہی ہے،

آؤ اس خاتونِ خفتہ کے لئے کوئی مرثیہ گائیں

"یہ نُور افشاں گنبد اسے اپنی پاکیزہ و منزّہ حفاظت میں لے"!!!

مترجمہ

رفیع الزمان خان

م ۔ ک ۔ ن ۔ ب

مَیں کبھی نہ بھولوں گا دو ہندوستانی نوجوانوں کی وہ گفتگو جو ایک شام میں نے ایک بزاز کی دکان میں سُنی۔
کچھ کپڑا خریدنے کے لئے میں دُکان میں داخل ہوا۔ مجھ سے پہلے دو نوجوان وہاں موجود تھے۔ ایک اُڑتی ہوئی نگاہ اُن کے چہرے پر ڈال کر معلوم کیا جا سکتا تھا کہ اُنہوں نے حال ہی میں الیف۔ اے۔ یا بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے۔
اور وہ دونوں ایک کپڑے پر رائے زنی کر رہے تھے۔
ایک نے کہا "آئی لائیک دِس کلاتھ وَیری مچ۔ کیونکہ اس کا کلر بھی بَیسٹ ہے اور ہے بھی ڈیوریبل"۔
دوسرے نے جواب دیا۔ "بٹ آئی ڈِس لائیک اِٹ۔ کیونکہ میں نے ایک دفعہ خریدا تھا اور آن وِی اُدر ڈے بالکل پھٹ بھی گیا"۔

پھر دونوں نے دوکاندار سے کہا:۔
"سیٹھ! ہم کوئی اور سمپل دیکھنا چاہیں گے"۔
دو چار تھان کپڑوں کے اور سامنے آنے پر پہلے نے دوسرے کو مخاطب کرکے کہا:۔
"نو مسٹر! اب ان میں سے سجیسٹ کرو"۔
دوسرے نے جواب میں کہا:۔
"کچھ تو یُور اون پسندیدگی ہونی چاہئے تاکہ ہاف ریسپانسیبلیٹی تم پر بھی رہے"۔
اور اوّل الذکر نے "آل رائیٹ! ایز یُو لائیک" کہہ کر کپڑا ہاتھ میں لے کر دیکھنا شروع کیا۔
مجھے علم نہیں کہ اُنہوں نے کپڑا خریدا بھی یا نہیں۔ کیونکہ مَیں اُن سے پہلے چلا آیا تھا۔ ہاں البتہ جس وقت میں نے دُکان سے باہر قدم رکھا تو سوچ رہا تھا:۔
"کیا ان جیسے "ہندوستانی" نوجوانوں کی موجودگی میں اُردو ہندی کا جھگڑا جائز ہے؟ اور کیا اُردو ہندی ایک ہی چیز کے دو مختلف نام تو نہیں؛ اور اگر واقعی مختلف ہیں تو ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ کوشش ہونی چاہئے یا دونوں کو متحد کرکے "تیسری" کے مقابلہ کے لئے تیار کرنا چاہئے!!!

ساون مل ترکھا

محفلِ ادب

ڈاکٹر سر سید راس مسعود (نواب مسعود جنگ) مرحوم کے خیالات

سر سید راس مسعود کی رحلت جو گذشتہ ہفتہ میں واقع ہوئی کسی ایک خاندان کا حادثہ نہیں بلکہ ایک قومی حادثہ ہے اور ایک ایسی ہستی کی رحلت ہے جو ہماری قوم کے لئے ذریعۂ عزت و افتخار تھی۔

جن لوگوں کو سید راس مسعود مرحوم کی صحبت سے لطف اندوز ہونے اور اُن کی دماغی و ذہنی قوتوں کا اندازہ کرنے کا موقع ملا ہے وہی سمجھ سکتے ہیں کہ اُن کی ہستی کیسی نادر المثال تھی اور دستِ قدرت نے کیسی عجیب و غریب دماغی قوتیں اُن کی گرانمایہ ذات میں ودیعت کی تھیں اور کیسا غیر معمولی حافظہ اُنہوں نے پایا تھا، اور اُن کے جدِ امجد سر سید مرحوم اور اُن کے والدِ ماجد سید محمود مرحوم کو جو دماغی برتری حاصل تھی اُس سے سید راس مسعود مرحوم کو بھی حصۂ وافر ملا تھا۔

سر سید راس مسعود کی تعلیم و تربیت تمام تر مغربی اصول و انداز پر ہوئی تھی، اور اوائل عمر ہی سے وہ مسٹر ماریسن کی تربیت میں دے دیئے گئے تھے۔ اس کے بعد مسلسل چند سال تک انگلستان میں رہے، لیکن بایں ہمہ اُن کے عادات و اطوار میں علیٰ وجہ الکمال مشرقیت موجود تھی۔

گذشتہ نومبر میں جب ناسازیٔ طبع کی وجہ سے وہ علی گڑھ میں زیرِ علاج تھے ایک روز فرمانے لگے کہ چونکہ میری تعلیم و تربیت مغربی ماحول میں ہوئی ہے اس لئے اکثر لوگ میرے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ میں انگریزوں کی ہر چیز کو پسند کرتا ہوں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ میں انگریزوں کی صرف اُن باتوں کو پسند کرتا ہوں جو بجائے خود بہتر و مفید ہیں۔ ورنہ میں ہر لحاظ سے ٹھیٹ مشرقی ہوں۔

اُنہوں نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل صحیح تھا، لباس اور بعض دوسری خصوصیات کے علاوہ اُن کا ذوق تمام تر مشرقی بلکہ دہلوی تھا، وہ ہمیشہ ہندوستانی کھانا کھاتے تھے، اور باوجود انگریزی کے مسلّمہ اسپیکر و انشا پرداز ہونے کے ہمیشہ اُردو میں بات چیت کرتے تھے۔ اُردو بھی معمولی نہیں بلکہ صحیح و فصیح جس میں ادبیت کی ایک خاص شان ہوتی تھی، نیز جب تک کوئی شدید مجبوری نہ ہو اُردو میں انگریزی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کرتے تھے، بلکہ ہم نے یہاں تک دیکھا ہے کہ کوئی صاحب اُن سے انگریزی میں

گفتگو کر رہے ہیں لیکن سید راس مسعود اُس کا جواب اُردو میں دے رہے ہیں، چونکہ مخاطب اُردو سمجھتا ہے اس لئے وہ انگریزی میں جواب دینا پسند نہیں کرتے یہاں تک کہ اُن کا مخاطب بھی شرمندہ ہو کر اُردو میں گفتگو کرنے لگتا تھا۔

برخلاف اس کے جب کبھی انگریزی میں تقریر و تحریر کی نوبت آتی تھی، تو سامعین ان کی خوش بیانی و انشاء پردازی سے مسحور ہو جاتے تھے۔ چنانچہ علی گڑھ جیسے مقام پر ان کی انگریزی انشاء پردازی و ادبیت کا سکّہ بلا استثناء ہر شخص کے دِل پر بیٹھا ہوا تھا، اور اُن کے سامنے کسی کو مجالِ دم زدن نہیں ہوتی تھی۔

بعض اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آئیں کہ کسی مجمع میں تعلیم یافتہ اہلِ زبان یعنی انگریزوں نے تقریر کی اُس کے بعد جب سید راس مسعود کی نوبت آئی تو ان کی انگریزی تقریر اور شانِ خطابت اور بلند آہنگی کے سامنے ساری تقریریں ہیچ ہو گئیں، لیکن وہ باوجود انگریزی کی اس غیر معمولی قابلیت کے اگر سامعین اُردو سے واقف ہوں تو اپنی مادری زبان ہی میں تقریر کرنا پسند کرتے تھے۔

اس بارہ میں مرحوم کا جو طریقۂ عمل تھا، اُس کا صحیح اندازہ حسبِ ذیل خیالات سے ہوگا جو اُنھوں نے بنارس میں بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۳۰ء میں ظاہر فرمائے تھے اور جو آج بھی نہایت توجّہ اور غور سے مطالعہ کرنے کے لائق ہیں کیونکہ یہ ایک ایسے شخص کے خیالات ہیں جو مغربی تہذیب و معاشرت سے کامل اور عملی واقفیت رکھنے کے علاوہ انگلستان کی مشہور و معروف آکسفورڈ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا، اس لئے مغربی تہذیب اور آدابِ رسوم کے متعلق اس کی رائے بلاشبہ لائقِ توجّہ ہے۔

مرحوم نے عورتوں کی تعلیم پر بحث کرتے ہوئے فرمایا:-

"میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہماری بعض نوجوان لڑکیوں کی یہ خواہش ایک بدنما بات ہے کہ یوریپینوں کے تمام رسوم و عادات کی نقل کریں، وہ شاید یہ نہیں سمجھتیں کہ اس طرزِ عمل کے اندر قومی خودداری کی کس درجہ تذلیل مضمر ہے، کسی قوم کے آداب و رسوم اس ماحول کا نتیجہ ہوتے ہیں جس کے اندر وہ قوم بڑھتی ہے اور اس لئے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو بات ایک قوم کے لئے صحیح اور درست ہو، وہ تمام دوسری اقوام کے لئے بھی صحیح اور درست ہو۔

اس سلسلہ میں مجھے عجیب و غریب نہایت تکلیف دہ حالات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے، کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا مجھے بتایا گیا کہ میری ایک ہموطن خاتون مجھ سے اس بات پر ناخوش ہوئیں کہ میں نے اُن سے "ہندوستانی" میں بات چیت کرنے کی کوشش کی، اُنھوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا کہ میرا یہ فعل محض اس خیال کی بنا پر تھا کہ شاید انگریزی زبان

نہ جانتی ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دُنیا میں صرف میرا ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں مجھے اس قسم کا سوء اتفاق پیش آیا۔
اس سے مجھے خیال پیدا ہُوا اور میں نے اپنے دل میں کہا۔ اس قوم کا کیا حشر ہونا ہے جس کی عورتیں خود اپنی زبان کے اُس فخر سے اور خود اپنی شائستگی پر اُس اعتماد سے دستبردار ہوچکی ہیں جس کے بغیر کوئی قوم کسی قسم کی خودداری حاصل نہیں کرسکتی"۔

یہ خیالات کسی مزید توضیح کے محتاج نہیں، ان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سرراس مسعود میں کس قدر خودداری تھی اور اپنی مادری زبان اور مشرقی رسوم و آداب کی کس قدر اہمیت وہ محسوس کرتے تھے۔

صرف اسی قدر نہیں کہ سید راس مسعود مرحوم اُردو ادب سے خاص ذوق رکھتے تھے بلکہ اُن کے دل میں اُردو کی اشاعت و ترقی کے لئے بھی ایک خاص جوش تھا، وہ انجمن ترقی اُردو کے صدر تھے اور ہمیشہ انجمن کے مالی وسائل کی ترقی کے لئے عملی جدوجہد کرتے رہتے تھے بلکہ اُنہیں جس صحبت و مجلس میں بھی موقع ملتا تھا، انجمن کے کارنامے بیان کرکے لوگوں کو اس کی شرکت و خدمت کی ترغیب دیتے تھے، اس کے علاوہ وہ اپنے قیام حیدرآباد کے زمانہ میں ہمیشہ اُردو کے مصنفین اور پبلشروں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، اور بعض صورتوں میں اُنہوں نے اعلیٰحضرت نظام کی شاہانہ توجہ اُن کی مالی امداد پر مبذول فرماکر اس میں کامیابی حاصل کی۔

زبان کے معاملہ میں سرراس مسعود کی یہ رائے بالکل صحیح تھی کہ :-

"کسی قوم کی زبان اور اُس کی شائستگی کے مابین رابطہ اس درجہ مربوط ہوتا ہے کہ اگر دنیا اس نقطۂ نظر سے ہمارا جائزہ لینے لگے تو ہماری شائستگی کے متعلق وہ کتنی ادنیٰ درجہ کی رائے قائم کرے گی"۔

اسی بنا پر اُن کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ اُردو کی تالیفات بہترین شکل وصورت میں چھاپی جائیں تاکہ اغیار کی نظروں میں اُردو کا معیار بلند ہو، اس بارہ میں اُن کی ذہنیت کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہوگا جو اُنہوں نے نہایت رنج و افسوس کے ساتھ لکھا ہے، فرماتے ہیں :-

"میں ایک بار کی ذلت کبھی نہیں بھول سکتا جب اتفاقاً ایک فرانسیسی دوست کے ساتھ دہلی جانکلا اور ان کے لئے دیوانِ غالب کی ایک جلد خریدنے کا ذمہ لیا اور اس غیرفانی شاعر کے کلام کی ایک ستھری جلد کی تلاش میں دلّی کی گلیوں میں پڑا مارا پھرا لیکن اس سے بہتر نسخہ دستیاب نہ ہوسکا کہ سستے زرد رنگ کے ایسے کاغذ پر چھپا ہوا تھا جس سے یورپ میں لوگ اپنے بوٹ بھی نہ صاف کرنا چاہیں گے، جب میں نے یہ کتاب اپنے اس فرانسیسی دوست کے ہاتھ میں دی، اس وقت اس کے چہرہ سے تعجب کے جو آثار نمودار ہوئے اُن کے تصور سے میں اب بھی کانپ جاتا

ہوں، اُسے یہ کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ میری مادری زبان کے سب سے بڑے شاعر کے کلام کا یہ بہترین نسخہ تھا جو خود اس کے بود و باش کے شہر میں دستیاب ہوا۔"

اب دیوانِ غالب کے چند عمدہ ایڈیشن شائع ہو گئے جن میں سے بعض خود مرحوم کے ذوق اور کوشش و توجہ کا نتیجہ ہیں۔ لیکن یہ واقعہ آج بھی بجائے خود صحیح ہے کہ قطع نظر معنوی حیثیت کے اُردو مطبوعات اپنی ظاہری محاسن کے لحاظ سے آج بھی متبذل حالت میں ہیں اور ایسی کتابیں بہت تھوڑی ہیں جو حسن طباعت کے لحاظ سے کسی ترقی یافتہ زبان کی کتابوں کے پہلو بہ پہلو رکھی جا سکیں، یہ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ محض ہماری غفلت و بے حسی ہے جو اپنی مادری زبان کے لٹریچر کی قدر اور حوصلہ افزائی کے لئے تیار نہیں ہیں، بلکہ بالفاظ سر سید راس مسعود مرحوم

"میرے ہم وطن اس کے لئے تو تیار رہیں کہ ردی ناولوں پر جو تیسرے درجہ کی انگریزی میں لکھے گئے ہیں، سات روپیہ خرچ کر دیں لیکن خود اپنے بڑے مصنفوں کی تصانیف کے دیدہ زیب نسخوں پر چار روپیہ بھی خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ہم دوسروں سے یہ توقع کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں کہ وہ ہمارا احترام کریں جب کہ ہم خود اپنی چیز کا احترام کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

سر سید راس مسعود کا یہ خیال تھا کہ اگر ہم اپنی مادری زبان کو ترقی دے کر اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں بنائیں گے تو خود ہماری اسلامی تہذیب بھی محفوظ نہیں رہے گی، وہ فرماتے ہیں کہ

"یقین رکھئے کہ جس چیز کو ہم اسلامی شائستگی سمجھتے ہیں وہ ہمارے ملک اور ہمارے گھروں سے یک قلم مفقود ہو جائیگی اگر ہم نے اپنی زبان کو زمانۂ حال کے خیالات کے اظہار کا معقول ذریعہ نہ بنایا، جب میں بنگال میں اپنے دوستوں سے ملتا ہوں۔ اور دیکھتا ہوں کہ بنگالی زبان کے لئے انہوں نے کیا کچھ کیا ہے اور کر رہے ہیں تو اُن کے کام کی طرف سے میرے دل میں عمیق ترین احترام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

کانفرنس گزٹ علی گڑھ
۸ راگست ۱۹۳۷ء

ساس

یہ میرے خوابوں کی تعبیر اور میری خوشیوں کا مرکز تھی — یہ خوبصورت عورت جسے تم اپنی بیوی کہتے ہو

تم اپنے کھیل کود میں مصروف ہوا کرتے تھے ——

ایک بیکار اور بے فکر لڑکے کی طرح، جب میں نے پہلے پہل اس کے وجود کا تخیّل اپنے دل میں جمایا - اس وقت میں وفورِ محبت سے کپکپا گئی اور ساری کائنات جوشِ محبت سے بھر گئی۔

تم اپنی بچپن کی نیند میں سوتے سوتے مسکرا دیا کرتے تھے ۔

جب میں زچگی کی مصیبتیں برداشت کر رہی تھی ۔

مَیں دکھ اور بیماری کے دنوں میں اس ننھی سی جان پر اپنی راتیں روتے ہوئے قربان کر دیتی ۔

جب تم شاید آرام سے دل خوش کن خواب دیکھ رہے ہوتے تھے —— اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے ہوئے نشو و نما پا رہے ہوتے تھے ۔

اور میں راتوں کو جاگتی اور اس پیاری بیوی کو تمہارے لئے پالنے اور محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ۔

یہ میرے دل کی محبوب مورت اور میرا غرور تھی ۔

مَیں نے اسے وہ سب وضعداریاں سکھائیں جن کی تم تعریف کرتے ہو۔

مَیں آنے والے زمانے کا خواب دیکھا کرتی کہ یہ میرے پہلو میں رہ کر میرے بڑھاپے کی زینت بنے گی اور میرے ساتھ لپٹی رہے گی —— ایک ثمرِ نورس کی طرح جو جھکی ہوئی شاخ کے ساتھ لٹک رہا ہو۔

لیکن آہ یہ بہار ایسی دلفریب تھی کہ تم نے اسے مجھ سے اپنی خوشیوں کے لئے جھپٹ لیا۔

خیر تم اس کے لائق ہو۔ خدا کا شکر ہے لیکن پھر بھی شاید تم یہ محسوس نہیں کرتے کہ وہ کس قدر تپتی ہوئی زمین تھی جس پر میں اِس عورت کی پیدائش اور پرورش کے واسطے ننگے پاؤں چلی ہوں جس سے تم اس قدر پیار کرتے ہو۔

اسے یوں ہاتھ سے جاتے ہوئے دیکھنا آسان کام نہ تھا اگرچہ وہ ایک ایسے شخص کے آغوش ہی میں گئی ہے جس سے وہ محبت ہی نہیں کرتی بلکہ جسے وہ پوجتی ہے۔

کتنی زبردست، کتنی پُرعظمت، کتنی خوفناک قوت ہے اس نئی محبت کی جو ایک نوجوان لڑکی کے دل میں ایک ایسے لڑکے کے لئے سما جاتی ہے جس نے کبھی اس کے لئے ایک گھنٹے کا دکھ بھی نہیں سہا ——

اور جس نے اسے جنا اور پالا پوسا تھا اُسے دُوسرا درجہ دے دیتی ہے۔

یہ مجھ سے اب بھی محبّت کرتی ہے لیکن اگر موت سامنے آ جائے اور کہے ان دونوں میں سے اب ایک کو پسند کر لے تو یہ تمہیں کو انتخاب کرے گی۔

خدا کی مرضی یہی تھی لیکن کیا تم کو تعجب ہوگا اگر اس کے ہنسی خوشی رہنے کے باوجود یہ خیال میرے دل میں نشتر کی طرح چبھے کہ اُس کی زندگی کے لئے اب میری ضرورت

نہیں رہی ۔

مجھے معذور سمجھنا کیونکہ یہ جواب تمہاری ہے ، مدت تک میری رہی ہے اور ایسے نقصان کو ٹھنڈے دل سے برداشت کرنے کے لئے انسان کو بہت بڑے جگر سے کی ضرورت ہے ۔

پس مجھے معاف کر دینا اگر میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہتی ہیں +

"نسوانی دُنیا"

حاجی لق لق کی "شعرائی" غزل

"تلوک[1] چند" ہوں کیوں لطف سے ہوا کیا ہے — نگاہ پھیر لی اے جاں، یہ ماجرا کیا ہے

مٹی جہاں سے "غلام[2] رسول" و "میلا[3] رام" — کسی کے عشق و محبت میں اب دھرا کیا ہے

ذرا سی ڈالئے مجھ پر نگاہِ "نانک[4] چند" — مریضِ عشق کی اس کے سوا دوا کیا ہے

گراؤ دل پہ مرے برقِ "مصطفٰے[5] صوفی" — جلا کے خاک کرو مجھ کو سوچنا کیا ہے

جو تیرا عشق "اسد اللہ خان[6]" ہے دل پر — تو یہ قصور ہے دل کا مری خطا کیا ہے

بِلا نہ کوئی بھی "عبد[7] المجید" جادہ عشق — نہ جانیں منزلِ اُلفت کی انتہا کیا ہے

جلا جلا کے مجھے "دینا[8] ناتھ" فرقت میں — وہ کہہ رہے ہیں کہ بگڑا احباب کا کیا ہے

نہیں ہے آہ میں کچھ ڈاکٹر "محمد[9] دین" — وگرنہ دیکھ لیں اس شوخ کی جفا کیا ہے

"غلام بھیک[10] یاں" قدرت کی دیکھئے لق لق
رقیب کہتا ہے "ہاں بول چاہتا کیا ہے؟"

[1] محروم ۔ [2] مہر ۔ [3] وفا ۔ [4] ناز ۔ [5] تبسم ۔ [6] غالب ۔ [7] سالک ۔ [8] آتش ۔ [9] تاثیر ۔ [10] نیرنگیاں ۔ کیونکہ مولانا غلام بھیک کا تخلص نیرنگ ہے +

(شیرازہ)

اُردو زبان کے یورپین ادیب

صاحب تخلص ، نام جرہانس ۔ اُردو ادب سے کافی دلچسپی رکھتا تھا اور شاعری میں اچھا دخل تھا ۔ میر وزیر علی صبا کا شاگرد تھا ۔ بطورِ نمونہ ایک شعر درج کیا جاتا ہے :-

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤں گا — مجھ کو پہناتے ہو زنجیر یہ زنجیر عبث

ن تخلص، پورا نام ایرن جیکب، گورکھپور میں سکونت پذیر تھا۔ حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم سے شرفِ تلمذ تھا، نمونۂ کلام درج ذیل ہے

یہ کیا چپکے چپکے شکایت ہے اے دل　　خبر دار کس کا گلہ ہو رہا ہے

ی تخلص۔ مسٹر بلیک کی بیٹی تھی، اُردو سے خاص دلچسپی رکھتی تھی اور کبھی کبھی اشعار بھی موزوں کر لیا کرتی تھی۔ اس سے زیادہ حال م نہ ہوسکا۔ نمونہ کلام یہ ہے

اے خفی اپنے اشکِ بے تاثیر　　مفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

یہاں تک تو اُن یورپین حضرات کا تذکرہ تھا جنھوں نے اُردو زبان کی خدمت بذریعۂ تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کی ہے۔[1] پند ایسے یورپین حضرات کا بھی ذکر کر دینا ہرگز بیجا نہ ہوگا، جنھوں نے اس زبان میں شاعری یا تصنیف و تالیف تو نہیں کی، تاہم اُردو ن سے بیحد دلچسپی رکھتے تھے، اُردو اچھی طرح لکھ پڑھ لیا کرتے تھے اور فصیح اُردو میں گفتگو کر سکتے تھے۔

ر ولیم جونس۔ ۱۷۸۳ء میں فورٹ کلکتہ میں جج ہو کر آئے تھے۔ آپ ہی "ایشیاٹک سوسائٹی" کے در اصل بانی تھے، اٹھائیس نوں کے ماہر تھے، اُردو میں بڑی اچھی استعداد تھی۔ ۱۷۹۴ء میں ہندوستان ہی میں انتقال کیا۔

رل آف کناٹ۔ ملکۂ وکٹوریہ کے صاحبزادے اُردو نہایت خوب لکھتے اور نہایت روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔

لیڈی چیمسفورڈ۔ اُردو کی نہایت دلدادہ تھیں، چنانچہ ہندوستان آکر شملے کے ایک زنانہ جلسے میں اُردو ہی میں تقریر ادبی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔

نجہانی ملکۂ وکٹوریہ کو بھی ساٹھ سال کی عمر میں اُردو سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور آگرے کے مولوی برکت اللہ مرحوم موصوفہ ردو پڑھانے کے لئے لندن بھیجے گئے۔ موصوفہ نے تھوڑے ہی عرصے میں اچھی طرح اُردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ چنانچہ اپنا ۔ روزنامچہ بھی اُردو ہی میں لکھا ہے۔ ۱۸۹۸ء میں شاہ ایران کی سیاحتِ انگلستان کے موقع پر وہ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ:۔

"آج کا دن بہت اچھا رہا، شاہ پرشیا معہ چند وزیروں
کے آئے تھے۔ کھانا ہمراہ کھایا، سوا تین بجے لندن گئے"

یہ تھی کچھ دنوں قبل تک اُردو زبان کی محبت کہ نہ صرف ہندوستانی قومیں بلکہ اہلِ مغرب بھی اس کے دلدادہ اور اس کی اہمیت ستار تھے۔ ایسی حالت میں چاہیئے تو یہ تھا کہ ملک کی ساری آبادی متفقہ طور پر ایسی روش اختیار کرتی کہ حکومت بھی عہد گذشتہ کی ح اس وقت بھی اُردو زبان کی ضرورت محسوس کرتی۔

"کلیم"

---

[1] عدم گنجائش کی وجہ سے بہت سے شعراء کا تذکرہ حذف کرنا پڑا۔ "ہمایوں"

ایرن تخلص، پورا نام ایرن جیکوب، اگورکپور میں سکونت پذیر تھا۔ حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم سے شرفِ تلمذ تھا، نمونۂ کلام درج ذیل ہے ؎

یہ کیا چپکے چپکے شکایت ہے اُے دل خبردار کس کا گلہ ہو رہا ہے

خفی تخلص۔ مسٹر بلیک کی بیٹی تھی، اُردو سے خاص دلچسپی رکھتی تھی اور کبھی کبھی اشعار بھی موزوں کر لیا کرتی تھی۔ اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہوسکا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

اے خفی اپنے اشکِ بے تاثیر مفت میں جگ ہنسائی کرتے ہیں

یہاں[1] تک تو اُن یورپین حضرات کا تذکرہ تھا جنہوں نے اُردو زبان کی خدمت بذریعۂ تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کی ہے اب چند ایسے یورپین حضرات کا بھی ذکر کردینا ہرگز بیجا نہ ہوگا، جنہوں نے اس زبان میں شاعری یا تصنیف و تالیف تو نہیں کی، تاہم اُردو زبان سے بیحد دلچسپی رکھتے تھے، اُردو اچھی طرح لکھ پڑھ لیا کرتے تھے اور فصیح اُردو میں گفتگو کر سکتے تھے۔

سر ولیم جونس۔ ۱۷۸۳ء میں فورٹ کلکتہ میں جج ہو کر آئے تھے۔ آپ ہی "ایشیاٹک سوسائٹی" کے دراصل بانی تھے، اکثر ایشیائی زبانوں کے ماہر تھے، اُردو میں بڑی اچھی استعداد تھی۔ ۱۷۹۴ء میں ہندوستان ہی میں انتقال کیا۔

ڈیوک آف کناٹ۔ ملکۂ وکٹوریہ کے صاحبزادے اُردو نہایت خوب لکھتے اور نہایت روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔

لیڈی چیمسفورڈ۔ اُردو کی نہایت دلدادہ تھیں، چنانچہ ہندوستان آکر شملے کے ایک زنانہ جلسے میں اُردو ہی میں تقریر کی جو ادبی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔

آنجہانی ملکۂ وکٹوریہ کو بھی ساٹھ سال کی عمر میں اُردو سیکھنے کا شوق پیدا ہؤا اور آگرے کے مولوی برکت اللہ مرحوم موصوفہ کو اُردو پڑھانے کے لئے لندن بھیجے گئے۔ موصوفہ نے تھوڑے ہی عرصے میں اچھی طرح اُردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ چنانچہ اپنا ایک روزنامچہ بھی اُردو ہی میں لکھا ہے۔ ۱۸۹۸ء میں شاہ ایران کی سیاحتِ انگلستان کے موقع پر وہ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ:۔

"آج کا دن بہت اچھا رہا، شاہ پرشیا معہ چند وزیروں کے آئے تھے۔ کھانا ہمراہ کھایا، ساڑھے تین بجے لندن گئے"

یہ تھی کچھ دنوں قبل تک اُردو زبان کی محبت کہ نہ صرف ہندوستانی قومیں بلکہ اہلِ مغرب بھی اس کے دلدادہ اور اس کی محبت میں سرشار رہتے۔ ایسی حالت میں چاہئے تو یہ تھا کہ ملک کی ساری آبادی متفقہ طور پر ایسی روش اختیار کرتی کہ حکومت بھی حد گذشتہ کی طرح اس وقت بھی اُردو زبان کی ضرورت محسوس کرتی۔

"کلیم"

---

[1] عدمِ گنجائش کی وجہ سے بہت سے شعراء کا تذکرہ حذف کرنا پڑا۔ "ہمایوں"

دل زبان اور زندگی

ذیل کا مضمون [illegible] کے سالانہ مشاعرہ میں جو آنریبل سر سلطان احمد صاحب وزیر حکومت کی صدارت میں ۱۹ ستمبر ۱۹۳۷ء کو منعقد ہوا پڑھا گیا۔

جو دل میں ہو وہ زبان پر! ——— لیکن ادب آداب میں اور سیاست میں تو یہ روا نہیں کم از کم ہمیشہ اور ہر حال میں روا نہیں ہے کہ جو دل میں ہو وہی زبان پر بھی آجائے اور سیاست بھی خواہ کبھی کبھی وہ شیطان کا چرخہ ہی کیوں نہ ہو ہے تو آخر زندگی ہی کا ایک کھیل جو ہم میں سے بہتوں کو کھیلنا پڑتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے دل اور زبان اور جسم اور جان کے ساتھ ساتھ نہ صرف ہماری اپنی بلکہ دوسروں کی زندگی بھی ہے جو قدم قدم پر ہماری چال ڈھال پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ یہ ہے انسان کی دُنیا۔ کوئی شخص صرف اکیلا نہیں رہ سکتا۔ ارسطو نے خوب کہا ہے کہ وہ جو دوسروں سے میل جول نہیں رکھتا وہ یا کوئی وحشی ہوگا یا خدا۔ انسان کے معنی ہیں ملنے جُلنے والا حیوان بلکہ معمولی ملنا جلنا تو کئی حیوانوں کے ہاں بھی ہے۔ چڑیاں، مرغابیاں، طوطے مل کر اُڑتے نظر آتے ہیں۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کا مل کر کام کرنا مشہور ہے۔ شملے میں جاکو کی چوٹی پر اکیلا دُکیلا آدمی کسی موٹے سے بندر کو ذرا تیوری چڑھا کر دیکھ تو لے، پھر دیکھو کس طرح بندر قوم اس شیخی خورے کے خلاف اپنے جتھے کے جتھے بھیجتی ہے۔ انسان اور حیوان میں فرق ہے تو یہ کہ انسان نے اس آپس کے میل جول کو بڑھایا اور اس سے طرح طرح کے کام لئے اور اسی سے وہ صحیح معنوں میں انسان بنا۔ گھوڑا اکثر اکیلا بھی ہنہناتا ہے، گو ایسا کرنے میں شاید وہ کسی اَور کو بُلاتا ہی ہو لیکن انسان، کم از کم ہوشمند انسان، ہنستا ہے تو اَور انسانوں کے ساتھ مل جُل کر۔ انسان کی تمام ترقیاں معاشرت سے یعنی ایک دوسرے کے میل جول سے پیدا ہوتی ہیں، یونہی تہذیب بڑھی، یونہی ٹیلیفون، تار، بے تار، گراموفون وغیرہ ایجاد ہوئے۔

میل جول کا سب سے بڑا ذریعہ زبان ہے۔ گونگوں کی بھی ایک زبان ہوتی ہے، ورنہ زندگی اُن کے لئے دوبھر ہو جائے۔ زبان کا استعمال اُس کا صحیح استعمال، تہذیب و تمدن کی نشانی ہے۔ اسی سے تعلقات بڑھتے ہیں، اسی سے وہ اچھے بُرے ہو سکتے ہیں۔ یوں تو مادی چیزوں کی تقسیم اچھے بُرے تعلقات کا سب سے بڑا سبب ہے۔ ایک شخص سب کچھ سمیٹ کر بیٹھ جائے تو دُوسرے بھُوکے مر جانے سے پہلے بغیر تقریر کئے بھی اُس ظالم حریص سے بہت کچھ چھیننے کو تیار ہو جائیں گے لیکن اس چھین جھپٹ میں بھی انسان عموماً بہت کچھ کہے سُنے گا۔ زبان کو تلوار کہا گیا ہے، یہ کتنی نرم ہے لیکن مثل کو کس طرح گرما سکتی ہے! ہنسا سکتی ہے، رُلا سکتی ہے، منا سکتی ہے، لڑا سکتی ہے اور یہ محض اُن سینکڑوں چھوٹے بڑے ہلکے بھاری لفظوں کے ذریعے سے جن سے زبانیں بنتی ہیں۔ سو جب تم کچھ کہو تو پہلے سوچ سمجھ لو۔ پہلے تولو پھر بولو۔ لفظوں کی بڑی قیمت ہے، بڑا اثر ہے، بولنے والوں کی ذمہ داری بڑی ہے اور اسی لئے کسی زبان کا استعمال اور اُس کی ترقی بڑی حد تک ذمہ دار ہے اُس قوم کی تہذیب و ترقی کی جو اُسے استعمال کرے۔ ضرب المثلوں کے اندر کتنا کچھ خزانہ بھرا ہے، وہ عموماً کتنی کام آمد ثابت ہوتی ہیں، "انت بھلا سو بھلا" "جس کا رب اُس کا سب" "جیسی کرنی ویسی بھرنی"، اور بعض مصرعے اور بعض شعر کیسے دل کی بات کہہ دیتے ہیں "مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے" "کس طرح دریا کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں" "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

"مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں" - "اُن میں صدیوں کی عقلمندی کا عطر ہوتا ہے۔" "روک لو گر غلط چلے کوئی - بخش دو گر خطا کرے کوئی"۔ شاعر کے نعرے ایک سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیتے ہیں:

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی — دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

شاعر مذہب کی غلط تاویل اور اُس پر غلط عمل ہوتے دیکھ کر چلا اُٹھتا ہے:-

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

شعر کہنے والا یا کچھ اور لکھنے والا یا بولنے والا بعض وقت ایسی بات کہتا ہے جو دل میں اُتر جاتی ہے، دراصل وہ ایسی بات کہتا ہے جو پہلے سے دل میں موجود ہوتی ہے:-

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا، — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

انسان کا دل ایک خزانہ ہے نہ ختم ہونے والا اور صرف بڑے بڑوں کا دل ہی نہیں، چھوٹے سے چھوٹے انسان کے دل میں بھی بڑے سے بڑے خیال چھپے ہوئے ہیں لیکن اُن کا جاننا، اُن کا وہاں سے نکالنا، اُن کا اُبھارنا ہر کسی کا کام نہیں۔ کبھی ایک معمولی اَن پڑھ آدمی کی زندگی میں ایک چونکا دینے والا، تڑپا دینے والا واقعہ ہو جاتا ہے، تو اُس کے مُنہ سے ایسے ہی اَن مول موتی جھڑ پڑتے ہیں، جیسے ہم شیکسپیئر یا کالیداس یا غالب کے شعروں میں بکھرے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کس لئے کس طرح؟ اس لئے کہ ہر انسان کے اندر ایک خاص قابلیت موجود ہے، اس لئے کہ نوعِ انسان ایک ہے یہ ایک ہی خاندان ہے، اس کے ارکان سب کے سب ایک ہی سرچشمے کی ندیاں ہیں ساری آخرکار ایک ہی سمندر میں مل جانے والی! ان کے دل میں ایک سے خیالات لہریں لیتے ہیں، ایک لہر کئی دفعہ بیسیوں سینکڑوں ہزاروں اور لہروں کو اُبھارنے کا کام دیتی ہے، چاند کی کشش سے سمندر میں صرف ایک لہر اُٹھتی ہے پھر اُس ایک لہر کے تھپیڑے سے دُنیا جہان کے سمندروں میں ہر طرف لہریں ہی لہریں اُمڈنے لگتی ہیں، جوار بھاٹا اسی طرح پیدا ہوتا ہے۔ مصنّف یا شاعر یا مقرر کا اثر بھی یوں ہی اسی طرح ہوتا ہے، وہ ایک ایسی بات کہہ دیتا ہے جو پہلے سے اُس کے ہم جنسوں کے دلوں میں موجود ہوتی ہے، وہ ایک ایسا تار چھیڑ دیتا ہے جس سے سارے ستار میں ایک جھنکار پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانوں کی دُنیا ایک ایسا گنبد ہے جس میں ایک آواز سے سینکڑوں آوازیں وجود میں آ جاتی ہیں۔ یہ ایک آئینہ خانہ ہے جس میں ایک چیز کے ہزاروں عکس نظر آنے لگتے ہیں مگر ہر بات ہر قول ہر آواز یکساں نہیں ہوتی۔ بات بات میں، آواز آواز میں کوسوں کا فرق ہوتا ہے۔ ایک بات جہاں کہی گئی وہیں رہ جاتی ہے، ایک آواز جہاں سُنی گئی وہیں گم ہو جاتی ہے لیکن اِک ایسی آواز جس کی نسبت کہا جائے کہ:-

اِک آواز میں سوتی بستی جگا دی

ہر آواز ایسی آواز نہیں ہوتی۔ ایسی آواز زبان سے جب پیدا ہوتی ہے کہ وہ دل کے خیالات و احساسات کی گہرائیوں میں سے

نکلے اور یہ خیالات و احساسات دل میں جب پیدا ہوتے ہیں کہ وہ صرف دل والے کی اپنی زندگی نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں اور زندگیوں کے تجربوں اور مصیبتوں اور ضرورتوں کے اندر سے ایک خواہش اور ایک ارادہ بن کر نکلیں، پھر یہ خیالات ایک تڑپتی اور کڑکتی آواز کے ذریعے ساری دُنیا کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ایک بڑا قول، ایک بڑے احساس اور ایک بڑے وسیع تجربے یعنی ایک بڑے عظیم الشان عمل ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ جو کچھ ہمارے کہنے والوں نے کہا وہ اُنھوں نے نہیں کہا بلکہ دُنیا کے ہزاروں اور رہنے والوں نے گویا کہنا چاہا اور پھر ان کہنے والوں کے مُنہ سے کہا، اور ان کہنے والوں نے جب کہا تو سننے والوں نے یہی سمجھا کہ گویا یہ باتیں ہمارے ہی دل کے اندر سے نکلیں۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ پاؤں ہیں اور دیکھنے والوں کے لئے دُنیا میں جسم کئی اور دل کئی نہیں ہیں بلکہ ایک ہی جسم اور ایک ہی دل ہے جس کا نام انسانی جسم اور انسانی دل ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہم ایک اپاہج کو دیکھ کر کانپ نہ جائیں ہم ایک فاقہ مرنے والے کی بیکسی سے تڑپ نہ اُٹھیں۔

لیکن آہ ہم میں سے کتنے ہیں جو یوں کانپتے اور یوں تڑپتے ہیں اور یا کانپے تو ایک لمحے کے لئے اور تڑپے تو گویا بے جانے۔ یہی نوعِ انسان کی وہ بےحسی اور سنگدلی ہے جس پر کبھی مذہب اور آج اشتراکیت اپنا بھاری بھرکم گرز مار رہی ہے اور اُس سے وہ چنگاریاں نکل رہی ہیں جن سے عجب نہیں کہ جلد دُنیا بھر میں ایک خوں ریز لڑائی کے شعلے بھڑکنے لگیں۔

ہر انسان مختلف باتوں کو محسوس کرتا ہے لیکن کوئی محسوس کرتا ہے نہ محسوس کرنے کے برابر اور کوئی محسوس کرتا ہے اس طرح کہ اُس سے نہ صرف اُس کا اپنا وجود لرز جاتا ہے بلکہ وہ صدہا اور لوگوں میں بھی سخت لرزش پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں ہمارے پیغمبر اور ریفارمر اور اور بڑے بڑے انسان اور ایسے ہی ہیں ہمارے مشہور مصنّف اور شاعر اور مقرّر۔

اگر ہم دُنیا کی کسی بڑی تحریک یا کسی ترقی یافتہ زبان کے لٹریچر کا مطالعہ کریں گے تو ہم دیکھیں گے کہ اُن میں زبان کا دل سے اور دل کا زندگی سے کتنا گہرا اور نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق ہے۔ زندگی بنیاد ہے دل اُس پر ایک عمارت ہے اور زبان اُس عمارت کی زیبائش و آرائش ہے آرائشیں سب فضول ہیں اور بےمعنی، اگر عمارت مضبوط نہ ہو اگر اُس عمارت کی بنیاد درست اور پختہ نہ ہو۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "اپنے دل میں دیکھ اور لکھ" اسی طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کی زندگی درست ہے اُس کا دل درست ہے اور جس کا دل درست ہے اُس کی ایک ایک بات درست ہے اور دل نشیں۔

ہماری زبان کبھی تو وہ کہتی ہے جو ہمارے دل میں گزرے اور کبھی وہ جو ہماری آنکھ دیکھے اور کان سُنے، لیکن جیسا ہم دیکھ چکے ہیں یہ دو دو قسم کی باتیں دراصل ایک ہی ہیں۔ اندرونی اور بیرونی دُنیا ایک ہی رشتے میں پڑی ہوئی ہیں۔ دل اور دُنیا کا تعلق اتنا قریبی ہے کہ وہ دل دل نہیں جو دُنیا سے وابستہ نہ ہو اور وہ دُنیا دُنیا نہیں جو دل کے اندر سما نہ چکی ہو!

یہ سُن کر ہمارے بعض نیک دل بھائی پکار اُٹھیں گے کہ حضرت! دُنیا تو صرف کھیل کود ہے دھوکا ہے فریب ہے اس سے دل لگانا محض فضول ہے اور نقصان دِہ۔

بس ہمارے یہی نیک دل نیک خیال نیک بخت ہم جنس ہیں جنہوں نے مشرق اور خصوصاً ہندوستان کو غلامی کا طوق پہنا دیا ہے۔

ہم مشرق کے "نیکوں" نے دُنیا و مافیہا سے مُنہ موڑ کر اپنی تو خیر دوسروں کی زندگی کو بھی تہ و بالا بلکہ برباد کر دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ غیروں کی ٹھوکریں اور انقلاب کے بھونچال آج اِن سب دُنیا سے اُکتائے ہوئے "خدا رسیدہ" سادھوؤں کو جھنجوڑ رہے ہیں اور سمجھا رہے ہیں کہ خدا کا سچا [illegible] بندہ وہی ہے جو خدا کی اسی دُنیا میں رہے اور خدا کی اِسی دُنیا کو اپنی کوشش سے جنّت کا نمونہ بنانے میں کوئی حجت اُٹھا نہ رکھے۔

غرض ہم ہندوستانیوں اور ہم اُردو ہندوستانی والوں کو ضرورت ہے، کہ ہم اپنی زبان کو اپنے دل، اپنے دل کو اپنی زندگی اور اپنی زندگی کو آج کل کی دُنیا کے حالات کے مطابق بنائیں۔ اس کی ضرورت نہیں کہ ہم اپنے سالقہ اور موجودہ ذخیرے کو تباہ کر دیں۔ ہمارے اس ذخیرے میں بہت سے چمکتے ہوئے جوہر ہیں وہ اندھیرے میں بھی آپ سے آپ چمکیں گے لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم خود اب اس اندھیر نگری سے نکلیں، باہر نکلیں اور دیکھیں کہ نئی دُنیا کی ہوا اور روشنی کیونکر جان کو تازہ اور دل کو تازہ و تابندہ کر رہی ہے۔

زندگی کا ہر دم غنیمت ہے، ہم برسوں غفلت میں سو چکے بہت کچھ کھو چکے، آج دُنیا میں ایک نئی زندگی کی رَو دوڑ رہی ہے۔ آیئے نکل کر اس بجلی کی فضا میں ہم بھی سانس لیں، آزادی سے دوڑیں، ہمّت کی چوٹیوں پر چڑھ جائیں، فراخ دلی کے نظارے دیکھیں، دیکھیں اب جب کہ ہمارے سانس میں حرکت، اور ہماری رگوں میں نیا خون دَوڑ رہا ہے۔

ہم میں بہت سے ابھی پُرانے خیالات کے پابند ہیں لیکن بعض نہیں بہت سے اب نئے خیالات کا دم بھی بھرنے لگے ہیں۔ نئے خیالات سے یہ مُراد نہیں کہ نیا لباس ہو، نیم عُریانی ہو، کانٹا چمچہ ہو، موٹر ہو، ریڈیو ہو گستاخی کی گفتگو ہو آزادی کا اظہار ہو، اور نہ پُرانے خیالات سے مُراد ہے ڈاڑھی اور شلوار یا دھوتی اور فاقہ کشی اور نفس کشی۔ اِن سب میں اچھی بُری باتیں دونوں ہیں۔ نہیں پُرانے خیالات سے میری مُراد ہے یہ خیال کہ جو کچھ ہے سو ٹھیک ہے اور اُسی پر قائم رہنا چاہیے اور نئے خیالات سے میری مُراد ہے یہ خیال کہ دُنیا کو انسانی کوشش سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

شکر ہے کہ آخر ہندوستان نے بھی موٹر اور ریڈیو کو دیکھ سُن کر رینگنا اور بولنا شروع کر دیا۔ اور رینگنا اور لولنا ہی نہیں اب تو بڑی تیز رفتاری کے سامان ہیں۔ اب تو تھوڑے ہی سالوں میں نہیں معلوم ہم کہاں سے کہاں پہنچ جائیں۔ گو یہ بھی یاد رکھیے کہ مستقبل کو کوئی نہیں جانتا نہ معلوم کل ہی دُنیا پھر ایک عالمگیر جنگ میں مُبتلا ہو جائے اور ہم ایک عرصے کے لئے پھر پیچھے دھکیل دیئے جائیں۔

خیر مستقبل کیا لائے اور کیا دکھائے یہ ہم نہیں جانتے نہ اس پر زیادہ سوچ بچار کی ضرورت ہے عقلمند وہ ہے جو آئندہ کا کچھ دھیان کرے لیکن زیادہ تر موجودہ کو دیکھے، موجودہ کو بہتر بنانے کی پُوری کوشش کرے اور نتیجے سے بالکل بے نیاز رہے۔

(ایک ادیب دُنیا کے موجودہ حالات پر کوئی تبصرہ کرے، وہ خالص ادبیت کو پھاند کر گویا سیاست اور معاشرت کے میدان میں کیوں ان نظریوں کے پیچھے بھاگ دوڑ میں مصروف ہو، صرف اس لئے کہ صحیح ادب زندگی کا آئینہ ہے اور زندگی وہی ہے جو موجودہ حالات پر مبنی ہو، اس لئے اگر کوئی ادیب چاہتا ہے کہ وہ صحیح ادب پیدا کرے، ایسا ادب جو نہ صرف علم ادب میں اضافہ کرے بلکہ جو قوم اور ملک اور عام طور پر نوع انسان کے لئے مفید ثابت ہو تو

اُسے موجودہ تحریکات کا مطالعہ کرنا چاہیئے موجودہ تحریکات میں حصّہ لینا چاہیئے۔ خواہ یہ حصّہ لینا صرف یہیں تک محدود ہو کہ وہ پبلک کو موجودہ تحریکات اور موجودہ میلانات سے آگاہ کرے، لوگوں کو بتائے کہ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے؛ تعلیم میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں؛ تربیت کن کن طریقوں سے ہوتی ہے؛ انسانی فطرت پر "تجزیۂ نفس" کے علم نے کیا روشنی ڈالی ہے؛ وہ نیکی جسے اپنے متعلق دعوٰے ہے کیا ہے؛ وہ شرم و حیا جو اپنے آپ پر فخر کرتی ہے کہاں تک اصلی ہے؛ سائنس نے زمانے اور فاصلے کو کس طرح اپنے شکنجے میں جکڑا ہے؛ اشتراکیت نے کس طرح بڑوں کی بڑائی کا پول کھولا ہے اور چھوٹوں کے دلوں کو گُدگُدایا ہے؛ دُنیا میں کس طرح محنت اور سرمایہ دو پہلوانوں کی طرح علم و حکمت کے اکھاڑے میں آستین چڑھا کر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہونے والے ہیں؛ اور عظیم الشان طاقتوں کی جو ٹکر ہونے والی ہے اُس ٹکر میں ہمارا کیا حال ہوگا؟)

یہ درست ہے کہ سیاسی دُنیا کی صید گاہ میں ابھی ہمارا یہ حال ہے کہ ہم ایک شکاری کے فتراک سے شاید اُس کی ایڑی سے بندھے ہوئے ہیں، اور اُس خوفناک جنگ میں جو غالباً بہت جلد برپا ہونے والی ہے ہم پر بغیر ہماری مرضی کے ہلاکت کے گولے برسیں گے، موت کا طوفان اُمڈے گا لیکن اس میں بھی ذرہ برابر شبہ نہیں کہ اب ہماری زنجیریں ڈھیلی ہو رہی ہیں اور ہمارے ہاتھ پاؤں کچھ زیادہ چُست و چالاک ہو رہے ہیں۔ اس نئی تبدیلی کی وجہ وہ نئے خیالات ہیں جو دُنیا کے نئے حالات کو دیکھ کر ہمارے رہنماؤں کے دل میں پیدا ہوئے۔ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہرلال نہرو کا بڑے سے بڑا دشمن اور کانگرس کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس خوشگوار حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا نہیں کرنا چاہتا کہ اُنھوں نے اس مردہ ملک کے پنجر میں اپنے قول و عمل سے ایک نئی رُوح پھونک دی ہے۔ ہم سب اُن کے پیرو ہوں نہ ہوں اُن کے نام کی سُمرن جپیں نہ جپیں ہم میں سے بعض اُن کی طرف پیٹھ بھی موڑ لیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اُن کی طرح مصروفِ عمل ہو جائیں، کسی نہ کسی نصب العین کی طرف چل دیں بشرطیکہ ہمارا نصب العین آخر کار انسانیت کو بڑھانے اور اُبھارنے والا ہو گرانے اور پاش پاش کرنے والا نہ ہو۔ ایسے نازک وقتوں میں بعض دفعہ اپنوں ہی سے لڑائی بھی ٹھن جاتی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ خواہ ہم ایک دوسرے کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں لیکن ہم دیانتدار اور سرگرم کام کرنے والے بنیں اور عدل و انصاف کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

(ہمارے انشاپردازوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ ایسے وقت میں ملک و قوم کے اندر ایک صحیح فضا پیدا کریں۔ پُرانے نغمے چھوڑ کر نئے گیت گائیں پُرانی رزم کہانیاں ترک کر کے نئے زندگی بخش افسانے سنائیں۔) وہ دن گئے کہ ہمارے شاعر صرف دوست کی پتلی کمر کا راگ گاتے تھے یا دُنیا کی بے ثباتی کا رونا روتے تھے کہ

چار دن کی چاندنی اَور پھر اندھیری رات ہے

یا یہ کہ ؎

دُنیا کے الم ذوق اُٹھا جائیں گے — ہم کیا کہیں کیا آئے تھے کیا جائیں گے
جب آئے تھے روتے ہوئے آپ آئے تھے — اب جائیں گے اَوروں کو رُلا جائیں گے

اب اُردو کے شعر و ادب میں جدوجہد اور انسانی خودداری کا نعرہ بلند ہو چکا ہے: ؎

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی — دلِ ہر ذرّہ میں غوغائے رُستاخیز ہے ساقی
نہ تُو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے — جہاں ہے تیرے لئے تُو نہیں جہاں کے لئے

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق — یہی ازل سے رہا ہے قلندروں کا طریق

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں!

اور بجائے اُس عشق کے جو عاشق کو معشوق کا بیمار سا گدھا بنا دے اب یہ حیات آفریں عشق ہے کہ ؎

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

ہاں عشق و محبت بھی ہوں تو ایسے نہ ہوں جو روتے دھوتے عمر گزارنے کا مرثیہ پڑھا کریں بلکہ وہ جو زندگی کے ہر کام کو زیادہ تن دہی اور خوش اسلوبی اور ذوق و شوق سے سرانجام دینے پر آمادہ کردیں۔

اب شاعر آسمان سے خدا کا یہ نعرہ سنتا ہے :۔

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی — اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

پہلے جو بے ثباتی کا رونا رویا جاتا تھا اب اُس کی بجائے یہ سمجھ کر کہ ثبات، جمود اور موت کا نشان ہے تغیّر کو یوں ترقی اور زندگی کا علم بردار قرار دیا جاتا ہے :- ع "ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں"

اور :- ع "جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اِک حرفِ محرمانہ"

اور ہندوستان کے مسلمان بھی اب "رخصت اے ہندوستاں" نہیں کہتے بلکہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر یہ آواز بلند کرتے ہیں :- ؎

دعویٰ ہے ہر آن ہمارا
سارا ہندستان ہمارا

جنگل اور گلزار ہمارے — دریا اور کہسار ہمارے

کوچے اور بازار ہمارے — پھول ہمارے خار ہمارے

ہر گھر ہر میدان ہمارا
سارا ہندستان ہمارا

شاعرِ انقلاب کی پکار ہے کہ :- ؎

اے مرد خدا فتنۂ اغیار سے ہشیار — ہشیار ہو ہشیار ہو ہشیار ہو ہشیار

ہم تجھ سے نہ کہتے تھے کہ ہونے کو ہے پیکار   لے آگئی وہ سر پہ چمکتی ہوئی تلوار

بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار

بیدار ہو بیدار

مزدوروں کی حمایت میں کہا ہے کہ :-

جانور لیں سانس یکرنگی و آزادی کے ساتھ   نوعِ انساں ہو تقسیم غلام و شہریار؟

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

مستقبل کی تصویر اب روشن نظر آتی ہے :-

مژدہ اے دل کہ نیا اب سرو ساماں ہوگا   جس کو دشوار سمجھتا ہے وہ آساں ہوگا

ایک مبہم سا نشاں ہوگا نشانِ آرام   ایک بھولا سا فسانہ غمِ دوراں ہوگا

پڑا ہے جو بیاباں کی کڑی دھوپ میں آج   کل اُسی سر کے لئے تاجِ گل افشاں ہوگا

آج جس رُعب سے ہے رُوئے امارت پہ شکوہ   کل وہ مزدُور کے چہرے سے نمایاں ہوگا

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد

عالمِ پیر دگر بارہ جواں خواہد شد

قومیت اور انقلاب اور اشتراکیت اور محنت کے نعروں کا طوفان آج نازک مزاج اردو شاعری کے گُل و بلبل والے گلستاں پر آ کر اپنے پورے زور میں ٹوٹا ہے ۔ ہم انفرادی طور پر انقلابی یا اشتراکی یا اشتمالی ہوں یا نہ ہوں ۔ ہماری قومی زبان کو لازم ہے کہ وہ دُنیا کی ساری جیتی جاگتی تحریکوں ، ساری زندہ چیزوں سے آشنا ہو اور ان چمکتے موتیوں اور چھپنے والے جواہر ریزوں سے اپنے وسیع دامن کو بھر لے ۔ ہر زندہ ادب کو علم کا ، تازہ ترین علوم کا ، عَلم بردار ہونا چاہئے ۔ خوشی کا مقام ہے کہ اُردو اس بارے میں کسی اور ہندوستانی زبان کے ادب سے پیچھے نہیں ۔ اُس کے دل میں جوش کا جذبہ ہمیشہ سے موجود تھا اب بھی اُس نے جوش کے ساتھ زندگی کے اِن نئے خیالات کا خیر مقدم کیا ہے ۔

زبان ، دل اور زندگی کا یہی صحیح ملاپ ہے جسے ہمارے لکھنے والوں کو دن رات اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہئے ۔ ہم نے اس دبی نصب العین کو پالیا تو پا نہیں لیا ۔ اس کا پالینا یہی ہے کہ ادب کے ہر شعبے میں ہر تصنیف میں ہر تالیف میں ہر نظم میں ہر غزل میں بھی ہر روز ہر گھڑی جس قدر جلد ہم سے ہوسکے ہم ایسے پُورا کر دکھائیں ۔ جو کچھ لکھیں جو کچھ کہیں اُس کا زندہ چیزوں سے زندہ نظریوں سے نئے خیالات سے نئے علم سے ، نئے فن سے واسطہ ہو ، اور اگر پُرانے آزمودہ اعتقادوں اور خیالوں سے واسطہ پڑے اور اُن کا اظہار ہو تو وہ بھی ایسے طریقے میں ہو جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ کہنے والے نے اُنہیں پہلے خود محسوس کیا ہے اور پھر اُن میں دُنیا کی زندگی کا اور ساتھ ہی اپنا بھی تازہ ترین خون بھر کر اپنے ہم جنسوں کے سامنے اپنا یہ تڑپتا ہوا تحفہ پیش کیا ہے کہ لیجئے یہ ہے زندگی کا ایک جیتا جاگتا ٹکڑا !

بشیر احمد

ہندوستانی زبان

غلط یہ دھیان ہے۔ کرنا پڑیگا ردِّ عمل　　مٹے گی آج نہ اُردو، نہ مٹ سکے گی کل

زبانِ ہند ہے۔ بھاشا کا سر پہ ہے آنچل　　اسی میں غرق ہیں گنگ و جمن کے دل بادل

مہابلی ہے یہ۔ ہر رُوپ اختیار میں ہے

یہی تو کاشی میں متھرا میں ہردوار میں ہے

اِسی کو ہندو مسلماں ہیں بولتے ہر جا　　یہ سو صدی کی ہے بولی، ہوئے ہو جس سے خفا

نہ اس میں مذہبی پُٹ دو، کہ دھرم ہے گھر کا　　یہ دیش بھاشا ہے تم جس کو میٹتے ہو، سُنا

زبان ایک بناؤ، تو ایک ہوتے ہو

یہ رُومٹی ہے، یہ ہٹ دھرمی ہے جو روتے ہو

ہماری بولی، ہمارے وطن کی دولت ہے　　یہ پریم بھاشا ہے اس سے ہمیں محبت ہے

وطن کہ جس کے لئے جان بے حقیقت ہے　　پھر۔ ایسی چیز کو چھینے یہ کس کی طاقت ہے؟

نئی اُپج نہیں۔ سو امتحان لے لینا

اُڑا دو سر کہیں۔ پیچھے زبان لے لینا

وطن کا ذکر نہیں، غیر ملکوں میں سُن لیں — جہاں تہاں اسی بھاشا کے لفظ چھپیں
بگاڑ کر کہ بنا کر اسی کے بول پڑیں — گھروں میں آ کے بھی دن رات بولتے ہی رہیں
جو اُردو بولتے ہیں۔ ایسے کالے گوروں کی
اسی زمین پہ تعداد ہے کروروں کی

جہاز سے کوئی اُترے کہ ریل میں بیٹھے — ہزار میں سے بہت لفظ وہ اسی کے سُنے
اسی میں بیچ وشری ہو، اسی میں جنگ چھڑے — اسی نے بڑھ کے زمانے کے مورچے روکے
اسی کے ہاتھ ہیں گردن میں راہواروں کی
یہی تو بانکی سی بولی ہے شہسواروں کی

اسی میں وصف ہے ہر پھول کا لہک جانا — ہزار رنگ کے غنچے لئے چٹک جانا
جہاں کہیں کوئی شقہ کھلا مہک جانا — سوادِ دل میں خدنگِ نظر اٹک جانا
نفاق ہندو مسلمان جانتے ہی نہیں
دوئی بھی کوئی ہے دُنیا میں مانتے ہی نہیں

ہزار لہجے ہوں۔ الفاظ اِس کے ساری ہیں یہ ہندی بولی ہے سکّے اسی کے جاری ہیں
حرم میں دیر میں سب اس کے ہی پجاری ہیں اسی کے اہلِ کلیسا بھی۔ پاٹ دھاری ہیں

جو ماں تھیں شاہ کی اُن فاضلہ نے اس کو پڑھا
جنابِ عالیہ وکٹوریہ نے اس کو پڑھا

اسی میں کیجئے تصنیف ہر طرح حاضر اسی میں بڑھ کے ترقی کرو۔ بنو ماہر
اسی میں مادہ تخلیق کا بھی ہوگا پھر اسی میں ہوں گی "اور تخیّل" کی قدرتیں ظاہر

اسے مٹاؤ نہ پیارے ابھی اُجالا ہے
لہو چُسا کے بزرگوں نے اِس کو پالا ہے

نصیحت آخری شاعر سُنا کے جاتا ہے کہ یہ فقیر، نرالی صدا لگاتا ہے
کہاں کے ہندو مسلمان ایک مایا ہے زبان ایک بناؤ جو ایک بننا ہے

یہاں سے اُنس ہے اُردو کو، گل کھلائے گی
جہاں سے جائیگی، اِس دیس سے نہ جائے گی

آغا شاعر قزلباش دہلوی

ریڈیو کا موجد مارکونی

جولائی کے آخری ہفتہ میں ریڈیو کے موجد مارکونی کے مرنے کی خبر اخباروں میں چھپی تھی۔ اس موقع پر یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ مارکونی کے مرنے سے بیسویں صدی کا سب سے بڑا موجد اور سائنس دان ہم میں سے اُٹھ گیا۔ موجودہ زمانے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ تیزی اور آسانی سے بات چیت کرنے کے جتنے بھی ذریعے ہیں ان میں وائرلیس کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ اور یہ سہرا مارکونی کے سر ہے کہ اس نے دنیا میں سب سے پہلے برقی لہروں کو اپنے قبضہ میں کر کے لاکھوں میل کے فاصلے کو اس قدر نزدیک کر دیا کہ اب دنیا کی لاانتہا وسعت سمٹ کر بلا مبالغہ ایک مٹھی میں بند ہو گئی ہے۔ زمین پر انسان کی حکومت ہزارہا سال سے ہو رہی تھی۔ پانی پر بھی انسان نے مدتوں سے قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن ہوا اور فضا اس کی دسترس سے باہر تھے۔ دُنیا کی ترقی کی تاریخ میں جہاں بیسویں صدی اور باتوں کی وجہ سے یادگار رہیگی وہاں مستقبل کا تاریخ لکھنے والا اس واقعہ کو سنہری حرفوں سے لکھے گا کہ بیسویں صدی میں سائنس کا سب سے بڑا کارنامہ ہوا اور فضا کو انسان کے قبضہ میں لانا تھا۔ ہوا پر انسان کی حکومت ایک محدود حد تک ہوائی جہازوں کے ذریعہ ہوئی۔ اگرچہ اب اس ایجاد نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ کسی خوف و خطر کے بغیر انسان زمین کے سفر کی طرح ہوا کے سفر کا بھی عادی ہو چکا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ ہوائی جہاز کو جادو اور اس میں سفر کرنے کو شعبدے سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن اب آمد و رفت کے ذریعوں میں ہوائی جہاز ایک معمولی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کی ایجاد کے بعد بھی انسان کی قوتِ اختراع بے چین تھی۔ وہ ہوائی جہاز کی صبارفتاری کو زنجیر پا سے زیادہ نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ بات چکر لگا رہی تھی کہ ہماری بات چیت مکان اور وقت کی قید میں کیوں گھُٹی رہے۔ اور فضا کے خلا میں انسان کی آواز کیوں نہ گونجے۔ جس طرح ہم آمنے سامنے بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں، بالکل اُسی طرح لاکھوں اور کروڑوں میل تک ہماری بات چیت ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر سفر کیوں نہ کرے۔ مُدت سے دنیا کے بڑے بڑے سائنسدانوں کے ذہن اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھے لیکن قدرت نے اس کامیابی کو مارکونی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ جس نے فضا کی آزاد برقی لہروں کو انسان کا مطیع و فرمانبردار بنا کر وائرلیس کی شکل میں دُنیا کے سامنے پیش کیا ؞

بیسویں صدی کی سب سے بڑی ایجاد اور دُنیا کی تاریخ میں سائنس کی نیچر پر سب سے بڑی فتح وائرلیس ہے جس نے مکان اور وقت کی بندشوں کو توڑ کر دُنیا کے سب سے دُور دراز گوشوں کو ایک دوسرے سے اس قدر مِلا دیا ہے کہ اب ایک سکنڈ کے بہت ہی حقیر سے حصّے میں بجلی کی لہریں انسان کی آواز کو بجنسہٖ دُنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پہنچا دیتی ہیں ؞

اٹلی کی سرزمین کو یہ فخر ابد تک رہے گا کہ دُنیا کا سب سے بڑا موجد مارکونی اسی مُلک میں پیدا ہؤا۔ آج سے تقریباً تریسٹھ سال پہلے ۲۵ راپریل ۱۸۷۴ء کو بلوگنا (Bologna) نامی قصبہ میں مارکونی پیدا ہؤا۔ اس کی ابتدائی تعلیم بہت معمولی طور پر بلوگنا، فلورنس اور لیگ ہارن میں ہوئی۔

مارکونی کو بچپن سے ہی سائنس اور خاص طور پر طبیعیات یعنی فزکس اور بجلی سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے اپنے بچپن میں بارہا ٹیلی گراف کے ذریعہ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پیغام بھیجتے دیکھا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ بجلی کی مقناطیسی لہروں کے ذریعہ بھی یہی کام لیا جا سکتا ہے، جو اُس وقت تاروں سے لیا جاتا تھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی کیونکہ اس سے بہت پہلے ۱۸۶۴ء میں کلارک میکسول نے اسی بات کو ریاضی کے زور سے ثابت کر دکھایا تھا اور اس کے بعد Heinrick Hertz آلیور لاج، Rigi اور دوسرے سائنسدانوں نے بھی اسی نظریہ کے متعلق بہت سے تجربے کئے تھے۔ ان کے علاوہ لندن اور دوسرے شہروں میں برقی لہروں کے بہت سے دلچسپ تجربے ہو رہے تھے لیکن مارکونی سب سے پہلا شخص ہے جس نے عملی طور پر برقی لہروں کو قبضہ میں لا کر ٹیلی گرافی کی دنیا میں ایک انقلاب سا پیدا کر دیا۔

مارکونی کا باپ بلوگنا کے پاس PONTECCHIO نامی ایک چھوٹے سے قصبہ میں رہتا تھا۔ یہ گاؤں دُنیا کی تاریخ میں ہمیشہ اس لئے یاد رکھا جائے گا کہ اسی جگہ مارکونی نے سب سے پہلے برقی لہروں کے تجربے شروع کئے۔ لیکن غریب مارکونی کے پاس ان تجربوں کے لئے کوئی سامان نہیں تھا اور وہاں کوئی ایسی تجربہ گاہ بھی نہیں تھی کہ یہ وہاں جا کر مدد لے سکتا۔ اس دقت اور بے چارگی کے باوجود اس کے تجربے کامیاب ثابت ہوئے۔ اور ایک سال کے اندر مارکونی نے بغیر تار کے ایک میل سے زیادہ فاصلہ تک پیغام رسانی شروع کر دی۔

وائرلیس کی ترقی میں انگلستان بھی فخریہ طور پر برابر کا شریک ہے۔ کیونکہ ان ابتدائی تجربوں کے بعد مارکونی ۱۸۹۶ء میں انگلستان آیا۔ اور اسی سال ۲ رجون کو مارکونی نے بے تار برقی کا سرکاری لائسنس حاصل کیا۔ جو وائرلیس کی تاریخ میں دُنیا کا سب سے پہلا لائسنس ہے مارکونی لندن میں نہایت تن دہی سے اپنے تجربوں میں لگا رہا۔ اسی سال اُس نے انگلستان کے ڈاک خانے کے محکمے کے بڑے بڑے افسروں اور دفترِ خارجہ کے نمائندوں کو اپنی ایجاد کا مشاہدہ کرایا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ مشاہدہ لندن کے جنرل پوسٹ آفس کی چھت پر کرایا گیا تھا۔ اس کے بعد انگلستان کے دوسرے شہروں میں انہی تجربوں کی بار بار نمائش ہوئی۔ ان تجربوں سے دو میل تک پیغام رسانی کا سلسلہ قائم ہؤا جو بعد میں بڑھتے بڑھتے چار میل اور پھر نو میل تک پہنچ گیا۔

جب پہلی دفعہ مارکونی نے نو میل تک پیغام رسانی میں کامیابی حاصل کر لی تو اس کی طفلانہ خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن قدرت اس کامیابی پر مسکرا رہی تھی۔ کیونکہ مارکونی کی قسمت میں نو میل کی جگہ ہزارہا میل تک پیغام رسانی لکھی تھی۔

جب اٹلی والوں کو مارکونی کی اس شاندار کامیابی کا پتہ لگا تو اس کو حکومت کی طرف سے اٹلی آنے کی دعوت دی گئی، چنانچہ

جون ۱۸۹۷ء میں مارکونی اٹلی گیا اور Spizia کے مقام پر ایک وائرلیس اسٹیشن بنایا جو بارہ میل کے اندر جنگی جہازوں کو پیغام پہنچا سکتا تھا۔ اس کے بعد روم میں جا کر اٹلی کے بادشاہ اور ملکہ کے سامنے مارکونی کو اپنے تجربوں کی نمائش کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد اٹلی کے ایوانِ حکومت میں بھی ان تجربوں کا مشاہدہ کرایا گیا۔

اب مارکونی کے تجربے اس حد تک کامیاب ثابت ہو چکے تھے کہ انہیں تجارتی کاروبار میں بھی استعمال کیا جائے۔ چنانچہ اب اسے یہ سوجھی کہ وائرلیس کی ایجاد کو تجربوں کے بازیچہ سے نکال کر ایک عملی اور افادی شکل میں ڈھالے۔ آج سے کوئی چار سال پہلے جولائی ۱۸۹۷ء میں لندن میں ایک کمپنی قائم ہوئی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مارکونی کی ایجادوں کے حقوق دُنیا کے تمام ملکوں میں محفوظ کرالئے جائیں لیکن مارکونی کی حب الوطنی نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کی ایجادیں اس کے اپنے وطن اٹلی میں بھی محفوظ ہو کر چند مخصوص لوگوں تک محدود ہو جائیں چنانچہ اس کمپنی نے اٹلی کے سوا دُنیا کے سب ملکوں میں مارکونی کی ایجادوں کے حقوق قانونی طور پر محفوظ کرالئے۔

اس کمپنی کا نام شروع میں وائرلیس اینڈ سگنل کمپنی لمیٹڈ تھا۔ جسے ۱۹۰۰ء میں مارکونی وائرلیس ٹیلی گراف کمپنی لمیٹڈ کے نام سے بدل دیا گیا۔ کچھ عرصہ تک اس کمپنی کا مقصد صرف یہ رہا کہ مارکونی کی ایجادوں کو رواج دیا جائے۔ اس سلسلہ میں جزائر برطانیہ کے ساحلوں پر بار بار دلچسپ تجربے اور کامیاب مشاہدے کئے گئے۔ اور جزیرۂ وائٹ میں، ایلم بے اور بورن ماتھ کے مقامات پر وائرلیس کے مستقل اسٹیشن بن گئے۔

۱۸۹۸ء میں سب سے پہلی دفعہ ساحل اور سمندر کے جہازوں کے درمیان بے تار برقی کے ذریعہ پیغام سلام ہوئے۔ اس موقعہ پر ساحل اور جہاز کا درمیانی فاصلہ بارہ میل تھا۔ جس جہاز میں وائرلیس لگایا گیا اس کا نام East Goodwin تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جہاز بہت ننھا سا تھا۔ اتفاقاً یہ کسی بڑے دُخانی جہاز کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس چھوٹے جہاز والوں نے وائرلیس کے ذریعہ ساحل والوں سے مدد مانگی۔ اس طرح سب سے پہلی دفعہ وائرلیس سمندر میں جان بچانے کے کام آیا۔ یہ حادثہ ۳ مارچ ۱۸۹۹ء کو پیش آیا۔ جب وائرلیس کے ذریعہ ساؤتھ فورلینڈ کے ساحل پر اس حادثہ کی خبر پہنچی تو اُس چھوٹے سے جہاز کی مدد کے لئے فوراً کشتیاں روانہ ہوئیں اور اُنہوں نے وقت پر پہنچ کر بہت سے ڈوبتے ہوئے آدمیوں کو بچا لیا۔

مارچ ۱۸۹۹ء میں مارکونی نے انگلستان اور فرانس کے درمیان بے تار برقی کے ذریعہ پیغام رسانی کا سلسلہ قائم کیا۔ اسی سال چوہتر میل کے فاصلہ تک جنگی جہازوں کے درمیان پیغام سلام ہوئے جو بحری لڑائی کی تاریخ میں اپنی قسم کی پہلی مثال ہے۔ اس کے بعد جب جنوبی افریقہ میں لڑائی چھڑی تو وائرلیس کے ذریعہ بہت سے کام لئے گئے۔

اکتوبر ۱۹۰۰ء میں مارکونی نے کارنوال میں ایک نیا وائرلیس اسٹیشن بنانا شروع کیا۔ اور اپنے تجربوں کے ذریعہ ثابت کر دیا کہ تقریباً دو سو میل تک بے تار برقی کے ذریعہ پیغام پہنچایا جا سکتا ہے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۱ء کو مارکونی نے بحر اوقیانوس پر سے پیغام بھیجے اور ان کا

ٹھیک ٹھیک جواب بھی وصول کیا +

سنہ ۱۹۰۲ء میں مارکونی ایک امریکی جہاز پر سفر کر رہا تھا۔ لیکن سفر میں بھی اس کے سر پر انہی تجربوں کی دُھن سوار رہتی تھی۔ اسی سفر میں مارکونی نے دن کے وقت سات سَو میل کے فاصلہ سے پیغام وصُول کئے۔ اور رات کو اس کے پاس دو ہزار میل تک کے پیغام آئے۔ مارکونی کا یہ سفر وائرلیس کی تاریخ میں اس لئے مبارک گنا جاتا ہے کہ سب سے پہلے مارکونی کو اسی سفر میں اس حقیقت کا پتہ چلا کہ بے تار برقی کے ذریعہ دن کی نسبت رات کو زیادہ فاصلہ سے پیغام سلام ہو سکتا ہے۔ اب یہ حقیقت بچہ بچہ جانتا ہے کہ ریڈیو پر دن کی نسبت رات کو زیادہ صاف اور دُور کی آوازیں سُنی جاتی ہیں +

سنہ ۱۹۰۲ء میں مارکونی نے ایک مقناطیسی آلہ پیٹنٹ کرایا جو برقی لہریں وصُول کرتا تھا اور سنہ ۱۹۰۵ء میں اُس نے ایسے آلے پیٹنٹ کرائے جو لمبے لمبے سیدھے ایریل کے ذریعہ کام کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں مارکونی کے ساتھ ایچ، جے، راؤنڈ نامی ایک اور شخص تجربوں میں شامل ہو گیا۔ اس کی مدد سے مارکونی نے تقریباً چھ ہزار میل تک کے پیغام سلام کئے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں مارکونی نے وائرلیس کی ایک اور ایجاد کی۔ جس کے ذریعہ متواتر اور لگاتار بغیر کسی رُکاوٹ کے پیغام بھیجے جا سکتے تھے۔ اسی ایجاد کے ذریعہ ستمبر سنہ ۱۹۱۸ء میں مارکونی نے انگلستان سے آسٹریلیا سب سے پہلا پیغام بھیجا +

اسی دَوران میں جنگِ عظیم چھِڑ گئی۔ اب دُنیا کی مختلف طاقتوں کو پیغام رسانی کے لئے وائرلیس جیسی مفید ایجاد کی اور بھی ضرورت ہوئی۔ جنگ میں پیغام رسانی کے لئے مارکونی نے "شارٹ ویو" پر تجربے شروع کئے۔ اسی سلسلہ میں انگلستان میں مارکونی نے مسٹر جی، ایس، فرینکلن کی مدد سے تجربے کئے جن کی بنا پر بہت سی ضروری باتیں ہاتھ لگیں۔ چنانچہ ۱۵ میٹر (شارٹ ویو) پر لندن اور برمنگھم کے درمیان پیغام بھیجا گیا اور یہ تجربہ بہت کامیاب ثابت ہؤا +

جنگِ عظیم میں مارکونی نے اٹلی کی فوج اور بحری بیڑے کو اپنی خدمات پیش کیں۔ اسی دوران میں مارکونی نے امریکہ کا سفر کیا۔ مارکونی کا یہ سفر اٹلی کے جنگی وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے تھا۔ یہ وفد لڑائی کے سلسلہ میں کچھ اصُولی باتوں کے تصفیہ کے لئے ریاستہائے متحدہ امریکہ گیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں شاہِ اٹلی نے پیرس کی صلح کانفرنس میں مارکونی کو اٹلی کا مختارِ کُل بنا کر بھیجا۔ اٹلی کے مختارِ کُل کی حیثیت سے مارکونی نے پیرس کی صلح کانفرنس کے سب جلسوں میں شرکت کی اور آسٹریا اور بلغاریہ والے صلح کے معاہدے پر دستخط بھی کئے۔ اسی حیثیت سے مارکونی پیرس اور لندن کے صلح کمیشن میں بھی شریک ہؤا۔ مارکونی کی ملکی خدمات کا سب سے بڑا اعتراف یوں ہؤا سنہ ۱۹۰۹ء میں فزکس کا نوبل پرائز مارکونی کو ملا۔ اس کے علاوہ رائل سوسائٹی آف آرٹس کا البرٹ میڈل اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے فرینکلن میڈل اور جون فرٹز میڈل بھی مارکونی کی شاندار خدمات کے اعتراف میں پیش کئے گئے۔ اسی سال شاہِ اٹلی نے مارکونی کو اٹلی کی سینیٹ کا ممبر نامزد کیا اور یہ سب سے بڑی عزت ہے جو اٹلی کی طرف سے اپنے سپوتوں کو ملتی ہے ::

جب سے وائرلیس کے سلسلہ میں شیشہ کے والو ایجاد ہوئے ہیں اس وقت سے وائرلیس میں گویا چار چاند لگ گئے ہیں۔ اور اب ہر قسم کی بات چیت ایک جگہ سے دوسری جگہ نہایت صحت اور سلامتی سے ہوسکتی ہے +

اسی ایجاد نے وائرلیس کی دُنیا پر موسیقی کا ڈنکا بجوایا۔ اور اسی کے ذریعہ سے اب لمبی لمبی تقریریں براڈکاسٹ ہوتی ہیں۔ یہ بات دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ ۲۳ر فروری اور ۶ر مارچ ۱۹۲۰ء کے درمیان انگلستان میں سب سے پہلی دفعہ ریڈیو کے ذریعہ موسیقی براڈکاسٹ ہوئی اور یہ تجربہ چیمسفورڈ میں مارکونی کمپنی کے کارخانہ سے براڈکاسٹ ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں موسیقی اور تقریریں بہت باقاعدگی سے مارکونی اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہونے لگیں یہ اسٹیشن چیمسفورڈ میں رٹل کے مقام پر تھا۔ پھر لندن میں مارکونی ہاؤس سے یہ تجربے براڈکاسٹ ہوتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں برٹش براڈکاسٹنگ کمپنی کے نام سے ایک کمپنی قائم ہوئی جو بعد میں برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن بن گئی۔ اسی کمپنی کو اب اختصار کے طور پر بی۔ بی۔ سی بھی کہتے ہیں۔ جسے ریڈیو سننے والا بچہ بچہ جانتا ہے +

وائرلیس کی نئی ایجادوں کے سلسلہ میں سب سے مفید ایجاد "شارٹ ویو" کی ہے۔ اس نئی ایجاد کے ذریعہ دور دراز فاصلوں کے درمیان بغیر کسی رُکاوٹ کے بات چیت ہوسکتی ہے۔ ۱۹۲۶ء میں برطانیہ، کینیڈا، ہندوستان، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جنوبی امریکہ کے درمیان بات چیت کا سلسلہ قائم کرنے کے لئے شارٹ ویو اسٹیشن بنائے گئے تھے، اور اب شارٹ ویو کی ایجاد بہت سُرعت سے پُرانی لانگ ویو کی جگہ لے رہی ہے۔ اسی ایجاد کی بدولت اب وائرلیس ٹیلیفون بھی عام طور پر استعمال ہوتا ہے جس کے ذریعہ آپ ہندوستان کے کسی شہر میں بیٹھ کر دُنیا کے ہر ایک شہر سے بات چیت کرسکتے ہیں۔ اس طرح دُنیا کے دُور دراز شہر اور بھی ایک دوسرے سے قریب آگئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کا خرچ بھی بہت کم ہے۔ اس نئی ایجاد سے تجارت پر جو کچھ اثر پڑا ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں +

یہ تھی دُنیا کے ایک بہت بڑے محسن اور اس کے کارناموں کی کہانی، جس نے چند سالوں میں تمام دُنیا کی کایا پلٹ دی۔ ایسے خوش قسمت لوگ بہت کم ہوں گے کہ جو اپنی زندگی میں اپنے لگائے ہوئے پودوں کو پروان چڑھتا دیکھتے ہیں، اس کے پھل خود کھاتے ہیں اور دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے ہیں۔ مارکونی سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا کہ اس نے آج سے بیالیس سال پہلے بے تار برقی کے ذریعہ پیغام سلام کا ایک دھندلا سا خواب دیکھا تھا جسے اُور تو اُور یہ خود بھی ایک سراب سے زیادہ نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن صرف چالیس سال کے اندر دُنیا کے کونے کونے میں مارکونی اور ریڈیو کا نام پہنچ گیا۔ دُنیا میں اس وقت جتنے بھی ریڈیو اسٹیشن کام کررہے ہیں اور جس قدر سننے والے روز ان اسٹیشنوں کے ذریعہ موسیقی، تقریریں اور خبریں سنتے ہیں وہ سب مارکونی کے احسان مند ہیں کہ اس نے اُنہیں ایک ایسی چیز دی کہ جس کے پہلے زمانے میں لوگ خواب دیکھتے تھے، افسانے پڑھتے تھے، یا کبھی کبھی کوئی شاعر خوش ہوکر کسی کو یہ دُعا دیتا تھا ع

تری آواز مکے اور مدینے

سائنس کے میدان کا یہ شہسوار دوسرے سائنس دانوں یا فلسفیوں کی طرح عمر بھر صرف اپنی تجربہ گاہ کی محدود چار دیواری کے اندر ہی مقید نہیں رہا بلکہ اس نے علمی اور سیاسی دُنیا کے جریدہ پر بھی اپنا نقش دوام ثبت کیا۔ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ جنگ عظیم کے دَوران میں امریکہ کے جنگی وفد اور پیرس کی صلح کانفرنس میں مارکونی نے اٹلی کے مختارِ کُل کی حیثیت سے شرکت کی۔

اس وقت جب کہ دُنیا میں ہر طرف سیاسی کشمکش کا بازار گرم ہے، اور ہر لمحہ اسی اُمید و بیم میں گزر رہا ہے کہ دیکھئے جنگ کی تاریک اور بھیانک بدلیاں کس سرزمین کو اور کس وقت اپنا تختہ مشق بناتی ہیں۔ اس خلفشار کے زمانے میں مارکونی ایک امن پسند شخصیت رکھتا تھا اس کا خیال تھا کہ وائرلیس کی مفید ایجاد سے مختلف قوموں کے خیالات اور ذہنی احساسات کے درمیان جو وسیع خلیج حائل ہے اسے ایک حد تک پاٹا جا سکتا ہے۔ یعنی ریڈیو دنیا میں امن کا ایک بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مارکونی کے لئے یہ خیال سوہانِ رُوح تھا کہ ہونے والی جنگ میں ریڈیو دنیا کی تباہی، بنی نوع انسان کی بربادی اور امن و امان کو تہ و بالا کرنے کا ایک ذریعہ بنایا جائے گا۔ مارکونی کے مرنے سے چند ہی دن پہلے انگلستان کے مشہور سیاست دان مسٹر لینز بری نے مارکونی سے بہت دیر تک بات چیت کی۔ اس ملاقات کے بعد انہوں نے جو بیان رائٹر کے نمائندے کو دیا ہے وہ قابلِ ذکر ہے۔

مسٹر لینز بری اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انگلستان اور اٹلی کے درمیان جو سیاسی گتھیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان سے مارکونی کو بے حد روحانی اذیت پہنچ رہی تھی۔ مارکونی کو یقین تھا کہ اٹلی والے کبھی جان بوجھ کر انگلستان والوں سے نہیں لڑیں گے اور ہر ممکن کوشش کریں گے کہ انگلستان والوں کے ساتھ امن اور صلح کی زندگی بسر کریں۔ مارکونی کا انگلستان سے بہت قریبی تعلق تھا کیونکہ اس کی ماں آئرلینڈ کی رہنے والی تھی اور اسی لئے انگریزوں کی یہ بے حد قدر کرتا تھا۔

سب سے زیادہ مارکونی کو اس بات کا افسوس تھا کہ انسانی ذہن کی بہترین ایجادیں ایسے وحشیانہ اور خطرناک مقصدوں کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام بہترین چیزیں جو انسان کو اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں اور جن کا زندہ رکھنا نہایت ضروری ہے تباہ و برباد ہو رہی ہیں۔

مارکونی کی ایجادوں سے جن لوگوں نے فائدہ اُٹھایا ہے وہ اب کروڑپتی بن گئے ہیں اور بعض لوگوں کا خیال ہوگا کہ مارکونی نے خود بھی بہت کافی دولت چھوڑی ہے، لیکن تعجب تو یہ ہے کہ مرتے وقت یہ کسی بڑے اثاثہ کا مالک نہیں تھا۔

حال ہی میں ایک انگریز مصنف نے مارکونی کے متعلق ایک رسالہ شائع کیا ہے اس میں مارکونی اور کولمبس کا بہت دلچسپ مقابلہ ہے۔ یہ مصنف لکھتا ہے کہ اٹلی کے دو سپوتوں نے زمین کے گرد چکر لگانے کا ارادہ کیا۔ ان میں سے ایک کا نام کولمبس تھا اور دوسرے کا نام مارکونی۔ ایک نے جہاز کے ذریعہ دُنیا کا چکر لگایا۔ اور دوسرا ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر زمین کے گرد گھوما۔ جب کولمبس نے اپنا زبردست ارادہ ظاہر کیا تو دنیا میں بسنے والوں کا یہ خیال تھا کہ زمین کی سطح ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح چپٹی

ہے لیکن کولمبس نے ثابت کر دکھایا کہ زمین گول ہے۔ مارکونی اس وقت پیدا ہوا جب کہ دُنیا میں بسنے والے مان چکے تھے کہ زمین گول ہے اور ان سب کا خیال تھا کہ وائرلیس کی لہریں زمین کے گرد چکر نہیں لگا سکتیں بلکہ اس کی سطح کو چھوتی ہوئی فضا میں غائب ہو جائیں گی۔ لیکن مارکونی نے ثابت کر دکھایا کہ گول زمین کے گرد وائرلیس کی لہروں کا بھی گول جال باندھا جا سکتا ہے۔

آخر میں ہم مارکونی کے ایک دلچسپ انٹرویو کا حوالہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ انٹرویو آج سے کوئی چھ سال پہلے مارکونی نے لندن کے اخبار مارننگ پوسٹ کے نمائندے کو دیا تھا۔ اس موقعہ پر مارکونی نے پانچ چیزوں کے متعلق پیشین گوئی کی تھی :-

۱- وائرلیس دُنیا میں مقبول ہو کر رہے گا۔

۲- ٹیلی وژن ایک دن تجارتی نقطۂ نظر سے بھی کامیاب ثابت ہو جائے گا۔

۳- وائرلیس کی ترقی لڑائی میں دُشواریاں پیدا کر دے گی۔

۴- ہوائی جہاز بغیر ہوابازوں کے چلا کریں گے۔

۵- شارٹ ویو کی ترقی ریڈیو کی دُنیا میں انقلاب پیدا کر دے گی۔

دیکھیئے یہ باتیں ان چھ سالوں میں کس حد تک ثابت ہو چکی ہیں اور آئندہ کس حد تک سچ ثابت ہوتی ہیں۔

آغا محمد اشرف ایم۔اے

اک ہستئ محدود میں یہ وسعتِ تخئیل
تسخیرِ ابد کو جسے چھوڑا تھا ازل نے

گو روحِ خدا ہوں نہ ہوں انساں تو نہیں ہم
تقدیر کے اس تیر کا پیکاں تو نہیں ہم

شاعر خدا کے حضور میں

شاعر

اللہ مرے! منزلِ حق کتنی کٹھن ہے!
ہر گام پہ یا آرہ ہے یا دار و رسن ہے!

ہے گھوم رہا سر پہ کہیں خنجرِ فرعون
اور آتشِ نمرود کہیں شعلہ فگن ہے

ہے چاہِ مصیبت میں کہیں یوسفِؑ معصوم
یعقوبؑ کہیں وقفِ غم و رنج و محن ہے

سر نوکِ سناں پر ہے حسینؑ ابنِ علیؑ کا
زہرابِ ہلاہل کا ہے جام اور حسنؑ ہے

ہیں اہلِ ہوس حسن کی آغوش میں مدہوش
لاشہ کہیں عشاق کا بے گور و کفن ہے

مومن کے لئے دار و رسن طوق و سلاسل
منکر کے لئے لعلِ یمن، دُرِّ عدن ہے

اربابِ وفا کے لئے تاریکیٔ زنداں
اربابِ ریا کے لئے دامانِ چمن ہے

اخلاص ہی اور گھونٹ ہیں خوننابۂ دل کے
تزویر ہے اور ساغرِ صہبائے کہن ہے

پرویز ہے اور جلوۂ شیریں کی بہاریں
فرہاد ہے اور تیشہ بکف سنگ شکن ہے

ابلیس کا وہ زور ہے وہ رنگ ہے وہ ڈھنگ
یارب! تری دُنیا ترے بندوں پہ ہوئی تنگ!!

خدا

اے شاعرِ حق کوش! بجا ہے ترا شکوہ — لیکن تو ابھی محرمِ اسرار نہیں ہے

رنگینیٔ باطل میں ہیں کھوئی ہوئی نظریں — اور چشمِ بصیرت ابھی بیدار نہیں ہے

کیا تو نے محمدؐ کی کرامت نہیں دیکھی! — تجھ کو خبرِ حیدرِ کرارؓ نہیں ہے؟

کیا سر ترا خالی ہے محبت کے جنوں سے — کیا روح تری مطلعِ انوار نہیں ہے؟

کیوں معرکۂ باطل و حق سے ہے پریشاں — کیا جذبۂ پیکار سے سرشار نہیں ہے؟

بزدل کیلئے خنجرِ خونخوار ہے باطل — ہمت ہے اگر تجھ میں تو خونخوار نہیں ہے

فرعون کے خنجر سے ہراساں نہیں موسیٰؑ — عیسیٰؑ کو بھی کچھ خوفِ سرِ دار نہیں ہے

پیدا ہے اگر دل میں براہیمؑ کا جذبہ — گلزار ہی گلزار ہے پھر نار نہیں ہے

حائل ہے تری راہ میں ابلیس کی دیوار — جو گر نہ سکے ایسی یہ دیوار نہیں ہے

ہے پاس اگر گرزِ گراں حسنِ عمل کا — پھر اس کا گرانا کوئی دشوار نہیں ہے

اے مردِ خود آگاہ! بس اک نعرۂ ہو حق!
پھر دیکھ کہ دیوار یہ ہوتی ہے ابھی شق!

اثر صہبائی

جھنڈا اونچا رہے ہمارا

اوکٹو فوئی لے (Octave Fuillet) انیسویں صدی کا ایک مشہور فرانسیسی ادیب تھا۔ فوئی لے اپنی حیاتِ ادبی کے آغاز میں حسن و عشق پر مختصر مضامین لکھتا رہا لیکن رفتہ رفتہ وہ پیرس کی فیشن ایبل سوسائٹی سے متاثر ہوا اور اس نے ۱۸۵۰ء کے بعد ناول لکھنا شروع کئے۔ جنگ فرانس و جرمنی کے بعد فرانس کی شکست سے متاثر ہو کر اس نے قومی افسانے سپرد قلم کئے اور مبصرین کا اتفاق ہے کہ اس کے بہترین افسانے وہ ہیں جن میں وطنیت کا رنگ ہو۔ مندرجہ ذیل افسانہ اس کے ایک مشہور افسانہ Swing the flag کا ترجمہ ہے۔

طالب صفوی

شبِ گزشتہ کھانے سے فارغ ہو کر ہم لوگ باغ میں ٹہل رہے تھے اور نسیمِ شب سے لطف اندوز ہو رہے تھے جس میں گلاب کے پھولوں اور سگار کے دھوئیں کی ملی جلی کیف آور خوشبو سی تھی۔ آسمان پر بادل نام کو بھی نہیں تھا اور ماہتاب آزادی کے ساتھ مصروف ضیا پاشی تھا۔ نکھری ہوئی چاندنی میں جھیل کے صاف و شفاف پانی کی لہروں پر چاندی کے پتروں کا گمان ہوتا اور جھیل میں پڑے ہوئے ساکن راج ہنس چاندی کے ڈلے معلوم ہوتے تھے۔ ہم سب اس سکونِ فطرت سے متاثر تھے اور خاموش۔ آخر کار اس طولانی خاموشی سے اُکتا کر دفعۃً میں نے کمانڈر ڈیبلے سے کہا "یہ غیر معمولی سکون گذشتہ جنگ کے شور و شغب سے کس قدر مختلف ہے۔"

کمانڈر نے چونک کر پوچھا "کیا آپ میں مافی الضمیر سمجھنے کی طاقت موجود ہے؟"

"مافی الضمیر کیسا میں تو سامنے کی چیز بھی صاف نہیں دیکھ سکتا کیونکہ میں بدقسمتی سے نزدیک بیں ہوں۔ لیکن آخر آپ نے یہ غیر معمولی سوال کیوں کیا؟"

"اس لئے کہ میں حقیقۃً اس وقت جنگِ گزشتہ کے ایک واقعے پر غور کر رہا تھا۔"

میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا "کمانڈر میں اس واقعے کے سننے کے لئے بیتاب ہوں جس نے تمہیں اتنے دن کے بعد بھی متاثر کر دیا۔"

(۲)

کمانڈر ذرا کی ذرا رکا۔ اس کے بعد ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگا "پناہ بخدا! اچھا سنو۔ یہ واقعہ ۲۷ر اکتوبر ۱۸۷۱ء کا ہے۔ میں اس زمانے میں فوج کا کپتان تھا۔ جرمنوں نے ذلت آمیز شرائطِ صلح طے کر لئے تھے اور مجھے حکم ملا تھا کہ میں ایک رجمنٹ کو جرمنوں کے خلاف جارحانہ اقدام سے روکوں۔ میں رجمنٹ کے کرنل کو حکم نامہ دے چکا تھا اور اس کا منتظر تھا کہ میرا گھوڑا ذرا سستا لے تو واپس جاؤں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج مجھے ڈ

واقعہ کیوں یاد آیا۔ یقیناً اس پُرفضا باغ اور ریتیلے میدان میں خاموشی کے سوا اور کوئی مناسبت نہیں ہے۔ بے شبہ ان سفید پوشوں اور سپاہیوں کی قطار میں سکوت کے علاوہ اور کوئی وجہ شبہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود یہ منظر دیکھ کر مجھے ۲۷ر اکتوبر کا واقعہ یاد آ گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ چشمِ تصور بعض اوقات دو متضاد چیزوں کو بھی ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے۔ ہاں تو ہُوا یہ کہ میرے جانے سے پوری رجمنٹ پر ایک عجیب افسردگی طاری ہو گئی اور سب کو یقین کامل ہو گیا کہ ہم کو جرمنوں کی اطاعت کرنا پڑے گی۔ سپاہی بندوقیں بے دلی سے ہاتھ میں لئے ہوئے خاموش کھڑے تھے اور کرنل حالتِ غیظ و غضب میں ٹہل ٹہل کر افسرانِ بالا کا حکم پڑھ رہا تھا۔ آخر کار وہ بوڑھا فوجی شیر خشمگیں انداز سے میرے پاس آیا گویا اس حکم کی ساری ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی اور میرا بازو جھنجھوڑ کر کہنے لگا "کپتان! میں تم سے دو دو باتیں کرنا چاہتا ہوں، بولو کیا ہمیں واقعی اعترافِ شکست کرنا ہوگا؟"

"ہاں سُنا تو یہی جاتا ہے اور میرا بھی یہی خیال ہے!"

"تمہارا بھی یہی خیال ہے! تمہارا بھی یہی خیال ہے!! تم یہ خیال کر کیونکر سکتے ہو!" کرنل یہ کہہ کر واپس چلا گیا لیکن تھوڑی دُور جانے کے بعد پھر پلٹ پڑا اور بپھرے ہوئے انداز میں کہنے لگا "تو کیا ہم اب غلامی کی زندگی بسر کریں گے؟ کیا ہمیں جرمنوں کا قیدی بن کر رہنا پڑیگا"۔ میں نے آہستہ سے کہا "ہاں غالباً!" کرنل یہ سُن کر بڑی دیر تک خاموش اور متفکر کھڑا رہا، اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی اہم سوال پوچھنا چاہتا ہے۔ آخر کار اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر نظر نیچی کر کے رہانسو آواز سے پوچھا "اور قومی جھنڈوں کا کیا حشر ہوگا؟" میں نے پھر آہستہ سے کہا "مجھے نہیں معلوم کرنل"۔ اس نے بپھر کر کہا "ہاں تمہیں کیوں معلوم ہوگا" اور اضطراب آمیز انداز سے ٹہلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے تحکم آمیز لہجے میں جھنڈا لانے کو کہا۔ ایک نوجوان افسر افسردہ دلی کے ساتھ قدم اُٹھاتا ہوا آیا اور ڈرتے ڈرتے جھنڈا کرنل کے ہاتھ میں دے دیا۔ قومی نشان پا کر کرنل کی آنکھوں میں حبِ وطن کے جوش سے ایک قسم کی چمک سی پیدا ہو گئی۔ اس نے جھنڈے کو بلند کرنا شروع کیا، معلوم ہوتا تھا کہ وہ مادرِ وطن کے نشان کو آسمان تک پہنچانے کا آرزومند ہے، یکایک کرنل کا ہاتھ نیچا ہونا شروع ہوا اور اس نے سر جھکا کر کچھ سوچنا شروع کیا پھر فیصلہ کُن انداز سے آگ کی طرف چلنے لگا۔ ہم سب اس کی نقل و حرکت کو ادب آمیز سکوت سے دیکھ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ آگ کے پاس پہنچ کر اس نے جھنڈے کو پھر خوب اونچا کیا اور بلند آواز سے ایک قومی گیت گانا شروع کیا جس کا پہلا مصرع تھا "جھنڈا اونچا رہے ہمارا"۔ آگ کی تیز روشنی میں اس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دُور سے بھی بآسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ بوڑھے کرنل کا جھریوں پڑا ہوا چہرہ جو ابھی حبِ وطن کے جوش سے سُرخ ہو رہا تھا دفعتہً زرد ہو گیا اور اس کے بعد اس پر کچھ مُردنی کے سے آثار طاری ہو گئے۔ بوڑھا کرنل رفتہ رفتہ خمیدہ ہو رہا تھا آخر کار وہ دو زانو بیٹھ گیا، سر پر سے ہیٹ تعظیماً اُتار لی اور جھنڈے کی سلامی کا حکم دیا اور جب بینڈ جھنڈے کی سلامی دے رہا تھا اس نے قومی نشان کو نذرِ آتش کر دیا۔ رجمنٹ کا ہر سپاہی زار و قطار رو رہا تھا اور میں ـــــ میرا دل بھی اپنے قابو میں نہ تھا"

کمانڈر ڈیبلے غالباً داستان ختم کر چکا تھا لیکن مَیں اس انداز سے سرنگوں اور ہمہ تن گوش بیٹھا تھا جیسے اس داستانِ غم کا کوئی اور ٹکڑا باقی ہے، آخر کار ایک دبی ہوئی سسکی کی آواز نے میرے اس طلسمِ محویت کو توڑا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو کمانڈر ڈیبلے مُنہ پھیرے ہوئے رو رہا تھا!

طالب صفوی

اصلی خواہش، آسایش، نمایش

عام طور پر ہمارے مصارف تین قسم پر منقسم ہو سکتے ہیں :-

(۱) اصلی خواہش کے لئے

(۲) معمولی آسایش کے لئے

(۳) عام نمایش کے لئے

حقیقی ضرورت اور اصلی خواہش تو بہت ہی مختصر ہوتی ہے، مثلاً پیٹ بھرنے کو ایک ٹکڑا، اور تن ڈھانکنے کو ایک کپڑا، اور ایسی حقیقی خواہش اور ضرورت تو بہت کم آمدنی میں پوری ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد آسائش کا نمبر ہے۔ معمولی آسایش بھی صرف معمولی صرف سے میسر ہو سکتی ہے۔ اصلی خواہش اور معمولی آسائش کے بعد انمایش کی نمایش ہوتی ہے۔

اپنی اس جھوٹی نمایش کے لئے خود نما انسان کس طرح اور کس قدر اپنے آپ کو تباہ کرتا ہے۔ دُنیا کے نمایشیوں کو دیکھو اور غور کرو ——

فَافْهَمُوْا فَتَدَبَّرُوْا لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔

(۱)

دین و دُنیا سے کھو دیا مجھکو
ہوسِ خام! تو کہیں گر بھی
نام نے، کام ہی تباہ کیا
شاخ کے ساتھ کھچ گئی جڑ بھی

(۲)

دو قسم کا ہم لوگ پہنتے ہیں لباس
اِک جسم کی خاطر، اِک جہاں کی خاطر
کھانا بھی اسی طرح کا ہم کھاتے ہیں
اِک پیٹ کی خاطر، اِک زباں کی خاطر

امجد

راجپوتانہ کی دِہاتی شاعری

(دوہے)

پنجاب، راجپوتانہ، صوبجاتِ متحدہ، بہار اور گجرات کی دِہاتی شاعری میں "دوہا" بہت مقبول ہؤا ہے۔ اِس بحر میں صرف دو مصرعوں میں ہی ختم ہو جانے والا نغمہ دیہات والوں کے لئے کسی خاص تعارف کا محتاج نہیں۔ کتنے ہی دوہے تو کہاوتوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ لوگوں کے دل پر اِن کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ دیہاتی انسانوں میں بھی جگہ جگہ موزوں دوہے وہی کام کر جاتے ہیں جو سونے کے زیور میں جڑے ہوئے بیش قیمت نگینے۔

جو درجہ سنسکرت شاعری میں "اُنشٹپ" نامی بحر کا ہے، وہی پراکرت زبان میں "گاتھا" کا اور پُرانی ہندوستانی میں جسے ہندی ادیب "اپ بھرنش" کے نام سے یاد کرتے ہیں، دوہے کا درجہ سمجھنا چاہئے۔ زمانہ اپ بھرنش کے سینکڑوں دوہے جن کی پیداوار براہِ راست عوام کے درمیان ہوئی تھی وقت کے چکّر میں کچلے گئے۔ آج صرف اُن کے چند نمونے ہی، جو ہیم چندر[1] کی تصنیف شدہ گرامر میں محفوظ ہیں، ہمیں اپنے زمانہ کی کچھ یاد دلا سکتے ہیں۔ ہاں، کتنے ہی دوہے ایسے بھی ہوں گے جن کی زبان وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی گئی ہے مگر فنِ شاعری اور جذبہ نگاری کے لحاظ سے وہ آج سے سینکڑوں سال پہلے کی ہندوستانی شاعری سے ہماری جان پہچان کراتے ہیں۔ دِہاتی شاعری نے اِن سب کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔

واضح رہے کہ دوہے کا جنم دیہاتی شعر و نغمہ کی گود میں ہی ہؤا۔ بعد ازاں کئی ایک اچھے شاعروں نے بھی اسے اپنے جذبات کی ترجمانی کے لئے بہتر پایا۔ ہندی ادیب راہول سانکرتاین کا خیال ہے کہ سمت ۹۰۰ بکرمی کے آغاز میں "سرہپا" نامی شاعر نے جو چوراسی "سِدّھوں" میں سب سے پہلے سِدّھ ہوئے ہیں وقت کی سلیس زبان میں دوہے لکھنے شروع کئے تھے، اس سے بہت آگے چل کر کبیر اور دادُو دایسے سنت شاعروں نے بھی دوہے ہی کو جذبہ نگاری کا موزوں ذریعہ پایا۔

دوہے کا راجستھانی تلفظ "دُوہا" ہے۔ سورٹھا بھی اس کی ایک شکل ہے۔ سورٹھا کو اکثر "سورٹھیو دُوہو" کے نام سے بھی یاد کیا

---

[1] ہیم چندر نے سنسکرت اور پراکرت کی یہ گرامر بارھویں صدی بکرمی کے آخری حصّہ میں لکھی تھی۔ اِس کتاب کے ضمیمہ میں "اپ بھرنش" زبان کے صرف و نحو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپ بھرنش کے نمونے دکھانے کی غرض سے مصنف نے یہاں کئی دوہے پیش کئے ہیں۔ عالموں کا خیال ہے کہ یہ دوہے ہیم چندر کی اپنی تصنیف نہیں بلکہ اُس زمانہ کی اپ بھرنش کی دِہاتی شاعری کے نمونے ہیں۔

جاتا ہے۔ سُورٹھا کی پیدائش پہلے پہل کاٹھیاواڑ (جسے سورٹھ یا سوراشٹر بھی کہتے ہیں) میں ہوئی۔ بعدازاں راجپوتانہ میں بھی اسے ہردلعزیزی حاصل ہوئی۔ ایک پُرانے دوہے میں ہم راجپوتانہ کے دیہاتی شاعر کو سُورٹھا کی تعریف کرتے پاتے ہیں :۔

سورٹھیو دُوہو بھلو، بھلی مرون ری بات
جوبن چھائی دہن بھلی، تاراں چھائی رات

ترجمہ :۔ گیتوں میں سورٹھیو دُوہا (یعنی سورٹھا) بہتر گیت ہے۔ افسانوں میں ڈھولا اور ماروں کا (قصۂ عشق)
نشۂ جوانی سے سرمست محبوبہ بہتر ہے (ویسے ہی جیسے) ستاروں سے آراستہ رات۔

ہزارہا دوہے ایسے ہیں جو جُداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر سینکڑوں دُوہے ایسے بھی ہیں جو مسلسل طور پر کوئی کہانی پیش کرتے ہیں۔ "ڈھولا ماروراں دُوہا" نامی کتاب کے دُوہے راجپوتانے کے ہردل عزیز عاشق ڈھولا اور اُس کی محبوبہ ماروں کی پریم کہانی کے ترجمان ہیں۔ جُداگانہ حیثیت رکھنے والے دُوہے کافی تعداد میں عوام کو یاد رہتے ہیں۔ کسی کسی شخص کو لمبی کہانیوں کے خاص خاص حصّوں کے دوہے حفظ کرنے کا شوق بھی دیکھنے میں آیا ہے مگر دیہات کے اوسط مرد و زن کے لئے لمبی کہانیوں کے مسلسل دوہے یاد رکھ سکنا بہت کم ممکن ہے چنانچہ "ڈھاڈھی" "ڈھولی" اور "بھاٹ" لوگ اکثر اس کام کو اپنے ذمّہ لیتے آئے ہیں۔ دیہاتی شاعری کے اِس ذخیرہ کو محفوظ رکھنے میں اِن لوگوں نے بہت شاندار خدمت سرانجام دی ہے۔ گاؤں گاؤں میں چکّر لگا کر عوام کو وطن کے شعر و نغمہ کی مسلسل کڑیوں سے تعارف کرانا اُنھوں نے ہمیشہ اپنا فرض سمجھا ہے۔ اِدھر زمانۂ حال میں جب سے شائقینِ ادب نے اِن چلتے پھرتے گویوں کی قدردانی کو اپنے پروگرام سے نکال سا دیا ہے۔ دوہوں کا پرانا ذخیرہ خطرہ میں پڑ گیا ہے۔

× × × × × × × × ×

بہت سے دُوہے حب الوطنی کے ترجمان ہیں۔ آبُو پہاڑ کی شان میں ایک مشہور دُوہا ہے :۔

جانے بلکے سجان نر، نہیں جانے سو بوک
جمی اَور اسمان بیچ آبُو تیجو لوک

ترجمہ جو اس سے واقف ہیں وہ اعلیٰ لوگ ہیں، جو ناواقف ہیں وہ جاہل ہیں۔
زمین اور آسمان کے مابین آبو ایک تیسری ہی دُنیا ہے۔

بیکانیر کو بھی بھلایا نہیں گیا۔ آپ خواہ اس میں کس قدر مبالغہ پائیں مگر دوہا گانے والے نے اپنے نکات پیش کرنے میں بیکانیر کو اپنی محبت کا مضمون بنا لیا ہے :۔

اونٹھ، مٹھائی، اِستری، سونو گہنو، ساہ
پانچ چیز پرتھی سرے، واہ ویکانا واہ!

ترجمہ :۔ اونٹ، مٹھائی، عورت، سونے کے زیورات، اور ساہوکار
یہ پانچ چیزیں زمین پر (بیکانیر میں بہترین چیزیں ہیں) واہ بیکانیر! واہ

مارواڑ کی ندیاں بھی شاعر کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔

ریڑی اور نکا کرے، لُونی لہراں کھائے

ترجمہ :۔ "ریڑی اور" ندی شور کرتی ہے۔ "لُونی" لہراتی ہوئی بہتی ہے۔

باندی بپڑی کیا کرے، گھیاسوں گھر جائے

"باندی" بے چاری کرے تو کیا کرے؛ "گھیا" ندی میں طوفان آتا ہے تو کتنے ہی گھر بہ جاتے ہیں۔

ریاست جے پور میں واقع "ڈھونڈ ہاڑ" نامی مقام کی تعریف میں بھی تین دوہے ملاحظہ ہوں :-

۱- اونچا پربت سیرون، کاریگر تروار
اترا ودھکا نیپ جے، رنگ دیسی ڈھونڈ ہاڑ

ترجمہ :- اونچے پہاڑ، خوبصورت جنگل اور تلواروں کے کاریگر اتنی چیزیں یہاں بہترین واقع ہوئی ہیں۔ اے ڈھونڈ ہاڑ تجھے آفرین ہے!

۲- داگاں واگاں واوڑیاں، پھل وانداں پھول پھیر
کوئل کرے سٹوکڑا، ای ہو دھر آمبیر

۲- ہر ایک باغ میں باؤلی ہے۔ چاروں طرف پھلواڑیاں ہیں۔ کوئل کوک رہی ہے۔ یہ تو آمبیر کی دھرتی ہے۔

۳- آم ج اُمدا نیپ جے گیہوں اُر گُڑ واڑ
ناہر تو نیپ جے، شیکھا دھر ڈھوڈھاڑ

۳- یہاں عمدہ آم پیدا ہوتا ہے۔ گیہوں اور گُڑ اچھے ملتے ہیں۔ شیر دل مرد پیدا ہوتے ہیں۔ ڈھونڈھاڑ تو شیکھا نامی بہادر کی دھرتی ہے۔

کس موسم میں راجپوتانہ کا کونسا مقام جائے قیام بنانا چاہئے، یہ بھی سُن لیجئے :-

سیالے کھاٹو بھلو، اونالے اجمیر
ناگا نو نِت نِت بھلو، ساون بیکانیر

ترجمہ :- جاڑے میں "کھاٹو" (ریاست جودھپور میں ایک مقام) بہترین جگہ ہے اور گرمی کے دنوں میں اجمیر۔

"ناگانو" (جودھپور ریاست کا "ناگور" نامی شہر) تو ہر روز ہی اچھا ہے۔ بیکانیر (کی بہار) ساون میں ہوتی ہے۔

اب ذرا اودے پور کی دلچسپیاں بھی ملاحظہ کر لیجئے :-

۱- اودے پور لنبا شہر، مانس گھن مولاہ
دسے جالا پانی بھرے، آیا پی چھولاہ۔

ترجمہ :- ۱- اودے پور بہت خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کے لوگ بیش قیمت ہوتے ہیں۔ یہاں کی عورتیں "پی چھولاہ" نامی تالاب پر پانی بھرتی نظر آتی ہیں۔

۲- بھاناتو سمجھا گیو پی چھولاہ ری تگ
گل لنبا پانی بھرے اُوپرے دے پگ

۲- اے "پی چھولاہ" کے کنارے کے پتھر! تو بہت ہی خوش قسمت ہے۔ تجھ پر پاؤں ٹکا کر نازنین عورتیں پانی بھرا کرتی ہیں۔

۳- اودیا پور ری کامنی گوکھاں کاڑھے گات
من تو دیواں راڑ گئے، منکھاں کتنی ک بات

۳- جب اودے پور کی حسین محبوبہ جھروکے سے باہر نکلتی ہے۔ اُسے دیکھ کر، دیوتاؤں کا دل بھی ہاتھ سے نکل جاتا ہے، انسان کی تو بھلا بات ہی کیا ہے۔

"راڑ دھرا" کا شاعر اپنے ہی وطن کو بہترین سمجھتا ہے :-

گھر ڈھانگی آلم گھنی، پرگل ٹوٹی پاس

ترجمہ :- جہاں "ڈھانگی" نامی ریت کے ٹیلے ہیں۔ جہاں آلم نامی دیوتا کا سایہ ہے۔ جہاں

لکھیو جن نے لابھسی، راڑ دھڑا رو واس — پانی سے بھرلیتے "لُونی" ندی بہتی ہے۔ جن کی قسمت میں لکھا ہو گا وہی ایسے راڑ دھڑا میں رہیں سہیں گے۔

× × × × × × × ×

راجپوتانہ کے دیہاتی شاعر زندگی کی گود میں بیٹھ کر ہی اپنے گیتوں کی تعمیر کرتے ہیں۔ زندگی کا ہر رنگ دوہوں کی دلچسپیوں میں اضافہ کرتا نظر آتا ہے۔ satire بھی غیر حاضر نہیں رہی۔ اکثر یہ اتنی کامیاب ہوتی ہے کہ ترقی پسند ادیب بھی اسے خراج تحسین ادا کئے بغیر نہ رہ سکے۔ آٹھ دوہوں کے ایک مجموعے میں مارواڑ کے ریگستانی علاقہ کو نہایت خوبی سے طنز کا مضمون بنایا گیا ہے۔ کسی زرخیز علاقہ کی ایک دوشیزہ اپنے دادا سے کہہ رہی ہے:-

۱- بالوں بابا! دیس ڑو، پانی جیاں کو واںہہ
آدمی رات گھکرٹا، جیوں مانس مُوواںہہ

ترجمہ:- ۱- اے دادا! اُس دیس کو میں جلا کر راکھ کر دوں جہاں پانی (صرف) کنوؤں میں ہی ملتا ہے + (پانی بھرنے والے لوگ) آدمی رات کے یوں شور برپا کر دیتے ہیں جیسے کسی کی موت واقع ہو گئی ہو۔

۲- بالوں بابا! دیس ڑو، پانی سندی تات
پانی کیرے کارنے، پرو چھنڈے اُدھ رات

۲- اے دادا - میں اُس دیس کو جلا کر راکھ دوں۔ جہاں پانی کی خاطر اپنا محبوب آدھی رات کے وقت ہی الوداع کہہ جاتا ہے۔

۳- بابا! مت دیئی مارو واں، ور کنواری رہیں
ہاتھ کچولو سر گھڑو، سینچتی یا مرسیں

۳- خواہ میں کنواری رہ جاؤں مگر اے دادا! کسی مارواڑی سے میری شادی کرنا۔ ہاتھ میں کٹورا لئے اور سر پر گھڑا رکھے! بس یوں ہی پانی بھرتی بھرتی میں مر جاؤنگی

۴- بابا! مت دیئی مارُو واں، سودھا گو والا نہہ
کندہ مہہ کہاڑو سر گھڑو، واسو منجھ تھلانہہ۔

۴- اے دادا کسی مارواڑی سے میری شادی نہ کرنا۔ مارواڑ میں تو گوالے رہتے ہیں۔ وہاں تو کندھے پر کلہاڑی رکھنی ہو گی۔ سر پر گھڑا رہا کرے گا، اور ریگستان میں رہنا ہو گا۔

۵ جن بھوئیں بہ پنگ پیونا، کیر کنٹا لا رُوکھ
آکے پھوگے چھانہڑی، ہُوں چھاں بھانجے بھُوکھ

۵- اُس دیس میں خون پی جانے والے سانپ ہوتے ہیں۔ وہاں "کریر" اور "اونٹ کٹارے" کے درخت ہی نظر آتے ہیں۔ وہاں آک اور "پھوگ" کے نیچے ہی چھاؤں مِل سکتی ہے، وہاں "بھرٹ" نامی گھاس کے بیج بھوک مٹانے کے کام آتے ہیں۔

۶- پہرن اوڑھن کاملا، ساٹھے پڑسے نیر
آپن لوک اُبھانکھرا، گاڈر چھالی کھیر۔

۶- پہننے اوڑھنے کے لئے وہاں صرف کمبل ملتے ہیں۔ ساٹھ "پُرس" (ایک پُرس تین ہاتھ کی لمبائی کو کہتے ہیں) کی دُوری پر کنوؤں میں پانی ہوتا ہے + وہاں لوگ ایک

جگہ ٹک کر نہیں بستے ۔ دودھ صرف بھیڑ بکری کا ہی ملتا ہے ۔

۷۔ مارواڑ او دیس میں، ایک نہ بھاجے رِڈ
اُوچا لوکسا اور سن لو کے پھا کا کے تِڈ

ترجمہ :۔ ۷۔ مارواڑ میں ایک نہ ایک مصیبت کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے ۔ قحط آ جائے تو وطن کو خیرباد کہہ کر پردیس کی راہ لینی پڑتی ہے، بارش کیلئے ترسنا پڑتا ہے ۔ فاقہ مستی نظر نہ آئے تو ٹڈی دل آ حاضر ہوتا ہے (اور بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتا ہے)

۸۔ پڑھے گنے نہیں پیکھیے، چاروں ورن نچنت
مارواڑ ری مُوڑھتا مِٹسی دُوری منت

۸۔ مارواڑ میں براہمن کشتری، بنئے اور کسان مزدور کوئی بھی پڑھنا لکھنا تو سیکھتا ہی نہیں ۔
مارواڑ کی جہالت مشکل سے ہی مٹے گی ۔

ایک دوہے میں ڈھونڈھاڑ (واقع ریاست جے پور) کا مذاق اُڑایا گیا ہے :۔

گاجر میوو کانس گھر، پڑ کھرج لُون اُگھاڑ
اُوندھا او جھر استری، ائی ہو دیس ڈھونڈھاڑ

ترجمہ :۔ جہاں گاجر کو پھل خیال کیا جاتا ہے ۔ جہاں کھیتوں میں "کانس" نامی گھاس کی بھرمار رہتی ہے اور جہاں کے مرد پوری طرح جسم نہیں ڈھکتے ۔ جہاں کی ستورات اوندھا پیٹ لئے چلتی پھرتی ہیں ۔ ایسے ڈھونڈھاڑ دیس! تجھے آفرین ہے !

(عدمتحملہ) طنز کی چوٹ آبو پر بھی جا لگی ہے :۔

جب کھانو، بھکھنو زہر، پالو چلنو پنتھ
آبُو اوپر بیسنو، بھلو سراہیو پنتھ

ترجمہ :۔ جہاں کھانے کے لئے صرف جَو ملتے ہیں، پینے کو نصیب ہوتا زہر سا پانی، اور جہاں پیدل منزل طے کرنی پڑتی ہے ۔
ایسے آبو کی رہائش کی اے میرے محبوب ! تم نے خوب تعریف کی !

ایک دوہے میں قحط کی زبانی کئی مقامات کو طنز کی زد میں لیا گیا ہے :۔

پگ پُوگل، دیہہ کوٹ ڑے، باہو باڑے ڑمیر
پھر تو گھر تو ویک پُور، ٹھاوو جیسلمیر

ترجمہ :۔ (قحط کہتا ہے) میرے پاؤں پُوگل میں رہتے ہیں ۔ جسم "کوٹ ڑے" میں نکلتا ہے اور میرے بازو "باڑے ڑمیر" میں (دیکھے جا سکتے ہیں) چلتا پھرتا میں بیکانیر میں بھی آ نکلتا ہوں ۔ (ویسے) جیسلمیر تو میری جائے سکونت ہے ہی ۔

لگے ہاتھ مالوہ کے متعلق بھی دو دوہے ملاحظہ ہوں ۔ راجپوتانہ کی دیہاتی دوشیزہ اپنے دادا کو مخاطب کر کے کہہ رہی ہے :۔

۱- بالوں بابا دیس ڑو جیاں پھیکریاں لوگ
ایک نہ دیسے گوریاں، گھر گھر دیسے سوگ

ترجمہ:- ۱- جہاں کے لوگ رُوکھی طبیعت کے واقع ہوتے ہیں۔ اے دادا! ایسے دیس کو جی چاہتا ہے جلا کر راکھ کر دوں۔
وہاں حسین عورتیں نظر نہیں آتیں، وہاں کالے کپڑے پہننے کا رواج ہے۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر گھر میں ماتم چھایا ہوا ہے۔

۲- بالوں بابا! دیس ڑو، جیاں پانی سیوار
نہ پنہاری جھولرو، نہ کوفے لے کار

۲- اے دادا! جی چاہتا ہے ایسے دیس کو جلا ڈالوں جہاں پانی پر سبز جھلی سی پڑی رہتی ہے۔ نہ وہاں (مالوہ میں) پنہاریاں جھنڈ بنا کر پانی بھرنے نکلتی ہیں اور نہ رہٹ چلانے والوں کے نغمے ہی سُنائی دیتے ہیں۔

× × × × × × × ×

دُنیا کا سب سے پہلا گیت شاید نغمۂ محبت ہی تھا۔ محبت آتی ہے تو اپنے ہمراہ حیات بخش آبِ ہوا لاتی ہے۔ محبت کے پہلو بہ پہلو زندگی کی وسعتوں میں حسن کا دیوتا بیدار ہوتا ہے۔ جب عورت اور مرد، جو ایک ہی گیت کے دو تال ہیں، باہمی کشش محسوس کرتے ہیں، زندگی کا راگ بے سُرا نہیں رہتا۔ آدم و حوّا کا افسانہ کیا ہے، عورت اور مرد کے ملاپ کا ایک لازوال گیت ہے۔

ہزاروں دوہے جذباتِ محبت کے ترجمان ہیں۔

محبوبہ کے ہاتھوں کی چوڑیاں محبوب کے مس کی بدولت کتنی بیش قیمت ہو جاتی ہیں:-

سمن چوڑی کانچ کی، کوڑی کوڑی دیکھ
جب گل لاگی پیو کے، لاکھ ٹکاں کی ایک

ترجمہ:- کانچ کی چوڑی کوڑی کے مول بکتی نظر آتی ہے۔
مگر محبوب کے گلے سے چھو جانے کے بعد ایک ہی چوڑی کی قیمت ایک لاکھ روپیہ تک پڑ سکتی ہے۔

دُنیا کے کسی بھی شخص کو دیکھ کر پاک دامن عورت اپنے محبوب کا تصور نہیں چھوڑ سکتی۔

ساجن! تُم مکھ جوئے جگ سارا ای جوئی او
الیسو ملیو نہ کوئے، جیاں دیکھیاں تجھ وِسبروں

ترجمہ:- تمہارا رُخ زیبا دیکھ کر، میرے پریتم! میں نے ساری دُنیا ہی دیکھ لی ہے۔
مجھے ایسا ایک بھی شخص نہیں ملا جسے دیکھ کر میں تجھے بھول جاؤں۔

محبوب کو گل گلاب کہہ دینا مشکل نہیں مگر عین عقیدت سے اُسے ہر گھڑی دیکھے بغیر چین ہی نہ پانا ایک قابلِ تحسین قدم ہے:-

ساجن ساجن ہوں کروں، ساجن جیئو جڑی
ساجن پھول گلاب رو، رکھوں گھڑی گھڑی

ترجمہ:- میں ہمیشہ پریتم کے نام کی رٹ لگائے رکھتی ہوں۔ میرا پریتم میرے لئے سنجیونی بوٹی (حیات بخش جڑی بوٹی) ہے۔
پریتم کیا ہے گلاب کا پھول ہے۔ ہر گھڑی میں اُسے (ہی) دیکھتی رہتی ہوں۔

چوڑے پر پریتم کا لفظ لکھوانے کا خیال بھی موجود ہے۔

ساجن ساجن ہوں کروں، ساجن جیؤ جڑی — ترجمہ:- پریتم پریتم کرتی رہتی ہوں مَیں۔ پریتم میرے لئے سنجیونی بُوٹی ہے۔

سجن لکھاؤں چُوڑے، واچوں گھڑی گھڑی — (جی چاہتا ہے کہ) پریتم کا لفظ اپنے چُوڑے پر لکھواؤں اور اسے ہر گھڑی پڑھتی رہوں

کیا پریتم ناپسند رہتا ہے؟

سجن ایسا نہ چاہئے جیا جھاڑی بُور — ترجمہ:- جھاڑی کے بیر کا سا پریتم مجھے درکار نہیں۔

اُوپر لالی پریم کی، ہِرداں مائیں کٹھور — اُس کے اوپر تو پریم کی لالی رہتی ہے اور اندر دل رہتا ہے بالکل کٹھور (سخت)

من مِلنے سے پیشتر ہی آنکھیں مِل جائیں پریتم سے۔ محبوبہ یہ کیسے پسند کر سکتی ہے:-

نین پٹک دوں تال میں، چھینٹ چھینٹ ہو جائے — ترجمہ:- جی چاہتا ہے اپنی آنکھوں کو تالاب میں دے ماروں تاکہ یہ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔

میں تنے نینا! کد کہیو من پہلی مل جائے۔ — اے آنکھو! کب کہا تھا میں نے تم سے کہ (پریتم سے) من مِلنے سے پہلے ہی تم اُس سے مِل جانا؟

محبت کا کھیل آسان تھوڑا ہی ہے؛ آنکھیں تو بچ بھی جائیں، من کا پیچھے مڑنا تو ناممکن سا ہو جاتا ہے:-

نین لگے تو لگن دے تُوں مت لگیو چِیت — ترجمہ:- آنکھیں جا ملتی ہیں تو ملنے دے انہیں مگر اے من! تُو نہ لگنا۔

وے چھوٹیں گے روئے تُوں بندھیو رہیگو نِت — آنکھیں تو رو کر چھُوٹ جائیں گی مگر تو ہر روز بندھا رہا کرے گا۔

مرد کا پردیس جانا محبوبہ کو منظور نہیں۔ اور پھر گرمی کے دنوں میں:-

تھل تتا لُو ساموہی دا جھولا پہیاہ — ترجمہ:- ریگستان گرم ہے، لُو سامنے ہے؛ اے مسافر! تم جل جاؤ گے۔

مہاں کو کہیو جو کدو گھر بیٹھا رہیاہ • — میرا کہا مانو تو ٹِک کر اپنے گھر ہی بیٹھو۔

مگر سپاہی کو اپنی نوکری پر تو جانا ہی ہوتا ہے:-

سجن سپاہی ہے سکھی! کس بدھ باندھوں نیند؛ — ترجمہ:- سکھی ری! میرا پریتم سپاہی جو ٹھہرا۔ کیسے باندھوں اُسے میں اپنے پریم میں؟

رات رہے دِن اُٹھ چلے آندھی گنے نہ مینہ — رات کو گھر پر رہتا ہے، دن پڑتے ہی وہ چلتا بنتا ہے۔ آندھی دیکھتا ہے نہ بارش۔

برسات میں محبوبہ پریتم کو گھر پر روک رکھنے کے لئے پُوری کوشش کرتی ہے:-

۱۔ کپڑ، جین، کمان گُن بھیجے سب ہتھیار — ترجمہ:- ۱۔ تمہارا لباس، زین، تیر کمان کی ڈوری اور باقی سب ہتھیار بھیگ رہے ہیں۔

اِن رُت صاحب نہ چلے، چالے نِکا گنوار۔ — پیارا محبوب اِس موسم میں پردیس کی راہ نہیں لیتا۔ جو بھی مسافرت کرتا ہے گنوار کہلاتا ہے۔

۲۔ ندیاں نالا نِجھرن، پاوس چڑھیا پُور — ۲۔ ندیاں نالے اور جھرنے سب پانی سے بھرپور ہیں۔

کرہو کا دم تلکسے، پنتھی پاگل دُور — اونٹ کا پاؤں پھسل جائے گا۔ (اچھا یہی ہے کہ یہاں ہی ٹھیرو) اے پردیس کو جانے والے مسافر! (تمہاری منزل) دُور ہے۔

صبح ہوتے ہی محبوب کو باہر جانا ہے، محبوبہ چاہتی ہے کہ وہ صبح کبھی آئے ہی نہیں:۔

سجن سکاراں جاوسی نیناں مرسی روئے — ترجمہ:۔ پریتم بھور ہوتے ہی چلے جائیں گے۔ اور میری آنکھیں رو رو کر مرجائیں گی
ودھنا! ایسی رین کر بھور کدے نہ ہوئے — یا خدا! رات ایسی (لمبی) کر کہ کبھی بھور نہ ہو۔

مگر قدرت کے قانون میں صبح کا ہونا کیسے رُکے؟

آج سکھی! ہم یُوں سُنیو، پو پھاٹت پیٔ گون — ترجمہ:۔ اے سکھی! میں نے آج یہ سنا ہے کہ پَو پھٹتے ہی پریتم چلے جائیں گے۔
پو اور ہرڑے ہوڑ ہے پہلی پھاٹت کون — پَو اور میرے دل میں مقابلہ ہے۔ دیکھوں پہلے کون پھٹے؟

پھر ہم محبوبہ کو اپنے پریتم کے گھوڑے کی رکاب پکڑے آنسو بہاتے دیکھتے ہیں:۔

ڈھولو ہلّا کرے، دھن ہلّوا نہ دے — ترجمہ:۔ پریتم جانے کی کوشش کرتا ہے مگر محبوبہ جانے نہیں دیتی۔
جھب جھب جھونبے پاگڑے، ڈب ڈب نین بھرے۔ — وہ گھوڑے کی رکاب تھام کر جھومتی ہے اور آنسوؤں سے آنکھیں بھر لیتی ہے۔

پریتم نہیں مانتا۔ محبوبہ طعنے دیتی ہے:۔

۱۔ ڈونگر کے را واہلا اوچھا کے را نیہ — ترجمہ:۔ ۱۔ اوچھوں کی محبت کیا ہے ایک پہاڑی نالہ
وہتا وہے اوتابلا چھٹک دکھاوے چھیہ — جب تک بہتا ہے تیزی سے مگر تھوڑی ہی دیر میں ختم ہو جاتا ہے۔
۲۔ پوکھوٹاں را اے ہوا جیہا کاتی میہ — ۲۔ بدقسمت عورتوں کے پریتم ویسے ہی ہیں جیسے خزاں کے بادل۔
آڈمبرات دا کھوئے آس نہ پورے تیہ — وہ دکھاوا تو بہت کرتے ہیں مگر رکھتے ہیں ہمیں مایوس ہی۔

آخر پریتم چلا گیا۔ بےچارا سپاہی تھا۔ رُکتا بھی تو کیسے؟ اب ہم محبوبہ کے حسرت آمیز کلمات سنتے ہیں:۔

سجن سدھایا ہے سکھی، واجیا ورہ نِسان — ترجمہ:۔ اے سکھی! پریتم تو چلے گئے۔ ہجر کا نقارہ بج چکا ہے۔ اب
ہاتھاں چوڑی کھس پڑی ڈھیلا ہوا سندھان۔ — میرے ہاتھوں کی چوڑیاں کھسک کر گر آئی ہیں۔ میرے جسم کا ایک ایک جوڑ ڈھیلا پڑ گیا ہے۔

محبوبہ راجپوتنی ہو تو اپنے سپاہی محبوب کے الوداعی باجوں پر سو جان سے قربان ہونا اور اُس کے راستہ کو دلچسپیوں سے پُر بنا لینا اپنی آن کے عین مطابق سمجھتی ہے:۔

سجن سدھایا ہے سکھی واجے واجا رنگ — ترجمہ:۔ اے سکھی! ساجن چلے گئے۔ خوب دھوم دھام سے باجے بجے۔

جن واٹے سجن گیا سو واٹ ڑی سُورنگ — جس راہ پر ساجن گئے ہیں کتنی رنگین ہے وہ راہ!

تب وہ تخئیل کا دامن پکڑ کر جذباتِ محبت کو ایک دم بلند کر دیتی ہے :-

ساں ول کائیں نہ سرجیا، امبرلاگ رہنت — ترجمہ :- (اے خدا) مجھے کالی گھٹا کیوں نہ بنایا؟ آسمان پر چھائی رہتی میں۔

واٹ چلنتا سالہہ پو اُوپر چھاں کرنت — اپنے راہ چلتے محبوب پر میں چھاؤں ہی کیا کرتی۔

یا :-

باں ول کائیں نہ سرجیا مارُو منجھ تھلاں — ترجمہ :- (اے خدا) مجھے مارواڑ کے ریگستان میں کیکر کا درخت کیوں نہ بنایا؟

پریتم واڑھت کانبڑی پھل سیونت کراں — پریتم اِس سے چھڑی کاٹتے۔ مجھے اُن کے ہاتھ میں رہنے کا شرف تو حاصل ہوتا۔

آخر ہجر کا حسرت آمیز دَور چھا جاتا ہے۔ محبوبہ کی آہ وزاری شروع ہوتی ہے۔ وہ چاہتی ہے اپنے جذبات کی ترجمانی کرے۔ شروع میں کسی قدر مبالغہ بھی ضرور رہتا ہے :-

آہ کروں تو جگ جلے جنگل بھی جل جائے۔ — ترجمہ :- آہ کروں تو دُنیا جل جائے۔ جنگل بھی جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے۔

یا پی جوڑو نہ جلے یا میں آہ سمائے۔ — مگر یہ پاپی دل نہیں جلتا جس میں آہ (خود) سماتی ہے۔

ہجر کے ایک گیت میں دل کو تالے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ اس کی چابی ہے محبت!

تالہ سجڑ جڑیہ کُونچی لے کینے گئیو؟ — ترجمہ :- مضبوط تالا بند پڑا ہے۔ اس کی چابی لے کر تُو کہاں چلا گیا؟

کُھل سی تو آئے ہہ، جڑیارہ سی جیٹھوا۔ — یہ تیرے آنے پر ہی کُھلے گا۔ اے جیٹھوا (پریتم کا نام) اُتب تک یہ بند ہی رہیگا

ناقوس کی صدا میں بھی محبوبہ ہجر کی آہ وزاری کا تصوّر کرتی ہے :-

صاحب سنکھ سمنّد کو، مَیں سُنیو واجنت — ترجمہ :- میں نے سمندر میں سے (نکلے ہوئے) ناقوس کو بجتے ہوئے سُنا۔

پیرمنت کے کارنے، گھر گھر دہا دئینت — (یہ بے چارا) اپنے پیارے پانی سے جُدا ہو گیا ہے اور اب گھر گھر دُہائی دے رہا ہے۔

کوّے کے ذریعہ محبوب تک اپنی آنکھیں بھیجنے کا تصوّر ہندوستانی عورت کی ایک خاص وراثت ہے۔ راجپوتانے کی نازنین بھی اس سے بچی نہیں رہی :-

کاگا! نین نکاس دوں، پیو پاس لے جائے — ترجمہ :- ابھی میں اپنی آنکھیں نکالے دیتی ہوں۔ اے کوّے! پریتم کے پاس لے جاؤ۔ انہیں

پہلی درس دکھائے کے پاچھے لیجو کائے — پہلے انہیں پریتم کا دیدار کرا دینا۔ بعد میں انہیں تم اپنی خوراک بنا سکتے ہو۔

کوّے کو مخاطب کر کے بہت سے دوہے گائے جاتے ہیں۔ ایک بہت ہی عام مگر بے حد ہر دل عزیز دوہا ملاحظہ ہو :-

کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھائیو ماس	ترجمہ:۔	اے کوّے! میرا سارا جسم کھا جانا، چُن چُن کر میرا سارا گوشت کھا جانا۔
دو نیناں مت کھائیو ان پیو ملن ری آس		ان دو آنکھوں کو نہ کھا جانا کہیں۔ انہیں پریتم کے ملنے کی آس ہے۔

پپیہے کی 'پی پی' کی صدا بھی ہندوستان کی عورت کو ہجر کے دنوں میں بہت بھاتی ہے۔ عام زندگی میں خواہ وہ پپیہے کی 'پی پی' سے بے اثر رہے مگر جب وہ گاتی ہے تو پپیہے کو کوسنے سے نہیں چوکتی۔ راجپوتانے کے دوہے بھی اس ذوق سے خالی نہیں۔

۱۔ بابیہا نِل پنکھیا! وا ڑھت دے دے لُون	ترجمہ:۔	اے پپیہے! تو زخموں پر کیوں نمک چھڑکتا ہے؛
پیو میرو میں پیو کی تُو پیو کہے سو کون؛		پی (پریتم) میرے ہیں اور میں پی کی مگر تُو کون جو 'پی پی' پکارتا ہے؛
۲۔ پیہو پیہو کرن ری بڑی پپیہا بان	ترجمہ:۔	اے پپیہے! 'پی پی' کرنے کی تیری عادت کتنی بُری ہے۔
تھارو سہج سبھاؤ او مھانرے لاگے بان		تیری تو یہ خصلت سی ہو گئی ہے مگر مجھے تو یہ تیر کی طرح چبھتی ہے۔
۳۔ ارے پپیہے داورا آدھی رات نہ کوک	ترجمہ:۔	اے پپیہے! آدھی رات کے وقت مت کوک
ہولے ہولے سُلگتی سوتیں ڈاری پھونک		(ہجر کی آگ) دھیرے دھیرے سُلگ رہی تھی مگر تُو نے تو یک لخت ہی مجھے پھونک ڈالا۔

ہجر کے دوہوں میں اکثر مور کو بھی مخاطب کیا گیا ہے:

مورا میں تنے ورجیو مت چڑھ بول کھجور	ترجمہ:۔	اے مور! میں نے تجھے کھجور کے درخت پر چڑھ کر بولنے سے منع کیا تھا۔
تھارا جل ہر ٹھوکڑے مھارا ساجن دُور		تیرا (محبوب) بادل تو بول رہا ہے مگر میرا پریتم تو دُور بستا ہے۔

مور کو عورت کی بات سمجھنے سے قاصر پاکر کسی دیہاتی شاعر کی جولانیٔ طبع مور کی نمائندہ بن گئی:۔

جھے مگرا را مور یا چک چڑھ چُون کراں	ترجمہ:۔	میں تو ریگستان کا مور ہوں۔ دانہ چُگ کر دن کاٹتا ہوں۔
رُت آئے نہ بول سیاں تو ہئے پھوٹ مراں		برکھا رُت آنے پر بھی میں دل کے جذبات ادا نہ کروں تو دل پھٹ جائے اور میں مر جاؤں۔

کونج (کلنگ) سے مخاطب ہونا ایک دوسری عام رسم ہے۔ واضح رہے کہ کونج سارس کی قسم کا ایک پرندہ ہے جو جاڑے میں میدانی علاقوں میں آجاتا ہے اور جاڑا ختم ہوتے ہی اپنے اصل وطن پہاڑی مقامات کی راہ لیتا ہے۔ ہجر رسیدہ راجپوتنی نے عجب لہجہ میں کونجوں کے جھنڈ سے منت سماجت کی:۔

کونجاں! دیئو نے پانکھڑی تھاں کو ونو وہیس	ترجمہ:۔	ری کونجو! مجھے اپنے پر دے دو۔ میں تمہارا بھیس بناؤں گی۔
سائر لنگھی پیو ملوں، پیو مل پاچھی دیس۔		سمندر پار کر کے میں اپنے پریتم سے ملوں گی۔ بعد ازاں میں تمہارے پر لوٹا دوں گی۔

کونجوں نے ہجر رسیدہ نازنین کی درخواست منظور نہ کی:۔

مے کرجھاں سرور تنی پانکھاں کہنی نہ دیس — ترجمہ:۔ ہم تو تالابوں کی کونجیں ہیں۔ ہم کسی کو اپنے پر نہیں دیتیں۔
بھریا سر دیکھی رہاں اُڈ آ گھیری وہیں — پانی سے بھرے ہوئے تالاب دیکھ کر ہم ٹھہر جاتی ہیں۔

پھر نازنین سوچتی ہے کہ چلو کونجوں کے ذریعہ ہی پریتم تک پیغام پہنچا دیں:۔

اُتر دِس اُپ راٹیاں، دِکشن سامو ہیاں — ترجمہ:۔ شمال کی جانب سے بیٹھتے پیچھے کی طرف کرنے اور جنوب کی طرف منہ کر کے
کُرجھاں! ایک سندیس ڈھولانے کہیاہ — اے کونجو! میرے پریتم کو میرا پیغام سُنا دینا۔

کونجوں کا جواب بھی سُننے ہی بنتا ہے:۔

مانس ہواں ت مکھ چواں مے چھاں کونج ڑیاں — ترجمہ:۔ ہم انسان ہوتیں تو ہم زبانی تمہارا پیغام پہنچا دیتیں۔ ہم تو کونجیں ہیں۔
پیو سندیسہ پاٹھو دس لکھ دے پنکھ ڑیاں — اپنے پریتم کو پیغام بھیجنا چاہو تو تم ہمارے پروں پر لکھ دو۔

ساون میں عورتیں "تیج" کا تیوہار مناتی ہیں۔ تب تو ہر ایک نازنین یہی چاہتی ہےکہ اُس کا پریتم گھر لوٹ آئے۔

گھر گھر چنگی گور ڑی گاوے منگل چار — ترجمہ:۔ گھر گھر نیک حسینہ خوشی کے گیت گا رہی ہے۔
کنتھا! متی چوکا وجو تیجاں تنو تیوار — پریتم! دیکھنا کہیں تیج کے تیوہار پر آنا نہ بھول جانا۔

ساری دُنیا ساون کی برکھا میں سرسبز تو ہو جائے۔ ہجر رسیدہ نازنین کا دل تو اُس کے محبوب کی آمد پر ہی ہرا ہو سکتا ہے۔

ساون آیو! ہریا ہریا بن — ترجمہ:۔ ساون آ پہنچا ہے پریتم! جنگل ہرا ہرا نظر آتا ہے۔
ہر یو ہوؤ نہ ایکلو پیاری دہن رو من — صرف ایک ہی شے ہری نہیں ہوئی۔ وہ ہے تمہاری محبوبہ کا دل۔

خواہ آپ اسے مبالغہ ہی سمجھیں۔ ہجر رسیدہ کے آنسو کبھی کبھی ساون کی برکھا سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں:۔

نینا ورسے سیج پر، آنگن ورسے مینہ — ترجمہ:۔ آنکھیں سیج پر برس رہی ہیں۔ آنگن میں بارش ہو رہی ہے۔
ہوڑا ہوڑی جھڑ لگی اُت ساون اِت نینہہ — خوب مقابلہ کی بارش ہے، اُدھر ساون ہے اور ادھر محبت۔

پریتم گھر پر نہ ہو تو نہ نازنین کو بجلی اچھی لگتی ہے نہ بادل:۔

ویجلی اں نلجیاں، جل ہر تو ہی لج — ترجمہ:۔ بجلی تو بے شرم ہے جو بار بار چمکتی ہے۔ اے بادل اب تو ہی ذرا شرم کر۔
سُونی سیج ودیس پریا مدھرو مدھرو گج — میری سیج سُونی ہے۔ محبوب پردیس میں ہے۔ اے ذرا آہستہ آہستہ گرج۔

"ڈھاڑی" راجپوتانہ کی ایک خاص قوم ہے۔ دوہوں اور گیتوں کے سلسلہ میں اس قوم نے بہت کام کیا ہے۔ واضح رہے کہ دیہات میں گھوم گھوم کر گانے بجانے کا کام اِس قوم کا پیشہ ہے۔ بہت سے دوہوں میں ڈھاڑی کو مخاطب کیا گیا ہے:۔

۱۔ ڈھاڑی ایک سندیس ڑو پریتم کہیا جائے
سائے دہن بل کوئلہ ہوئی سسم ڈھنڈوے آئے

ترجمہ:- ۱۔ ارے ڈھاڑی! پریتم کے پاس میرا ایک پیغام لے جاؤ۔
(کہنا کہ) محبوبہ جل کر کوئلہ ہوگئی ہے (دیر کروگے تو) آکر راکھ ہی کریدوگے۔

۲۔ ڈھاڑی ایک سندیس ڑو ڈھولے لگ پہنچائے
تن من اُتر بالیو دکھن واجہ آئے۔

۲۔ ارے ڈھاڑی! ڈھولے سے جاکر یہ کہنا۔
شمالی ہوا نے (محبوبہ کا) تن اور من جلا ڈالا ہے۔ رحم آؤ اور جنوبی ہوا بن کر چلو۔

۳۔ ڈھاڑی ایک سندیس ڑو ڈھولے لگ پہنچائے
جوبن جا دسے پراہنو، دسے گے رو گھر آسئے

۳۔ اے ڈھاڑی! پریتم کو یہ پیغام دینا۔
(محبوبہ کا) شباب اب (گھڑی پل کا) مہمان ہے۔ جلد گھر پہنچو۔

۴۔ ڈھاڑی! ایک سندیس ڑو ڈھولے لگ پہنچائے
جوبن چاپنو مور لیو کلی نہ چونٹے کائے۔

۴۔ اے ڈھاڑی! ڈھولے سے یہ کہنا۔
میرا شباب چمپا کی طرح کھل گیا ہے، (تیرے بغیر) کوئی کلیاں نہیں چنتا۔

۵۔ پہی بھنتو جو ملئے ہے اہی نی وت
دہن کنیر ری کامب جیوں سوکی تو ئے تُرت

۵۔ مسافر! گھومتے گھماتے اگر تمہیں میرا محبوب ملے تو اُس سے میری بات کہنا۔
محبوبہ کنیر کی ڈنڈی کی طرح سوکھ گئی ہے تمہاری یاد میں۔

ڈھاڑی کی بدولت بھی محبوبہ کا کام نہیں بنتا تو وہ پریتم کو خط لکھنے بیٹھتی ہے:

۱۔ کاگد تھوڑو بہت گھنو کیسے لکھوں بنائے
ساگر میں جل بہوت ہے گاگر میں نہ سمائے

۱۔ کاغذ تھوڑا ہے، میرا پریم بہت زیادہ۔ پھر لکھوں تو کیسے؟
سمندر میں پانی بہت ہے، گاگر میں نہیں سماتا۔

۲۔ پاتی لکھتاں پیو نے ہوڑو اوجھل گیو
آنسو پڑے انکھیاں سوں کاگد بھیج گیو

۲۔ میں پریتم کو خط لکھنے بیٹھی تو میرا دل بھر آیا
آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ کاغذ بھیگ گیا۔

انتظار کی بھی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹتیں۔ کبھی حسرت زدہ نازنین اپنی سکھی سے باتیں کرتی دکھائی دیتی ہے:

ساجن آئیاں کی کہئے کوئی اچانک آن
تو سکھی تا کو ہر کھ دیؤں ودہائی پران

۱۔ کوئی اچانک آکر کہے کہ پریتم آگئے ہیں۔
اے سکھی! تب میں اس خوشی میں تجھے بدھائی دوں۔

کبھی یہ بے چاری اپنے میکے میں ہوتی ہے تب بھی برابر پریتم کا انتظار قائم رہتا ہے۔ عالمِ خیال میں پریتم سے باتیں کرنا تب اُس کا ایک شغل ہوتا ہے:۔

۱۔ پیارا آجیو پاونا پیاری دہن سے دیس
ساجن جہاں رہ پی ہر میں تھاراں کوڈ ہمیں

۱۔ پیارے! اپنی پیاری کے وطن میں کبھی مہمان بن کر آجانا
ساجن! میرے میکے میں ہمیشہ تیرے (انتظار کا) شوق رہتا ہے۔

۲۔ سسرو ساسو سالیاں سالا سکھیا سبھی

۲۔ سسر، ساس، سالیاں، اور دوسرے سبھی رشتہ دار

جو وسے، واٹاں راج رسی پھیر آ جیو پی — پیارے! سب تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ یہاں میرے میکے میں آ جاؤ نا۔

کئی بار خواب میں محبوبہ اپنے پریتم کا دیدار کر لیتی ہے۔ خواب کی مدح میں کتنے ہی دوہے ہیں:۔

۱۔ سپنا! توں سبھاگیو، تم تھاری جات
سو کوساں ساجن بسے آن ملاوے رات۔

۱۔ خواب! تم بہت خوش قسمت ہو۔ تمہاری ذات بھی بہترین ہے۔ صدہا کوسوں پر بسنے والے پریتم سے تم نے میری ملاقات کرا دی۔

۲۔ سپنے پریتم مجھ ملیا ہوں گل لاگی دھائے
ڈرپت پلک نہ کھول ہی مت سپنو ہوئی جائے۔

۲۔ خواب میں مجھے پریتم ملے میں لپک کر اُس کے گلے سے لگ گئی۔ اس ڈر سے کہ یہ سب خواب ہی ثابت ہو میں نے آنکھ تک نہ کھولی۔

۳۔ سپنے میں ساجن ملیو کر نہ سکی دو بات
سوتی تھی روتی اُٹھی مینخبت رہ گئی ہات

۳۔ خواب میں پریتم سے ملاقات ہوئی۔ دو باتیں بھی تو نہ کر سکی۔ میں بیدار ہوئی تو میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ (افسوس سے) میں ہاتھ مل رہی تھی۔

خواب سے ناراض ہونے کی بات بھی غیر حاضر نہیں:۔

سینہا! توئے مراؤ سیوں، ہیۓ دراؤں چھیک
جد سوؤں جد دوئے جن جد جاگوں جد ایک

ترجمہ:۔ اے خواب! میں تجھے قتل کرا دوں گی۔ تیرے دل میں سوراخ نکلوا دوں گی۔ جب سوتی ہوں تو پریتم کو اپنے ساتھ پاتی ہوں۔ جاگتی ہوں تو پھر اکیلی کی اکیلی۔

آخر پریتم آ جاتا ہے۔ بہت سے دوہے ملاقات کے نغمے ہیں۔ عشق و حُسن کی رنگ رلیاں اِن ننھے گیتوں کی روح رواں ہیں۔ تخیل، رنگینی اور تاثیر کے لحاظ سے ملاقات کے دوہے بہت ہر دل عزیز واقع ہوئے ہیں!

صاحب آیا، ہے سکھی! کائیں بھینٹ کراں؛
گج موتیں کا تھال لے، اُوپر نیں دھراں۔

ترجمہ:۔ سکھی ری! پریتم آئے ہیں۔ کیا بھینٹ پیش کروں؛ میں موتیوں کا تھال بھر کر، اوپر اپنی دونوں آنکھیں رکھ کر پیش کروں گی۔

یا:۔

صاحب آیا، ہے سکھی! توڑ و نو سر ہار
لوک جانے موتی چگے، جھک جھک کرو جہار

سکھی ری! پریتم آئے ہیں۔ نو لڑیوں والا ہار توڑ دو۔ لوگ سمجھیں گے موتی چُن رہی ہے (اس بہانہ سے) جھک جھک کر پریتم کے پاؤں پڑوں گی۔

یہاں پھر برسات کی دلچسپیاں نمایاں طور پر آ حاضر ہوتی ہیں۔ برسات کا مزا تبھی ہے جب پریتم گھر پر ہو:۔

۱۔ دہن دھوراں، جوراں گھٹا لوراں برست لائے — ترجمہ ۱۔ ٹیلوں پر دھان کے نظارے ہیں اور بادلوں کی زوردار گھٹائیں اُمنڈ

امنڈ کر برس رہی ہیں ۔

وِیج نہ ماوے وادلاں رسیا ! تیج رماو	بجلی بادلوں میں نہیں سما پاتی ۔ آؤ رسیا ! "تیج" کا تہوار منائیں ۔
۲ ۔ ہرنی من ہریالیاں اُرہالیاں اُمنگ تیج پرب رنگ تیاریاں ساون مدیو سنگ	۲ ۔ ہرنیوں کے دل (خوشی سے) سرسبز ہوگئے ہیں اور کسانوں کے دل اُمنگوں سے بھرپور ہیں ۔ تیج کا تہوار ہے ۔ رنگین تیاریاں ہو رہی ہیں ـــــ یہ سب کچھ ساون کا مہینہ اپنے ساتھ لایا ہے ۔
۳ ۔ دھرنیلی دھن پُنڈری گھر گیہ گیے گِمار مارُو دیس سہاو نو ساون سانجھی وار	۳ ۔ زمین سرسبز ہے ۔ محبوبہ نکھر کر گوری ہوگئی ہے ۔ گھر گھر خوشی کے باجے بج رہے ہیں ۔ (اس طرح) ساون کی ہر شام کو مارواڑ خوب سہاونا ہو جاتا ہے ۔

x x x x x x x x x x

یُوں سازِ ہستی کو چھیڑ چھیڑ کر راجپوتانہ کے عوام نے ہمیشہ شعر و نغمہ کی دُنیا آباد کی ہے ۔ دوہے اسی دُنیا کی زندہ چیزیں ہیں ۔ فطرت کے متعدد پہلو، معاشرت اور تمدن کے متعدد رنگ یہاں موجود ہیں ۔ ترنّم کے آغوش میں خوشی و غم کے جذبات و احساسات کو برابر جگہ ملی ہے ۔ دوہوں میں جنگی ترانوں کا جنم بھی نمایاں طور پر ہوا ہے اور ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کئی جداگانہ مضامین لکھے جا سکتے ہیں ۔ کوئی زمانہ تھا کہ راجپوتانہ کا ہر ایک گشت لگانے والا گویا گاؤں کے دروازوں پر الکھ جگاتے وقت خود دار گھر والی کو مخاطب کر کے یہی ترانہ چھیڑتا تھا ۔

جتی ! جن اہرڑا جنے کے داتا کے سور ناتر رہجے بانجھڑی متی گواوے نور	ترجمہ :۔ اے ماں ! ایسے بیٹے کو جنم دو جو بہادر ہو یا فیاض ۔ نہیں تو بانجھ ہی رہ ۔ (شباب کا) نور کیوں گنواتی ہے ۔

اور ہر ایک راجپوتنی لوری گاتی ہوئی بھی اپنے بیٹے کو وطن پرستی کی تعلیم دینا اپنا فرض سمجھتی تھی :۔

اِلا نہ دینی آپنی رن کھیتاں بھڑ جائے پُوت سکھاوے پالنے مرن بڑائی مائے	ترجمہ :۔ "اپنی سرزمین غیر کے ہاتھ میں نہ پڑنے دینا ۔ میدانِ جنگ میں بھڑ جانا" (یوں) ماں جھولا ہلاتی ہوئی بھی اپنے بیٹے کو (وطن پر) مرمٹنے کی خوبیاں سکھلا رہی ہے ۔

رانا پرتاب کا نام تو ہزاروں گیتوں میں لازوال شکل اختیار کر چکا ہے ۔ ہر ایک ماں سے بہادر و خود دار بیٹے کی توقع رکھتے ہوئے "چارن" لوگ یہی ترانہ چھیڑتے تھے :۔

مائی ایہو پُوت جن جیہا رانا پرتاب	ترجمہ :۔ اے ماں ایسا بیٹا پیدا کر جیسا رانا پرتاب تھا ۔

شاعری کا پودا جو زندگی کے ماحول میں پیدا ہوتا ہے اپنی پرورش کے لئے اچھی آب وہوا اور قدرتی نظاروں کا اتنا محتاج نہیں جتنا کہ وطن کے تمدن کا۔ یہی وجہ ہے کہ راجپوتانہ کی سرزمین جس کا بہت سا حصہ سوائے ریگستان کے جو گرمیوں میں آگ کی طرح جل اُٹھتا ہے، اور کچھ بھی نہیں ہے، اپنے ہاں شعر و نغمہ کی ایسی شاندار دعوت پیش کر سکا ہے۔ شاعری کی دیوی ہمیشہ دِل مانگتی ہے اور دل بھی ایسا جو تندرستی خون کا سرچشمہ ہو۔ صرف اچھی آب وہوا ہی ہو یا شاعر کے چاروں طرف صرف طبیعتوں میں روانی لانے والے ریا ہی ہوں اور شاعر خود اپنے تئیں حق پرست ہو تو اُس کا کلام اپنے اندر ترقی پسند زندگی کا پیغام کیسے رکھ سکتا ہے ؛ اگر شاعر غلامانہ ذہنیت کا شکار ہو جائے تو خواہ وہ کشمیر کے جنتی نظاروں کے درمیان پلا ہو اس کے اشعار کو بیکانیر جیسے ریگستانی علاقہ کا ایک معمولی سا خود دار شاعر بھی اپنے کلام سے ماند کر سکتا ہے۔

راجپوتانے کی تاریخ ایسے تمدن سے منسلک ہے جو خود داری کا ترجمان ہے۔ محبت کی قیمت بھی اِس سرزمین میں بوس و کنار تک ہی محدود نہیں رہی۔ یہاں کے لوگ تلوار کے دھنی رہے ہیں اور عورتیں اپنے اِن خود دار اور بہادر سپاہیوں کے لئے بالکل پاکدامن رہ کر جی جان سے قربان ہونا اپنا فرض سمجھتی رہی ہیں۔ تمدن کی اِس موزون آب وہوا ہی میں راجپوتانے کی دِہاتی شاعری نے پرورش پائی ہے +

دیو اِندر ستیارتھی

جادۂ حیات

مجھے معلوم نہیں یہ خوبصورت راستہ کدھر جاتا ہے۔

کیا یہ اِن حسین درختوں کے سایوں ہی میں کہیں ختم ہو جاتا ہے، یا اُن ننھی ننھی پہاڑیوں کے پیچھے ؛

لوگ کہتے ہیں کہ یہ راستہ ایک سرسبز و شاداب وادی میں جاتا ہے۔ جہاں سکون ہے، نغمہ ہے، مسرت ہے۔

اگر یہ سچ ہے تو میرے معبود مجھے کسی اور راہ پر ڈال دے جس پر چلتے چلتے مَیں ایسی جگہ پہنچ جاؤں، جہاں ہنگامہ ہو، مسرت کے ساتھ ساتھ رنج ہو اور کامرانی سے پہلے ناکامیاں ہوں۔

ورنہ تن آسانیوں میں زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

محمد ایوب

کرشن اور رادھا

(شملہ میں ایک رقص سے متاثر ہو کر!)

(۱)

ہر ذرّۂ کائنات رقصاں — مرکز کی کشش سے ہے پرافشاں
موجِ دریا بھی رقص میں ہے — ریگِ صحرا بھی رقص میں ہے
گردوں پہ یہ کہکشاں کا جلوہ — تاروں کی ہے بزمِ رقص گویا

کیوں باغ میں گھومتا ہے بھونرا! — منہ پھولوں کا چُومتا ہے بھونرا!
اس کے دل میں بھی اِک لگن ہے — اپنے ہی خیال میں مگن ہے
وہ تیتروں کا قافلہ ہے — کلیوں کی چٹک جیسے درا ہے
گویا پھولوں کی پتّیاں ہیں — جو صحنِ چمن میں پرفشاں ہیں
کیا رُوح فزا ہے وقتِ پرواز — یہ بھی اِک رقص کا ہے انداز!

پڑتی ہے نگاہِ مہر جس دم — ہوتی ہے جُدا گلوں سے شبنم
یوں رقص کناں ہے اُڑ کے جاتی — واپس نہیں پھر وہاں سے آتی

ندی کا وہ نغمہ ریز پانی! — اور اِس پہ حباب کی روانی!
ہر موج سے ہمکنار ہو کر — اپنی ہستی کو اس میں کھو کر
یہ رہروِ بے نیازِ ساحل — پا لیتا ہے جب سُراغِ منزل

آتا ہے اُبھر کے پھر کئی بار
اپنے ذوقِ خودی سے سرشار
رہرو بھی ہے راہبر بھی۔ خود ہے
منزل بھی ہے رہگزر بھی خود ہے
یہ رقص نہیں تو اور کیا ہے
اس رقص میں محو بُلبُلہ ہے

پروانہ ہے گردِ شمع رقصاں
سوزِ فرقت سے شعلہ ساماں
خود شمع بھی سر کو دُھن رہی ہے
پروانے کا حال سُن رہی ہے
قصہ دونوں کا پاک ہوگا
یعنی انجام خاک ہوگا
مِٹ مِٹ کے بھی شادکام ہیں یہ
جل بُجھ کے بھی سوزِ تام ہیں یہ
پروانے کی خاک ہے ہوا میں
کیفیتِ رقص ہے فضا میں
شمعِ کُشتہ کا جو دھواں ہے
رُخ اُس کا بھی سوئے آسماں ہے

---

(۲)

دو صدق و صفا کی دیویاں ہیں،
دو عشق و وفا کی دیویاں ہیں
معصوم سی ننھی ننھی جانیں
آنکھیں شرم و حیا کی کانیں
اِک کرشن بنی ہے ایک رادھا
اب دیکھیے رقص کا تماشا:

وہ پریم کی ناؤ کا کھویا
کھیتا ہے جو بنسری سے نیا
پہنے ہوئے تاجِ نور افشاں
رادھا کی تلاش میں ہے رقصاں
دل پریت کے دیوتا کا مندر
رادھا کا خیال اُس کے اندر
آوارہ چمن میں جس طرح بُو
کھویا ہوا بن میں جیسے آہُو
بنسی کی جو مدھ بھری صدا ہے
رادھا کو پیامِ آشنا ہے

گوکل کی ہوا میں خامشی ہے
ہر سمت فضا میں خامشی ہے
دشت و درو کوہسار خاموش!
دریا چُپ، آبشار خاموش!
خاموش فضائے نیلگوں ہے
چھایا ہُوا ہر طرف سکوں ہے
یہ طلسم ہے کرشن بنسری کا
یا سحر کسی حسین پری کا

نغموں کا اُبل پڑا ہے دریا
وہ تیر کے آئی اس میں رادھا
اِک حالتِ وجد دل پہ طاری
رگ رگ سے وفا کے گیت جاری
یہ اس کے سریر کی ہے تکمیل
اب راگ میں ہو رہا ہے تحلیل
جادو یہ کیا ہے بنسری نے
سانچے میں جو ڈھل رہے ہیں نغمے
اب جسم نہیں ہے راگ ہے یہ
یہ راگ نہیں ہے آگ ہے یہ
یہ آگ بھڑک رہی ہے من میں
لَو جس کی لگی ہوئی ہے تن میں
اظہار ہے رقص اسی لگن کا
اس رقص میں گم ہوئی ہے رادھا

آپہنچی وہ کرشن جی کے نزدیک
اور مانگ رہی ہے پریم کی بھیک
دونوں مئے شوق کے طلبگار
اِک جذبۂ آرزو سے سرشار
یُوں رقص میں محو ہو گئے ہیں
گویا دُنیا سے کھو گئے ہیں
رادھا کی وہ بے قرار نظریں
رخشاں ہے وفا کا نور جن میں
اُٹھ کر کئی بار رُک گئی ہیں،
آخر چرنوں پہ جُھک گئی ہیں
اب جذب و کشش کا ہے یہ عالم
قدموں پہ سرِ نیاز ہے خم
یہ سر نہ یہاں سے اب اُٹھے گا
اُٹھا تو نہ پھر کہیں جُھکے گا

حفیظ ہوشیارپوری

نغمۂ موت

افرادِ تمثیل

حشمت بیگ ۔ ایک تعیش پسند رئیس جو ایک شاہدِ بازاری پر عاشق ہو کر تمام دولت لُٹا چکا ہے۔

گوہر علی حشمت بیگ کا خازن ۔

ارشد حشمت بیگ کا مطلب پرست دوست ۔

فرخ ارشد کا دوست جو بالواسطہ حشمت بیگ سے متعارف ہے۔

سیٹھ گھنشیام داس شہر کا مشہور و معروف سود خوار سرمایہ دار۔

گوپی ۔ سیٹھ گھنشیام داس کا نوکر

چھمن نیلم بائی کا صراف ملازم جس کا کام شکار پھانسنا ہے۔

بیگم حشمت بیگ حشمت بیگ کی حسرت نصیب اہلیہ

نیلم بائی شہر کی ایک حسین و جمیل مغنیہ

نائکہ نیلم بائی کی قطامہ ماں

زمانہ ۔ بیسویں صدی کا آغاز

مقام ۔ ہندوستان کا ایک متمدن شہر جو مشرق و مغرب دونوں کی تہذیبوں کا مرکز ہے ۔ ہر دو معاشرتوں کے آثار ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں۔

منظرِ اوّل

وقت ۔ رات کے نو بجے۔

مقام ۔ "عشرت منزل" نام کی ایک برباد کوٹھی ہے جس کے کتابِ ہند آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ فنِ تعمیر کے لحاظ سے یہ کبھی زیبائش و پاکیزگی کی دلہن تھی۔

حشمت بیگ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا شراب پینے میں مشغول ہے، قریب ہی گوہر علی بیٹھا ہے۔

حشمت بیگ۔ دولت، شراب اور موسیقی، تینوں زندگی کی مسرت کے لئے ضروری ہیں۔ جو ان کے حصول کی آرزو کرے وہ دولت مجھ سے لئے تقدیر سے، شراب کے لئے میفروش سے اور موسیقی کے لئے عورت سے بلکہ نیلم سے التجا کرے اور اگر مستجاب ہو جائے تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھے۔

(شراب کا ایک لبریز جام پی جاتا ہے۔ برسوں سے پینے کا عادی ہے اس لئے حواس نہیں کھوتا۔)

دولت سے بھری ہوئی تھیلیاں رکھنے اور شراب سے لبریز جام پینے کے بعد اگر کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے تو وہ نیلم اور اس کی موسیقی کی ہے۔ کاش وہ ہر وقت میرے پہلو میں ہو۔

(معاً کسی خیال کو دماغ میں لاتا ہے اور خازن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔)

کیوں جی! اس وقت تمہارے پاس کتنا روپیہ اور ہوگا؟

گوہر علی۔ سرکار! سو سو روپئے کے پانچ نوٹ ہیں۔

حشمت بیگ۔ کُل پانچ سو!

گوہر علی۔ جی ہاں!

حشمت بیگ۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ میں یونہی مغالطے میں رہا بھلا ان سے کیا بنتا ہے۔ مجھے اس وقت سات ہزار کی ضرورت ہے۔ نیلم کو میں زبان دے چکا ہوں اور وہ اس لئے کہ رقم مل جانے کی مجھے پوری پوری توقع تھی۔ اگر مجھے پہلے سے اس بات کا علم ہوتا تو میں کسی نہ کسی طرح ٹال دیتا۔

گوہر علی۔ سرکار! یہ تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ یہاں آن کی آن میں ڈھیر کے ڈھیر لگتے رہے ہیں اور آپ کے ہاتھوں نذر لُٹتے رہے ہیں لیکن اب کچھ ایسا منحوس وقت آیا ہے کہ روپیہ ہاتھی کا پاؤں معلوم ہوتا ہے۔

حشمت بیگ۔ آج تک ہم نے پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھا ہے اور ٹھیکریوں کی طرح خرچ کیا ہے "برے" ایسی تھا ہی کبھی نہیں دیکھی۔ زندگی میں یہ پہلا دن ہے کہ روپے کی قلت محسوس ہوئی ہے۔

گوہر علی۔ سرکار! وجہ یہ ہے کہ نقد روپیہ جس قدر بھی تھا خرچ ہو چکا ہے۔ بنک میں ایک حبہ تک باقی نہیں تین کوٹھیاں تھیں۔ ان سے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ وہ سیٹھ گھنشیام کے ہتھے چڑھ گئی ہیں۔ اب یہ ایک سر چھپانے کا ڈر بہ رہ گیا ہے۔ اس پر بھی وہ دانت لگائے بیٹھا ہے اور تاک میں ہے کہ کب موقع ملے تو قرقی کے لئے آ دھمکوں۔ اس کا قرضہ پچیس ہزار تک پہنچ چکا ہے۔

حشمت بیگ۔ غضب ہے اس کم بخت نے کس بری طرح گلا گھونٹا ہے۔ جانے زندہ بھی چھوڑے گا یا نہیں۔ اگر اس کوٹھی کو بھی ہتھیا لے تو ہمارا کیا حشر ہوگا۔ خودکشی کے سوا تو کوئی چارہ نہیں۔

گوہر علی۔ سرکار! خاندانی آدمی کے لئے تو یہی سبیل ہے۔ وہ ایسی شرمناک حالت میں کب زندہ رہنا چاہے گا۔

حشمت بیگ۔ اب اس وقت کیا کروں۔ سات ہزار کی رقم کس سے مانگوں؟

گوہر علی۔ کیا بتاؤں سرکار! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

حشمت بیگ۔ سیٹھ کی طرف جاؤں۔

گوہر علی ۔ نہیں سرکار! اس کی طرف جانا بیکار ہے۔ ابھی پہلی رقم کے لئے کتنی دفعہ کہہ چکا ہے۔ آگے کیا دے گا۔
حشمت بیگ ۔ پھر اور کس سے مانگوں؟
گوہر علی ۔ کل تک انتظار کیجئے۔ گاؤں سے رقم آجائے گی۔ آپ اسے استعمال کر لیجئے گا۔
حشمت بیگ ۔ اتنا انتظار نہیں نہیں۔ میں نیلم کے سامنے وعدہ فراموش نہیں بننا چاہتا۔ میرے لئے ایک ایک لمحے کا انتظار سوہان روح ہے۔ مجھے آج ہی انتظام کرنا ہے آج اور فقط آج۔
گوہر علی ۔ آپ کو کل بہت دُور معلوم ہو رہی ہے۔ حالانکہ اتنی دُور نہیں ہے۔
حشمت بیگ ۔ پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ مجھے کل سے کیا سروکار، آج اگر سات ہزار ملیں تو کام بن سکتا ہے کل اگر سات لاکھ ملیں تو بیکار ہیں۔ چیز کی قیمت ضرورت اور وقت پر ہوا کرتی ہے۔ اس کے بعد نہیں۔
گوہر علی ۔ ابھی تک تو روپیہ ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔
حشمت بیگ ۔ ٹھیرو۔ ایک آئی ہے۔ اگر کارگر ہو جائے تو بیڑا پار ہے۔
گوہر علی ۔ وہ کیا؟
حشمت بیگ ۔ بیگم کے پاس جاؤں، وہاں سے کچھ مل جائیگا
گوہر علی ۔ سرکار اُن کے پاس کیا رکھا ہے؟
حشمت بیگ ۔ بہت کچھ
گوہر علی ۔ زیور پہلے ہی بک چکا ہے۔ قیمتی سامان سب ٹھکانے لگ گیا ہے۔ اب اللہ ہی اللہ ہوگا۔
حشمت بیگ ۔ نہیں۔ یہ تمہارا خیال ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بیگم کے پاس اِن گئے گزرے دنوں میں بھی دس بارہ ہزار سے کم کی رقم نہ ہوگی لیکن وہ ہوا نہیں لگانا چاہتیں کہ کہیں مَیں نہ مانگ لوں اور اگر سچ پوچھو تو تین مہینے ہونے کو آئے ہیں کہ اُن سے کچھ مانگا ہی نہیں۔ ستمبر میں کچھ لیا تھا اب دسمبر ہے۔
گوہر علی ۔ سرکار! اصل بات یہ ہے کہ پہلے وہ کچھ دے بھی دیتی تھیں اور آپ کا کہا مان جاتی تھیں لیکن اب کچھ بدل گئی ہیں۔
حشمت بیگ ۔ بدل کیا گئی ہیں۔ کٹر ہو گئی ہیں۔ پھر بھی جا کر دیکھتا ہوں، شاید داؤ چل جائے۔
گوہر علی ۔ جیسے آپ کی مرضی ہو ویسا کیجئے۔
حشمت بیگ ۔ اچھا تو تم بیٹھو۔ میں ہو آؤں۔

(جزء ب)

حرم :۔ بیگم مایوسی کے انداز میں پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی ہیں۔ سامنے پاندان دھرا ہے۔ پان کا ٹکڑا لگا رہی ہیں۔

بیگم ۔ (دل میں) زمانہ کس قدر بدل گیا ہے۔ وہ باتیں ہی جاتی رہیں۔ کہاں وہ سہاگ کے دن۔ کہاں یہ رنج و محن کے دن۔ یہ سب ان کی بے پروائی اور عشرت پرستی نے کیا ہے۔ کاش وہ آج بھی سدھر جائیں۔ میں ان کے جملہ

مصارف کی کفیل ہونے کو تیار ہوں ۔ لیکن ان کی آزادانہ روش سے متنفر ہوں ۔ میں ان کا بھلا چاہتی ہوں لیکن وہ میری کسی بات پر کان تک بھی نہیں دھرتے ۔ مجبوراً خفگی کا اظہار کرتی ہوں اور کیوں نہ کروں ۔ اُنہوں نے جب سے کمبخت تنیلم کا دامن پکڑا ہے تب سے تباہی ہی تباہی ہو رہی ہے ۔ اگر میرا اس گھر میں قدم نہ ہوتا تو تیجے کے نیچے دھری ہوئی پونجی کا آخری حصّہ بھی برباد ہو چکا ہوتا ۔

(سامنے سے حشمت بیگ کمرے میں داخل ہوتا ہے ۔)

آہا ۔ یہ آج خلافِ معمول کیسے آنا ہُوا ۔ تمہیں تو گھر میں بھول کر آنا بھی شاید منع تھا ۔ خیر تو ہے ؟

حشمت بیگ ۔ ہاں ہے تو خیر ہی ۔ کچھ کہنا تھا ۔

بیگم ۔ کہو کیا کہنا ہے ؟

حشمت بیگ ۔ کہے تو دیتا ہوں لیکن ڈر معلوم ہوتا ہے ۔

بیگم ۔ ڈر کاہے کا ؟

حشمت بیگ ۔ یہی کہ تمہاری طبیعت ذرا اُس قسم کی ہے ۔

بیگم ۔ کس قسم کی ؟

حشمت بیگ ۔ اب کیا کہوں ؟

بیگم ۔ بتانے کہنے کی ضرورت نہیں ۔ میں سمجھ گئی ۔ یہی نا کہ تمہاری حرکتوں پر لے دے کرتی رہتی ہوں اور کھری کھری کہتی ہوں جس پر تمہیں تاؤ آتا ہے ۔ کیا خوب ۔ اوّل تو ایک زبان عورت کی شرافت سے ناجائز طور پر فائدہ اُٹھا کر اسے اُلّو بنانا چاہتے ہو ۔ پھر یہ بھی چاہتے ہو کہ وہ مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالے تو زبان ہی گُدی سے کیوں نہ کھینچ لو جو سارا جھنجھٹ ہی جاتا رہے ۔

حشمت بیگ ۔ تم تو ناحق بات بڑھاتی ہو ۔

بیگم ۔ بڑھاؤں نہ تو کیا کروں ۔ تمہارا یہی مطلب ہے نا کہ تم جو جی میں آئے کرو لیکن گھر کی عورت بھول کر بھی نکتہ چینی نہ کرے ۔ ٹھیک ۔ ٹھیک ۔ بہت ٹھیک ۔ کبھی تمہارا دل دُکھے تو پتہ لگے کہ کتنے بلبلاتے ہو اور کتنے تلملاتے ہو ۔ یہ عورت ذات ہی ہے جو اتنا صبر کرتی ہے ۔

حشمت بیگ ۔ میں اس وقت بحث کرنے نہیں آیا ۔

بیگم ۔ بحث کرے تمہاری بلا ۔ تم اپنے حال میں مست ہو ۔ تمہاری بلا سے کوئی مرے یا جئے ۔

حشمت بیگ ۔ خیر اس فضیحتی کو بند کرو ۔ مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے ۔

بیگم ۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کونسا ضروری کام ہے اور کس سے متعلق ہے ۔ تم نے اس کے علاوہ دُنیا میں کوئی اور کام بھی کیا ہے ؟

حشمت بیگ ۔ کچھ کہو مجھے اس وقت سات ہزار کی رقم چاہیئے ۔

بیگم ۔ رقم اور پھر سات ہزار کی ۔ سات ، آٹھ ، نو ، دس ہزار ۔ مدّت سے یہ نام بھولے ہوئے ہیں ۔ آج تم نے یاد دلائے ہیں ۔

حشمت بیگ ۔ میں نے کچھ کہا ، تم کچھ کہہ رہی ہو ۔ معاملہ زیادہ کھٹائی میں نہ ڈالو ۔

بیگم ۔ تو پھر اُور کیا کروں ۔ تمہیں سات ہزار کی رقم لا کر گِن دوں ۔ پاس نہ ہو تو دھاڑا ماروں ؟

حشمت بیگ۔ رقم تمہارے پاس ہے۔
بیگم۔ ہوگی!
حشمت بیگ۔ تم دانستہ مجھ سے چھپا رہی ہو۔
بیگم۔ یونہی سہی! کسی طرح پنڈ تو چھٹے۔
حشمت بیگ۔ یہ ٹھیک نہیں۔
بیگم۔ تو کیا یہ ٹھیک ہے کہ بھاڑ میں جھونکنے کے لئے تمہیں اتنی رقم دے دوں؛
حشمت بیگ۔ کچھ سہی۔ تمہارے پاس وہ کونسی انڈے دے رہی ہے۔
بیگم۔ نہ سہی۔ بیکار بھی تو نہیں۔ میری رقم ہے۔ میں اسے رکھوں، پھینکوں، جو جی چاہے کروں تمہیں اس سے کیا؟
حشمت بیگ۔ تو کیا تم بطور قرض بھی نہ دو گی؟

— — — — — —

— — — — — —

— — — — — —

بیگم۔ رقم میرے پاس نہیں ہے۔
حشمت بیگ۔ ہے اور مجھے پتہ ہے کہ کہاں ہے؛
بیگم۔ ہے تو لے لو۔
حشمت بیگ۔ لے لوں؟
بیگم۔ لے لو۔

ایکشن ۱۔ حشمت بیگ غصے میں بھرا ہوا ملحقہ کمرے میں چلا جاتا ہے جہاں اسے یقین تھا کہ نیاز پر رکھے ہوئے غیر مقفل صندوق میں اس کی مطلوبہ شے مل جائے گی۔ صندوق کھولتا ہے۔ کپڑے لتے پڑے ہیں۔ سب کو ٹٹولتا ہے۔ "اگر دھنگڑ، کھکیڑ کھکیڑ" کر باہر پھینکتا ہے لیکن کچھ نہیں بنتا۔ اسے مبہم طور پر باور کرنا پڑتا ہے کہ بیگم کے پاس کچھ نہیں ہے۔ صرف چڑانے کے لئے بات چھیڑی تھی۔

(واپس چلا جاتا ہے)

جزء ج

(وہی سب سے پہلا کمرہ)

گوہر علی۔ (حشمت بیگ کو داخل ہوتے دیکھ کر) کیوں کار کچھ بنا؟
حشمت بیگ۔ کچھ تھا جو ملتا؛
گوہر علی۔ اب پھر کیا ارادہ ہے؟
حشمت بیگ۔ یہی سوچ رہا ہوں۔
گوہر علی۔ میرے خیال میں تو آج یونہی نیلم کے ہاں جا کر دیکھئے۔
حشمت بیگ۔ واہ کچھ ہوش کے ناخن لو۔ دیوانے ہو گئے ہو۔ اس کی میّا باتوں ہی باتوں میں وہ دھتکار دے گی کہ منہ تک دکھانے کے لائق نہ رہوں گا۔
گوہر علی۔ لیکن اتنی بھی کیا بے مروت ہوگی جس کے گھر میں مینہ کی طرح روپے کی بارش کی ہو وہ کل تک کا اعتبار نہ کرے گی۔ اتنی بے وار ہوگی۔
حشمت بیگ۔ تم تو ڈھاک کے تین پات ہی رہے۔ وہ حرافہ کہیں ماننے والی جنس ہے۔ نیلم اس کے لئے سونے کی کان ہے۔ مفت کی ٹکسی تو نہیں کہ ہر ایک کے حوالے کر دے وہ بکی ہے۔ ہم سے کوئی ہاتھ تھوڑی جوڑتی ہے کہ تم آؤ۔

اپنی غرض کے لئے جاتے ہیں اور اپنی غرض پوری کرتے ہیں بھلا وہ اپنی غرض کیوں نہ پوری کرے۔

گوہر علی۔ یہ آپ درست فرماتے ہیں لیکن ایک آدھ دن کی دیر ہو جائے تو بدلحاظی بھی نہیں کرنی چاہئے۔

حشمت بیگ۔ یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ چلتی کا نام گاڑی ہے۔ وہ بدلحاظی کرے تو اسے زیب دیتی ہے اس لئے کہ اس کے پاس نسیم جیسی پری ہے۔ ہم ایسے کئی ٹٹ پونجئے اس پر جان دیتے ہیں اور منہ مانگی مراد پوری کرتے ہیں۔

گوہر علی۔ اب روپے کی بات پھر کیسے طے ہو۔ کوئی اور ذریعہ بھی تو نہیں۔ یار دوستوں نے ملنا ترک کر دیا ہے۔ کہیں وہ وقت تھا کہ میلا ٹھیلا لگائے رہتے تھے۔ اب یہ وقت ہے اکہ جھانکتے تک نہیں۔

حشمت بیگ۔ سب مطلبی ہیں۔ اپنے مطلب کے لئے آتے تھے کوئی میرے لئے آتے تھے۔ پیسہ تھا تو جھمیلا کئے رہتے تھے۔ تمہارے پاس پیسہ ہو تو تم سے یارانہ گانٹھ لیں گے اور جب پیسہ نہیں تو دیکھ لو کیسے رفو چکر ہوئے ہیں۔ البتہ ارشد پر کچھ بھروسا ہے۔ وہ بڑی ہمدردی جتایا کرتا تھا۔

گوہر علی۔ کوئی نہیں۔ زبانی ہمدردی کو لے کر کوئی چاٹتا پھرے۔

حشمت بیگ۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے اس پر بھروسا ضرور ہے اس نے شراب پیتے وقت حلف اٹھایا تھا کہ آخری دم تک میرا شریک حال رہے گا۔

گوہر علی۔ یہ لوگ اعتماد جمانے کے لئے یونہی کیا کرتے ہیں۔

حشمت بیگ۔ لیکن غالباً وہ ایسا نہیں۔ اسے ہمارا حال معلوم نہیں ہے ورنہ وہ ضرور آتا اور سوجتن سے سات ہزار کی رقم پیدا کر دیتا۔ میرے خیال میں اس سے ملنا چاہئے

گوہر علی۔ آپ کے خیال میں اسے ملنا چاہئے میرے خیال میں بے سود ہے۔

حشمت بیگ۔ بے سود ہی سہی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ روپیہ نہ دے گا۔ نہ دے۔ ملنے میں تو مضائقہ نہیں۔ ویسے بھی گیارہ ہزار کی رقم ڈکارے بیٹھا ہے جو اس نے بطور قرض لی تھی۔

گوہر علی۔ سرکار قرض لے کر کوئی دیا بھی کرتا ہے۔ قرض تو فریب دے کر روپیہ اینٹھنے کا دوسرا نام ہے۔ چالاک لوگوں کے لئے یہ ایک زبردست فن ہے۔ ویسے نہ کسی نے روپیہ دیا قرض کہہ کر لے لیا۔

حشمت بیگ۔ شاید اس کے دل میں کچھ احساس پیدا ہو جائے اور اسے میرے پرانے احسان اور پرانی مہربانیاں یاد آجائیں۔

گوہر علی۔ آپ کی مرضی۔

حشمت بیگ۔ ہاں چل کر دیکھنا چاہئے۔ اس میں کیا ہرج ہے۔ کوشش ہے اور نہ ہوگا تو قلعی ہی کھل جائے گی۔ آخر اتنا بھی کیا بے شرم ہوگا۔ مجھے سدابرت کی طرح لوٹا ہے ارشد خود نہ دے گا تو فرخ سے ہی لے دے گا۔ ارشد نے اپنی معرفت اسے قرض دلایا تھا۔ یاد ہے کچھ کتنا روپیہ ہوگا۔

گوہر علی۔ ساڑھے چار ہزار۔

حشمت بیگ۔ چلو بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ اتنی رقم

پر تو نیلم مان بھی جائے گی۔ باقی کا وعدہ کل پر رہے گا۔

گوہر علی۔ چلئے پھر۔ یہاں تو وقت ضائع ہی ہو رہا ہے۔

(چلے جاتے ہیں)

منظرِ دوم

مقام: ارشد منزل۔ ارشد اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا نوٹ گن رہا ہے۔

ارشد۔ پانچ اور پانچ دس۔ اور پانچ پندرہ اور یہ بیس۔ پہلی رقم ملائی تو کل رقم ہوئی اکیس ہزار۔ بہت کافی ہے۔ سلیقے سے خرچ کی جائے یا بنک میں رکھ کر ماہانہ سُود لیا جائے تو بے فکری سے زندگی کٹ سکتی ہے۔ یہ سب حشمت بیگ کی مہربانی ہے ورنہ ساری عمر بھی جان مارتا تو اتنی رقم نہیں مل سکتی تھی۔ اس عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے رئیس کو پہلے ہم نے شراب کا چسکا لگا دیا اور پھر نیلم بائی سے چپکا دیا اور اچھی اچھی طرح اس کی حجامت بنائی۔ خوب دولت سے ہاتھ رنگے۔ اب تو وہ بات نہیں رہی۔ سب کچھ کھو بیٹھا ہے صرف گاؤں کی آمدنی پر دھندا چلتا ہے۔ پھر جب کبھی موقع ملا چکمہ دے ہی آؤں گا۔ مجھے روپے کی ضرورت ہے۔ اس رقم کو تو چھُونا نہیں البتہ اور جو ہوگی اس سے ایک دو مقدمے کرنے ہیں وہ کر لوں گا۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر۔ آپ سے ملنے کے لئے نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔

ارشد۔ حشمت بیگ؟

نوکر۔ جی ہاں،

ارشد۔ کچھ کہا تو نہیں؟

نوکر۔ جی نہیں۔

ارشد۔ حالت کیسی ہے؟

نوکر۔ ازحد پریشان،

ارشد۔ بس پھر کچھ مانگنے آئے ہوں گے۔ کہہ دو گھر نہیں ہیں!۔

نوکر۔ کہے دیتا ہوں۔

نوکر چلا جاتا ہے۔ اس نے بمشکل دہلیز پر قدم رکھا ہوگا کہ ارشد بُلا لیتا ہے۔

ارشد۔ اچھا ٹھہرو۔ مت کہو۔ ورنہ وہ پھر دوبارہ آجائینگے یا یہیں دھتا دے کر بیٹھے رہیں گے۔ مَیں نپٹ لیتا ہوں۔ کہو آتے ہیں۔

نوکر۔ بہتر!

جزو (ب)

حشمت بیگ ڈرائنگ روم میں مضطرب و متذبذب ہو کر اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہے۔ ارشد داخل ہوتا ہے۔

ارشد۔ السلام علیکم! معاف فرمائیے۔ بیت الخلا میں تھا قدرے دیر ہوگئی۔ ناچیز کو یاد فرمانے اور غریب خانے پر تشریف لانے کی کونسی ضرورت پڑ گئی؟

حشمت بیگ۔ بھائی بات اصل میں یہ ہے مجھے اس وقت کچھ رقم چاہئے تھی اس لئے تمہارے پاس آگیا۔"

ارشد۔ اب کیا عرض کروں۔۔۔۔ قبلے کی طرف منہ ہے یقین جانیے کہ ایک پائی تک نہیں ہے۔ اگر کچھ پاس ہو تو مجھ پر حرام سمجھئے۔ میں خود آپ سے ترسوں ترسوں بل کر کچھ مانگنے والا تھا۔

حشمت بیگ۔ یہ تو بہت بُری بات ہے۔ اگر رقم نہ ملی تو سخت دقت ہوگی۔

ارشد۔ بجا ہے آپ کا فرمانا لیکن چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ یہاں گزارہ ہی نہ معلوم کیسے چل رہا ہے، کئے بار تو دیوالہ نکلنے کی نوبت پہنچ گئی ہے۔

حشمت بیگ۔ پھر کوئی اور تدبیر ہی بتاؤ۔

ارشد۔ کیا تدبیر بتاؤں۔ رقم میرے پاس ہوتی تو چپکے سے لاکر مٹھی میں پکڑا دیتا اور منہ سے بات بھی نہ نکالتا۔

حشمت بیگ۔ کہیں کسی اور جگہ سے ہی انتظام کر دو۔

ارشد۔ صاحب کسی سے میل جول رکھا ہوتا تو کر بھی دیتا میں نے تو سوائے آپ کے کسی سے بات بھی نہیں کی کبھی۔

حشمت بیگ۔ تعجب ہے۔ تم یہاں اتنے عرصے سے رہتے آ رہے ہو اور کہتے ہو کہ کسی سے بات بھی نہیں کی۔

ارشد۔ سچ تو یہ ہے کہ بات ہر ایک سے کی جا سکتی ہے لیکن دُنیا غرض کی بندی ہے۔ جس سے ذرا منہ لگاؤ، وہ پاؤں پکڑتے ہی پہنچا پکڑنے پر آ گیا۔ اب ایسی حالت میں کسی سے کوئی کیا بات کرے۔

حشمت بیگ۔ تو کیا اس وقت کوئی ایسا نہیں ہے جو سات آٹھ ہزار کی رقم نکال دے۔ ہم کوئی غیر معتبر آدمی تو ہیں نہیں جو اس کا روپیہ دبا لیں گے۔ صاحب حیثیت ہیں۔ ہم نہ دیں تو ہماری جاگیر اس سے وضع کرلے۔ اور کیا چاہتا ہے۔

ارشد۔ اجی آپ تو بالکل سادہ لوح ہیں۔ وہ دن لد گئے جب اعتبار کی قیمت تھی اب تو کام کی بات پر کوئی کان ہی نہیں دھرتا۔

حشمت بیگ۔ تو پھر ناامیدی ہے؟

ارشد۔ دیکھ لیجیے۔ حالات میں نے پیش کر دیئے ہیں۔ آپ ذی فہم ہیں۔ فیصلہ کر سکتے ہیں۔

حشمت بیگ۔ تو کیا آپ اپنے دوست فرخ سے نہیں کچھ لے دیں گے۔

ارشد۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اگر ہوئے ان کے پاس تو لے دوں گا بلکہ وہ خود ہی دے دیں گے۔ تامل نہیں کریں گے۔

حشمت بیگ۔ اُنہوں نے قرض کے طور پر آپ کی معرفت ساڑھے چار ہزار کی رقم لی تھی۔ وعدے کے دن بھی پورے ہونے کو آئے ہیں۔ اگر کچھ روز پہلے ادا کردیں تو ایک پنتھ دو کاج والی بات ہو گی۔ ان کا بوجھ اُتر جائے گا میرا کام بن جائے گا۔

ارشد۔ دیکھیے اُن کا معاملہ اُن پر منحصر ہے۔

حشمت بیگ۔ تم زور دو گے تو غالباً دے دیں گے۔ اس لئے کہ تمہارے وہ گہرے دوست ہیں اور میری آشنائی تمہارے ذریعے ہوئی تھی۔

ارشد۔ یہ تو کوئی بات نہیں۔ رقم ان کے پاس ہوئی تو

انکار نہیں کریں گے۔ یہیں سے فون کر کے دریافت کر لیجئے۔

حشمت بیگ ۔ وہیں کیوں نہ چلیں۔ موٹر میرے پاس ہے۔

ارشد ۔ کیا ضرورت ہے۔ اس میں وقت لگ جائے گا، اور پھر اگر وہ نہ ملے یا اُنہوں نے انکار ہی کر دیا تو محنت اکارت جائے گی۔ ان کا مکان یہاں سے خاصا دُور ہے فون سے آن کی آن میں پتہ لگ جائے گا۔

حشمت بیگ ۔ اچھا تو لگاؤ نمبر اور پوچھو میری طرف سے۔

ارشد ۔ آپ خود پوچھئے۔ میں نمبر لگائے دیتا ہوں۔ اس لئے کہ میرا پوچھنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ انہیں کیسے پتہ چلے گا کہ آپ بھی موجود ہیں۔ اگر میں انہیں بتا بھی دوں تو پھر بھی شاید وہ یہی سمجھیں کہ میں اپنی طرف سے بول رہا ہوں۔

حشمت بیگ ۔ اچھا تو لاؤ میں خود ہی پوچھتا ہوں (ٹیلیفون لے کر) ہیلو . . . ہیلو!

فرخ ۔ یس۔ آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔

حشمت بیگ ۔ ارشد منزل سے۔

فرخ ۔ خوب تو آپ ارشد صاحب ہیں۔

حشمت بیگ ۔ نہیں۔ ارشد صاحب بھی موجود ہیں میں حشمت بیگ ہوں۔

فرخ ۔ اخاہ۔ مدتِ مدید کے بعد شرف ملاقات حاصل ہوا۔ اور وہ بھی ٹیلیفون پر۔ خاکسار کے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے۔

حشمت بیگ ۔ خدمت کیا۔ ایک ضرورت ہے۔

فرخ ۔ ہاں ہاں فرمایئے۔ ہو سکا تو ہر ممکن طریق سے پوری کرنے کی سعی کروں گا۔ آپ سے بڑھ کر مجھے اور کون عزیز ہے۔

حشمت بیگ ۔ مجھے کوئی سات آٹھ ہزار روپے کی ضرورت ہے کسی نہ کسی طرح مہیا کر دو۔

فرخ ۔ سات آٹھ ہزار۔ یہ تو معمولی رقم تھی۔ اس سے دُگنی بھی آپ مانگتے تو حاضر کر دیتا لیکن کیا کروں اس وقت ایک چھدام بھی نہیں ہے۔ جتنی رقم تھی نئے مکان کی تعمیر پر لگا چکا ہوں۔ اب پھر کچھ عرصے کے بعد آمدنی کی صُورت پیدا ہو تو رقم ہاتھ لگے۔

حشمت بیگ ۔ آپ کا تو وعدہ بھی پورا ہونے کو ہے تھوڑے دِن اور ہیں۔

فرخ ۔ اس کے لئے میں آپ سے معافی مانگنے والا تھا۔

حشمت بیگ ۔ پھر آپ کسی اَور سے لے کر دے سکتے ہیں؟

فرخ ۔ فی الحال کس سے لے کر دوں۔ پڑوس میں کوئی ایسا ذی استطاعت بھی تو نہیں جو دس بیس ہزار کی مالیت رکھتا ہو۔

حشمت بیگ ۔ تو انکار ہے آپ کی طرف سے۔

فرخ ۔ یہ کہتے تو مجھے شرم آتی ہے۔ البتہ مجبوری سمجھیے۔

حشمت بیگ ۔ بات تو ایک ہی ہے کسی طرح کہیے۔

حشمت بیگ کبیدہ خاطری میں ٹیلیفون کو وہیں پٹک کر، کسی سے بات کئے بغیر، تیورا تا ہؤا ارشد منزل سے باہر نکل جاتا ہے۔ اور موٹر میں سوار ہو کر چلا جاتا ہے۔

منظر سوم

'فرحت کدہ' (نیلم کے مکان کا نام ہے) نیلم ہلکے رنگ کی لاجوردی ساڑھی میں ملبوس ہے جس پر برہنہ باہوں کی پیازی جاکٹ اور بھی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ صوفے پر بیٹھی ہوئی دلربایانہ انداز میں خوشبودار سگریٹ کے کش لگا رہی ہے۔

چمن سامان کی ترتیب کے لئے کمرے میں آتا ہے۔ نیلم کو بیٹھے دیکھ کر بلاتکلف مخاطب کرتا ہے۔

چمن۔ بائی جی آج نواب صاحب نہیں آئے ؟

نیلم۔ بس آ چکے۔

چمن۔ کیوں ؟

نیلم۔ سات ہزار روپے دینے کا وعدہ بڑی شد ومد سے کر گئے تھے۔ اب بغیر روپے کے کیسے منہ دکھائیں۔

چمن۔ اوہو اگر وہ نہ آئے تو سات ہزار کا نقصان ہوگا۔

نیلم۔ تو پھر تجھے اس سے کیا ؟

چمن۔ واہ مجھے اس سے کیوں کچھ نہیں ؛ ان کے آنے سے میری بھی مٹھی گرم ہو جاتی۔

نیلم۔ چل چل۔ ایک دفعہ چکنی چپڑی باتوں سے اسے پھانس لایا، اب ہمیشہ کے لئے دیدے ہی جمانے لگا۔ مجھے اس موئے نواب صاحب کی ناز برداری کرنی پڑتی ہے۔ اس کا ذکر ہی نہیں۔

چمن۔ لیکن میرا کام بھی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

اتنے میں زینے پر سے نائکہ کے اترنے کی آہٹ آتی ہے۔ چمن فوراً وہاں سے ہٹ کر کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔

نائکہ۔ نیلم! آج حشمت بیگ کے آنے کے آثار ٹھیک نہیں معلوم ہوتے۔ اس نے نو بجے آنے کو کہا تھا۔ اب گیارہ بجے ہیں۔

نیلم۔ شاید اب بھی آجائے۔ رقم کا معاملہ ہے۔ دیر لگ گئی ہوگی۔

نائکہ۔ رقم اور اس میں دیر لگ جائے۔ نہیں نیلم۔ جو شخص کسی شاہد بازاری کو دل دے بیٹھے وہ جان جوکھوں میں پڑ کر بھی دیا ہوا قول پورا کرے گا اور بھول کر بھی ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔ رقم نہ ملنے کے صاف معنی ہیں کہ حشمت اب کھکل ہو چکا ہے۔ اس کے پاس اب کچھ نہیں رہا۔ ورنہ وعدے پر ضرور پورا اترتا۔

نیلم۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مجبوری بھی کوئی شے ہے۔

نائکہ۔ یہاں مجبوری کا نام مفلسی ہے۔ حشمت بالکل قلاش ہو چکا ہے۔ اس کا بھرم جاتا رہا ہے۔ بنی بنائی ساکھ ٹوٹ گئی ورنہ اسے دینے والے بیسیوں تھے۔ اب اسے دے کر کسی کو اپنی رقم ڈبونی ہے۔

نیلم۔ ہاں میرے خیال میں بھی بات اسی قسم کی ہے۔ غالباً وہ ادھر ادھر سے روپیہ بٹورنے کی کوشش میں ہوگا لیکن ناکامی کا سامنا ہوتا ہوگا۔

نائکہ۔ ہاں بیٹی۔ ہم نے سارا زمانہ چھان مارا ہے ہم آدمی کے دل تک میں گھر کر لیں۔ اور اس کی ہر بات کو اسی دم جان لیں۔

سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آتی ہے اور اُس کے مردانہ بوٹ کی آواز بڑھتی جاتی ہے۔

کوئی آیا تو ہے۔

نیلم۔ حشمت بیگ ہوگا۔

نائکہ۔ ابھی پتہ چل جاتا ہے۔ اگر حشمت ہو تو تُو خاموشی سے ایک طرف ہو لینا۔ میں معاملہ طے کر لوں گی۔ تو بالکل دخل نہ دیجیو۔

(حشمت بیگ داخل ہوتا ہے)

حشمت بیگ۔ آہا۔ نیلم بائی بھی موجود ہیں۔ کیسی ہے طبیعت ان کی؟

نائکہ۔ (شانِ استغنا کو قائم رکھ کر نہایت بے پروایانہ انداز میں) بس جی چھوڑیئے۔ ایسی باتوں سے کیا حاصل۔ آپ کو بھی دیکھ لیا۔

حشمت بیگ۔ نہیں بڑی بی۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

نائکہ۔ ہاں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ نواب صاحب! آپ سے ہماری بڑی بڑی اُمیدیں بندھی ہوئی تھیں۔ آپ ابھی سے پھسڈی ہو گئے۔ بھلا کیا حیثیت ہے موئے سات ہزار کی۔ آپ اس تک کا انتظام نہ کر سکے۔

حشمت بیگ۔ یہ تم نے کیسے کہہ دیا؟ اگر کر سکوں تو پھر؟

نائکہ۔ کیا تو نہیں نا۔ کر سکنے کی کیا کہی۔

حشمت بیگ۔ بڑی بی بات اصل میں یہ ہے کہ رقم گھر میں نہیں ہے۔ گاؤں سے آنے والی ہے۔ کل تک آ جائے گی۔

نائکہ۔ بس جی۔ چھوڑیئے بحث کو۔ کل بھی آج ہے اور آج بھی کل۔ کل کا سودا بنئے کی دُکان پر ہوتا ہوگا۔ یہاں نہیں ہوتا۔

حشمت بیگ۔ تم تو ناحق بگڑ رہی ہو۔

نائکہ۔ بات ہی ایسی ہے۔ آپ جب وعدے پر سات ہزار نہ دے سکے تو اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ یہاں تو اُٹھتے بیٹھتے اسی طرح کی فرمائشوں کی بھرمار رہے گی۔ آپ کس طرح نبھا سکیں گے۔ ناحق ہمیں بھی غلط فہمی میں رکھا۔ کیا ہُوا وہ آپ کا رسُوخ جو ہر وقت کہا کرتے تھے کہ میں صاحب اثر و اقتدار ہوں۔ شہر کے بڑے بڑے معزز رئیس میرے دسترخوان پر بیٹھتے ہیں۔ ان کو میں اشارہ کر دوں تو کافی ہے۔ آن کی آن میں روپوں کا ڈھیر لگا دیں گے۔

حشمت بیگ۔ ہاں تو یہ غلط نہیں۔ میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں لیکن میں کسی کے پاس گیا ہی کب بھلا۔

نائکہ۔ آپ جائیں گے تو کونسا تیر مار لیں گے۔

حشمت بیگ۔ نہیں تم یہ غلط کہہ رہی ہو۔

نائکہ۔ ممکن ہے غلط کہہ رہی ہوں لیکن میں نے بھی بہت سے دیکھے ہیں جو ایسا ہی کرتے ہیں لیکن جب آزمائش کا وقت آتا ہے تو رہ جاتے ہیں۔

حشمت بیگ۔ رہ جاتے ہوں گے۔ مَیں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں اگر چاہوں تو چشم زدن میں ایک سات ہزار نہیں کئی سات ہزار لا کر رکھ دوں۔

نائکہ۔ ہمیں تو توقع نہیں ہے۔

حشمت بیگ ۔ کیوں نہیں ہے میں شہر کا رئیس اعظم ہوں ۔ مجھے سب جانتے ہیں ۔ صرف زبان زبان پر ہزاروں کا لین دین کر سکتا ہوں ۔

نائکہ ۔ اگر ایسا ہی ہے تو زبانی جمع خرچ کی کیا ضرورت ۔ دکھا دو نا لاکر ۔

حشمت بیگ ۔ اگر یہی ہے کہ تم میری آزمائش پر تُل گئی ہو تو میں ابھی سات ہزار روپئے لاکر تمہارے مُنہ پر مارتا ہوں ۔

حشمت بیگ تاؤ میں آکر اُلٹے پاؤں لوٹ جاتا ہے اور موٹر پر سوار ہو کر چلا جاتا ہے ۔

اس کے جانے کے بعد نیلم ، نائکہ اور چمپن کے قہقہوں کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں ۔

منظرِ چہارم

(شہر کی ایک تاریک اور بند گلی ۔ پرانے وقتوں کی جنگی حویلی)

سیٹھ گھنشیام داس حساب کتاب میں مصروف ہے ۔ گوپی ایک کونے میں بیٹھا اونگھ رہا ہے ۔ ہاتھ میں تمباکو کی چلم پکڑ رکھی ہے ۔

سیٹھ گھنشیام داس ۔ اے گوپی !

(گوپی چونک اُٹھتا ہے)

گوپی ۔ ہوں مہاراج !

سیٹھ گھنشیام داس ۔ دن رات سوتا ہی رہتا ہے ۔ تیرے نیتر دل میں بڑی اونگھ رہتی ہے ۔ جا جرا بھیتر سے جا کر میرا پستول لے آ ۔ جمانہ کھراب ہے ۔

گوپی ۔ جے کاہے مہاراج تکیے کے نیچے ۔ اپن نے کبھی کا لا کر رکھا ہے ۔

سیٹھ گھنشیام داس ۔ بس پھر ٹھیک ہے (تکیہ اٹھا کر اطمینان کر لیتا ہے) جے ہمارے کتنے بڑے پرانے بختوں کی شے ہے ۔

(پستول کے دستے کا ایک حصّہ باہر ہی رہتا ہے ۔)

گوپی ۔ اب تو اسے جنگ بھی چمٹ گئی ہے ۔

سیٹھ گھنشیام داس ۔ پرنتو کام کھوب دیتا ہے ، ابھی لشکر وار کو یونہی اس کی کل دبائی تھی کھٹ سے چلا تھا ۔

گوپی ۔ پھر بھی شاپھ کرانا اچھا ہے ۔ بہت کم رقم لگے گی ۔

سیٹھ گھنشیام داس ۔ کتنی بھی اس سے بڑھتی ہے ۔ جمانہ کم کھرچنے کا نہیں ہے ۔ (پھر فوراً ہی حساب کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے ۔) جے شولہ ہجار ۔ اس پر چڑھا شود بنا تیش ہجار ۔ لیا انیش ہجار رہا گیارہ ہجار (دروازے پر دستک) آ گئی کوئی مرگی ۔ کون شاب ؟

آواز ۔ مَیں ہوں حشمت بیگ ۔

سیٹھ گھنشیام داس ۔ ارے گوپی کھول دروجہ ۔ کچھ دینے آیا ہوگا میں نے تکا جا کیا تھا ۔ شرم والا آدمی ہے ۔ رقم لے آیا ہوگا ۔

(حشمت بیگ داخل ہوتا ہے)

آیئے مہاراج ۔ تشریپھ رکھیے ۔ کیسے آنا ہوا ؟

حشمت بیگ ۔ مَیں اس وقت کچھ قرض مانگنے آیا ہوں ۔

سیٹھ گھنشیام داس ۔ کرج ؟ رام رام ۔ آپ نے گجب بات کہہ دی ، ابھی پہلی رقم دی نہیں اور آگے سے لینے آ رہے ۔

حشمت بیگ ۔ اس بات کو چھوڑیئے ۔ پہلی رقم آ جائے گی ۔ مجھے اس وقت ایک سخت ضرورت پڑ گئی ہے جس کے لئے قرض مانگتا ہوں ۔

سیٹھ گھنشیام داس۔ گستاخی معاف فرمائیے۔ سبھی لوگ رقم جرورت کی کھاطر لیتے ہیں لیکن آپکے شاتھ ہمارا حساب بند ہو چکا ہے۔

حشمت بیگ۔ یہ کیوں؟

سیٹھ گھنشیام داس۔ مرجی اپن کی۔

حشمت بیگ۔ میں صاحب جائداد ہوں۔ میری ایک کوٹھی موجود ہے

سیٹھ گھنشیام داس۔ شاب وہ بھی کل تک کُرک ہو جانے کی بھگت جوتشی جی سے مہورت پوچھی ہے۔

حشمت بیگ۔ قرقی خواہ کل کی بجائے آج ہی کر لیجئے لیکن آخری بار مجھے روپیہ دے دیجئے۔

سیٹھ گھنشیام داس۔ نہ شاب ہمارا بجنس مندا پڑ گیا ہے۔ اب گنجیش نہیں۔ نہ ہی ہمیں سجتا ہے۔

حشمت بیگ۔ بڑا افسوس ہے آپ پر۔

سیٹھ گھنشیام داس۔ افسوش بھشوش کچھ نہیں۔ اے لین دین کی بات ہے۔

حشمت بیگ۔ تو کیا آپ دینے کو تیار نہیں۔

سیٹھ گھنشیام داس۔ اُوں ہوں۔ جہاں سے کھسکتے بنو جرا۔ ابھی اپن کو شو کام کرنے ہیں۔

(معاً حشمت کو پستول کا دستہ نظر آ جاتا ہے۔ جھٹ پھرتی کر کے اُٹھاتا ہے۔)

حشمت بیگ۔ خبردار جو آگے بڑھے۔ تو بھی پیچھے ہٹ رے اپھیجی۔

(گوپی اور سیٹھ گھنشیام داس کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ بات تک مُنہ سے نہیں نکلتی)

تم نے مجھ پر زندگی تنگ کر دی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا حشر بُرا ہوگا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ایک نہ ایک دن مجھے اپنی آخری کوٹھی سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور پھر ذلت کا سامنا ہوگا لیکن اس سب کے موجب تم ہوگے۔ تمہارے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کرنے سے پہلے میں تمہاری موت کا سامان کرتا ہوں۔

(ڈز۔ ڈز۔ گوپی اور سیٹھ گھنشیام داس کی نعشیں تڑپ تڑپ کر سرمایہ داری کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔)

کتنے ہی مصیبت کے مارے تمہاری سُودی جکڑبند سے آزاد ہو گئے۔

حشمت بیگ روپیہ اُٹھا کر اور پستول خون آلود نعشوں کے پاس پھینک کر فرار ہو جاتا ہے۔ اس کی فراری سے یہ نتیجہ نہ نکالئے کہ وہ قانون کی زد سے نکل گیا۔ قانون کا بھیانک عفریت اس کا تعاقب کرتا ہے لیکن بعجلت نہیں بلکہ کچھ تعلّل کے بعد جبکہ وہ جملہ حالات سے آگاہ ہو چکتا ہے۔ حشمت بیگ فی الحال آزاد ہے۔ فقط جسماً روح اس کی مضطرب ہے۔

منظرِ پنجم

مقام: 'فرحت کدہ'۔ نیلم اب کی ایک نئے لباس میں ہے۔ باریک اور شگفتہ رنگ کی عنابی ساڑھی اور گلابی رنگ کی جاکٹ کو اس کے تن مرمریں کو چھُونے کا فخر حاصل ہے۔

اس وقت وہ آہستہ آہستہ جانے کیا گنگنا رہی ہے۔ اچھا ہے وہ اسی طرح گنگنانے میں معروف ہے ورنہ ذرا واضح اور بلند سروں پر آ جائے تو قیامت برپا ہو جائے گی۔ تعیش پسند اس پر پروانہ وار فریفتہ ہونے لگ جائیں گے، ان میں سے اہلِ تموّل اوپر آ جائیں گے اور اپنی دولت کا خون کریں گے اور غیر مستطیع سڑک پر نیچے کھڑے ہو کر لطف اندوزی حاصل کریں گے اور بہت سے اُمورِ لازمہ سے غافل ہو جائیں گے۔

اُسے زہرہ کی بہن، یا جیو پیٹر کی دختر نیک اختر اور یا اپالو دیوتا کی منظورِ نظر سمجھ کر ساری عمر

کے لئے اس کی ملاقہ گوشی کرنے میں سعادت محسوس کریں گے۔

وقت گزرتا جاتا ہے۔ کلاک ایک بار چلا کر ساڑھے گیارہ کا اعلان کرتا ہے۔

(حشمت بیگ داخل ہوتا ہے)

حشمت بیگ ۔ اُف ۔ اُف ۔ محبت کو دام و درم سے فروخت کرنے والے دُکانداروا! یہ ہیں چاندی کے ٹھیکرے۔ انہیں سنبھالو۔ (روپوں کی تھیلی ایک طرف پھینک دیتا ہے) مرنے سے پہلے پہلے ان سے خوش ہولو۔ ان ٹھیکروں کے لئے دوانسا...... (دماغ کسی فوری خیال کے آتے ہی رُک جاتا ہے) ...... اُف۔ اُف میں ذرا گھبرا رہا ہوں۔ شراب۔ شراب۔

نیلم ۔ (شراب کا جام پیش کرکے) لیجئے۔ نوش کیجئے۔ سب گھبراہٹ جاتی رہے گی۔

حشمت بیگ ۔ آہ۔ روح میں تازگی آگئی۔ یہ دروازے بند کردو۔ ان پر سکرین ڈال دو تاکہ شیطانِ لعین کے قہقہوں کی گونج یا کسی منحوس مُردے کی خبیث رُوح بھٹک کر نہ آجائے۔ شاید آج تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں۔

نیلم ۔ نہیں۔ پیارے! یہ نہ کہئے۔ لیجئے ایک جام اور نوش کیجئے۔ تمام غم دُور ہو جائے گا۔

حشمت بیگ ۔ ہاں ہاں مَیں بھی یہی چاہتا ہوں۔ مجھے شراب کے نشے میں مست کردو۔ پھر آخری نغمہ سُنا کر اس میں گُم کردو۔ میں اس وقت خوش بخت ہوں۔ میرے پاس دولت، شراب اور موسیقی سب کچھ ہے۔ ایسے وقت میں مَیں موت کو دعوت دوں گا۔ یہ حسین موت سب کو نصیب نہیں ہوتی۔

نیلم ۔ موت کا نام لے کر میرے دل پر چوٹ نہ لگایئے۔ ایسے کلمے زبان پر نہ لایئے۔

حشمت بیگ ۔ مجھے دل پر قابو نہیں۔ مجھے آخری بار ایک نغمہ سُنا دو۔ میں پُوری طرح مخمور ہو چکا ہوں۔ موسیقی کا خوب لُطف آئے گا۔ میری بیتاب رُوح کو سرشاری کا پیغام دو۔

محبت کے معبد میں سازِ دل کے اعجاز افروز سُود گم آوازوں سے شروع ہوتے ہیں نیلم ترنم ریز ہوتی ہے۔ موسیقی کی نوائے دلکشا لبیک کہتی ہے ؎

شراب سُرخ ترے جام میں سمائی ہے
کہ حُور کوئی شفق سے اُتر کے آئی ہے

چلی ہے تیغ ستمگر کِسی کی گردن پر
کہ خوں کی دھار صراحی سے بہہ کے آئی ہے

مئے شباب میں ساقی ہے غرق سرتا پا
یہ موج کیف کی کس کے لئے اُٹھائی ہے

گانے کی آخری گونج کے ختم ہوتے ہی نیچے کا دروازہ "بھڑ بھڑ" کرکے کھٹکتا ہے۔ کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ دروازہ اور زور سے کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ خاموشی برتی جاتی ہے۔ دروازہ بالآخر بھٹ سے گرتا ہے۔ دونوں پٹ دھڑ سے الگ ہو جاتے ہیں۔ سیڑھیوں پر متعدد قدموں کے بڑھنے کی آہٹ آتی ہے ۔ حشمت بیگ بسرعت حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ لڑکھڑاتا لڑکھڑاتا کھڑکی کی طرف جاتا ہے۔ کھڑکی کو کھولتا ہے۔ ہوا کا خوشگوار جھونکا خیر مقدم کرتا ہے۔ وہ کمرے کی فضا کا آخری بار جائزہ لیتا ہے۔ سیڑھیوں پر کی آوازیں بالکل قریب ہو جاتی ہیں۔

جونہی کہ پولیس افسر کا پہلا قدم دہلیز پر پڑتا ہے۔ حشمت بیگ، نیلم کو الوداع کہہ کر، کھڑکی میں سے خود کو دھڑام سے پھینک دیتا ہے۔

(محبوس رُوح آزاد ہو جاتی ہے)

رحمٰن مُذنب

خداوندا بیا مرزانِ شہیدِ امتحانے را

(غالب)

شمع کو جوہرِ افسانہ طرازی نہ ملا

اُس کے شعلے کی زباں واقفِ اظہار نہیں
نالوں اور آہوں سے کچھ اُس کو سروکار نہیں
اُس کی خاموش محبت کو نوا ہی نہ ملی
اُسے جل جانا ہی آتا ہے وہ جل جائے گی

اور مرا عشق بھی اظہار سے بیگانہ ہے

خواہشِ وصل۔ تمنائے اثر سے محروم
گریۂ نیم شبی۔ آہِ سحر سے محروم
دِل کی چنگاری سُلگتی ہے کہ شعلہ بن جائے
مَوجِ اُمید تڑپتی ہے کہ دریا بن جائے
ضبط نے تھام رکھا ہے مرے ارمانوں کو
مرے سینے میں چھپا رکھا ہے طوفانوں کو
مری دُنیا میں ہے محدود کہانی میری
اپنی ہی آگ میں جلتی ہے جوانی میری
آخر اِک روز یونہی جاں سے گزر جاؤں گا
شمع ساں عشق کے ہیکل پہ میں مر جاؤں گا
تُو مگر جان سکے گی نہ مری موت کا راز!

عطاء اللہ سجاد

ہندی کی شائستہ ترین صُورت

۱۔ اُصولِ ارتقا

"زبان نہ کسی کی ایجاد ہے اور نہ کوئی اسے ایجاد کرسکتا ہے۔ جس اصُول پر بیج سے کونپل پھوٹتی ہے پتے نکلتے ہیں، شاخیں پھیلتی ہیں، پھل پھول لگتے ہیں، اور ایک دن وہی ننھّا سا پودا درخت تناور بن جاتا ہے، اسی اصُول کے مطابق زبان پیدا ہوتی بڑھتی اور پھلتی پھُولتی ہے۔"

زبانوں کی عام تعریف کے بارے میں زبان کے زبردست محقّق مولوی عبدالحق صاحب بی، اے سیکرٹری انجمن ترقیِ اُردو اورنگ آباد دکن کی مذکورہ بالارائے باوجود کمال اختصار کے نہایت جامع اور گوناگوں نکات کی حامل ہے۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان، ایک مروّج زبان بالفاظِ دیگر ایک زندہ زبان کے اندر حسب ذیل خصوصیات کا ہونا لازمی ہے:۔

۱۔ زبان کی ابتدا صرف ونحو (گرَیمر) سے نہ ہوئی ہو۔

۲۔ اس میں قانونِ ارتقا پایا جائے یعنی اپنے جنم سے لے کر آغازِ شباب تک تیز رفتار ترقی اور شباب میں کامل جلوہ نمائی پھر ذرا رُکی ہوئی حالت میں سال بسال درختِ تناور کی طرح پھل پھُول پیدا کرے۔

۳۔ ماحول کا اثر اس کے نمو میں ہو۔ اور پھر آئندہ فضا میں اپنا اثر دکھا کر ماحول کو بھی متاثر کرے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح انسان کی کوشش درخت کے مزاج، اس کے پھل پھُول، رنگ ذائقہ کو تبدیل نہیں کرسکتی۔ اس طرح ایک زندہ زبان بھی مسخ نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ دُنیا کے ہر مُلک کی ایک زندہ زبان ہے۔ جو اُس کی تہذیب، تمدن آئین کی ترجمان ہے۔

ہندوستان میں زبان کی تاریخ ۔ ایک زمانہ تھا جب کہ ہندوستان جنت نشان کی زبان دیوبانی رزبانِ الٰہی) تھی۔ اصُولِ ارتقا کے خلاف سعی بلیغ کی گئی کہ زبانِ الٰہی میں کسی طرح کونپل نہ پھُوٹنے پائے۔ برفستان میں جس طرح تخم اپنے بختِ خفتہ پر خشک آنسو روتا ہے۔ ویدک زبان برہمنوں کے سینوں میں مدفون رہی۔ آفتابِ ارتقا چمکا، دانے پھوٹ نکلے۔ آن کی آن میں اس کی دوسری شکل تھی۔ زبانِ ویدک نے جون بدلی اب اس نے اپنا نیا نام پایا اسکا نام ویدک پراکرت تھا۔ اُس پراکرت کو اگر ایک مجسّم شکل تصوّر کیجئے تو پالی کو جو گوتم بدھ اور اُن کے عہد کی آئینہ دار ہے اُس کا دستِ راست سمجھنا چاہئے۔ یہ تغیر دیکھ کر قانونِ ارتقا کے مخالف پھر چونکے۔ اُنھوں نے پراکرت کو روک کر قدیم مردہ زبانوں کو رائج کرنے کی دوبارہ کوشش کی اور ویدک پراکرت کو قواعد کی زنجیروں سے باندھ کر خوب تراش خراش کر کے ایک غیر فطری زبان پیش کی۔

اس کا نام سنسکرت رکھا گیا۔ اس لئے کہ یہ نہایت آراستہ پیراستہ کی گئی تھی۔ لیکن رفتارِ قدرت کے خلاف یہ زبان پھر نہ چل سکی۔ ملک کی فطری زبان عوام کے ساتھ ایک قدرتی چشمہ کی طرح آگے بڑھ رہی تھی جس سے اِدھر اُدھر سے نالے اور چھوٹی ندیاں آ کر مل رہی تھیں۔ کنارِ ساحل، سبزہ و گیاہ کو سیراب کرتا ہوا یہ چشمہ ہر ایک کے اجزا اپنے اندر شامل کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اب چشمہ نے دریا کا نام پایا یعنی زبانِ ہند نے تیسری جون بدلی۔ اس کا تیسرا نام اُپ بھرنش تھا۔ اب قدامت کے پجاریوں کے حوصلے چھوٹ چکے تھے۔ اپ بھرنش زمان و مکان کے موافق مختلف لباسوں میں نظر آئی۔

(۱) مرکزِ ملک (میرٹھ اور نواح دہلی)۔ (۲) وسطِ ملک (برج کے آس پاس کا ملک) کا لباس دیدہ زیب تھا۔ ماحول کا آخری اثر مسلمانوں کا ورود تھا۔ حکومتِ مرکزی کے اہتمام نے سب کو سمیٹ کر ایک کر دیا۔ دہلی اور آگرے کی بولیاں گنگا جمنا کی طرح مل گئیں۔ جس کے نمونے خسرو کی مکرنیوں اور پہیلیوں میں نظر آتے ہیں۔ قدر شناس مسلم قوم نے لطیف چیز یعنی برج اور آس پاس کی زبان کا انتخاب کیا۔ وہ ہندوستان کو ہند اور اس نسبت سے یہاں کی زبانِ عوام کو ہندی یا ہندوی کہنے لگے۔ یہ زبانِ ہند کی چوتھی صورت تھی۔ مسلمانوں کا عہد بھی بہت وسیع تھا۔ انقلاب عہد بہ عہد ہوتا ہے۔ عہدِ اکبری میں ہند کی حدیں وسیع ہوئیں۔ دکن بھی شامل ہو گیا۔ اور اس طرح ہند میں دکنی عنصر شامل ہو گیا۔ اُس نے اپنے یہاں کے ماحول میں اپنا اگلا نام کھو دیا۔ اور دکنی کہلانے لگی۔ اُردوئے شاہجہانی نے اسے اُردو کا نام دیا۔ ڈیڑھ سو برس کے بعد عہدِ محمد شاہ میں ہندِ شمال کے نواسی ولی کے ساتھ پھر دہلی آئے۔ اب وہ اس کی دکنی صورت چھٹنی شروع ہوئی۔ اور وہ زبان ہند (ہندی) کی آخری جون تھی جس کا نام ریختہ یا اُردو ہے۔

اسی طرح نواحِ دہلی سے اُٹھ کر اُردو ہندوستان کے جنوبی حصّہ (دکن) اور وہاں سے ہمراہِ ولی گجرات پہنچنے سے دکنی اور گجراتی زبانوں پر نقش بٹھا چکی ہے۔ گجراتی زبان پر اُردو رنگ صاف جھلکتا ہے۔ نرسی مہتا (گجراتی شاعر) کے چند ابیات ملاحظہ ہوں جو پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے ہندی کے شنکشپت اتہاس میں ہندی اور گجراتی کے عنوان میں دیا ہے:۔

ہردم کرشن کہے تو کرشن کہے تو زبان میری	یہی مطلب خاطر کرتا ہوں خوشامد میں تیری
دہی اور دُودھ شکر، ہر روز کھلاتا ہوں تجھے	تو بھی ہر روز نہ ہر نام۔ سنائی مجھے
کھوئی زندگانی ساری ہوئی گناہ معاف تیرا	دیامت بھولے پر بھو نام آخر وقت میرا

الفاظِ خط کشیدہ کی ترکیبیں اور خود الفاظ بالکل اُردو روزمرّہ کا نمونہ ہیں۔

اُردو کی نشوونما۔ جب اُردو سارے ملک کے ماحول سے متاثر ہو کر ماحول پر اپنا نقش ڈال چکی، دُور و نزدیک پھیل چکی تو انیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں کی تجارت سارے ہند کا احاطہ کرنے لگی۔ اب اُنہیں ایک ایسی زبان کی ضرورت ہوئی جسے وہ سیکھ کر اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔ اُنہوں نے خطے خطے کی زبان سمجھنے کے بدلے اُردو کو سیکھا کیونکہ وہ ہر حصّۂ ملک میں سمجھی جاتی تھی۔

اس وقت غریب اُردو کا دامن علمی جوہر سے خالی تھا بس لے دے کر اس کی جھولی میں قصے کہانیاں تھیں۔ جب اس زبان کو انگریزوں

کی تعلیم کے لئے درس نصاب کی صورت میں فورٹ ولیم کالج نے جگہ دی تو اُس کی خوبیاں زیادہ آشکارا ہوئیں۔ غرض کالج نے اُردو کا باشندگانِ ہند سے ہندوستانی کی شکل میں تعارف کرایا۔ اور یہ ایسے ہی تسلیم ہُوا جیسے کہ ایک تسلیم کئے ہوئے کُلیے کو ایک مزید تائید ملے۔ ہندوستان کے باشندگانِ عوام تو اسے بولتے اور سمجھتے ہی تھے۔ غیر ملکیوں نے بھی اسے ہندوستانی سمجھ کر سیکھا۔

آگے چل کر ملک کے فطری رجحان نے تین تحریکیں نمایاں کیں۔ جن سے اُردو فرش سے عرش پر جا پہنچی، دہلی میں ایک وسیع پیمانہ پر کالج کھولا گیا جس کا ذریعۂ تعلیم اُردو تھا۔ اس کالج کے لئے علمی کتابوں کے ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوئے اور اس طرح اُردو کو علمی زبان بننے میں بہت کچھ کامیابی ہوئی تیسری تحریک سائنٹیفک سوسائٹی کی تھی۔ جو ملکی تمدن اور اقتصادی اُلجھنوں کو لے کر وجود میں آئی جس نے علم و ادب و سیاست ہر ایک پر اپنی توجہ صرف کی۔ اب اُردو ایک کاروباری اور علمی حیثیت سے بڑھ کر سیاست کے لئے نہایت عمدہ زبان بن گئی۔ فارسی کی محتاجی جاتی رہی اور ہر قسم کے ادائے بیان پر قادر ہو گئی۔ اورینٹل کالج لاہور بھی اس تحریک کی آخری کڑی تھی۔ اس کے کارکنوں کی بدولت اُردو دُنیا کی جدید ترقی یافتہ زبانوں سے ہمدوش ہوئی۔ اب وہ (موجودہ صورت میں) برابر بڑھتی رہی ہے۔

موجودہ ہندی کی ابتدا۔ جب انیسویں صدی کے شروع میں اُردو والوں کی قدر ہوئی۔ اور ملک کے ہر حصّہ سے زبان پر دسترس رکھنے والے منشی و انشا پرداز کلکتہ میں جمع ہوئے تو تنگ نظری نے حسد کی آگ کو بھڑکایا اور جس ذہنیت نے ہندوستانیوں کو ہمیشہ غلام رکھا۔ وہ ایک نیا رُوپ بھر کر نمایاں ہوئی۔ اور اُردو کے مقابل ایک زبان وضع کی گئی۔ اور ذرا بھی نہ سوچا گیا کہ قومی یکجہتی کے گلے پر چھُری پھر رہی ہے۔ یہ زبان پہلے بھاشا کہلائی پھر ناگری اور آخر میں ہندی سے موسوم و معروف کی گئی۔ اس لئے اس جذبۂ رشک اور تنگ نظری کے ساتھ ہندی کی تاریخ پیدائش انیسویں صدی کا آغاز ہے۔ فورٹ ولیم کے مصنفین میں سے اکثر اس جذبہ کا شکار تھے۔

راجہ شیو پرشاد صاحب ستارۂ ہند نے جو ہندی کے محسن ہی نہیں اُس کے خدائے ثانی ہیں، اوّل اوّل اُردو عبارت کو ناگری رسم الخط میں لکھنے کا رواج اپنی خدمات کی بجاآوری کے سلسلے میں بآسانی کیا۔ اور اُنہوں نے اس ہندی کو سرسری طور پر زبان کا مرتبہ دینے کی سب سے پہلے کوشش کی۔ آپ کی تصنیفات خالص اُردو زبان میں ہیں، مگر رسم الخط ناگری ہے۔ مدرسوں میں ہندی کو بحیثیتِ زبان اور ذریعہ تعلیم تسلیم کرانے میں کتنا زور صرف کیا گیا کتنے ڈیپوٹیشن سرکار کے سامنے گزرے۔ اس کا اندازہ اُس بسیط مضمون سے ہوتا ہے، جو ہندی شبد ساگر (ایک جامع لغت) کے دیباچہ میں پنڈت رام چندر شکل نے ہندی ساہتیہ کا اتہاس کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے۔ ایسی ہی کوششیں ایک نہیں صدہا ہوئیں اور جب جا کر حق کے مقابل ناحق، زندہ کے مقابل مردہ، فطری کے مقابل غیر فطری اور قدرتی کے مقابل مصنوعی زبان کی حیثیت سے اُردو کے مقابل ہندی سرکاری طور پر تسلیم ہوئی۔ اس کے خالق و مالک اُنیسویں صدی کے اوائل سے پیشتر ہندی کی معدومی کے ساتھ ساتھ خود بھی نہ تھے۔ اگر کوئی بھی ایسی زبانِ عوام تھی تو وہ اُردو تھی، یا اُردو کے مالک وہ ہندو اور مسلمان جن میں اس قدر فرق و امتیاز نہ تھا جیسا کہ اب ہے۔ (ایف۔ اے۔ کے) کی کتاب ہندی لٹریچر سے اس کی تصدیق ہوگی۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ شمالی ہند میں ہندی کی بہت سی بولیاں بولی جاتی تھیں لیکن ان لوگوں میں جو فارسی نہ جانتے تھے شائستہ گفتگو

کا ذریعہ اُردو تھی۔

اُردو میں بہت سے الفاظ فارسی و عربی سے مستعار لئے گئے تھے۔ جن کا تعلق اسلام سے تھا۔ اس لئے ہندی بولنے والوں کے لئے ایک ایسی ادبی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی، جو زیادہ تر ہندوؤں کو مرغوب ہو سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کو لے کر ایک نئی زبان بدلی گئی۔ اور اس میں سے (اُردو) فارسی، عربی لفظوں کو نکال کر ان کی جگہ سنسکرت ہندی الاصل الفاظ داخل کئے گئے۔

ہندی آگے نکل گئی۔ اب وہ اُردو کہلاتی ہے۔ مگر قدامت پسندوں کی نئی کوشش ہے کہ وہ خواہ مخواہ عہدِ طفولیت کو قائم رکھنے کی مضحکہ انگیز کوشش کر رہے ہیں۔ جو بچہ پنجسالہ سے بڑھ کر تیس سالہ جوانوں میں داخل ہو چکا۔ کیونکر اس کا بچپن واپس کیا جائے۔

صاف ظاہر ہے کہ اصلی ہندی کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ صرف نام بدل گیا ہے۔ اُردو وہی اصل ہندی ہے۔ ہندی کی سب سے آخری شائستہ صورت اُردو ہے۔ اسے ہر شخص جانتا ہے۔ مگر پھر بھی آپ تعجب کریں گے۔ جب ہندی کے حمایتیوں کی موجودہ کوششیں سنیں گے۔ نیشنل کانگرس نے یہ طے کیا ہے کہ ہندوستان کی قومی و ملکی زبان ہندوستانی ہوگی۔ یعنی اس میں نہ تو سنسکرت کی بھرمار ہوگی نہ اپ بھرنش کی کرختگی اور نہ بھاکھا کی رکھائی اور نہ فارسیت و عربیت کا غلبہ۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ لکھی چاہے جس طرح جائے مگر زبان اُردو ہی اصل ہندوستانی ہو سکتی ہے۔ یہ ترمیم بھی اُردو کا کچھ بگاڑ نہ سکی، تو مہاتما گاندھی جی نے بحیثیت صدر بھارتیہ ساہتیہ پرشد (اپریل ۱۹۳۶ء) بمقام ناگپور ہندوستان کی زبانِ مشترک کا نام یوں لکھا ہے۔ اس سبھا کا کام ہندوستانی اتھوا (یا) ہندی میں ہوگا۔

ان سے پوچھا گیا کہ آپ صرف ہندوستانی کو کیوں نہیں رہنے دیتے یا صرف ہندی کو رکھئے۔ اتھوا ہندوستانی کی کیا ضرورت ہے؛ تو گاندھی جی نے فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہندی اتھوا ہندوستانی سے مُراد ایسی ہندی ہے جو آئندہ چل کر ہندوستانی بننے والی ہے۔ مگر دل کا چور صاف بول گیا کہ صرف "ہندوستانی" نام کا اطلاق بھی اُردو پر ہوگا جیسا کہ پہلے اطلاق ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا ہندوستانی کو زبردستی ہندی کے ساتھ گانٹھنا چاہیے۔ تاکہ اُردو کو ہندوستانی کہنے کا سوال ہی نہ اُٹھ سکے۔ جو درحقیقت ہندوستان کی زندہ زبان ہے۔ یہ زندہ زبان کا ادنےٰ کرشمہ ہے کہ آج موضوعہ زبان کے لئے (غیر مروّجہ زبان کے لئے) ایک ایسا لفظ بھی نہیں مل رہا ہے۔ جو جامع و مانع ہو سکے۔

اُردو کی دلکشی۔ زندہ چیز میں ایک کشش ہوتی ہے جو نظر کو کھینچتی ہے۔ اُردو میں وہ کشش موجود ہے۔ مگر جن کے دل کی آنکھیں حقیقت کی روشنی سے خالی ہیں۔ وہ اس طرف سے کتراتے پھرتے ہیں۔ آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ پھر بھی ہندی باٹکا میں بیٹھے ہوئے باغِ اُردو کی سرسبزی پر رشک کرتے ہیں۔

پنڈت رام نریش ترپاٹھی اپنی کویتا کومدی کی بھومکا (ہندی سنکشپت اتہاس) میں لکھتے ہیں:۔

"ہندی کوی کو ایسا سوبھاگیہ نہیں پراپت ہے۔ اس کے سامنے بڑا بندھن ہے۔ جو روڑا جیسا ہے اُسے بلا کاٹ چھانٹ کئے ویسے ہی جمانا پڑتا ہے۔ اسے ذرا بھی کاٹ چھانٹ کرنے کا ادھیکار نہیں۔ وہ آنند (لُطف) کو کانند (نون

غنہ بھی نہیں کرسکتا۔ اس کے آس پاس کی زمین اوبڑ کھابڑ ہے۔ اس میں ہو کر جانے کا سنکرا (نون غنہ) راستہ ہے۔ اُردو کویوں نے اس تکلیف کو سمجھا ہے۔ اُنہوں نے کچھ اُونڈتا ربیجا تصرف) سے کام لیا ہے۔ اپنا مارگ چھوڑ کر ادھر اُدھر بھی ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ وہ اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں۔ کسی کا کچھ بگڑے۔ انہیں کچھ پروا نہیں ہوتی۔ اُردو کا ایک شعر سنئے:۔

کھلتا نہیں دل بندہی رہتا ہے ہمیشہ
کیا جانے کہ آجاتا ہے اس میں تو کدھر سے

اس شعر میں جانے، جاتا ہے، اور اس میں، ان بیچاروں کا ڈھانچہ تو پورا ہے۔ مگر جان ادھوری ہے۔ نے تا، اور میں کا روپ دیکھنے میں دیرگھ (معروف) ہے، پرنتو اچارن (تلفظ) میں ہرسو (ہلکا) ہے۔ اُردو والے او، اور یہ، کرالگھ کر بھی اپنا بھاؤ پرگٹ کرسکتے ہیں کنتو دگمر) ہندی میں شبد کے روپ اور اُچارن میں انتر نہیں ہونا چاہئے۔ کنتو دپھر بھی) ہر ایک بار سال پورا آنا چاہئے۔ ستوڑے مال سے گرگوں (گاگوں) کا جی نہیں بھر سکتا ہے۔ اب ایسا کرنے کے لئے ہندی کے کچھ کوی اُردو والوں کا راستہ پکڑنا چاہتے ہیں۔ (ہندی کا سنکشپت اتہاس صفحہ ۹)"

پھر آگے چل کر حق کا جادو سر پر چڑھ جاتا ہے۔ اور اس حالت میں وہ اقرار کرتے ہیں:۔

"جب ہندو مسلمانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تب ایک کو دوسرے کی بھیش بھوشا (بھیس، وضع، قطع) سے نفرت کیونکر ہونی چاہئے۔ پرتیک (ہر ایک) ہندو کو اُردو سیکھنی چاہئے۔ اور پرتیک مسلمان کو ہندی۔ میری تو دِرڑھ دھارنا (اٹل رائے) ہے کہ کوئی بھی سبجیکت (شخص) اُردو جانے بنا ہندی کا سلیک نہیں بن سکتا۔ اب تک اُردو کی بھاشا شیلی (اسلوب) ہندی سے کئی انشوں میں بڑھ کر ہے۔ اُردو میں جیسا سندر پریوگ (استعمال) ہے ویسا وہی لیکھک کرسکتے ہیں، جو اُردو جانتے ہیں۔"

اکثر ہیں جو باوجود ہندی کی حمایت کے حرفِ راست بھی بے اختیار کہہ جاتے ہیں۔ منشی بالمکند گپت، پنڈت چندر شیکھر، لوگری و جگناتھ پرشاد مصنف گدیہ میمانسا کی رائیں اُردو کے بارے میں ان کی تصنیفات میں مطالعہ فرماتے ہیں، وہ اُردو کی ان خوبیوں کے قایل ہیں جو کسی ملک کی زندہ زبان میں ہونے ضروری ہیں۔ بالمکند گپت جو اُردو ہندی کے بڑے ماہر گزرے ہیں۔ اسے ہندوستان کی جگت بھاشا تسلیم کر چکے ہیں۔ گولیری جی کا بیان ہے کہ اُردو نثر و نظم ہندی سے پرانا ہے۔ یعنی بقول دیگر حضرات وضع کی ہوئی مصنوعی زبان نہیں ہے۔

برخلاف اس کے ہندی کی نسبت رماکانت پرشاد ایم اے اپنی تصنیف گدیہ میمانسا میں صاف صاف لکھتے ہیں:۔

"پنڈت للوجی لال نے بول چال کے تمام شبد اُردو، فارسی کے سمجھ کر نکال ڈالے" گدیہ سیمانسا صفحہ للوجی لال

اب فرمایئے۔ جدید اور مصنوعی زبان کون ہے۔ اُردو یا ہندی۔ اور مقبولیتِ عام کا تاج کس کے سر رہا۔

شاید ہندی (مصنوعی زبان) کا حمایتی طبقہ اپنی اکثریت کا غرور کر کے اُردو کو کمزور سمجھتا ہے۔ مگر خود اُن کو اُردو (زندہ اور فطری زبان) کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ جیسا کہ بار بار لوٹنا پڑا۔

پنڈت بھیم سین نے ہندی کی ترقی کی کیا تجویز پیش کی تھی؛ اُردو پن کو ہندی سے ایک دم مٹانے کے لئے فارسی وعربی کے لفظ مروج چشمہ کو چکبچھا اور سفارش کو چھپرا شش سے تبدیل کر کے ہندی کو سنسکرت بنایا۔ کیوں مقبول نہ ہوا؛ ایک پُرجوش حمایتی کی آواز کیوں ٹھکرائی گئی؟

اُردو سے ہزار کترائیے پھریئے مگر اُردو وہ تیرونشتر رکھتی ہے جس سے آشنا ہونے کے لئے آپ کے دل بے تاب ہیں۔ جبھی تو مرحوم پریم چند نے باوجود اکیلی آواز کے بنارس کے مجمع عوام میں ہندی زبان کو اُردو پن سے الگ کرنے کی تجویز کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ غالباً ابھی یہ لکچر ابنائے وطن کو بھولا نہ ہوگا۔

ماحول سے اثر پذیر اُردو، تمدن کے ساتھ ساتھ لطیف اور نازک ہو چکی ہے۔ زمانے کے مزاج کی طرح اس کا مزاج ہے۔ وہ اس لوچ اور گھلاوٹ سے مالامال ہے جو اس تہذیب کا نتیجہ ہے۔ وہ مطمئن ہے۔ آپ کو وہی باتیں اُردو کی شان میں کہنی پڑیں گی۔ جو ایرانی شاعر نے روٹھے ہوئے عاشق کی زبان سے حسین اور سجیلے معشوق کی شان میں کہی تھیں۔

بدور گردی من از غرور می خندد   حریف سخت کمانے کی در کمیں دارم

وہ معشوق میرے کترائے پھرنے سے ہنستا ہے۔ ایسا سخت کمان درست انداز نشانے والا، جان لیوا اداؤں والا معشوق میری گھات میں ہے۔ یعنی عاشق بچ کر کہاں جائے گا۔ جبکہ معشوق کا ہر ایک تیر بے خطا ہے۔

(باقی)

چراغ علی

اکبر

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں

اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں

ممکن نہیں شیخ امرؤالقیس بنیں

پنڈت جی بالمیک ہونے کے نہیں

کسی دُھندلی سی وادی میں

مجھے لے جا مرے مالک کسی دُھندلی سی وادی میں

مرا دل عرصۂ ہستی کے ہنگاموں سے تنگ آیا
مرا دل تیز تیز اور تند نظاروں سے تنگ آیا

مجھے لے جا مرے مالک کسی دُھندلی سی وادی میں

جہاں چھایا فضاؤں پر دُھندلکا ہی دُھندلکا ہو
جہاں دھیمی سے دھیمی بھی کوئی آہٹ نہ پیدا ہو

مجھے لے جا مرے مالک کسی دُھندلی سی وادی میں

مری وادی وہ وادی ہو نظر آئے نہ انساں کو
سُراغ اُس کا ملے یا رب نہ انساں کو نہ حیواں کو

مجھے لے جا مرے مالک کسی دُھندلی سی وادی میں

مری وادی ہو عنقا کی طرح معدوم و رپنہاں
مری وادی کے رستے بھی ہوں نامعلوم اور پنہاں

مجھے لے جا مرے مالک کسی دُھندلی سی وادی میں

مری وادی میں بُلبل تک نوا پیرا نہ ہو یارب
کلی تک کو چٹکنے کا وہاں یارا نہ ہو یارب

مجھے لے جا مرے مالک کسی دُھندلی سی وادی میں

مری وادی پہ چھایا خوبصورت سا اندھیرا ہو
مری وادی میں خاموشی کا ہر دم بول بالا ہو

مرا بیزارِ شورش دل وہاں آرام کرتا ہو!

ج - ب

مادرِ وطن

اے مادرِ وطن

ہم، تیرے بچے ـــــ

گنہگار ہیں

غیروں کے پاؤں تجھے روندتے پھریں

اور ہم

ان کے نقشِ پا پر سجدے کریں!

محکوم انسان،

ہمارا پیشہ غلامی ہے

آسمان پر بکھری ہوئی چنگاریاں، ستارے

ہماری ہنسی اُڑاتے ہیں۔

لیکن بوڑھا چاند

ہمارے غم میں زرد ہو رہا ہے

اے پوتر گنگا

اپنی آزاد لہروں کو حکم دے

کہ ہمیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیں

زمیں پھٹ جائے ـــــ

اور ہم اس میں سما جائیں

زمانہ جانتا ہے کہ

غلام قوموں کے اُبھر جانے سے یہ جہان اور آباد ہو جاتا ہے۔

حسن عباس

آنکھیں مل جانیکے بعد

خدایا شکر تیرا مجھ کو بینا کر دیا تُو نے
مری تاریک دُنیا میں اُجالا کر دیا تُو نے
مگر افسوس تیری مہر نکلی قہر سے بڑھ کر
مَیں سر کو پیٹتا ہوں آہ یہ کیا کر دیا تُو نے
مری یہ ظاہری آنکھیں تو بیشک ہوگئیں روشن
مگر باطن کی آنکھوں میں اندھیرا کر دیا تُو نے
مرے مالک مَیں جس دُنیا کو جنت زار سمجھا تھا
جہنم زار نکلی وہ اسے کیا کر دیا تُو نے
میں نابینا تو تھا لیکن سکونِ دل تو حاصل تھا
مگر بینا بنا کر ناشکیبا کر دیا تُو نے
یہ ہے گو کفرِ نعمت لیکن اکثر سوچتا ہوں میں
جہاں پہلے بھی تھا ایسا کہ ایسا کر دیا تُو نے

تاجور سامری لائل پوری

غزل

کہاں لے جاؤں میں ناشاد اِس تکلیفِ پنہاں کو
نگاہِ ناز نے نشتر بنا ڈالا رگِ جاں کو
بہارِ بے خزاں ہے گریۂ پیہم کی رنگینی
لئے پھرتا ہوں میں آنکھوں کے اندر ہی گلستاں کو
اب اِس میں میری جانِ زار ہی پر کیوں نہ بن جائے
بنانا ہے مجھے جانِ وفا اِک دشمنِ جاں کو
یہ صبح و شام کے منظر مسرت بخش ہیں، لیکن
مَیں کب تک اس طرح بہلاؤں اپنے دل کے ارماں کو
کسی کے حسنِ روز افزوں کا یہ شاید بھکاری ہے
زمیں پر چاند نے پھیلا دیا ہے اپنے داماں کو
مَیں اپنی آرزو کو صبر کی تعلیم دیتا ہوں
سکھاؤ تم بھی اختر ضبط اپنی چشمِ گریاں کو

اختر انصاری بی۔اے

مصوّر کا راز

ایک مصور کی تصویریں عوام میں بہت مقبول تھیں۔ اس کے ہم عصروں کی تصویریں موضوع، فن اور رنگ آمیزی کے لحاظ سے لاجواب ہوتیں۔ لیکن اس کی سادہ یک رنگ تصاویر میں ایک پُراسرار شفق کی سی خون آشام جھلک تھی جس کے باعث ہر کس و ناکس ان کا دلدادہ ہو جاتا تھا۔

مصوروں اور عوام کے پیہم تقاضے کے باوجود بھی وہ یہ بتلانے پر راضی نہ ہؤا کہ وہ اپنی تصاویر کے رنگ میں دلاویزی، دلکشی، اور یہ پُراسرار آب و تاب کس طرح پیدا کرتا ہے۔

ایک مصور نے دُور دراز کے ممالک میں طویل سفر کر کے رنگ سازی کے اجزاء اور نادر نسخے حاصل کئے اور نہایت روشن رنگوں سے تصویریں بنائیں۔ لیکن کچھ مدت کے بعد رنگ ماند پڑ گئے۔ ایک اور منچلے مصور نے پُرانی کتابوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا اور نئے اجزاء سے ایک رنگ ایجاد کیا لیکن اس کی تصویر میں بھی ویسی چمک مفقود تھی۔

مصور نت نئی تصاویر بنا کر عوام سے خراجِ تحسین حاصل کرتا رہا۔ اس کی تصاویر کی پُراسرار شفق گوں جھلک روز بروز شوخ ہوتی گئی اور مصور کا چہرہ زرد ہوتا گیا حتےٰ کہ ایک روز وہ ایک نامکمل تصویر کے سامنے مردہ پایا گیا۔ اس کے سامانِ تصویر کشی اور رنگ آمیزی کا جائزہ لینے پر بھی کوئی نئی یا خلافِ معمول شے دریافت نہ ہوئی۔

تجہیز و تکفین سے پہلے اسے غسل دیا گیا تو لوگوں نے اس کے سینے میں دِل کے مقام پر ایک زخم کا نشان دیکھا۔ زخم بہت ہی پُرانا تھا۔ جس نے غالباً تمام عمر اس کی رفاقت کی تھی کیونکہ زخم کے لب سخت اور کھُردرے تھے۔ لیکن موت نے جو ہر شے پر مہرِ سکوت لگا دیتی ہے لبوں کو باہم ملا کر زخم کا مُنہ بند کر دیا تھا۔ زخم کے خاموش لب زبانِ بے زبانی میں مصور کے کمالِ فن کا راز بیان کر رہے ہیں۔

حسبِ معمول رفتارِ زمانہ نے اس کی یاد لوگوں کے دلوں سے محو کر دی لیکن اس کے شاہکار ابھی تک ویسے ہی روشن اور زندہ ہیں۔

(ترجمہ)

عتیق اللہ خاں

مقصدِ زندگی

(۱)

ایک درخت نے،
گھنی چھاؤں کی،
بے گھروں کو ٹھکانا دیا،
دھوپ سے جلتے ہوؤں کو ٹھنڈک دی،
ٹھنڈی ہوا پھیلا کر،
دُنیا کو راحت آگیں کیا،
اور خود سخت سردی میں ——
ٹھٹھر کر جان دے دی،
پھر اپنے بے جان جسم کو،
ماگھ کے سرد موسم میں،
نذرِ آتش کر کے ——
غریب کسان کے بے حِس جسم کو،
حِس دے گیا!!
الٰہی ایسی زندگی عطا کر،

(ہندی سے ترجمہ)

(۲)

ایک پرند
اپنے بازو پھیلا کر،
اپنے حسن پر اترا کر،
فضا میں اُڑ کر،
ناچ کر، گیت گا کر،
میرے مکان کے صحن میں
آ کر بیٹھتا رہا،
اور اُسے نغمہ زار بناتا رہا۔
آخر میں اُس نے،
شکاری کا تیر کھا کر،
اپنی ننھی سی ہستی کو،
اُسی کی شکم پُری کے لئے،
قربان کر دیا!!
الٰہی ایسی زندگی عطا کر!

مخدوم علی شیدا دہلوی

محفلِ ادب

اُردو شاعری میں جمہوری رُجحانات

اُردو شاعری کی یہ خصوصیت بھی نہایت قابلِ قدر ہے کہ صرف کسان ہی نہیں بلکہ غریبوں کے وہ طبقے بھی جو باوجود بے انتہا کارآمد ہونے کے ابھی تک بے توجہی کے شکار تھے۔ کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور جن کو بڑی مشکل سے دُنیا آدمی سمجھنے کے لئے تیار ہوتی تھی، ان کو ہمارے دُوربین شعراء نے اپنے کلام سے نہایت دلکش پیرائے میں اہلِ نظر کے سامنے پیش کردیا۔ مزدور یا خدمتی رعایا کی صف میں بعض ایسی بھی ہستیاں تھیں جن کا ذکر اپنی جگہ پر مکروہ ہوگیا تھا۔ گو میرؔ نے عشق کی زبان سے دَورِ اوّل ہی میں سمجھا دیا تھا ؎

کیا پوچھتے ہو عاشقی میں ذات کے تئیں ‌ ‌ سید ہو یا چمار ہے اس میں وفا کی شرط

لیکن یا تو یہ اشارہ دُنیا نا کافی سمجھی یا اگر سمجھی بھی تو بس اس قدر کہ شاید دُنیائے عشق میں بہ جبر و قہر ایسی ہستیاں گوارا کرلی جائیں تو خیر ورنہ دُنیاوی اور کاروباری زندگی میں یہ کیا، ان کا ذکر بھی سرتا پانجس ہے۔ اُردو کا موجودہ شاعر زمانہ کے اس دھارے پر کشتی چلانا چاہتا ہے جس سے مخالف موجوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس لئے کہ انجام معلوم ہے۔ اپنی کشتی پر دُوراندیشی کا وہ چراغ جلائے ہوئے ہے جو مستقبل کی روشنی قرار پائے۔ ہندوستان کی دُنیا بہت کچھ بدل چکی ہے۔ پڑھے لکھے عالی خاندان افراد کی بھی نظریں ہمدردی اور حق شناسی کی عینک سے کام لینے لگی ہیں۔ چھوت اچھوت کا سوال کم ہو چلا ہے۔

اُردو کا شاعر بھی اپنا فرض سمجھنے لگا ہے انسان کو انسان بنا دینا اس کا پہلا کام ہے۔ اسی فریضہ کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ہمارے شعراء نے جامن والی، بہرا اور مہترانی پر جو نظمیں کہی ہیں وہ اپنی پاکیزگی کی نفاست، انسانیت، تخیل اور شعریت کی وجہ سے بیش بہا جواہر پارے ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر سخت قسم کا عالی خاندان و نجیب الطرفین شخص بھی بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔ چند اشعار اس موقعہ کے ملاحظہ ہوں:۔

تقاضائے جوانی

مُنہ اندھیرے تھی جب آویزش سی مہر و ماہ میں ‌ ‌ مہترانی کل نظر آئی مجھے اِک راہ میں
چھاؤں میں تاروں کی کچی نیند سے چونکی ہوئی ‌ ‌ اِک قدم پر جاگتی اِک گام پر سوتی ہوئی
رنگ تھا اک شہر پیما پائے بے پاپوش پر ‌ ‌ رُخ پہ انجمن ملگجی ساری کا پلو دوش پر
چال اٹھلائی ہوئی گردن کا خم مستانہ وار ‌ ‌ انکھڑیوں میں تنگ گلیوں کے تصور کا غبار

لیکن اس عالم میں بھی اے محوِ فطرت ہم نشیں — غم کا کوئی خارِ پیشانی کے بھولوں میں نہیں
دیدنی ہے تلخ پیشے کا یہ اندازِ طرب — اِک خوشی سی انکھڑیوں میں ایک لَے سی زیرِلب
سچ ہے ایفائے جوانی کو دبا سکتا ہے کون — سرِشباب روح پرور کا چھپا سکتا ہے کون
مہترانی ہو کہ رانی مسکرائے گی ضرور — کوئی عالم ہو جوانی گنگنائے گی ضرور

اس سلسلہ میں بعض شعرا کو اتنا انہماک ہو گیا ہے کہ انہوں نے ایسے ہی طبقوں کو اپنا موضوع بنا لیا ہے۔ مثلاً احسان بن دانش نے مستقل طور پر مزدور کو اپنی شاعری کا کارنامہ سمجھا ہے۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے اس پر یا اس کے متعلقات پر کہتے ہیں۔ اچھا یہ ہوا ہے، کہ موجودہ شعراء کا قلم صرف ایک خاص طبقہ تک نہیں رُکا۔ بلکہ انفرادی حیثیت سے بھی لوگوں کی تعریف مکمل طور پر کی گئی ہے لیکن کس انداز سے؟ قصیدہ نگاری کا پیرایۂ بیان چھوڑ کر اپنے ممدوح کے اصلی خصوصیات اور کارنامے ہمارے شعراء نے بے باکی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے مثال کا پیش کرنا تو شاید بہت زیادہ طوالت کا باعث ہو اس لئے کہ اس ضمن میں بھی بڑی کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہو گئی ہے، جن کا ذکر انفرادی حیثیت سے شاعری میں آگیا ہے۔ لیکن اگر آپ کو شک ہو یا شوق ہو تو چکبست کی صبح وطن میں "تلک۔ گوکھلے۔ راناڈے" وغیرہ کی شاعرانہ تصویر حقیقت کے آئینہ میں دیکھیے، اقبال کے بانگِ درا سے غالب۔ گرونانک اور سیماب کی بساطِ سیاست سے محمد علی۔ گاندھی۔ جواہر لال کی خصوصیات دیکھیے اور تلوک چند محروم کے گنجِ معانی میں بدھ، نور جہاں وغیرہ کے حالات وغیرہ مطالعہ فرمائیے۔

"نیساں"

تین سو برس پہلے کا ہندوستان

یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی حکومت اپنے پورے شباب پر تھی ہندوستان میں مسلمانوں کو شاہی اقتدار حاصل تھا وہ سیاہ و سفید کے مالک تھے لیکن ہندوؤں کو اپنا مفتوح و غلام نہیں بلکہ برابر کا بھائی سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں دخل دینا اسلامی شان کے خلاف تھا۔ ہندو آزاد تھے، ان کے مذہبی جذبات کا احترام کیا جاتا تھا۔ ان کو سلطنت میں بڑے سے بڑے عہدے ملتے تھے۔ ایک مسلمان اپنی مسجد کے اندر مسلمان تھا اور ایک ہندو اپنے مندر کے اندر ہندو۔ لیکن جب اپنے مراسم مذہبی ادا کرنے کے بعد وہ ہندوستان کی سڑکوں پر چلتے تو نہ کوئی ہندو تھا نہ کوئی مسلمان بلکہ دونوں ہندوستانی تھے۔ ہندوؤں کے مندر نہایت شاندار اور وسیع تھے جہاں وہ بلا کسی روک ٹوک کے اپنے مذہبی فرائض انجام دیا کرتے تھے۔

مغربی سیاحوں نے جنوبی ہندوستان کے جن بعض مندروں کا تذکرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کی اکثر مورتیاں بالکل عجیب طرز کی ہوتی تھیں مثلاً بجواڑہ کے قدیم ہندو مندروں کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے کہ وہاں عام طور پر ایک ایسی مورت ہوتی تھی جس کی شکل تو خوبصورت انسانوں کی سی تھی لیکن سر پر چار طویل سینگ تھے۔ اس بُت میں ایک گھنٹہ لٹکا ہوا تھا۔ پجاری مورت پر تیل چڑھانے کے بعد اس گھنٹہ کو تین دفعہ "رام

رام " کہہ کر بجاتے تھے۔ ان مندروں میں زر رومال کی قسم سے جو کچھ چڑھاوا چڑھتا تھا اُسے مہنت تین روز تک ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ چوتھے دن وہ رقم آپس میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ غریب جاتریوں کے طعام و قیام کا انتظام مندر کی جانب سے ہوتا تھا۔

موسیو تیورنیر نے بجواڑہ کے ایک مندر کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ یہ واقعہ بالکل اسی قسم کا ہے جیسا کہ شیخ سعدیؒ مرحوم اپنی کتاب بوستاں میں درج کر چکے ہیں یعنی بعض بڑے بتوں کی پشت پر جوف ہوتا تھا جس کے اندر مندر کے مہنت چھپ کر بیٹھ جاتے اور گفتگو کر کے عام جاتریوں کو یہ مغالطہ دیتے کہ دیوتا مہاراج خود ان سے سرگرمِ تکلم ہیں۔ سیاح مذکور کا بیان ہے کہ جنوبی ہندوستان کی سیاحت کرتے ہوئے جب وہ بجواڑہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک شاندار مندر میں ایک عورت مُورت کے قدموں پر سر رکھے ہوئے گریہ وزاری کر رہی ہے اور بار بار مُورت سے کچھ سوال کرتی ہے۔ تیورنیر یہ نظارہ دیکھ کر حیران ہُوا۔ اس نے ایک مہنت سے پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ مہنت نے جواب دیا کہ یہ مُورت اپنے جس پرستش کرنے والے پر مہربان ہو جاتی ہے اُس سے خود گفتگو کرتی ہے۔ عورت کو اسی طرح بت کے قدموں پر روتے پیٹتے تین دن گزر گئے۔ ایک دن تیورنیر موقع پا کر چپکے سے مندر کے اندر گھس گیا۔ مندر کے اندرونی حجروں میں بہت زیادہ تاریکی تھی۔ تاریکی میں اس نے بُت کے پیچھے جا کر جب دیکھا تو اسے بہت بڑا سُوراخ نظر آیا جس میں ایک آدمی بآسانی داخل ہو سکتا تھا۔ مندر کے مہنت اس سوراخ کے ذریعہ بت کے اندر سما کر بولتے تھے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ بت خود گفتگو کر رہا ہے۔ تیورنیر ابھی اپنی تحقیقات میں مصروف ہی تھا کہ مندر کا ایک مہنت آ گیا اور اس نے تیورنیر کو دیکھ کر بے ساختہ گالیاں سنانا شروع کیں کہ تو نے میرا مندر ناپاک کر دیا۔ تیورنیر نے پنڈت جی مہاراج کے ہاتھ میں چپکے سے دو روپے رکھ دیئے۔ بس پھر کیا تھا پنڈت جی ایسے خاموش ہوئے کہ جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ اُلٹے " پان سپاری " سے تیورنیر کی مدارات کی۔

اس زمانہ میں ہندوؤں کے مذہبی جلوس نہایت دھوم دھام کے ساتھ اُٹھا کرتے تھے۔ اسلامی حکومتوں کی جانب سے کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاتی تھی۔

ایک مغربی سیّاح کے سفرنامہ میں اس قسم کے جلوسوں کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ یہاں بطورِ تمثیل مختصر الفاظ میں صرف ایک جلوس کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو اُس وقت کی طرزِ معاشرت کا اندازہ ہو سکے۔ جلوس کم و بیش پانچ ہزار ہندو عورتوں اور مردوں پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ پچیس تیس خوبصورت پالکیاں تھیں جن کے اندر پُرتکلف پوشاک سے آراستہ رنگ برنگی مورتیں رکھی ہوئی تھیں پالکیوں پر زربفت اور مخمل کے بیش قیمت پردے پڑے ہوئے تھے۔ پالکیوں کی مُورتیں بعض تو بہت مہیب اور قوی ہیکل تھیں اور بعض چھوٹی اور خوبصورت۔

ہر ایک پالکی کے دونوں طرف نوعمر حسین لڑکے ہاتھوں میں بیش قیمت پنکھے لئے ہوئے مُورتیوں کی مگس رانی کر رہے تھے۔ فوج اور پولیس کے ہندو مسلمان سپاہی مجمع کو جلوس کی راہ سے ہٹاتے تھے۔ بالا خانوں پر سے ہندو عورتیں جلوس پر گلاب پاشی کر رہی تھیں۔ پالکیوں کے آگے آگے باجہ بج رہا تھا اور ان کے عقب میں کئی سَو نوجوان چاندی کے ڈنڈے لئے ہوئے تھے جن کے سروں پر رنگین ریشمی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک بہت بڑا جواہر نگار رتھ تھا جس میں سینکڑوں گھنٹیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ جب وہ چلنے سے بجتیں تو ان کی ہم آہنگی ایک

عجیب لطف پیدا کرتی تھی۔ طاؤس اور شتر مرغ کے پروں کے بعض چھوٹے پنکھے بھی تھا۔ شرکاءِ جلوس باآوازِ بلند اپنے مقدس گیت گاتے جاتے تھے۔ تماشائیوں میں ہزاروں مسلمان بھی تھے اور ان کی صورتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اپنی ہندو رعایا کے جذبات کا کامل احترام کرتے ہیں۔

مُلک میں ہندو جوگیوں کو خاص عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اہلِ اسلام بلا امتیاز مراتب و مدارج ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور اکثر ہندو جوگی تو ایسے تھے کہ ہندوؤں سے زیادہ مسلمان ان کے معتقد تھے۔

ایک مغربی سیاح نے موثق ذرائع کی بناء پر ایک ہندو جوگی کا یہ مافوق الفطرت کارنامہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جنوبی ہندوستان کے کچھ سیہ ہندو زائرین تیرتھ کے لئے کسی دُور دراز مقام کو جارہے تھے۔ یہ لوگ رات کو کسی گاؤں میں قیام کرتے اور وہیں اپنے لئے اشیائے خور و نوش حاصل کر لیتے تھے اتفاق سے اُنہیں راستہ میں شدید بارش نے گھیر لیا۔ اب انہیں جس گاؤں میں قیام کرنا تھا اُس کے درمیان ایک ندی حائل تھی۔ قافلہ جب شام کو ندی کے کنارے پر پہنچا تو اس کو معلوم ہوا کہ ندی شدتِ بارش کی وجہ سے ناقابلِ عبور ہوگئی ہے اور گاؤں تک پہنچنے کا اب کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ لوگ بہت گھبرائے کہ جنگل میں کھانے پینے کا انتظام کیا ہوگا۔ قافلے میں کم سن بچے تھے۔ جب رات زیادہ آئی تو بچے بھوک کی شدت سے چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ رونے پیٹنے کی آواز سُن کر جنگل سے ایک ہندو جوگی نکل آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی مٹکی تھی۔ اس نے جاتریوں سے سارا حال دریافت کیا اور جب یہ معلوم ہوا کہ اہلِ قافلہ کے پاس کھانے کو کچھ نہیں اور وہ بھوک کے مارے بیتاب ہورہے ہیں تو جوگی نے ہر شخص سے پوچھنا شروع کیا کہ وہ کیا کھائے گا۔ جو جاتری جس چیز کا نام لیتا جوگی اُسے مٹکے سے نکال کر کھانے کے لئے دے دیتا یہاں تک کہ تمام قافلے نے خوب سیر ہو کر من مانی چیزیں کھائیں اور اس کے بعد وہ غائب ہوگیا۔

اس زمانہ میں بھی اچھوتوں کی حالت نہایت قابلِ رحم تھی۔ ان سے انتہائی ذلت و حقارت کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ جنوبی ہندوستان کے راجاؤں کی حکومت میں تو یہ حال تھا کہ اگر کوئی اچھوت کسی اونچی ذات والے کے برابر سے گزر جاتا تو وہ اونچی ذات والا اپنے کو ناپاک سمجھ لیتا اور دوبارہ پاک ہونے کے لئے پہلی شرط یہ تھی کہ اس بدنصیب اچھوت کو اسی جگہ قتل کر دیا جائے۔ اگر اونچی ذات کا کوئی ہندو ازراہِ ترحم گستاخ اچھوت کو قتل نہ کرتا اور کسی طرح راجہ کو یہ حال معلوم ہو جاتا تو راجہ اس ہندو کے خلاف فرمانِ قتل صادر کر دیتا۔ اپنی جان کے خوف سے یہ بدنصیب فرزندانِ وطن شہر میں تو قطعاً آتے ہی نہ تھے، دیہاتوں میں بھی اگر کہیں اپنے کھیتوں میں جانے کے لئے گھروں سے باہر نکلتے تو مُنہ سے باآوازِ بلند "پو پو" چیختے جاتے تھے تاکہ اونچی ذات کے ہندو یہ آواز سُن کر ہوشیار ہو جائیں۔ اگر کسی ہندو راہگیر کے کانوں تک "پو پو" کی آواز پہنچتی تو وہ جواب میں "کو کو ئیا" پکار دیتا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ راستے کے قریب ایک اونچی ذات والے مہاشے موجود ہیں، غریب اچھوت کو آگے بڑھنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ بیرنگ واپس لوٹ جائے۔

ہندوؤں میں کمسنی کی شادی کا عام رواج تھا۔ اسلامی حکومت نے ایک مرتبہ اس مذموم طریقہ کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن ہندوؤں نے جب اسے اپنے امورِ مذہبی میں مداخلت تصور کیا تو حکومت خاموش رہی۔

مطبُوعات

دیوانِ غالب - آغا محمد طاہر صاحب نبیرہ حضرت آزاد نے دیوانِ غالب کا ایک نہایت خوبصورت پاکٹ ایڈیشن شائع کیا ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔ جلد نفیس اور سائز موزوں ہے۔ خود مرزا صاحب کے ایک قلمی نسخے سے بذریعہ بلاک شائع کیا گیا ہے۔

دیوانِ غالب اُردو کی وہ کتاب ہے کہ خواہ اس کے کتنے ایڈیشن شائع ہوں یہ ہمیشہ مقبول ہوگی۔ زیرِ تبصرہ ایڈیشن اس قابل ہے کہ غالب کا ہر شائق اسے منگوا کر اپنے پاس رکھے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:- آغا محمد طاہر صاحب آزاد بک ڈپو کوچہ چیلاں دہلی۔ قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔

تعلیمِ بالغاں اور ایک نیا قاعدہ - بالغوں کی تعلیم کی ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایس۔ ایم شاہ ولی یمینی صاحب بی۔ اے (آنرز) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ نے "تعلیمِ بالغاں" کے نام سے اُردو کا ایک نیا قاعدہ لکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بالغوں اور بوڑھوں کی نفسیات اور ذہنی کیفیت بچوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے جو ابتدائی قاعدے بچوں کو مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں وہ بڑی عمر کے آدمیوں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہو سکتے۔ اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے مصنف نے یہ قاعدہ لکھا ہے۔ مصنف کا دعوےٰ ہے کہ اس کی مدد سے بالغوں کو دو ماہ میں اُردو لکھنی پڑھنی آجاتی ہے اور بہت سے لوگوں پر اس کا تجربہ بھی کیا جا چکا ہے۔ شروع میں ایک نہایت مفید اور دلچسپ دیباچہ ہے جس میں بالغوں کی نفسیات اور طریقۂ تعلیم پر روشنی ڈالنے کے علاوہ معلمین کے لئے چند ہدایات درج ہیں۔

ہمارے خیال میں اُردو سیکھنے کے خواہشمند بالغوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اسباق میں صرف اُنہی باتوں کا ذکر ہے جن میں بڑی عمر کے لوگ دلچسپی لے سکتے ہیں۔ زمانے کی ضروریات کے پیشِ نظر ہر شخص کے لئے لازمی ہے کہ وہ معمولی پڑھنا لکھنا سیکھ جائے۔ ہمارے ملک کی بہت سی مصیبتوں کی جڑ "ناخواندگی" ہے اور بدقسمتی سے اکثر حضرات خیال کرتے ہیں کہ جب انسان عمر میں ذرا بڑا ہو جائے تو وہ کسی صورت میں بھی پڑھنا لکھنا سیکھ نہیں سکتا۔ ایسے لوگوں کو اس کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

اس کتاب میں ایک خامی بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ پڑھانے کا طریقہ تشنۂ تفصیل ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ مصنف کا ارادہ ہے کہ آئندہ اس کمی کو پورا کر دیا جائے مثلاً اس بات کی ضرورت ہے کہ بتایا جائے کہ کس طرح سے طالب علم بتدریج حروفِ تہجی سیکھتا جائے۔

کتاب کا ایک اور مفید پہلو بھی ہے۔ اخیر میں خط، درخواست، رسید، پرونوٹ اور سمن کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ فارسی اور مہاجنی رقمیں بھی درج ہیں۔ قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں۔ غالباً مصنف سے براہِ راست مل سکتی ہے۔

بشیر احمد

مطبُوعات

دیوانِ غالب - آغا محمد طاہر صاحب نبیرہ حضرت آزاد نے دیوانِ غالب کا ایک نہایت خوبصورت پاکٹ ایڈیشن شائع کیا ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔ جلد نفیس اور سائز موزوں ہے۔ خود مرزا صاحب کے ایک قلمی نسخے سے بذریعہ بلاک شائع کیا گیا ہے۔

دیوانِ غالب اُردو کی وہ کتاب ہے کہ خواہ اس کے کتنے ایڈیشن شائع ہوں یہ ہمیشہ مقبول ہو گی۔ زیرِ تبصرہ ایڈیشن اس قابل ہے کہ غالب کا ہر شائق اسے منگوا کر اپنے پاس رکھے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:- آغا محمد طاہر صاحب آزاد بک ڈپو کوچہ چیلاں دہلی۔ قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔

تعلیمِ بالغاں اور ایک نیا قاعدہ - بالغوں کی تعلیم کی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایس۔ ایم شاہ ولی یمینی صاحب بی۔ اے (آنرز) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ نے "تعلیمِ بالغاں" کے نام سے اُردو کا ایک نیا قاعدہ لکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بالغوں اور بوڑھوں کی نفسیات اور ذہنی کیفیت بچوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے جو ابتدائی قاعدے بچوں کو مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں وہ بڑی عمر کے آدمیوں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہو سکتے۔ اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے مصنف نے یہ قاعدہ لکھا ہے۔ مصنف کا دعوےٰ ہے کہ اس کی مدد سے بالغوں کو دو ماہ میں اُردو لکھنی پڑھنی آجاتی ہے اور بہت سے لوگوں پر اس کا تجربہ بھی کیا جا چکا ہے۔ شروع میں ایک نہایت مفید اور دلچسپ دیباچہ ہے جس میں بالغوں کی نفسیات اور طریقۂ تعلیم پر روشنی ڈالنے کے علاوہ معلمین کے لئے چند ہدایات درج ہیں۔

ہمارے خیال میں اُردو سیکھنے کے خواہشمند بالغوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اسباق میں صرف انہی باتوں کا ذکر ہے جن میں بڑی عمر کے لوگ دلچسپی لے سکتے ہیں۔ زمانے کی ضروریات کے پیشِ نظر ہر شخص کے لئے لازمی ہے کہ وہ معمولی پڑھنا لکھنا سیکھ جائے، ہمارے ملک کی بہت سی مصیبتوں کی جڑ "ناخواندگی" ہے اور بدقسمتی سے اکثر حضرات خیال کرتے ہیں کہ جب انسان عمر میں ذرا بڑا ہو جائے تو وہ کسی صورت میں بھی پڑھنا لکھنا سیکھ نہیں سکتا۔ ایسے لوگوں کو اس کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

اس کتاب میں ایک خامی بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ پڑھانے کا طریقہ تشنۂ تفصیل ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ مصنف کا ارادہ ہے کہ آئندہ اس کمی کو پورا کر دیا جائے مثلاً اس بات کی ضرورت ہے کہ بتایا جائے کہ کس طرح سے طالب علم بتدریج حروفِ تہجی سیکھتا جائے۔

کتاب کا ایک اور مفید پہلو بھی ہے۔ اخیر میں خط، درخواست، رسید، پرونوٹ اور سمن کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ فارسی اور ہندسی رقمیں بھی درج ہیں۔ قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں۔ غالباً مصنف سے براہِ راست مل سکتی ہے۔

بشیر احمد

فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ نومبر ۱۹۳۷ء

تصویر: ۔۔۔ [illegible]

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے مع محصول فی پرچہ ۸ ر

بزمِ ”ہمایوں“

دُنیا کی رفتار کتنی تیز ہوتی جاتی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ محض ایک دائرے میں گھوم رہی ہے بعض سمجھتے ہیں کہ نہیں یہ پیہم آگے کو چل رہی ہے۔ کچھ ہو یہ واقعہ ہے کہ پہلے کی نسبت یہ زیادہ تیزی سے رواں ہے۔ خود ہمارے ہندوستان میں کیسی کیسی تبدیلیاں کس سرعت کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ ہم جو زبان کے مسئلے سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں بھی تجویزوں اور تردیدوں اور ترمیموں کا سلسلہ بڑے زور شور سے جاری ہے۔

گزشتہ تین مہینوں میں کم از کم تین نہایت اہم بیانات مُلکی زبان کے متعلق پبلک کے سامنے آئے ہیں: اُردو ہندی کے جھگڑے کو مٹانے کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو نے اگست ۱۹۳۷ء میں ایک رسالہ ”زبان کا مسئلہ“ لکھا ہے۔ اُن کی تجاویز غور کے قابل ہیں۔ مہاتما گاندھی نے دیباچے میں اُن پر اپنی پسندیدگی ظاہر کی ہے۔ تجاویز کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) ہندوستانی (اُردو اور ناگری دونوں رسمِ خط میں) ہندوستان کی عام زبان تسلیم کی جائے۔ ہر عدالت میں درخواستیں وغیرہ اس زبان میں کسی ایک رسمِ خط میں پیش کی جا سکیں۔

(۲) ”بنیادی“ انگریزی کے ڈھنگ پر ”بنیادی“ ہندوستانی وضع کی جائے جس میں گرامر کم ہو۔ ایک ہزار سے زیادہ لفظ نہ ہوں اور جو تمام معمولی کاروبار کے کام آسکے۔ یہی کل ہندوستان کی عام زبان ہو۔

(۳) بنیادی ہندوستانی (کسی ایک خط میں) ثانوی تعلیم میں تمام غیر ہندوستانی علاقوں میں لازمی مضمون ہو اور اعلےٰ تعلیم میں ہندوستانی اور ایک غیر ملکی زبان لازمی ہوں۔

(۴) ہر صوبے کی زبان وہاں کا ذریعۂ تعلیم اور عدالتی اور دفتری زبان ہو۔ لیکن اگر کسی جگہ کسی دوسری زبان والے طلبہ کی کافی تعداد ہو تو ابتدائی تعلیم اور ہو سکے تو ثانوی تعلیم بھی انہیں اپنی زبان میں دی جائے، گو اُن کے لئے علاقے کی زبان سیکھنا بھی لازم ہو۔ ثانوی تعلیم میں ہماری قدیم زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو لیکن وہ لازمی نہ ہوں۔ یہ زبانیں اپنے اپنے علاقے کی زبانیں تسلیم کی جائیں: ہندوستانی (اُردو اور ہندی)، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلنگو، کنٹری، ملیالم، اُڑیا، آسامی، سندھی اور ایک حد تک پنجابی اور پشتو۔

(۵) ہندوستانی بولنے والے علاقوں میں طلبہ کو ابتدائی تعلیم اُردو یا ناگری کسی خط میں حاصل کرنے کا اختیار ہو۔ لیکن ثانوی درجوں میں دوسرا خط سیکھنے کی طرف توجہ دلائی جائے اگرچہ اس کا سیکھنا لازم نہ ہو۔ ان علاقوں میں دفتری اور عدالتی زبان ہندوستانی (دونوں خطوں میں) ہو لیکن عدالتی کارروائی بالعموم عدالتی علاقے کے مروجہ رسمِ خط میں لکھی جائے۔ باقی سرکاری کاغذات و اعلانات دونوں خطوں میں شائع ہوں۔

(۶) پنجاب میں ابتدائی تعلیم پنجابی میں ہو اور سرحدی صوبے میں پشتو میں لیکن ان صوبوں میں اعلیٰ تعلیم غالباً ہندوستانی میں زیادہ مناسب ہوگی۔

(۷) لاطینی رسمِ خط کا اختیار کرنا فی الحال ناممکن ہے۔ کوشش کی جائے کہ دیوناگری، بنگالی، گجراتی، اور مرہٹی کے رسمِ خط یکساں ہو جائیں۔ سندھی کا خط اُردو میں جذب ہو جائے۔ ہندی اور اُردو خطوں کی اصلاح کی جائے اور انھیں چھاپے ٹائپ وغیرہ کے لئے موزوں بنایا جائے جنوبی زبانوں کے خط اگر ناگری کے قریب نہ لائے جاسکیں تو کم از کم اُن کا ایک ہی خط بنا دیا جائے۔

(۸) ہندی اور اُردو کو الگ الگ ترقی کرنے سے روکا نہ جائے۔ دونوں کی ترقی ہمارے لئے مفید ہوگی۔ زمانے کے حالات انہیں خود ایک دوسرے کے قریب لائیں گے۔ اس بارے میں ہمیں بھی کوشش کرنی چاہئے۔ توجہ لائی جائے کہ طرزِ تحریر آسان ہو اور عوام کی دلچسپی اور ترقی مدِ نظر رہے۔

اصطلاحیں کچھ تو باہر کی زبانوں سے جُوں کی تُوں لے لی جائیں اور کچھ ہم مِل کر اپنی زبانوں سے مناسب طریقے سے بنائیں۔

(۹) ترجمے کثرت سے کئے جائیں تاکہ ہم تازہ اور نئے خیالات سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

---

۲۸ اگست ۱۹۳۷ء کو مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمنِ ترقیِ اُردو اور بابو راجندر پرشاد کے درمیان اُردو اور ہندی کے متعلق ایک سمجھوتا ہو گیا۔ اس پر اُنھوں نے ایک بیان شائع کیا جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:۔

ہندوستانی زبان ہندوستان کی مشترک زبان ہونی چاہئے اور اُردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جانی چاہئے اور دونوں رسم الخط تمام سرکاری اور تعلیمی مقاصد کے لئے تسلیم کر لینے چاہئیں۔

ہندوستانی سے ہماری مُراد وہ زبان ہے جس میں زیادہ سے زیادہ اجزاء اُس زبان کے لئے جائیں جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی جاتی ہے۔ اس زبان میں الفاظ کے انتخاب کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ اُن کا عام بول چال میں کس حد تک رواج ہے۔

ہماری یہ بھی رائے ہے کہ ہندی اور اُردو دونوں کو بہ حیثیت ادبی زبانوں کے پوری پوری ترقی کا موقع دینا چاہئے۔ ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ ہندی اور اُردو کے ادیبوں کی اعانت سے ہندوستانی زبان کے بنیادی الفاظ کا ایک لُغت تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کے لئے اور اصطلاحاتِ علمیہ کے انتخاب کے لئے اُردو اور ہندی والوں کی ایک چھوٹی سی نمائندہ کمیٹی بنائی جائے جس میں ایسے رُکن ہوں جو دونوں زبانوں کو قریب تر لانے کے خواہشمند ہوں۔

اس بیان کے علاوہ ایک الگ ریزولیوشن میں ہندوستانی کی یُوں تعریف کی گئی! ہندوستانی سے ہماری مُراد وہ زبان ہے جو اس ملک کی ہندو مسلمان قوموں کے میل جول اور ایک دوسرے کی تہذیب سے متاثر ہونے سے بنی ہے۔ یہ زبان شمالی ہندوستان کے باشندے عام طور سے بولتے ہیں اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں کے رہنے والے سمجھتے ہیں جو عربی فارسی سنسکرت کے نامانوس لفظوں سے خالی ہے اور

جو اُردو دیوناگری یا کسی دوسرے رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے نہایت اہم سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں حسبِ ذیل قرارداد منظور کی :-

ا۔ چونکہ اُردو زبان قدرتی طور پر ایک ہندوستانی زبان ہے۔

ب۔ چونکہ اُردو زبان زیادہ تر مسلمانوں اور ہندوؤں کے تمدنوں کے طویل میل جول کی پیداوار ہے اور ملک میں اور کوئی ایسی زبان نہیں بولی جاتی جس میں دونوں فرقوں کے تمدنی خیالات بخوبی ادا کئے جاسکیں۔

ج۔ چونکہ اُردو زبان ہندوستان کے بہت بڑے حصے میں مشترکہ زبان کے طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اسی وجہ سے غیر ملکی لوگ اسے ہندوستانی یا ہندوستان کی زبان کا نام دیتے ہیں۔

د۔ چونکہ ان وجوہ سے اُردو زبان اہلِ ہند کی متحدہ قومیت کی نشوونما کے لئے موزوں ترین ہے۔

ہ۔ اور چونکہ وہ نئی زبان جو ہندی یا ہندی اَلْمعروف ہندوستانی کے نام سے محض اُردو کی جگہ لینے کے لئے وضع کی جارہی ہے اپنی نوعیت میں زبردستی طور پر مصنوعی ہے اور عوام کی روزمرہ کی زندگی اور بول چال سے اس قدر علیحدہ ہے کہ اندیشہ ہے کہ اس سے اُردو کی تعمیری بنیاد کو ضربِ کاری لگے گی اور ہندوستان کے ہندو اور مسلم فرقوں کے دوستانہ تعلقات پر خراب اثر پڑے گا —— اس لئے ان حالات کے مدِ نظر آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستان کے تمام اُردو بولنے والے لوگوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ہر شعبے میں جس کا تعلق مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے ہو اپنی زبان کے تحفظ کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں اور اس غرض سے یہ مطالبہ کریں کہ (۱) ملک کے ان تمام حصوں میں جہاں اُردو زبان علاقے کی زبان ہے اُس کے تحفظ پورے استعمال اور ترقی کے لئے حکومت موجودہ انتظامات کو برقرار رکھے (۲) ملک کے جن حصوں میں اُردو زبان علاقے کی خاص مروجہ زبان نہ ہو اگر اُردو بولنے والے چاہیں تو اُن کے لئے اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا معقول انتظام کیا جائے نیز سرکاری نصابِ تعلیم میں اُردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت دی جائے اور اُسے اچھی طرح پڑھانے کا باقاعدہ انتظام ہو اور (۳) تمام سرکاری دفتروں، عدالتوں، کونسلوں، محکمۂ ریلوے اور محکمۂ ڈاک میں اُردو زبان کے استعمال کے لئے انتظام کیا جائے۔

آل انڈیا مسلم لیگ اُردو کو ہندوستان بھر کی زبان بنانے کیلئے ہر ممکن کوشش کرے گی"

ہمارے خیال میں دونوں قوموں کا فرض ہے کہ وہ اُردو کی ملکی حیثیت کو برقرار رکھنے اور اُسے ترقی دینے میں فراخدلی سے حصہ لیں۔ اس سے نہ صرف زبان کا مسئلہ طے ہو جائے گا بلکہ اُس اتحاد کے لئے رستہ صاف ہو جائے گا جس کی اس وقت ملک کو اشد ضرورت ہے۔

بشیر احمد

جہاں نما

منو کے قوانینِ جنگ

مسیح کی پیدائش سے سینکڑوں سال پہلے منو نے جنگ کے جو قانون بنائے تھے اُن کا مقابلہ اگر آج کل کے بے رحمانہ طریق جنگ سے کیا جائے تو یورپ کی تہذیب کا بھرم کُھل جاتا ہے۔ ان قدیم قوانین کے مطابق بادشاہ کو جنگ میں بھی بڑی حد تک رحم دلانہ طریقے ملحوظ رکھنے پڑتے تھے۔ چنانچہ لازم تھا کہ:۔

بادشاہ جنگ میں خفیہ ہتھیار استعمال نہ کرے۔

نہ ایسے ہتھیار جو زہر میں بجھے ہوئے یا آگ میں گرم کیئے گئے ہوں۔

بادشاہ اس شخص کو نہ مارے جو لڑتے لڑتے بچ کر کسی جگہ پناہ لے رہا ہو۔

نہ اُسے جو لڑائی میں حصہ نہ لے رہا ہو۔

نہ اُسے جس کے ہتھیار ٹوٹ گئے ہوں۔

نہ اُسے جو لڑائی میں پیٹھ دکھا کر بھاگ رہا ہو۔

جنگ کے متعلق منو کے اِن قوانین کا مقابلہ آج کل کے مہذب ممالک کے آئین جنگ سے کیا جائے تو خدا یاد آجاتا ہے۔ آج کل زہریلی گیسوں اور بم بارطیاروں سے عورتیں اور بچے تک بے دریغ موت کے گھاٹ اُتارے جاتے ہیں۔ شہروں کے شہر بے جرم وقصور تباہ و برباد کر دیئے جاتے ہیں۔ ہلاکت بار توپوں سے نہ مذہبی معابد بچتے ہیں نہ شفاخانے، نہ بیش بہا تاریخی اہمیت رکھنے والی عمارات۔

عجب نہیں کہ اس تہذیب کے خاتمے کے بعد آنے والی نسلیں اپنے مُنہ میں انگشتِ حیرت ڈال کر سوال کیا کریں کہ کبھی انسان بھی ایسی خوفناک اور غیر انسانی حرکتیں کرتا رہا ہے۔

تفریحی مشاغل

بہت سے لوگ اپنے اپنے تفریحی مشاغل کا ذکر کرتے ہیں لیکن در اصل اُن کا تفریحی مشغلہ کوئی نہیں ہوتا۔ جس بات کو وہ تفریحی مشغلہ

کہتے ہیں، وہ دراصل اُن کا ایک دوسرا کاروبار ہوتا ہے جس کو وہ اُسی انہماک، اُسی تندہی اور اُسی خودغرضانہ انداز سے انجام دیتے ہیں جسے وہ اپنے روزی کمانے کے کاروبار میں ملحوظ رکھتے ہیں۔

ہر شخص ایسے لوگوں سے جن کا یہ ذکر ہے واقف ہوگا۔ وہ کبھی آرام نہیں لیتے۔ کبھی اپنے دماغی بوجھ کو ہلکا نہیں ہونے دیتے، وہ گالف، برج اور ٹینس وغیرہ بھی اُسی شدید توجہ کے ساتھ کھیلتے ہیں جیسے کوئی حریص آدمی دولت حاصل کرنے کے لئے جان توڑ کوشش کررہا ہو۔

وہ ہر کھیل کے بعد "تحقیقات" کی مجالس بٹھاتے ہیں۔ وہ اگر کوئی فراغت کا دن باغ میں بھی گزاریں تو اسے بھی "کاروبار" بنانے سے باز نہیں رہ سکتے۔ وہ کسی بات کو کھیل نہیں سمجھتے۔ اگر وہ دوپہر کے کھانے کے بعد لان پر مشین چلانا شروع کریں تو وہ یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ چائے کے وقت سے پہلے پہلے لان کا کام ختم کردیں۔

گلاب کے پھول اُن کے لئے سبز مکھیوں اور اُن کے ہلاک کرنے کی دواؤں کا مجموعہ ہیں۔ پرندے اُن کے لئے ناپاک تکلیف دہ حشرات ہیں جو پھلوں کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔ باغ بھی اُن کے لئے اسی طرح فکر اور پریشانی کا گھر ہوتا ہے جیسے دفتر۔ انہیں باغ میں بھی کسی قسم کی تفریح یا آرام حاصل نہیں ہوتا۔

حالت یہ ہے کہ اگر اُن کا ہمسایہ اپنے کھیت میں ذرا بڑے کھیرے پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے یا پھولوں کی نمائش کے لئے ذرا بہتر پھول پیدا کرلے تو اُن کا گھر کا گھر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ دُنیا رہنے کے قابل نہیں رہی۔

ایسے لوگوں پر اگر اعتراض کیا جائے تو وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرتے ہیں کہ جو کام کرنے کے قابل ہے وہ اس قابل بھی ہے کہ اچھی طرح کیا جائے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب کوئی ڈاکٹر کسی سے کہے کہ تمہیں کوئی تفریحی مشغلہ اختیار کرنا چاہئے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عموماً یہ بات ایسے لوگوں سے کہتے ہیں جو اپنے کام سے کسی طرح نجات نہیں پا سکتے۔ جو اپنے دفتر کو اپنے ساتھ ہی گھر لے جاتے ہیں۔ جو فرصت کے اوقات میں بھی اپنے کاروباری جھگڑوں جھمیلوں کے متعلق سوچتے رہتے ہیں اور جنہیں ہر وقت یہ فکر لگی رہتی ہے کہ ہم نے فلاں بات اچھی طرح کی یا نہیں؛

ڈاکٹر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کو فارغ رکھنے کی عادت ڈالیں۔ کاروباری آدمیوں کے لئے تفریحی مشاغل اختیار کرنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے لیکن اگر وہ تفریحی مشاغل کو بھی کاروباری سرگرمی کے ساتھ اختیار کریں تو پھر اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ تفریح کے لئے کوئی کتاب پڑھنی شروع کرتے ہیں لیکن پھر اسے بھی اپنے لئے ایک کام بنا لیتے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے ہیں لیکن ذہنی غلامی کا تقاضا ہوتا ہے کہ اب اسے ختم کرکے دم لو۔ یہ لوگ کبھی کام سے آزاد نہیں ہوتے۔

بعض لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہمارا کام ہی ہمارا تفریحی مشغلہ بھی ہے۔ یہ لوگ درست کہتے ہیں اور یہ بہت خوش قسمت ہیں لیکن ان کو بھی اپنے لئے کوئی دوسرا مشغلہ سوچ رکھنا چاہیئے جو کاروبار سے دستبردار ہونے کے بعد زندگی کو اُن کے لئے خوشگوار رکھ سکے۔ یہ بات صرف کاروباری آدمیوں ہی کے لئے ضروری نہیں بلکہ اُن ماؤں کے لئے بھی ضروری ہے جو بچے پال رہی ہوں۔

رفتہ رفتہ بچے بڑے ہوجاتے ہیں یا مدرسے چلے جاتے ہیں، ان فارغ اوقات کے لئے کوئی نہ کوئی مشغلہ اُور ہونا چاہیئے ورنہ زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔

لیکن اس سے زیادہ قابلِ توجہ حالت ان لوگوں کی ہے جن کے لئے نہ تو اُن کا کام تفریحی ہوتا ہے اور نہ کوئی اور تفریحی مشغلہ کیونکہ وہ اسے بھی اپنے لئے ایک کام بنا لیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ہی قید سے رہا نہیں ہوسکتے۔ وہ کسی بات میں ذہنی غور وفکر سے آزاد نہیں ہوتے۔

ان لوگوں کا تفریحی مشغلہ اگر باغبانی ہو تو ہروقت انہیں اس بات کا احساس رہتا ہے کہ یہ "میرا" باغ ہے۔ وہ اسے خدا کا باغ کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ پھولوں کی خوبصورتی میں خدا کے ہاتھوں کی صنعت کا مشاہدہ کبھی نہیں کرتے بلکہ وہ ہمیشہ اپنی محنت کے نتیجے پر نظر رکھتے ہیں۔

انہیں پھولوں کے حُسن سے محبت نہیں ہوتی۔ اُن کے نزدیک پھولوں کا حُسن محض اس لئے ہوتا ہے کہ اس کا مقابلہ ہمسایہ کے پھولوں سے کیا جائے۔ چنانچہ اُن کے باغ میں ہروقت کام ہی کام ہوتا ہے۔ وہاں کبھی کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جس سے لُطف اُٹھایا جائے نہ لطف اُٹھانے کا وقت ہی ملتا ہے۔

ایک اَور شخص کہتا ہے کہ میرا تفریحی مشغلہ سیر ہے۔ یہ خیال میں بھی نہیں آسکتا کہ کوئی شخص قدرت کے خوبصورت میدانوں اور مرغزاروں میں سیر گشت کرنے کو بھی "کام" بنا سکتا ہے لیکن یہ شخص ایسا ہی کرتا ہے۔ وہ قدرت کے نظاروں کی طرف سے اندھا اور صبح خواں پرندوں کے نغموں کی طرف سے بہرا ہے، اس کا مقصد صرف یہ دیکھنا ہے کہ میں کتنے میل چلا ہوں۔

کیا آپ بھی ان لوگوں کی طرح ہیں، اگر آپ ان کی طرح ہیں تو یقیناً آپ کا کوئی تفریحی مشغلہ نہیں۔ اکثر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں اور دراصل انہیں کسی قسم کی تفریح حاصل نہیں ہوتی۔

ہم لوگ اپنے فارغ اوقات کو استعمال کرنے کا طریقہ نہیں جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں زندہ رہنا ہی نہیں آتا۔ ہم میں سے اکثر کے لئے زندگی نہیں بلکہ زندگی گزارنے کا کوئی ذریعہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔ یہ بہت افسوسناک حالت ہے۔ جن لوگوں کی یہ حالت ہے اُن کی زندگی ہی سراسر غلط ہے۔

قدرت کا گراموفون

مسٹر رنگا راؤ نیپالی نے بمبئی کرانیکل میں اپنی ایک دلچسپ سیر کا حال یوں لکھا ہے:-

ریاست میسور کے ضلع چیتل ڈرگ میں مولا کالا مورو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس کی آبادی کوئی پانچ ہزار کے قریب ہوگی۔ اس میں زیادہ تعداد جلاہوں کی ہے۔ یہ جگہ سطح بحر سے کوئی ۲۵۰۰ فٹ اونچی ہے اور خوبصورت اتنی ہے کہ کشمیر کے مناظر بھی اس کے سامنے معمولی معلوم ہوتے ہیں۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جن پر گھنے سرسبز جنگل لہلہاتے ہیں۔ شکاریوں کے لئے یہ جنگل لاجواب ہیں۔ جنگلی پرند، ریچھ، چیتے اور سؤر یہاں بہت پائے جاتے ہیں۔ مسافروں کے لئے ایک چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ بھی موجود ہے، عام طور پر لوگ لبسوں کے ذریعے سے یہاں پہنچتے ہیں۔ سڑک خوبصورت وادیوں کی گود میں چکر کھاتی ہوئی یہاں تک پہنچتی ہے۔ یہ جگہ ایسی ہے کہ اگر کوئی ایک بار اسے دیکھ لے تو برسوں یاد کرتا ہے۔

مولا کالا مورو صرف دلکش مناظر اور نفیس آب و ہوا ہی کی وجہ سے پسندیدہ نہیں بلکہ یہاں قدرت اپنا پُراسرار گراموفون بھی بجاتی ہے اور یہ قصبہ کوئی افسانے کا گاؤں معلوم ہونے لگتا ہے۔ شمالی پہاڑیوں سے ایسی ایسی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں کہ آدمی انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ وہی فقرہ جو کوئی دو منٹ پہلے میری زبان سے نکلا تھا اب پہاڑ اسے دُہرا رہے ہیں تو میں بھونچکا سا رہ گیا۔

ہم کُل چار آدمی تھے۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ معلوم کریں کہ اصل بات کیا ہے، پیش نظر عمودی پہاڑی پر چڑھنا آسان نہ تھا۔ گاؤں والے اسے "گھٹنے توڑ" پہاڑی کہتے ہیں اور یقیناً اس پر گھٹنوں کے بل چڑھتے چڑھتے آدمی سخت زخمی ہو جاتا تھا۔ آخر کار ہم زمین سے پانچ سو فٹ کی بلندی پر یعنی اس پہاڑی کی آخری چوٹی پر آپہنچے۔ نیچے وادی میں کالے بادل پیچ و خم کھا رہے تھے اور ان کے نیچے سفید گایوں کی ایک قطار نظر آتی تھی۔ گایوں کی گردن میں بندھی ہوئی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور ایک گوالا گیت گاتا ہوا ان کے پیچھے آرہا تھا۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑی عمیق جھیل تھی۔ اس کے گرداگرد خوبصورت درختوں کا گھیرا تھا ہم اس جھیل کے کنارے کنارے جا رہے تھے اور بتدریج بلندی پر چڑھ رہے تھے۔ ہمارے رہنما نے ہمیں ٹھہرنے کیلئے اشارہ کیا کیونکہ ہمارا سفر تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اب ہم سے پچاس فٹ نیچے شفاف پانی کی ایک بلوریں جھیل چمک رہی تھی۔ اردگرد پہاڑیوں کی ڈھلوان دیواریں تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک ایسے پیالے میں بیٹھے ہیں جس میں تھوڑا سا پانی پڑا ہے۔ ہمارے سامنے تین سو گز کے فاصلے پر دو سو گز لمبی اور ایک سو گز چوڑی ایک چٹان تھی۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں قدموں کے تین نشان تھے۔ میں نے ان نشانات پر کھڑے ہو کر اور چٹان کی طرف منہ کر کے تلنگی میں ایک گیت گایا۔ دو منٹ گزر گئے۔ ہم پنجوں کے بل کھڑے ہو کر نہایت اضطراب سے اپنی صدائے بازگشت کے منتظر تھے۔ یکایک ہمیں اپنی مشقت اور دوڑ دھوپ کا صلہ مل گیا۔ میرا گیت صاف صاف سنائی دے رہا تھا اور ہم حیرت زدہ ہو کر سوچ رہے تھے کہ یہ کیا معمّا ہے؟ یہ آواز کہاں چلی گئی تھی؟ اس کی گونج کہاں سے آئی؟ اسے دوبارہ سنائی دینے میں اتنا وقت کیوں صرف ہوا؟ یہ سوالات ایسے ہیں جنہیں میرا دماغ حل کرنے سے عاجز ہے۔ لیکن ہم یہ اندازہ کئے بغیر نہ رہ سکے کہ اس گونج کے پس پشت ایک پُراسرار طاقت ہے جو اسے کسی دُور دراز مقام سے واپس پہنچا دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے صرف سائنسدان ہی حل کر سکتے ہیں۔

سچ بولنے کا مرض

زندگی کے متعلق سوچ سوچ کر جن غلط نتائج پر میں پہنچا ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم ہندوستان میں رہنے والے

سچ

محض رسماً بولتے ہیں یعنی جس طرح مُردوں کے سوم اور چہلم کی رسم ہے یعنی مرنے والا اچھا ہو کہ بُرا ہو، جوان ہو کہ بوڑھا ہو، قاتل ہو کہ مقتول ہو سوم اور چہلم ضرور ہوتے ہیں اسی طرح موقع ہو کہ نہ ہو، ضرورت ہو کہ نہ ہو ہم لوگ سچ بک دیتے ہیں۔ مجھے تقریباً پکا یقین ہو چلا تھا کہ انگریزوں کے ہاں جھوٹ بولنے کی رسم ہے اور ہمارے ہاں سچ بولنے کی رسم ہے اور اسی افسوسناک نتیجہ کو اخذ کرکے اس مضمون پر مزید غور کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ حال ہی میں چند واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ نتیجہ نظر ثانی کا محتاج ہے اور اب میری رائے یہ ہوتی جاتی ہے کہ میرا پہلا خیال غلط تھا۔ اب مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریز تو ضرور محض رسماً جھوٹ بولتے ہیں مگر ہم لوگ رسماً نہیں بلکہ مجبوراً سچ بولتے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں سینکڑوں بیماریاں ہیں اور نصف درجن قائم و دائم وبائیں ہیں وہاں سچ بولنے کی وبا بھی عام ہے۔ ملیریا کے مریض کو امتلاء و اعضا شکنی و دردِ سر سے مفر نہیں اسی طرح ہندوستانی تمدن کے مقصور کو سچ بولنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

پہلی مثال

(ہندوستانی گھر میں سچ)

بیوی میاں اِدھر اُدھر کی باتیں ختم کر چکے ہیں کہ یک لخت بیوی کو خیال آتا ہے کہ دو سال ہوئے سونے کی چوڑیوں کو دل چاہا تھا کمبخت آج تک میسر نہ ہوئیں۔ سہیلیوں نے دو دو دفعہ بدلوا بھی لیں اور ایک میں ہوں کہ کانچ پہنتے پہنتے ہڈیاں گھس گئیں۔

بیوی۔ اپنے مطلب کی باتیں تو آپ کو خوب یاد رہتی ہیں یہ بھی کبھی سوچا کہ مجھ نصیبوں جلی نے دو سال ہوئے سونے کی چوڑیوں کو کہا تھا۔

شوہر۔ بیگم کیوں خفا ہوتی ہو۔ سونا تم پر قربان مگر یہ تو سوچو کہ شادی کا قرض اُتارا، اماں کا چہلم کیا، بچے کی بسم اللہ کی، اب چھوٹی بہن کی شادی درپیش ہے۔ آخر محض ۶۰ روپیہ ماہوار تنخواہ ہے، قارون کا خزانہ نہیں۔

(سچ کی حرارت سے مزاجوں کا پارہ چڑھنا شروع ہو جاتا ہے)

بیوی۔ میری آرزو کو ٹھکرانے کے لئے تو آپ سو معقول دلیلیں پیش کردیں گے مگر کیا ہوتا جو مجھے پانچ روپیہ ماہوار آپ کسی طرح دے دیتے

تو ان دو سال میں ایک سو بیس جمع ہو جاتے۔ وہ بھی آپ نے وعدہ کر کے زندگی کے بیمہ کے بہانے خود ہی ہتھیا لئے۔

یہ مکالمہ بہت لمبا ہے۔ اس کی ہزاروں شاخیں ہیں مگر مطلب واقعات کی تصویر کھینچنے سے نہیں ہے بلکہ واقعات کی روح کا فوٹو پیش کرنا ہے نہ بیوی نے کوئی بات غلط کہی نہ شوہر نے ذرہ برابر جھوٹ کو روا رکھا مگر اس سچ پرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہفتہ بھر کے لئے زندگیاں تلخ ہو گئیں۔ شادی جو درحقیقت وہ اچھی خاصی مصیبت بن گئی۔ کسی انگریزی گھر میں اس قسم کا مکالمہ ناممکن ہے۔ جھوٹ بولنے کی رسم کی پابندی میں شوہر فوراً بیوی کی کلائیوں کو دو چار دفعہ ہونٹوں سے چھو دیتا۔ سینما چلنے کا ذکر چھیڑ دیتا اور بناوٹی پیار کرتے کرتے سچ مچ دونوں میں پہلے سے زیادہ مضبوط پیار کی بنیاد ہو جاتی۔ مصنوعی پیار کی یہ روحانی خاصیت ہے کہ جھوٹ سے شروع ہو کر سچے پیار کو مات کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں تصنع کے پیار سے نفرت ہے اس لئے سچا پیاری قسم کا پیار کبھی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری مثال

(ہندوستانی قومی جلسوں میں سچ)

قومی جلسے سکھ صاحبان کے ہوں کہ مہاسبھا کے مہارشیوں کے ہوں، کہ اسلام کے نام پر جان قربان کرنے والے سرخ اور نیلی قمیص پوشوں کے ہوں سب کے سب سچ سے لبریز ہوتے ہیں۔ آج تک ایک بھی مثال ایسی نہیں ہے کہ کسی شخص نے دانستہ کسی جلسہ میں صریح جھوٹ بولا ہو۔ یہ نہایت دلیری سے کہا جا سکتا ہے کہ پولیٹیکل جلسوں میں بھی کسی قسم کے جھوٹ کو مشکل سے ہی دخل ہونے کا موقع ملتا ہے مگر نتیجہ ملاحظہ ہو۔ اکالیوں نے سچ بولا تو گوردوارے ہل گئے۔ سرخ قمیصوں نے سچ کے طیش میں آکر آنکھیں لال پیلی کیں تو جلا وطنیوں کا بول بالا ہو گیا اور جو ہندوؤں کے حقوق کی حفاظت میں مہارشیوں نے نرمی اور ملائمت سے بحث شروع کی تو مسلم اخباروں کے آسمان سے آگ برسنے لگی۔

جس قسم کے مطالب ہندو یا سکھ صاحبان یا فدایان اسلام کے مدنظر ہیں اگر اسی قسم کے مطالب انگلستان کے لوگوں کے مدنظر ہوتے تو جھوٹوں کی کوئی حد نہ رہتی۔ میکڈانلڈ مزدوروں کا حامی اور سرمایہ داروں کا دشمن فوراً سرمایہ داروں کے سردار بالڈون کو جھوٹ موٹ پیار کر کے انگریزی سفینہ کی ناخدائی کا بیڑا اٹھا لیتا۔ ہندوستان میں محض سچ بولنے کے مرض کی وجہ سے یہ صورت ناممکن ہے حضرت جناح جو اسلامی سیاسی سرمایہ کے خود ساختہ امین ہیں کبھی پنڈت جواہرلال نہرو سے مل کر کام کرنے کا موقع نہیں پاتے۔ قصور کسی کا بھی نہیں۔ پنڈت جی بھی سچے ہیں اور جناح صاحب بھی راستی کا لٹھ ہیں مگر ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے یہ دو سچ

کبھی ہم نوالہ ہم پیالہ نہ ہوں گے۔ ہندوستان میں ایک سچ دوسرے سچ کے لئے قطعی اچھوت ہے۔

تیسری مثال

(ہندوستانی تاریخ میں سچ)

سیوا جی بھی سرگباش ہوئے اور حضرت اورنگ زیب بھی جنت کو چل دیئے مگر ان کی باہمی لڑائی آج تک جاری ہے مر مرا چکے

کی دشمنیوں کو زندہ رکھنے والے ہزاروں موجود ہیں اور محض سچ کی خاطر۔ ایسا کوئی مرد باطل پیدا ہی نہیں کہ یہ ثابت کر دے کہ سیواجی اور اورنگ زیب در اصل دلی دوست تھے اور نبرد آزمائی محض جوشِ شجاعت تھا۔ تاریخ تو تاریخ اب ناٹکوں میں بھی یہ حال ہے کہ ہندو لکھے تو سیواجی فرشتہ اور ان کے مخالف شیطان اور مسلمان لکھے تو حضرت زندہ پیر فرشتہ اور سیواجی ملعون۔ اس پر کوئی بھی متفق نہیں ہوتا کہ دونوں فرشتے تھے اور شکر ہے کہ دونوں رخصت ہوئے۔

متعدد مثالیں اور پیش کی جا سکتی ہیں کہ ہند میں ایک سچ کا دوسرے سچ سے نکاح قطعی حرام ہے مگر اس سے فائدہ؛ یہ مضمون بجائے خود ایک ناقابلِ معافی سچ کا نمونہ ہے۔ مہاتماجی کے ہوتے ہندوستان کو سچ کے مرض سے صحت یاب ہونے کی اُمید رکھنا قطعی فضول ہے۔ سچ ایک لاعلاج مرض ہے اور ہندوستان میں مریض کے تیسرے درجہ کی بھی آخری حالت ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس مرض کا علاج امریکہ سے نکلے گا۔ مگر تا تصنع از امریکہ آوردہ بود ہندی حق گزیدہ مردہ شود۔

فلک پیما

صدا

جاگ اے نیند کے ماتے جاگ!

تیرے وطن پر ادبار کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔

ہر طرف بھوکوں کا مجمع ہے۔

اغیار تیرے وطن کو پامال کر رہے ہیں۔

تیری حمیت کیا ہوئی۔

فرسودہ دُنیا میں انقلاب بپا کر

قدیم نظام بدل ڈال

اے مادرِ وطن کے فرزند

جاگ

محمد ایوب

کیلاش کنول

ترجمہ "لالۂ طور" از پیام مشرق

میں نے "ہمایوں" کے لئے یہ تراجم علامہ اقبال کی اجازتِ خاص سے کئے ہیں۔ براہِ کرم کوئی صاحب انہیں میری اجازت کے بغیر شائع کرنے کا قصد نہ فرمائیں۔

مقبول احمد پوری

جہانِ ما کہ نابود است بودش
زیاں توام ہمی زاید ز سودش
کہن را نو کن و طرحِ دگر ریز
دلِ ما برنتابد دیر و زودش

ترجمہ

اپنے جگت کا نہ ہونا ہے ہونا
لابھ کے ساتھ ہے گھاٹے کا کھونا
نیو رکھ اور پرانا نیا کر
چھوڑ یہ جلدی دیر کا رونا

[1] سود۔ فائدہ۔ نفع + [2] زیان۔ نقصان۔ گھاٹا + [3] طرح۔ بنیاد +

نہ من انجام و نے آغاز جویم
ہمہ رازم جہاں راز جویم
گر از روئے حقیقت پردہ گیرند
ہماں بوک و مگر را باز جویم

ترجمہ

آدی[1] نہ انت[2] کی کھوج[3] لگاؤں
بھید ہوں، بھید کی دنیا منجھاؤں
تتو[4] کا گھونگھٹ پٹ جو کھولیں
سونس[5] مگر[5] سے پھر بھڑ جاؤں[6]

[1] آغاز۔ ابتدا + [2] انجام۔ انتہا + [3] جستجو میں پھرنا۔ چھان بین کرنا۔ [4] حقیقت (یعنی فلسفۂ مادیات کی اصطلاح ہیں)۔ [5] دریائی درندے +

[6] اس رباعی کے مفہوم کا اشارہ ڈارون کے نظریۂ Origin of Species کی طرف ہے یا غالباً حضرت مولانا روم رح کے اُن اشعار کی طرف ہے جس میں مولانا نے تخلیقِ حیات کے مسئلہ پر گفتگو کی ہے۔ مولانا نے حیات کی ارتقائی سیڑھیاں جمادات، نباتات اور حیوانات سے ہوتے ہوئے انسان تک نمایاں کی ہیں اور فرمایا ہے کہ اس طرح حیات روحانیت کی طرف ارتقاء کر رہی ہے۔ مولانا کے اس ارتقائی تناسخ اور ہنود کے آواگون میں بہت بڑا فرق ہے۔ مولانا کے اس ترقی پذیر نظریہ کی صداقت کا دم بھرتے ہوئے ہنود کے ایک مہاتما سوامی رام تیرتھ نے مولانا روم کے اشعار کا حوالہ دے کر اپنے ایک اپدیش میں اس طرح لکھا ہے:۔ "پیارے تم منتخب ہو چکے ہو۔ تمہارے لئے لنگور اور چیتے کا زمانہ گزر چکا۔ خونخوار ناخنوں، دانتوں اور سینگھوں کا عہد بیت چکا۔ پھاڑ کھانے یا دُم ہلانے کا وقت نہیں رہا۔" (رسالہ ست اپدیش)

(۱۴)

تنے پیدا کُن از مشتِ غبارے
تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلِ درد آشنائے
چو جوئے در کنارِ کوہسارے

(ترجمہ)

چُٹکی راکھ سے جسم بنا لے
کُوٹ[1] اَٹل جیون کا اُٹھا لے
درد بھرا دِل اُس میں براجے[2]
ڈھال[3] سے جیسے ندی جَل ڈھالے[4]

[1] کوٹ ۔ معنی قلعہ ۔ اٹل معنی مضبوط ۔

[2] براجے ۔ معنی براجمان ہو ۔ قیام پذیر ہو ۔ مکین ہو ۔

[3] ڈھالوان ۔ slope [4] بہائے ۔ رواں کرے

(۱۵)

ز آب و گِل خدا خوش پیکرے ساخت
جہانے از ارم زیبا ترے ساخت
ولے ساقی بہ آں آتش کہ دارد
زخاکِ من جہانِ دیگرے ساخت

(ترجمہ)

مُورتی[1] جل مِٹّی سے بنائی
سُورگ[2] کی دُنیا خدا نے سجائی
آگ سے اپنی مرے ست گُرنے[3]
اُس میں اِک اَور ہی دُنیا بسائی

[1] مورتی یا مورت بمعنی پیکر ۔ قالب ۱۲

[2] سورگ یعنی جنّت ۔ اِرَم

[3] ساقی کا مفہوم مُرشد ہے یعنی ست گُرُ

(۱۶)

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت
فروغِ زندگی تابِ شرر بود
ولیکن گر نہ رنجی با تو گویم
صنم از آدمی پائندہ تر بود

(ترجمہ)

حشر[1] میں بولا خدا سے برہمن
آگ کی ایک جھلک تھا جیون
بُرا نہ مانے تو میں یہ کہوں گا
آدمی سے تھا اَٹل[2] بُت کا تن

[1] حشر معنی پرلے قیامت۔

[2] اٹل۔ معنی پائندہ، مضبوط

(۵۷)

تو اے شیخِ حرم شاید ندانی
جہانِ عشق را ہم محشرے ہست
گناہ و نامہ و میزاں ندارد
نہ او را مسلمے نے کافرے ہست

(ترجمہ)

سُنو جی تم کاشی کے پنڈت
پریم کا پرلے[1] سب سے نرالا
پوچھ وہاں نہیں پاپ اور پُن[2] کی
ایک ہے دھرم[3] اَدھرم کا پالا[4]

[1] پرلے معنی محشر، قیامت " [2] نیکی و بدی

[3] دھرم معنی دین "ادھرم" معنی بے دینی۔

[4] پالا معنی منزل۔ جیسے "پالا مار لیا یا پالا جیت لیا"

مقبول حسین احمد پوری

تالاب کی حسینہ

پہاڑی کے اوپر تالاب تھا۔ یہاں سے شہر کا منظر بہت دلفریب معلوم ہوتا۔ چھوٹا سا خوبصورت کوہستانی شہر، اس کے مکانوں کی ٹین کی چھتیں، دھوپ میں چاندی کے تختوں کی طرح چمکتی ہوئی، شوالوں کے رنگین اور روپہلی کلس، سڑکیں جن پر اُودے رنگ کی بجری بچھی ہوئی تھی اور جن کے گرد دو رویہ شمشاد اور سرو کے درخت ایستادہ تھے، اس کے باغات جو آڑو، پلم، اور خوبانیوں سے لدے ہوئے تھے، ان سب نے مل کر اس چھوٹی سی وادی کے حسن کو فزوں تر کر دیا تھا۔ شمال مغرب کے سلسلۂ کوہ پر ایک ہلکی، لطیف سی دُھند چھائی ہوئی تھی، صنوبر، کاؤ اور دیودار کے گھنے درخت اسی سپید دھند کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ پہاڑی کے قدموں میں یوکلپٹس کے درختوں کا ایک بڑا سا جھنڈ کھڑا ایک لمبے سے کھیت پر سایہ کر رہا تھا، کھیت کے درمیان ہل میں جُتے ہوئے دو بیل تھے اور اتنی بلندی پر سے دو خوبصورت کھلونوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

میں نے ان دو بیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے تالاب کے چوکیدار سے کہا، "فیروز بہت افسوس ہے، بہت ہی افسوس ہے جب ہم نے یہ منحوس خبر سُنی، جب ——ہاں، پرسوں شام کو میں ڈاکٹر ساجد کے ہاں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے مجھے بتایا کہ فیروز کا لڑکا تالاب میں ڈوب کر مر گیا، کیا بتاؤں یہ سُن کر کتنا رنج ہوا، اسی وجہ سے ہم سب (اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے) کل یہاں تیرنے کو نہیں آئے تھے، ایک دو بار جی میں آیا کہ چلو چلیں، شاید ہماری چند رسمی باتوں سے تمہارے دل کو کچھ تسکین پہنچ سکے، مگر ہماری طبیعتیں ہی کچھ اس قدر افسردہ اور رنجور سی ہو گئی تھیں کہ ادھر پاؤں ہی نہ اُٹھ سکے۔"

فیروز نے چنار کی ایک ٹہنی کا سہارا لیتے ہوئے کہا "ٹھیک کہتے ہو، بابوجی، کل میں سوچتا تھا کہ بابوجی کیوں نہیں آئے۔ میں غریب تو ہوں، مگر پھر بھی مجھے اُمید تھی کہ آپ ضرور افسوس ظاہر کرنے آئیں گے اور میری ڈھارس بندھائیں گے۔"

جگدیش بولا "بس یہی بات تھی (میری طرف اشارہ کر کے) جو انہوں نے بیان کر دی۔"

دت نے کہا، "ہاں، ہاں، اور بھلا نہ آنے کی اور کیا وجہ ہو سکتی تھی۔"

سرجیت نے پوچھا۔ "مگر یہ ہوا کیسے؟"

فیروز نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "یہ کیونکر بتاؤں کہ یہ کیسے ہوا؛ کس طرح میرا ننھا مُنا لال آنکھوں دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں ابھی تک اِس امر کو سمجھ نہیں سکا کہ اُسے موت کیونکر آ گئی، بھلا یہ بھی کوئی موت ہے، اگر اُسے مرنا بھی تھا تو

پہلے بیمار ہوتا، پھر میں اُس کا علاج کرتا، اُسے ڈاکٹروں، حکیموں، عطائیوں، پنساریوں کے پاس اُٹھائے اُٹھائے پھرتا، اُن سے ہاتھ باندھ کر عرض کرتا، خدارا میرے بچے کا اچھی طرح علاج کرو، ہم دونوں میاں بیوی بیماری کی راتیں جاگ جاگ کر کاٹتے، سارا دن اُس کے سرہانے بیٹھے رہتے، اُس کی ذرا ذرا سی فرمائش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے، وہ کتنے ہی دنوں سے ربڑ کا کھلونا مانگ رہا تھا، ہائے میں نے اُسے کیوں نہ لا کر دیا۔ میں نے اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اگلی تنخواہ کے آنے پر تجھے لے دوں گا۔ کیا پتہ تھا کہ جب اگلی تنخواہ آئے گی، میرا بیٹا کھلونا مانگنے کے لئے یہاں موجود نہ ہوگا، دل چاہتا ہے، میں وہ ربڑ کا کھلونا جو اُسے اس قدر پسند تھا خرید لوں اور اپنے بیٹے کی قبر پر جا کر رکھ دوں اور اُس سے کہوں، اُٹھو، بیٹا منظور، تمہارا باپ تمہارے لئے ربڑ کا پیارا سا کھلونا لایا ہے، کیا وہ میری بات نہ سُنے گا بابو جی ؟"

ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے . . . . ہم نے جلدی جلدی کپڑے اُتارے اور غسل کا لباس پہننا شروع کر دیا۔

سرجیت بولا "کے سال کا تھا منظور ابھی دو، ڈھائی، تین سال کا ہوگا، چھوٹا سا تو تھا ہی!"

فیروز بولا "ہاں بابو جی، بس اتنی ہی عمر کا ہوگا، مگر کتنا پیارا بچہ تھا۔ آپ نے دیکھا تھا نا، سانولا سا رنگ موٹے موٹے ہاتھ پاؤں، اس کی ماں سعیدہ نے اُسے کئی تکلیفوں سے پایا تھا، کتنے ہی پیروں، فقیروں سے گنڈے تعویذ لئے، منتیں مانیں، تب جا کر گھر کا لال ہاتھ آیا۔ یہ پتہ نہ تھا کہ اتنی جلدی ہمیں جدائی کا داغ دے جائے گا، بس حیرت ہے تو یہی، ایمان سے کہتا ہوں، بابو جی، میرے کلیجے میں بس یہی ایک ناسور ہے، وہ بیمار ہوتا، میری آنکھوں کے سامنے کمزور ہوتا۔ میری آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کی جھولی میں جان دیتا، پھر میں اُسے کفناتا، دفناتا تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا، مگر یہ کیا ہوا کہ میں یہاں (تالاب کے عین اوپر ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے) اپنے مکان کے صحن میں کھڑا دُور نیچے پگڈنڈی پر جاتے ہوئے اُن خوش باش بے فکر نوجوانوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو گاتے، ناچتے ہوئے بساکھی کے میلہ پر جا رہے تھے۔ یہاں، تالاب میں، غربی سمت پر، چند سکھ لڑکے نہا رہے تھے، اُدھر دوسری طرف چند عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں، منظور کی ماں سعیدہ صحن میں چولہے پر مکی کی روٹیاں پکا رہی تھی۔ منظور اُسی کے پاس کھڑا توتلی آواز میں کہہ رہا تھا، اماں آنی، اماں اوتی، سعیدہ کی ماں کھاٹ پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ پھر پتہ نہیں کس وقت منظور اپنی اماں کے پاس سے اُٹھ کر چلا گیا، کپڑے دھوتی ہوئی عورتوں کی چھوا چھو، نہاتے ہوئے سکھ لڑکوں کے قہقہے، بساکھی کے میلہ کو جاتے ہوئے جاتریوں کا شور و غل، بس ہم نے ان چند منٹوں کے لئے منظور کو اپنے دل سے بھلا دیا، کچھ دیر کے بعد میں نے تالاب کے کنارے سے کسی کو کہتے سُنا، وہ لکڑی سی کیسی تیر رہی ہے، اس کے بعد "ارے" پھر — "یہ تو کسی کی لاش ہے" پھر کسی نے کہا "بچہ!" میں بھاگتا ہوا کنارے کی طرف گیا۔ کسی نے ہاتھ پاؤں کو چھو کر کہا "مر گیا!" (چھاتی پر دوہتڑ مار کر) ہائے!!"

جگدیش ۔ صبر کرو۔ فیروز، صبر کرو!

فیروز۔ بابوجی صبر کروں تو کیسے، آنکھوں کے آگے اُس کی بھولی بھالی صورت ہے۔ اب ہمارے لئے اُس کی یاد کے سوا اور کیا رہ گیا ہے۔ (جیب میں ہاتھ ڈال دیتا ہے) اور یا یہ —— (جیب سے ہاتھ نکال کر) —— یہ پتلی سی مسواک، یہ مسواک اور ایک چھوٹی سی مٹی کی پیالی، میں نے یہ دونوں چیزیں اُس چھوٹی سی نہر کے کنارے پر پائیں جو اس تالاب کو پانی مہیا کرتی ہے، وہ صحن سے اُتر کر نہر کی ان سیڑھیوں کی طرف آیا ہوگا۔ آہستہ آہستہ اُس نے جھک کر مٹی کی پیالی میں پانی بھرا ہوگا، مسواک کو زمین پر رکھ کر اُس نے نہر میں ہاتھ ڈال کر پانی سے کُلی کرنے کی کوشش کی ہوگی، پھر وہ یکایک پھسل گیا ہوگا، پانی میں ہلکا سا شور بھی پیدا ہؤا ہوگا، اُس نے چیخنے کی کوشش بھی کی ہوگی، تالاب کے کنارے تک جاتے جاتے اُس نے ہاتھ پاؤں بھی مارے ہوں گے، مگر آہ، میری آنکھوں نے کچھ نہ دیکھا، نہ کانوں نے سُنا، سوا اُن گیتوں کے جو راہگیر گا رہے تھے: سعیدہ روٹی پکاتی رہی، بڑی اماں کھاٹ پر چائے پیتی رہیں، اور اس نہر کے کنارے ہماری آنکھوں کے سامنے —— ہائے —— ہائے، بابوجی، صبر کیسے آئے؟"

سرجیت۔ یہ مشیتِ ایزدی تھی، اس میں کسی کو کیا دخل، خدا نے تمہیں دیا، اُسی نے لے لیا، تمہارا اُس پر اتنا ہی حق تھا۔

فیروز۔ سچ ہے بابوجی، انسان کیا کر سکتا ہے۔

دت۔ کیسا پیارا بچہ تھا، جگدیش، تمہیں یاد ہے وہ دن، وہ اس نہر کے کنارے اپنی چھوٹی سی قمیص دھو رہا تھا، کتنا پیارا معلوم ہوتا تھا، یاد ہے، میں نے تم سے کہا تھا، اُس وقت کیمرہ ہوتا تو اُس کی تصویر کھینچ لیتے اور انعامی مقابلے کے لئے بھیجتے۔

سعیدہ جو اب تک پاس کھڑی چُپ چاپ سب باتیں سُن رہی تھی اور آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی، بھرّائی ہوئی آواز سے بولی، بابوجی، کنور لوک ناتھ سنگھ جی جو ڈاک بنگلے کے قریب ایک کوٹھی میں رہتے ہیں اُنہوں نے ایک بار منظور کی تصویر کھینچی تھی، منظور نے کئی بار اُن سے وہ تصویر مانگی ہے مگر وہ دیتے نہیں، اگر آپ اُن سے کہیں تو ——

جگدیش بولا، بہت اچھا، سعیدہ، میں ضرور اُن سے کہوں گا، اُمید ہے وہ تصویر دے دیں گے۔

× × × × ×

اب ہم سب غسل کا لباس پہن کر تالاب کے کنارے پر پہنچ چکے تھے، تالاب کی وسیع چادرِ آب ہمارے سامنے تھی جس پر کہیں کہیں نیلوفر کے پھول کھلے ہوئے تھے، میں ہاتھ پھیلا کر ایڑیاں اُٹھا کر غوطہ زن ہونے کو تھا کہ سرجیت نے آہستہ سے میرے کان میں انگریزی زبان میں کہا، "پیچھے دیکھو!"

میں نے مُڑ کر دیکھا، چنار کے درخت کے قریب جنگلی گلاب کی بیلوں کے درمیان ایک لڑکی کھڑی تھی، سرو کی طرح خوش قامت اور جنگلی گلاب کے پھول کی طرح خوب صورت اور نازک اندام، اُسکی دونوں کلائیاں اُوپر اُٹھی ہوئی تھیں اور سر پر رکھی ہوئی مٹی کی گاگر کو تھامے ہوئی تھیں۔ سعیدہ اُس کے پاس کھڑی اشاروں میں اُس سے کچھ کہہ رہی تھی، وہ کتنی نازک کتنی خوبصورت تھی۔ بانکے،

ترچھے، دلاویز نقش، کیا ایک عورت بھی اس قدر حسین ہو سکتی ہے۔ مجھے احساس ہوا، یہ عورت نہیں چغتائی کی ایک تصویر ہے۔

میں نے سرجیت سے پوچھا، یہ کون ہے؟

سرجیت نے استعجاب ظاہر کرتے ہوئے کہا "تم نہیں جانتے، یہ کون ہے، حیرت ہے، یہ ایک کمہاری ہے اور پرے، تالاب کے اُس پار (اُنگلی سے اشارہ کر کے) وہ جو گھر ہے نا، کچا سا، وہاں رہتی ہے، سب جج صاحب کا لڑکا جو یہاں نہانے کے لئے آیا کرتا ہے نا، اُس نے اس کا نام "تالاب کی حسینہ" رکھ دیا ہے۔"

"تالاب کی حسینہ ـــــ تالاب کی حسینہ ـــــ" میں نے دُہراتے ہوئے کہا، "اچھا تو یہ سعیدہ اسے کیسے اشارے کر رہی ہے؟"

"بیچاری غریب لڑکی گونگی ہے نا۔"

"اوہ ـــــ" میں نے آہستہ سے کہا یکایک میرے دل میں خیال آیا، یہ لڑکی گونگی ہے، یہ تو بہت ہی اچھا ہے، کیا کسی نے چغتائی کی تصویر کو بولتے دیکھا ہے، اگر تصویر، خاموش تصویر بول اُٹھے، تو اُس کی آدھی شعریت، رنگینی اور سحر پروری فنا ہو جائے، کاش دُنیا کی تمام حسین عورتیں گونگی ہوتیں۔"

ہم سب کی نظریں اپنی طرف گڑی دیکھ کر وہ لڑکی حیران سی ہو گئی، اُس نے اپنی بڑی بڑی وحشی ہرنیوں والی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا، وہ گھبرا کر ٹھٹک سی گئی، اُس نے اپنا رُخ ہماری طرف سے پھیر لیا۔ کانوں میں پڑے ہوئے موتیا کے آویزے یکایک سُورج کی کرنوں میں چمک اُٹھے۔ اُس نے سعیدہ کی طرف دیکھ کر سر کو ایک خفیف سی جنبش دی، مٹی کی گاگر میں ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا، پاؤں کی جھانجنیں بجنے لگیں، ساکن تصویر میں زندگی کی لہر دَوڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر سے نیچے اُترنے لگی۔

میں نے یکایک کہا "تم جانتے ہو سرجیت! ہندوستانی رقص کی ایجاد کیسے ہوئی؟"

"نہیں۔ کیوں؟"

میں نے پگڈنڈی پر نیچے اُترتی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا، وہ دیکھو، ایک مٹی کی گاگر اُٹھائے ہوئے دوشیزہ، اور ٹخنوں پر بجتی ہوئی روپہلی جھانجنیں، یہی ہندوستانی رقص کی ابتدا اور انتہا ہے!

جگدیش نے ہنستے ہوئے کہا، "میرا خیال ہے تم اس غریب لڑکی کو نگاہوں سے نگل جاؤ گے، کیسی گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہو، اب نہاتے بھی ہو کہ دوں میں تمہیں پانی میں ایک غوطہ۔"

اتنا کہہ کر جگدیش نے شانے پھیلا کر، ایڑیاں اُٹھا کر، ہوا میں ابابیل کی طرح ایک زقند بھری اور دوسرے لمحہ میں وہ پانی میں دھم سے غوطہ زن ہو گیا۔

اس کے بعد دھم، دھم، دھم، ہم سب پانی میں کُود پڑے، اور فضا بلند قہقہوں سے معمورہ ہو گئی، سطح آب پر بازوؤں کے تیر تیز

چہچہا چل رہے تھے، ایک دوسرے پر پانی اُچھالا جا رہا تھا، نیلوفر کے پھول توڑ توڑ کر ایک دوسرے کی طرف پھینکے جا رہے تھے، دت بار بار مُنہ میں پانی بھر کر زور زور سے کُلّیاں کرتا تھا، سرجیت کو تیرنا کم آتا تھا اس لئے وہ سب سے الگ تھلگ آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں مار کر تیرنے کی مشق بہم پہنچا رہا تھا، جگدیش اُس کے قریب گیا اور اُس کے سر کو اپنے بازوؤں میں تھام کر پیار سے بولا، این دفتر بے معنی، ر ایک ڈبکی لے کر، غرق مئے آب اولے! سرجیت چلّانے لگا، کنارے پر فیروز کھڑا افسردہ نگاہوں سے تالاب کے پانی کی طرف دیکھ رہا تھا

× × × × ×

× × ×

× ×

×

فیروز کی اُداس نگاہیں میرے دل میں ایک عجیب خلش پیدا کر رہی تھیں۔ تیرتے تیرتے میں نے سوچا کہ اس زندگی کے بلبلیں تالاب میں ہمیشہ یونہی ہوتا رہے گا، یہاں ہنسی کی لہریں ہیں، اور موت کے چھینٹے بھی، اور پھر کبھی کبھی کوئی خوبصورت کُمہاری ......

کرشن چندر ایم۔ اے

ہوا باز کا ترانہ

میں اپنی فطرتِ بلند کی طرح ایک اُڑان میں پستیوں سے بلندیوں میں پہنچ جاتا ہوں
میرے نورانی شہپر ایک ہی پرواز میں تمام وسعتوں کو پیر جاتے ہیں
خلائے آسمانی میری اُلٹی ترچھی زقندوں کی بازیگاہ ہے
اور میری دھیمی دھیمی گنگناہٹ علوی سیرگاہوں کا ارغنوں

میری نگاہ ہر وقت مائل بہ رفعت ہے
میری ہمت ہر وقت بلندیوں کے ہمالے تلاش کرتی رہتی ہے۔
میرا قدِ درازان ہمالوں کو دیکھ کر درازتر ہو جاتا ہے۔
اور میری نظر ان ٹھنگنے بونے انسانوں پر بھولے سے بھی نہیں پڑتی۔

میں نے اپنی ناپیداکنار فضاؤں کو سمندروں اور بحیروں اور ملکوں میں تقسیم نہیں کیا۔
نہ یہاں بحرالکاہل ہے نہ بحیرۂ روم نہ ایبے سینیا
میرے ہاں ارتقاء پسند فطرت کا فطری ارتقاء ہے
اور ہم آہنگ وسعتوں میں ہم جنس مخلوق کا ارتباط

میری معراجِ کمال کسی رفیق کار کی پرواز کا آغاز ہوگا۔
اور میرا دل ابدی سماوی مسرتوں سے جلوہ زار بن جائے گا۔
ہمارا مقصود رفعتوں کا ہے
اور ہماری بیتاب فلک پیمائی کسی بلند اختر کو وہاں دیکھنا چاہتی ہے۔

اے خشکیوں اور ... ماؤں کے اسیرو
آؤ اور ازل اور ابد کا سنگم دیکھو
آؤ اور بلندیوں سے پستیوں کا مشاہدہ کرو
ہماری منزل کس قدر غیر فانی مسرتوں سے بُقعۂ نور بنی ہے!

عبدالغنی بی۔ اے

غزل

کیا تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زُلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصوّر کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گُل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دِل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے، اب اُن کی جفا کو کیا کہیے
اِک نشترِ زہر آگیں رکھ کر، نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

مجاز

ہندی کی شائستہ ترین صورت

بول چال کی زبان

زبانِ ہند کو صحیح طور سے پرکھنے کے لئے اس مضمون کا پہلا حصّہ اصُولی حیثیت پر ہر طرح کافی ہے۔ ثابت ہو چکا کہ زبانِ ہند اپنا نشان خود بتاتی ہے۔ اپنے متعلق اعتراضات خود رفع دفع کرنے کی طاقت رکھتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معترض کو خود اس کا قائل ہو جانا پڑتا ہے۔ اعتراض کے لئے جو دلیلیں آج گھڑی جاتی ہیں کل مخالفین کی زبانوں ہی سے غلط ہو جاتی ہیں۔ وہ تعجب کرتے ہیں کہ راشٹر بھاشا کی ہم نے جتنی کسوٹیاں ایجاد کیں۔ اُن پر اُردو ہی صحیح اُترتی ہے۔ اب حقیقت کو جان کر اور سمجھ کر وہ محض اپنی بات کی پچ کر رہے ہیں۔ اُردو کو ہندوستانی تسلیم کرنے میں بھی یہی دشواری ہمارے بھائیوں کے راستے میں حائل ہے۔ وہ اُردو بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں مگر جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو (لیکن) کا لفظ قلم سے نکل جانے کے بدلے پرنتو اور یا کی جگہ اتھوا لکھنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اُن کا دعویٰ غلط ٹھہرجاتا ہے۔ ہندی میں لکھی ہوئی تحریر اُردو ہوئی جاتی ہے۔ اب وہ اُردو سے دامن چھڑا کر بھاگ رہے ہیں۔ پہلے نام سے گھبراہٹ تھی، ہندوستانی نام قرار پایا۔ پھر ہندی کی طرف لوٹے، پھر نئے نام کی ضرورت ہوئی اور ہندی اتھوا ہندوستانی کا شاخسانہ کھڑا ہُوا۔

ہندوستانی۔ زبانِ ہند (اُردو یا ہندوستانی) زبردستی رائج کرنے اور پروپیگنڈے سے نئی شکل اختیار نہیں کرے گی۔ بندھوے بنیوں سے مینا بازار نہیں لگتا۔ تلوں کی کوٹھی میں بند کرنے سے گورا کالا نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانی ایک شکل رکھتی ہے وہ تشکیل کیلئے پروپگنڈوں کی محتاج نہیں ہے۔ یہ کتنا غلط ہے کہ اس کا ادب نہیں تھا۔ موسیو گارساں دتاسی کے خطبات میں ہندوستانی ادب کے بیشمار ذخیروں کے حوالے ملیں گے۔ اس کی شکل وہ ہے جس میں گرام سدھارک، صفائی کا انسپکٹر، وکیل، بیرسٹر، اسکاؤٹ آرگنائزر اپنے خیال کی اشاعت کرتا ہے، یعنی ان لوگوں کی زبان جن کو کام سے کام ہے جو چاہتے ہیں کہ ہماری بات بلا وقت سمجھ لی جائے جن کا مقصد یہ نہیں کہ ان کو لوگ کھری ہندی کا وِدوان سمجھیں۔

بزّازوں کی زبان، موچی کی زبان، سیٹھ ساہوکاروں کی زبان، خوانچے والوں کی زبان، ہمیں بتاتی ہے کہ موجودہ ہندوستان کی زبان کیا ہے۔ یہ مانا کہ ان کی زبان کو ادبی زبان نہیں کہہ سکتے۔ مگر زبانِ عام اور ادبی زبان کے ڈھانچوں میں فرق مطلق نہیں ہوتا مزاج بھی یکساں ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ادبی زبان میں سادہ لفظوں کے بدلے ادبی لفظ زیادہ ہوتے ہیں۔ استعارے تشبیہیں

آ کے اسے ادبی زبان بناتی ہیں۔ ہمیں باشندگانِ ہند کے مختلف طبقوں کی زبانوں کو الگ الگ بغور دیکھنا چاہیئے۔

اوّل اوّل ان بچوں کی گفتگو پر غور کریں جن کے لیے ہندوستانی بننے والی ہندی کی ایجاد ہو رہی ہے[1]۔ یہ معصوم ہیں۔ ان پر تعصب کا رنگ نہیں چڑھا ہے۔ میں اس معاملہ میں اپنا تجربہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں دس سال سے ورنیکولر اسکول کا ٹیچر ہوں۔ مجھے پرائمری درجوں سے لے کر مڈل کے ساتویں درجہ تک کے لڑکوں سے کام پڑتا ہے۔ اُردو، ہندی، حساب، جغرافیہ، تاریخ مختلف زبانوں کی تعلیم میں مجھے ہمیشہ ہندوستانی زبان اختیار کرنی پڑی ہے۔ جس کو دونوں طرح کے طلبہ سمجھ سکیں۔ اس موقع پر میں چھوٹی جماعت درجہ سوم، چہارم کے بچوں کی گفتگو ٹھیک ٹھیک اُنہیں کے لفظوں میں درج کرتا ہوں کیونکہ اس درجہ تک ان کی زبانِ عام کی ریڈریں ایک مطلب اور ایک مضمون کی قریب قریب ایک ہی زبان میں ہیں۔

دو لڑکوں کی گفتگو

رام پیارے۔ مولوی صاحب! غلام محمد ہمیں راستے میں گالی دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اگر نالش کرو گے تو خوب پیٹوں گا۔

میں نے پکارا — غلام محمد، یہاں آؤ اور وہ آتے ہی اپنا بیان دینے لگا۔

غلام محمد۔ مولوی صاحب! ایک روز یہ گھر سے پڑھنے چلے مگر اسکول سے غیر حاضر تھے۔ میں نے آپ کو خبر کر دی تھی جس سے مجھے کمینہ، چغلخور کہتے ہیں۔ اور دشمنی سادھ کر آپ سے جھوٹ جھوٹ نالش کرتے ہیں تاکہ میں بھی سزا پاؤں۔

جگناتھ۔ مولوی صاحب! غلام محمد کا قصور ہے۔ رام پیارے صحیح کہتے ہیں۔ ان کو (غلام محمد کی طرف اشارہ کر کے) جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔

ہنسراج اور دکھی۔ مولوی صاحب! غلام محمد سے ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ اس کے آگے ہم لوگ پیش نہیں پاتے۔

رام پیارے، دکھی اور جگناتھ ہندی پڑھنے والے طلبہ ہیں۔ ان کی زبانوں پر عادت، صحیح، نالش کے لفظ بے تکلف آتے ہیں ایسے ہی ہلکے لفظ ہیں جن کو فارسی و عربی سمجھ کر سمجھنے میں مشکل اور دقت بتلا کر (ہندی پڑھنے والوں کے لئے) ہندی کی کامن ریڈروں سے الگ کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ اصلیت کے بالکل خلاف اُردو ہندی کامن ریڈروں (بول چال کی زبان) کا معیار ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی ایم۔ اے کی تصنیف کی ہوئی کتاب اونکار ریڈر سے بخوبی معلوم ہوگا۔

اُردو ایڈیشن	ہندی ایڈیشن
اونکار تعلیمی سلسلہ	اونکار شکشا مالا
اونکار ریڈر	اونکار ریڈر

---

[1] جب بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس منعقدہ ۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو عبدالحق صاحب نے گاندھی جی سے پوچھا کہ ہندی اتھوا ہندوستانی کے کیا معنی تو گاندھی جی نے کہا وہ ہندی جو آگے چل کر ہندوستانی بننے والی ہے۔ (رسالہ اُردو۔ اپریل ۱۹۳۶ء)

تیسری کتاب

مصنفہ ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی، ایم اے، ڈی ایس، لندن سائنٹی

اُردو عبارت

زبان نے سوچا اس طرح دب کر رہنے سے مرنا ہی اچھا ہے۔ مجھ کو کمزور دیکھ کر دانت ہمیشہ ستایا کریں گے۔ وہ بھی بدلا لینے کی گھات میں رہی۔ ایک دن ایک پہلوان کہیں سے آگیا۔ اس کو دیکھ کر زبان بہت خوش ہوئی اور سوچنے لگی کہ بدلا لینا چاہیئے۔ اس نے پہلوان کو گالی دینا شروع کیا۔ پہلوان کو غصہ آگیا۔ اس نے مُنہ پر ایسا گھونسا مارا کہ چار دانت ٹوٹ گئے۔ اور کئی ہل گئے۔ زبان نے دانتوں سے کہا۔ اپنی کرتوت کا نتیجہ دیکھا۔ شیخی مارنے اور دوسروں کے ستانے کی یہی سزا ہے۔ ہم تم ساتھ کے رہنے والے ہیں۔ اس لئے مل کر رہنا ہی اچھا ہے۔ جھگڑا کرنے میں میرا اور تمہارا دونوں کا نقصان ہے۔

تیسری کتاب

ہندی عبارت

جیبھ نے سوچا کہ اس طرح دب کر رہنے سے مرنا ہی اچھا ہے۔ مجھ کو نربل دیکھ کر دانت ہمیشہ ستایا کریں گے۔ وہ بھی بدلہ لینے کی گھات میں رہی۔ ایک دن ایک پہلوان کہیں سے آگیا۔ اس کو دیکھ کر جیبھ (जीभ) بہت پرسن (प्रसन्न) ہوئی اور سوچنے لگی کہ بدلا لینا چاہیئے۔ اس نے پہلوان کو گالیاں دینا شروع کیں۔ پہلوان کو کرودھ (क्रोध) آگیا۔ اس نے ایسا گھونسا مارا کہ چار دانت ٹوٹ گئے اور کئی ایک ہل گئے۔ جیبھ نے دانتوں سے کہا۔ اپنی کرتوت دیکھا۔ شیخی مارنے اور دوسروں کے ستانے کا یہی پھل ہے۔ ہم تم ساتھ کے رہنے والے ہیں اس لئے مل کر رہنا ہی اچھا ہے۔ جھگڑا کرنے سے میری اور تمہاری دونوں کی ہان (हानि) ہے۔

اب ملاحظہ فرمائیے ایک ہی مطلب کو دونوں عبارتوں سے ۱۱۸ لفظوں میں ظاہر کیا گیا، ۱۱۳ لفظ مشترک ہیں۔ صرف پانچ لفظوں میں فرق ہے۔ جس سے زبان کی شکل کیا بدلے گی۔ سننے والا جب تک اُسے دکھایا نہ جائے تمیز بھی نہیں کر سکتا کہ دونوں میں کچھ فرق ہے ہندی عبارت میں زبان کے بدلے جیبھ آیا ہے۔ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ زبان، ناک، کان، مُنہ سب لڑکے سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح نربل بجائے کمزور کے لکھنا بیکار ہے۔ کمزور ہندی والے کے لئے اسی طرح سہل ہے جس طرح اُردو کے طالب علم کو کرودھ، پرسن کو ہندی کے طالب علم غصہ، خوشی سے مشکل سمجھتے ہیں۔ اگر کسی بچے سے آپ پوچھئے کرودھ کیا؛ وہ فوراً کہے گا غصہ۔ پرسن کا بھی یہی حال ہے۔ پرسن کے مقابلہ کا وہ لفظ جو اُردو ریڈر میں آیا ہے یعنی "خوشی" اس سے بچے شاید اُسی وقت سمجھنے لگتے ہیں۔ جب وہ بولنے اور باتیں کرنے لگتے ہیں، پس صاف ظاہر ہے کہ خوش "کمزور" ہندوستانی زبان کے لئے عام ہے۔ یعنی بول چال کی زبان سے باہر نہیں ہے اور کامن ریڈر سے جو بول چال کا معیار ہے خارج کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اب صرف دو لفظ رہ جاتے ہیں۔ یعنی پھل اور ہان، اس کو ہندی سے مخصوص کرنا ٹکسالی اُردو سے بے خبری ہے۔ اُردو میں ہزار موقعوں پر ہان، لابھ، پھل، پھلاری بولا جاتا ہے۔

پھل نتیجہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح نتیجہ اور نقصان سے گنوار و شہری سبھی واقف ہیں۔ صاف ظاہر ہے ہماری بول چال کی زبان میں ایک نقطہ کا بھی فرق نہیں ہے۔ محض لکھاوٹ (رسم الخط) کے فرق سے دو زبانیں نہیں ہوسکتیں۔ زبان اپنے ذخیرہ الفاظ، قواعد صرف و نحو (ویاکرن) کی بنا پر مختلف قرار دی جاتی ہے۔ تعجب ہے کہ افعال ایک حروف عامل (उभयान्वय) ایک، علامات ایک، نشانات بھی ایک اور زبانیں دو!!

"بہت سے عربی فارسی کے شبدوں کا پریوگ (استعمال) اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب ان کے استھان سنسکرت یا پراکرت کے پرائے باچی (مرادف الفاظ) شبد ڈھونڈ رکھے جائیں۔ تو یا تو کچھ ارتھ ہی نہ نکلے گا یا بھاشا اتنی کٹھن ہو جائے گی کہ سرب سادھارن (عام پبلک) تو کیا شکچھت ہندو بھی کٹھنتا سے سمجھ سکیں گے۔ جیسے مزدور، وکیل، قلم، دوات سیاہی، مسخرہ، نصیحت، چادر، صورت، طوطا، پرجلاب، گلاب ہتنگ، زین، رکاب، نال، کرنل، جہاز، پستول، پردہ دالان، تنخواہ، سہی، (صحیح) غلط، تازہ، رسد، کاریگر . . . . . .

اوپر کے شبدوں کے برائے باچی (مرادف الفاظ) سنسکرت میں اوشیہ ہیں، پر ہندی میں ان کا پریوگ بند ہوگیا ہے۔ اب پائل کے استھان پر گلاب نے ادھیکار جما لیا ہے"۔

(ہندی سنکشپت اتہاس صفحہ ۵، مصنفہ پنڈت رام نریش ترپاٹھی)

میری دلیلیں شخصی نہیں ہیں۔ ہندی داں اور اردو جاننے والا ہر ایک اسے پیش کرتا ہے اور اردو سے ہندی الگ ثابت نہیں ہوتی، مزید وصاحب کے لئے، پنڈت رام نریش ترپاٹھی کی رائیں ان کی تصنیف مذکورہ بالا سے پھر نقل کرتا ہوں جو ہندی کے زبردست پرچارک ہیں۔

"اردو ہندی میں صرف اتنا ہی انتر ہے کہ ہندی ناگری (رسم الخط) میں لکھی جاتی ہے اور سنسکرت شبدوں کی بہلتا (بہتات) ہوتی ہے۔ اردو فارسی (رسم الخط) میں لکھی جاتی ہے۔ اور اس میں عربی و فارسی کے شبدوں کا ادھکتا رہتی ہے . . . . . ." (صفحہ ۷، ہم بحث ہندی اردو)

مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہی یہاں کی بھاشا میں عربی و فارسی، ترکی شبد پرچلت (رائج) تھے، یہ بات چند بردائی کی کبتا سے اسپشٹ (صاف معلوم) ہوتی ہے۔ جب مسلمانوں کا سنسرگ (تعلق) اس دیش میں بڑھا تو اُن کی بھاشا کے بہت سے شبد ہماری بول چال میں آگئے۔ بول چال کے سمجھنے کے سبھیتے کے لئے ہندو مسلمان دونوں نے ہندی میں عربی و فارسی کے شبدوں کو ملنے دیا۔ شاہ جہاں کے وقت میں مشبرت بھاشا کا نام اُردو پڑگیا . . . . . اس کا پرانا نام ریختہ بھی ہے . . . . . . " ہندی کا سنکشپت اتہاس صفحہ ۶۵)

اس سلسلہ کی ایک دلچسپ بات عرض کرنا چاہتا ہوں، میرے کلاس کے ہندی طلبہ نے اپنی ریڈروں کے مشکل لفظوں کے سمجھنے کا آسان طریقہ نکالا ہے۔ وہ میری توضیح کا انتظار نہیں کرتے ہیں بلکہ کسی اُردو طالب علم سے اس کے مقابل کا لفظ پوچھ لیتے ہیں۔ اُردو ریڈر میں لکھا ہوٗا لفظ ان کے لئے معروف ہوتا ہے۔ اس لئے موقع استعمال سے سمجھنے کے بجائے بدل الفاظ کو سہل تر سمجھتے ہیں۔ عبارت مذکورہ بالا میں کسی ہندی طالب علم کو کرودھ کا لفظ سمجھنا ہے۔ وہ پوچھتا ہے بھائی متین اپنی کتاب کھولو، جہاں میں پڑھتا ہوں تم بھی پڑھو، جب سب عبارت مطابق ہوتی جاتی ہے اور اُردو طالب علم "غصّہ" پر پہنچتا ہے تو ہندی طالب علم سمجھ لیتا ہے کہ کرودھ و غصّہ ایک چیز ہے۔ اسی طرح ہندی طالب علم ریڈر میں آئے ہوئے ان گنے لفظوں کو سمجھ لیا کرتے ہیں۔ میں نیچے چند اسباق سے ایسے لفظوں کو چھانٹ کر ان کے مقابل اُردو ریڈر کے الفاظ لکھتا ہوں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ بول چال کے لئے ٹکسالی ہونے کی کسوٹی پر ان دونوں قسم کے الفاظ میں سے کون رکھنے کے قابل ہے۔

ہندی ریڈر		اُردو ریڈر		ہندی ریڈر		اُردو ریڈر
سادھارنتر	साधारण	معمولی	(سبق ۹)	اہو بھاگیہ	अहोभाग्य	خوش قسمت
رُچی	रुचि	شوق		اگیان	अज्ञान	حکم
کر	कर	محصول	(سبق ۱۰)	سواستھیہ	स्वास्थ्य	تندرستی
پرشنسا	प्रशंसा	تعریف	(″ ۱۱)	پریکشا	परीक्षा	آزمائش
شترو	शत्रु	دشمن	(″ ۱۲)			

اسی طرح اُردو کامن ریڈر پڑھنے والا ہر ایک طالب علم اپنے ہندی خواں دوست کا کام چلاتا ہے۔

شاید غلط فہمی ہو کہ میں اُردو سے ہندی کے اسماء خارج کرنے کی رائے دے رہا ہوں، ہرگز نہیں، ان حوالوں کا مقصد صرف یہ ہے، جب بول چال کی زبان ایک ہے اور جو الفاظ سہل ہیں، جن کا چلن ہے، اُن کو اُردو یا ہندی سے خارج کیوں کیا جائے۔ وہ تعداد میں کتنے ہی کم ہوں مگر ایک روز بول چال کی زبان میں وسیع خلیج پیدا کر دیں گے۔

پس ہماری بول چال کی مشترک زبان ایک ہے اس میں شبہ نہیں رہا۔ پھر ادبی زبانیں دو کیوں؛ اور کیسے ہو گئیں یہی چند الفاظ جو بطور دال میں نمک تھے۔ جنھوں نے کامن ریڈر میں بھی اُردو و ہندی کی تمیز پیدا کی، جنھوں نے وہی عمل کیا جو ایک نقطہ پر ملنے والے زاویہ کے بنانے والے دونوں خطوط کرتے ہیں۔ انہی کی بنا پر

آج اُردو، ہندی ایک دوسرے سے اتنی ہی دور ہوتی جاتی ہیں،

جتنی یہ آگے بڑھتی جاتی ہیں +

ہندی ادبی زبان

ہندی کامن ریڈر

اُردو کامن ریڈر

اُردو ادبی زبان
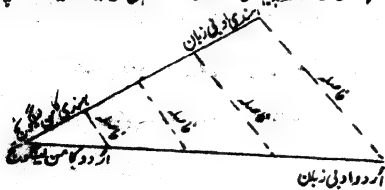
بول چال کی زبان کا حال جو مدرسوں میں ہے ۔ اچھی طور پر واضح ہو گیا ۔ ثابت ہو گیا اگر ہم ہندی کو اُردو سے الگ کرنے کا ارادہ نہ کریں تو جس طرح زبان سے ایک طرح کی زبان کام میں لائی جاتی ہے ۔ اسی طرح تحریر میں قلم سے بھی نکلے گی اور اگر ارادہ ہی کچھ اور ہے تو ساری بحث ، ساری دلیلیں بے کار ہوں گی ۔ سوتے کو جگانا آسان ، اور جو جاگتے ہوئے سویا ہُوا بن جائے گا ۔ وہ ڈنڈوں کی چوٹ سے بھی نہ جاگے گا

اب ناظرین سے ان لوگوں کی باتوں کے سُننے اور غور کرنے کے لئے میں التجا کرتا ہوں جو اپنے کسی مقصد کے پُورا کرنے کی غرض سے بولتے ہیں ۔ محض تفننِ طبع یا زورِ طبع دکھانے کے لئے نہیں ۔ جو اپنا خیال سمجھانا اور ذہن نشین کرنا مقصدِ اوّل سمجھتے ہیں اور شانِ ادبیت یا زورِ قلم دکھانے سے ان کو سروکار نہیں ہے ۔ مثلاً اصُولِ صحت کو سمجھانے والا ڈاکٹر گرام سدھارک ، اسکاؤٹ آرگنائزر ، وکیل ، مختار ، تجارتی ، پروپیگنڈسٹ ، پان ، بیڑی ، سگرٹ اور دیگر خوانچے والے ۔ میں تین سال سے اس جماعت کی زبان کا مطالعہ کر رہا ہوں جو درحقیقت عملی زندگی میں کام آنے والی ہے اور درحقیقت ہندوستانی کہلانے کی مستحق ہے ۔ جو فارسیّت سے اتنی ہی دُور ہے جتنی کہ سنسکرت کے شبدوں کی بھرمار (ہندی) سے ۔ حفظانِ صحت کے متعلق ڈاکٹر جو کچھ کہتا ہے ، اس میں بیماری کے بجائے اسوستھ (　　　　) دوا علاج کے بجائے آوشدھی (　　　　) ، ترکیب کے بجائے اُپائے (　　　　) ، استعمال کے بجائے سیون (　　　　) کہیں سننے میں نہیں آتا ہے ۔ سارے لیکچر میں آپ مشکل سے ایک دو لفظ دے سکیں گے جو سنسکرت اصل (　　　　) سے ہوں ۔ اسکاؤٹ آرگنائزر کو بھی اپنے کام سے کام ہے ، وہ کام کی باتیں کرتا ہے ۔ ہوا میں لفظوں کی پھلجھڑی اُڑانا اس کا مقصد ہرگز نہیں ہے ۔ اس کے سامنے ہر قسم کے لڑکے اور ہر قسم کے لوگ ہیں وہ عام زبان استعمال کرتا ہے ۔ ان لوگوں کی زبان میں جہاں تک ہندوستانی ہوتی ہے ۔ وہ اپنے خیال کی اشاعت میں اتنے ہی کامیاب ہوتے ہیں ۔ اور اس کے خلاف عمل میں جو دقتیں ہوتی ہیں ، اُنہیں ہندوستانی اسکاؤٹ آرگنائزر صاحب بخوبی جانتے ہیں ۔ ہندوستان کے چیف اسکاؤٹ پنڈت ہردے ناتھ کنسرو کی زبان اور اس کا جو غیر معمولی اثر پڑتا ہے اس کو میں مثال میں پیش کرتا ہوں ۔

بزازوں ، دکانداروں کی گفتگو سرتاسر ہندی سے مختلف ہے ۔ میں اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں کہ وہ کس زبان میں گفتگو کرتے ہیں مگر یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی گفتگو جو زبانِ عوام کا درجہ رکھتی ہے ہندی اور وہ ہندی ہرگز نہیں ہے ، جس کا بھارتیہ ساہتیہ پریشد اعلان کر رہی ہے ۔ نیچے میں ایک مارواڑی بزاز کی گفتگو ایک گاہک سے ہو بہو نقل کرتا ہوں جس کو میں نے آج ہی سُنا ہے ۔

"بابو آپ کے خاطر خواہ کپڑا دوں گا نفع کا کیا سوال ہے ۔ پہلے آپ تو یہ سوال بتلائیے کہ پسند ہے یا نہیں ۔ . . . مرضی کیا ہے : لینا ہے یا نہیں ۔ نہیں تو فضول پریشان کرنے سے کیا فائدہ : (۱۵ راکتوبر ۱۹۳۶ء)

خدارا انصاف کیجئے ۔ کہاں زبردستی رائج کی جانے والی ہندی یہی ہے ۔ موجودہ ہندی میں اس کا ترجمہ کرتا ہوں :-

"شریمان! آپ کے اچھا انسار بستر دوں گا ۔ لابھ کا کیا پرشن ہے ۔ پہلے آپ اپنی رچی تو بتلائیے ۔ تبھ شٹ کیا ہے ؟ بدی لینا ہو

لیجئے نہیں تو بیرتھ بکواس سے کیا لابھ؟!

بہرحال آپ نے دیکھا کہ جس ہندی کا اس قدر شور وغل ہے وہ بزازوں اور پروپیگنڈسٹوں کی زبان پر نہیں چڑھتی۔

خوانچے والوں کا بھی یہی حال ہے۔ پوربی ضلعے جو اس مصنوعی ہندی کے مرکز تبلائے جاتے ہیں۔ وہاں بھی مونگ پھلی، جاڑے کی بہار، چنے مزیدار، مسالے دار کی آواز کانوں میں سنائی دے گی۔ حلوائی بھی، سواد کے بدلے "لذت" کے لفظ کی لذت لیتا ہے۔ تماکو فروش اوٹو دل بہار، خمیرہ خوشبو دار کے اشتہار سے حقے بازوں کو بے چین کرتا ہے۔

ناظرین! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؛ آپ کی زبان آپ کے گرد و پیش نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے ہونٹوں پر ہے، پھر بھی یہ پوچھنا کس قدر ہنسنے کے لائق ہے کہ ہماری زبان کیا ہے؛

دیہاتی اور شہری زبان میں ہمیشہ قدرے فرق و امتیاز ہوتا رہا ہے۔ شہری زبان کو اُردو سے اور دیہاتی کو ہندی سے قریب بتلانا اُصولی غلطی اور مشاہدے کی کوتاہی ہے۔ شہری اور دیہاتی زبان کی ہیئت اور اس کا مزاج (تقریبًا) ایک ہوگا۔ لباس میں اختلاف ہونے سے دیہاتی زبان اور شہری زبان مختلف نہیں کہی جاسکتیں۔ البتہ یہ کہئے کہ ان کے رتبہ اور درجہ میں فرق ہے۔ چیز ایک ہے دیہاتی گنواروں کی زبان ہے۔ اس کے بولنے والے اس درجہ کے لوگ نہیں جس درجہ کے شہری لوگ ہیں۔ تمدن کا فرق زبان پر بھی نتیجہ کی صورت میں نمایاں ہے۔ . . . دونوں میں لفظوں کا سرمایہ ایک طرح کا ہے۔ فارسی و عربی کے لفظوں کا چلن جس کو غلطی سے اُردوپن سمجھا گیا ہے، دیہاتی زبان میں شہر سے کم نہیں ہے۔ سنسکرت لفظوں کی اصلی صورتیں یہاں بھی مشکل سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے وہ سنسکرت کے بدلے ہوئے لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بچوں کے نام پر نگاہ ڈالئے۔ پورن چند بجائے پورن چند، رام رتن بجائے رام رتن اور اسی قسم کے صدہا پائے جاتے ہیں۔ خوشی، ناخوشی، ہنسی، دل لگی، بند مٹھیک، آب و تاب، زور و ظلم، شان بان، ناز نخرہ (نکھرا)، حیلہ حوالہ، آرام (تکلیف)، دُکھ مصیبت، موہ محبت، جادُوگر، بازی گر، زبان، لگام، بندگی وسلام، جندگی (زندگی) موت، شیر ببر، کھوف کھتر (خوف خطر) نجر گجر (نظر گزر)، اور اسی قسم کے بے شمار الفاظ ہیں۔ جو دیہاتی زبان کا دامن بھرے ہوئے ہیں۔ شہری تو خیر اب کسی قدر تکلیف سے مصنوعی ہندی میں اپنے خیال کو تھوڑا بہت شاید ادا کرسکتا ہے (مگر اس عرصہ میں اسے بہت چوکنا رہنا پڑتا ہے) مگر دیہاتی مجبور ہوجائے گا۔ (اُردوپن) فارسی الفاظ اب ہندی میں اس قدر ضم ہوچکے ہیں کہ اپنا مرادف سنسکرت نام کھو بیٹھے ہیں۔ شمالی ہند کے دیہات میں پڑھے لکھے لوگ گوشت، مانس اور ان پڑھ لوگ کلیہ (قلیہ) کہتے ہیں۔ وہ چکتی کے بدلے پیوند، گوسٹھی کے بدلے صلاح، پرمان کی جگہ ثبوت کا لفظ نہایت آسانی سے لاتے ہیں۔ قسم کے موقعوں پر طلاق، حرام کے لفظ کام میں لاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی لفظوں کی ہندی شکلیں انھوں نے ایسی ایسی ڈھالی ہیں، مظہر جان جاناں، میر، انشا، ناسخ و غالب سے بھی نہ ہوسکا۔ مثلاً نریا نا (زور سے شور کرنا)، چلّانا۔ نعرہ کرنے سے بنا ہے۔ دق وقانا (دق کرنے کی تخفیفی صورت ہے) تلاش کیجئے تو تسفید و تاریہ (تسفید و تاریہ)

کی کتنی مثالیں اس دیہاتی زبان میں موجود ملیں گی۔

معاشرتی تمدنی حالت کے مطابق دیہات کی زبان شہری زبان کے ساتھ اسی نسبت سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اگر قانون، مالگذاری، بیدخلی، اخراج کو اسلامی تمدن کا زبردستی رائج کیا ہوا سمجھا جاتا ہے۔ تو فصل گرانی، حیرانی، پریشانی، غلہ وجنس (جنس) نفع ونقصان کس نے ملا دیئے۔ حضرات! یہ زبان صنعتِ الٰہی کا نمونہ ہے، قدرتی چیز ہے۔ اسی بھیر بھاڑ سے کچھ بھی ثابت کرنا مشکل ہے۔ وہ سمندر جو کہ محیطِ عالم ہے ایک پڑیا رنگ سے رنگین کرنا محال ہے۔

جس وقت میں اِن سطروں کو لکھ رہا تھا میرے وہاں کمہاری مٹی کے برتن لئے ہوئے آئی۔ شب برات کا موقع تھا۔ میں نے پوچھا کیوں ری! کتنے تقاضوں کے بعد برتن لائی۔ اس نے اپنی قدرتی زبان میں کہا:- "ہمیں (ہم کو) بڑا سرم (شرم) لگے لا (لگتا ہے) اب بتلائیے شرم کے لفظ سے ہندی کو بچا کر "لاج" لکھنا ایک بات بھی ہے۔ کیونکہ شرم اور لاج لکھے جاتے ہیں، بولے جاتے ہیں۔ مگر نہ معلوم کیوں ہندی کا ایکھک "شرم" کو تجانہ لکھے تو اُسے شرم آتی ہے۔ شاید اس طرح وہ ہندی کی لاج رکھتا ہے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

ادبی زبان (نثر)

ہندوستانی زبان کی بول چال کی صورت مفصل طور پر دکھائی جا چکی۔ بحث ونظر، شہادت، تجربات، ہر طریقہ پر ثابت ہو چکا ہے کہ وہ اپنی ایک صورت رکھتی ہے۔ ہندی کے ودوان اور اُردو جاننے والے ایک ہی طرح بولنے کے لئے مجبور ہیں۔ یہ سب کچھ تو دیکھ لیا گیا، اب اس سوال کا ہونا یقینی ہے کہ کیا بول چال کی زبان ایک ہوتے ہوئے ادبی زبان ایک نہیں ہو سکتی؛ بول چال کی زبان کے ایک ہوتے ہوئے ادبی زبان دو صورتیں کیوں رکھتی ہے؛

جواب میں ہر شخص کو تامل ہوگا "خود کردہ را علاجے نیست"۔ ادبی زبان کی خلیجیں خود ہم نے وسیع کی ہیں۔ ایک فیصدی سے بھی کم الفاظ جو بول چال کی زبان میں بلا ضرورت تبدیل کر کے اُردو ہندی کی شناخت کے لئے تمیز بنے ہوئے ہیں۔ اسی کا یہ پھل ہے۔

بعض حضرات فرمائیں گے کہ ادبی زبان کے لئے چلن کے لفظ کافی نہیں ہیں۔ نازک اور لطیف جذبات کومل بھاؤں کے بیوہار کی سکت اس میں نہیں ہے۔ مگر تجربات خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ اُردو، ہندی کی ادبی تصنیفات ایک دو نہیں سینکڑوں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ہندی میں ہم ادب کی زبان کا کوئی معیار نہیں پاتے (۱) شدھ ہندی (سنسکرت آمیز ہندی)۔ (۲) مشرت ہندی کی تقسیم بھی آپ کے قائم کئے ہوئے معیار کا نباہ نہیں کرتی۔ جب آپ تنقید اور سمالوچنا کرتے وقت بھاشا کی سادگی کو سراہتے ہیں تو شدھ ہندی (جس کو بلا شبہ کٹھن ہندی کہنا چاہئے) کا درجہ مشرت ہندی سے بلند کیوں مانا جائے۔ شدھ ہندی کی شان میں پنڈت

رام نریش ترپاٹھی کے خیالات انصاف پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

"بہت سے عربی و فارسی شبدوں کا پریوگ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب اُن کے استھان پر سنسکرت یا پراکرت کے پرایا باچی (مرادف) شبد ڈھونڈھ کر نکالے جائیں۔ تو یا تو کچھ ارتھ ہی نہ نکلے گا یا بھاشا اتنی کٹھن ہو جاوے گی سرب ساد ھارن (عام لوگ) تو کیا شکشت ہندو بھی کھٹنتا سے سمجھیں گے۔" (ہندی کا سنکشپت اتہاس صفحہ ۵۰)

صاف ظاہر ہے کہ شدھ ہندی کا سمجھنا ایسا مشکل ہے۔ جیسا کہ قدیم کلاسیکل لینگویج کا سیکھنا۔ اس وقت بھی ہندی داں طبقہ شدھ ہندی کے لیکھکوں کے اعداد و شمار کافی بیش نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہو جب بھی یہ شدھ ہندی کے معیاری زبان ہونے کی سند نہیں۔ سمجھنا دوسری چیز ہے اور سمجھا لینا دوسری چیز ہے۔ بنگال اور مدراس میں انگریزی بخوبی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے لکھنے والے بھی کافی ہیں۔ ایک ہی شخص انگریزی کے ساتھ اپنی مادری زبان کا بھی خاصا انشا پرداز ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ لازم نہیں آتا کہ رواج کر دیئے جانے سے اس زبان کو ملکی مان لیا جائے جو قرونِ وسطیٰ میں بھی اس طرح قدامت سے دبی ہوئی نہیں تھی جیسی کہ اب ہے۔ اُنیسویں صدی کی ابتدائی تصانیف پریم ساگر اور سکھ ساگر کی زبان اس وقت کی زبان سے زیادہ صاف اور عام فہم ہے۔ ماننا پڑتا ہے کہ زبان کو سنسکرت آمیز بنانا ماضی کا سُنہرا خواب ہے۔ مصلحتاً با دلِ ناخواستہ قبولیت کا راز بھی اسی میں ہے۔ ورنہ حقیقت تو بس اتنی ہے کہ سنسکرت الفاظ جتنا ہی بھریئے گا زبان اتنی ہی ٹکسال سے باہر ہوتی جائے گی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ باوجود پروپگنڈا پرچار (ناگری پرچارنی سبھاؤں ہندی پرچارنی ناٹک منڈلیوں، ہندی پرچارک سمیلنوں کے سکھا سکھایا کوئی چیلا لکھنے بیٹھتا ہے، اور بابو شیام سُندر داس اور پنڈت رام چندر جیسی شدھ ہندی نویس ہستیوں کا سُمرن کر لیتا ہے، پھر بھی کہیں "تاکہ" قلم سے لکھا جاتا ہے، کہیں "تاہم" "مگر" اور "لیکن"، و، یا، بلکہ" کا شمار نہیں۔ بیچارہ کانٹا چھانٹتا ہے، پرانے دفینے سے پرنتو، کنتو، کمبا، اتھوا نکالتا ہے۔ زندہ سماج میں ڈیڑھ سو سال کے مُردے لا کھڑے کئے جاتے ہیں۔ اس طرح شدھ ہندی کی صورت وجود میں آتی ہے۔ پھر بھی ہندی کے والنٹیروں کو حکم ہوتا ہے کہ اقصائے عالم میں ڈنکے کی چوٹ پکار آؤ کہ ہندی جیوت بھاشا ہے۔ مگر گلا پھاڑنا بے سُود ہوتا ہے جب سامنے سے آ کر کانگریس والنٹیر کا لیڈر شان سے بولتا ہے، نعرہ قومی (اور سب والنٹیر ایک ساتھ) انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

اس وقت میں اپنے ایک دوست کی حالت لکھتا ہوں، آدمی ملنسار اور وطنی جذبات سے پُر ہیں۔ ایک روز کہنے لگے میں نے اپنے چچا کو ایک پتر لکھا ہے۔ آپ کو سناؤں۔ اس خط میں شدھ ہندی کو نہایت مستعدی سے نبایا گیا تھا۔ مجھ کو خط سناتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے مولوی صاحب! آپ ہندی جانتے ہیں۔ سمالوچنا (تنقید) کی درشٹ (نظر) سے دیکھئے گا۔ ایک جگہ بیچارے سے لغزش ہو گئی تھی "لیکن" لکھ گیا تھا۔ اس موقع پر پہنچتے ہوئے بولے "ارے رام رے! لیکن"، نہیں "کنتو" ہونا چاہئے تھا۔" میں ہنس دیا اور کہا "لیکن سے ہرج کیا ہے؟" میرے دوست نے فرمایا کہ شدھ ہندی کی مریادا (منصبِ عزت) سے یہ لیکھ گر جائے گا۔ ہندی کے

وِدوانوں کا یہ مت ہے کہ جو شبد ہماری سنسکرت بھاشا میں ہیں اُن کے بدلے اینہ بھاشا (غیر زبان) کا پریوگ اُچت نہیں۔

یہ خیالات شخصی نہیں عام ہو چکے ہیں۔ انہیں خیالات نے ہندی کی اصلی صُورت کو مسخ کیا ہے۔ یہ ایک طرح کا عدم تعاون ہے، یا سوشل بائیکاٹ ہے۔ اُردو سے جو دُوری برتی جارہی ہے وہ لسانی ضرورت پر نہیں ہے۔

اس قدر ہُشیاری اور مستعدی کے باوجود بھی اصلی زبان سے گریز مشکل ہے۔ جس طرح ہندوستان میں رہ کر انگلینڈ کی ہوا میں سانس لینا ناممکن ہے اسی طرح عصرِ جدید میں زمانۂ قدیم کی زبان کا چلنا بھی ناممکن ہے۔ برادرانِ وطن! فارسی و عربی کے الفاظ ہندوستانی کے لئے غیر ملکی نہیں رہے۔ وہ ہندی زبان کیلئے سرمایۂ ناز ہیں۔ ان انمول رتنوں سے زبان کے خزانوں کو پر کرنے کے بجائے ان کو حسبِ ضرورت استعمال کرکے گلستانِ خیال کو آراستہ کرنے کے بجائے، ادبِ ہند کے تاج میں جڑ کر جگمگانے کے بجائے، تم اسے نکال کر پھینک رہے ہو۔ یقیناً یہ تنگ نظری نہیں بلکہ بیہوشی ہے۔ راشٹریتا (وطنیت) کے علمبرداروں سے یہ توقع نہ تھی۔ تعصب تصویر کا صرف ایک رُخ دکھلاتا ہے۔ فارسی و عربی لفظوں کا محض بدیسی ہونا یاد رہ گیا۔ باقی خوبیاں (چلن، رواج، لوچ، گھلاوٹ، شیرینی، بانکپن و سنکھاپن) بھول گئیں۔ مشرت ہندی میں کیا معیار ہے۔ جہاں تک میں نے سوچا ہے اور مطالعہ اور چھان بین کی ہے اس میں سوائے اس کے اور کوئی معیار نہیں ہے کہ وہ اس طرح لکھی جائے کہ اُردو سے کچھ تمیز باقی رہے۔ کہیں پورے پورے پیراگراف میں سنسکرت آمیز چھٹا ہے تو کہیں سادہ اور شستہ دل لبھانے والا پیرایۂ بیان۔ اس طرح مشرت ہندی بھی اپنا مقصد ادائے مطلب کے ساتھ ساتھ کچھ اور رکھتی ہے اور وہ سوائے تفریق اور تمیز کے دوسرا نہیں ہے۔ نیچے میں مشرت ہندی کا ایک ٹکڑا پیش کرتا ہوں جو مادھوری (ایک ماہانہ مستند ادبی رسالہ) سے ماخوذ ہے:۔

زمین کی چھوٹی مالکیت کے سمبندھ میں کمیشن کا کہنا ہے کہ اس سے پیداوار کو نقصان پہنچتا ہے، ہندو اور مسلمان دونوں میں پیترک سمت سبھی پتروں کو برابر ملتی ہے۔ پر اس بشے میں ہو ہی کیا سکتا ہے۔ ہاں سرکاری منڈل، دوارا کھیتی کرنے سے اس ترٹ کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب کے سرکاری منڈل نے آشا تینت اُنتی کی ہے، پر مدھیہ دیس میں قانون دوارا یہ ترٹ دُور کی گئی ہے۔

(مادھوری صفحہ ۲۰۹ برس ۸ رکھنڈ ۱ سنکھیا ۵ مارگ شیرش بلاگھ ہمت ۱۹۶۶)

(اس کی صُورت اُردو میں یہ ہے:۔)

زمین کی چھوٹی ملکیت کے بارے میں کمیشن کا بیان ہے اس سے پیداوار کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں میں موروثی جائداد سبھی بیٹوں کو برابر ملتی ہے۔ پر اس بارے میں ہو ہی کیا سکتا ہے۔ ہاں امدادی سوسائٹی (کواپریٹو سوسائٹی) کے ذریعہ کھیتی کرنے سے اس نقص کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب کی امدادی جماعت (کواپریٹو سوسائٹی) نے اُمید سے بڑھ کر ترقی کی ہے لیکن صوبہ متوسط (مدھ پردیش) میں یہ نقص قانون کے ذریعہ دُور کیا گیا۔

ملکیت کے بدلے مالکیت، موروثی جائداد کے بدلے پیترک سمپت، اُمید سے بڑھ کر کے بدلے آشا تینت، ترقی کے بجائے

انت ، ذریعہ کے بدلے دوارا لانے سے ہندو یا ہندی پبلک کونسی سہولیت یا کونسی ادبی نزاکت محسوس کرے گی اور دلوں پر ہاتھ رکھ کر بتلایئے کہ لکھنے والے کے سامنے قلم اُٹھاتے وقت ان مقابل کے لفظوں میں سے کون لفظ پہلے حاضر ہؤا تھا ؛ ملکیت کو مالکیت اور شہری شہراتی لکھنا شروع ہو گیا ہے ۔

ہندی کی ادبی زبان اپنی ویاکرن کی باندھ سے باہر جا رہی ہے ۔ اسم کیفیت (بھاؤ باچک سنگیا) کی علامت میں عام طور سے ہر قواعد نویس ، تا ، جیسے ، سندرتا ۔ توا جیسے مھتوا ، گرتو ۔ نیہ جیسے کاٹھیتہ ، انیتہ کی سنسکرت علامتوں کو ہندوستانی علامتوں پن (بچپن) وٹ (لکھاوٹ) ، پن (لڑکپن) ئی (برائی) آو (چڑھاؤ ، بہاؤ) وغیرہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں مگر آہستہ سے ان سے گزارش ہے کہ آزمائش ، فرمائش ، زیبائش ، آمادگی ، سادگی کے لئے کونسا نیم (قاعدہ) ہے ۔ جبکہ اس قسم کے الفاظ بول چال سے بڑھ کر ہندی کی ادبی زبان اور پرتشٹھت (مشہور معزز) لیکھکوں کے لیکھوں میں براجمان ہیں ۔

آرائش ، دھواں کش ، بادکش ، کرتر باچک (اسم فاعل) کے تحت میں جب جگہ نہیں دے گی تو ان کے استعمال میں نہ آنا چاہئے تھا مگر کیا ممکن کہ ہندی ان سے اپنا دامن چھڑا کر زندہ زبانوں کی صف میں بول سکے ، ہاں وہ کھڑی تو کی جا سکتی ہے ۔ مگر اس میں خود بہ سکت نہیں ۔

پس ہندی کی سچی خدمت کیا ہے ؛ اس کو آزاد کیجئے ، اپنی قواعد کی کتابوں میں اس کی بقا کا سامان کیجئے اور بہ الفاظ دیگر اسے اُردوپن سے دُور نہ لے جایئے ۔ اُردوپن ہندی کی جان ہے ۔ اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو میں بلا خوفِ تردید کہتا ہوں کہ ہندی میں سنسکرت لفظوں کی اصل صورت ( ) بھر کر اپنا ایک الگ یونیفارم مکمل کیا گیا ہے ۔ افسوس مادرِ ہند کے سپوتوں کی کوئی چیز مشترک رہنے نہ پائی ۔ وہ اُردو جسے ہندو مسلمانوں کے ملاپ کا نشان اور اثر کہنا چاہئے ۔ جو دونوں کی آبیاریوں سے اپنے کامل شباب کو پہنچ چکی تھی زمانے کی باد مخالف آج اُسے بدیسی عنصر سے ٹکراتی ہے ۔ یہ سب جذبات کے کرشمے ہیں ۔ عقل سرگردان ہے کہ یہ معاملہ کیا ہے اور ایسا کیوں ہو رہا ہے ۔

چراغ علی

ٹہری گڑھوال

آسماں کے شامیانے کے تلے سوتی ہے تُو
سو کے اُٹھتی ہے تو گنگا جل سے مُنہ دھوتی ہے تُو

قدرتی بہتے ہوئے پانی کی یہ آواز ہے
یا تری خاطر بجاتی قدرت اپنا ساز ہے

دُور آ کر ہے بسی گرد و غبارِ دہر سے
پربتوں میں آ چھپی تو آسماں کے قہر سے

گود میں اپنی لئے بیٹھا ہماچل ہے تجھے
اور چھپا لیتا کبھی دامن میں بادل ہے تجھے

پربتوں کے بیچ میں کیا شان سے رہتی ہے تُو
بے خطر بے خوف اطمینان سے رہتی ہے تُو

اُونچے اُونچے پربتوں کی آڑ میں محدود ہے
ہر طرف تیرے لئے اِک پاسباں موجود ہے

اِک طرف ٹہری تری بھاگیرتھی کا زور ہے
دوسری جانب ہے بھیلنگ اور اس کا شور ہے

تُو ہے فخرِ کوہسار اور زینتِ گڑھوال ہے
دستِ قدرت کی بدولت تو بھی مالا مال ہے

گھومتے تیرے بنوں میں سینکڑوں خونخوار ہیں
جھومتے اِن جنگلوں میں چیڑ اور دیودار ہیں

ہیں بھرے بادِ صبا میں نغمہ ہائے بے خودی
پتا پتا گت بجاتا رہتا ہے کھڑتال کی

چشمِ حق بیں پر عیاں ساری حقیقت ہے یہاں
منکشف ہر ایک دل پر رازِ فطرت ہے یہاں

بھول جاتا ہے بشر دُنیا کی دار و گیر کو
دیکھ لیتا ہے وہ جب قدرت کی اس تصویر کو

مرحبا اے کلکِ قدرت مرحبا صد مرحبا
کھینچ کر فردوس کا نقشہ ہے تُو نے رکھ دیا

دُور سے آیا ہوں میں تیری زیارت کے لئے
کنجِ تنہائی میں آیا ہوں عبادت کے لئے

اَے پہاڑوں کی دُلھن مُنہ سے ہرا آنچل اُٹھا
میں ترے درشن کو آیا ہوں مجھے مکھڑا دِکھا

رام پرشاد ناشاد

طلسمِ گفتار

غم کا یہی علاج ہے، ناحق نہ تنگ کر
پینے دے شیخ! مجھ سے نہ بے سود جنگ کر

اِس وہم میں زیاں ہے سراسر، خدا کو مان!
خوش جی، نہ بھول کر ہوسِ نام و ننگ کر

ہے موت نام رُوح کے بجھنے کا ہم نشیں
پیدا دلِ فسردہ میں تازہ اُمنگ کر

پھر آگیا ہے موسمِ رنگیں بہار کا
توبہ کو توڑ، زہد و تقدس سے جنگ کر

صحنِ چمن میں مجلسِ مے گرم ہے عدمؔ
جی بھر کے کسبِ کیف و تماشائے رنگ کر

عدمؔ

میں کبھی نہ بھولوں گا

اُس وقت میری عمر نو برس کی تھی۔ جبل پور سے بھوپال جا رہا تھا، تن تنہا۔ اسکول بند ہوگیا تھا، بڑے بھائی تجارت کرتے تھے " دیوالی کی اکیس دن کی تعطیلات میں والدین سے مل آؤں، آخر بے کار کیا کروں گا" یہ ان کا خیال تھا۔ چنانچہ ایک سیاہ ٹرنک میں اُنہوں نے میرے ضروری کپڑے اور درسی کتابیں، بھردیں، اسٹیشن آئے ٹکٹ دلا دیا، ٹرین میں سوار کرایا اور خدا حافظ کہہ کر واپس چلے گئے۔

میرے سفید کوٹ کی اوپر کی جیب میں چمڑے کا بٹوہ تھا، اس میں پانچ روپے کے دو نوٹ، کچھ روپے، ریزگی اور میرا آدھا ٹکٹ رکھا ہوا تھا۔ بھائی صاحب اصرار کرتے رہے کہ صرف ریزگی اور ٹکٹ بٹوے میں رہنے دوں اور روپے اور نوٹ ٹرنک میں رکھ لوں۔ لیکن میں نے اپنی ضد پوری کی اور اپنے نقد کی تمام کائنات جیب ہی میں رہنے دی۔ گو وہ متالم ضرور ہوئے اور کنجی مانگ کر خود بھی ٹرنک کھولا، سامان دوبارہ باقاعدہ رکھ دیا لیکن میری ضد کے سبب اسی طرح صندوق بند کرکے چپ ہو رہے۔

ڈاک گاڑی تھی، ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اٹارسی جنکشن کے ایک اسٹیشن ادھر میں باتھ روم میں گیا۔ اتفاق سے جھکنے کے ساتھ ہی اوپر کی جیب سے بٹوہ پھسل کر باتھ روم میں گرا اور ڈبے سے نیچے گر کر ریل کی سڑک پر خبر نہیں کہاں چلا گیا۔ میرے ہوش و حواس اُڑ گئے۔ آج تک اکیلا کہیں نہیں گیا تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ اپنے کسی سرپرست کے بغیر ٹرین میں سفر کر رہا ہوں۔ جب میں باہر آیا تو ہاتھ اور پاؤں کانپ رہے تھے۔ آنکھوں تلے اندھیرا آرہا تھا، لیکن چونکہ کسی کتاب میں مَیں نے ریلوے سفر کے قواعد کا مطالعہ کیا تھا لہٰذا اپنے ٹکٹ کا نمبر اپنی کوٹ بک میں کاپنگ پنسل سے نقل کرلیا تھا اور اسی لئے مجھے تھوڑا بہت اطمینان تھا کہ میں بھوپال بغیر کسی زحمت کے پہنچ جاؤں گا تاہم میں نے اپنے ہم سفروں سے اس حادثے کا اظہار کردیا۔ ریلوے پولیس کا ایک کنسٹبل بھی اسی ڈبے میں بیٹھا تھا، اسے بھی مطلع کیا۔ بعض نے رائے دی کہ فوراً زنجیر کھینچ دی جائے، لیکن کنسٹبل نے منع کردیا کیونکہ بقول اس کے پچاس روپے سے کم مالیت کا سامان گرا ہے حالانکہ اس کا نظریہ غلط تھا، اب تمام مسافر تھے اور میں اکیلا تھا۔ ان کے سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ میں اپنے حواس بمشکل قابو میں رکھ کر سب کو جواب دے رہا تھا۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے کہ یہ عمر اور اتنی ہمت! دوسرا ہوتا تو رو دیتا بہت ہوشیار! بہت چالاک!" لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ باطن میں میرے دل پر کیا گزر رہی تھی۔

آخری بنچ پر ایک ہاف پینٹ اور خاکی کوٹ پہنے اور سیاہ ٹائی لگائے ہوئے ایک بھوری آنکھوں بھورے بالوں والے گداز جسم

کے گورے چٹے نوجوان بیٹھے ہوئے سگار پی رہے تھے۔ اُنھوں نے مجھے اشارے سے پاس بُلا کر بٹھا لیا۔ ماجرا سُنا۔ خاندانی حالات دریافت کئے۔ پھر کہنے لگے "اچھا گھبراؤ مت! اٹارسی میں عجلت نہ کرنا۔ میرے ہمراہ چلنا۔ کیونکہ مجھے بھی ٹرین بدلنی ہے۔ میں بھی اسی لائن پر آگے جاؤں گا ——— بھوپال سے آگے۔"

میں نے بچپن سے ناول، افسانے اور حکایات بہت پڑھے ہیں۔ اگرچہ دُنیا کا ذاتی تجربہ نہیں تھا تاہم کتابی تخیل کی بنا پر میں بھی سمجھتا تھا کہ یہاں کسی کا بھروسا نہیں ہے۔ وقت پر کوئی مدد نہیں دیتا۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ اٹارسی میں کہیں ایسا نہ ہو میں پکڑا جاؤں ٹکٹ کلکٹروں کا پورا جمگھٹ وہاں رہتا ہے۔ میرے پاس اپنا اسباب منتقل کرانے کی اُجرت دینے کے لئے بھی ایک پائی تک نہیں ہے۔ ٹرین لائنوں کی تبدیلی کا اعلان اپنی "کھٹ کھٹ" کی صدا سے کر رہی تھی، تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر پھاٹک کی روشنی، سُرخ اور ہرے سگنلوں کی روشنی بار بار دوچار ہو رہی تھی، پھر اٹارسی جنکشن کے فانوس دکھائی دینے لگے اور آن واحد میں ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا۔ بعض لوگ اطمینان سے بیٹھے رہے، بعض اپنا اسباب قلیوں کے حوالے کر کے اُترنے لگے۔ میں بھی اُترا، اور اپنے ہاتھ سے اپنا بستر اور ٹرنک اُتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ بھورے بالوں والے نوجوان کی نظر پڑ گئی۔ کیونکہ اب تک وہ اپنا اسباب قلی کے حوالے کر رہے تھے۔ وہ فوراً "ہیں ٹھہر جائیے!" کہتے ہوئے قریب آئے۔ ایک قلی کو آواز دی اور میرا سامان اُٹھا کر اپنے سامان کے ہمراہ لے چلنے کا اشارہ کیا۔ پُل پر ٹکٹ کلکٹروں سے میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جس کی ایک نو برس کے ہندوستانی طالب علم سے توقع ہو سکتی ہے، ٹکٹ اور نقد کے گم ہو جانے کی سرگزشت سنائی ان کو اپنے ٹکٹ کا نمبر نوٹ کرا دیا اور پھر ان صاحب کے ساتھ دوسرے پلیٹ فارم پر آ گیا۔ اوپر والے ٹکٹ کلکٹروں نے ضرور کہا تھا کہ اب تم یہاں سے ٹکٹ خرید لو ورنہ ایک دو دن ٹھہرنا پڑے گا تا وقتیکہ جبل پور سے تمہارے نمبر والے ٹکٹ کی فروخت ہو جانے کی اطلاع نہ منگا لی جائے۔ لیکن میرے پاس کیا تھا جو آگے کا ٹکٹ لیتا۔ اس وقت میرے اضطراب کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس ساعت میں تمام کرۂ ارض پر مجھ سے زیادہ حواس باختہ اور پریشان کوئی متنفس نہ ہوگا۔

مجھے اکیلا چھوڑ کر میرے رفیق سفر ذرا دیر کے لئے باہر گئے تھے۔ وہ آئے، میرے ہاتھ میں آدھا ٹکٹ اور پانچ روپے کا ایک نوٹ اور دو روپے چند آنے دیئے اور کہا "میاں صاحبزادے! انہیں بحفاظت رکھ لیجئے۔ خبردار اب اوپر والی جیب میں نہ رکھنا۔" میں اپنے طفلانہ عقاید کے بموجب اس وقت یہی محسوس کر رہا تھا کہ یہ بیداری کا عالم نہیں ہے، یہ کیا ناممکن بات ممکن ہوئی جا رہی ہے۔ کہتے ہیں یہ کلجگ ہے۔ اس زمانے میں کوئی ہمدرد اور اخلاص مند غمخوار نہیں ہے! میرے جس ہاتھ میں ان کا عطیہ رکھا تھا وہ ہاتھ منٹوں سے اسی طرح کھلا تھا۔ وہ بولے ——— کیا سوچتے ہو، رکھ کیوں نہیں لیتے، اور اب میں نے اپنا سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ میں یہاں سے جو نئی لائن ہیتول ہوتی ہوئی ناگپور تک کھلی ہے اس سے واپس ناگپور جاؤں گا۔ تمہیں بھوپال جانے والی گاڑی میں سوار کر دوں پھر مجھے اطمینان ہوگا۔"

"ہائے! اتنی دلسوزی" میری آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے تھے۔ نہیں جانتا کہ وہ کونسے آنسو تھے۔ خوشی کے تھے، یا معصومیت کے یا اپنی بےکسی کے آنسو تھے، یا اپنے برادر بزرگ کے حکم کی نافرمانی کا خمیازہ بھگتنے کی ندامت اور انفعال کو مٹانے والے آنسو تھے۔

میں نے چند لمحوں کے بعد کہا ـــــ "آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں؟ آخر آپ بھی تو سفر میں ہیں"

وہ فرمانے لگے ـــــ "نہیں یہ کوئی تکلیف نہیں ہے۔ تم اسے چُپ چاپ ہوشیاری سے جیب میں رکھ لو۔ تم میرے چھوٹے ہو، میرا حکم مانو"

مَیں نے کہا ـــــ "لیکن میری غیرت تو نہیں تقاضا کرتی کہ ـــــ"

وہ بات کاٹ کر، اپنے الفاظ پر زور دے کر، اور مجھے اپنی رحیم آنکھوں سے گھُور کر کہنے لگے ـــــ "تو کیا میں خیرات دے رہا ہوں، نہیں پیارے بچے تم میرے اپنے بھائی ہو۔ ہم تم پہلے اسلام اور پھر انسانیت کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ میرا فرض ہے تم سے ہمدردی کرنا اور ادائے فرض سے میں مجبور ہوں کہ تمہیں یہ دوں اور تم کو لینا پڑے گا، چلو دیر نہ کرو، رکھ لو، کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارے مذہب نے سکھایا ہے کہ سب مسلمان ایک دوسرے کے مال ومتاع میں ہمدردی میں برابر کے شریک ہیں! بس رکھ لو!"

میں نے اپنی چھوٹی سی نوٹ بک میں ان کا نام اور پورا پتہ لکھ لیا۔ ان کا رنگ سازی کا کارخانہ تھا۔ ناگپور میں رہتے تھے۔ عبدالقادر اسمِ گرامی تھا۔

بھوپال میں اقربا اور اعزہ نے ان کا غائبانہ شکریہ ادا کیا۔ والد صاحب نے میری نوٹ بک میں لکھے ہوئے پتے پر منی آرڈر کے ذریعہ ان کا روپیہ روانہ کیا جو چند روز کے بعد ڈاک خانے کے عمال کے سُرخ سیاہی کے ان الفاظ کے ساتھ واپس آگیا "یا بندہ لینے سے انکار کرتا ہے"

+ + + + + + + + + + +

گیارہ برس کے بعد پھر ان سے ملاقات ہوگئی۔ میں ناگپور کا عجائب خانہ دیکھنے گیا تھا۔ سر فرینک سلائی سابق گورنر صوبجات متوسط نے جو زبردست ترین شیر مارا تھا اسے ولایت سے بنوا کر منگوایا اور ناگپور کے عجائب خانے کی نذر کر کے گویا اپنی یاد صوبے کے لوگوں کے دلوں میں چھوڑ گئے ہیں۔ میں بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا، اتنا زبردست شیر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اور فی الواقع اس کے مقابلے کا دوسرا شاید ہی ہوگا۔

اسی وقت جو صاحب میرے پاس کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے ان کے مُنہ سے بےساختہ "اوہ!" "اللہ اکبر!" "بھئی کتنا زبردست شیر ہے یہ!" کلمات سُن کر میں مخاطب ہُوا، گیارہ برس تو بہت تھوڑے ہوتے ہیں، گیارہ سَو برس کے بعد بھی کوئی اپنے محسن کو نہیں بھُول سکتا۔

میں نے کہا — "عبد القادر صاحب! السلام علیکم"

وہ بغور دیکھ کر بولے — "وعلیکم السلام، مگر میں آپ کو نہیں پہچان سکا۔"

میں نے کہا — بھائی میں نے تو پہچان لیا، بتائیے کبھی کہیں ہماری ملاقات ہوئی تھی؟"

وہ بولے — اس سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ مجھے مطلق یاد نہیں کہ کہاں اور کب آپ سے نیاز حاصل ہوا تھا۔"

میں نے ہنس کر کہا — "یاد کیجیے — اچھا سنئے — میں وہی نو برس کا لڑکا ہوں جو آپ کے ساتھ جبل پور سے بھوپال کا سفر کر رہا تھا، جس کا ٹکٹ اور روپے گر گئے تھے، جسے آپ نے نوٹ، روپے اور ٹکٹ عنایت فرمایا تھا۔"

"اخاہ، خوب، آپ نے خوب یاد رکھا۔" یہ کہہ کر وہ بغلگیر ہوئے۔ ان کے بشرے سے خوشی ٹپکنے لگی، پھر خیریت پوچھی، عرصے تک ہم دونوں مصروفِ گفتگو رہے۔ انہیں اپنے کاروبار میں بہت نقصان ہوا تھا، اور وہ افلاس کی منزل کے قرب میں پہنچتے جا رہے تھے تاہم جب میں نے ان کے روپے واپس کرنے پر اصرار کیا تو وہ مُورت بنا کر کہنے لگے — "بھائی وہ کوئی قرض نہیں تھا۔ وہ اللہ کے واسطے مدد تھی۔ خیرات بھی نہیں تھی۔ خوب یاد رکھنا، خدا تمہیں بھی اس قابل کرے کہ تم دوسروں کی مدد کرو۔"

حسن عزیز جاوید

ہاں تیغ وار سینہ میں آرزوئے انقلاب

یاد کر کروں گر عمر نے اسے زبان وا بیان نہیں

عورت

تابشِ خورشید۔ نورِ ماہ۔ پانی کی جھلک
خندۂ قلقل۔ صدا کوئل کی۔ غنچوں کی چٹک

لرزشِ سیماب۔ بجلی کی تڑپ۔ شاخوں کا لوچ
عقل کی تیزی طبیعت کی اُپج۔ شاعر کا سوچ

حاصلِ تحقیق۔ جانِ فلسفہ۔ منطق کی روح
خُلق و نفسیات کی ساری شقیں، ہر شق کی رُوح

اضطرابِ موج۔ کانٹوں کی خلش۔ ناگن کے بل
تیر کی سُرعت۔ کماں کا عجز۔ شمشیروں کے پھل

آبِ موتی کی چمک کندن کی ہیرے کی دمک
اشرفی کا رُوپ، ٹکسالی صداقت کی کھنک

دامنِ کہسار کے منظر، نوائے آبشار
شورِ دریا۔ کروٹیں لہروں کی۔ ساحل کا قرار

زمزمہ کا عطر۔ کیفِ نغمہ۔ لے کی پختگی
شورشِ مے۔ مستیِ مے نوش۔ جوشِ بےخودی

آہوئے رم خوردہ کی وحشت طرارے، تیزیاں
گائے کی سنجیدگی۔ جگنو کی آتش ریزیاں

وادیٔ کشمیر کی نزہت، گلوں کا رنگ و بُو
سرو کا قد۔ مور کی رفتار۔ قمری کا گلو

ظلمتِ شامِ اودھ، صبحِ بنارس کا نکھار
آگرہ کے تاج کی عظمت۔ ہمالہ کا وقار

سومناتی رفعتیں۔ بھارت کی تہذیبِ قدیم
پاٹلی پُتر کی شہرت، مگدھ کی شانِ عظیم

دلپذیریٔ اذاں۔ دلداریٔ ناقوسِ دَیر
صحنِ مسجد کا تقدس۔ پرتوِ فانوسِ دَیر

ہر بھجن کا فیض۔ حسنِ اعتقادِ برہمن
کُمبھ کے میلے کی شہرت، وقعتِ گنگ و جمن

تلخیٔ انجام جب سب کوششیں ناکام ہوں
خوشنما سیبوں کی ہلکی ترشیاں، جب خام ہوں

بربطِ وچنگ وسرود وارغنوں کے زیر وبم
لرزشیں پردوں کی آوازوں کے جادو تال ہسم

دیکھ کر یہ اقتباسِ کارگاہِ انس وجاں
کارپردازانِ قدرت میں ہوئیں سرگوشیاں
ایک بولا امتزاج ان کا قیامت ساز ہے
دوسرا کہنے لگا۔ خاموش! کوئی راز ہے

صبحدم جب گوشہ گوشہ مطلعِ انوار تھا
ذرہ ذرہ عالمِ نیرنگ کا سرشار تھا
اس مرکب کو اصولی جنبشیں ہونے لگیں
تاکہ ہو غربالِ قدرت سے کثافت تہ نشیں
یہ عناصر ایک مدت تک رہے گرمِ عمل
آخرش تحریکِ عصمت سے ہوئے آپس میں حل
جلوۂ حسنِ ازل سے پا کے قلبِ ماہیت
آگئی کافور میں بلور کی سی خاصیت
اب ہیولیٰ ارتقائی منزلیں طے کر گیا
شہ پرِ پروازِ عفت سے بلندی پر گیا
اعتدالِ عنصری پر پا لیا جب اعتبار
عزمِ فطرت کے مطابق شکل کی اِک اختیار
آئی اعضا میں گدازی اور نرمی جسم میں
آئی رخساروں پہ سرخی اور گرمی جسم میں
جوں ہی پہنچا پایۂ تکمیل پر یہ شاہکار
دستِ قدرت نے ٹٹولی نبض اس کی بار بار
بسترِ نکہت پہ یہ پتلی جو محوِ خواب تھی
مست انگڑائی کے ہاتھوں جاگ اٹھی، شرما گئی!
دیکھ کر شاعر نے اس کو نکتۂ حکمت کہا
اور بے سوچے زمانہ نے اسے 'عورت' کہا

شاد عارفی

فلسفی کی بیوی

ڈاکٹر نے نہایت غمناک آواز میں کہا "اب اُسے صرف خدا ہی بچا سکتا ہے"۔ یہ سُن کر ہنری کا چہرہ بھی اپنی نوخیز بیوی کے چہرے کی طرح زرد پڑ گیا۔ مریضہ کو شاید موت کا بھیانک ہاتھ صاف صاف نظر آرہا تھا۔ وہ ہنری کے سامنے اس پلنگ پر لیٹی دم توڑ رہی تھی۔ جس پر انہوں نے کبھی عیش و مسرت کی بہترین گھڑیاں بسر کی تھیں۔ ہنری کے دل میں ایک ٹیس سی پڑی۔ شدتِ درد سے اس کی چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ اس نے بمشکل تمام اُسے ضبط کر لیا۔ اپنے چہرے کی یاس انگیز کیفیات کو چھپانے کے لئے وہ دوڑ کر پاس کے کمرے میں چلا گیا ایک آرام کُرسی پر جا گرا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر زار و قطار رونے لگا۔

آہ غریب لنزا! وہ اس کی زندگی کی تنہا و تاریک شاہراہ پر شبنم کی طرح یا کسی پھُول کی طرح نمودار ہوئی تھی۔ حسُن اور جوانی کی اس مورت کا تصور اب تک اس کے سامنے تھا ——— وہ اس کے مطالعہ کے گرد آلود کمرے سے چوہیوں اور پروانوں کو اُڑا رہی تھی۔ وہ اس لئے آئی تھی کہ کھڑکی کھول دے اور چمکتا ہُوا سورج اور قدرت کے خوبصورت نظارے کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے والے کو نظر آسکیں۔

. . . . اب اس کی کتابیں اپنے حریف سے ایک ظالمانہ انتقام لے رہی تھیں۔

ہنری پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔

لیکن ——— اس فوری اور لرزہ خیز مصیبت کا کوئی تدارک نہیں ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی غم کے بھُوت کے خوفناک جنگل میں اسی طرح تنہا بلا مقابلہ گرفتار رہے؛ سالہا سال تک ان کتابوں پر جھکے رہنے سے، پڑھ پڑھ کر چہرہ زرد کر لینے سے اور دوسروں کے گوناگوں تجربات کا فائدہ اُٹھانے سے آخر حاصل کیا ہُوا؟ آخر یہ مطالعہ میرے کس کام کا ہے کہ میں اتنی ذہنی کوفت میں مبتلا ہوں اور یہ مجھے اس سے رہا کرنے سے قاصر ہے۔ اگر اس کی وساطت سے بدقسمتی کی دیوی معقول شرائط پر میری طرف دستِ تعاون نہیں بڑھا سکتی تو ایسا مطالعہ جائے بھاڑ میں۔ آخر ایسے مطالعہ اور سوچ بچار کا فائدہ۔

او فلسفے! آ کر مجھے بچا! تو جو ہمارے اِردگرد کی چیزوں کی ظاہری نہیں اصل صورت دیکھتا ہے۔ تو جو ہر چیز کے لئے جواز ڈھونڈ لیتا ہے اور کسی چیز کو دیکھ کر حیرت زدہ نہیں ہوتا۔ تو نے اپی کیورس (EPICURUS) کو غربت سے نجات دلائی تھی۔ تو نے سقراط کی موت کو تجربے اور بحث کی بنیاد ٹھیرا لیا تھا۔ تو نے مارکس کی سلطنت کو علوم و فنون کا مرکز بنا دیا تھا۔ تو اُن لوگوں کو تباہ نہیں کرتا جو تجھ سے محبت کرتے ہیں۔ آ اور مجھے تسکین دے! تو اپنی شاندار اور بلند مملکت سے جہاں خموشی کا راج ہے ہماری دُنیا کو دیکھ رہا ہے۔

کہ اس کی کیا حقیقت ہے۔ یہ ایک نقطہ ہے ایک غیر مرئی نقطہ۔ پھر اس نسلِ آدم کی حقیقت کیا ہے جو اپنے دلوں میں خواہشات کا طوفان چھپائے ہوئے ہے۔

او فلسفے اگر تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں پیدا کرتا تو کم از کم مجھے کسی قدر سرد مہر تو بنا دے۔ اور مجھے تسلی دے۔ تو کہتا ہے کہ کوئی برائی ایسی نہیں جس سے کوئی نہ کوئی اچھا نتیجہ نہ نکلتا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قدرت طرح طرح کی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ سیاہ بادلوں پر صاف آسمان چمکتا ہے۔ بادل کھُل جائیں گے لیکن چمک نہیں کھُل سکتی . . . . . .

او انسان! اگر زندگی تیرے لئے ایک دردناک آہ ہے تو کیا موت اس کا علاج نہیں؛ اور اگر دُکھ کا علاج موت ہے تو اے انسان تُو موت سے کیوں بچتا ہے، اس پر کیوں لعنت بھیجتا ہے۔ اور جن جن ہستیوں سے تجھے محبت ہے تو انہیں کیوں موت سے بچاتا ہے؛ "اُن ہستیوں کو جن سے تجھے محبت ہے" —— ہاں . . . . لیکن کیا ہم ہمیشہ ہی کسی سے محبت کر سکتے ہیں —— لیزا پیاری کتنی حسین ہے . . . . لیکن درازی عمر اسے بدصورت بنا دیتی۔ لیزا اچھی ہے . . . . لیکن بدصورتی اس کا چہرہ مکاروں کا سا بنا دیتی اگر وہ اب مرجائے یعنی نوعمری ہی میں اس کا انتقال ہو جائے تو ہمیشہ کے لئے میرے دل میں اس کی شیریں اور خوبصورت یاد رہ جائے گی۔ وہ ہمیشہ میرے تصوّر میں جوان خوبصورت اور شیریں ادا بن کر رہے گی۔ اور ہمیشہ میری ہی محبوبہ بن کر رہے گی۔ محبت کی غذا خواہشات کی تکمیل نہیں بلکہ خواہشات کا ادھورا رہ جانا ہے۔ سو کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ میری محبت آمیز خواہشات پورا کرنے کے بجائے مرجائے۔ پھر میں مطالعہ کرنے کے لئے پیدا ہُوا ہوں، اس کے لئے تنہائی کی ضرورت ہے۔ بیوی اور خصوصاً حسین بیوی کی موجودگی میں آدمی کو گھر بھر کے کاموں میں دخل دینا پڑتا ہے۔ کچھ وقت اس سے محبت کرنے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ ایک وقت میں دو کام نہیں ہو سکتے۔ جو شخص ایک ہی پگڈنڈی پر نہیں چلتا۔ وہ کبھی صحیح طریقے سے منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ جو شخص اپنی دانائی کی کمان کو ایک ہی چیز کا نشانہ کرنے کے لئے نہیں جھکاتا۔ وہ کوئی شکار نہیں مار سکتا۔ سو ہمیں قادرِ مطلق کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جو غم کے فائدہ مند امتحان کی راہ سے ہمیں منزلِ مسرت تک پہنچاتا ہے۔ ہماری کتابیں منتظر ہیں کہ ہم انہیں پڑھیں۔ ان کے حاشیوں کی باریک باریک عبارت پڑھ کر فائدہ حاصل کریں اور زندگی کے حقیقی راز پائیں وہ تو منتظر ہیں کہ کوئی ہیں کھولے اور ہمارا خزانہ لُوٹ لے۔ کتابیں ہی ہماری پُرانی دوست ہیں . . . . .

فلسفی کی ہچکیاں ختم ہو چکی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اس کی نگاہوں میں فتمندی کی ایک چمک تھی۔ فلسفہ جسے وہ اس قدر محبت اور بے تابی کے ساتھ بُلا رہا تھا اس کی گود میں آبیٹھا تھا۔ اس کا سر فلسفی کے شانوں پر جھکا تھا۔ ڈاکٹر مسکراتا ہُوا اندر آ داخل ہُوا۔ پہلے کی طرح اس کا چہرہ مایوس اور تاریک نہیں تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "مریضہ کی جان بچ گئی ہے" ڈاکٹر نے لرزتی ہوئی آواز میں چلّا کر کہا —— "ہیں! سچ مچ؛" ہنری نے جواب دیا۔ اس کی آواز پہلے سے بہت بھاری ہو گئی تھی۔ کیا اس وقت اس کے دل میں جذباتِ محبت کا سمندر موجزن تھا؛ جذبات کے ماہر ذرا بتائیں تو!

(ماخوذ از کار لو دوسی)

منسوبہ!

جسے شعروں سے اُلفت ہے جسے پھولوں سے رغبت ہے
جسے ہنسنے کی عادت ہے وہ جس سے میری نسبت ہے
مجھے اُس سے محبت ہے
مجھے اُس سے محبّت ہے

جو ہر دم گنگناتی ہے جو میرے شعر گاتی ہے
فضاؤں کو سناتی ہے بڑی دُھومیں مچاتی ہے
جسے شعروں سے اُلفت ہے
مجھے اُس سے محبت ہے

جو باغ آتی ہے روزانہ پئے گلگشت مستانہ
بصد نازِ عروسانہ ! برنگ مستِ میخانہ
جسے پھولوں سے رغبت ہے

مجھے اُس سے محبت ہے

جو اکثر مسکراتی ہے — مسرت جس کو بھاتی ہے
جو ہنستی کھلکھلاتی ہے — جو مجھ کو بھی ہنساتی ہے

جسے ہنسنے کی عادت ہے
مجھے اُس سے محبت ہے

جو اکثر یوں ستاتی ہے — کہ آوازیں سناتی ہے
پسِ چلمن تو آتی ہے — مگر پھر بھاگ جاتی ہے

وہ جس سے میری نسبت ہے
مجھے اُس سے محبت ہے

جو سازِ شادمانی ہے — جو میرے دل کی رانی ہے
جو حورِ آسمانی ہے — سراپا نوجوانی ہے

مجھے اُس سے محبت ہے
مجھے اُس سے محبت ہے

مرزا یاور علی

اَے دوست

اب کہاں اے دوست وہ بیتی ہوئی رنگیں بہار
اب کہاں ہیں وہ مہکتے اور لہکتے خلد زار
اب کہاں وہ دیوداروں کے خنک سائے نصیب
اب کہاں اشکوں کی مالا پر ترا ذکرِ حبیب
اب کہاں خوابوں میں وہ کھوئی ہوئی سی زندگی
نکہتوں کی گود میں سوئی ہوئی سی زندگی
اب کہاں وہ اُودی اُودی بدلیاں وہ آبشار
اب کہاں وُہ دُور تک چھایا ہُوا رنگِ خُمار
اب کہاں معصوم آنکھوں میں بوقتِ انتظار
گاہ ہلکا سا تبسّم گاہ ہلکی سی پھوار
اب کہاں سادہ فضائیں اب کہاں معصوم رُت
آکہ اِک مُدّت سے اب کٹتی نہیں مغموم رُت
آہ آلامِ زمانہ نے جوانی چھین لی
چھین لی اَے دوست مجھ سے زندگانی چھین لی

الطاف مشہدی

دِل کی ڈائِری

"لندن کا اخبار "ڈیلی مرر" آج کل "نقشِ اوّلیں کی ڈائری" کے عنوان سے مستقل سلسلۂ مضامین شائع کر رہا ہے۔ مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ اکابر انگلستان کے قلم سے محض مختصر واقعات لکھوائے گئے۔ یعنی کسی مضمون میں دو سَو سے زیادہ الفاظ نہیں ہیں۔ ایک ٹکڑے کا ترجمہ نذرِ قارئین ہے جس میں مفلسی کی مجبوری، محبت کے جذبات، اور دولت کے تماشے کے ساتھ محض سطحی اور فطری واقعات پیش کیے گئے ہیں۔"

کوکب

(۱)

نورما کے چاہنے والوں کی تعداد کثیر تھی لیکن مجھے ہمیشہ یقین رہا کہ میں اس کو سب سے زیادہ چاہتا ہوں۔ اس کی عمر صرف سترہ سال کی تھی۔ میں دُور ہی سے اس کی پُوجا کر لیا کرتا تھا کیونکہ میرے رقیبوں کے والدین میرے والدین سے بہت زیادہ دولتمند تھے۔ اس لئے نورما کے ان کی طرف مائل ہونے کے زیادہ موقعے تھے۔

اُن کے پاس سائیکلیں تھیں اور میں مفلس تھا اور جب میں سائیکل خریدنے کے قابل ہُوا تو ان لوگوں نے موٹر سائیکلیں خرید لیں! آخر کار کسی صُورت سے میں نے بھی اپنی سائیکل میں ایک ٹوٹی پھُوٹی موٹر کی مشین لگالی اور گاڑی طیار کر لی۔ میرے رقیبوں کے پاس تفریح کے مختلف سامان موجود تھے لیکن اس نے میرا ہی ساتھ دیا۔

نورما میرے ساتھ بائیسکل پر بیٹھی اور چلی!

بدقسمتی سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر بائیسکل کی مشین ٹوٹ گئی اور میری مفلسی کا یہ عالم تھا کہ میں اس سے یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ "تم اپنا کرایہ صرف کر کے ریل کے ذریعہ سے واپس جا سکتی ہو۔ میرے پاس صرف اتنی رقم ہے کہ بمشکل میری واپسی کے لئے کافی ہو سکے!"

بہرحال دو بجے دن کے ہم اس کے مکان پر پہنچے جہاں اس کے والدِ ماجد بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اس دِن کے بعد آج تک اس نے مجھ سے بات نہیں کی۔ . . . . . .

آج اس نے ایک دولتمند شخص سے شادی کر لی ہے لیکن اب بھی میں دُور سے اس کی پُوجا کرتا ہُوں۔

(رچرڈ)

(۲)

جب میں سولہ سال کی تھی مجھ کو ایک دواخانے کے اسسٹنٹ سے بہت محبت ہو گئی۔ تقریبِ ملاقات کی خاطر میں نے اِس دکان سے بار بار صابون خریدنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ میری تمام پونجی صابون کی خریداری پر صرف ہو گئی۔ خیال تھا کہ راہِ محبت میں روپے سے میں صرف یہی بہترین کام لے سکتی ہوں کیونکہ صابون ایک تو کافی مدت تک درست رہ سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ بڑے دن کے تہوار میں اس سے تحفے بھیجنے بھجوانے کا معقول ترین کام نکل سکتا ہے۔ غرضکہ میں نے اس قدر صابون خریدا کہ اس کی تعداد ہزاروں ڈبوں تک پہنچ گئی۔ آج خریداری ترک کئے ہوئے پچیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن اب بھی میری چودہ سال کی لڑکی اسی صابون کی ایک ٹکیہ کو استعمال میں لا رہی ہے۔ اور نہ معلوم کب یہ ذخیرہ ختم ہوگا۔

میری پوویل

مَیں نے کیا دیکھا؟

جب گاؤں پر ہر طرف دُھند چھائی تھی
جب گھر سے باہر نکلنے والوں کو
غصّے سے بھری سردی سوئیاں چبھوتی تھی
مَیں نے دیکھا کہ کھیتوں سے دُور بہت دُور
خار دار جھاڑیوں کے جنگل میں
چاند سُستی سے بیٹھا کانپ رہا ہے

مہدی علی خاں

مشاہدات و محسوسات

آنکھوں کی زباں سے بولتا رہتا ہوں
خاموش نظر میں تولتا رہتا ہوں
کچھ لے کے گزر رہا ہے یادے کے مجھے
ہر لمحہ کا دل ٹٹولتا رہتا ہوں

تھم جا کہ ہے اس راہ سے چڑھنا بھی تجھے
دریا میں ہے ڈوبنا بھی ترنا بھی تجھے
نخوت نے بلند کر دیا ہے جتنا
اُتنی ہی بلندی سے ہے گرنا بھی تجھے

تو ہی تری ذات ہے تو کچھ اور بھی ہے
سیدھی سی یہ بات ہے تو کچھ اور بھی ہے
اپنی ہستی میں ڈھونڈ رازِ ہستی
احساسِ حیات ہے تو کچھ اور بھی ہے

سُکھ کی بنسی بجائے جاؤ ساجن
جاتی دُنیا ہے گائے جاؤ ساجن
کے دِن کے رات کا ہے آنا جانا
چوری چوری ہی آئے جاؤ ساجن

نجم آفندی

گارڈن پارٹی

کیا پیارا لفظ ہے۔ کتنا دلچسپ ہے۔ کس قدر "اشتہا انگیز" ہے۔ عامل حکیم کریم الدین صاحب کی کسی دوا کا بڑے سے بڑا قدح وہ قوتِ ہاضمہ عطا نہیں کرسکتا جو اس لفظ کا صرف سننا کرسکتا ہے۔ کسی گارڈن پارٹی میں شامل ہونے کا دعوتی رقعہ ملتے ہی آپ میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ چہرے پر شگفتگی آجاتی ہے۔ ہونٹوں پہ تبسم کھیلنے لگتا ہے۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اور آپ ہر اس شخص پر جو اس وقت نزدیک بیٹھا ہو۔ فوقیت محسوس کرتے ہوئے فرمانے لگتے ہیں "تو مسٹر فلاں۔ آپ کا کام پھر کبھی ہو جائے گا۔ آج شام کو تو میں ایک جگہ جاؤں گا" اور یہ الفاظ کہتے ہوئے آپ اس بات کے متوقع ہوتے ہیں کہ جن صاحب سے آپ مخاطب ہیں، وہ آپ سے پوچھیں "آپ کہاں تشریف لے جایئے گا۔ کوئی ضروری کام ہے؟" اگر انہوں نے پوچھ لیا تو آپ کی تمنا بر آئی اور آپ تھوڑا سا مسکرا کر اور کسی قدر بے پروائی کا انداز اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں "کوئی خاص جگہ نہیں۔ یونہی ایک پارٹی سی ہے" یہ فقرہ اس انداز سے ادا کیا جاتا ہے گویا آپ کو آئے دن پارٹیوں میں جانا پڑتا ہے۔ اور گویا ان پارٹیوں کی کثرت سے آپ تنگ آئے ہوئے ہیں۔

ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھے ہوئے کالج کے ان طلبہ کو جنہوں نے ڈاکٹر یا انجنیر بننے کے خیال سے سائنس لے کر اپنی اور ہماری جان عذاب میں ڈال دی ہے ان کی کاہلی اور نتیجۂ امتحان سے بے پروائی کے متعلق اپنی "تنقیدات" سُنا رہے تھے کہ عبداللہ "سلام علیکم" کہتا ہوا اور دایاں ہاتھ ماتھے کے قریب تک اُٹھاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ عبداللہ کالج کا دفتری ہے اور یہ وہی شخص ہے کہ جب یہ صبح کالج کے دفتر میں داخل ہوتا ہے تب سات بجتے ہیں۔ ان حضرت کے دفتر میں تشریف لانے سے پیشتر دفتر کے دقیانوسی کلاک میں خواہ ساڑھے سات بجے ہوں یا پونے سات لیکن ان کے داخل ہوتے ہی وہی کلاک سات پر سوئی دکھلانے لگتا ہے اور کالج کا چپراسی گھنٹہ بجانے لگتا ہے۔ اگر یہ نہ آئیں تو نہ سات بجیں نہ کالج شروع ہو۔ جب یہ میرے کمرے میں تشریف لاتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اب آئی مصیبت یا تو میں کسی نوٹس کے احکام کی تعمیل بھول گیا ہوں جس کی یہ یاد دہانی کرانے آئے ہیں۔ یا کوئی پروفیسر صاحب چھٹی پر چلے گئے ہیں جن کا کام یہ میرے سر ڈالنے آئے ہیں یا کسی کالج کی ہاکی ٹیم آرہی ہے جس کے قیام وطعام اور میچ کا انتظام مجھے کرنا ہے۔ غرض ان کا آنا کسی نہ کسی پریشانی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ ان کو دیکھتے ہی میری بھویں سکڑ جاتی ہیں۔ اور ان کے سلام کا جواب ایک بے معنی "ہوں" یا "ہم" سے دیتے ہوئے میں انتظار کرنے لگتا ہوں کہ اب کیا احکام نازل ہوتے ہیں۔ لیکن اس روز

چونکہ علی الصباح کالج آتے وقت ان زنگی نژاد لحیم شحیم مدراسی "صاحب" سے جو غالباً بجلی گھر سے کچھ تعلق رکھتے ہیں آنکھیں دو چار نہیں ہوئی تھیں جن کی بائیسکل ان کے عظیم الشان جثے کو مشکل سے سنبھالے چوں چوں۔ چوں چراچر چوں کرتی چلی جاتی ہے اس لئے اُمید تھی کہ نہ صرف روٹی مل جائے گی بلکہ دن بھر اچھا گزرے گا۔ ہوا بھی یہی۔ دفتری صاحب نے بجائے کسی لمبے سے کاغذ پر دستخط کرانے کے ایک چوڑا سا لفافہ ہمارے ہاتھ میں دے دیا اور بغیر کچھ فرمائے تشریف لے گئے۔

اگر دیوانہ بھی بکارِ خویش ہوشیار ہو سکتا ہے تو کالج کے سوٹ پہننے والے اور سائنس پڑھنے والے طلبہ کی ہوشیاری کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے چہرے پر غصّے کے آثار خوشی میں تبدیل ہوتے دیکھ کر انھوں نے موقع غنیمت جانا اور رُخصت کی اجازت چاہی جو فوراً بخندہ پیشانی دے دی گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ اشرف کو جو دروازے کے پاس اندر آنے کے انتظار میں کھڑے تھے آواز دی:۔

"ہلو کیپٹن کم اِن۔ ہاؤ ڈو یو ڈو؟" Hullo captain How do you do

"تھینک یو سر۔ ~~کوائٹ آلرائٹ~~" ہاؤ ڈو یو ڈو۔ Thank you Sir

"کہو کیسے آئے ہو؟"

"جناب وہ بوتلوں والا کئی دفعہ تقاضا کر چکا ہے۔ پچھلے میچوں میں جو بوتلیں استعمال ہوئی تھیں ان کے دام اب تک نہیں ملے۔"

"اچھا اچھا۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ اس سے کہہ دینا کہ میں اس کا بل پورے کا پورا پاس کر دوں گا۔"

"بہت بہتر۔ اور آج شام کو آپ ہاکی گراؤنڈ پر تشریف لائیں گے نا؟"

"میں؛ میں تو آج شاید نہ آسکوں۔"

"کچھ پرچے دیکھنے باقی رہ گئے ہیں کیا؟"

"پرچے ورچے تو نہیں۔ ایک جگہ جانا ہے۔"

"کہاں؟"

"کوئی خاص جگہ نہیں۔ یونہی ایک پارٹی سی ہے۔"

گارڈن پارٹیوں میں تین قسم کے آدمی آیا کرتے ہیں۔ ایک تو وہ سوٹ اور ہیٹ پوش اشخاص جن کی توند نکلی ہوئی اور کھوپڑی صفاچٹ ہوتی ہے۔ چندیا پر چند بال ہوتے ہیں جن کو نہایت احتیاط سے برش کیا ہوتا ہے۔ ان کے سوٹ کا کپڑا نہایت قیمتی اور سلائی نہایت گھٹیا ہوتی ہے۔ اکثر کے مُنہ میں سگار رہتا ہے۔ دوسرے وہ جو سوٹ کے ساتھ ٹوپی یا ہیٹ یا پگڑی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے سوٹ

کا کپڑا معمولی ہوتا ہے لیکن سلائی عمدہ - یا شاید توند کی غیر موجودگی سے سُوٹ "فٹ" معلوم ہوتا ہے - تیسرے وہ جو سفید شلوار اور سفید پگڑی، یا تنگ پاجامہ اور فلیٹ کی کشتی نما ٹوپی کے ساتھ بند گلے کا کوٹ پہنے ہوتے ہیں - اکثر ڈاڑھی مونچھ رکھتے ہیں اور قد و قامت میں پہلی دو قسموں پر فوقیت رکھتے ہیں -

قسم اوّل میں "گیسٹ آف دی ایوننگ" - ڈپٹی کمشنر - سشن جج - جنٹ صاحب اور پولیس کپتان وغیرہ ہوتے ہیں - یہ لوگ شامیانے کے نیچے اور کاؤچوں کے اُوپر بیٹھتے ہیں - قسم دوم میں کالجوں کے پروفیسر - وکیل لوگ - گورنمنٹ سکول کا ہیڈ ماسٹر اور دیگر سرکاری عہدہ دار جو "بابوجی" کہلانے کی زد میں آسکتے ہوں، شامل ہیں - یہ لوگ کچھ شامیانے کے اندر کچھ باہر ان چھوٹی میزوں کے گرد بیٹھتے یا بٹھا دیئے جاتے ہیں جن کے گرد چار چار کرسیاں لگی ہوتی ہیں - قسم سوم میں شہر کے رئیس پانچ روپیہ پنشن پانے والے نواب - قومی سکولوں کے ہیڈ ماسٹر - پنشن یافتہ صوبیدار - جمعدار - تھانیدار اور ہر قسم کے 'دار' ہوتے ہیں - ۱۸۹۷ء سے قبل کے میٹرک پاس وکیل اور 'داروغہ جی' بھی اسی قسم میں شامل ہیں - یہ لوگ شامیانے سے دُور بڑی بڑی میزوں کے گرد بیس بیس بائیس بائیس کی تعداد میں بٹھا دیئے جاتے ہیں -

قسم اوّل والوں کی میز پر لاہور کی کسی عمدہ انگریزی دکان سے منگوائے ہوئے پلین کیک - آمنڈ کیک - شوگر کوٹڈ کیک - کاغذ کی کنگرے دار کٹوریوں میں رکھی ہوئی پیسٹریاں - سینڈوچ وغیرہ 'کیک سٹینڈ' پر لگے ہوئے میزوں پر چُنے ہوتے ہیں - خشک اور تر میوے چینی کی پلیٹوں میں مع سٹینفیلڈ کی بنی ہوئی چھریوں کے رکھے ہوتے ہیں - قسم دوم والوں کی میزوں پر دیسی مٹھائی جس میں رس گلے ضرور ہوتے ہیں کافی مقدار میں ہوتی ہے - نمکین بیسنی سویاں بھی ہوتی ہیں اور تھوڑا بہت میوہ بھی ہوتا ہے - کیک پیسٹری میزوں پر نہیں ہوتے لیکن 'سرو' کئے جاتے ہیں - اور ان دو اشیا کا اپنے حسبِ منشا مقدار میں حاصل کرنا آپ کے عہدے اور قابلیت پر نہیں بلکہ جدت طرازی اور قوتِ ارادی پر منحصر ہوتا ہے -

قسم سوم والوں کے لئے اس میلے کچیلے مقامی حلوائی کی بنی ہوئی معمولی مٹھائی ہوتی ہے جو میونسپل کمیٹی کے کسی زور دار ممبر کی گلی کے نکڑ پر رہتا ہو - ساڑھے تین آنے درجن کے ہری چھال والے کیلے بھی بہ حساب ایک عدد فی کس رکھے جاتے ہیں - چائے کی پیالیاں تو ضرور رکھی جاتی ہیں لیکن شکر دان نہیں رکھے جاتے - یہ چیز مانگنے پر "سپلائی" کی جاتی ہے - چائے بھی کبھی کبھار پہنچ ہی جاتی ہے - اور اتنی کافی ہوتی ہے کہ ہر ایک شخص پوری ایک ایک پیالی ضرور پی سکتا ہے -

---

تجربے نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ شام کی گارڈن پارٹی کی وجہ سے رات کے کھانے کی اشتہا رجاتی رہتی ہے - اگر کھانا زبردستی کھالیا جائے تو اگلے روز اینوز فروٹ سالٹ کی بوتل خریدنا پڑتی ہے - اور اگر نہ کھایا جائے تو رات کے ڈیڑھ بجے آنکھ کھل جاتی ہے اور سینے کے نیچے اندر کی طرف کچھ کھرچن سی محسوس ہونے لگتی ہے - تھوڑی دیر تک سونے کی بیکار کوشش کرنے کے بعد انسان کچھ

ایسا محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ کوئی کام کرنا بھول گیا ہے۔ پھر ایک دم سے یہ بات دماغ میں آتی ہے کہ سونے سے پیشتر کھانا نہیں کھایا تھا۔ ساتھ ہی معدے میں کوئی چیز اِدھر سے اُدھر لڑھکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اور انسان اصلیت کی تہ کو پہنچ جاتا ہے کہ سخت بھوک لگی ہے۔ اب اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں کہ انسان اُٹھ کر یا تو تہجد کی نماز پڑھنا شروع کر دے یا پھر "نتیجۂ کاوشِ طبع جناب مہرم الدین صاحب محرم نمبکنوی" کے عنوان سے غلمتِ شب۔ مارِ کہکشاں۔ سپیدۂ سحر پر جولانیٔ طبع دکھانے لگے۔ اب اگر آپ ان دونوں باتوں میں سے ایک کی بھی قابلیت نہیں رکھتے۔ تو آپ کے لئے صرف ایک راہ رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ گارڈن پارٹی میں ہی "ایں کار از من آید و مرداں چنیں کنند" کہتے ہوئے ایسی کارروائی کیجئے کہ رات کے کھانے اور سوتے وقت کے دودھ سے بے نیاز ہو جایئے۔ یہ کام بہ ظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل صرف تھوڑے سے تدبّر کی ضرورت ہے۔

گارڈن پارٹی کے احاطے میں آتے ہی ان صاحب یا صاحبان سے جو استقبال کر رہے ہوں۔ ہاتھ ملا کر ان کے "وہاں تشریف رکھیئے" کی پروا نہ کرتے ہوئے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگ جایئے۔ اور پھر جس طرح نپولین دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر ٹانگیں چوڑی کر کے میدانِ جنگ کا معائنہ کیا کرتا تھا اسی طرح آپ بھی میدانِ "پارٹی" کو بھانپئے اور یہ دیکھیے کہ سپنسر اینڈ کو کے سبز پٹے والے سفید پوش کس طرف سے سروس شروع کریں گے۔ آپ اسی طرف جا کر ان کے میگزین کے سامنے مورچہ جما دیجے۔ یعنی اس خیمے کے سامنے جس میں یہ اصطلاح علی گڑھ "سامانِ چرندم خورندم" دھرا ہو۔ کسی نزدیک ترین کرسی پر بیٹھ جایئے اور اپنے پاس والی کرسی پر اپنی ہیٹ رکھ لیجئے۔ پھر ہیٹ وہاں ہی چھوڑ کر استقبال کرنے والے حضرات کی صف میں آپ بھی کھڑے ہو جایئے۔ اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھئے۔ بڑی سے بڑی توند والا لکھ پتی۔ بھاری سے بھاری پگڑ والا سردار۔ لمبے سے لمبے طرّے والا ملک، ڈھیلی سے ڈھیلی شلوار والا آنریری مجسٹریٹ۔ مشن اسپتال کی کالی سے کالی ڈاکٹرنی۔ صفاچٹ کھوپڑی والے گزیٹڈ آفیسر وغیرہ وغیرہ میں سے کسی کی مجال نہیں کہ آپ سے ہاتھ ملائے بغیر آگے نکل جائے اب آپ ان سب کو "دِس وے پلیز" کہتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے ادھر چلتا کرتے جایئے جدھر آپ والی میز نہیں ہے جس وقت کہ آپ کا کوئی دوست آ جائے۔ پھر آپ کو میزبانی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے دوست کا ہاتھ لیجئے۔ اور اپنی میز پر آ کر آمنے سامنے دو کرسیوں پر آپ دونوں بیٹھ جایئے اور باقی دو کرسیوں پر اپنی اپنی ہیٹ رکھ دیجئے۔ اب جو شریف آدمی ادھر آئے گا۔ وہ یہ سمجھ کر کہ یہ ہیٹیں کسی دو اصحاب کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ آپ کی میز کے پاس بھی نہ پھٹکے گا بلکہ خود اپنی سطح' آپ تلاش کرے گا۔ اور میز پر مکمل قبضہ آپ دونوں کا ہی رہے گا۔

اب آپ اطمینان سے بیٹھ کر خلقِ خدا کا معائنہ کیجئے۔ وہ دیکھئے ایک بزرگ قدیمی وضع کے تشریف لا رہے ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکر کھا رہے ہیں۔ ہر اس ہیٹ و سوٹ پوش شخص کو جو سامنے آ جائے سلام کرتے جاتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی صاحب اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیتے ہیں تو یہ اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر مصافحہ کرتے ہیں۔ اور جہاں کوئی بیٹھنے کو کہتا ہے وہیں بیٹھ جاتے

ہیں۔ اور ایک بڑے سے رومال سے پیشانی اور چہرے کا پسینہ پونچھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ یقیناً کوئی خاندانی 'اشراف' ہیں۔

ایک صاحب کوٹ اور پتلون پہنے چلے آرہے ہیں۔ پتلون بہ نسبت کوٹ کے نیا معلوم ہوتا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پتلون کی بہ نسبت کوٹ زیادہ پہنا جاتا رہا ہے۔ نکٹائی سے بے نیاز ہیں۔ پگڑی کی وضع اور مونچھوں کی قطع جھٹی جماعت کی تاریخ ہند میں دی ہوئی بالاجی باجی راؤ پیشوا کی تصویر یاد دلاتی ہیں۔ یہ صاحب دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر ہر کہ و مہ کو سلام کرتے جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ آریہ سکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں اور دیکھئے وہ صاحب سُوٹ پہنے۔ ہیٹ لگائے لمبا سا سگار مُنہ میں دبائے لوگوں کے سلاموں کا جواب گردن کی جنبش سے دیتے ہوئے آرہے ہیں۔ یہ یا تو پولیس کپتان ہیں یا جنٹ صاحب + وہ صاحب جو عمدہ سا سُوٹ پہنے اور پھولوں کے ہار ہاتھوں میں تھامے آرہے ہیں اور جن کے چہرے سے بیک وقت گھبراہٹ اور 'میزبانی وقار' ٹپکتی اور ٹپکتا ہے۔ یہ ضرور میونسپل کمیٹی کے صدر ہوں گے۔ جنہیں پارٹی کے اختتام پر 'تمام شہر' کی طرف سے تمام معزز مہمانوں کی تشریف آوری کے شکریے کا 'خوشگوار فرض' ادا کرنا ہوگا + وہ ایک اور صاحب کو دیکھئے جو نہایت بوکھلائے ہوئے ہیں۔ آدمیوں سے ٹکراتے۔ کرسیوں کو ٹھکراتے۔ نوکروں سے جھگڑتے اور خاکروبوں سے بگڑتے اِدھر سے اُدھر بھاگے پھر رہے ہیں۔ یہ صدر میونسپل کمیٹی کے "رائٹ ہینڈ" (دست راست) ہیں۔ انہیں آپ ضرور سلام کر لیجئے خواہ ان کے ظاہری حُلیے سے آپ قطعاً مرعوب نہ ہوئے ہوں۔ جس وقت سگرٹ اور سگار پیش ہونے لگیں گے۔ اس وقت آپ کو اپنی دُور اندیشی کا صلہ ملے گا +

جب وقت معینہ سے کافی زیادہ وقت گزر جاتا ہے۔ سُورج کی روشنی زرد پڑنے لگتی ہے اور چائے کا 'وقت' 'بیوقت' ہو جاتا ہے تو سڑک پہ بینڈ بجنے سے تین چار موٹروں کے بیک وقت رُکنے اور ان کے انجنوں کو بند کرنے کی آواز سے اور ٹہنیوں اور پتّوں کے بنے ہوئے "گیٹ" کے سامنے ہجوم میں کھلبلی پڑنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "گیسٹ آف دی ایوننگ" تشریف لے آئے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے سُوٹ پوش انسانوں کا گروہ ہوتا ہے۔ اکثر کے گلے میں ہار ہوتے ہیں۔ یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے کی طرف آتا ہے۔ "گیسٹ آف دی ایوننگ" ایک یا دو آدمیوں سے ہاتھ ملاتے ہیں اور کاؤچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ صدر میونسپل کمیٹی آن کر اُن کو دس بارہ ہار پہنا دیتے ہیں اور ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ شامیانے کے گرد اکٹھے ہو کر "گیسٹ آف دی ایوننگ" کو اس طرح دیکھنا شروع کرتے ہیں گویا وہ کرۂ مریخ سے لائی ہوئی کوئی اعجوبۂ روزگار شئے ہے۔ لیکن آزمودہ کار لوگ اپنی کرسیوں سے نہیں کھسکتے کیونکہ سپنسر اینڈ کو کے سبز پٹے والے 'سروس' شروع کر چکے ہیں۔ اور جیسا کہ ہر "گرگِ پارٹی دیدہ" جانتا ہے۔ گیسٹ آف دی ایوننگ تو صرف ایک واجبی سی چیز ہے، اصل چیز ہے ٹی پارٹی۔ اس لئے آپ اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھتے ہوئے صرف اپنا فکر کیجئے۔

چائے شروع ہوتی ہے۔ جو لوگ شامیانے تک آ گئے تھے۔ خالی کرسیوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرنے لگتے ہیں اور جسے جگہ

نہیں ملتی وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے چہرے کے انداز سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے گویا وہ جان بوجھ کر نہیں بیٹھنا چاہتا آپ دلجمعی سے اپنی میز پر چنی ہوئی عمدہ عمدہ چیزیں کھاتے رہئے۔ اور جب وہ ختم ہو جائیں تو آپ کھڑے ہو کر ٹہلنا شروع کیجئے۔ لوگ خواہ مخواہ آپ کو بیچے از منتظمانِ پارٹی سمجھیں گے۔ عام طور پر ایسی پارٹیوں میں بے شمار منتظم ہوتے ہیں اور اس لئے دراصل کوئی بھی منتظم نہیں ہوتا۔ ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ کوئی نہ کوئی دیکھ بھال کر ہی رہا ہوگا۔ پس اگر آپ کسی بیرے سے جو عمدہ سا کیک جس پر بادام لگے ہوئے ہوں لئے جا رہا ہو۔ زور سے کہیں "ارے بھئی اس میز پر بھی تو رکھو" اور اشارہ اپنی میز کی طرف کر دیجئے تو وہ بیچارہ یہ سمجھ کر کہ آپ پارٹی کا انتظام کرنے والوں میں سے سب سے بڑے نہیں تو اچھے خاصے بڑے آدمی ہیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل کرے گا۔ جب وہ چلا جائے۔ تو آپ اپنے دوست کے ساتھ شریک ہو جائیے اور جب کھا پی کر فارغ ہو جائیں اور تسلی ہو جائے کہ اب رات کا کھانا آسانی سے چھوڑا جا سکتا ہے تو ان صاحب کے پاس جو سگرٹوں کا ڈبہ لئے پیش کرتے پھر رہے ہوں جائیے اور کہئے "اوہو۔ آپ بڑی دیر سے یونہی پھر رہے ہیں آپ نے تو کچھ بھی نہیں کھایا پیا ہوگا جائیے آپ بیٹھئے اور یہ ڈبہ مجھے دے دیجئے میں مہمانوں کو آفر کرتا رہوں گا۔" سترفیصدی یقین اس بات کا ہے کہ وہ مان جائیں گے اور ڈبہ آپ کے حوالے کر کے چلے جائیں گے۔ بس پھر آپ کے وارے نیارے ہیں۔ خود خوب پیجئے اور پھر پھر کے اپنے ہی دوستوں کے پاس جا جا کر انہیں پیش کیجئے۔ افسروں کو بھی پیش کیجئے لیکن اس وقت جب ذرا پہلے وہ کسی اور سے یا اپنی ہی جیب سے سگرٹ لے کر سلگا چکے ہوں۔ تاکہ وہ "نو۔ تھینک یو" کہہ دیں۔ اس طرح سے آپ افسروں کی "نظر میں آجائینگے" اور آپ کے سگرٹ بھی محفوظ رہیں گے اور یہ آپ جانتے ہیں کہ داشتہ آید بکار۔ ۔ ۔ ۔

شبیر احمد قاری

گاتی ہوئی راہیں

ہیں جو یہ پگڈنڈیاں میداں میں بل کھائے ہوئے
ہم انہیں راہوں پہ گاتے تھے کبھی
شام کو اُلفت کے گیت

جو مناظر دل لبھاتے تھے کبھی
اُن مناظر پر ہے اب افسردگی چھائی ہوئی
دِن گئے اُلفت کے بیت

لیکن اب بھی چھاؤں میں تاروں کی اکثر وقتِ شام
میں سُنا کرتا ہوں ان راہوں پہ گانے کی صدا
یاد ہیں ان کو وہ گیت

مشک میں بس کر جو شب کو سنسناتی ہے ہوا
اُس ہوا سے کوئی پیہم مجھ کو دیتا ہے پیام
پریت کر دُنیا میں پریت

جلال ملیح آبادی

ساربان کی داستان

جیسا کہ میرے کپڑوں سے ظاہر ہے میں مصر کے ایک گاؤں کا باشندہ ہوں اور وہیں میں پیدا ہؤا تھا۔ لیکن میں آج کی طرح ہمیشہ سے غریب نہیں ہوں۔ میرا باپ متعدد اونٹوں کا مالک تھا جنہیں وہ ان تاجروں کو کرایہ پر دیا کرتا تھا جن کے قافلے ہر سال شہر سے باہر دُور دُور جایا کرتے تھے۔ جب وہ مر گیا تو اس کی کُل جائداد میرے قبضہ میں آگئی اس کے علاوہ میرے باپ کے وقت کے پُرانے گاہکوں کا حسنِ ظن بھی میرے ساتھ قائم رہا۔ اس لئے میرے کاروبار کو خوب عروج ہؤا۔ میرے اونٹ ہمیشہ کرایہ پر لئے جاتے اور میں اپنے اونٹوں کے ساتھ ہمیشہ جایا کرتا تھا تاکہ انہیں بیدردی سے استعمال نہ کیا جائے۔ چنانچہ متعدد بار مکہ معظمہ سے بھی ہو آیا تھا جس کی شہادت یہ سبز پھُندنے والی ٹوپی دے سکتی ہے۔ میری زندگی پریشانی اور مسرت کا مجموعہ تھی! سفر کی صعوبت اور تکالیف برداشت کر کے خوش خوش اپنی بیوی اور بچوں کے پاس آتا اور جتنے دنوں میرا کاروبار مجھے اجازت دیتا۔ گھریلو زندگی کی چہل پہل سے لطف اندوز ہوتا۔ ان دنوں میں نے خوب محنت کی اور دولتمند ہو گیا۔

ایک بار جبکہ میں ایک قافلہ کے ساتھ ایک دشوار گزار ریگستان سے ہو کر گزر رہا تھا میری ایک پیاری اونٹنی نے بچہ دیا۔ چونکہ میرے اونٹ کافی سے زیادہ تھک چکے تھے اس لئے پہلے مجھے خیال ہؤا کہ اس گوشت پوست کو اس کی قسمت پر چھوڑ دوں۔ لیکن پھر اس کے خوبصورت بدن، اس کے قوی جثہ اور اس کے متناسب اعضا کو دیکھ کر میں نے اسے گھر لے آنا پسند کیا۔ میں نے ایک اونٹ کا نصف بوجھ دوسرے اونٹوں پر تقسیم کر دیا اور باقی ماندہ جگہ پر اسے باندھ لیا۔ ہم لوگ جب قاہرہ پہنچے تو ننھا جانور کچھ سیانا ہو گیا تھا اس لئے اس کی جان بچا کر مجھے بیحد مسرت ہوئی۔ اونٹ کے ماہروں نے اسے دیکھ کر غیر معمولی حسین اور طاقتور بتایا اور خوشخبری سنائی کہ چند دنوں کے بعد سفرِ حج کے موقع پر یہ مبارک جانور قرآن شریف لے جانے کے لئے منتخب ہوگا اور پانچ سال کے بعد ایسا ہی ہؤا۔ اس پانچ سال کی مدت میں میں حسبِ دستور قافلوں کے ساتھ جاتا اور اپنی دولت میں اضافہ کرتا رہا۔

اب میرا اُونٹ نشوونما کی آخری منزل کو پہنچ چکا تھا، وہ جب کھڑا ہوتا تو اور اونٹوں سے تین فٹ بلند رہتا۔ جب سفرِ حجاز کی تیاری ہونے لگی اور قرآن شریف لے جانے کے لئے اچھے سے اچھے اونٹ کی تلاش ہوئی تو میں اسے شیوخ کے پاس لے گیا اور اسے اس عزت و شرف کے اُمیدوار کی حیثیت سے پیش کیا۔ یہ لوگ میرا اُونٹ فوراً چُن لیتے اگر ایک شاہ صاحب نہ ہوتے جنہوں نے نہ معلوم کیوں میرے اونٹ کا کرایہ پر لیا جانا ناپسند کیا اور کہا کہ اگر یہ اونٹ قرآن مجید لے جانے کے لئے منتخب ہؤا تو قافلہ کی شامت آ جائے گی۔

چونکہ شاہ صاحب پیر و مرشد سمجھے جاتے تھے اس لئے شیوخ سہم گئے اور کوئی فیصلہ کن جواب نہ دے سکے۔ شاہ صاحب کی اس مداخلت سے برہم ہو کر میں نے انہیں سخت سُست کہہ دیا، اُنہوں نے شور و واویلا مچا دیا۔ اس پر لوگ مجھ پر پل پڑے اور اس قدر مارا کہ میں نیم مردہ ہو گیا۔ پھر جب میں بھاگنے لگا تو اس کمبخت نے مجھ پر تھوڑا سا بالو پھینکا اور چلا کر کہا " اسی طرح عذابِ الٰہی سے قافلہ تباہ و برباد ہو جائے گا اگر اللہ کا پاک کلام اس کے منحوس اونٹ کو لے جانے کی اجازت دے گئی"۔ آخر کار اس سے معمولی درجہ کا اُونٹ چُن لیا گیا اور مجھے ناکامی ہوئی۔ لیکن دوسرے سال شاہ صاحب قاہرہ میں موجود نہ تھے اور چونکہ خوبصورتی میں میرے اُونٹ کا ہمسر ایک اُونٹ بھی نہ تھا۔ اس لئے شیوخ نے بالاتفاق اسے پسند کر لیا۔ اور مخالفت کی ایک صدا بھی بلند نہ ہوئی۔

اپنی اس خوش قسمتی پر میں اپنے کُل خاندان کے لئے رحمت تصوّر کرتا تھا شاداں و فرحاں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہؤا میں اپنی بیوی کے پاس پہنچا۔ میری طرح وہ بھی مسرور ہوئی اور معلوم ہوتا تھا کہ میرا خوبصورت اونٹ بھی اپنے اس اعزاز سے جس کا وہ مستحق قرار دیا گیا تھا آگاہ ہے کیونکہ اس نے ہم لوگوں کے پیار کے جواب میں اپنی لانبی گردن کو جُھکا دیا اور اپنے سر کو ہم لوگوں کے کندھوں پر رکھ دیا۔

قافلے والے جمع ہو گئے۔ سالہا سال گزرے قاہرہ سے اتنا بڑا کارواں روانہ نہ ہؤا تھا، یہ اٹھارہ ہزار اونٹوں کی جمعیت پر مشتمل تھا آپ میری بے پایاں مسرت کا اندازہ اس سے کر سکتے ہیں کہ جب جلوس سڑک سے گزر رہا تھا تو میں نے دُور سے اپنی بیوی کو اپنا شاندار اونٹ دکھایا جس کی مہار زر و جواہر سے مرصّع تھی جسے محترم شیوخ جو سبز عبا میں ملبوس تھے لے جا رہے تھے، جس کی پشت پر وہ صندوق رکھا ہؤا تھا جس کے اندر اسلامی شریعت کی مقدس کتاب محفوظ تھی اور جو اپنے ہر چہار طرف مسرور و مطمئن گانے بجانے والے مرد اور عورتوں کے بے شمار جھنڈ دیکھ کر بصد عزّ و تمکنت چل رہا تھا۔

چونکہ اگلے دن قافلہ کو شہر سے رخصت ہونا تھا اس لئے میں اپنے اور اونٹوں کو جو زیارتِ کعبہ کے لئے کرایہ پر لئے گئے تھے اپنے ایک ملازم کے سپرد کر کے اپنی بیوی اور بچوں کے پاس چلا آیا کہ باقی وقت اُن کی معیت میں گزار سکوں۔ دوسرے دن صبح کو میں نے بیوی بچوں کو الوداع کہا، اور گھر سے جُدا ہو رہا تھا کہ میری سب سے چھوٹی بچی نے جو کم و بیش دو سال کی تھی آواز دی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ذرا سی دیر کے لئے اُس کے پاس آؤں اور اُسے اپنا بوسہ دیتا جاؤں۔ میں نے اسے اپنی گود میں اُٹھا لیا، اُس نے اپنی عادت کے موافق اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو میرے ڈھیلے ڈھالے لبادہ کے جیب میں ڈال دیا۔ وہ شاید پھل تلاش کر رہی تھی، کیونکہ میرا معمول تھا کہ میں بازار سے واپس ہوتے ہوئے اس کے لئے ہمیشہ کچھ پھل لایا کرتا تھا۔ لیکن آج جیب میں کچھ نہ تھا۔ میں نے اسے اس کی ماں کی گود میں دے دیا۔ اور اس خیال سے کہ مقررہ وقت سے دیر نہ ہو جائے تیز تیز قدم اُٹھاتا ہؤا روانہ ہو گیا۔ شاید آپ کو اس کا علم ہو گا کہ ہم مصری لوگ جیسا کہ اکثر قافلوں کا دستور ہے یکے بعد دیگرے ترتیب وار نہیں چلتے بلکہ ایک صف میں ہو کر پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ روانہ ہونے کی تاریخ سے ایک روز قبل تمام ضروری انتظامات درست کئے جاتے ہیں اور آفتاب

غروب ہونے کے بعد فوراً ہی کوچ کرتے ہیں۔ شام کے وقت ہم لوگوں کا قافلہ روانہ ہوا، دو روز کی مسافت طے کر کے ہم لوگوں نے تین دن قیام کیا تاکہ اپنے اپنے مشکوں کو سویز کے پانی سے بھر سکیں، اور الیتاح جیسے ریگستان میں چلنے کے لئے جانوروں کو تازہ دم کر سکیں۔

تیسرے دن جب کہ میں اپنے حقہ کا کش لگا رہا تھا، اور میرا اونٹ میرے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا مجھے قاہرہ کی جانب سے ایک سواری آتی ہوئی نظر آئی جو بہت تیزی سے آ رہی تھی، اگرچہ یہ میرے سامنے سے بجلی کی طرح گزر گئی لیکن پھر بھی مجھے سوار کے پہچاننے کا کافی موقع مل گیا۔ یہ سوار وہی شاہ صاحب تھے جنہوں نے گذشتہ سال کے حج میں میرے اونٹ کے قرآن شریف لے جانے پر منحوس پیشگوئی کی تھی۔

شاہ صاحب نے اپنی اونٹنی کو حاجیوں کے امیر کے سامنے روکا جو قافلہ کے حکمران تھے۔ اس کے اس تعاقب کا سبب جسے میں نے پہلے ہی سے یہ سمجھ رکھا تھا کہ وہ میرے اونٹ کے متعلق کچھ پیشنگوئی کرے گا معلوم کرنے کے لئے مضطرب ہو کر میں جلدی سے اس جگہ پہنچا۔ میں نے اسے امیر اور ان لوگوں کے سامنے جو اس کے گرد حلقہ باندھے ہوئے تھے تقریر کرتے ہوئے پایا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر میرا اونٹ مار نہ ڈالا گیا اور اس کی جگہ دوسرا نہ چنا گیا تو تمام کے تمام قافلہ کو ہولناک مصیبتوں کا سامنا ہوگا۔ تھوڑی دیر تک سخت پر جوش انداز میں تقریر کر کے اور تمام قافلہ میں ہلچل مچا دینے کے بعد اس نے اپنی اونٹنی کا رُخ پچھم کی طرف کیا اور تھوڑی دیر میں نظر سے اوجھل ہو گیا۔

امیر سخت پریشان تھے، مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگ آپس میں صلاح و مشورہ کرنے لگے۔ میں ڈرا کہ یہ لوگ شاہ صاحب کی تجویز قبول کر لیں گے۔ مجھے یہ بھی خطرہ ہوا کہ میرا اونٹ جان سے جائے گا اور جس اعزاز کے لئے وہ مخصوص کیا گیا تھا۔ اس سے محروم ہو جائے گا۔ میں نے ایک جرم کا ارتکاب کیا، میں جھوٹ بولا۔

مَیں نے کہا" امیر! آپ اس شخص کی بات نہ سنیں جو میرا دشمن ہے، ایک مرتبہ جب کہ وہ میرا مہمان تھا۔ میری روٹیاں کھانے کے بعد میری بیوی کی عصمت پر حملہ کر کے سخت نمکحرامی کا ثبوت دینا چاہتا تھا اور اس پر مَیں نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ اب یہ اس طرح اپنا انتقام لینا چاہتا ہے۔ میرے اونٹ کو قافلہ کے ساتھ جانے دیجئے کیونکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل سچ ہے۔" میری بات سچی مانی گئی، شاہ صاحب کے الہامات بے اعتبار سمجھے گئے اور اسی شب کو ہم لوگ الیتاح کے لق و دق میدان میں چل پڑے۔

شاید آپ نے حج کا سفر نہ کیا ہو۔ اس لئے ہم لوگ جس سرزمین سے گزر رہے تھے۔ اس کا تصور آپ ذہن میں قائم نہیں کر سکتے۔ یہ بالو کا ایک وسیع خطۂ زمین ہے جہاں مسافروں کے نقوش قدم سے بنے ہوئے راستے آندھی اور جھکڑ سے مٹ مٹ جاتے ہیں ——— بے پانی کا ایک وسیع سمندر ——— دُور تک پھیلا ہوا ایک سنسان ریگستان۔ اب ہم لوگ لق و دق بیابان میں داخل ہو گئے۔ چونکہ جانوروں کا طویل جھنڈ جو حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا بالکل خموش جا رہا تھا اس لئے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اونٹ نہیں بلکہ سائے چل رہے ہیں۔

شاہ صاحب کی پیشین گوئی کے باوجود ہم لوگوں کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا، سات راتوں کے تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم لوگ بخیریت تمام نخیل پہنچے۔ یہاں پہنچ کر ہم نے اپنے اپنے خالی مشکیزوں کو دوبارہ پانی سے بھر لیا۔ جن لوگوں سے میری ملاقات تھی اُنہوں نے کنوئیں پر میرے دشمن شاہ صاحب کی غلط پیشینگوئی کا خوب خوب مضحکہ اُڑایا۔ اب قلعہ عقابہ پہنچنے کے قبل تین دن سخت مصیبتوں کا مقابلہ کرنا تھا۔

دوسرے دن صبح کا وقت تھا، اپنا اپنا خیمہ نصب کئے ہوئے ایک ہی گھنٹہ گزرا تھا کہ شاہ صاحب پر جھوٹی تہمت لگانے کے جرم میں خدا کا قہر اور ان کی ہولناک پیشینگوئی حرف بحرف صحیح اُتری۔

ایک سیاہ بدلی اُفق پر نمودار ہوئی، یہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگی اور چمکیلے زرد رنگ میں تبدیل ہوگئی۔ پھر اوپر بلند ہوتی گئی یہانتک کہ اس نے آسمان کے نصف حصّہ کو چھپا دیا اور دفعتہً ہم لوگوں پر آندھی کی شکل میں برس پڑی، وہ آندھی جو بالو کے بڑے بڑے پہاڑوں کو ان کے قدموں پر گرا گرا کر اور ہم حاجیوں کے سروں پر انہیں زور زور سے پھینک کر اپنے سامنے کی ہر چیز کو بہا لے گئی۔ امیر کا عظیم الشان خیمہ جو سب سے پہلے آندھی کی نذر ہوا میرے قریب سے اُڑتا ہوا گزرا۔ دوسرے لوگ یا تو زمین کے برابر ہو گئے یا انہیں آندھی بہا لے گئی اور وہ چرخی کی طرح چکر کھا رہے تھے۔ ریت کے بڑے بڑے ستون ہم پر گر رہے تھے اور بیشمار آدمی اور جانور گھُٹ گھُٹ کر مر رہے تھے۔ بعض اونٹ اپنا مُنہ زمین میں چھپائے ہوئے تھے۔ ان کی اس ذکاوت سے فائدہ اُٹھا کر مَیں نے بھی ایسا ہی کیا مگر صد درجہ خوفزدگی اور سکتہ کے عالم میں قسمت کے لکھے ہوئے کا منتظر تھا۔ ابھی تک آندھی ہم لوگوں پر اپنی پوری تباہ کاریوں کے ساتھ حملہ آور نہیں ہوئی تھی، چند منٹ کے بعد تو ہاتھ کو ہاتھ نہیں سُجھائی دیتا تھا —— ہر جگہ تاریکی تھی، خوفناک تاریکی جسے آخری سانس لینے والوں کے ہذیان، عورتوں کے نالہ و شیون اور ہزاروں ہزار گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کی بھاگ دوڑ نے جو رسیوں اور ڈوریوں کو توڑ کر اس طوفان کی ہلاکت آفرینی سے نجات پانے کی کوشش میں پاگل جانوروں کی طرح بدک رہے تھے اور بھی مہیب بنا دیا تھا۔

میں اپنے اونٹ کی ایک بغل میں پڑا رہا تھا اور اپنا مُنہ اُس کے پہلو میں چھپائے ہوئے موت کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھ پر اس شخص کی سی دہشت طاری تھی جو یہ سمجھ رہا ہو کہ یہ عذابِ الیم، یہ خدائی غیظ و غضب صرف اُسی پر برس رہا ہے۔ کامل ایک گھنٹہ تک اسی حالت میں رہا اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ دوزخ کی کوئی تکلیف بھی اس تکلیف سے زیادہ نہیں ہوسکتی جو اس تھوڑی سی مدت میں اُٹھائی۔ گرم گرم ریت ہمارے کپڑوں میں گھُس گئی تھی۔ بدن کے کُل مسامات بند ہو گئے تھے اور مجھے مشکل سے کبھی کبھی گرم ہوا میں سانس لینے کا موقع مل جاتا تھا جو میرے رشتۂ حیات کے باقی رکھنے کا واحد ذریعہ تھا۔ آخر کار میں نے ذرا آسانی سے سانس لینے کی صُورت نکالی، اب آندھی کا شور و شغب بھی سنائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے سر کو بلند کیا لیکن میری آنکھیں بینائی کھو چکی تھیں، میں زرد شعاع کے

سوا کچھ نہ دیکھ سکا۔ میں نے سمجھا کہ میں اندھا ہو گیا ہوں اور الیناح جیسے بے آب و گیاہ ریگستان میں ایک اندھے کا کیا حشر ہو سکتا ہے میں نے اپنے سر کو زمین پر ڈال دیا۔ مجھے اپنے گھر کے لوگوں کا خیال آگیا، میں مایوسی اور نا اُمیدی کے ہجوم میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

آنسوؤں کے بہنے سے میری آنکھوں پر خوشگوار اثر ہؤا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری تکلیف دور ہو چکی ہے اپنے سر کو اُٹھایا ——— اب میں دیکھ سکتا تھا! خدا تعالیٰ کی اس عنایت کے شکریہ میں بصد عجز و نیاز سربسجود ہو گیا۔ ہاں میں دیکھ سکتا تھا لیکن کونسا منظر میرے پیشِ نظر تھا۔ آسمان صاف اور لامتناہی فضا گرد و غبار سے پاک تھی۔ لیکن وہ ہزار ہا نفوس جو میرے ساتھ تھے، وہ جانور اور آدمیوں کا پرشوکت اژدہام، یہ سب کہاں گئے؟ امیر حجاج اور اس کے محافظ کہاں تھے؟ سلطنت کے وزرا، سپہ سالار، لشکرِ عظیم، مقدس شیوخ، متبرک اونٹ اور گانے بجانے والے کہاں؟ مختلف قومیں اور بے شمار قبیلے جنہوں نے کارواں میں شرکت کی تھی وہ کہاں؟ سب کے سب ہلاک ہو گئے! ریگ کے اونچے اونچے ٹیلے اس جگہ کا نشان بتاتے تھے جہاں وہ لوگ مدفون تھے، مگر ان پر سوائے آدمیوں اور جانوروں کے اس جسم کے جواب ناک بالو کے ڈھیر میں چھپے نہ تھے اور کوئی یادگار نہ تھی۔ سب کے سب رخصت ہو چکے تھے، سوائے ایک کے، اور وہ ایک وہ اکیلا گنہگار خود میں تھا جسے محض اس لئے زندہ رہنے کی اجازت دی گئی تھی کہ وہ اس ہلاکت اور نقصانِ عظیم کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے جو اس کے اور صرف اس کے گناہ کا نتیجہ تھا۔

چند منٹ یاس اور نا اُمیدی سے بے خبر اس نظارہ کو غور سے دیکھتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ان تمام لوگوں سے علیحدہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ میری موت ان کی موت سے بھی زیادہ دہشتناک ہو۔ لیکن فوراً ہی مجھے اپنی بیوی اور بچوں کا خیال آگیا اور ان لوگوں کی خاطر میں نے اپنی زندگی بچانے کا تہیہ کیا، وہ زندگی جو روئے زمین پر اس ایک پابندی کے سوا اور کوئی پابندی نہیں رکھتی تھی۔ میں نے اپنی پگڑی سے ایک ٹکڑا پھاڑا اور اپنے خون آلود نتھنوں سے بالو صاف کرتے ہوئے اس گورِ غریباں پر ادھر اُدھر چلنے لگا۔

بہت سے ٹیلوں کے درمیان میں نے متعدد اونٹوں کو پایا جو بالو میں دفن نہیں ہوئے تھے۔ ایک مشک دیکھ کر اس کی طرف دوڑا کہ اپنی ناقابلِ برداشت پیاس بجھا سکوں لیکن وہ خشک ہو چکی تھی ——— اور ایک قطرہ بھی باقی نہ تھا۔ مجھے ایک اور مشک نظر آئی۔ لیکن یہاں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ مجبوراً ایک اونٹ کا پیٹ چاک کر کے اس کے معدہ میں بچا ہؤا پانی نکالنے پر آمادہ ہؤا اور اپنی پیاس بجھا کر وہ پیاس جسے پیٹ سے نکالا ہؤا گرم پانی بھی خوش ذائقہ معلوم ہؤا، میں جلدی سے اور جانوروں کی طرف بڑھا تاکہ ان کے پیٹ میں بچے ہوئے پانی کو قبل اس کے کہ اس میں نقص پیدا ہو جائے اپنی مشک میں جمع کروں۔ میں نے نصف مشک سے زائد پانی حاصل کیا اور اپنے اونٹ کے پاس جس کے پہلو میں آندھی کے وقت چھپا ہؤا تھا واپس آیا، اس کے بدن پر بیٹھ گیا اور آگے بڑھنے کے بہترین ذرائع پر غور کرنے لگا۔ مجھے معلوم ہؤا کہ میں چشمہ سے ایک دن کی مسافت کی دوری پر ہوں۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی اُمید کتنی موہوم تھی دن ختم ہونے کے قریب تھا میں نے اپنی کوشش جاری کرنے کا قصد کیا۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا، میں اُٹھا اور اپنی پیٹھ پر مشک لئے ہوئے اپنے مایوس کن سفر کے لئے آگے بڑھا، ساری رات چلتا رہا۔ صبح سویرے سے مجھے یہ معلوم ہؤا کہ اس چلچلاتی ہوئی گرمی میں بغیر کسی پناہ کے ایک دن اور پھر ایک مصیبت بھری رات اور چلنا ہے۔ میرے پاس پانی کافی مقدار میں تھا لیکن کھانے کی کوئی چیز بھی نہ تھی۔ آفتاب جب بلند ہؤا تو اُس کی گرم شعاؤں میں نہ ختم ہونے والے بارہ گھنٹوں تک جھلسنے کے لئے ریت کے ایک جلتے ہوئے ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ دوپہر ہونے کے قبل ہی میرا دماغ کھولنے لگا۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی تھی۔ آہ، زندگی کا خواب ایک سراب تھا، میں نے وہ چیز دیکھی جو عنقا تھی!

دفعتہً میری مشتاق آنکھوں نے ایک جھیل دیکھی اور مجھے اس کا اس درجہ یقین ہؤا کہ میں اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہؤا چلا یہاں تک کہ اس کی تلاش میں تھک کر چُور ہو گیا۔ پھر مجھے دُور ببول کا ایک درخت نظر آیا جو ہوا میں حرکت کر رہا تھا۔ اپنے جسم کو اس کے سایہ میں چھپانے کے لئے جلدی سے دوڑا اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں پہنچ گیا جو وہاں بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔

مجھے تمام دن جو پریشانیاں اُٹھانی پڑیں اور جن جن مصیبتوں کا سامنا ہؤا اُن کی یاد اب بھی میرے دماغ میں تازہ ہے۔ آخر رات آ گئی، اور جھلملاتے ہوئے تاروں نے مجھے دوبارہ سفر جاری کرنے کی ہدایت کی۔ اپنی مشک سے خوب جی بھر کر پانی پیا اور تن تنہا چل پڑا۔ میں اس راستہ پر جا رہا تھا جس پر کسی زمانہ میں ہلاک و برباد ہو جانے والے قافلوں کی ہڈیوں سے نشانات بن گئے تھے۔ صبح ہوتے ہی کچھ فاصلے پر حقابہ کا قلعہ نظر آیا۔ ازسرِنو زندگی پانے کی مسرت میں مَیں نے اپنی مشک پھینک دی، اپنی رفتار چوگنی کر دی اور آدھ گھنٹے کے اندر اپنے آپ کو اس چشمہ کے قریب ڈال دیا جس سے چند دن قبل ٹھنڈا اور شیریں پانی پی چکا تھا۔ میری مسرتوں کا کیا ٹھکانا تھا، سایہ کے اندر لیٹنا، ٹھنڈی ہوا میں سانس لینا، چڑیوں کا دلکش نغمہ سننا، پھولوں کی دلآویز خوشبو جس سے وہاں کی خوبصورت فضا معطر تھی سُونگھنا میرے لئے کس قدر فرحت بخش تھا۔ ایک گھنٹہ کے بعد لباس اُتار، غسل کیا اور پھر پانی پی کر سو گیا۔

سو کر اُٹھا تو طبیعت بشاش تھی، لیکن بھوک کی جانگسل تکلیف سے جس کا حملہ اب شدید ہو رہا تھا سخت بےچین تھا۔ میں تین دن سے بغیر غذا کے تھا لیکن اب تک اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی، اس لئے کہ پیاس میرے ہوش و حواس پر غالب تھی۔ اب جبکہ بڑی مصیبت دُور ہو چکی تھی کم درجہ کی تکلیف بڑھ گئی اور ہر گھنٹہ اس کی اذیت بڑھتی گئی۔ میں نے آسمان کے چاروں طرف اس اُمید میں کہ شاید کوئی کارواں گزرتا ہؤا نظر آ جائے نگاہ دوڑائی لیکن بےسُود، آخر چشمہ پر واپس چلا آیا۔ اس طرح دو دن اَور گزرے مگر کوئی امداد نہ پہنچ سکی، اور میری رہی سہی طاقت نے بھی جواب دے دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں مر رہا ہوں۔ چشمہ کا دلفریب ترنم چڑیوں کا دلکش نغمہ، رُخساروں سے مس ہونے والی ہوا کا نرم و نازک جھونکا، ان نعمتوں کو پا کر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہؤا کہ بےآب و گیاہ اور سنسان ریگستان میں ہلاک ہو جانا اس جنتِ ارضی میں ترس ترس کر جان دینے سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔ میں مرنے کے لئے زمین پر پڑا رہا اس لئے کہ اب مجھ میں بیٹھنے کی تاب نہ تھی اور جیسے ہی قریب بہنے والی آبشار پر جو میری حیات میں اضافہ کا باعث ہوئی تھی ایک آخری

نگاہ ڈالنے کے لئے کروٹ لینا چاہتا تھا کوئی سخت چیز میرے پہلو میں گڑی۔ میں نے سمجھا کہ پتھر ہے اور اس کو الگ کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ زندگی کے آخری لمحات ذرا چین سے گزریں لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ زمین پر نہیں بلکہ میری جیب میں کوئی چیز ہے تو اس سے بے خبر کہ کیا ہے میں نے جیب کے اندر ہاتھ ڈال دیا اور باہر نکال کر پھینکنے کے قبل اسے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ خشک روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ مجھے جنت سے بھیجا گیا ہے اور تھا بھی جنت سے بھیجی ہوئی چیزوں کی طرح عمدہ اور خالص کیونکہ یہ محبت، اُلفت اور معصومیت کا تحفہ تھا ـــــــ یہ وہی روٹی کا ٹکڑا تھا جو میری پیاری ننھی بچی کو ناشتہ میں ملا تھا اور جسے اُس نے میری روانگی کے وقت جب کہ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ کھیل تلاش کر رہی ہے میری جیب میں ڈال دیا تھا۔ میں رینگتا ہوا چشمہ کے قریب گیا، روٹی کے ٹکڑے کو تر کیا اور کھا گیا اس وقت خدا کے اس احسانِ عظیم پر تشکر و امتنان، اور شفقت پدری کے ملے جلے والہانہ جذبات، سے متاثر ہو کر میری آنکھوں سے سیلابِ اشک جاری تھا۔

اسی روٹی کے ٹکڑے نے میری جان بچائی۔ دوسرے دن ایک چھوٹا سا قافلہ پہنچا جسے قاہرہ جانا تھا۔ یہ تاجر میرے ساتھ بہت ہمدردی سے پیش آئے۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے ساتھ لے لیا اور میں ایک مرتبہ پھر اپنی پیاری بیوی اور اپنے عزیز بچوں کو گلے لگا سکا جن سے پھر ملنے کی مجھے کوئی اُمید نہ رہی تھی ـــــــ اسی زمانے سے میں غریب ہوں مگر قانع، اپنے جُرم کی پاداش میں مَیں نے اپنی ساری جائداد سے محروم ہو جانا پسند کیا، اور اب مال و دولت سے دست بردار ہو کر خدائے بزرگ و برتر کی ہر مرضی پر سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

مسعود حسن شمسی دانا پوری

بھکاری کا گیت

آؤ! اِدھر آؤ!
بہار ہر ایک پرند کی ہمنوائی میں
جو خوش الحانی سے گا سکتا ہے
اور شیریں راگنی الاپ سکتا ہے
ہمیں
کھیتوں میں۔ اشجار کے جھنڈوں میں
کوہسار پر۔ گھاٹیوں میں
اپنے سرود و کیف سے محظوظ ہونے کی
دعوت دے رہی ہے
اور اس کے ساتھ
بُلبل بھی ہے
جو اپنے شیریں ترین نغمات سے
اپنی ہمنوا کوئل کی شکستہ آواز کے شور کو
شکست دینے کی کوشش میں محو ہے۔

کوکو! کوئل چیخ رہی ہے۔
جگ۔ جگ! بُلبل گا رہی ہے۔
جھاڑی جھاڑی پر۔ ایک درخت سے دوسرے درخت تک۔
تو پھر ہم بھی کیوں،
ایک ہی جگہ قیام پذیر رہیں؟

آؤ! اِدھر آؤ!
ہم بھی کیوں ٹھیریں؟
ہمیں کوئی قرضہ یا کرایہ ادا نہیں کرنا ہے
کسی قسم کی خرید و فروخت یا حساب کتاب کا کام نہیں ہے
اور نہ زمین اور اُس کے لگان ہی کا لین دین ہے۔
تمام پیشِ نظر دُنیا
ہماری اپنی ہے۔
اور جہاں سے ہم گزرتے ہیں
یا رہنے سہنے لگتے ہیں
وہی ہماری مملکت ہے
اور وہی ہمارا دربار

کو۔ کو! کوئل چیخ رہی ہے
جگ جگ! بلبل گا رہی ہے
جھاڑی جھاڑی پر۔ ایک درخت سے دوسرے درخت تک
تو پھر ہم بھی کیوں؟
ایک ہی جگہ قیام پذیر رہیں؟

(رچرڈ برُوم)

مترجمہ گل سعید

محفلِ ادب

کیسانووا کے نظریاتِ محبت

گیاکومو کیسانووا، اٹلی کا رہنے والا، یورپ کے برندابن کا کنھیا تھا۔ اس کا زمانہ سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں ہے۔ ادبی مذاق رکھنے والے اس مغربی رسیا کی یادگار اس کی خود نوشتہ سرگزشتِ حیات ہے۔ جو صاف گوئی اور حقائق پرستی میں روسو کے مشہور عالم اقبال نامے سے بھی سبقت لے گئی ہے۔ کیسانوا چند سال چھوڑ کر تمام عمر یورپ کے مختلف ممالک میں سفر کرتا رہا اور دادِ عیش دیتا رہا۔ اور اسی جہاں گردی اور اس کی اپنی فلسفیانہ طبیعت نے اس کی سوانح حیات کو ایک نفسیاتی اہمیت دے دی ہے۔ ہم ذیل میں محبت، عشرت، اور عورت کے متعلق اُس کے چند نظریے پیش کرتے ہیں جن کی بنیاد اس کے اپنے تجربات پر ہے:۔

محبت

محبت ایک طرح کا تجسس ہے۔

والہانہ محبت میں ہمیشہ محبوب کی ہستی کے متعلق تجسس کا احساس ہوتا ہے۔

اگر آزادی ایک قابلِ قدر شے ہے تو محبت میں اس کی قدر اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔

خوفزدہ جذبۂ عشق احساس تعقل کے ساتھ انتشارِ قوت کا باعث ہوتا ہے۔

عالمِ نسواں کی مکمل ترین ہستی کو چاہنے کے بعد بھی ایک مرد دوسری عورتوں کی چاہت میں گرفتار ہو سکتا ہے۔

محبت کی کمی نفرت کے آغاز کی دلیل ہے۔

جذبات کی فراوانی میں انسان ایک خود غرض اور خود پرست ہستی بن جاتا ہے۔

محبت ہو اور محبت کی رفاقت نہ ہو تو رشک و حسد بھڑک اُٹھتے ہیں۔ دل ڈرتا ہے کہ وہ شے جس کی اُسے تمنا ہے کہیں غیر کے ہاتھوں میں نہ چلی جائے۔

مناکحت محبت کی موت ہے۔

محبت ہمارے ذہنوں کو سرابی کیفیتوں سے بھر کر حقائق پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

کئی بار محبت ذہن کو چمکانے کی بجائے کُند کر دیتی ہے۔

محبت میں مرد کتنا احمق ہوتا ہے!

عشرت

حصولِ عشرت میں اقتصادیات کو دخل دینا میرے مذاق کے منافی ہے۔

مسرت کے بغیر شادی پھولوں کے بغیر کانٹا ہے۔

چوری کے پھلوں سے شیریں تر کوئی شے نہیں ہے۔

(میرے لئے) صرف محبوب ہستی ہی آرزو انگیز ہوسکتی ہے۔

عیش و مسرت میں گزارے ہوئے لمحے کبھی ضائع نہیں ہوتے۔

احساسِ تشکر اگرچہ اظہارِ نجابت ہے۔ لیکن یہ محبت کی شیریں بہجت کو ضائع کردیتا ہے۔

شادمانی تخیل کی ایک کیفیت ہے۔ اگر خوش ہونا چاہتے ہو تو (پہلے) تصور کرلو کہ تم خوش ہو۔

ذہنی متانت کے باوجود قلبی مسرت ممکن ہے۔

محبوب کے چہرے پر اظہارِ تشکر کا تاثر بے حد جاذب ہوتا ہے

حیائے ذہنی کی نسبت حیائے جسمانی کی گرفت زیادہ محکم ہوتی ہے۔

کئی غم اس قدر لطیف ہوتے ہیں کہ اُن کی لطافت انہیں مسرت کا ہم پایہ بنا دیتی ہے۔

عورت

اس دُنیا میں ایک بھی عورت ایسی نہیں جو مسلسل ادعائے محبت کا مقابلہ کرسکے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ اُس کا چاہنے والا بڑی سے بڑی قربانی کے لئے بھی تیار ہو۔

مجھے معلوم ہے کہ ذرا ذرا سی خدمت گزاریاں بہت بلند درجہ پالیتی ہیں۔ دُنیا میں کامیابی کا رازِ عظیم اسی میں پنہاں ہے اور سب سے بڑھ کر عورتوں کے سلسلے میں یہ اصول چسپاں ہوتا ہے۔

عورت کی طبعی پاکیزگی آسانی سے رحم کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

شرم وحیا (لڑکیوں کو) نگاہیں جھکانا سکھاتی ہیں۔ لیکن تہذیب وتمدن آنکھیں ملانا سکھاتے ہیں۔

تند و تیز اور شدید حملے کی نسبت آہستگی اور احتیاط کے ساتھ کی ہوئی نرم اور جرأت آمیز حرکات کی مدافعت ایک عورت کے لئے زیادہ مشکل ہے۔

عورت کو آپ سے محبت نہ بھی ہو تو وہ آپ کے جذبۂ عشق سے (ہر ممکن اور ناجائز) فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔

رسمی تعصبات اور خود پرستانہ جذبات ایک عورت کے لئے ہار ماننے میں رُکاوٹ ہوتے ہیں۔

مردوں سے بھی بڑھ کر عورتیں سیلِ تخیل میں بہ جایا کرتی ہیں۔

ایک مرد کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب اُس کی محبوب عورت اُس سے جو چاہے منوا سکتی ہے۔

عورت کو ممنون کرو اور جیت تمہاری ہے۔ اس دُنیا میں کوئی بھی عورت احسانمندی کے بوجھ سے بار نہیں پاسکتی، کامیابی کا بہترین اور یقینی طریقہ یہی ہے کہ اُس عورت کے محسن بنو جس پر فتح حاصل کرنا چاہتے ہو۔

اگر ایک نوجوان لڑکی تنہائی میں محبت کے متعلق سوچ بچار کرے تو اُسے ضرور کسی نہ کسی سے محبت ہو جائے گی۔

مردوں کے تمام فلسفے اور تحقیقات سے بڑھ کر عورت کی جبلت ہی اُسے گہرے رازوں سے آگاہ کردیتی ہے۔

ساحلِ گنگا کے تاثرات

روانی پر تری اے رودِ گنگا! جان و دل قرباں
تری موجوں میں ہے عہدِ کہن کی داستاں پنہاں

نمایاں ہے ترے آئینے میں تصویر ماضی کی
ترے جینِ جبیں میں نقش ہے تقدیر ماضی کی

ترا ہر قطرہ ہندوستاں[1] کے حق میں آبِ حیواں ہے
حیات افزا ایماں بادۂ سرجوشِ عرفاں ہے

نہ تنہا منظرِ فگن تیری تجلی چشمِ زائر میں
تڑپتی ہیں تری موجیں دلِ بے تابِ شاعر میں

ترے ہی دم سے باقی ہے نشاں دیرینہ عظمت کا
وطن مرجع بنا ہے آج تک اہلِ عقیدت کا

تمنّا ہے ترے جلووں کی پہنائی میں کھو جاؤں
تری ان مضطرب موجوں سے ہم آغوش ہو جاؤں

کسی صورت سے اب قابو نہیں ہے شورشِ دل پر
کہوں کیوں کر جو کچھ دیکھا ہے میں نے تیرے ساحل پر

کمی اب تک نہیں ہے اشکِ رنگیں کی روانی میں
جھلک کس کی نظر آئی ہے مجھ کو تیرے پانی میں

ابھی تک نقش ہے دل پر تری موجوں کی بے تابی
وہ اندازِ تلاطم وہ ادائے رقصِ سیمابی

دمِ صبح اللہ اللہ وہ شعاعِ مہر کا عالم
وہ کوسوں تک مسلسل ارتعاش و لرزشِ پیہم

تری یہ مضطرب موجیں ہیں یا کرنوں کا گہوارہ
ترے یہ مرتعش جلوے ہیں یا فردوسِ نظارہ

جدھر دیکھو ہے اک طوفاں رنگینی و رعنائی
ہے کیف اندوز تا حدِ نظر چشمِ تماشائی

(محمد یحییٰ۔ اعظم گڈھ)

فرشتۂ موت اور متاہل زندگی

مسلمانوں کے نزدیک ملائکہ خواہشات نفسانی سے پاک ہیں مگر عیسائی ملائکہ کی نسبت عجیب و غریب عقائد رکھتے ہیں۔ ذیل میں ایک قصّہ درج کیا جاتا ہے جو جرمنی کے صوبوں سیکسنی و بوریا کے علاوہ ریاست ہائے بلقان میں بھی مشہور ہے۔

فرشتۂ موت جسے کبھی کسی پر رحم نہیں آتا سیکسنی میں ایک حسینہ کی روح قبض کرنے کے لئے گیا۔ دیکھا کہ حسینہ مارے کرب و اضطراب کے نمناک زمین پر لوٹ رہی ہے اور ہر گزرنے والے سے بہ منت التجا کرتی ہے کہ میرے منہ میں پانی کے چند قطرے ٹپکاتے جاؤ، رہگزر پانی پلاتے مگر اُسے تسکین نہ ہوتی اور پھر اُسی طرح زمین پر تڑپنے لوٹنے لگتی۔ فرشتۂ موت اس کی روح قبض کرنے کے لئے آیا تو اُسے اس کی حالت پر رحم آگیا اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے مریضہ کی روح قبض کرنے میں تساہل سے کام لیا تو یہ امر خدا کی ناراضی کا موجب ہوگا۔ مگر محبت سے مریضہ کو بستر پر لٹایا پانی پلایا۔ دوائی دی اور اُسے بتایا کہ میں فرشتۂ موت ہوں جو گویا رحم کا نام نہیں جانتا۔ تمہاری حالت پر مجھے رحم آگیا ہے۔ اگر تم مجھ سے شادی کا

[1] مراد ہند و دنیا

(جامعہ)

وعدہ کرو تو تمہاری جان بچائی جا سکتی ہے۔ حسینہ یہ سُن کر خاموش ہوگئی۔ فرشتۂ موت نے اس خاموشی کو حسینہ کی رضامندی پر محمول کیا اور وہ اُٹھوا کر اُسے قریب ہی کے ایک مکان میں لے گیا۔ جہاں اس نے اس کا علاج معالجہ اور تیمارداری کی اور صحت کے بعد اس سے شادی کر لی۔

شادی کے بعد حسینہ نہایت زبان دراز نکلی بلکہ کسی کسی وقت دست درازی بھی کر بیٹھتی۔ ایک دن فرشتہ دیر سے گھر پہنچا بیوی غصہ میں بھری بیٹھی تھی اس نے آتے ہی ایک دو ہنٹر فرشتۂ موت کے رسید کیا۔ اس کے بعد مکّوں اور لاتوں سے اس کی مرمت کی۔ اُسے کہا کہ شام کے بعد فوراً گھر پہنچ جایا کرو۔ اتنے میں بیوی ایک بچہ کی ماں بن چکی تھی، فرشتۂ موت نے کہا کہ میرے فرائض اس قسم کے ہیں کہ میں گھر سے باہر جانے یا گھر واپس آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں کر سکتا۔ نہ مجھ میں مکّوں اور لاتوں سے آئے دن پسلیاں سڑوانے کی ہمت ہے اس لئے یہ بہتر ہو گا کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں، تم اپنے بچے سمیت اسی مکان میں رہو اور میں ملاءِ اعلےٰ میں ملائکہ کے ساتھ جا کر رہوں گا۔ بیوی یہ سُن کر اُٹھی کہ اُسے اس قسم کا ارادہ کرنے کی سزا دے، وہ بھی اداشناس تھا، اس کی نیت بھانپ گیا اور سر پر پاؤں رکھ کر اس طرح بھاگا کہ پھر کبھی بھولے سے بھی اس مکان کی طرف رُخ نہ کیا۔

اتنے میں بچہ جوان ہو چکا تھا۔ ماں نے اُسے کہا کہ تم اب کوئی کام کیا کرو۔ بیٹے نے کہا کہ میں کوئی کام تو سیکھا ہی نہیں کیا کام کروں؟ ماں نے جواب دیا کہ تیرے باپ نے مجھے ایک دفعہ بتایا تھا کہ جس مریض کی موت یقینی ہو اس کے سر کی طرف میں کھڑا ہوتا ہوں اور جسے بیماری سے جانبر ہونا ہو اُس کے پاؤں کی طرف۔ تم طبیب بن جاؤ اور صرف اُن مریضوں کے علاج کا ذمہ لیا کرو جن کے پاؤں کی طرف اپنے باپ کو کھڑا دیکھو وہ یقیناً اچھے ہو جائیں گے اور دنوں میں تمہاری شہرت ہو جائے گی۔

لڑکے نے ایسا ہی کیا۔ جس مریض کے سرہانے وہ اپنے باپ کو کھڑا دیکھتا اس کے علاج سے انکار کر دیتا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ جن مریضوں کا وہ علاج کرتا وہ سب اچھے ہو جاتے۔ تھوڑے عرصہ میں دُور و نزدیک اس کی صداقت کا شہرہ ہو گیا۔ ورٹم برگ کے حکمران کی مہجمال لڑکی بیمار ہوئی اس نے اعلان کیا کہ جو طبیب اسے اچھا کر دے اُس کے ساتھ اس کی لڑکی کی شادی کر دوں گا۔ اور اُسے اپنی نصف سلطنت انعام میں دوں گا۔ فرشتہ موت کا لڑکا بھی وہاں پہنچ گیا۔ لڑکی کی نبض دیکھی، قارورہ دیکھا، زبان کی رنگت دیکھی لڑکی کا حُسن گلوسوز دیکھ کر اس کا دِل بے اختیار ہو گیا مگر جب اس نے لڑکی کے سرہانے اپنے باپ کو کھڑا دیکھا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے تمام خدام اور تیمارداروں سے کہا کہ تم لوگ کمرہ سے باہر چلے جاؤ۔ کمرہ خالی ہو جانے پر اس نے باپ سے کہا کہ تم محبت کی مجبوریوں سے واقف ہو۔ مانا کہ تمہیں کسی پر رحم نہیں آتا لیکن یہ میری محبوبہ ہے میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، آخر اس سے پہلے بھی تم نے ایک مرتبہ ایک عورت پر رحم کیا تھا۔ اس پر بھی رحم کرو۔ مگر فرشتۂ موت نے چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا کہ پہلی مرتبہ رحم کرنے کا نتیجہ یہ ہؤا تھا کہ جس پر رحم کیا اس نے مجھے ہر وقت گالیاں دینا اور کوسنا اپنا وظیفۂ زندگی بنا لیا اور آخر مجھے زدوکوب کر کے گھر سے نکال دیا۔ اور اس کے علاوہ مجھ پر خدا کا قہر نازل ہؤا۔ اب دوبارہ میں یہ تجربہ کرنے کو طیار نہیں ہوں۔ لڑکے نے بہت منت سماجت کی۔ باپ کے پاؤں پر گرا مگر اس کا دل نہ پسیجا

لڑکے نے کہا کہ اچھا اگر تم کسی طرح نہیں مانتے تو ٹھیرو میں اماں کو بلاتا ہوں۔ یہ سُن کر فرشتۂ موت کی رُوح خطا ہوگئی۔ اس نے لڑکے سے کہا کہ میں جاتا ہوں۔ آئندہ کبھی اس لڑکی کے سرہانے آکر کھڑا نہیں ہوں گا۔ لیکن تم خدا کے لئے اپنی اماں کو نہ بلاؤ۔ اس کے بعد فرشتۂ موت چلا گیا۔ لڑکی اچھی ہوگئی اور فرشتہ موت کے بیٹے سے اس کی شادی ہوگئی۔ بادشاہ نے اپنی آدھی سلطنت وعدہ کے مطابق لڑکی کو جہیز میں دے دی۔

زنبیلا "بحوالۂ" بمبئی کرانیکل"

مجنوں کی دو نظمیں

عشق انسان کے اخلاق کو سدھارتا ہے اُس کے مذموم عادات شریفانہ اخلاق سے بدل جاتے ہیں، نفسانیت اور شہوانی خواہشات مِٹ جاتے ہیں، بغض وحسد، مکر وفریب، فسق وفجور اور تمام وہ عادات جن کا تعلق اخلاقِ رذیلہ سے ہے ایک ایک کرکے فنا ہو جاتے ہیں۔

یہ سب کچھ کیوں؛ صرف اس لئے تاکہ عاشق اپنے آپ کو محبوب کی نظروں میں شریف تر ثابت کرسکے اور اُس کے دل میں اپنے لئے گنجائش پیدا کرسکے، کسی نے سچ کہا ہے، "الحبُّ ربّانی وعلمنی الادب"۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اگر کوئی شخص کسی سچے عاشق پر بدچلنی کا بہتان لگائے تو ظاہر ہے اُسے سخت صدمہ ہوتا ہے، چنانچہ قبیلۂ بنو اسد کے کچھ لوگوں نے جب مجنوں پر بدچلنی کا الزام لگایا۔ تو اُسے بے انتہا رنج ہوا جو اُس کے حسب ذیل کلام سے ظاہر ہوتا ہے:۔

۱- الا ایّھا القوم الذین وشوبنا	اے لوگو! جو مجھ پر الزام لگاتے ہو
علی غیر ما تقوی الالٰہ ولا برٍ	بغیر کسی نیک نیتی اور خوف خدا کے
۲- الم ینھکم عنا تقاکم فتنتھوا	کیا تمہارا تقویٰ تم کو اس سے باز نہیں رکھتا؛
ام انتم اناس قد جُبلتم علی الکفر	کیا تم وہ ہو جن کی سرشت میں کفر داخل ہے۔
۳- تعالوا نقف صفین مناد منکم	آؤ، ہم اپنی اور تمہاری دو صفیں قائم کریں،
وندعوا اللہ الناس فی وضح الفجر	اور علے الصباح خدا سے بددُعا کریں
۴- علی من یقول الزور اویطلب الخنا	اُس شخص کے لئے جو جھوٹ بولتا ہے اور بہتان لگاتا ہے اور
ومن یقذف الخود الحصان ولا یدری	جو نوجوان پاکدامن عورتوں پر بغیر علم کے تہمت لگاتا ہے۔
۵- حلفت بمن صلّت قریش وحجرت	میں قسم کھاتا ہوں اُس ذات کی جس کے لئے قریش نمازیں پڑھتے ہیں
لہ بمنیً یوم الافاضۃ والنحر	اور جس کے نام پر منیٰ میں قربانی کے روز رمی جمار کرتے ہیں۔
۶- لقد اصبحت منی حصاناً بریئۃً	کہ لیلیٰ پاک دامن ہے، وہ فحش اور ناجائز باتوں سے کبھی ملوث
مطھرۃً لیلی من الفحش والنکر	نہیں ہوئی۔

۷۔ ھی البدر الحسناء والنساء کواکب	وہ پری جمال وماہ تاباں ہے دوسری عورتیں اُس کے مقابلہ میں ستارے ہیں۔
فشتان ما بین الکواکب والبدر	اور یہ ظاہر ہے کہ ماہ کامل اور ستاروں کے درمیان کتنا فرق ہے۔
۸۔ علیہا سلام اللہ من ذی صبابۃ	اُس پر خدا کی سلامتی ہو جو ایک عاشق دل گیر کی طرف سے طرح طرح
وصب مُعَنّیً بالوساوس والفکر	کی فکروں اور وسوسوں میں مبتلا ہے۔

محبت کرنے والے کے لئے کوئی چیز قابلِ نفرت نہیں رہتی اُسے دُنیا کی ہر چیز سے محبت ہو جاتی ہے حتےٰ کہ دشمن سے بھی دشمنی کا خیال نہیں رہتا، عداوت محبت ہو جاتی ہے، بخل فیاضی بن جاتا ہے، نخوت وغرور، نیاز و فروتنی سے بدل جاتا ہے، پست ہمتی کے بجائے بلند حوصلگی پیدا ہو جاتی ہے۔

کسی نے ایک مرتبہ طعنہ دے کر مجنوں سے کہا کہ لیلیٰ تو بیمار ہو کر عراق گئی ہوئی ہے اور اس کی بُری حالت ہے، مگر تمہیں کچھ خبر نہیں، یہ سُن کر مجنوں بیہوش ہو گیا جب ذرا ہوش درست ہوئے تو اُس نے کہا:۔

۱۔ یقولون لیلی بالعراق مریضۃٌ	لوگ کہتے ہیں کہ لیلیٰ عراق میں بیمار پڑی ہوئی ہے تمہیں کیا ہو گیا۔
فمالک لا تضنی وانت صدیقُ	کہ تم کمزور و لاغر نہیں ہوتے حالانکہ تم اُس کے شیدائی ہو۔
۲۔ سقی اللہ مرضی بالعراق فاننی	خدا عراق کے مریضوں کو اچھا کرے، میں وہاں کے تمام
علی کل مرضی بالعراق شفیقُ	بیماروں سے ہمدردی رکھتا ہوں۔
۳۔ اُہیم باقطار البلاد وعرضہا	میں شہروں شہروں مارا مارا پھرتا ہوں۔
ومالی الی لیلی الغداۃ طریقُ	مگر دوشیزہ لیلیٰ کی طرف مجھے راستہ نہیں ملتا۔
۴۔ اذا ذکرتہا النفس ماتت صبابۃً	دل اُسے جب یاد کرتا ہے تو سوزشِ عشق سے مر کر رہ جاتا ہے۔
لہا زفرۃٌ قتالۃٌ و شہیقُ	اُس میں ایک ہوک اُٹھتی ہے اور جان لیوا فریاد
۵۔ سقتنی شمسٌ یخجل البدر نورہا	مجھے ایک ایسے آفتاب نے سیراب کیا ہے جس کا حسن ماہ کامل کو شرمندہ
ویکسف ضوء البرق وھو بروقُ	کرتا ہے اور بجلی کی چمک کو خیرہ کر دیتا ہے جب وہ کوندتی ہو۔
۶۔ اری حبہا جسمی وقلبی ومھجتی	میں دیکھتا ہوں کہ اس کی محبت میرا جسم، میرا دل اور میری جان ہے۔
فلم یبق الا اعظمٌ وکروبُ	مجھ میں سوائے رنج وغم اور ہڈیوں کے کچھ باقی نہیں رہا۔
۷۔ الی اللہ اشکو ما اُلاقی من الہوی	میں خدا سے اُن مصیبتوں کی شکایت کرتا ہوں جو لیلیٰ کی محبت میں مجھ پر نازل ہوئیں
بلیلی ففی قلبی جویً وحریقُ	اس لئے کہ دل میں اب تک ایک سوزش ہے اور محبت کی تپش۔

بادشاہوں کے آخری لمحے

ظاہربیں آنکھیں سمجھتی ہیں کہ دولت اور حکومت انسانی ترقی کی معراج ہے۔ لیکن مشاہدات بتاتے ہیں کہ انسان کو نہ دولت سے سکون حاصل ہوتا ہے نہ حکومت سے بلکہ اس کے لئے کسی اور شے کی ضرورت ہے۔ ذیل میں ہم چند بادشاہوں کے وہ کلمات درج کرتے ہیں جو انہوں نے مرتے وقت کہے تھے۔ ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دُنیا اور اس کا تموّل کیا حقیقت رکھتا ہے۔

رجاء بن حیوٰۃ سلیمان بن عبدالملک کا سب سے بڑا معتمد تھا۔ رجاء بن حیوٰۃ کا بیان ہے کہ جب سلیمان پر موت کی مایوسی طاری ہوئی تو اُس نے کہنا شروع کیا:

"میں اسی تمنا اور آرزو میں رہا کہ مجھے زندگی میں کبھی اطمینان حاصل ہو سکے اور میں اس اطمینان کے بعد اپنی زندگی عبادتِ الٰہی میں صرف کرسکوں۔ مگر مجھے اپنی عمر کا ایک دن بھی ایسا یاد نہیں جس روز مجھے سکون حاصل ہوا ہو۔ میں بے اطمینانی کی موت مر رہا ہوں۔ میں دُنیا میں کچھ نہ کرسکا لیکن مجھے مسرت ہے کہ میں ایک نیک کام کرکے جا رہا ہوں۔ یہ نیک کام یہ ہے کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کیا ہے"۔

ان الفاظ کو کہتے ہوئے سلیمان بن عبدالملک نے جان دے دی۔ سلیمان بن عبدالملک جیسے بلند مرتبہ فرمانروا کے مندرجۂ بالا الفاظ سے ظاہر ہے کہ دُنیا اور دُنیا کی حکومت کیا حقیقت رکھتی ہے۔

سلیمان بن عبدالملک کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز تخت پر بیٹھے۔ آپ بادشاہ نہیں تھے بلکہ ایک ولی تھے جن کے سر پر حکومت کا بار رکھ دیا گیا تھا۔ آپ نے دو برس اور پانچ مہینے حکومت کی۔ قتادہ کہتے ہیں کہ مرنے سے ذرا پہلے آپ نے اپنے خلیفۂ مابعد یزید بن عبدالملک کو ایک رقعہ بھیجا جس میں لکھا ہُوا تھا:۔

"میں یہ خط تمہیں اپنے کرب کی حالت میں لکھتا ہوں، میں ڈر رہا ہوں کہ مجھ سے میرے عہدِ حکومت کی نسبت سوال ہونے والا ہے۔ اور وہ سوال کرنے والا دُنیا و آخرت کا مالک ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ میں اس سے اپنا کوئی بھی عمل پوشیدہ رکھ سکوں۔ اگر وہ مجھ سے راضی ہوگیا تو میری نجات ہو جائے گی۔ ورنہ مَیں تباہ ہو جاؤں گا۔ تمہیں لازم ہے کہ خدا سے ڈرو اور رعیّت کے ساتھ رعایت کرو۔ کیونکہ میرے بعد تم بھی زیادہ دن دُنیا میں نہ رہو گے"۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نہایت عابد و زاہد تھے۔ لیکن اس کے باوجود موت کے خوف نے اور عاقبت کے ڈر نے آپ پر کس قدر

ہیبت طاری کر رکھی تھی۔ اس کا اندازہ آپ کے الفاظ سے ہو سکتا ہے۔

ہارون الرشید کے باپ خلیفہ مہدی بغداد سے جرجان جا رہے تھے۔ ہارون الرشید ان کے ساتھ تھے۔ جب آپ ماسبندان پہنچے تو یکایک آپ کی حالت بگڑ گئی اور آپ پر نزع کی کیفیت طاری ہو گئی اُس وقت آپ نے ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے بادشاہت کی ہے مگر میں نے انتہائی مصیبت اور تکلیف کی زندگی گزاری ہے۔ اگر انسان کی زندگی کا مقصد اسی قسم کی بے اطمینانی ہے تو اس زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ میں خوش ہوں کہ بے اطمینانی کی زندگی سے مجھے نجات مل رہی ہے۔ میں نے جہاں تک ممکن ہوا رعایا کی خدمت کی۔ مگر اب میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کچھ نہیں کیا اور میری زندگی ضائع ہو گئی"۔

مہدی جیسے شہنشاہ کے یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ دُنیاوی حکومت اور بادشاہت کیا وقعت رکھتی ہے۔

خلیفہ مامون رشید جب روم کے سفر سے واپس آ رہے تھے تو بذندون کے کنارے قیام کیا۔ یہیں آپ کو بخار ہوا اور یہیں آپ کا انتقال بھی ہو گیا۔ مرنے سے پہلے علماء و فقہا کو اپنے روبرو بُلا کر کہا:۔

"میرے مرنے کے بعد زیادہ رونا دھونا نہیں کیونکہ ہر انسان جو دُنیا میں آیا ہے، اسے مرنا ہے تم کو اگر اندازہ ہو کہ میں نے زندگی میں کتنی تکلیفیں اُٹھائی ہیں تو تم رونے کی بجائے میری مَوت پر خوش ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں خدمتِ خلق نہ کر سکا۔ میں چاہتا تھا۔ کہ کسی طرح جیتے جی سکون حاصل ہو جائے۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ ناممکن ہے"۔

اس کے بعد آپ نے ابو اسحٰق معتصم کو جس کو ولیعہدِ سلطنت بنا چکے تھے بُلا کر نصیحتیں کیں اور ہدایت کی کہ رعایا کے ساتھ اولاد سے بھی بہتر سلوک کرنا۔

بادشاہوں کے مندرجۂ بالا آخری وقت کے کلمات صاف بتا رہے ہیں کہ یہ دنیا اور دُنیا کی حکومتیں کیا ہیں۔ اور حکمرانوں کی زندگی کس قدر کرب اور بے چینی میں بسر ہوتی ہے۔

وہ آنکھیں جو ظاہر کی باتوں کو دیکھتی ہیں یہ سمجھتی ہیں کہ بادشاہ، حکمران اور امراء عیش میں ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے حقیقی عیش صرف اُن کو حاصل ہے جو دولت اور حکومت سے بے نیاز ہیں اور جن کی زندگی کا مقصد خلقِ خدا کی خدمت ہے۔

"دین و دُنیا"

اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۰۲۰ - ۹۸۸ ہجری)

سلطان فطری طور پر عاشق مزاج تھا، شاہزادگی کے زمانہ میں ہی اُسے بھاگ متی نامی ایک تلنگن (یعنی ساکن تلنگانہ) سے عشق ہوگیا، بھاگ متی ایک مشہور مطربہ تھی اور اُس چھوٹے سے قریہ میں رہتی تھی جو اُس وقت چیچلم کہلاتا تھا اور آج حیدرآباد کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا قدیم نام بھاگ نگر ہی تھا جو بھاگ متی سے نسبت رکھتا ہے، لیکن بھاگ متی کی وفات کے بعد جب جنون ذرا کم ہوا تو شہر کا نام بھی بدل گیا لیکن جوانی میں بھاگ متی کے عشق نے شاہزادے سے سب کچھ کرالیا۔ وہ روزانہ اپنی محبوبہ کی خیر و عافیت معلوم کرنے کے لئے "رودِ موسے" کو عبور کرتا تھا شہزادے کے اس خیال کو دُور کرنے کے لئے اُس کے والد ابراہیم قطب شاہ نے تلنگانہ، کرناٹک اور گجرات کی تو بہ شکن نازنینیں محل میں جمع کردیں جنہیں حکم تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو شاہزادے کے اس خیال کو دُور کریں۔ ان کی تعریف میں شاہزادے نے کیسے آبدار اشعار نکالے ہیں:۔

سہیلیاں وہ جھمکائیں ٹک[1] نور کو   دوانہ[2] کریں چاند ہور[3] سور[4] کو

اگر دیکھتا جوت ان[5] نور کا   فرشتہ نہ کرتا صفت حور کا

جو آویں چمن میں سکیاں[6] شاج[7] سوں[8]   پھولاں[9] غنچے ہو جائیں پھر لاج سوں[10]

مجالس عجب شاہ عالی کئے   کہ حوراں[11] کو لا بہشت خالی کئے

اب جن حرکات سے ان خوبرویوں نے شاہزادے کی دلبستگی کی کوشش کی اُن کا بیان ملاحظہ ہو:۔

کدھیں[12] کوئی کھڑی رہتی آسامنے   کدھیں شاہ اپر[13] کرتی کوئی آسامنے

کدھیں بند پکڑتی کوئی ناز سوں[14]   کدھیں دود کوئی جھاڑتی ساز سوں

کدھیں کوئی کھلاتی اتھی[15] پان آ   کدھیں کوئی پکڑتی اتھی پیکدان آ

کدھیں گرد پیتے کوئی آتی اتھی   کدھیں بندسوں کوئی جیو[16] لاتی اتھی

کدھیں کوئی پیالہ پلانے کو آئے   کدھیں کوئی نقل لیا[17] کے شہ کو چکھائے

کدھیں پھول شٹتی[18] کوئی بر منے   کدھیں کوئی ٹلاتی اتھی گھر منے[19]

---

۱ ذرا۔ ۲ دیوانہ۔ ۳ اور۔ ۴ سورج۔ ۵ اُن کے۔ ۶ سکھیاں۔ ۷ سجاوٹ۔ ۸ سے۔ ۹ جمع پھول کی۔ ۱۰ سے ۱۱ جمع حور۔ ۱۲ کبھی ۱۳ اوپر۔ ۱۴ سے۔ ۱۵ تھی۔ ۱۶ جان۔ ۱۷ لاکر۔ ۱۸ پھینکتی۔ ۱۹ میں +

کدھیں کوئی دکھاتی سینہ کھول کر کدھیں کوئی رجھاتی بچن بول کر

کدھیں کوئی دوانی ہو پھرتی اٹھی کدھیں کوئی بے سدھ ہو لڑتی اٹھی"

وہ لوگ جنہوں نے میرحسن کی مثنوی سحرالبیان پڑھی ہے شاہزادہ محمد علی قطب شاہ کی شاعرانہ قوتوں کا فیصلہ ذیل کے نمونہ سے مقابلہ کرکے کرسکتے ہیں، میرحسن کا شاہکار واقعی سحرالبیان ہے، محاکات کا کمال اور زبان کی روانی تعریف سے مستغنی ہیں لیکن میرحسن کے زمانہ تک زبان خراط پر اُتر کر صاف ہو چکی ہے، قطب شاہ کی زبان وہ بھی دکن کی اور تین سو سال پہلے کی اب کیا مزا دے سکتی ہے، بعض الفاظ اور محاورات خود اہلِ دکن آج نہیں سمجھتے لیکن جہاں زبان زیادہ رواں ہے وہاں یہ دقت نہیں، میرحسن کا کمال بھی قابلِ دید ہے۔

اِدھر اور اُدھر آتیاں جاتیاں پھریں اپنے جوبن پہ اتراتیاں

کہیں اپنے پٹے سنوارے کوئی کہیں او رسیلی پکارے کوئی

کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں

بجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے کہیں واہ وا اور کہیں واچھڑے

دکھاوے کوئی گوکھرو موڑ موڑ کہیں سوت بوٹے کہیں تار توڑ

ادا سے کوئی بیٹھی حقّہ پیئے دمِ دوستی کوئی بھر بھر جیئے

کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے کہیں نہر پر پاؤں بیٹھی ہلائے

کوئی اپنے طوطے کی لیوے خبر کوئی اپنی مینا پہ رکھے نظر

کسی کو کوئی دھول مارے کہیں کوئی جان کو اپنی وارے کہیں

کوئی آرسی اپنے آگے دھرے ادا سے کہیں بیٹھی کنگھی کرے

مقابہ کوئی کھول مسّی لگائے لبوں پر دھڑی کوئی اپنے جمائے

کہا جاتا ہے کہ میر حسن سے پہلے فضائل علی خاں بے قید نے اپنی داستانِ عشق کو ایک مثنوی میں نظم کیا تھا۔ میر حسن اور بے قید کی مثنویوں میں بہت کچھ ظاہری اور معنوی اشتراک ہے اور یہ قرینِ قیاس ہے کہ میر حسن اس مثنوی سے متمتع ہوئے ہوں۔

بہر حال ابراہیم قطب شاہ کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ نوجوان شاہزادہ خود تسلیم کرتا ہے۔

وے کوئی میرے دل کوں[22] بھاتی نہیں ۔۔۔ کسی میں سو وہ ٹُک[23] آتی نہیں

اگر نار[24] رہتی[25] وہ اس ٹھار[26] پر ۔۔۔ تو بھلیاں[27] سکیاں[28] سب اُس نار پر

دوانی ہر اِک اس کی یوں نار ہووے ۔۔۔ کہ سٹر تے[29] منج[30] رشک کا ٹھار[31] ہووے

جو یوں دیکھتیاں[33] اُس کوں چک[32] نین بھر ۔۔۔ تو پانی پیتیاں[34] اُس اُپر وار کر

جو دھن سج لوں سارے سویاں نہیں ۔۔۔ پتیاں[35] ہیں وے ایک دویاں نہیں

انو[37] میں کسی پر مرا دل نہیں ۔۔۔ انو تے مجھے کوچ[38] حاصل نہیں

کمل[39] پھول طالب جو ہے سور[40] کا ۔۔۔ وہ محتاج نہیں[41] چاند کے نور کا

کہ عاشق رہے شمع کا جو پتنگ ۔۔۔ نہ بھاوے اُسے پھول کا کوچ[42] سنگ

منج ان سکیاں کا سولو چھند[43] نہ بھائے ۔۔۔ سمندر کو امریت کیا کام آئے

"المنظوم"

---

۲۲ کو۔ ۲۳ ذرا۔ ۲۴ عورت۔ ۲۵ رہتی۔ ۲۶ جگہ۔ ۲۷ بھلی۔ ۲۸ سکھیاں۔ ۲۹ سے۔ ۳۰ مجھے۔ ۳۱ جگہ ۳۲ یہ۔ ۳۳ دیکھتیں۔ ۳۴ ذرا۔
۳۵ پتیں۔ ۳۶ عورتیں۔ ۳۷ اُن ۳۸ کچھ۔ ۳۹ کنول۔ ۴۰ سورج۔ ۴۱ نہیں۔ ۴۲ کچھ۔ ۴۳ طریقہ۔

نمبر (۶)

ہمایوں بابت ماہِ دسمبر ۱۹۳۷ء

تصویر :- پٹھان

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ر

ایسی بات کیونکر کہی جائے جو سب کے لئے درست ہو اور ہمیشہ کے لئے درست ہو؟

غنیمت ہے کہ وہ کام کیا جائے جو تھوڑی دیر کے لئے اور کم از کم کچھ لوگوں کے لئے مفید ہو۔

نیک نیتی اور محنت یہ کافی ہیں! کافی ہیں اگر دُنیا میں اتنے شیطان نہ ہوں!

خدایا ہمیں ایسے خبط سے بچائے رکھ جس میں اُس خبط کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے۔

اِدھر کوئی بات ایسی نہیں جو اہم اور نتیجہ خیز نہ ہو اور اُدھر اہمیت اور نتیجے دونوں ہی غلط ہیں اور بے حقیقت!

آج کل کی دُنیا میں ہزار امن ہو پھر بھی ہر جگہ اور سب لوگوں کے درمیان لڑائی ہی لڑائی ہے۔

مقصد اور نتیجہ صرف اپنے متعلق ہوتا ہے لیکن اُس کا اثر سب پر پڑتا ہے۔

اگر غیر سیاسی چیزیں اور غیر سیاسی امور نہ ہوں تو دُنیا کس قدر تنگ نظر ہو جائے۔

"اے کاش" اور "اے وائے" کہنے کو جی تو چاہتا ہے مگر عقل نے سب جذبات کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں۔

نیند آ رہی ہے اس وقت کون کچھ اور لکھے!

بشیر احمد

جہاںؔ نما

قدیم ہندوستان کا نظامِ تعلیم

آج کل یونیورسٹیوں میں "ٹیوٹوریل سسٹم" پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اگر اس کا مقابلہ ہندوستان میں بُدھ کے زمانے کی یونیورسٹیوں سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں یہ طریقہ صدیوں پہلے رائج تھا۔ اُس زمانے کے نظامِ تعلیم کے متعلق جتنی بھی تحقیقات کی جائے یہی ثابت ہوتا ہے کہ پندرہ سے زیادہ طالب علم کسی استاد کے سپرد نہیں کیے جاتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اُستاد تمام طالب علموں کی طرف فرداً فرداً توجہ کر سکے اور تعلیم و تربیت کے معاملے میں ہر طالب علم کی اچھی طرح رہنمائی کر سکے۔

پڑھانے میں استاد تین مختلف طریقے استعمال کرتے تھے وہ عموماً طلبہ کو اس طرح تعلیم دیتے تھے گویا اُن سے باتیں کر رہے ہیں۔ کبھی وہ طلبہ کے دل میں تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اُن کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کر کے مباحثہ کا دروازہ کھول دیتے تھے اور کبھی وہ اسباب و علل کی بحث چھیڑ کر طلبہ کے فکر و تدبّر کو تحریک دیتے تھے۔

باقاعدہ تعلیم کے علاوہ کبھی کبھی عام "لکچروں" کا انتظام بھی کیا جاتا تھا اور وقتاً فوقتاً طلبہ دوسری یونیورسٹیوں کا چکر بھی لگاتے تھے۔ کھیلوں اور تفریحات کے متعلق بھی پُرانی کتابوں سے بہت سی معلومات بہم پہنچتی ہیں۔ گولہ پھینکنا، بگل بجانا، تیر اندازی، نشانہ بازی، شمشیر زنی، شکار، گھوڑے کی سواری، کُشتی، گھونسم گھونسا وغیرہ اس زمانے کے مقبولِ عام کھیل تھے۔

ہندوستان کی آبادی

حکومتِ ہند کے "محکمۂ امورِ صحت عامہ" کی تازہ روئداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۵ء کا سال، سالہائے ماقبل کے مقابلے میں زیادہ صحت مند سال رہا۔ یہ روئداد بتاتی ہے کہ ۱۹۳۵ء میں ۱۹۳۴ء کے مقابلے میں چار لاکھ دس ہزار پیدائشیں زیادہ ہوئیں اور ۱۹۳۵ء کی اموات سالِ ماقبل سے دو لاکھ اٹھاسی ہزار کم تھیں۔ آبادی کی ترقی کے اس بلند معیار کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی چنانچہ ۱۹۳۵ء کے وسط ہی تک برطانی ہند کی آبادی میں ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مقابلہ میں ایک کروڑ پچاس لاکھ کا اضافہ ہو چکا تھا۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہندوستانی ریاستوں کی آبادی بھی اسی تناسب سے بڑھتی رہی ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ ۱۹۳۱ء سے لے کر اب تک ہندوستان کی آبادی میں پانچ فیصدی کا اضافہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس وقت ہندوستان کی مجموعی آبادی

تخمیناً سینتیس کروڑ ہوگی۔

ہندوستانی سینما

ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن میں دیوان شرر نے ہندوستان کے سینما کے متعلق ایک مقالہ پڑھ کر سنایا تھا جس میں انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ ہندوستانیوں میں اچھی فلمیں تیار کرنے کی قابلیت موجود ہے لیکن اس صنعت کی صحیح تنظیم، ضروری تربیت اور مناسب رہنمائی ابھی تک نہیں کی گئی۔ فنی نکات کے ماہرین کی کمی کی وجہ سے یہاں فلمسازی کی صنعت بہت نقصان اُٹھا رہی ہے ہندوستان میں ہر قسم کے خوبصورت مناظر موجود ہیں۔ یہ سرزمین عدیم النظیر قدیم اور شاندار تاریخی عمارات سے بھری پڑی ہے اور یہاں تاریخ و حکایات کا ایک ایسا ذخیرہ بھی موجود ہے جو ڈرامانگاری کے لئے بیش بہا سہولتیں مہیا کر سکتا ہے لیکن بدقسمتی سے یہاں فن کے اچھے ڈائرکٹر تصویر کش اور منظر نگار موجود نہیں ہیں۔ ہندوستان میں فلمسازی کی صنعت کو ہر قسم کی تنظیم اور خصوصاً سرمایہ کی تنظیم کی بے حد ضرورت ہے۔

اس مقالے میں حکومت سے پُرزور مطالبہ کیا گیا کہ وہ اِس صنعت کے ارتقا میں خود حصّہ لے۔ اس کے لئے قرضے دے۔ ہونہار طلبہ کو برطانی نگارخانوں میں جاکر تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظائف دے۔ موجودہ محکموں میں ایک محکمے کا اضافہ کرکے اسے فلمسازی کی صنعت کی سرپرستی کے لئے وقف کر دے۔

دیوان شرر نے ہندوستان میں تعلیمی فلموں کے رواج کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایک ایسے ملک میں جہاں کی بیشتر آبادی ناتعلیم یافتہ ہو، فلموں سے بہت مفید تعلیمی کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف سکولوں کے طلبہ ہی فلموں سے فائدہ اُٹھائیں گے اگرچہ یہ بھی صحیح ہے مگر طب، زراعت، خانگی صنائع، اصلاح دیہات اور حفظانِ صحت کے محکمے بھی جن کی حکومت پہلے ہی سرپرستی کر رہی ہے اس سے غیر معمولی فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ اگر زراعت، صنعت، تجارت اور صحت کے محکمے یہ کام اپنے ہاتھوں میں لے لیں تو ہندوستانی فلم کمپنیوں کو بہت سی سہولتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

ڈاکٹر اے بیک نے اس مقالہ پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا:-

"ایک بات کا ذکر فاضل مقالہ نگار نے نظر انداز ہی کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ سینما ہندوستان کی بعض قدیم روایات کو بھی جو رفتہ رفتہ مِٹ رہی ہیں محفوظ کر دے گا۔ مسز سٹین ہارڈنگ نے اس سلسلے میں بہت مفید کام کیا ہے۔ قدیم ہندوستان کا فنِ رقص جو رفتہ رفتہ نابود ہو رہا ہے اُن کے مطالعہ اور تحقیقات کا خاص موضوع رہا ہے اور انہوں نے اس باب میں بہت سی تکلیفیں اُٹھا کر بیش بہا معلومات حاصل کی ہیں۔ اس ضمن میں جنوبی ہند کے رقص قابل ذکر ہیں۔ اُنہوں نے وہاں جاکر اُس رقص کے متعلق بھی معلومات بہم پہنچائیں جو عہدِ قدیم میں ہندوستان کے مندروں میں ناچنے والی لڑکیوں میں رائج تھا اور اب دستبردِ روزگار کے ہاتھوں روز بروز نابود

ہو رہا ہے۔

ہندوستان کا فنِ رقص

راگنی دیوی نے "رائل سوسائٹی" لنڈن میں ہندوستان کے رقص کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے قدیم رقص نے انسان میں الٰہی روح کے اظہار کا وسیلہ بن کر فروغ حاصل کیا۔ فن کے لئے ہندوستان کا یہ غیر معمولی احترام وہاں ہر زمانے میں فنونِ لطیفہ کے علمبرداروں کا سب سے بڑا محرک اور رہنما بنا رہا۔ ہندوستانی رقص محض رقص ہی نہیں اس سے کچھ بڑھ کر تھا۔ یہ ہم آہنگ حرکات و اشارات کے ذریعہ سے صُورت پذیر ہونے والے انسانی اور الٰہی جذبات و تخیلات کا ایک مرصّع اظہار تھا۔

اشارات ہندوستانی رقص کے روح و رواں ہیں۔ جدھر ہاتھ حرکت کرتا ہے اُدھر آنکھ دیکھتی ہے اور جسم جھکتا ہے۔ حرکات کی طرف یہ میلان ہی موضوع رقص کا پتہ دیتا ہے اور اسی سے رقص میں توازن اور موسیقی پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان کے قدیم رقص میں ہر اشارہ کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔

اشارات کا یہ فصیح البیان حُسن، ہاتھوں کی اُنگلیوں، ہتھیلیوں اور کلائیوں کے متعلق بعض بنیادی تصوّرات و مفروضات پر مبنی ہے۔ ہتھیلی "دستی زبان" کا اہم ترین مرکز سمجھی جاتی ہے۔ دیکھنے والوں کو اُنگلیوں کے مختلف اشارات کے ساتھ ہتھیلی دکھانا فنِ اشارات میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

عورت کا عقدۂ دشوار

آنریبل مسز وجیا لکشمی پنڈت نے "السٹریٹڈ ویکلی" میں ہندوستانی عورت کی موجودہ حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمیں سب سے پہلے معاشرہ میں عورت کا صحیح منصب معلوم کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ کس طرح ملک اور قوم کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس مسئلے کے متعلق مختلف لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔

ہم اُس زمانے کے مقابلے میں ترقی کی منزل پر بہت آگے بڑھ چکے ہیں جب قبیلے کی عورت خوراک اور بچوں کی نگہداشت کے لئے گھر پر ٹھہری رہتی تھی۔ آج کل عورت کسی خاص دائرے کے اندر بند رہنے پر مجبور نہیں اور کم از کم نظری طور پر اس نے کسی قدر آزادی حاصل کر لی ہے۔

لیکن بہت سی بندشیں جن میں وہ پہلے جکڑی ہوئی تھی، اب بھی نئی نئی صُورتیں اختیار کر کے ترقی کی منزل میں اس کے لئے سنگِ راہ بنی ہوئی ہیں۔

موجودہ تعلیم عورتوں کو ملک کے لئے مفید بنانے کے بجائے ایک آرائشی کھلونا بنا کر نہ گھر کا رہنے دیتی ہے نہ گھاٹ کا۔

تاریخ کے اس جدید دور میں بھی ہنوز مردانہ تہذیب وتمدن ہی کا دور دورہ ہے اور عورت کو کاروبارِ عالم میں ابھی اپنی صحیح جگہ نہیں ملی۔ حالانکہ تہذیب کے لئے عورت کا وجود بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا مرد کا۔ چنانچہ موجودہ عورت کی جنگ نہ صرف مرد کے کاروباری اجارے کے خلاف ہے بلکہ اس کا مقصد مرد کی اجارہ داریٔ تہذیب وتمدن کا توڑ بھی ہے۔

یہی کافی نہیں کہ عورت نسل کو قائم رکھنے کے لئے بچے پیدا کرتی رہے۔ اسے ان بچوں کی جسمانی اور روحانی تربیت کے گر بھی معلوم ہونے چاہئیں۔ اس کو ان میں یہ خصوصیت پیدا کرنے کا ڈھب آنا چاہئے کہ وہ حق کو پہچان سکیں اور حالات سے بے پرواہو کر حق کی حمایت کرسکیں۔

پہلے عورتوں کا کام صرف گھر بنانا تھا لیکن کوئی وجہ نہیں کہ وہ مزید ترقی کرکے ملک کی زندگی کی تنظیم میں حصّہ نہ لیں۔

گذشتہ زمانے میں عورتیں زیادہ تر خیالی زندگی بسر کرتی تھیں لیکن اب ان کے خیالات کا رُخ زیادہ سے زیادہ حقیقت کی طرف پھر جانا چاہئے۔ وہ گھر کے انتظام کی عادی رہ چکی ہیں۔ اب انہیں یہ ثابت کرنا چاہئے کہ وہ ملک کا انتظام بھی کرسکتی ہیں۔

عورت کو گھر کی ملکہ ضرور ہونا چاہئے، وہ اپنے گھر کو خوبصورت اور پُرمسرت ضرور بنائے لیکن اس کے اس فطری جوہر سے وسیع تر میدانِ عمل میں بھی کام لینا چاہئے۔

عورتوں کو یہ کوشش بھی کرنی چاہئے کہ وہ دُنیا کو زیادہ خوبصورت، زیادہ حق پرست، اور زیادہ رہنے کے قابل بنائیں ہمیں چاہئے کہ دُنیا کو بتادیں کہ ہندوستانی عورت کا حسن اس کی جرأت اور حق پرستی میں پنہاں ہے۔

ہندوستان کی تعلیم

حال ہی میں گاندھی جی نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

"موجودہ نظامِ تعلیم ملک کی ضروریات کے لئے قطعاً مناسبِ حال نہیں۔ تمام اعلےٰ علوم میں انگریزی ذریعۂ تعلیم بنی ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی بے حد وشمار ناتعلیم یافتہ آبادی اور قلیل التعداد تعلیم یافتہ آبادی کے درمیان علیٰحدگی کی ایک مستقل دیوار حائل ہوچکی ہے اور علم عوام تک سرایت نہیں کرسکتا۔ انگریزی کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اُس نے تعلیم یافتہ لوگوں پر ایک ایسا بوجھ ڈال دیا ہے جس نے عمر بھر کے لئے ان کے دماغوں کو مفلوج کردیا ہے اور وہ اپنے ہی ملک میں اجنبی بن گئے ہیں۔ صنعتی تعلیم کے نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم یافتہ جماعت تخلیقی کام کرنے کے قابل نہیں رہی اور اس ناقابلیت سے اُسے جسمانی طور پر بھی نقصان پہنچا ہے۔ پرائمری تعلیم پر جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے وہ ایک لحاظ سے ضائع ہی جاتا ہے کیونکہ جو تھوڑی بہت تعلیم اس طرح دی جاتی ہے وہ جلد بُھلا دی جاتی ہے اور شہروں

اور گاؤں کو مجموعی طور پر اس سے بہت کم فائدہ پہنچتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں سب سے بڑی ٹیکس دینے والی جماعت تعلیمی فواید سے محروم رہتی ہے۔

پرائمری تعلیم کا نصاب کم از کم سات سال پر پھیلانا چاہیے اور اس کا معیار کم از کم انٹرنس کے تعلیمی درجے تک پہنچا دینا چاہیئے۔ لیکن اس میں انگریزی کو کم کر کے کسی مفید پیشہ کی تعلیم کا اضافہ کر دینا ضروری ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کو سکول میں کوئی ایسا فایدہ مند پیشہ ضرور سکھانا چاہیے جس کی پیداوار دورانِ تعلیم میں ان کے تعلیمی مصارف کی کفالت کر سکے اور فارغ التحصیل ہو چکنے کے بعد انہیں اس قابل بنا دے کہ وہ فکرِ معاش سے آزاد ہو جائیں۔

روئی، اُون، ریشم کا جمع کرنا، صاف کرنا، کاتنا، رنگنا، بُننا، کپڑے کا سینا اور کاڑھنا، کاغذ بنانا، کتابوں کی جلد بندی کرنا، الماریاں اور کھلونے بنانا، یا گڑ، شکر وغیرہ تیار کرنا اس قسم کے پیشے ہیں جو آسانی سے سیکھے جا سکتے ہیں اور جن کے لئے زیادہ سرمایہ کی ضرورت نہیں۔

پرائمری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنی روزی کمانے کے قابل بنا دے اور حکومت کو یا تو انہیں کام بہم پہنچانے کا ذمہ لینا چاہیئے یا اُن کی محنت کی پیداوار کو سلطنت کی طرف سے مقرر کردہ قیمتوں پر خرید لینے کا انتظام کرنا چاہیئے۔

باقی رہی اعلےٰ تعلیم سو اسے کچھ تو لوگوں کی شخصی استعداد و ضرورت پر چھوڑ دینا چاہیئے اور کچھ مختلف صنائع، دستکاریوں، فنونِ لطیفہ، اور ادب میں قومی ضروریات کی مناسبت پر۔

حکومت کی یونیورسٹیوں کا کام صرف امتحان لینا ہو اور وہ اپنے مصارف کو امتحانوں کی فیسوں سے پورا کریں۔ یونیورسٹیوں کا کام یہ بھی ہو کہ وہ عام تعلیمی معاملات کی نگرانی کریں اور نصاب تعلیم کی تیاری اور منظوری کا کام بھی اپنے ذمے لیں۔ یونیورسٹیوں کی منظوری کے بغیر کوئی پرائیویٹ سکول نہ کھل سکے۔ یونیورسٹی کے چارٹر، قابل اور ہوش مند لوگوں کے ہر ادارے کو فراخ دلی سے عطا کر دیئے جائیں لیکن یونیورسٹیوں کے مصارف کا کوئی بار حکومت پر نہیں پڑنا چاہیئے۔ البتہ ایک مرکزی ادارۂ تعلیم کا خرچ حکومت ضرور برداشت کرے۔

اِن تجاویز کا یہ مطلب نہیں کہ حکومت ان سکولوں اور کالجوں کے مصارف بھی ادا نہ کرے جن کا وجود سلطنت کے مفاد کیلئے ضروری ہے۔

یہ دعوےٰ کیا گیا ہے کہ اگر یہ تمام تجاویز منظور کر لی جائیں تو اس سے سلطنت کے آئندہ ارکان یعنی موجودہ نوجوانوں کی تعلیم کے اہم مسئلے کا حل بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔

حامد علی خاں

ہمایوں کا سالگرہ نمبر ۱۹۳۸ء ۔ ہمایوں کا آئندہ پرچہ اس کا سولھواں سالگرہ نمبر ہوگا جو اپنی مخصوص روایات کے ساتھ یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو شائع ہوگا۔

"مینیجر"

بیاضِ راحلؔ کا ایک ورق

تیر و نشتر

ع دو سہ حرفِ خونچکا نے بہ تو ارمغاں فرستم

(۱)

زہرِ غمِ ہجر تو بجاں کارگر افتاد — اُمیدِ وصالِ تو بعمرِ دگر افتاد (علی حزینؔ)

شیخ کا یہ مطلع زور میں، برجستگی میں، درد میں، حسنِ بیان میں جس میں کہیئے بے مثال ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ ایسا مطلع پھر اس زمین میں نکال سکے۔ اس شعر کی خوبی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ خدائے ہند ملک الشعراء میر تقی نے اُس کو قابلِ تضمین سمجھا۔ فرماتے ہیں:۔

دُوری ہی میں طاقت نہ رہی بات کی آخر — روزی نہ ہوئی رات ملاقات کی آخر

زہرِ غمِ ہجرِ تو بجاں کارگر افتاد — اُمیدِ وصالِ تو بعمرِ دگر افتاد

(اقتباس از مقالۂ سید رضا علی وحشت) (میر تقی میر)

(۲)

دِلّی سے تازہ آئی تھی یہ میرؔ کی غزل — جس کا یہ شعر ہوش سے بیہوش کر چلا

"یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رُخ زرد پر مرے — کہتا ہے "میرؔ رنگ تو اب کچھ نکھر چلا" (میر حسن)

(۳)

گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے
پھولوں سے ابھی تک تری خوشبو نہیں جاتی

(حامد علی خاں)

جی چاہتا ہے اس جنوں انگیز شعر کو اپنے غمخانے کی دیواروں پر جا بجا لکھوں، پڑھوں اور رقص کروں! بقول منصور احمد "وہی" اور "ابھی تک" دو لفظ ہیں جو اس شعر میں کوئی افسانہ کہہ رہے ہیں: وہ کیا حشر تھا جو گلزار کے سایوں میں بپا ہوا، اور کیوں پھولوں سے ابھی تک اُس کی خوشبو نہیں جاتی؛ صرف وجدان ہی ان سوالات کی پہنائی کو پا سکتا ہے۔

مُرسلۂ حضرتِ راحلؔ ہوشیارپوری

میں ایک نامور پنجابی امیرزادہ ہوں۔ زندگی کے تاریک پہلو کا مجھے ذاتی تجربہ نہیں بجز افسانوں میں، رسائل واخبارات میں نیز بمواعظ وتقاریر میں بسا اوقات انسانی مظالم کی سوز فرسا داستانیں پڑھی اور سُنی ہیں۔ بارہا خدا کی بے کس ستم رسیدہ، افلاس زدہ اور اپاہج مخلوق دیکھی ہے، مگر مزدور کی سرمایہ دار کے خلاف شکایت، مفلس کا منعم کی بے اعتنائی سے گلہ، مقروض کا قرضخواہ کی بے رحمی کے خلاف احتجاج مجھے ہمیشہ بے جا اور ناگوار معلوم ہوا۔ اپنی جاہ و ثروت کو میں نے ایک ناگزیر انعام سمجھا جو رحمت ایزدی نے میری یا آبا جان کی کسی نامعلوم خوبی کے صلے میں بخشا ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس دُنیا کے دیگر مرفہ الحال اور صدیوں سے دولت و حشمت کے اجارہ دار لوگ مجھے خاصانِ خدا نظر آئے چنانچہ تحریکِ اشتراکیت کو میں نے انسانی فطرت کا وہ شیطنت آمیز ولولہ گردانا جس کے آگے حقوق العباد خس و خاشاک کی طرح بہ جائیں

مگر آج صبح کیا ہوا؟

میں حسبِ معمول شکار کے لئے تیار ہوا۔ باورچی کو کہ اس کا گھر میری کوٹھی کے عقب میں چند گز کے فاصلے پر تھا، بُلا بھیجا۔ مگر اس نے خلافِ عادت تعمیلِ حکم میں دیر کر دی جسے میں نے عدول حکمی پر محمول کیا۔ بس بپھر گیا تھا۔ دل میں شعلۂ غضب مشتعل ہوگیا۔ سامنے آتے ہی دو تین تھپیڑ اُس کے کہن سال جھرّی دار چہرے پر رسید کئے۔ پھر پوچھا "مالک کے حکم کی تعمیل یوں ہؤا کرتی ہے ناہنجار؟ دیکھ ساڑھے آٹھ بجنے کو آئے۔ اب شکار کیا خاک کھیلوں گا۔" لرزتے ہوئے ہونٹ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ "بکو مت۔ جلد کھانا تیار کرو" کے حکم نے اس کو ساکت کر دیا۔ مگر میں یہ دیکھ کر کچھ حیران سا ہوگیا کہ جب وہ برتن اُٹھاتا تو اُس کے ہاتھ کانپتے۔ اور جب کھانا پکانے کے اہتمام میں اِدھر اُدھر جاتا تو اس کی ٹانگیں لڑکھڑاتی تھیں۔ ایک خدمتگار نے میرے چہرے کا استعجاب دیکھ لیا۔ بولا "حضور باورچی کے اکلوتے بیٹے پر نزع طاری ہے۔"

میرے دل پر ایک بجلی سی گری۔ میں بھی ایک ہی بچے کا باپ ہوں۔ چند دن گذرے میں نے ایک شاہی دربار میں شامل ہونے کی دعوت محض اس لئے ٹھکرا دی تھی کہ میرے بچے کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔

عرقِ انفعال سے میرا بدن تر ہوگیا۔ دل بھر آیا۔ بڑی مشکل سے اتنا کہا "چھوڑ دو۔ اپنے گھر جاؤ" اُسے گئے کوئی دس منٹ گذرے ہوں گے کہ اُس کے گھر سے آہ و بُکا کی جگر گداز صدائیں اُٹھنے لگیں۔ یہ آہ و بُکا معنی اشتراکیت کی ایک فصیح ترین تفسیر تھی۔

غلام محی الدین

زندگی اور موت

زندگی

ننھی کلی سو رہی تھی اپنے خوابوں سے ہم آغوش

نسیمِ سحر نے آہستہ آہستہ اُسے جگایا

اب وہ پھول تھی

بادِ سموم کی تندیوں کی تاب نہ لاکر

پھول مرجھا گیا

آہ کیا اسی کا نام زندگی ہے ؛

موت

وہ آرہی ہے

ہر صبح میں اُسے قریب تر پاتا ہوں

میں اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی ہر ممکن سعی کر رہا ہوں

تاکہ اُس کے آنے سے پیشتر اپنی آرزوئیں پوری کر لوں

کیونکہ میرے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے سے

اُس کی رفتار کم نہ ہو گی۔

محمد ایوب

مسرت کے چشمہ سے سیراب ہو کر میں عمر کے مزار پر پہنچا۔
—— رباعیات کی حیات بخش شراب سے مدہوش ہو کر
نغمۂ ایران سے بے بس ہو کر
شیرینیٔ فارس سے شاد کام ہو کر
میں نے مدت العمر میں ایسی شاداب سرزمینِ عشق نہ دیکھی تھی
—— آہ مزارِ خیام کے انوارِ عشق و تصوف!

گلابوں سے ڈھکے ہوئے مزار پر پہنچا
اس نہر کے کنارے جہاں سبز گھاس کا نم روح پرور ہے۔
میں کنارِ دریا بیٹھ گیا
رباعیوں کے جرعات سے مدہوش ہو کر
—— ہاں اسی کنارِ دریا پر جہاں عمر روز آیا کرتا تھا!
گلاب کی نکہت، ماہتاب کی بارشِ انوار
آسمان کی پیدائشِ انجم
اور سامنے مے خانے کا کھلا ہوا دروازہ
میں اس نظارہ کو گھنٹوں دیکھتا رہا
—— ہاں میں گم ہو گیا!

انگور کی بیل مزار کے گرد لپٹی ہوئی نظر آئی ——

گل کوزہ کو میں نے جابجا دیکھا ـــــــ

گلگوں شراب کے مزے

گلاب تازہ کی نکہت !

گلِ کوزہ کا خمیر

اور گل چہرہ نازنینوں کے جلوے دیکھے !!

ہاں، دوستو، ــــ ہاں، میں نے رباعی کے چاروں مصرعے یکجا دیکھے !

اس چاندنی رات کو

کاش عمر میرے ساتھ زندہ ہوتا ــــ اے کاش اگر ایسا ہوتا۔

مگر لوگ عمر کو بھولتے جاتے ہیں۔

عمر کو ہم سے جدا ہوئے برسوں گزر گئے

اب

اس کی روح کہاں ہے ؟

کسی گلاب میں ــــــ جسے دیکھ کر ہم بھول گئے ہیں

کسی ستارہ کی دمک میں ــــ جسے ہم پہچانتے نہیں

کسی مہ رو میں ــــــ جسے ہم جانتے نہیں !۔

کسی کوزہ میں ــــــ ہاں، وہ ضرور کسی کوزہ میں ہے

کیوں ؟

اس وجہ سے کہ آج کل شراب بہت پی جا رہی ہے ۔

ہاں، دوستو، اس کی روح بادۂ ناب میں ہے

اُس شب میں مزارِ خیام پر سو گیا۔

خواب میں ایک پیر مرد نظر آیا۔

عمر خیام باشندۂ نیشاپور، بغل میں اصطرلاب

اور ہاتھوں میں آلاتِ مے کشی! اور کوزہ

ایک کوزۂ نو

خوبصورت گل پوش کوزہ ——— عرقِ تُند سے لبریز

خیام مسرور تھا، مستی و جوش سے سرشار، آنکھیں قطب تارے کی طرح روشن اور چمکدار تھیں —

پُوچھا "تُو کون ہے، اے جوان؟"

جواب دیا

"ایک مسافر، رباعیوں کی پیاس میں تیرے چشمۂ عشق و گداز سے سیراب ہونے آیا ہوں

——— ہاں ایک کوزۂ حیات" مجھے بھی دے

ایک جرعۂ مست مجھے بھی پلا تاکہ میں بھی کائنات کو بھلا دوں

اپنے آپ کو بھلا دوں

اپنے محبوب کو بھلا دوں

اور

تجھے بھی بھلا دوں

ہاں میری باغی روح تمام آفرینش کو بھلا دے البس ایسا جرعہ پلا دے

عُمر نے تبسم کیا اور بولا :-

"مسافر۔ تو اپنے مینائے دل کو "ملالِ حیات" سے لبریز نہ ہونے دے!

اُمید کے کوزوں میں مسرت کے جرعے چڑھائے جا!

روز ایک نیا میخانہ تعمیر کر

روز ایک نیا مطرب بلا

روز ایک نیا ساغر بدل

روز ایک نیا کوزہ توڑ

روز ایک نیا دن گزار!

روز جواں رہ۔ ـــــــــ کیونکہ

کل قیامت آنے والی ہے ـــــ کل کو کل پر چھوڑ

آج کے جرعہ سے دل کی لگی بجھا!

روز نئی مسرت کے کوزہ میں اُمید کی شراب پیا کر ـــــــــ مایوس نہ ہو، ملول نہ ہو ـــــــــ"

میں نے عمر کا جامِ شیریں پی لیا!

ایک نیا انسان، ایک نئی روح، ایک نئی تازگی

روز میں اس کی شراب پیتا ہوں ـــــــ لوگ اسے رُباعیاں کہتے ہیں۔

نادان، انجان لوگ سمجھتے نہیں!

ـــــــــ غمِ ایام کو، مرجھائے ہوئے گلاب اور ٹوٹے ہوئے کوزہ کو بھول چکا ہوں

مسرت و اُمید کی شراب سے محبت کی نورانی راتوں اور عشق کے پُر فضا باغوں میں اپنی زندگی گزارتا ہوں اور ہر آفتاب کے ساتھ ایک نئی زندگی لے کر پیدا ہوتا ہوں۔ آفتاب روز نکلے گا اور میں کبھی نہ مروں گا اور نہ بوڑھا ہوں گا، میں ایک دن مزارِ خیام پر گیا ـــــــ!!

ظفر قریشی بی۔اے
دہلوی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا میں نہ ناپ

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اقبال

کیلاش کنول

ترجمۂ "لالۂ طور" از "پیامِ مشرق"

"میں نے ہمایوں کے لئے یہ تراجم علامہ اقبال کی اجازتِ خاص سے کئے ہیں۔ براہِ کرم کوئی صاحب انہیں میری اجازت کے بغیر شائع کرنے کا قصد نہ فرمائیں۔"

مقبول احمد پوری

(۱)

گذشتی تیز گام اے اخترِ صبح
مگر از خوابِ ما بیزار رفتی
من از ناآگہی گم کردہ راہم
تو بیدار آمدی بیدار رفتی

(ترجمہ)

پھُرت[۱] گیا تو صبح کے تارے
سُپنے سے رُوٹھ گیا تو ہمارے
آیا تو اور گیا بھی چوکس[۲]
ہم انجان ہیں راہ بِسارے[۳]!

۱؎ پھُرت معنی جلد۔ تیز (فرفر) ۲؎ چوکس معنی چوکنا۔ آگاہ و ہوشیار
۳؎ بِسارے معنی بُھلائے جیسے بھولی بسری (بات)

(۲)

تہی از ہائے و ہُو مے خانہ بودے
گِلِ ما از شرر بیگانہ بودے
نبودے عشق و ایں ہنگامۂ عشق
اگر دل چوں خرد فرزانہ بودے

(ترجمہ)

مَن کی سبھا میں نہ ہوتی ہل چل
تَن میں نہ پھُوٹتی پریم کی کوپل
پریت نہ ہوتی یہ ہوک نہ اُٹھتی
دل میں جو گیان کا ہوتا کس بل[۴]

۴؎ عقل کی قوت یا اُس کا کس بل عقلمندی یا فرزانگی ہے۔

(۱۵)

ترا اے تازہ پرواز آفریدند
سراپا لذّتِ بال آزمائی
ہوس ما را گران پرواز دارد
تو از ذوقِ پریدن پر کشائی

ترجمہ

تازہ[1] اُمنگ ہے تیرے مَن میں
چاہ اُڑن کی بھری جیون میں
لوبھ سے پنکھ ہیں اپنے بھاری
کھول کے پر تا کے تو گگن[2] میں

۱ نئی ۔ نویں   ۲ گگن معنی آسمان

(۱۶)

چہ لذّت یا رب اندر ہست و بود است
دلِ ہر ذرہ در جوشِ نمود است
شگافد شاخ را چون غنچۂ گل
تبسم ریز از ذوقِ وجود است

ترجمہ

کونسا رس داتا[1] جیون میں
کامنا[2] جیو[3] کی ہے کن کن[4] میں
چیر کے شاخ کلی جب نکلے
کھلکے ہنسے جیون سے چمن میں

۱ داتا معنی خدا۔ رب۔ ۲ کامنا معنی آرزو۔ ۳ جیو معنی جان یعنی زندگی۔
۴ کن کن معنی ذرہ ذرہ ۔

فلسفہ اور زندگی

مجھے اس بات کا پکا یقین ہے کہ فلسفہ زندگی پر ایک نہایت اہم اور وسیع اثر مترتب کرتا ہے لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ اثر نہ درست ہے اور نہ ایسا جسے آسانی سے بیان کیا جا سکے۔

فلسفہ کے اثر کے درست نہ ہونے سے میری مُراد یہ ہے کہ فلسفہ مذہب کی طرح یہ نہیں سکھاتا کہ زندگی کسی خاص طرز پر بسر کی جائے۔ اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ وہ دُنیا کے لئے کوئی مخصوص پیغام لے کر نہیں آیا۔ بایں ہمہ یہ بالکل یقینی ہے کہ اس کا مطالعہ ہماری نگاہ میں وسعت، ہمارے مذاق کی سطح میں بلندی، اور ہمارے قلب میں کشادگی پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس انقلاب کو زیرِ مطالعہ مسائل سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا اور نہ یہ بتلایا جا سکتا ہے کہ خود یہ انقلاب ہے کیا چیز۔ تاہم ممکن اختصار سے کام لے کر میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ فلسفہ کا مطالعہ کرتے ہیں ان پر وہ کس قسم کا اثر ڈالتا ہے اور یہ اثر قابلِ قدر کیوں ہے اور پیدا کیسے ہوتا ہے۔

فلسفہ کے متعلق بے بُنیاد دعوے:۔

فلسفہ کے متعلق یہ امر شروع ہی میں ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ ہمیں اس سے غلط توقعات وابستہ نہیں کرنی چاہئیں۔ وہ نہ ہماری آمدنیوں میں اضافہ کرنے کے وسائل سوچتا ہے نہ ہمیں سماج میں کامیاب بنانے کی تدبیریں اور ترکیبیں سُجھاتا ہے نہ ہماری شخصیتوں کے اثر اور نفوذ کو بڑھانے میں مدد دیتا ہے اور نہ دوستوں میں ہماری ہر دل عزیزی کو فروغ بخشتا ہے اس کے برعکس اس بات کا قرینہ بلکہ احتمال موجود ہے کہ وہ ان چیزوں میں معتدبہ کمی پیدا کر سکتا ہے۔ آج کل کی دُنیا کاروبار اور تجارت کی دُنیا ہے لوگوں پر سوداگرانہ ذہنیت بُری طرح مسلط ہو گئی ہے جس کی وجہ سے اُنھوں نے ہر علم اور ہر مطالعہ کی قدر کا معیار یہ قرار دے رکھا ہے کہ اس سے کون کون سے ٹھوس دُنیوی نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ فلسفہ چونکہ اس معیار پر پُورا نہیں اُترتا اس لئے اُسے عدم التفات کے تاریک غار میں دھکیل دیا گیا ہے۔ عام پسند سائنس اور نفسیات کے پھیلاؤ نے بھی فلسفہ کی ہر دلعزیزی کو کچھ کم نقصان نہیں پہنچایا۔ آج فلسفہ کو لفظی گورکھ دھندے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور یہ کہ اس کا دامن معین اور مسلم نتائج کی دولت سے بالکل خالی ہے، یہ الزامات سائنس اور نفسیات کے اسی روز افزوں پھیلاؤ کا نتیجہ ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ کوئی شخص اس سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اس طرح **فلسفہ کے خلاف اہم الزامات** دو ہیں :-

(۱) یہ کہ اس کو زندگی سے کوئی تعلق نہیں - اور

(۲) یہ کہ اس کے نتائج معین اور مسلم نہیں ہوتے -

اگر پہلے اعتراض سے مُراد یہ ہے کہ فلسفہ روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے عملی مسئلوں کا کوئی حل تجویز نہیں کرتا تو ہمیں اس الزام سے انکار کی مجال نہیں - کیونکہ زندگی اگر کوئی فن ہے تو فلاسفہ اس کے غالباً گیا یقیناً فن کار نہیں ہیں اور نہ فلسفہ کے مطالعہ سے اس فن کے اصُول اور قواعد اور اسلوب کا علم ہوتا ہے - اگر ہم زندگی کو شطرنج کے کسی عقدہ سے تعبیر کریں تو فلسفہ اس کا کوئی بنابنایا حل مہیا نہیں کرتا - اگر کسی فلسفی کو یہ دعویٰ ہو کہ اس کی تحریرات کا مطالعہ پڑھنے والے کو کارزارِ حیات کی صبر آزما تگ و دَو کے لئے تیار کرتا ہے تو ہمیں یہ آزادی اور حق حاصل ہے کہ ہم اس دعوے کی سنجیدگی کا مضحکہ اُڑائیں - اسے مشتبہ سمجھیں اور بے بنیاد قرار دیں فلاسفہ کی زندگیوں پر اگر ہم ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ فلسفہ معاملاتِ زندگی پر کوئی درست اثر نہیں ڈالتا - سیاسی فلسفی اپنے عامی ہمسایہ کے مقابلہ میں نہ بہتر شہری ہوتا ہے اور نہ بہتر مدبّر - مابعد الطبیعی فلسفی بہت سے سوالوں کے قطعی اور متفق علیہ جوابات پیش کرنے سے قاصر ہے کائنات کی ابتداء کیسے ہوئی ؟ کیا وہ مشینی انداز میں چل رہی ہے ؟ کیا خدا کا وجود بدیہی ہے ؟ اور کیا مادّہ حقیقتہً موجود ہے ؟ یہ وہ چند مسئلے ہیں جن پر مابعد الطبیعی فلسفی غور کرتا ہے لیکن ایسے حل پیش نہیں کرپاتا جو ایک دُنیا کے لئے لائق تسلیم اور قابلِ قبول ہوں، اخلاقیاتی فلسفی اخلاق کے اعتبار سے کسی معمولی انسان پر کچھ تفوق نہیں رکھتا - وہ "فلسفیانہ طبیعت" کے لئے کچھ زیادہ مشہور نہیں ہوتا اس میں اور ایک عام انسان میں کیا بہ لحاظ بُردباری اور کیا بہ لحاظِ خوش مزاجی کوئی لائقِ لحاظ فرق نہیں ہوتا وہ جب کوئی چیز کھو بیٹھتا ہے تو ایک معمولی آدمی کی طرح اپنی جھنجلاہٹ کو روک نہیں سکتا - اور نہ موقع بے موقع قسم کھانے سے چوکتا ہے اگر کوئی فلسفی ان تمام اخلاقیاتی نظاموں کو جو آج تک تجویز کئے اور ترتیب دیئے گئے ہیں گھول کر بھی پی جائے تو کوئی اچھا آدمی نہیں بن سکتا اور نہ سوچنے اور غور کرنے سے وہ کوئی مسرور انسان ہی ہوسکتا ہے -

فلسفہ سے حاصل کیا ؟

ایسی صُورت میں آپ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ آخر فلسفہ سے حاصل کیا ؟ اور اگر جواب میں دیانت کا اہتمام کیا جائے تو بادلِ ناخواستہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فلسفہ سے راست کوئی فائدہ نہیں اور اس خصوص میں وہ بالکل منفرد ہے کیونکہ سائنس ہمیں ہوائی جہازوں اور موٹروں میں بٹھاتی ہے تحلیل نفسی ہمیں اپنے دوستوں کے عیبوں اور نقصوں کی اطلاع دیتی ہے اور ادب عقلی مذاکروں کے لئے موزوں عنوانات مہیا کرتا ہے لیکن فلسفہ ان سب کے برعکس کوئی ٹھوس فائدہ ہمیں نہیں پہنچاتا - اس لحاظ سے اسے بیکن کی زبان میں "بانجھ کنواری" کہنا بالکل درست ہے -

لیکن یہ تنقید ایک سخت تنقید ہے اور سوء فہمی کی پیداوار۔

ہمارے زمانے میں بھرا ہوا پیٹ اور کھنکھناتی جیب سب کچھ ہیں اور قدر ایسی چیزوں کی ہے جو مادّی فوائد سے مملو ہوں۔ اسی لئے غیر پیشہ ورانہ تعلیم یعنی وہ تعلیم جو تنازع للبقا میں مددنہ دے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھی جاتی۔ امریکہ کی نئی جامعات میں تعلیم صرف عملی فنون (مثلاً تعمیرات، زراعت، طب وغیرہ) کی دی جاتی ہے اور نظری ریاضیات، فلسفہ اور تاریخ سے کوئی اعتنا نہیں کیا جاتا۔ یہ رُجحان اب نہ صرف امریکہ کی پُرانی جامعات ہی میں پھیلتا جا رہا ہے بلکہ ساری دُنیا ہی اسی رَو میں بہ رہی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جب ہم تعلیم پر روپیہ صرف کرتے ہیں تو تعلیم کیوں نہ ہمارا اصل مع سود ادا کرے۔

اس مطالبہ کی صحت سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن "ادائی" کے تصور پر اعتراض ضرور ہے۔ اچھی خوراک، اچھی پوشاک، اور اچھی حالت یقیناً "ادائی" کی تعریف میں داخل ہیں لیکن ادائی کو انہی کی حد تک محدود رکھنا اور محدُود سمجھنا یقیناً ایک غلطی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا صحتِ فکر کی استعداد، وہ ہمدردی اور رواداری جو دوسروں کے نظریوں اور ان کی مشکلوں کو اچھی طرح سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے، اور بے غرضانہ عقلی تحقیق کی عادت ادائی کی تعریف میں داخل نہیں؟ کیا یہ چیزیں ہماری زندگیوں کی خوش حالی اور کاملیت میں کچھ اضافہ نہیں کرتیں؟ دُنیائے جدید کہتی ہے کہ نہیں اور یہیں ایک فلسفی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور وہ اِس دعوتِ مبارزت پر جو اس انکاری جواب میں مضمر اور متضمن ہے بے ساختہ لبیک کہہ اُٹھتا ہے۔ اس کے مباحثہ اور معارضہ کے مورچہ کا رُخ اس وقت خود بخود قدروں کی طرف پھر جاتا ہے کیوں کہ ساری بحث کا دار و مدار انہیں پر ہے۔ وہ یہ پوچھتا ہے کہ اگر گزر بسر کی حالت آپ کی اچھی ہے لیکن راست بازی یا نیک معیشت کا کوئی تصوّر آپ کو حاصل نہیں تو اچھی حالت کے حصُول کی خصوصیات اور علامات کیا ہیں؟ اور اس کے بعد خود ہی یہ بتلاتا ہے کہ راست بازی یا نیک معیشت میں بہت سے غیر مادّی فائدے شامل ہیں اور یہ فائدے وہی ہیں جن کی تکمیل فلسفہ کرتا ہے اور جن کے فقدان کی صُورت میں وہ زندگی بھی جو مادّی طور پر سب سے زیادہ کامیاب ہے سب سے زیادہ ناکام کہی جا سکتی ہے۔ اس طرح جن وجوہ کی بنا پر فلسفہ کو بیکار ٹھیرایا جاتا ہے انہی وجوہ کو فلسفہ کا مطالعہ قابلِ ترک قرار دیتا ہے لیکن یہ سب کچھ ایک پیش قیاسی ہے اور بنا بریں اس قابل نہیں کہ بحالاتِ موجودہ اس پر زیادہ توجہ صرف کی جائے۔

حاصل شدہ نتائج کی غیر قطعیت۔

اب دوسرے اعتراض کو لیجئے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ فلسفہ سائنس کی طرح نتائج پیش نہیں کرتا۔ اس سے مراد اگر یہ ہے کہ وہ ان سوالوں کے متفق علیہ جوابات نہیں گزرانتا جو ابتدا سے سوچنے والے انسان کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ تو ہمیں اس اعتراض کے وزنی ہونے سے انکار نہیں۔ فلسفیوں کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے پیش روؤں کے حاصل کردہ نتائج کو جس صورت میں کہ وہ انہیں ملتے ہیں قبول نہیں کرتے۔ اور نہ انہیں اپنی عمارتوں کی بنیادیں بناتے ہیں بلکہ اپنا بہت سا وقت اور اپنی بہت سی قوت صرف

ان کی تنقید پر ان کے دلائل و براہین میں مین میکھ نکالنے پر اور ان کے نتیجوں کو مشتبہ ٹھہرانے پر صرف کرتے ہیں دُنیا چھان ڈالئے اور کوئی فلسفہ آپ کو ایسا نہیں ملے گا جس پر جملہ فلاسفہ کو اتفاق ہو۔ حالانکہ پہاڑوں پر تمام ریاضی والوں کو اتفاق ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فلسفیوں کی اکثر و بیشتر بحثیں اس بارے میں ہیں کہ ان کے موضوع بحث کی حقیقی ماہیت کیا ہے اسی بنا پر یہ پھبتی کسی گئی کہ فلسفی وہ اندھا آدمی ہے جو ایک اندھیری کوٹھڑی میں ایک کالی بلی کو ڈھونڈ رہا ہے اور یہ کالی بلی وہ ہے جس کا وہاں پتہ نہیں۔

فلسفہ کے خلاف جتنے الزامات عائد ہو سکتے ہیں ان سب کا آزادی کے ساتھ اظہار کرنے کے بعد یہ دیکھنا چاہئے کہ فلسفہ اپنی صفائی میں کیا بیانات پیش کرتا ہے۔ یہ الزام کہ فلسفہ کے نتائج معین نہیں ہوتے ایک ایسا الزام ہے جس کا مفہوم عام متبادر مفہوم سے جُدا ہے جملہ حکمتیں ابتدا میں فلسفہ تھیں، فلکیات، ریاضیات، حیاتیات اور طبیعیات یونانیوں کے زمانہ میں فلسفہ کی شاخیں تھیں اور وہ اس وقت تک فلسفہ کی شاخیں بنی رہیں جب تک کہ ان میں قیاس آرائی کو دخل تھا لیکن جوں ہی کہ ان کے بارے میں معین چیزیں کہی جانے لگیں وہ فلسفہ سے جُدا ہوتی اور مستقل حکمتیں بنتی گئیں۔ اس طرح فلسفہ کی حیثیت ایک مُدرّس کی ہے جو لڑکوں کو نہایت جانفشانی اور محنت سے پڑھاتا ہے اور دل سے یہ چاہتا ہے کہ وہ لائق ہوں لیکن جب وہ لائق ہوتے ہیں تو اسے چھوڑ جاتے ہیں یہی اس کی خوش قسمتی ہے اور یہی بدقسمتی۔

فلسفہ میں معین علم کو کوئی دخل نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مادی واقعات سے بالکل بیگانہ ہے لیکن اس کی یہ بیگانگی اس کے لئے مضرت رساں نہیں بلکہ فائدہ بخش ہے۔ کیونکہ اسی بیگانگی کی بدولت وہ انسان کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے ہے۔ اب ذرا سی دیر کے لئے یہ مان لیجے کہ فلسفہ یکسر غیر قطعی ہے اور کائنات کے متعلق ہماری واقفیت میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ تو کیا ایسی صورت میں وہ بالکل ردّی اور بیکار ہو جائے گا؟ جواب یقیناً نفی میں ہونا چاہئے کیونکہ اگر ہم فلسفہ کی قدر کا تخمینہ کم سے کم بھی کریں اور اس کے بارے میں بدترین سے بدترین رائے کو بھی صحیح باور کریں تو زیادہ سے زیادہ اسے ایک دماغی کھیل ٹھہرا سکتے ہیں۔ اس حیثیت میں وہ ان چیزوں کے لئے جن پر ہم بربنائے جبلت یقین لانا چاہتے ہیں دلائل دریافت اور مہیا کرتا ہے۔ دلائل کی یہ دریافت خود ایک جبلت ہے۔ یہ جبلت عقلی تجسس کی ہے اور اس کی تسکین صرف فلسفہ کے بس میں ہے۔ جس طرح جسمانی صحت کی برقراری کے لئے ورزش کی ضرورت ہے خواہ وہ کوئی کیوں نہ ہو اسی طرح ذہنی صحت کی بقاء کے لئے بھی ورزش کی ضرورت ہے۔ ذہن کے لئے ایسی ورزش جو اسے ہمیشہ چاق و چوبند بنائے رکھے سوائے فلسفہ کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ ذہن کی تنقیہ اور تقویت کے لئے فلسفہ کے سوا اور بھی مشاغل ہیں لیکن فلسفہ راس المشاغل ہے اور بنا بریں ذہن کی اور مشاغل کے مقابلہ میں بہت زیادہ تنقیہ کرتا ہے، یہ تنقیہ استدلال اور جدلیات کے ذریعہ انجام پاتی ہے، یوں تو ہر استدلال دلچسپ ہوتا اور ہو سکتا ہے لیکن کوئی استدلال فلسفیانہ استدلال کے مقابلہ میں آنے کی حامی نہیں بھر سکتا۔ فلسفیانہ بحث غیر قطعی ہوتی ہے۔

لیکن اس کا یہ غیر قطعی ہونا ہی اس کی سب سے بڑی دل فریبی ہے ہر بحث جو واقعات کے بارے میں ہوتی ہے واقعات کے معلوم ہونے پر فوراً ختم ہو جاتی ہے مثلاً ایک شخص سے آپ حیدر آباد سے دہلی جانے والی گاڑی کے وقت کے متعلق بحث کرتے ہیں بحث کچھ طول کھینچتی ہے اور آپ یا آپ کے مخاطبوں میں سے کوئی زچ ہو کر اور ہمت کر کے ریلوے کا ایک نظام الاوقات خرید لاتا ہے نظام الاوقات کے آتے ہی ساری بحث دم بھر میں ختم ہو جاتی ہے کیونکہ مزید بحث کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس طرح ہر بحث جو فلسفیانہ بحث نہیں صرف اسی وقت تک جاری رہ سکتی ہے جب تک کہ واقعات کا علم نہیں ہوتا۔ جہاں واقعات ہمارے علم میں آئے اور بحث یکلخت ختم ہو گئی، واقعات کی دنیا میں عقل آرائی کو داخلہ کی ممانعت ہے کیونکہ اس کی حیثیت وہاں حرف مکرر یا انگشت ششم کی ہے ہم سوچتے اسی وقت ہیں جب کہ ہم جانتے نہیں ہیں۔ فلسفہ کو چونکہ معین نتائج سے کوئی سروکار نہیں لہٰذا وہی ایک ایسا علم ہے جو اپنے وابستگان دامن کو واقعاتی علم کی دم گھونٹنے والی تنگیوں سے نجات دلاتا ہے۔

فہم عامہ کی دنیا میں انقلاب۔

لیکن ناانصافی ہو گی اگر ہم فلسفہ کو محض ایک کھیل سمجھیں وہ کھیل نہیں کھیل سے بہت کچھ سوا ہے وہ ہماری زندگیوں کو متاثر کرتا ہے اور ذہنی کسرت سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اس کے عملی اثرات مختلف پیرایوں میں اثر کرتے ہیں، وہ ایک معمولی چیز کو لیتا ہے اور یہ بتلاتا ہے کہ ہم کو اس کے متعلق کتنا تھوڑا علم ہے اور ہمارا یہ زعم کہ ہم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں کس قدر باطل ہے مثلاً ایک کرسی کو لیجیے فہم عامہ کے لئے تو وہ چار چوبی پایوں اور ایک چوبی نشست کا مجموعہ ہے لیکن فلسفہ یہ ثابت کر سکتا ہے کہ وہ باری تعالےٰ کے ذہن کا ایک تصور ہے یا روحوں کی ایک نوآبادی ہے یا حاصلات حس کا ایک مجموعہ ہے یا ہماری اپنی نفسیات کا ایک جزو ہے۔ یا مطلق کا ایک تغیر ہے وہ ان متعدد نظریوں میں سے ہر نظریہ کی تائید میں دلپذیر دلائل پیش کر سکتا ہے اور اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں ثابت کر سکتا کہ کرسی واقع میں کیا ہے یعنی صرف باری تعالےٰ کے ذہن کا ایک تصور ہے یا روحوں کی نوآبادی، یا حسیات کا مجموعہ، یا ہماری اپنی نفسیات کا جزو یا مطلق کا تغیر لیکن یہ ثابت کر سکتا ہے اور پورے ایقان کے ساتھ کہ وہ معمولی کرسی نہیں ہے۔ اس نقطۂ نظر سے فلسفہ کی قدر کا دار و مدار تمام تر اس کی نااستواری اور بے اعتباری پر ہے۔ وہ شخص جسے فلسفہ سے نیاز حاصل نہیں ایک ایسا شخص ہے جو اپنے سماج اور اپنے زمانہ کے تعصبات اور مرغوبات اور اعتقادات کا بندۂ بے دام ہے، وہ اگر تبت کا رہنے والا ہے تو ایک عورت کا متعدد مردوں سے نکاح کرنا اس کے نزدیک جائز ہے۔ اور اگر مورمن فرقہ سے تعلق رکھتا ہے، تو ایک مرد کا متعدد عورتوں سے بیاہ رچانا اس کے نزدیک مباح اور مشروع ہے۔ وہ اگر ۴۰۰ ق۔م میں پیدا ہوا ہے تو سورج کو زمین کے گرد گھومتا خیال کرتا ہے اور اگر اس نے ۱۹۰۰ء میں جنم لیا ہے تو زمین کو سورج کے گرد متحرک باور کرتا ہے اس طرح جن نظریوں کو وہ مانتا ہے ذاتی اجتہاد اور شخصی اور غیر جانبدارانہ فکر کی بنا پر نہیں مانتا۔ وہ سب کے سب اس کے

اعتقادات کی پیداوار ہیں اور یہ اعتقادات وہ ہیں جن کے آئینہ میں اس کے اپنے زمانہ کے تعصبات اور مسلمات عکس فگن ہیں۔ ایک ایسے شخص کے لئے دنیا بے رنگ اور بے تہ ہے معمولی چیزیں اشتباہات سے بالاتر ہیں اور نامانوس امکانات مردود اور مطرود۔ فلسفی کی حالت اور ہے فلسفہ مسلمات کو مشتبہ ٹھہراتا، حیرت کی حس کو بیدار کرتا، اور دنیا کو پُراسرار بناتا ہے۔ وہ موجودات کے متعلق ہمارے یقین کو مختصر کر کے ممکنات کے امکان کو وسیع کر دیتا ہے۔ اس طرح زندگی زیادہ دلچسپ، زیادہ دلکش، اور زیادہ دلفریب بن جاتی ہے۔ لیکن اس لئے نہیں کہ جو سوالات فلسفہ اُٹھاتا ہے ان کے جوابات بھی وہ تجویز کرتا جاتا ہے بلکہ اس لئے کہ ایسے سوالات اُٹھا کر وہ ہمیں واقعات کی کال کوٹھڑی سے نکالتا اور آزاد فکر کی ہوادار اور دھوپ سے جگمگاتی دُنیا میں داخل کرتا ہے۔

فلسفہ حساب گھر کی حیثیت میں۔

اس نوبت پر ہماری توجہ خود بخود فلسفہ کے مخصوص وظیفہ کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ یہ وظیفہ صرف فلسفہ انجام دے سکتا ہے۔ اور اسی کے دم سے فلسفہ کی گرمیٔ محفل قائم ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ وظیفہ کیا ہے ہمیں فلسفہ اور سائنس کے باہمی اساسی فرق پر نظر ڈالنی چاہئے، سائنس دان اپنے مخصوص دائرۂ عمل میں اور اپنے اس موضوع میں جسے دوسرے موضوعوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کائنات کے صرف ایک حصّہ پر توجہ دیتا اور غور کرتا ہے۔ وہ اس طرح الگ تھلگ رہ کر کم و بیش معین نتائج اخذ کرتا ہے اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کرتا کہ اس کے حاصل کردہ نتیجوں کو دوسرے سائنس دانوں (مثلاً ماہرانِ حیاتیات، یا طبیعیات، یا نفسیات، یا فلکیات، یا ریاضیات وغیرہ) کے نتیجوں سے کون علاقہ ہے۔ یہ واقعہ ہے سائنس دان کی تنقیص یا تنقید نہیں ہے، کائنات میں باہمی تعلق کا قیام سائنس دان کا کام نہیں اور جب صورت حال یہ ہے تو کوئی تعجب نہیں جو سائنسوں کے نتائج آپس میں لڑ جائیں، آج کل ہو بھی یہی رہا ہے۔ جدید طبیعیات کے بعض نتائج نفسیات کے ایک مشہور دبستان کی دریافتوں سے کوئی میل نہیں رکھتے۔ اس طرح دُنیا کے بارے میں اگر طبیعیات دانوں کے قول کو صحیح فرض کیا جائے تو نفسیات دانوں کا قول صحیح نہیں ہو سکتا اور یہی حال اس کے عکس کا ہے۔ بنابریں ضرورت ہے ایک ایسے حساب گھر کی جہاں مختلف سائنسوں کے مختلف نتیجوں میں مطابقت پیدا کی جا سکے تاکہ مجموعی حیثیت سے ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ جس دُنیا میں ہم رہتے سہتے ہیں وہ کس قسم کی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے مقدرات کیا ہیں۔

اس طرح فلسفہ کی یہ تعریف ہوگی کہ وہ ایک کوشش ہے دُنیا کو مجموعی حیثیت سے سمجھنے کی، وہ طبیعیات اور حیاتیات کی طرح دُنیا کے کسی خاص شعبہ سے بحث نہیں کرتا۔ اس کی نظر کائنات کے پورے مجموعہ پر ہوتی ہے، کائنات کے اس مجموعہ میں جہاں طبیعیات اور حیاتیات دانوں کی دریافتیں داخل اور شامل ہیں وہیں انسانی نسل کی پوری تاریخ، حسن کار کی جمالی لذت، بزرگانِ دین کا مذہبی شعور اور عام انسانوں کے اخلاقی وجدانات بھی داخل اور شامل ہیں۔ ایک ایسے ہمہ گیر اور ہمہ رس موضوع کے متعلق نپے

تلے اور معین علم کی تلاش دیوانگی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔
اول تو یہ موضوع خود مسلسل بہاؤ کی حالت میں ہے اور پھر تغیر پذیر یا اپنا نقیض آپ ہونا صرف فلسفہ سے مخصوص نہیں سائنس بھی اسی قسمت سے دوچار ہے اور غالباً زیادہ ہے۔ آپ سائنس کی پچھلی تاریخ کھنگال دیجئے۔ آپ کو اس کا کوئی صفحہ ایسا نہیں ملے گا جو رد کئے ہوئے نظریوں سے رنگین نہ ہو۔ ایک عہد کے کلیاتی قوانین اور ضوابط دوسرے عہد میں زیب طاقِ تردید نظر آتے ہیں، آج کل کا طبیعیات دان مادی دنیا کی ترکیب کے بارے میں ہر دس سال میں ایک نظریہ کی رفتار سے آگے بڑھا جا رہا ہے اور حیاتیات داں ارتقا کے اسباب وغیرہ کے متعلق گرما گرم اور غیر مختتم بحثوں میں اُلجھا ہوا ہے۔ لیکن ان نتائج کے فرق جن کے متعلق فلسفی قیاس آرائیوں سے کام لیتا ہے اتنے زیادہ اہم نہیں جتنے زیادہ کہ فلسفیوں کے ذہنی فرق اہم ہیں۔ فلسفہ واقعات کا چٹھا بنانے یا ان کی گنتی کرنے پر قناعت نہیں کرتا۔ وہ ان کے معنوں کی تحقیق اور تفتیش کرتا ہے۔ سائنس دانوں، دینی بزرگوں، حسن کاروں، اور عام انسانوں کے تجربوں کو باہم ملا کر اور ترتیب دے کر وہ یہ پتہ چلانا چاہتا ہے کہ اس دنیا کی جس میں تمام تجربے ممکن ہوں ماہیئت کیا ہوگی۔ کیا ہونی چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اسے دلچسپی واقعات سے نہیں واقعات کے معنوں اور مفہوموں سے ہے اس طرح جیسے سائنس کے مخصوص اصول دو ہیں (۱) افتراض اور (۲) تصدیق ویسے ہی فلسفہ کے بھی مخصوص اصول دو ہیں (۱) انتخاب اور (۲) رد۔ ان اصولوں کے ذریعہ فلسفہ بعض واقعات کو اہم اور بعض کو غیر اہم اور بے وقعت ٹھہراتا ہے، وہ قدروں کا تعین بھی کرتا ہے اور دنیا کے خیر اور جمال پر سے اس کے مول تول کا اندازہ بھی۔

موضوعی عنصر۔

حاصل کلام یہ کہ فلسفہ ایک تلاش ہے معنی کی ایک جستجو ہے مفہوم کی ایک تشخیص ہے قیمت کی اور ایک تعیین ہے قدر کی۔ لیکن واضح رہے کہ ان چیزوں کی تلاش اور تشخیص میں شخصی خصوصیتوں کو بہت بڑا دخل ہے۔ ہم چنتے اور چھانٹتے انہی واقعات کو ہیں جن کو ہم اہم سمجھتے ہیں انہی اشکال کے بموجب چنے ہوئے واقعات کو اکٹھا کرتے اور ترتیب دیتے ہیں جن کو بامعنی خیال کرتے ہیں اور انہی چیزوں کو قدروں سے منسوب کرتے ہیں جن کو خوبصورت اور اچھا پاتے ہیں۔ اس طرح اہمیت معنی، جمال، اور خیر کا انحصار زیادہ تر ہمارے اپنے اذہان کی مخصوص ساخت پر ہے اور نہ صرف اذہان کی مخصوص ساخت پر بلکہ ہماری سیرتوں اور طبیعتوں پر بھی۔ ایک ہی چیز ایک شخص کو بھلی لگتی ہے اور دوسرے کو بری، ایک ہی چیز میں ایک آدمی توافق کو کارفرما دیکھتا ہے اور دوسرا تخالف کو۔ کسی کو دنیا میں خدا کا ہاتھ کام کرتا نظر آتا ہے اور کسی کو مادہ کا، کوئی دنیا کو بامقصد خیال کرتا ہے اور کوئی بے مقصد۔ انسان کی ہستی کو کوئی اتفاق کا نتیجہ سمجھتا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ نہیں وہ ایک سوچی سمجھی ہوئی چیز ہے۔ غرضکہ واقعات تو سبھی کے لئے وہی ہیں البتہ ان کی تعبیر یں اور ان سے اخذ کئے ہوئے نتیجے مختلف ہیں لیکن اس اختلاف کو ہمیں افسوسناک نہیں خیال کرنا چاہئے۔ کیوں کہ جس طرح افراد کا اختلاف دنیا کی ہستی کے لئے ضروری ہے اسی طرح اذہان کا اختلاف اس دنیا کے متعلقہ حق کی تشکیل کے لئے ضروری ہے۔ پس فلسفہ سے بھی

محض اس لئے دست کش نہیں ہونا چاہئے کہ ہر فلسفی ایک جداگانہ نظام رکھتا ہے کیونکہ اگر نظامات کا تعدد کوئی جرم ہے تو اس کا پہلا اور آخری مجرم غالباً فلسفہ نہیں اخلاق اور مذہب اس سے پرانے گنہگار ہیں، ایک کے ہاں اخلاقی تصدیقات بے شمار ہیں اور دوسرے کے ہاں مذہبی یقین کی اشکال۔

پس معلوم ہوا کہ فلسفہ کے نتائج غیر قطعی اس لئے ہوتے ہیں کہ وہ واقعات کی بجائے واقعات کی تعبیر پر موقوف ہوتے ہیں اور جب ہم واقعات کو پھلانگ جاتے اور ان میں معنی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہماری شخصیت ایسی کوششوں میں ایک نمایاں اور اہم حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ایک واقعہ سے دو ناظر دو مختلف مفہوم لیتے ہیں اور دو مختلف نظریے ترتیب دیتے ہیں اور یہ محض اس لئے کہ وہ دو مختلف افراد ہیں۔ مثلاً لوگوں کے ادیان کو لیجیے، ان کی بنیاد جن واقعات پر استوار ہے وہ ہیں تو سبھی کے لئے ایک ہی لیکن ان کی تعبیروں کے فرق نے ایک گوناگونی پیدا کر دی ہے۔ دنیا کے بارے میں کوئی نظریہ کتنا ہی اوٹ پٹانگ کیوں نہ ہو اس کے ماننے والے کچھ نہ کچھ نکل ہی آئیں گے اور ہر وہ یقین جس کا آسمان کی نیلی چھت کے نیچے کوئی قایل ہو اپنی پشت پر چند در چند نفیس دلائل ضرور رکھتا ہے۔ ان حالات میں یہ معلوم کرنا کچھ دشوار نہیں کہ واقعات کے ساتھ ہمارا برتاؤ اور ان کے معنوں کے متعلق ہمارا تخمینہ دونوں ایک حد تک ہماری طبیعتوں، ہمارے تجربوں، ہماری خواہشوں، اور ہماری امیدوں کے تابع ہیں اور یہ معلوم کرنے کے بعد اکثر و بیشتر ہمیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہماری عقل ہمیں صرف اس لئے تو نہیں دی گئی کہ ہم ان چیزوں کے لئے جن پر ہم جبلتہً یقین لانا چاہتے ہیں دلائل وضع اور ایجاد کر سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری امیدیں اور خواہشیں ہر جگہ قریب قریب یکساں ہیں خواہ ہم ان کا روپ کتنا ہی کیوں نہ بدل دیں تاہم یہ ماننے پر ہم مجبور ہیں کہ ان میں اختلافات ہیں اور ناقابل انکار۔ مثلاً جنت کے تصور کو لیجیے۔ دنیا کے تقریباً ہر مذہب میں یہ تصور موجود ہے لیکن اسلامی، عیسوی، عبرانی، ہندی، زردشتی وغیرہ جنتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ماحصل اس ساری بحث کا یہ ہے کہ ساری خواہشیں ہمارے نتیجوں پر بہت بڑا اثر اور اقتدار رکھتی ہیں۔ ایک مرتبہ اگر ہم اس بات کو مان لیں اور اس سے کوئی گریز بھی نہیں تو فلسفہ ایک شخصی بیان قرار پاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ دنیا کی ایک تصویر ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ فلسفی کا ایک عکس ہے۔ اتنا جان لینے کے بعد ہم پر یہ لازم ہے کہ جب کبھی ہم فلسفہ کے دعوئ حق کی قیمت کا اندازہ لگانا چاہیں تو سب سے پہلے اس میں سے شخصی جزو کو حذف کر دیں۔ سائنس دان سروکار صرف واقعات سے رکھتا ہے لیکن فلسفی اس سے ایک قدم آگے بڑھاتا اور یہ بتاتا ہے کہ وہ واقعات اس کے خیال میں کن کن باتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ آپ اس سے اتفاق کر سکتے ہیں کیونکہ اس کے استدلال کی بے پناہ قوت کے سامنے تسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی خواہشوں میں آپ اس کے شریک ہوتے ہیں۔

فلسفیانہ موضوعاتِ بحث کی ہمہ گیری۔

اس طرح فلسفہ کی بے وثوقی اور نا استواری کے سبب دو ہیں:۔

(۱) ایک یہ کہ جن مسائل پر وہ غور وفکر کرتا ہے ان کا نہ حساب ہے اور نہ شمار۔ اور

(۲) دوسرا یہ کہ فلسفیوں کی طبیعتیں آپس میں ایک دوسرے سے لگا نہیں کھاتیں۔ اور طبائع کا یہ اختلاف فلسفیانہ مسائل کے ساتھ ان کے برتاؤ اور ان کی بحث ونظر پر بڑا اثر ڈالتا ہے۔

لیکن فلسفیانہ مسائل کی ہمہ گیری صرف جوابات ہی میں غیر قطعیت نہیں پیدا کرتی بلکہ ان ذہنوں کو بھی متاثر کرتی ہے جو فلسفہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ فلسفہ علم کی پوری قلمرو کو اپنی قلمرو بنا کر ان مسئلوں سے بحث کرتا ہے جو نوع انسان کو ابتدا سے پریشان کئے ہوئے ہیں۔ ان مسئلوں پر قابو پانے کے لئے وہ جدید ترین معلومات سے جن میں مخصوص حکمتوں کے جملہ نتائج بھی داخل ہیں استفادہ کرتا ہے لیکن ان نتائج پر وہ قناعت نہیں کرتا۔ اس کے لئے یہ نتائج ایڑ کا حکم رکھتے ہیں جس سے برانگیختہ ہو کر وہ عقل آرائی میں معروف ہو جاتا ہے یا اس کے نزدیک وہ بمنزلہ ایک اونچے پشتہ کے ہیں جس پر سے اُچھلکر "وہ نامعلوم" کی وسیع اور عریض باؤلی میں کود پڑتا ہے مختصر یہ کہ سائنس دان کی انتہا فلسفی کی ابتدا ہے۔ فلسفی حکمیاتی تحقیق کے نتائج اور حاصلات کی روشنی میں انسانیت کے قدیم مسائل پر نظر کرتا ہے۔ یہ دیکھتا ہے دیکھتا رہتا ہے کہ کیا دنیا کا کوئی مقصد ہے یا وہ سالمات کا ایک اتفاقی اجتماع ہے؟ کیا ذہن دُنیا کا کوئی بنیادی خاصہ ہے یعنی ایک ایسی چیز جو انتہائً ساری دُنیا میں کارفرما ہے یا محض ایک عرض ایک اتفاقی شے ہے؛ اور کیا خیر وشر حقیقی اور مستقل اصلیں ہیں یا محض ایسے اسماء جن سے ہم ان چیزوں کو موسوم کرتے ہیں جن کو پسند یا ناپسند کرتے ہیں؟

فلسفہ ان مسئلوں کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کرنا چاہتا ہے، وہ کبھی یہ کوشش نہیں کرتا کہ دل خوش کن یا سستے نتیجے اخذ کرے یا ایسی دُنیا تعمیر کرے جو انسانی خواہشوں سے کامل مطابقت رکھتی ہو اس کے برعکس اس کا مقصد شروع سے یہ ہے کہ معروضی واقعات کے بارے میں اس کا رویہ مائل بہ معقولیت ہو اور ستائش اور نکوہش دونوں سے بے پروا ہو کر حق کا انکشاف کرے۔

فلسفیانہ طرزِ عمل:-

اب وہ اصحاب جو ایسے غیر شخصی مسئلوں کے مطالعہ پر اپنا عزیز وقت صرف کرتے ہیں عمل اور جذبہ کی دُنیا میں بھی اسی قسم کی غیر جانبداری اور آزادی کو قائم رکھتے ہیں۔ کیونکہ بنیادی مسئلوں پر غور کرنے سے انہیں یہ معلوم رہتا ہے کہ تیقن کے ساتھ ہم کو علم کتنا تھوڑا حاصل ہے۔ فلسفی یہ ماننے میں کبھی پس وپیش نہیں کرتا کہ اس کے مخالف نظریے اتنے ہی برحق ہو سکتے ہیں جتنے کہ اس کے اپنے نظریے ہیں۔ اس طرح فلسفہ رواداری سکھاتا ہے اور رواداری وہ ابراہیمی تیشہ ہے جس سے صواب وناصواب، خیر وشر، حق و باطل کے آزری بُت چُور چُور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ایک فلسفی کے افکار اور افعال کو اگر ہم صائب، خیر اور برحق قرار دیں تو دوسرے فلسفی کے ـــــ اس فلسفی کے جو بالکل مختلف الخیال ہے ـــــ افکار وافعال لازماً غیر صائب، پُر شر، اور باطل ٹھہریں گے۔ لیکن فلسفی تو یہ مانتا ہے کہ اس کے مخالف کے نظریے بھی اسی قدر برحق ہو سکتے ہیں جس قدر کہ اس کے اپنے نظریئے برحق ہیں۔ یعنی نہ صواب کچھ ہے اور نہ ناصواب، نہ خیر و

نہ شر، نہ حق اور نہ باطل۔ علاوہ ان تمام باتوں کے ایک ایماندار مفکر اس واقعہ کے پیشِ نظر کہ بنیادی سوالوں کے متفق علیہ جوابات اب تک دیئے نہیں گئے۔ یہ تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں کر سکتا کہ فلسفہ کے جملہ نظامات ایک نہ ایک حد تک غلط ضرور ہیں۔ وہ لوگ جن کے مذاق فلسفہ پسند نہیں یا جن میں فلسفہ کی کوئی رمق نہیں، آپ کو معلوم ہے کرتے کیا ہیں؟ وہ کرتے یہ ہیں کہ دوسروں کے قیاسات اور قرائن کو اعتقادات اور ادعاؤں میں تبدیل کر کے جملہ ناقابلِ ثبوت سوالوں کو علم بنا ڈالتے ہیں لیکن فلسفی ایسا نہیں کرتا وہ کھلے بندوں یہ اقرار کرتا ہے کہ ہم جسے علم کہتے ہیں وہ سراسر قیاسی ہے، ظنی ہے، احتمالی ہے۔ اور تعصب اور ہٹ دھرمی اور جبر نہ صرف عصمت اخلاق ہی کو آلودہ کرتے ہیں بلکہ حق اور صداقت کی راہ کے زبردست روڑے بھی ثابت ہوتے ہیں، پس فلسفہ قابلِ قدر اس لئے نہیں کہ وہ زیرِ مطالعہ مسئلوں کے جوابات تجویز اور پیش کرتا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ وہ متعدد مسئلوں پر غور کرتا اور ان سے مختلف اسالیب کے ذریعہ سے بحث کرتا ہے۔

دُنیا ایک وجودِ باعظمت ہے اور جو ذہن اس پر غور و خوض کرتا ہے وہ بھی اس کے پرتو سے باعظمت بن جاتا ہے۔ ہم انسانوں کی اکثریت ادنیٰ درجہ کی خواہشوں اور کم پایہ مقصدوں کی کنیز ہے لیکن فلسفی اس سطح سے بہت بلند ہوتا ہے وہ عامیانہ احتیاجوں اور دُکھ دردوں کو پرِ کاہ کے برابر وقعت نہیں دیتا۔ اس کی نظر مافوق الانسان پر ہوتی ہے اور وہ ماورائے نفسیات سے ربط ضبط پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ذہن کی یہ عظمت، یہ بزرگی، رواداری، نصفت پسندی، اور خوش فہمی جیسی صفتوں کو ابھرنے کا موقع دیتی ہے اور عہدِ حاضر کی مصیبتوں کا خاتمہ بڑی حد تک انہی صفتوں کے نشوونما پر منحصر ہے۔

(سی۔ ای۔ ایم جوڈ)

مترجمہ

محبوب بیگ

دن اور رات

میرے نصیب کیونکر اچھے ہو سکتے ہیں؟
مجھ سے آسائش چھین لی گئی ہے،
رات اس تکان کو رفع نہیں کر سکتی،
جو پیدا ہوتی ہے
دن میں۔
دن اور رات دشمن ہیں اگرچہ

ایک دوسرے کے،
لیکن متحد ہیں دونوں
مجھے آلام کا شکار بنانے میں
دن گزرتا ہے مصیبت میں
اور رات،
اسبابِ غم پر غور کرنے میں۔

باری

مردِ حق سے خطاب

گرم مردانِ خدا سے ہُوا ہنگامۂ حق
لالہ گوں خونِ شہیداں سے ہُوا جلوۂ حق

اشکِ شاعر سے ہوئی کشتِ محبت شاداب
فکرِ اربابِ خرد سے چھٹے باطل کے سحاب

جتنے پیغامبر اور جتنے بھی اوتار ہوئے
سب کے سب حق و صداقت کے علمدار ہوئے

ابھی ابلیس کی قوّت ہے مگر زوروں پر
ابھی انسان پہ ہے اس کا اثر زوروں پر

ہے فضا دہر کی مسموم و غم انگیز ابھی
آتشِ بغض و عداوت ہے بہت تیز ابھی

ظلمت و نور ہیں آپس میں گلوگیر ابھی
محفلِ دہر کی، گردش میں ہے تقدیر ابھی

اے جواں مرد! ہو اللہ کی رحمت تجھ پر
جنگ برپا ہے ابھی خواہشِ آرام نہ کر!

صفحۂ دہر پہ باطل کا نشاں ہو اب تک
تو بھی رہ تیغ بکف تاب و تواں ہو جب تک

اثر صہبائی

حسنِ مآل

نہ مشاہدہ نہ مجاہدہ کوئی خواب ہے نہ خیال ہے
مری کائناتِ خموش ہیں، نہ فراق ہے نہ وصال ہے

میں ہزار ضبط کروں تو کیا! میں ہزار کچھ نہ کہوں تو کیا!
ترے آستانۂ ناز پر، مری خامشی بھی سوال ہے

مری ایک کاہشِ آرزو ہے فروغِ عالمِ آرزو،
کہ ہزار ماہِ تمام جس میں چھپے ہیں یہ وہ ہلال ہے

میں نثارِ رحمتِ عشق ہوں کہ بغیر عشق کے دہر میں
نہ کوئی نشاط نشاط ہے، نہ کوئی ملال ملال ہے

وہی اک حقیقتِ لم یزل ہے ہر ایک رنگ میں جلوہ گر
کہیں خاکِ کشتۂ طور ہے کہیں برقِ نازِ جلال ہے

کسی اعتکاف نشینِ دل پہ گمانِ کم نظری نہ کر،
کہ جو ہم نشینِ خیال ہو، وہی ہم نشینِ جمال ہے

نہیں شیخ: منبرِ وعظ سے کوئی دارِ عشق کو فاصلہ
دلِ باخبر ہی زباں سے بنے تو جو قال ہے وہی حال ہے

دلِ نامراد کی بے کسی مجھے بامراد بنا گئی
جو عزیزِ خاطرِ دوست ہو وہ مآل حسنِ مآل ہے

دلِ زندہ اُس پہ فدا روشؔ مرے دل کی ہے وہی زندگی
جو مرادِ عشقِ اویس رضؓ ہے، جو حبیبِ قلبِ بلالؓ ہے

روشؔ صدیقی

کرنے کے کام

۱۔ شہر اکثر غلیظ ہیں تنگ ہیں ۔ نئے بنائے جائیں یعنی ایسے کہ مکان ہوادار ہوں، سڑکوں پر خاک نہ ہو، شہروں کے اندر اور باہر چھوٹے اور بڑے باغ ہوں۔ گزرگاہوں میں نالیاں نظر نہ آئیں اور گھروں سے دھواں نہ نکلے ۔

سکول شاندار ہوں ۔جیل ہرگز نہ ہوں اور ہسپتال اس قدر آرام دہ ہوں کہ کوئی مریض گھر میں رہنا پسند نہ کرے۔ ڈاکٹر فیس نہ لے اور دوا بلا قیمت ملے ـــــ تھیٹروں، سینماؤں، ناچ گھروں میں داخلہ کا ٹکٹ نہ ہو اور خور و نوش کا اعلےٰ انتظام ہو اور ہاں مفت بھی ہو۔

ریشمی اور اُونی کپڑوں کی بے نظیر منڈیاں ہوں ۔کپڑے کی قیمت واجبی ہو یا نہ ہو۔ درزی فوراً سی دے، دھوبی وقت پر دھولائے اور بل گورنمنٹ ادا کرے۔

پُرانے کپڑے پُرانے جُوتے کانگرس خود اپنے خرچ پر گھروں سے جمع کرے۔

فرنیچر، چاندی سونے اور چینی کے برتن نہایت خوبصورت ہوں اور اُن کے خراب یا شکستہ یا مستعمل ہونے پر حکومت ازخود بدل دے بل ضرور بھیجا جائے مگر یاددہانی نہ کی جائے ۔

۲ ۔ مذہب یہ ہو کہ ایک دوسرے کو نصیحت کرنا عبادت ہے ۔ صرف یہی عبادت مقرر ہو۔

یہ کہنا کہ نصیحت پر عمل کرو گناہ ہو اور صرف یہی ایک گناہ ہو۔

۳ ۔ شہروں میں اگر کوئی پیدا ہو تو سرے سے جوان اور فاضل ہی پیدا ہو اور جوان ہی رہے ۔ سکول صرف گاؤں والوں کے بچوں کے لئے مخصوص ہوں ۔

۴ ۔ شہروں سے دُور مناسب فاصلوں پر خوشنما گاؤں بسائے جائیں جہاں پکنک (Picnic) کے لئے جانا روح افزا ہو۔ گاؤں والے دن رات پکنک والوں کی خدمت کو عزت تصور کریں اور مکھن، دودھ، شہد، پھل اور پھول بلا معاوضہ پیش کریں۔

۵ ۔ عورتیں سب حسین اور نازک مزاج ہوں یعنی کبھی کبھی رُوٹھ بھی جائیں تاکہ منانے کی نوبت آئے اور پھر من بھی جائیں۔

۶ ۔ ہر کام مشینوں سے ہو۔ یہاں تک کہ ہنسنا بھی مشینوں سے چلیں ۔

۷ ۔ ہر گلی کوچہ میں ایک دو موت کی مشینیں ضرور ہوں جس کا مرنے کو جی چاہے وہ مشین میں داخل ہو جائے اور مشین اسے بجلی کے ذریعہ قطعی غائب کر دے ۔ اگر کسی قسم کی راکھ بچے تو زمین کے اندر ہی اندر کسی تختۂ گل میں کھاد کی صورت میں بکھر جائے ۔

اس قسم کی دُنیا بنی ۔ کچھ عرصہ خوب چلی مگر آخر ہر ایک نے یہی فیصلہ کیا کہ مفت جینے سے موت کی مشین کا احسان اُٹھانا بہتر ہے ۔ اب اس دنیا کی یادگار صرف وہ چند پھول ہیں جو کبھی کبھی کسی اچھے باغ میں دکھائی دے جاتے ہیں ۔ کیا خوب انسان تھے کہ مفت جینے کی تہمت گوارا نہ کی اور مر کر ہماری اس نکمی دُنیا پر بہار کا احسان کر گئے ۔

کیا موجودہ انسان بھی اس قابل ہوں گے کہ مریں اور پھول بنیں ؟ اُمید کچھ کم ہی ہے ۔ جسے دیکھو مفت جینے کی ہوس میں مرتا ہے ۔

"فلک پیما"

رازِ سربستہ

مَیں نے پوچھا ۔ تم مُنہ چھپا کر کیوں مسکراتے ہو ؟

بولے ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ پھول رات کو کیوں کھلا کرتے ہیں ۔

اوس

اے دلرُبا !

اُمیدیں اور اُن پر آنسوؤں کی اوس ۔

گلاب کی خوشنما پتیاں اور اُن پر اوس کی بوندیں ۔ مگر ان میں کس قدر فرق ہے ؛

آتشِ گُل اور بھڑک اُٹھتی ہے اوس سے لیکن بیچارہ عاشق اُس اوس سے بُجھ کر رہ جاتا ہے ۔

اور پھر یہی گلاب عاشقِ نامراد کی قبر پر چڑھائے جاتے ہیں ۔

گوردمن داس بی ۔ اے

رُباعیات

جو تیرے لئے خراب ہو جاتا ہے
ہر شے میں وہ کامیاب ہو جاتا ہے
دل ذرۂ بے نور ہے جلنے کے بغیر
جلتا ہے تو آفتاب ہو جاتا ہے

دِل میں جو ترا درد مکیں ہو جائے
دُنیا مجھے فردوسِ بریں ہو جائے
ڈھل جائے جو سانچے میں محبت کے نظر
ہر چیز زمانے کی حسیں ہو جائے

مَے تیری محبت کی پیئے پھرتے ہیں
دِل دہر سے آزاد کیئے پھرتے ہیں
سینے میں چراغِ تہِ داماں کی طرح
اِک شعلۂ بے تاب لیئے پھرتے ہیں

سراج الدین ظفر

غزل

اُٹھی وہ گھٹا شیشہ و پیمانہ کہاں ہے؟
مطرب ہے کدھر، ساقیٔ میخانہ کہاں ہے؟
افسردہ ہُوا جاتا ہے پھر غنچۂ خاطر
لے جلد خبر جوششِ مستانہ کہاں ہے؟
نعمت یہ خداداد ہے اللہ جسے دے
ہر اِک کو میسّر دلِ دیوانہ کہاں ہے
ممکن ہے جبیں سائی سے تسکینِ جنوں ہو
تقدیر میں لیکن درِ جانانہ کہاں ہے
اسرارِ محبت ہیں عیاں قلبِ حزیں پر
فرزانہ سمجھتے اِسے، دیوانہ کہاں ہے؟
پیش آتے ہیں خطرات بہت راہِ طلب میں
آواز دے اے ہمتِ مردانہ کہاں ہے؟
پھر سرد ہے بازارِ محبّت کئی دن سے
معلوم نہیں یاورِ دیوانہ کہاں ہے

مرزا یاور علی

تخیلات

نقشِ نو

آہ وہ حسن جس پہ تنگ لالہ وگل کی ہے قبا | اپنی نمود کے لئے کتنا ہے پیچ وتاب میں!
اُلٹے ہوئے نقابِ رُخ، چاندنی رات میں کبھی | اور کبھی بیقرار سا اخترِ صبح تاب میں!

پھول اور ستارے

زمیں پر پھول بوسے ہیں خدا کی اُس محبت کے، | جو پھیلائے ہوئے ہے اپنا دامن روئے فطرت پر
ستارے دامنِ شب میں ہیں ہمدردی کے وہ آنسو، | گرے ہیں چشمِ یزداں سے جو انساں کی مصیبت پر

سعید احمد اعجاز

تلاشِ حق

سمجھ پہ میری یہ پردہ کیا ہے؛ اندھیرا کیسا ہے آگے میرے؟
چھُپا ہوا دل میں کون ہے جو اُجالے پر ہے سیاہی پھیرے؟
مَیں "نور اندھیرے" کی کشمکش میں ہوں بوکھلایا ہوا بھٹکتا
ہے روشنی گو دکھائی دیتی، مگر اندھیرا ہے اُس کو گھیرے
سنبھل مرے ڈوبتے ہوئے دل! اندھیر تجھ بن ہوئی ہے دُنیا
تو بجھ رہا ہے تو دیکھ آئی، وہ رات چاروں طرف سے گھیرے

ایم ضیاء الدین

ہندی کی شائستہ ترین صُورت

ادبی زبان : نظم

اُردو یا ہندوستانی کی نظم کی زبان ایک ہے اس کی بول چال کی صُورت اور ادبی زبان میں کوئی مغائرت نہیں - وہ تمیز جو ہندی کی بول چال کی زبان اور اس کی ادبی زبان میں ہے اُردو میں نہیں - اُس کی دُوسری خوبی ہندی کے مقابلے میں اُسے اور ممتاز کرتی ہے نظم و نثر کی زبان یک رنگ و ہم آہنگ ہے - برخلاف اس کے ہندی ہندوستانی کے مرکب لفظ کی حامل زبان ابھی اسی قضیہ میں اُلجھی ہوئی ہے کہ نظم کے لئے برج بھاشا اور کھڑی بولی (اُردو طرز) میں سے کون سی اختیار کی جائے - پنڈت پدم سنگھ شرما اور بیوگی ہری اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ کھڑی بولی ہندی کی مروج بحروں (دوہا - سورٹھا - گیت - سویّا وغیرہ) میں کہی جا سکتی ہے - ڈاکٹر گریرسن مصنف لنگوسٹک سروے آف انڈیا کا خیال ہے کہ ہندی نظم کی زبان برج بھاشا ہے - اس کو ترک کر کے نثری زبان اختیار کرنا گویا ادبی نزاکت سے زبان کو محروم کرنا ہے - ایک تیسری جماعت ہندی کے حامیوں اور مصلحوں کی ہے ان کی دُھن اور ساری سرگرمی کھڑی بولی کو ہندی نظم کی زبان تسلیم کرانے میں اس لئے ہے کہ اگر ایسا نہ ہُوا تو ہم ہندی کو ہندوستان کی زندہ اور فطری زبان اُردو یا ہندوستانی کے مقابلہ میں کیسے پیش کر سکیں گے -

اوّل اوّل ایودھیا سنگھ نے کوشش کی اور اُنھوں نے مروجہ بحروں سے دامن بچا کر سنسکرت بحروں کا انتخاب کیا اور بلا ردیف و قافیہ، بلا روانی و ترنم کے پریہ پرواس کا شاہکار تیار کر کے پیش کیا مگر اس کوشش میں ہندی کی چندی ہو گئی - پنڈت رام چندر شوکلا کا بیان اس بارے میں زیادہ معتبر خیال کیا جائے گا - وہ ہندی ساہتیہ کے اتہاس میں لکھتے ہیں :-

"ایودھیا سنگھ کی تصنیف پریہ پرواس سنسکرت سے مشابہ ہو گئی ہے ایک ایک مصرع پورا ماسک رکھنا پڑا ہے، کہیں چار چار مصرعوں کے بعد تھا، ہوا، وغیرہ افعال آ گئے ہیں اور وہی بدل دیئے جائیں تو سنسکرت عبارت سے مشابہ ہو جائیں - مثلاً

روپودیان، نر پھلا - پرانکا، رو کند و سبانا، شنوگی، کلھاسی، سرسکا، کرنڈا کلا تپلی شوبھا ڈہی

دھی کی اہو لیہ یامنی، سبلا دتیہ لیلائی، شری رادھا مرد بھاشنی، مرگ درگی مادھریہ مورت تھیں - کھنا، دینا، موہ گدھا، مکیتا، استا تیں نکٹ پتی کے، امبو نیترا لیشو دھار"

ریہ پرواس مصنفہ ایودھیا سنگھ

خیر پر یہ پر واس میں ہندی نظم جیسی کچھ کامیاب ہوئی اُسے دُنیا نے دیکھا۔ اگر فارسی بحروں کا انتخاب کیا جاتا تو یہ دقتیں ہرگز پیدا نہ ہوتیں، اس تلخ تجربے کے بعد کسی نے پھر اس راستے کو اختیار کرنے کی جرأت نہ کی۔ اس کے لئے ایودھیا سنگھ ہی کا جیوٹ تھا۔

اب کھڑی اور برج کو ملا کر کوشش شروع ہوئی۔ بابو میتھلی پرشاد گپت ہمارے سامنے کھڑی بولی کے کوی (شاعر) کی حیثیت سے آتے ہیں۔ ان کی زبان ایک دم نثری نہیں اور بحر بھی اُنہوں نے عام طور سے ہر گتیکا ہی رکھا جسے ہم اُردو والے بحر کامل سالم کہتے ہیں۔ نمونۂ کلام سے اس کی زبان کا اندازہ ہوگا:۔

اُن انگ انگوں سے رچا لواں انگ اُن کے بین سنے | تیا لبن اسنگھرش سے جو ہو رہے ا تی جھین تھے

ہوتی س س بزرل، نیل نبھر کی چھب چھٹا مود بردا | جمی شرد رُت میں گھن پٹل کے ورل کھنڈوں سے

شری کرشن جی کے خواب سے بیدار ہونے کا نہایت کامیاب نقشہ ہے، ابھی ابھی وہ نرم نازک جسم پلنگ کے بستر سے گویا کچھ گھس کر دُبلے سے ہو گئے تھے مگر سُرخ و سفید صندل کے لیپ نے اس کی تلافی کر دی ہے سانولے جسم پر سفید چندن نیلے آسمان پر چھٹکے بھٹکے سفید بادلوں کا سماں پیش کرتا ہے۔ نہایت کامیاب نقشہ ہے مگر جمی کا لفظ کھڑی بولی کی حد سے نظم کو باہر لے جاتا ہے، یہ برج بھاشا کا کلمۂ تشبیہ ہے، مگر ہندی میں اس کے بدلے جیسا ہی آنا چاہئے تھا۔

وہ یکرنگی اور ہم آہنگی جو ایک مسلمہ زبان کے لئے لازمی ہے اُس سے ہندی کا دامن پاک ہے اور لطف تو یہ کہ بعض حامیانِ ہندی بھی اسے عیب کبھی نہیں مانتے۔ پنڈت کرشن بہاری صاحب نے "دیو بہاری" کی تمہید میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ نظم و نثر کی زبان کے ایک ہونے کی اُلجھن ہیں خواہ مخواہ کیوں ہونے لگی ہے جبکہ دُنیا کی اکثر زبانوں کا یہی حال ہے مگر یہ پنڈت جی کا دعوائے محض ہے۔ ترقی یافتہ زبانوں میں سے کوئی زبان آج تک صنعتی ہستی پر نظر نہیں آتی جو نظم میں دوسری صورت رکھتی ہو اور نثر میں دُوسری۔

اب اُردو کی طرف نگاہ ڈالئے، امیر خسرو کی زبان کو چاہے فارسی رسم خط میں لکھی جانے والی ہندی کہئے یا اُردو کی ابتدائی شکل، اس کے مشتقات کی صورتیں صاف بتلاتی ہیں کہ ان کی پہیلیوں، مکرنیوں، انمل میں وہی قواعدِ صرف و نحو کام کر رہے ہیں جو نثر میں برتے گئے ہیں، مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ترور سے اِک تریا اُتری اُس نے بہت رِجھایا

باپ کا اُس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا

آدھا نام بتایا، رِجھایا، اُتری، کی صورتیں ہندی نثر میں عہد فورٹ ولیم کے بعد ملتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُردو کی ان تمام تصنیفوں کو ناگری رسم خط کا لباس پہنا کر ہندی ادب کی تاریخ بنانے کی کوشش کی گئی ہے مگر یہ کوشش ڈھول کے پول کھولنے میں اور مدد گار ہوگئی ہے۔ اگر خسرو اور انشا کی کھری اُردو کی تحریریں جسے وہ لوگ اپنے عہد میں ہندی کہتے رہے۔ موجودہ ہندی کے

ابتدائی کارناموں میں شمار ہوں تو اس کے بعد جو تصانیف ہوئیں اُن میں زبان یا تو زیادہ صاف ہونی چاہیئے یا کم از کم ویسی ہی مگر کیا کوئی ایسی تصنیف پیش کی جا سکتی ہے جو خسرو کے بعد لکھی گئی ہو اور طرز تحریر، ترکیب الفاظ اُسی بنیاد اور نمونہ پر ہوں۔ اُردو میں ایک دو نہیں سینکڑوں کتابیں ہیں جو اُسی بنیاد کی بالائی منزلیں یا ارتقائی شکلیں کہی جا سکتی ہیں۔ حقیقت پر پردہ ڈالا جائے تو کیا وہ ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جائے گی؛ ہرگز نہیں۔ کون ایسا راز ہے جو فاش نہیں ہوا اور کون ایسا پردہ ہے جو ہٹا اور پھٹا نہیں۔

ادبی تاریخ کا بدلنا بیکار ہے۔ قانونِ ارتقا کے محقق بآسانی بتا سکتے ہیں کہ کون سا کارنامہ کس سلسلے سے متعلق ہے جب فن تاریخ کا ماہر پرانے خزف ریزوں سے عہدِ تعمیر تک پہنچ جاتا ہے تو کیا وہ ہستیاں جن کی آنکھیں بحرِ ادب کی تہ تک پہنچنے والی ہیں اس بات کی تہ کو نہ پہنچیں گی۔

قصہ کوتاہ، کیا ہوا؟ اور کیا کیا گیا۔ اس کو چھوڑیئے اور دیکھئے کہ اس ہندی، ہندوستانی اور ہندوستانی (صرف) یعنی اُردو میں کون واقعی ہندوستانی ہے اور کس میں عام فہمی کا مادّہ زیادہ ہے۔ اس کے لئے ایک ہی معنی، ایک مفہوم، ایک ہی پیرایۂ بیان کا ہونا ضروری ہے خوشی کی بات ہے کہ پنڈت بدری نارائن صاحب چودھری نے سر محمد اقبال کی مشہور نظم "ہندوستان ہمارا" کا ترجمہ ہندی پد میں کر کے اس مشکل کو بھی آسان کر دیا ہے۔ پنڈت صاحب موصوف ہندی میں مستند حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندی کے بڑے بھاری پرچارک بھی ہیں، نظم کا ترجمہ بہت سوچ سمجھ کر لکھا ہے:-

(۱)	سارے جہاں[۱] سے اچھا ہندوستاں[۲] ہمارا ہم بلبلیں[۳] ہیں اس کی یہ گلستاں[۴] ہمارا	(۱)	مہی منڈل[۱] میں سندرتر[۲] یہ بھارت ورش ہمارا ہے ہم کوکلیں[۳] اسی اُپ ون[۴] کی یہ اُدیان[۵] ہمارا ہے

دُنیا جہان کو ہر عامی بھی سمجھتا ہے اس کے مقابل کے ہندی لفظ "مہی منڈل" میں (جو سنسکرت سے لیا گیا ہے) جو قابلیت ہے وہ ظاہر ہے "سب سے اچھا" کے صاف لفظ کے بدلے "سندرتر" آسان نہیں ہے۔ ہندوستان، بھارت ورش کے بدلے زیادہ ٹکسالی اور زیادہ عام ہے، اُپ ون اور اُدیان، مل کر بھی "گلستان" کی جگہ نہیں لے سکے۔ بلبل اور گلستان کا تعلق، کوکل اور اُدیان میں ناممکن ہو گیا ہے۔

(۲)	غربت[۱] میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن[۲] میں سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا	(۲)	چاہے کسی دیش میں ہوں ہم ماتری بھوم میں رہتا من جہاں ہر دے ہے وہاں سو ہم ہم تن سے من نہیں نیارا ہے

اُردو شعر کا لفظ لفظ پانی کی طرح رواں اور سلیس ہے۔ ہندی کا ایک لفظ اپنے مقابل کے لفظوں سے مشکل ہے۔ ذرا سو ہم بمعنی میں یا ہمیں، وطن کا بدل ماتری بھوم ملاحظہ فرمایئے۔

(۳)	پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا	(۳)	مہی کا اچل[۱] مہی پت ساتی اُچ گگن چمن[۲] کرتا

وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا — اہا ہمالیہ پتھ رکھشک یہ پورا ہتّو ہمارا ہے

سنتری اور پاسبان کے مقابلے میں "پتھ رکھشک" کو وضع کرنے سے کیا کاربراری ہوگی، جب تک دونوں لفظوں کی تشریح و ترکیب نہ سمجھائی جائے۔ پہلا مصرعہ تو ماشاء اللہ سنسکرت کا دامن چھو رہا ہے۔

(۴) گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں — (۴) اگنرٹ ندیاں اس پربت کی رمیہ تٹی میں کریں کلول
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا — جن کے کارن نندن بن سم بھارت ورش ہمارا ہے

اردو نظم میں پہلا مصرعہ ٹھیٹ ہندی ہے پھر بھی اسے چودھری صاحب نے "اگنرٹ" اور "رمیہ تٹی" کے سنسکرت لفظوں پر قربان کیا ہے۔ مطلب کو سہل سے کٹھن بنا دیا ہے۔

(۵) اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو — (۵) ہے یاد ان پنی متی سُرسرتے! کیا وہ دن ہے یاد تجھے
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا — کرتا بچرن جب ترے تٹ آیا برند ہمارا ہے

گنگا کے بدلے سُرسرتے ہندوؤں اور ہندی والوں دونوں کے ذہن کو جلد نہیں کھینچ سکتا۔ کارواں کا اصطلاحی لفظ ہندی میں بھی برند سے زیادہ عام ہے۔ "اترا ترے کنارے" کی سادگی کسی خاص جذبہ کی تہ میں "کرتا بچرن جب ترے تٹ" پر نچھاور کی گئی ہے۔

(۶) مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — (۶) کرنے کو یہ دیش بیر پر نہیں دھرم سکھا دیتا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا — بنے سُو ہر دے سب بھارت باسی بھارت ورش ہمارا ہے

ایک نگاہ سے نمبروار مقابلہ کافی ہے۔ انصاف کیجئے یہ ہندی۔ ہندوستانی کے محرک زبان میں آسانی پیدا کر رہے ہیں یا اُسے اور مشکل بنا رہے ہیں۔ سکھاتا اور سکھا دیتا میں کون سا لفظ ہندوستانی کی کسوٹی پر صحیح اُترے گا۔ مذاقِ سلیم تو سکھاتا کی طرف اشارہ کرے گا۔ پھر یہ تبدیلیاں کیوں ہیں۔ ہندوستانی کے صحیح اور اصلی روپ پر سنسکرت کا موٹا غلاف کیوں چڑھایا جا رہا ہے۔ فارسی اور عربی کے مروج لفظ جو تلسی داس اور سورداس کے وقتوں سے کھپتے چلے آرہے ہیں اور اس بنا پر عربی و فارسی نہ کہلا کر وہ ہندوستانی کہلانے چاہئیں کیوں متروکات کی لپیٹ میں آرہے ہیں اور جن کی صورت سے اُنیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی پبلک آشنا نہ تھی وہ دفینے کیوں نکالے جا رہے ہیں۔ صدیوں کے مُردہ الفاظ کو زندہ اور مروج لفظوں پر ترجیح بلا کسی مقصد کے محض بیکار ہے۔ یہ سیاست کے مردِ میدان بھلا ایسا کارِ عبث کیوں کر کرنے لگے۔ شاید اس لئے تو نہیں کہ اُردو ہندی کی سرحدیں ملنے نہ پائیں۔ ہندی اُردو سے گلے ملنے کو بےچین ہو کر دوڑنا چاہتی ہے مگر آج وردھا کمیٹی وہی کام کر رہی ہے جو تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پیشتر سنسکرت کے محافظوں نے کیا تھا — ذات پات کا چھوت اس وقت قابلِ نفرت سمجھا گیا مگر چھوت نے دوسری شکل اختیار کی۔ اپنی زبان سے زبان کا چھوت ہے۔ افسوس پیوری اور دورنگی کی تدبیریں اُن کے ہاتھوں ہو رہی ہیں، جو ہندو مسلم اتحاد کے روحِ رواں وطنیت کے قائدِ اعظم تصور کیے گئے تھے اس کا انجام

کس طرح بہتر سمجھا گیا ہے !!!

ماحول کا اثر اس مروج تحریری ہندی کو صاف کر دیتا اور صبح کے بھولے شام تک ضرور راہ لگ جاتے مگر اب تو انجنیئروں نے دریا کا رخ پھیرنا چاہا ہے ۔ کاکا کالیکر صاحب آچاریہ کا ایک مضمون مجھے ہندی پربھات میں دیکھنے کو ملا ۔ اس کا عنوان ہے "راشٹر بھاشا اُتپت کیسے ہو"؟ آپ نے اُردو کے علاوہ تمام زبانوں کا ذکر خیر فرماتے ہوئے بہت سے طریقے مقامی زبانوں کی ہم آہنگی اور یک رنگی کے پیش کئے ہیں اور سفارش کی ہے کہ جس کسی کو نئے الفاظ ہندی یا ہندوستانی کے معیار پر ملیں وہ وردھا کمیٹی کے پاس بھیج دے وہاں سے پاس ہوکر وہ ہندوستانی و ہندی میں شامل ہو جائے گا ۔ ان الفاظ کا معیار کیا ہوگا کچھ نہیں تبلایا گیا ہے ۔ کیا چلن انے بیوہار؟ نہیں معلوم ۔ اگر ایسا ہوتا تو وردھا کی مشین میں ڈھالنے کی ضرورت کیوں پڑتی ۔ تو پھر اور کیا معیار ہے ؟ یہ راز ہے جو وردھا کمیٹی کے ارکین ہی جانتے ہیں ۔ میں نے ایک مرکب لفظ موصوف کے مضمون میں دیکھا ۔ نئی ترکیب ہے اور نرالی ترکیب ہے ۔ انوکھی سمجھ کا نتیجہ ہے ۔ وہ مرکب لفظ ہے "پارمبھک تعلیم" جس کے لئے ہم ابتدائی تعلیم اب تک بولتے آئے ہیں ۔ ہندی میں اس کی دو شکلیں ہیں ابتدائی تعلیم اور پارمبھک شکھا ، پرارمبھک شکھا ، خالص ہندی یا ادبی زبان میں پارمبھک شکھا یا پرارمبھک شکھا ہی مستعمل تھا ۔ "ابتدائی تعلیم" کے مقابلے میں اس کا سکہ ٹھنکتا نہ تھا اور اعتراض کی بات تھی ۔ ہندی ، ہندوستانی کو عام فہمی کے دعوے کا کچھ ثبوت بھی چاہئے تھا ۔ لہٰذا ابتدائی تعلیم اور پرارمبھک شکھا میں صلح کی ٹھیری ۔ صلح میں جانبین نے تھوڑا تھوڑا ایثار کیا اور نیا مرکب دونوں سے ایک ایک لفظ لے کر جوڑ دیا گیا ۔ "پارمبھک تعلیم" کی شانِ نزول یہ ہے ۔ صفت اور موصوف کا ایسا قدرتی میل ملاپ جیسا پارمبھک (سنسکرت صرف)، تعلیم (عربی صرف) میں ہے ۔ میں نے ہندی ہندوستانی کے جنم سے پیشتر نہ سنا تھا ۔

اُردو کا شاعر برمحل الفاظ کی تلاش کرتا ہے ۔ وہاں پر فارسی و عربی کی بیچ میں موقع و محل کا سنسکرت لفظ سنسکرت ہونے کی بنا پر نظر انداز نہیں کیا جاتا ۔ اسی لئے بلا تشریح و تفصیل مطلب فہمی میں آسانی ہوتی ہے ۔ اُردو ادب کی نظموں کا یہی حال ہے ۔ اس موقع پر دو تین مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں ۔

(۱)

اے کنول اے جل پری اے جھیل پر تاروں کی جوت ۔۔۔ تیرے کارن پیت ساگر میں کھلی گنگا کی سوت

دھارتا ہے روپ ایسے کچھ تو اے نازک کنول ۔۔۔ موہنی مورت پہ تیری آنکھ جاتی ہے پھسل

(ہمایوں ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

(۲)

ہے ہمالہ پہاڑ سرجیون ۔۔۔ جس کے اوپر تلے کھڑا ہے بن

(مولوی محمد اسمٰعیل صاحب)

(۳)

آ اک نیا شوالہ تعمیر کر دکھائیں | دامانِ آسماں سے اُس کا کلس ملا دیں
تسبیح ہاتھ میں ہو زنّار ہو گلے میں | گویا صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتروہ میٹھے میٹھے | سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

(۴)

کوئی بیکس کا رہبر نہیں ہے | مہرباں کوئی ہم پر نہیں ہے
لاکھ رو رو کے میں نے پکارا | محوِ غفلت ہے سنسار سارا
کس لئے پھر یہ شور و فغاں ہے | میں یہاں رام میرا کہاں ہے

اگر ہندی ہندوستانی کے حامی اُردو ادب سے متنفر نہ ہوتے تو سارا وقت اور روپیہ جو غیر فطری اور بے معنی ہندی و ہندوستانی کی وضع اور ایجاد میں صرف ہو رہا ہے۔ بنی بنائی ہندوستانی کے سرسبز و شاداب کرنے میں کام آتا اور یہ مبارک کوشش ملک کے حق میں مفید ثمرات پیدا کرتیں۔ مگر اب اس بدلی ہوئی فضا میں کیا اُمید کی جائے کہ کوئی اس جماعت سے ازراہِ حق پسندی اُردو کی طرف ایک نگاہِ غلط انداز ڈالے گا۔ یہ سب کچھ ناقدردانی کے کرشمے ہیں۔

اے ناقدردانی تجھ پہ لعنت | کہ ہے تجھ کو ساوی نور و ظلمت
سمجھ لیتی ہے عیبوں کو ہنر تو | ہنر کی توڑ دیتی ہے کمر تو
کہ ہے اندھے کی لاٹھی تیری بیداد | جہاں میں داد ہے جس کی نہ فریاد

مگر سے

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی | کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

یارانِ وطن نے جس ہندوستانی سے کنارہ کشی اختیار کی دیکھنا ہے کہ غیر ملکیوں نے اُس کو کیا رُتبہ دیا۔ اگرچہ ملک کے اکثر انصاف پسند اس حبتت سے دل ہی دل میں کڑھ رہے ہیں اور بعضوں نے اپنی صاف صاف رائیں بھی پیش کیں۔ مگر یورپی مستشرقین کی جن دلیلوں کی بنا پر اُردو ہندوستانی کی مہذب ترین شکل مانی گئی ہے وہ ہر صاحب ذوق کے لئے ایک طرف دلچسپ ہیں اور دوسری طرف ہمیں سکھلاتی ہیں کہ حقیقت کی تلاش کن کن ذریعوں اور کس صبر و سکون کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اس مضمون کے خاتمہ پر یہی دلچسپ بحث ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

مستند شہادتیں

از خطبات گارساں دتاسی

اٹھارھویں صدی کے اواخر تک اُردو کی دلکشی اور ہر دلعزیزی سارے ہندوستان میں کم و بیش اور شمالی ہندوستان میں بخوبی مسلّم ہو چکی تھی۔ اور یہ اُس عالمگیر عام فہمی کی برکت تھی جس کی بنا پر دانشمندانِ یورپ نے اسے اختیار کیا۔ ان حکمائے فرنگ نے یہی نہیں کیا کہ اپنے مطلب کے موافق ہندوستان کی مروّجہ بولیوں میں سے ایسی زبان کو چُن لیا جس کے بولنے، سمجھنے اور لکھنے پڑھنے والے زیادہ تھے بلکہ اُنھوں نے اس کے حُسن و قبح کے ایک ایک جُز پر اپنی پوری توجہ صرف کر دی اور ان تجربات اور مشاہدات کی بنا پر اپنی تصنیفات اور تحریروں میں مدلل رائیں پیش کیں۔ اور سر چارلس وُڈ کی تعلیمی رپورٹ جب ۱۸۵۴ء میں نکلی اور اُنھوں نے ہندوستان کی زبانِ عام کے متعلق اپنی سچی رائے کو سب کے سامنے رکھا تو وہ آنکھیں جو حقیقت سے آشنا تھیں۔ خیرہ ہو گئیں۔ گھر بیٹھے بلا ایک قدم ہلے، سیر و سفر کی زحمت اُٹھائے بغیر قدامت پسند: ان ہندوستانی کی شائستہ صورت (اُردو) کی مخالفت پر ڈٹ گئے۔ جو محض سر چارلس وُڈ ہی کو نہیں، بیمز، ہارول (ناظمِ تعلیمات صوبہ مغربی و شمالی)، مسٹر کمسن (ایک اعلیٰ تعلیم کا افسر)، مسٹر منٹگمری مصنف "مشرقی ہند" کو کلکتہ سے پشاور تک بولی جاتی ہوئی ملی تھی۔ ان محققوں نے یہی نہیں کیا کہ اپنی رائیں لکھ کر رپورٹ کی صورت میں ظاہر کر دیں بلکہ اس کے خلاف ہندوستان میں جو کوششیں ہوئیں اُن کو نادانی کی حرکت قرار دیتے ہوئے افسوس کیا۔ آگے چل کر مسٹر ہارول اور بیمز کے جو بیانات نقل کئے گئے ہیں اس کی شہادت دیں گے۔ ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۸۷۷ء تک اُردو ہندی کے جھگڑے نے اس قدر کشیدگی پیدا کر دی تھی کہ خیال میں نہ آتا تھا کہ یہ ہنگامے کبھی ختم بھی ہوں گے مگر آفرین ہے اُن محققین کو جنھوں نے قدامت پسندی کی ہڑبونگ کو اپنے سیدھے سادے اور مدلّل بیانات، تحریروں، تقریروں سے باطل کر دکھایا۔ ان عالموں نے اپنی صاف گوئی، صداقت پسندی اور سچائی کے آشکارا کرنے کا بیڑا اس لئے اُٹھا لیا تھا کہ سچ کی طرفداری عالم کا فرض ہے اور حقیقت پر پردہ پڑتا ہوا دیکھ کر اگر ایک عالم خموش رہا تو اُس کی بُزدلی علم کے چاند کو گہن لگا کر رہے گی۔ ورنہ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے بیشتر کا وطن بھی تو ہندوستان یا فارس یا عرب نہ تھا، اور نہ وہ اُردو کے وکیل تھے۔ ان کے جذبات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ معلوم کرتے ہیں کہ زبان کی تحقیقات کے سلسلے میں ان میں سے بہتوں نے عمریں صرف کر دیں۔ موسیو گارساں دتاسی کی حیثیت ان محققوں میں سب سے اہم ہے جس طرح مسٹر براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا ایرانی السنہ کی سب سے عمدہ اور نادر تحقیق ہے اسی طرح ہندوستان کی مروجہ اور متعلقہ زبانوں کے بارے میں موسیو گارساں دتاسی کے بصیرت افروز خطبات ہیں۔ آپ پیرس کی یونیورسٹی میں اُردو کے لکچرار تھے اور ہر سال کے آخر میں اپنے شاگردوں کے سامنے ہندوستان کے ادبیات پر مفصل اور بسیط تقریر کرتے۔ یہ تقریر ہندوستان کے ذمہ دار افسروں کی رپورٹوں۔

گورنمنٹ گزٹ، جنرل ایشیاٹک سوسائٹی کی تحقیقات اور اسی قسم کے مستند مضامین اور سچے بیانات پر مشتمل ہوتی تھی۔ اسی طرح دتاسی کے خطبات میں ردوکد بحث وتحمیص کے دونوں پہلو صاف صاف اصلی صورت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس نے اپنی رائے پیش کرنے سے ہمیشہ اجتناب اور پرہیز کیا ہے اور اس موقع پر اُن لوگوں کی رائیں پیش کی ہیں جو اس موضوع سے متعلق ہو کر ہندوستان میں مقیم تھے۔ اِن خطبات میں تلاش اور تحقیق کی خوب خوب داد دی جاتی۔ اُن تحریکوں کا ذکر بھی ہونا ضروری تھا جو ہندوستان میں زبان اور معاشرت کے متعلق نمایاں ہوئیں اور آگے بڑھیں۔ اُن اعتراضات کا بھی اظہار رہے جو زبان و معاشرت ومذہب وملت، علوم وفنون پر مہذب سوسائٹیوں میں ہو کر اخباروں کے ذریعہ عام حیثیت اختیار کر لیتے تھے۔ نئے رسائل، جدید اخبارات و دیگر مطبوعات کا بھی سال بسال ذکر ہے۔ غرض کہ دتاسی کے خطبات خزائۂ معلومات ہیں اور ہندوستانیوں کے لئے اس معاملے میں سبق آموز ہیں کہ دانشمند قوم کے افراد میں کہاں تک وسعتِ نظری ہوتی ہے۔ اور نیز یہ بھی کہ نزاعی مسئلوں کے جواب کا پیرایۂ بیان کیسا ہونا چاہئے۔ نیچے آپ کے خطبات کے چند ٹکڑے مختلف جگہوں اور مختلف خطبوں سے دیئے جاتے ہیں:۔

وہ زمانہ اب گیا گزرا جب کہ کہا جاتا تھا کہ جدید ہند کی قومی زبان درحقیقت ٹوٹی پھوٹی بولی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ممکن ہے اس خیال کے حامیوں میں آپ کو چند لوگ ایسے ملیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستانی زبان میں ایک جنسیت نہیں پائی جاتی اسی وجہ سے وہ اس زبان کو ہیچ لوچ سمجھتے ہیں؛ لیکن اس خیال کی حمایت کے وقت وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ خود یورپ کی زبانیں اور خاص کر انگریزی زبان متفرق عناصر کے امتزاج سے بنی ہے، بہرنہج لوگوں کا خیال ہندوستانی کی نسبت چاہے کچھ بھی ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ سارے ہندوستان کی مشترک زبان بن گئی ہے۔ روز بروز جو اس کی ترقی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جاسکتی ہے۔ اس مسئلہ کی نسبت کپتان آرچ بور نے اپنی رائے سے مجھے مطلع کیا ہے۔ موصوف مرکزی حکومت میں ترجمان کے عہدے پر فائز ہیں۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"بلاشبہ کچھ عرصہ بعد ہندوستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کرے گی۔ اسی زبان کے توسط سے لاکھوں اہلِ مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ریل کی وجہ سے اور بھی جو اندرونِ ملک میں ہزاروں میل کی مسافت پر پھیل گئی ہے۔ ہندوستان اور وسط ایشیا کے لوگوں کو ملنے جلنے کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ہیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، ہندوستانی زبان اس مقصد کو بطریقِ احسن پورا کرتی ہے اس لئے کہ اس کی ساخت میں ہندی فارسی اور عربی کے عنصر شامل ہیں۔ اس زبان میں بدرجہ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندؤں اور مسلمانوں دونوں کے مقاصد کو پورا کرے۔

میرے خیال میں ہندوستانی کے قدرتی وسائل کی ترقی کے جس قدر امکانات ہیں اسی قدر ہندوستانی زبان
کے فروغ حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں۔ اِن قدرتی وسائل کی ترقی کی بدولت یورپ کے ہر ملک کے
لوگ ہندوستان کھنچے چلے آرہے ہیں؛

ہندوستانی کا لفظ ہندی اور اُردو، دونوں ہی پر حاوی ہے۔ میں جن کتابوں کا ذکر کرتا ہوں اُن کا تعلق اُردو اور
ہندی دونوں سے ہوتا ہے۔ زبان کے مسئلہ پر ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑی بحثیں ہو رہی ہیں اول الذکر
اپنی قدیم زبان کی حمایت میں سرگرم ہیں اور ثانی الذکر اُردو کو سراہتے ہیں، جو ان کے نزدیک ہندوستانی کی جدید ترین شکل ہے۔

اب یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اُردو کی جگہ ہندی کو رواج دینا بہت مشکل ہے اس لئے کہ ہندی کی بہت ساری
بولیاں ہیں جن میں ایک بھی کلاسک نہیں کہی جا سکتی۔ حالانکہ شمالی ہند میں اُردو کلاسک حیثیت رکھتی ہے اور ایک دن ایسا
ضرور آئے گا جب کہ اُردو کی بدولت ہندوستان کی بیس کروڑ مخلوق میں رشتۂ اتحاد استوار ہوگا۔

میرے خیال میں اُردو کے مقابلے میں ہندی کی جانب توجہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے آج کل کی جدید یونانی کے بجائے
قدیم یونانی کی طرف توجہ کی جائے۔

تعجب اس پر ہے کہ اُردو کی تصانیف بھی دیوناگری رسم خط میں چھاپی جا رہی ہیں۔ چنانچہ ابھی حال میں دیوانِ نظیر
اور میرحسن کی مثنوی سحر البیان اور دوسری تصانیف جن کی زبان دہلی کی خالص ٹکسالی زبان ہے، دیوناگری رسم خط میں طبع
کی جا رہی ہیں۔

ہندوؤں پر یہ الزام لگانا درست نہیں: کہ وہ اپنی زبان کو جو دیوناگری رسم خط میں لکھی جا رہی ہے۔ اور جس کو دیوناگری
ہی کہتے ہیں، اسلامی عناصر سے پاک کر رہے ہیں۔ چنانچہ جہاں تک ممکن ہے عربی و فارسی کے الفاظ ترک کئے جا رہے ہیں۔

موصوف نے لکھا ہے کہ آج کل عام طور پر اُردو کے خلاف خیالات پھیلائے جا رہے ہیں اس لئے کہ یہ زبان عدالتوں
اور دفتروں میں رائج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُردو جن عناصر سے مرکب ہے وہ آپس میں میل نہیں کھاتے۔

موصوف اپنے سات سال کے تجربات کی بنا پر کہتے ہیں: "اُردو ہندوستانی کی مہذب ترین شکل ہے۔ اس میں ایجاز
اور فصاحت بدرجۂ اتم موجود ہے، اور اظہارِ خیال کے لئے اس زبان میں بڑی صلاحیت ہے"۔

موصوف نے اس طرف بھی اشارا کیا ہے کہ دوآب گنگا کے رہنے والوں کی گھٹی میں یہ زبان شامل ہے۔ انہیں
اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

اُردو سے عربی فارسی الفاظ خارج کرنا ایسا ہی ہے جیسے آپ انگریزی زبان سے لاطینی الفاظ نکالنے کی کوشش

کریں اور چاہیں کہ اس میں صرف اصل سیکسن کے الفاظ باقی رہیں۔ زبانیں اس طرح بنائے نہیں بنتیں۔
زبانیں اس طرح ارادہ کرنے سے نہیں بنائی جاتیں۔ زندگی کی ضروریات سے اُن کی ساخت میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے سیاسی فتوحات، تجارتی تعلقات، ادبی اور علمی ضرورت سے زبان میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور اس میں الفاظ داخل ہوتے ہیں۔ جس طرح انگریزی میں المانی اور لاطینی عنصر موجود ہے اس طرح اُردو میں بھی سنسکرت اور سامی یا اسلامی عناصر موجود ہیں۔ اُردو کی یہ ایک طرح کی خوبی کہی جاسکتی ہے کہ وہ تمدنی ضروریات کے لحاظ سے دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار لے کر اپنا کام چلا سکتی ہے۔
ایک مقالہ نقل کیا جاتا ہے :-
ہندوستان کی زبان جس کے ذریعہ مسیحی خیالات اور مغربی تہذیب اہلِ ہند میں پھیل رہی ہے، برابر ترقی پر ہے مَیں اس دعوے کی تائید میں ایم۔ اے۔ ایس ہارول کا ایک خط نقل کرتا ہوں جو ممالکِ یُوپی مغربی شمالی کے ناظم (ڈائرکٹر) تعلیمات ہیں :-

"آپ نے اپنے خطبات میں جو خیال پیش کیا ہے مَیں اُس سے بالکل متفق ہوں کہ اُردو کو ہندی پر فوقیت حاصل ہے۔ اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں مَیں نے ہر ممکن موقع پر اُردو کی توسیع و ترقی کے لئے حمایت کی ہے۔ اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں قومی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اس سے میری مُراد وہ زبان ہے جو خاص و عام کی سمجھ میں آتی ہے۔ اس بارے میں مسٹر کمسن جو صوبہ مغربی و شمالی میں سررشتہ تعلیم میں سب سے اعلیٰ عہدہ دار ہیں، بڑی حد تک میرے ہم خیال ہیں، لیکن بدقسمتی سے ابتدائی مدارس میں یہ طریقہ رائج ہوگیا ہے کہ اُردو ہندی میں سے کسی ایک کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ چونکہ اکثریت ہندو طلبہ کی ہے، اس لئے ہندی کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ مسلمان اور بعض ہندو جن کی مادری زبان اُردو ہے، اُردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ میرے خیال میں اُردو ہندی کی تفریق قومی نقطۂ نظر سے سخت باعثِ نقصان ہے۔ یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ اگر ہندو بچوں کو اُردو سکھائی جاتی۔ بجائے اس کے انہیں اُس بولی میں اظہارِ خیال کی مشق کرائی جائے جو بالآخر ایک دن اُردو کے آگے اپنا سر تسلیم خم کرے گی۔"

{ از خطباتِ گارساں دتاسی، مترجمہ یوسف حسین صاحب ڈی لٹ
شائع کردہ انجمن ترقی اُردو۔ (رسالہ اُردو میں) }

صاف ظاہر ہے کہ :۔

(۱) اُردو آج سے تقریباً سو برس بیشتر قومی زبان کہلانے کی مستحق تسلیم کی جا چکی ہے۔

(۲) اُسے خاص و عام کم سے کم ایک صدی بیشتر سے سمجھتے اور بولتے آئے ہیں۔

(۳) برخلاف اس کے ہندی اُس وقت تک زبان کی حیثیت نہ رکھتی تھی، وہ محض بولی بتلائی گئی ہے۔

(۴) ہندی قصداً رائج کی ہوئی زبان ہے۔ قدرتی طور پر اُس کا ظہور نہیں ہوا، اُردو کے مقابلہ میں ہندی کی ترویج کی گئی۔ چلتی ہوئی پراکرت نے جس ہندی کو پیدا کیا تھا، وہی ہے جو مسلمانوں کے آنے پر فارسی، عربی کے الفاظ کو لے کر آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کو ہندوؤں نے اپنے مزاج کے موافق مسخ کیا۔ فارسی و عربی کے الفاظ چُن چُن کر نکال ڈالے۔ اس دعوٰی کی مزید تائید میں ایف۔ اے کی تصنیف کی ہوئی کتاب "ہندی لٹریچر" کا وہ مقالہ پیش کرتا ہوں جو منشی پریم چندر کا عذر تقصیر اور اُردو ہندی کی چھیڑ کے سلسلے میں رسالہ اُردو جولائی ۱۹۳۶ء میں دیا جا چکا ہے :۔

"جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ شمالی ہند میں ہندی کی بہت سی بولیاں بولی جاتی تھیں لیکن ان لوگوں میں جو فارسی نہیں جانتے تھے، شائستہ گفتگو کا ذریعہ اُردو تھی۔ اُردو میں بہت سے الفاظ فارسی عربی میں مستعار لئے گئے تھے۔ جن کا تعلق اسلام سے تھا۔ اس لئے ہندی بولنے کے لئے ایک ایسی ادبی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جو زیادہ تر ہندوؤں کو مرغوب ہو سکے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کو لے کر ایک زبان بدل گئی، اور اس میں سے (یعنی اُردو میں سے) عربی فارسی کے لفظ خارج کر کے اُن کی بجائے سنسکرت یا ہندی الاصل الفاظ داخل کیے گئے۔"

پنڈت رما کانت صاحب نے بھی گدیہ میمانسا صفحہ للوجی لال پر لکھا ہے :۔

"للوجی لال نے فارسی و عربی کے شبہے میں بہت سے ٹھیٹ لفظ بھی نکال ڈالے۔"

اب خطبات گارساں دتاسی کی طرف میں پھر لوٹتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے خط کا حوالہ دینے کے بعد صاحب موصوف ایک دوسرے خط کا جواب دیتے ہوئے اپنی رائے کی موافقت ظاہر کرتے ہیں :۔

"اُردو ہندی کی اہمیت کے متعلق میں نے گذشتہ سال کے خطبہ میں جو ذکر کیا تھا اُس پر مسٹر ہنری کارٹر نے جو کئی سال تک میرے شاگرد رہ چکے ہیں اور مسٹر ہرڈوڈ کے یورپ جانے کے بعد بمبئی کی انڈین ایشیاٹک سوسائٹی کی شاخ بمبئی کے سیکرٹری ہو گئے ہیں۔ مجھے ایک خط لکھا ہے اور اس سلسلے کو چھیڑا ہے۔ خط کے الفاظ یہ ہیں :۔

مسٹر ہنری کارٹر سکرٹری رائل ایشیاٹک سوسائٹی شاخ بمبئی کا خط :۔

"اُردو بہ نسبت ہندی کے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اس میں ترقی اور نشو و نما کی صلاحیت زیادہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک دن آنے والا ہے جب کہ اُردو سارے ہندوستان کی مشترکہ زبان بن جائے گی۔"

خط درج کرنے کے بعد خطبہ میں اُردو (ہندوستانی) کا ذکر اس طرح ہے :-

"سچ ہے کہ ہندوستانی (اُردو) کا ماضی ایسا درخشاں نہیں ہے لیکن اس کا مستقبل یقیناً شاندار ہے۔"

(از خطبات گارساں دتاسی)

یہ آج سے تقریباً ایک صدی پیشتر کی اُردو پر رائیں ہیں۔ اب بہ نسبت پہلے کے اُردو اور زیادہ ہندوستانی (بالکل ہندوستانی ہو چکی ہے) اور یہی وہ زمانہ ہے جس کے لئے مسٹر ہنری نے پیشین گوئی کی ہے۔ ان تصریحات کے بعد ہر منصف مزاج سمجھ سکتا ہے کہ اُردو یا ہندوستانی ہند کی زبان ہو چکی ہے نہ کہ ہندی اتھوا ہندوستانی۔

گاندھی جی خود فرماتے ہیں کہ "ہندی اتھوا ہندوستانی" سے وہ زبان مراد ہے جو آئندہ چل کر ہندوستان کی قومی زبان بننے والی ہے عجیب بات یہ ہے کہ جو زبان ملک کی ہر چہار سمتوں میں سمجھی جائے۔ ممالکِ غیر روس وغیرہ میں بطورِ ہندوستانی زبان کے داخلِ نصاب ہو، جو ہندوستان سے آگے نکل کر عدن اور سکندریہ کے ہندی جہازیوں کو مخاطب کرے اُس کو ٹھکرا دیا جائے اور نئی ہندوستانی کی تخلیق کی جائے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک تیار شدہ عمارت کو ڈھا کر محض اپنے نام یا ضد کی بنا پر از سرِ نو نئی عمارت تعمیر کی جائے۔ "وطنیت" کے اس دور میں یہ انوکھی مثال ہے۔

اب خطبہ کا وہ حصّہ بھی ملاحظے کے لائق ہے جو فیصلہ کُن ہے اور ساری کج بحثیوں کا ختم کرنے والا ہے :-

"اس ضمن میں سر چارلس وُڈ کے قول کا نقل کرنا مناسب خیال کرتا ہوں، سر چارلس ٹرویلین بھی اس کے ہم خیال ہیں۔ درس میں بھی متعدد مرتبہ ان خیالات کا اعادہ کر چکا ہوں لیکن سر چارلس وُڈ نے انہیں خیالات کو نہایت خوبی اور واقف کاری کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ کہتے ہیں :-

"پٹنہ سے لے کر پشاور تک سارے شمالی ہند میں زبان ہندوستانی ہے۔ شہروں میں، قصبات میں، گاؤں میں، سول اور فوجی مرکزوں میں، درباروں میں اور سرکاری دفتروں میں ہر کہیں یہ سمجھی جاتی ہے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص اور ادنےٰ سے لے کر اعلےٰ تک سب ہی اُسے استعمال کرتے ہیں جس طرح اطالوی زبان کی اہمیت اٹلی میں ہے یا انگریزی کی انگلستان میں ہے بس وہی حیثیت ہندوستانی کی شمالی ہند کے دیہاتوں اور شہروں میں ہے۔"

پھر وہ کہتے ہیں :-

"ہندی سے دراصل مُراد وہ دہقانی بولیاں ہیں جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہیں۔ سول سروس کے نوجوانوں

کو جو ہندی سکھائی جاتی ہے وہ برج کی بھاشا ہے، یہ وہ بولی ہے جو متھرا اور بندرابن کے آس پاس بولی جاتی ہے۔ ہندی کا پنجابی سے بس اسی قسم کا تعلق ہے جو سمرشٹ شیر کی بولی اور نارتھمبرلینڈ کی بولی کا ہے۔ ان ہندی بولیوں کا اُردو (ہندوستانی) سے وہی تعلق ہے جو اصلی انگریزی زبان کا مذکورہ صدر (سمرشٹ اور نارتھمبرلینڈ) بولیوں سے۔ ہر کہیں آپ دیکھینگے کہ گاؤں والے بے تکلف ہندوستانی میں بات چیت کرتے ہیں اگر کسی کو ہندوستانی زبان پر پوری قدرت حاصل ہو تو وہ بہت جلد آسانی سے ہندوستان کی ہر مقامی بولی کو سیکھ سکتا ہے۔"

دتاسی نے اس کے بعد اور مزید رائیں نقل کی ہیں مگر میں اُن میں سے سب سے پہلے کی رائے نقل کرتا ہوں :-

"مسٹر منٹگمری مارٹن نے اپنی کتاب "مشرقی ہند" میں اور بھی واضح طور پر یہ بات ثابت کی ہے کہ صوبہ شمال مغربی کی زبان سوائے ہندوستانی کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ دہلی، آگرہ و الہ آباد، لاہور اور اودھ کے متحدہ علاقوں میں بھی یہی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ ہندی بہار و صوبہ متوسط کی زبان ہے لیکن ہندوستانی یا اُردو یا دکنی ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں سمجھی جاتی ہے۔"

(از رسالہ اُردو - خطبات گارساں دتاسی - تیرھواں خطبہ نمبر ۱۸۶۳ئہ

مترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین صاحب - ڈی - لٹ - پیرس -)

ہندوستانی کونسی ہے ؛

اقتباسات بالا اس قضیئے کو پاک کرتے ہیں، اُردو اور ہندی میں سے کون سی زبان ہندوستانی ہونے کی دعویدار ہو سکتی ہے اور سارے ہندوستان کے لئے مشترکہ ملکی زبان کی حیثیت سے کون سی زبان اختیار کی گئی تھی اور اس وقت کون سی زبان ہندوستانی کہلا سکتی ہے۔

ہندوستان میں معاملات اُلجھتے ہیں مگر وہ سُلجھتے نہیں اس لئے کہ تحقیقات اور تلاش سے مطلق کام نہیں لیا جاتا، جو کچھ صحیح غلط خیال ظاہر ہو گیا اُس کے نبھانے کی کوشش کی جاتی ہے اس صورت میں حقیقت اپنا چہرہ بے نقاب نہیں کرتی بلکہ وہ اور سات پردوں میں روپوش ہو جاتی ہے۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ دیکھا بھالا راستہ گمراہی کا سبب بنتا۔

کیا ہمارے احباب اب بھی حقیقت کی تلاش میں ایک غیر جانبدار یورپین محقق کی قابل قدر تحقیقاتوں پر نظر انصاف ڈالیں گے۔ موسیو موصوف کے خطبات فرانسیسی سے اُردو زبان میں ترجمہ ہو کر رسالہ اُردو میں کئی سال تک مسلسل نکل چکے ہیں۔ اگر ہندوستانی یا اُردو پر مشکوک نظر رکھنے والے حضرات اس کا مطالعہ کریں تو سارے شبہات جو آئے دن رُونما ہوتے رہتے ہیں دُور ہو جاتے۔ ہندوستانی بننے والی ہندی (ہندی اتھوا ہندوستانی) کی ترقی کا انتظار بھی نہ کرنا پڑتا۔

چراغ علی

قومی زبان سے بیر

افسانۂ عبرت ہے بیانِ اُردو
ہر قوم تھی شیدا لئے زبانِ اُردو
پر کانگرسی بھی ہیں اب اُس کے دشمن
اللہ ہے اب نگاہبانِ اُردو

اُردو سے پریشان ہیں ہندی والے
کم عقل ہیں، نادان ہیں ہندی والے
ایسے بھی کہیں کوئی زباں مٹتی ہے
کیوں مفت میں ہلکان ہیں ہندی والے

اُردو سے جو پرخاش ہے ہندی والو
جو پردہ تھا وہ فاش ہے ہندی والو
اگلوں نے جسے سینچا، اُسے کاٹتے ہو
شاباش ہے، شاباش ہے ہندی والو

سر اپنا سبر کوہ سے ٹکراتے ہیں
اور رشک سے بے موت مرے جاتے ہیں
کیا عقل پہ ان کی پڑ گئے ہیں پتھر
اُردو کے مٹانے کو بڑھے آتے ہیں

اُردو کو سمجھتے ہیں وہ اس راج کا ننگ
اس قوم پرستی پہ مری عقل ہے دنگ
اُردو کا گلا گھونٹ کے ہندی کو جلائیں
کیا خوب نکالا ہے یہ سوراج کا ڈھنگ

پیارے لال شاکر میرٹھی

اِس جام کا پینا جینا ہے

(۱)

ہوتا ہے یہی اس عالم میں، تخریب بھی ہے تعمیر بھی ہے
اس گنگا جمنی دنیا میں، تدبیر بھی ہے تقدیر بھی ہے

روتے ہیں کبھی ہنستے ہیں کبھی پہلو ہیں یہی دو جینے کے
کچھ اس کی کچھ اُس کی گھاتیں ہیں دنیا بھی ہے نخچیر بھی ہے

(۲)

پیمانِ وفا کعبہ میں بندھا اور لائے گئے بتخانے میں
"لاہوتی" مے بھر دی ساقی نے "ناسوتی" پیمانے میں

حیرت سے جو فطرت کو دیکھا، وہ الٹا پوچھنے مجھ سے لگی،
"آتا ہے نظر جو تجھ کو شجر تھا مٹی میں یا دانے میں؟"

(۳)

گو دانے کے اندر ہی تھا شجر مٹی میں پلا "مشہود" ہوا
غائب میں ہیولیٰ سا تھا جو۔ وہ حاضر میں موجود ہوا

تکمیلِ محبت ہی کے لئے یہ کھیل کسی نے کھیلا ہے
ابلیس یہی تو سمجھ نہ سکا۔ ناری وہ جبھی مردود ہوا

(۴)

اِک جوہر ہے آئینے میں جس جوہر سے آئینہ ہے
اِک نورِ تجلی ہے گل میں، گل جس سے طور ہی سینا ہے

اِک جام امیں ہے ناسوتی مے جس میں بھری ہے لاہوتی
ساقی نے جبھی تو فرمایا "اس جام کا پینا جینا ہے"

امینِ حزیں سیالکوٹی

عہدِ حاضر کا سوشل ڈراما

ہماری زندگی معاشری بندشوں اور رسم و رواج کی پابندیوں میں کچھ اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ ہم تصور میں بھی کسی ایسی صورت سے مانوس نہیں ہو سکتے جس میں ایک انسان ازدواج، برادری، مذہب، گورنمنٹ یا قانون کی پابندی سے بے نیاز رہ کر کلیتہً انفرادی زندگی بسر کر سکے۔ ہم اپنی بود و باش، خور و نوش، مذہب و سیاست کے مختلف ضوابط میں گرفتار ہیں اور ہر چند یہ جماعتی نظام کتنے ہی مفید اور ضروری کیوں نہ ہوں بعض حالات میں کوئی نہ کوئی سماجی پابندی یا مذہبی تعصب ایسی شکل اختیار کر ہی لیتا ہے کہ اس کی تکمیل کے لئے انسانی آرزوؤں کو قربان کرنا پڑتا ہے، حساس طبائع ایسی قربانی سے متاثر ہو کر معاشری بندشوں، مذہبی قیود، اور سیاسی نظریات کی پابندیوں کے خلاف جوش میں آجاتی ہیں اور انہیں ظلم سے تعبیر کرنے لگتی ہیں۔ آزاد منش طبائع کا دم سماج اور اخلاق کے احتساب سے گھٹنے لگتا ہے اور اُن کی رُوح بسا اوقات گرد و پیش کے رواجی ماحول سے آزاد ہو جانے کی آرزومند ہوتی ہے۔ بس یہی جذبہ اور یہی خواہش عہدِ حاضر کے سوشل ڈراما کی محرک یا موجب ہوئی ہے۔ یہاں سوشل ڈرامے سے مراد وہ اصلاحی ناٹک ہرگز نہیں جو کسی خاص سوسائٹی کے عیوب اور نقائص نمایاں کرنے کے لئے یا بُری رسوم کی اصلاح کے لئے لکھے جاتے ہیں بلکہ ایسے ناٹک مراد ہیں جو کم و بیش ہر سماجی، مذہبی، اور سیاسی نظریہ کی تقلید کو اس لئے قابلِ ملامت قرار دیتے ہیں کہ اُن کی وجہ سے بیشتر انسانی جذبات اور انسانی اُمیدوں کا خون ہوتا ہے۔ یہ سوسائٹی کی اصلاح یا تنظیم کے بجائے سوسائٹی کی تخریب اور اس کے انتشار کی رہنمائی کرتے ہیں۔ سوشل ڈراما نگار مصلح یا ریفارمر نہیں۔ وہ سماج کے ناکردہ گناہ ملزم کی طرف سے سماج کے خلاف وکالت کا حق ادا کرتا ہے اور سماجی تعصبات یا مذہبی نظریات کے مقابلہ میں انسانی جذبات کے احترام کی حمایت میں اپنا سارا زور صرف کر دیتا ہے۔

ہمارے ملک میں رسم و رواج کی پابندی اور معاشری قیود اتنے قدیم اور سخت گیر ہیں کہ ابھی ان کے خلاف آواز اُٹھانا کچھ آسان کام نہیں۔ ان میں اصلاح کی ضرورت تو ضرور محسوس ہوتی ہے اور ایسی اصلاح برابر ہوتی بھی رہتی ہے لیکن سماج یا مذہب کی علانیہ مخالفت کی جرأت کرنا فی الحال ہندوستان کی سرزمین میں بہت کم ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس طرز کا سوشل ڈراما مفقود ہے۔ مغرب میں اس قسم کے ڈرامے کثرت سے لکھے جا رہے ہیں لہٰذا اس مضمون میں سوشل ڈرامے کی تمام تر مثالیں سمندر پار ہی کے ڈراموں سے پیش کی گئی ہیں۔

سوشل ڈراما گو بظاہر کبھی کبھی طربیہ صورت بھی اختیار کر لیتا ہے لیکن نفسِ مضمون کے لحاظ سے اس قدر سنجیدہ ہوتا ہے کہ اس کا شمار

زمانۂ حاضر کی ٹریجیڈی (المیہ) میں کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ ٹریجیڈی میں ایک ایسی کشمکش کا منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں ایک فرد اپنے سے زیادہ مضبوط طاقتوں کے خلاف برسرِپیکار ہو درآنحالیکہ ناکامی اور نامرادی پہلے ہی سے اس کے لئے مقدر ہو چکی ہو۔ یونانی المیہ میں یہ مخالف طاقت "تقدیر" ہوتی ہے۔ عہدِ الزبتھ کے ڈرامے میں انسان کی قسمت میں ناکامی اس لئے لابدی ہوتی ہے کہ اس میں فطرۃً بعض کمزوریاں اور نقایص موجود ہوتے ہیں۔ خود اُس کے اعمال اور خیالات اس کے نقش بر آب بن جاتے ہیں۔ میکبتھ اس لئے المیہ نہیں کہ دشمنوں نے ہیرو کو تخت سے اُتار کر قتل کر ڈالا بلکہ وہ اس لئے المیہ ہے کہ ایک عالی ہمت اور نیک خصلت انسان جو بہت سی خوبیوں کا مالک ہے صرف اپنی ایک جبلی کمزوری اور ادنیٰ جذبہ کا شکار ہو جاتا ہے۔

عہدِ حاضر کے سوشل ڈراما میں کسی فرد کو اپنے ماحول سے برسرِپیکار دکھایا جاتا ہے۔ ماحول سے مُراد وہ مجلسی قیود ہیں جنہیں توڑنے کی وہ سعیٔ لاحاصل کرتا ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں برطانیہ اور دیگر ممالکِ یورپ میں مجلسی رسوم نے حد درجہ اہمیت اختیار کر لی تھی انہیں باقی تمام خیالات پر فوقیت حاصل تھی۔ اس سے قبل الیزبتھ کے عہد میں یا تو لوگ جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو رہے تھے یا ہر ایک کو مہموں اور اولوالعزمانہ کارناموں کی دُھن سمائی تھی۔ یہ ریلے (Raleigh) اور ڈریک (Drake) جیسے لوگوں کا زمانہ تھا۔ اسی طرح پھر سترھویں صدی عیسوی میں یا تو مذہبی اصُولوں کی شدید پابندی یا سیاسی رُجحانات نے عوام کو متحد کر رکھا تھا اور جب کبھی لوگوں میں مذہبی عقاید یا سیاسی نظریوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا تو اُس وقت تک تلوار نیام میں نہ جاتی جب تک کہ ایک نہ ایک فریق زیر نہ ہو جاتا۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی مذہبی اور سیاسی مناقشات ختم ہو گئے۔ پہلے یہ خیال دماغوں پر مسلط تھا کہ مذہب میں عقل کو کوئی دخل نہیں پھر مذہب پر معقولات غالب آ گئے اور مذہبی عقاید کی جگہ اخلاق نے لے لی۔ اس طرح انگلینڈ میں ایک منظم سوسائٹی عالمِ وجود میں آئی۔

زمانۂ حاضر کے سوشل ڈرامے میں (معاشری ڈرامے) اسی منظم سوسائٹی کے خلاف آواز اُٹھائی جاتی ہے۔ یہ نئی طرز ہنرک ابسن (Henreik Ibsen) کے اجتہادِ فکر سے وجود میں آئی۔ ہنرک ابسن سکنڈے نیویا کا باشندہ تھا جو ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوا۔ یہ شخص انفرادی آزادی کا زبردست حامی اور مذہبی اور سماجی قیود کا شدید ترین مخالف تھا۔ برنرڈ شا اُس کا بلند آہنگ مداح اور کامیاب متبع ہے۔ لیکن اب تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور انگلینڈ کے تمام ڈراما نگاروں کا موضوع یہی ہو گیا ہے، وہ سب اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ سیاسی، مذہبی اور اخلاقی اصولوں کی کورانہ تقلید رحمت کے بجائے زحمت کا موجب ہوتی ہے کیونکہ ہزارہا افراد کی اُمیدیں اور اُمنگیں ان فرسودہ اصُولوں کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ جاتی ہیں جس سے ان کی تمام زندگی منتشر کر رہ جاتی ہے۔ حساس آرٹسٹ سوال کرتا ہے کہ ہم کیوں ان دقیانوسی اصُولوں پر جمے رہیں اور انسانی جذبات اور اوصاف کی بے دریغ قربانی کرتے چلے جائیں؟

جب ایک ڈراما نویس اس موضوع پر قلم اُٹھائے گا تو لازمی طور پر وہ کسی ایسے فرد یا ہیرو کو منتخب کرے گا جو سوسائٹی کے اصُولوں کا

مخالف اور سوسائٹی کی نگاہ میں مجرم ہو۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ڈراما کا ایک لازمی عنصر یعنی "کشمکش" کا اظہار ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہیرو عموماً خطاکار بیویاں یا ایسی عورتیں جن کا دامن پہلے آلودہ رہ چکا ہو یا غیر منکوحہ جوڑے یا مشکوک پیدائش کے نوجوان ہؤا کرتے ہیں۔ ڈرامانگار اس امر کی پوری پوری احتیاط کرتا ہے کہ ہیرو کو ایسے رنگ میں پیش کرے کہ کسی خاص معاملہ میں وہ راستی پر ہے اور سوسائٹی غلطی پر۔

ابسن اپنے ڈرامے "خبیث ارواح" میں شادی کے مسئلہ کو اس حیثیت سے پیش کرتا ہے گویا یہ ایک انسانی قربانی ہے، جسے سوسائٹی کے اصول و ضوابط کے بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ اس ڈرامے میں ایک عورت کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو بیوی کی حیثیت سے وفاشعار اور بطور ماں کے ایک قابلِ تقلید عورت ہے۔ جو ہر موقع پر خود فراموشانہ فرائض انجام دیتی ہے۔ اس کا خاوند مسٹر الونگ ایک عیاش انسان ہے اور عیاشی اس کے لئے باعثِ فرحت و انبساط ہے۔ سوسائٹی کے ڈر سے وہ علانیہ ہوس رانی نہیں کرسکتا مگر خفیہ اور ناجائز طریقہ سے مقصد براری کرکے مسرور ہوتا ہے یہاں معاملات کو یہ بات اور بھی بدتر بنا دیتی ہے کہ الونگ کی بیوی کو در اصل اپنے شوہر سے کوئی محبت نہیں۔ بلکہ اُسے اپنے خاوند کے ایک پادری دوست سے عشق ہے، اس کے باوجود دُنیا نے جو فرض اس پر عاید کیا ہے وہ اس کی بجا آوری میں کوتاہی نہیں کرتی، خاندانی ناموس اور پاک بازانہ زندگی کے ضوابط اس امر کے متقضی ہیں کہ وہ یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرے کیونکہ اگر وہ اپنے بیٹے کو باپ کی زندگی کے اصل حالات سے آگاہ کردے تو بیٹے کو اپنی گھریلو زندگی کی تقدیس کا جو یقین ہے وہ جاتا رہے۔ اس مصلحت کے پیشِ نظر وہ حقیقت کو اپنے بیٹے اور دُنیا سے چھپائے رکھتی ہے۔ لیکن اس کے تمام مصائب اور قربانی کا اثر ایک خوفناک حقیقت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ اُس کا بیٹا آسولڈ بالکل اپنے باپ کا نقشِ ثانی ثابت ہؤا ہے۔ وہ بھی اُسی کی طرح عیش و عشرت کا دلدادہ ہے۔ آسولڈ کو اپنے گھر کی خادمہ ریجینا سے محبت ہو جاتی ہے ریجینا در اصل آسولڈ کے باپ ہی کی ناجائز اولاد ہے لیکن اس کی ماں کے سوا اور کوئی اس حقیقت کو نہیں جانتا۔ آسولڈ اپنے باپ کے پادری دوست منیڈر اور اپنی ماں سے بیان کرتا ہے کہ پیرس میں لوگ بغیر کسی باقاعدہ شادی کے باہم خوشی سے رہتے ہیں۔ پادری اس بدچلنی پر نفریں کرتا ہے، یہاں آسولڈ اور پادری کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

آسولڈ۔ آخر وہ کیا کریں؟ ایک غریب نوجوان لڑکی یا ایک مفلس مصور کو شادی کرنے کے لئے بہت سے روپے کی ضرورت ہے! کہئے پھر انہیں کیا کرنا چاہئے؟

منیڈر۔ وہ کیا کریں؟ ہاں میں بتاتا ہوں مسٹر الونگ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ ابھی انہیں اوّل ہی سے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا چاہئے اب سمجھے تم! انہیں کیا کرنا چاہئے؟

آسولڈ۔ ان نوجوانوں پر جن کے خون میں حرارت ہے، جو عشق میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے ہیں، ایسی گفتگو کا کچھ اثر نہیں ہوسکتا۔

اسی دوران میں آسولڈ جسے اس بھید کا علم نہ تھا کہ اس کی محبوبہ اس کے باپ کی ناجائز اولاد ہے۔ دو ٹوک فیصلہ کردیتا ہے کہ "ریجینا کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا"۔ اس کی ماں جب دیکھتی ہے کہ اُس کے بیٹے کی زندگی کا انحصار اسی پر ہے کہ آسولڈ کو اُس کی مرضی پر

عمل کرنے دیا جائے۔ وہ آسولڈ اور رجینا کو اصل حالات سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

مینڈرز۔ (پادری اور کنبہ کا دوست) آپ کا اس معاملہ میں کیا خیال ہے؟

مسز الونگ۔ آسولڈ کا ایک ایک لفظ راستی پر مبنی ہے۔

منیڈرز۔ (بھونچکا سا رہ جاتا ہے) راستی پر! ایسے اصولوں میں؟

مسز الونگ۔ پادری صاحب میں بھی اس تنہائی کی زندگی میں سوچ بچار کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچی ہوں۔ لیکن میں نے یہ باتیں زبان پر لانے کی کبھی جرأت نہیں کی۔ اب میرا بیٹا میری ترجمانی کرے گا۔

. . . .

. . . .

اگر میں ایسی بُزدل نہ ہوتی تو اُس سے صاف کہہ دیتی "تم اُس سے شادی کر لو یا پھر خوشی سے سب کچھ کئے جاؤ لیکن چھپ چھپا کر کچھ نہ کرو"۔

منیڈرز۔ پناہ بخدا! تم انہیں شادی کی اجازت دے دیتیں! اتنی شرمناک بات سُنی تک نہیں؛ ایسا قابلِ اعتراض تعلق!

مسز الونگ۔ جہاں تک اس خیال کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم سب اسی قسم کے تعلق سے عالمِ وجود میں آئے ہیں۔ ہاں تو پادری صاحب آپ ہی فرمایئے کس نے دُنیا کو ایسا بنایا ہے؟

"کس نے دُنیا کو ایسا بنایا ہے" یہی ساری بحث کا ماحصل ہے۔ مسز الونگ جیسا کہ وہ خود اپنی بُزدلی کا اقرار کرتی ہے اپنے بیٹے کے سامنے اصل حقیقت کا اظہار کر دیتی ہے، اور اس صدمے سے اُس کا بیٹا جو اُس کی اُمیدوں کا آخری سہارا ہے جاں بحق ہو جاتا ہے۔

ڈراما نگار ان سماؤں کے خلاف جو اخلاق کی علمبردار ہیں اور جو اس قدر انسانی قربانی کی طالب ہیں، غیظ و غضب کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ "ہمیں اپنی راہ چلنا چاہئے اور جب تک ہمارے جذبات اور تعصبات کے علاوہ ہمیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے ہمیں کسی سے تعرض نہ کرنا چاہئے، ہر ایک کو اس کی خواہش کے مطابق کام کرنے دیجئے اور اس قسم کے اخلاقی صدمات کے لئے ہمیں ہر لحظہ طیار رہنا چاہئے"۔

مسز الونگ نے پرستاران عوائد اور مدعیانِ اخلاق کے متعلق ان واضح الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے "ہم میں فقط وہی چیزیں مروج نہیں جو ہمیں اپنے بڑے بوڑھوں سے ورثہ میں ملی ہیں۔ بلکہ ہر قسم کے دقیانوسی خیالات، پرانے اعتقادات جن میں اب کوئی جان باقی نہیں۔ ہم میں جاری وساری ہیں۔ وہ بے جان ہونے کے باوجود ہم سے اس طرح چمٹے ہوئے ہیں کہ ہم اُن سے مخلصی نہیں پا سکتے۔ جب کبھی میں کوئی اخبار اُٹھا کر دیکھتی ہوں۔ مجھے اس کی سطور میں رُوحیں حرکت کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ یقیناً ایسی

روحیں تمام دُنیا میں سمندر کی ریت کی طرح تہ در تہ پائی جاتی ہیں۔ اور ہماری حالت ایسی قابلِ رحم ہے کہ ہم روشنی سے خوف کھاتے ہیں۔"

ابسن "دشمنِ جمہور" میں جمہوریت کے اصولوں کا مضحکہ اُڑاتا ہے۔ اس میں اوسط درجہ کی اکثریت کی حالت بیان کی گئی ہے جس نے صحتیابی کی غرض سے حمام بنا رکھے ہیں اور ان میں غسل کرنے کے لئے دُور دُور سے سیاح کھنچے چلے آتے ہیں۔ جلبِ زر کے لئے یہ بڑا مؤثر ذریعہ ہے اور ان کے ہوٹلوں اور دُکانوں میں خوب چہل پہل رہتی ہے۔ دراصل ان حماموں کا پانی مضرِ صحت جراثیم کا مسکن بن کر خراب ہو چکا ہے لیکن عوام کی اکثریت اس راز کو چھپائے رکھتی ہے۔ ایک دیانتدار ڈاکٹر سٹاکمین جونہی دُنیا کو یہ آگاہ کرنے کا تہیہ کرتا ہے کہ غسل کے حماموں کا پانی مضرِ صحت ہو چکا ہے تو یکدم تمام شہری بحیثیت سوسائٹی، بحیثیت عوام اور بحیثیتِ جمہوریت اُس کی مخالفت پر اُتر آتے ہیں۔ اُس کا بیان ہے کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اکثریت خواہ کس قدر بھی پرانی لعنتوں کو دُور کرنے کی خواہاں ہو وہ ہمیشہ نئی اصلاحات کے متعلق صحیح رائے قایم کرنے سے نہ صرف قاصر بلکہ انہیں قبول اور جذب کرنے کے نااہل ہوتی ہے اس ڈاکٹر کو عوام کی طرف سے "دشمنِ جمہور" کا خطاب ملتا ہے۔ وہ اپنی سابقہ نیک شہرت کھو بیٹھتا ہے۔ اُس کی بیٹی پیٹرہ جو ایک زنانہ مدرسہ میں معلمہ ہے ملازمت سے برطرف کر دی جاتی ہے، غضبناک اکثریت کے ہاتھوں اُسے بے حد نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ آخر وہ بھی سیاسی اور اخلاقی سبھاؤں کی کمزوری اور کمینگی کا راز پالیتا ہے اور اُسے اس خیال سے تسکین حاصل ہوتی ہے کہ "دُنیا میں سب سے مضبوط انسان وہ ہے جو سب سے الگ رہے"۔

ابسن کے ڈرامے "گڑیا کے گھر" میں سوسایٹی اور عوامید کی مخالفت کا جذبہ بہت حد تک دبا ہوا ہے۔ تاہم اس کی تہ میں یہی جذبہ جاری و ساری ہے جو تھوڑے سے غور و خوض کے بعد پورے طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ اسی ڈرامے میں ایک عورت ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنے الہامی اوقات میں یُوں بول اُٹھتی ہے:۔

"آخر میں اپنے ضمیر کی پابندیوں سے آزاد ہو گئی ہوں۔ اب میں ان لوگوں کے خیالات کی ترجمانی کروں گی جو بولنے سے ڈرتے ہیں۔ میں اُس دل کی صدا بن گئی ہوں جو اندر ہی اندر چکنا چُور ہو رہا ہے۔ میں نے آواز بلند کرنے کا حق حاصل کر لیا ہے ہاں ہاں میں نے جرأت کی ہے!"

اس کے بعد اُس کا حرماں نصیب عاشق اپنے دل کی پوشیدہ گہرائیوں کا انکشاف کرتا ہے۔ ابسن کا نفسِ موضوع ہمیشہ یہی رہا ہے کہ زمانہ حاضرہ کی غلامی دراصل نیکی کے خود ساختہ اصولوں ہی کی غلامی کا دوسرا نام ہے اور وہ اس عام کلیہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے "کہ اخلاقی اور مذہبی اصول منوانے یا اُن پر عوام کو پابند رکھنے کے لئے سوسائٹی نے جو طریقے اختیار کر رکھے ہیں، ان میں وہ حق بجانب ہے"۔

برنرڈ شا اپنے ڈرامے "انسان اور مافوق الانسان" میں اِن فرسودہ اصولوں کو جو اب ناقابلِ عمل ہو چکے ہیں آڑے ہاتھوں

لیتا ہے۔ اس میں انڈریو اپنی لڑکی کو ان الفاظ میں ڈانٹ بتاتا ہے۔ "تم نے اپنے لئے کچھ گھڑ لیا ہے جس کا نام تم نے مذہب۔ اخلاق اور نہ جانے کیا کیا رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن یہ حقائق سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ان کو اتنا گھسو کہ یہ اپنی جگہ ٹھیک بیٹھ جائیں۔ ان دونوں دُنیا میں یہی تو خرابی ہے جب مشینوں کے ڈائینمو اور پُرزے کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو یہ لوگ انہیں گھس گھسا کر ٹھیک کر لیتے ہیں۔ لیکن مذہب، اخلاق اور سیاست کی وجہ سے دُنیا گھاٹے میں رہتی ہے اور یہ سب اُسے ہر لحظہ دیوالیہ ہونے کے قریب لا رہے ہیں۔ اس لغویت پر اصرار نہ کرو۔ اگر تمہارا مذہب آج ناکارہ ہو چکا ہے تو اگلے روز نیا اور اس سے اچھا مذہب اختیار کر لو۔"

اسی طرح برنرڈ شا اپنے ڈرامے "شادی" میں ایک عورت اور ایک مرد کے خیالات کی نمائندگی کرتا ہے جو ایک دوسرے سے رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں لیکن وہ شادی کے موجودہ قوانین کو قبول نہیں کر سکتے، اس موقع پر لیو کہتی ہے۔

لیو۔ ہاں میں دونوں سے محبت کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں کئی آدمیوں سے شادی کروں۔ ریجی کو میں خانگی زندگی کا رفیق بنانا چاہتی ہوں۔ اور سجن کو ناچ، گانے، تھئیٹر اور شام کی چہل قدمی میں ساتھ رکھنا چاہتی ہوں۔

"ڈاکٹر کا تذبذب" غالباً شا کا شاہکار ہے۔ اس میں ایک ڈاکٹر کو جس نے تپِ دق کی مجرب دوا ایجاد کر کے دفعتہً شہرت حاصل کر لی ہے تذبذب کی حالت میں دکھایا گیا ہے۔ وہ ایک وقت میں دس مریضوں کا علاج کیا کرتا ہے۔ نو اُس کے پاس پہلے سے موجود ہیں باقی ایک جگہ کے لئے دو مریض اُمیدوار ہیں، ان میں سے ایک اس کا ہم پیشہ غریب، دیانتدار اور شریف الطبع ڈاکٹر بلکنسپ ہے۔ دوسرا ایک بلند پایہ مصور لوئی ہے جو عیار عورتوں کے مسئلہ میں لااُبالی طبیعت رکھتا ہے اور بھونرے کی طرح ہر کلی کا رس چوس کر اُڑ جاتا ہے۔ موخرالذکر کی بیوی نہایت خوبصورت ہے اور وہ اپنے خاوند کی پرستش کرتی ہے اور اُسے لوئی کی بدکاریوں کا علم نہیں ہے۔

سر پیٹرک۔ (ڈاکٹر کا ایک دوست) ہاں بھئی جانوں کے بچانے والے! کس کا علاج کرو گے۔ اُس دیانتدار اور شریف النفس انسان بلکنسپ کا یا اُس ذلیل پاجی مصور کا؟

ڈاکٹر۔ یہ بتانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ بلکنسپ دیانتدار شریف انسان ہے لیکن کیا اس کی زندگی کا کچھ مصرف بھی ہے؟ لوئی ذلیل ہے پاجی ہے، لیکن اُس کی ذات بعض نفیس اور خوشنما اشیا کا حقیقی سرچشمہ ہے۔

سر پیٹرک۔ اگر اس کی معصوم بیوی اس کے اعمال کو دیکھ پائے تو اُس بیچاری کے لئے مسرت کا کونسا چشمہ پھوٹ نکلے گا؟

ڈاکٹر۔ یہ صحیح ہے کہ اُس کے لئے زندگی جہنم ہو جائے گی لیکن پھر بھی مجھے تذبذب ہے بالکل تذبذب۔ اور بھی کچھ اُلجھنیں ہیں جن کا ہم نے تذکرہ نہیں کیا۔

سر پیٹرک۔ وہ کیا؟

ڈاکٹر۔ ہاں اگر میں لوئی کو مرنے ہی دوں تو بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے یہ اس لئے کیا ہے کہ میں اس کی بیوہ سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔

سر پیٹرک۔ ہیں یہ کیا؟

ڈاکٹر۔ یہی کہ اگر میں لوئی کو مرنے دوں تو میں اُس کی بیوہ سے نکاح کر لوں گا۔

آخر ڈاکٹر انتخاب کر لیتا ہے ۔ بلکنسپ بچ جاتا ہے ۔ لوئی کو کسی نیم حکیم کے رحم پر چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ اُس کا خاتمہ ہو جائے ۔

سر پیٹرک ۔ تو بھئی ۔ وہ میاں تو بہت گئے ۔

ڈاکٹر ۔ پیشتر اس کے کہ لوئی کی بیوی کو اُس کی اصل حقیقت معلوم ہو ۔ اس کا مر جانا ہی اچھا ہے ۔

سر پیٹرک ۔ (خشک لہجہ میں) یہ بڑا ظلم ہے کہ کسی آدمی کی اس لئے جان لی جائے کہ اُس کی بیوی کو اُس کے عیوب کا علم نہ ہو جائے ۔

ڈاکٹر کا یہ خیال ہے کہ اُس نے لوئی کی بیوی کو تباہی سے بچا لیا ہے ۔ لہٰذا وہ معتوق کی زندگی کے پوست کندہ حالات بےکم و کاست اُس کی بیوی کو سُنا دیتا ہے ۔ وہ عورت ان باتوں کو ذرہ بھر اہمیت نہیں دیتی اور کہتی ہے ۔

"وہ اُن ہستیوں میں سے تھا جو عورتوں کی طرح جانتے ہیں کہ ایثارِ نفس ایک لغویت اور بزدلی ہے ۔ تم غلطی پر ہو قطعاً غلطی پر ۔ تم لوئی کی خوبیوں کی داد دینے کے بالکل نااہل ہو ۔"

عہدِ حاضر کے سوشل ڈرامے پر اعتراض ہے کہ یہ مخرب اخلاق ہے ۔ برنرڈ شا اس کا جواب ان الفاظ میں دیتا ہے ۔ "بدکاری لازمی طور پر مفسدانہ روش ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق ایسی روش پر ہوتا ہے جو مروجہ اصُولوں کے مطابق نہ ہو ۔ خواہ وہ مفسدانہ ہو یا نہ ہو" اس لحاظ سے کہ یہ مروجہ اصولوں کے خلاف ایک بغاوت ہے ، یہ واقعی مخرب اخلاق ہے ۔ لیکن یہ مفسدانہ یا بدآموز اُس صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ مصنف ڈرامے میں اول سے لے کر آخر تک کردار کے باہمی تعلقات کی حیثیت کو اچھی طرح نہ سمجھے اور اُس کے حُسن و قبح کو واضح نہ کرے ۔ اُسے اس امر کا علم ہونا چاہئے کہ وہ کہاں راستی پر ہیں اور کہاں غلطی پر ۔ مشکل اُس وقت ہوتی ہے جب کہ اخلاقی فیصلے جن کا اطلاق ڈرامے کے خاص کردار پر ہونا چاہئے ۔ روزمرہ زندگی پر چسپاں کر لئے جائیں ۔ نفسِ مضمون کی ترتیب اور طرزِ تحریر کے بغور مطالعہ کے بعد ہی اُس پر اخلاقی پہلو سے رائے زنی کی جا سکتی ہے ۔

چونکہ ڈرامے کے نفسِ مضمون میں تبدیلی ہو چکی ہے اس لئے طرزِ تحریر میں تغیر ہونا ایک لازمی امر تھا ۔ گذشتہ ایام میں ڈرامانگار کا آرٹ اس بات میں تھا کہ وہ ایک غیر معمولی ماحول پیدا کرے ۔ اسی لئے میکبتھ کو اُمیدوں اور اُمنگوں کے درمیان ایک ایسی ترغیب (اپنے محسن کے قتل کی) دلائی جاتی ہے جو اُس کی شرافتِ نفس کے خواہ کس قدر منافی کیوں نہ ہو اُسے اپنی آرزوؤں کی تکمیل کا موقع بہم پہنچاتی ہے ۔ ہیملٹ میں بھی بھتیجے کو اپنے مقتول باپ کا بدلہ لینے کے لئے چچا اور اپنی ماں کے قتل کی ترغیب دلائی جاتی ہے ۔

پُرانے ڈراموں میں جو صورتِ حالات پیش کی جاتی تھی وہ روزمرہ کی زندگی سے اتنی بعید اور مخالف ہوتی جتنا کہ ہیرو کا کردار عامۃ الناس سے بلند ہوتا تھا ۔ تماشائیوں کی دلچسپی کا مدار اس عمل (Action) پر موقوف ہوتا جو ہیرو کی ممتاز شخصیت اختیار کرتی ۔ کیونکہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی بلند مرتبت اور عالی ہمت انسان ماحول کے مقابلہ میں عاجز ہو کر رہ جائے تو انسانی عجز کا اعتراف اور بھی گہرا ہو جاتا ہے ۔ عہدِ حاضر کے سوشل ڈرامے میں روزمرہ کے نجی یا خانگی معاملات ڈرامانگار کے پیشِ نظر رہتے ہیں ۔ واقعات اور ماحول کو جہاں

تک ہو سکتا ہے روزمرہ کی زندگی کے مطابق رکھا جاتا ہے۔ عمل (Action) روزمرہ کے واقعات، لاینحل خیالات اور وقتی مسائل کی کشمکش سے ترکیب پاتا ہے۔ تماشائی بذاتِ خود ان کے حل میں دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے کسی خاص کردار کا عمل محض ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل چیز نفسِ مضمون یعنی اس کا حل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکالمہ اس کا ایک اہم جزو بن گیا ہے۔ اس سے قبل ڈراما طلعت (exposition) عمل (Action) اور انجام سے ترکیب پاتا تھا لیکن سوشل ڈرامے میں عمل کی جگہ مکالمہ نے لے لی ہے۔ اسی لئے "خبیث ارواح" میں تمام عمل سٹیج سے باہر ہو جاتا ہے سٹیج پر صرف مسز الونگ یا تو پادری سے بحث کرتی نظر آتی ہے یا اپنے بیٹے کی زبان سے خوفناک انکشافات سنتی دکھائی دیتی ہے۔ سوشل ڈرامے میں اوّل سے لے کر آخر تک مکالمہ ہوتا ہے باقی عمل یا تو دلچسپی قائم رکھنے کے لئے یا نئی بحث کا موضوع مہیا کرنے کے لئے لائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات عمل دفعتہً بند ہو جاتا ہے اور ایک طویل مکالمہ شروع ہو جاتا ہے۔

عہدِ حاضر کے ڈرامے میں حادثات، خلافِ واقعہ معاملات یا اتفاقات کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس میں صرف وہ چیزیں شامل ہیں جو لوازمِ حیات ہیں اور عام دیکھنے میں آتی ہیں۔ سوشل ڈرامے میں ایسی کسی غلط فہمی کو دخل نہیں جیسی کہ اوتھیلو میں پیش کی گئی ہے۔ یعنی اس کی بیوی کی بے وفائی کا منظر۔ موجودہ ڈراما اس لئے تماشائیوں کی دلچسپی برقرار رکھتا ہے کہ یہ اُن کی اپنی دقتوں کو اُن کے سامنے پیش کرتا اور انہیں ان معاملات پر غور و خوض کی ترغیب دیتا ہے اور اہل الرائے اور پختہ کار تماشائی ایسے مسایل نظر انداز نہیں کر سکتے جو بالکل انہی کی روزمرہ زندگی سے متعلق ہوں۔

چونکہ نئی طرز کا ڈراما نگار رسمی حیثیت سے اپنی اہمیت قائم کرتا ہے اس لئے وہ سابقہ ڈراما نویسوں کی مصنوعی پابندیوں سے آزاد رہتا ہے۔ پہلے یہ اصول تھا کہ حاضرین کو حقیقت سے بے خبر نہ رکھا جائے۔ ایاگو ڈراما کے تمام کرداروں کے نزدیک دیانتدار ہو سکتا ہے لیکن ڈراما نگار تماشائیوں کو دھوکے میں رکھتا ہے یہاں تک کہ وہ ہیرو کے خلاف فتوے صادر کر دیتے ہیں لیکن دوسرے ہی ایکٹ میں وہ اس فیصلے کو بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ "خبیث ارواح" میں مسز الونگ کو پہلے ایک درگزر کرنے والے خاوند کی بیوفا بیوی کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے (یعنی اُس کا پادری سے عشق)۔ لیکن بعد میں معاملہ اس کے برعکس نکلتا ہے۔ دراصل وہی اپنے بدکردار خاوند کی بدکرداریوں کی پردہ پوشی اور ایثارِ نفس کا ایک مجسمہ نظر آتی ہے۔ ابھی تماشائی پوری طرح اس کی بے گناہی کے بھی قایل نہیں ہونے پاتے کہ ڈراما نگار ثابت کر دیتا ہے کہ یہ سوسائٹی اور اس کی بیوی کے نظریات اور معتقدات ہی تھے جو اُس کے غلط اعمال کو بدنما بنائے ہوئے تھے۔ (ملاحظہ ہو "ڈاکٹر کا تذبذب" میں آرٹسٹ کی بیوی کا جواب جو اُس نے ڈاکٹر کو دیا ہے صفحہ ۸۸)

اس مختصر سی نگارش سے کم از کم اتنی بات ضرور واضح ہو گئی ہو گی کہ سوشل ڈراما نویس نے کس طرح دنیائے ڈراما کا نظریہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور کس طرح ہماری روزمرہ زندگی کے پریشان کُن مسایل ڈراما نویس کی توجہ کا مرکز بن رہے ہیں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ ڈراما نگار سماج، مذہب، اخلاق اور سیاسی نظریات کی بے بضاعتی اور ان کے تشدد کے خلاف احتجاج کرتا ہے لیکن مروجہ طریق کے

بجائے نئے نظریات یا کسی اصلاح شدہ طرزِ زندگی کا مرقع پیش کرنے سے بالکل عاجز ہے۔ وہ ہرطرف اُمیدوں اور آرزوؤں کا خون ہوتے دیکھتا ہے اور اس کی رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ اور جب ہم اُس کے احساسات سے دوچار ہوتے ہیں تو ہم بھی وہی لرزہ اور روحانی جذبات کا تلاطم محسوس کرتے ہیں۔ سوشل ڈرامے میں اُمید کی شعاعیں نہیں نامرادیوں کی تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس میں زندگی کے بھید تو کھولے جاتے ہیں لیکن ایسے بھیدوں سے بے خبر رہنا شاید زیادہ اچھا ہوتا۔ یہ خوشی بے وقوفی یا جہالت کی خوشی ہی کیوں نہ ہو "حقیقت" سے شاید زیادہ دلفریب ہوتی۔

محمد حسین غازی

ایڈیٹر "امدادِ باہمی" جموں سٹیٹ

ان کے جانے کے بعد

مَیں نے دلِ ناشاد سے پوچھا

"وہ کہاں گئے ؟"

وادی میں بہتے ہوئے دریا کی روانی میں یہ آواز غائب ہوگئی۔

"نہیں معلوم !"

میں نے ڈوبتے ہوئے چاند کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

ضبط کرکے اس سے پوچھا۔ "وہ کیوں چلے گئے ؟"

خاموش دریا کے اُوپر لرزتی ہوئی چاند کی چند ایک کرنوں نے دھیرے سے کہا

"نہیں معلوم !"

دور جنگل میں کسی آم کی ڈالی سے پپیہا بولا۔

"پی کہاں ؟ پی کہاں ؟"

کسی کے فراق میں چکور اُڑتا رہا۔

پہاڑوں کے دامن سے صبح کا آفتاب اُٹھا۔

اس کی شعاعوں کے مس سے مَیں کانپ گئی۔

دفعتہً میرے لب ہلے۔ شاید میں نے کہا "کیا وہ واپس آئیں گے ؟"

ہنستے ہوئے آفتاب نے اپنے تبسم کناں چہرے کو ذرا اوپر کیا۔ اور آہستہ سے کہا

"رانی یہ بھی نہیں معلوم !"

سشیلا موہن بکایا

اندھا فقیر

آگ سی برسا رہا ہے آفتابِ ماہِ تیر
رہگزر کے بیچ میں بیٹھا ہے اِک اندھا فقیر

اشک آنکھوں سے رواں ہیں، جسم سرتاپا نڈھال
آسماں کو تک رہا ہے پیکرِ رنج و ملال

راستے میں راہگیروں کا پتہ تک بھی نہیں
اِک صدا ہے "کچھ تو دے!" اس کے سوا کچھ بھی نہیں،

ناوکِ آواز سے دِل میرا گھائل ہوگیا
اب قدم آگے بڑھانا مجھ کو مشکل ہوگیا

دیکھتا کیا ہوں، وہ اندھا ہے مری دنیائے عشق
جس کی آنکھیں تھیں کبھی میخانۂ صہبائے عشق

لوٹ تھا جس چہرۂ گلرنگ پر میرا شباب
تابشِ خورشید سے مُرجھا چکا تھا وہ گلاب

جس کے پائے ناز پر پھیروں مرا رہتا تھا سر
جم رہی تھی گردِ رہ اُڑ اُڑ کے اس کے جسم پر

سِکۂ زر پرزۂ قرطاس تھے جس کے لئے
اب وہی خود رو رہا تھا پیسے پیسے کے لئے

جس صدا سے رنگ پر آتی تھی بزمِ ناؤ نوش
وہ ہمیشہ کے لئے اب ہونے والی تھی خموش

نام جس کا دوستوں میں "دائمی مخمور" تھا
آج اُس کا شیشۂ دل غم سے چکنا چور تھا

اس کا سارا درد میری روح میں حل ہوگیا
ہوش رخصت ہوگئے، سارا بدن شل ہوگیا

کائناتِ دل میں عکسِ عیش تک نایاب تھا
کیسی قاتل نیند تھی، کتنا ستمگر خواب تھا

سکندر علی وجد بی اے (عثمانیہ)

موسیو وِکٹر!

فرانسیسی نوجوان نے انگریز ڈیوک کی آستین میں سے پتا کھینچ کر کہا:۔

"ڈیوک صاحب۔ مجھے اِسی بات کی توقع تھی۔"

"تو مجھے تمہیں ہمیشہ کے لئے خاموش کرنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر ڈیوک برسٹن اپنی کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہؤا۔ اور ایک بپھرے ہوئے ببر کی طرح نوجوان وِکٹر کی طرف بڑھا۔

نوجوان۔ "اپنے پیچھے تو دیکھو"

اِن الفاظ سے گھبرا کر ڈیوک برسٹن نے پیچھے جو دیکھا تو چھ خاموش فرانسیسی اُس کے پاس ہی کھڑے تھے۔

"کیا آپ اِسے باعثِ فخر نہیں سمجھتے کہ چھ مضبوط آدمی آپ کی خاطر لایا ہوں۔ اب اگر آپ سنجیدگی سے اس معاملہ پر گفتگو کرنے کے لئے تیار ہوں تو مَیں اُن کو دُور بھیج دوں" یہ کہہ کر وکٹر نے اپنے نوکروں کو اشارہ سے دروازے کی طرف بھیج دیا۔

موقع شناس ڈیوک برسٹن بظاہر بڑے اطمینان کے ساتھ کُرسی پر بیٹھ گیا۔ صرف اس کی خشمگیں آنکھیں بتا رہی تھیں، کہ وہ وِکٹر کو تمام عمر معاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ڈیوک۔ "اچھا وکٹر بکو۔ تمہیں کتنے روپے چاہئیں۔"

وِکٹر۔ "واہ ڈیوک صاحب! آپ بھی کیا خوب سمجھے۔ مَیں بھلا روپوں کا بھُوکا ہوں؟ آپ ابھی جو ایک ہزار پاؤنڈ ہارے ہیں وہ بھی واپس لے سکتے ہیں۔ نہیں، وِکٹر دولت نہیں چاہتا۔"

ڈیوک۔ "تو پھر تُو کیا چاہتا ہے؟"

وِکٹر۔ "ہاں۔ مجھے روپے کی ضرورت نہیں۔ آپ اور آپ کے دوستوں سے بازی جیت جیت کر مَیں آج ہاتھ میں سب سے زیادہ امیر ہوں، لیکن میرے پاس دولت ہے، عزت نہیں۔ مَیں ہاتھ کی معزز سوسائٹی میں داخل نہیں ہو سکتا۔"

ڈیوک۔ "تو میرا اس میں کیا دخل؟"

وِکٹر۔ "آپ کے پاس معزز سوسائٹی کی کُنجی ہے اور آپ جس کو چاہیں اُس میں داخل کر سکتے ہیں۔ آج رات لیڈی میری کے ہاں ڈنر ہے۔ آج آپ مجھے اپنے مہمان اور دوست کی حیثیت میں وہاں لے جائیے اور لیڈی میری سے میرا تعارف کرائیے۔"

ڈیوک ۔ "تُو اور لیڈی میری ، یہ مُنہ اور مسُور کی دال ۔ کہاں وہ مہ جبین اور کہاں ایک حجام ۔ ڈیوک برسٹن کے ہاتھ میں معزز سوسائٹی کی کنجی سہی ۔ مگر وہ بھی تجھ ایسے کمینوں کو اس میں کیسے داخل کر سکتا ہے ۔ کیا تُو بھول گیا کہ پچھلے ہفتے سٹرناش نے اپنے ریسٹوران سے تجھے کس بے عزتی کے ساتھ نکالا تھا اور لیڈی میری اُس وقت کھڑی دیکھ رہی تھی ۔"

وِکٹر ۔ " ہاں ۔ میں نے اُس حسینہ کو دیکھا ہے اور اُس کے پاؤں کی خاک چُومنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ بھی میسّر نہیں ۔ آج شام میں بھی اُس کے پاس بیٹھوں گا اور وہ گلاب کا پھُول مجھے بھی عطا کیا جائے گا جو ہر روز وہ کسی خوش نصیب کو عطا کرتی ہے ۔"

ڈیوک ۔ " ارے ! تیرا سر تو نہیں پھر گیا ۔ آدھا شہر تجھے پہچانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ تو فرانسیسی سفیر موسیو برکلام کا حجام تھا اور تیرا اصلی نام مارتنہ ہے ۔"

وِکٹر ۔ " ڈیوک صاحب ! آپ کوئی فکر نہ کیجیے ۔ میں مُونچھ داڑھی صاف کرا لُوں گا اور وِگ اُتار دوں گا ۔ پھر مجھے یہاں کوئی نہیں پہچان سکے گا ۔ ہاں ، میرا نیا نام ! میں کیا بتاؤں ڈیوک ! اچھا ڈیوک آف شیرانتہ سہی ۔ آپ کو صرف ایک شام کے لئے مجھے اپنا مہمان بنانا ہے اور باتھ کے معززین سے میرا تعارف کرانا ہے ۔ بس آپ کا فرض ختم ہو جاتا ہے ۔ پھر آپ جو چاہیں کریں ۔"

ڈیوک ۔ " اور اگر میں انکار کر دوں تو ۔"

وِکٹر ۔ " تو کل باتھ کا بچہ بچہ جانتا ہوگا کہ ڈیوک برسٹن ناش میں دغابازی کرتا ہے ۔ اور لیڈی میری سے آپ بھی اُتنے ہی دُور ہو جائیں گے جتنا کہ میں ہوں ۔ آپ کے کھیل کو لوگ پہلے بھی شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ ڈیوک صاحب ، آپ گھبرائیں نہیں آپ پر کوئی حرف نہیں آئے گا ۔"

یہ کہتے ہوئے وِکٹر نے اپنی سیاہ وِگ اُتار کر پھینک دی اور اُس کے سنہری بال اُس کے کانوں پر چمکنے لگے ۔

آدھ گھنٹے کے بعد وِکٹر کے مکان سے " دو ڈیوک " نکلے اور لیڈی میری کے ڈنر کی طرف روانہ ہوئے ۔

سٹرناش کے ریسٹوران پر بڑا ہجوم تھا کیونکہ لیڈی میری کی بیسویں سالگرہ کی خوشی میں ڈیوک شیرانتہ نے ایک عظیم الشان ضیافت کا انتظام کیا تھا ۔ اس مجلس میں کوئی شخص شیرانتہ سے زیادہ خوش نہ تھا ۔ وہ لیڈی میری کے دائیں ہاتھ بیٹھا تھا اور لیڈی میری کا عطا کردہ گُلاب کا پھُول اُس کے کوٹ کے کالر میں تھا ۔ ڈیوک برسٹن کی پیشانی پر تیوری تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر ڈیوک شیرانتہ نہ ہوتا تو لیڈی میری کے ساتھ بیٹھنے کا موقع اسے ملتا ۔ اُس کے ہونٹوں پر پُرمعنی مسکراہٹ تھی جو بتا رہی تھی کہ وہ اپنے میزبان کے خلاف کوئی شرارت سوچ رہا ہے ۔

شیرانتہ باتھ میں بہت مقبول ہو گیا تھا ۔ تقریباً تمام شرفاء اُس کے آشنا بن گئے تھے اور تمام اُس سے حسد کرتے تھے کیونکہ

تعارف کے دن ہی لیڈی میری اُس کی مصاحبت کو ترجیح دیتی تھی، اور اب تو شہر کے "کافی خانوں" میں یہ خبر سُنی جاسکتی تھی کہ لیڈی میری اور شیرانتہ میں نسبت قرار پانے والی ہے۔ ہاں باتھ میں ایک شخص تھا جو اس خبر کی تردید کرنے کو بیقرار تھا اور وہ ڈیوک برسٹن تھا۔ اس تردید کے ساتھ اُس کے دوستوں نے اُسے یہ بھی کہتے سُنا: "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔"

ایک دن شیرانتہ لارڈ ہلفرڈ اور چند اور معززین کے ساتھ مسٹر ناش کے ریسٹوراں میں بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا کہ برسٹن اپنے ساتھ ایک اجنبی کو لئے آیا اور تمام حاضرین سے اُس کا تعارف کرایا۔ شیرانتہ کو مخاطب کر کے کہا "اُمید ہے آپ کپتان بکرٹن کی گفتگو سے بہت محظوظ ہوں گے۔"

کپتان بکرٹن جو بڑا تنومند و جسیم اور بڑا قد آور جوان تھا، شیرانتہ سے لڑائی لینے پر تُلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بیٹھتے ہی اُس نے فرانسیسیوں کی بُرائی کرنی شروع کر دی۔ اُن دنوں انگلستان میں ایک کہانی مشہور تھی کہ لوئی شاہِ فرانس نے اپنے بھائی شہزادہ چارلس کو ایک خاتون سے شادی کرنے کے لئے کہا۔ لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ اِس پر شاہِ فرانس نے اُسے قلعہ بیسٹیل میں قید کر دیا۔

کپتان بکرٹن نے اِس کہانی کو بڑے مزے مزے لے لے کر سُنایا اور اس کے دَوران میں شاہِ فرانس اور شہزادہ چارلس کو بہت سخت سُست کہا۔ شیرانتہ اپنے غصّے کو ضبط کئے بیٹھا رہا۔ لیکن جب بکرٹن نے اُس فرانسیسی دوشیزہ کے کیرکٹر پر حملے کرنے شروع کئے تو اُس سے نہ رہا گیا: "ہاں، شہزادہ چارلس بہت کمینہ ہے لیکن اے کُتّے! تجھ سے کہیں کم۔"

بکرٹن اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا کیونکہ اب دونوں میں صرف تلوار ہی فیصلہ کر سکتی تھی۔ اُس زمانہ کے دستور کے مطابق دو منصف مقرر کئے گئے اور طرفین کے لئے جگہ صاف کر دی گئی۔ ڈیوک برسٹن کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی لیکن زیادہ دیر تک نہ رہ سکی۔ آدھے منٹ میں شیرانتہ کی تلوار بکرٹن کے دائیں کندھے کے پار تھی۔

چند دنوں کے بعد باتھ میں ایک اور کپتان نمودار ہوا اور اُس نے شیرانتہ پر جعلسازی کا الزام لگایا لیکن اُس کا بھی وہی حشر ہوا جو بکرٹن کا ہوا تھا۔ لڑائی کے بعد شیرانتہ نے منصفوں سے کہا: "اصل میں مَیں اپنے دوست برسٹن کی لڑائی لڑا ہوں۔ یہ برسٹن پر الزام لگاتا ہے کہ اُس نے ایک جعلساز کو آپ کی سوسائٹی میں داخل کیا۔ اِس کی جرأت تو دیکھو" اور جھک کر مفتوح کپتان کے کان میں کہا: "اپنے مالک سے کہنا کہ تم جیسے بیوقوف اور نہ بھیجے۔" دوسرے دن لیڈی بیری کے دروازے پر شیرانتہ اور برسٹن ملے۔

"برسٹن! کیا تم گوارا کر سکتے ہو کہ جسے تم اِس معزز سوسائٹی میں داخل کرو۔ اُسے کوئی اَور نکال دے۔ نہیں یہ کام تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ تم ہی میرا راز فاش کر سکتے ہو۔"

"ایں سبو گر شکند امروز فردا بشکند" برسٹن کا جواب تھا۔

رات کا وقت تھا۔ چاند کی چاندنی فٹن پر پتوں میں سے چھن چھن کر پڑ رہی تھی۔ گاڑی کے کوئی پچاس گز پیچھے چھ سوار آ رہے تھے۔ یہ لارڈ بلیفرڈ، سرنگ وغیرہ تھے۔ فٹن کے ساتھ ایک اور سوار تھا جو فٹن میں کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ سوار شیر آنتہ تھا۔ وہ اور لیڈی ہیری سرنگ کے ڈنر سے واپس آ رہے تھے۔ فٹن آہستہ جا رہی تھی اور ہیری اپنا چہرہ باہر نکالے شیر آنتہ کی عاشقانہ گفتگو سن رہی تھی۔ لیڈی ہیری کا ہاتھ شیر آنتہ کے ہاتھ میں تھا۔

"آہ لیڈی ہیری، کیا میری یہ درخواست کبھی منظور نہ ہوگی" شیر آنتہ کی آواز ہجوم کیفیات سے بھرائی ہوئی تھی۔

"کیوں نہ ہوگی، شیر آنتہ"

"حجام"، "حجام"، "حجام" کی آوازوں نے رات کے ساحرانہ سکوت کو یکلخت توڑ دیا اور چھ سات نقاب پوش سوار سڑک پر نمودار ہوئے۔

"آہ کمینے" کہہ کر شیر آنتہ مقابلے کے لئے تیار ہوگیا۔ پہلے سوار کی ٹکر نے شیر آنتہ کے گھوڑے کو زمین پر گرا دیا۔ لیکن شیر آنتہ ایک مشاق سوار کی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ایک درخت کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں لارڈ بلیفرڈ اور اس کے ساتھی بھی آ گئے اور لیڈی ہیری کی گاڑی کے ساتھ آ کر کھڑے ہوگئے۔

"تم شیر آنتہ کی مدد کیوں نہیں کرتے؟"

"لیڈی ہیری! آپ کو ابھی سب کچھ بتایا جائے گا"

اس کے بعد اس درخت کے نیچے ایک عجیب لڑائی شروع ہوئی۔ شیر آنتہ کے پاس ایک چھوٹی سی تلوار تھی۔ لیکن وہ کسی افعی سے کم زہریلی نہ تھی۔ اُس نے چھ حملہ آوروں کو روک دیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس چھوٹی سی تلوار نے اُس کے گرد قلعہ کھڑا کر دیا ہے۔

"کیا موسیو اسے باعثِ فخر نہیں سمجھتا کہ میں چھ مضبوط آدمی اس کی خاطر لایا ہوں"۔ برسٹن کے یہ الفاظ "حجام" "حجام کو پکڑ لو" "حجام" کے شور میں شیر آنتہ کے کان تک پہنچے۔

"اخاہ، میرے دوست تم بھی یہیں ہو۔ مجھے یہی توقع تھی لیکن پیچھے، بہت پیچھے" یہ کہتے ہوئے شیر آنتہ نے اپنے مخالفین میں سے ایک کی تلوار چھین لی۔

اس کے بعد مقابلہ پھر اسی زور و شور سے شروع ہوا اور تھوڑی دیر میں شیر آنتہ کے مخالفین میں سے ایک زمین پر گرا پڑا تھا اور دو کے بازوؤں میں سے خون نکل رہا تھا۔

لارڈ بلیفرڈ بولا "حجام اُسترا چلانا خوب جانتا ہے!"

تماشائیوں کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ شاید شیرانتہ ہی فتحیاب ہو، لیکن اب دو حملہ آوروں نے تلواریں چھوڑ کر ڈنڈے پکڑے اور پہلی ہی ضرب میں شیرانتہ کی تلوار چورا چورا ہو گئی۔

"المدد۔ المدد۔ مارٹن" شیرانتہ کی گرجتی ہوئی آواز تمام شور سے بلند سنائی دے رہی تھی۔ نقاب پوشوں نے شیرانتہ کو باندھ لیا اور اُن میں سے ایک نے ہاتھ میں چابک لیا۔

میری کی آواز غصہ سے تھرّا رہی تھی۔ اس نے چیخ کر کہا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"مدد، مارٹن، مدد" شیرانتہ کی آواز گونج رہی تھی۔

نقاب پوشوں میں سے ایک نے کہا: "اسے فٹن کے نزدیک لے آؤ۔ لیڈی میری کے سامنے یہ حجام اپنی سزا بھگتے گا"۔

"حاضر! موسیو حاضر!" کی آواز سڑک پر سے آئی اور اُس کے ساتھ ہی چھ سوار، گھوڑے سرپٹ چھوڑے ہوئے نمودار ہوئے۔ اُن کے نظر آتے ہی نقاب پوش گم ہو گئے، تین گھوڑوں سے کود کر شیرانتہ کی طرف متوجہ ہوئے اور تین نقاب پوشوں کے تعاقب میں دوڑے۔ شیرانتہ نے چابک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مارٹن، دیکھو کیا ہونے والا تھا۔"

"موسیو، معاف کیجیے۔ ہمیں آپ کی آواز نہیں پہنچی تھی"۔

شیرانتہ دو نوکروں کی مدد سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس نے ایک نازک ہاتھ اپنے ہاتھ پر محسوس کیا۔ ایک سیکنڈ میں وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور لیڈی میری سے فٹن میں بیٹھنے کی درخواست کرنے لگا۔

لیڈی میری نے شیرانتہ کی چھاتی پر خون کے دھبے کو دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا تمہیں چوٹ آئی ہے؟"

شیرانتہ۔ "نہیں۔ کچھ نہیں۔ محض ایک خراش" اور رومال کے ساتھ اُس لحظہ بہ لحظہ بڑھتے ہوئے دھبے کو چھپا لیا۔

لیڈی میری۔ "آؤ تم میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلو"۔

"لیڈی میری، ٹھہر جائیے۔ اِس کو گاڑی میں بٹھانے سے پیشتر میری بات سُن لیجیے"۔ ڈیوک برسٹن چہرے سے نقاب اُٹھائے لیڈی میری کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

لیڈی میری۔ "ہاں، اور تمہیں جواب دینا ہے کہ تم نے میرے سامنے میرے دوست ڈیوک شیرانتہ پر کیوں حملہ کیا"۔

برسٹن۔ "ڈیوک! اس سے زیادہ تو آپ کا کوچوان ڈیوک ہے۔ میری عرض سُن لیجیے۔ پھر آپ پر سب حقیقت واضح ہو جائے گی"۔

لیڈی میری۔ "نہیں، میں کچھ سننے کے لئے تیار نہیں۔ آؤ شیرانتہ بیٹھو۔ چلیں"

شیرانتہ۔ "نہیں، میری خاطر اس کی بات سنیئے"۔

لیڈی میری۔ "اچھا تو بتاؤ کہ تم ایسی غیر شریفانہ حرکت کو کس طرح جائز ثابت کرتے ہو۔ لیکن خدارا اختصار سے کام لینا"۔

برسٹن : "مادام کوئی چار مہینے ہوئے، باتھ میں ایک قمار باز آیا جس کا نام مارتنہ تھا ۔ وہ پہلے فرانسیسی سفیر موسیو برکلام کا حجام رہ چکا تھا لیکن وہ یہاں اپنے آپ کو وِکٹر کہتا تھا اور اپنے کمینہ پیشے کو چھُپانے کی بہت کوشش کرتا تھا ۔ میں اور میرے دوست بھی اُس سے کھیلا کرتے تھے ۔ لیکن ایک دن مسٹر ناش کو اُس کی حقیقت معلوم ہو گئی اور اُس نے بلا تامل اُسے اپنے رسٹوراں سے نکال دیا۔ اُس دِن کے بعد وِکٹر سے کوئی معزز انسان گفتگو تک نہ کرتا تھا ۔

اس واقعہ کے بعد جس کا میں نے ذِکر کیا ہے ۔ ڈیوک شیرانتہ میرے پاس آیا اور آپ سے متعارف ہونے کی درخواست کی ۔ میں اُسے پہلے بالکل نہیں جانتا تھا لیکن مہمان نوازی کے خیال سے میں نے اُس کی درخواست پوری کی ۔ اس کے بعد آپ جانتی ہیں کہ اس نے کِس طرح اپنی دولت اور چالاکی سے یہاں رسوخ پیدا کر لیا ۔

مجھے اس پر کوئی شک نہیں تھا ۔ لیکن کپتان بکرٹن جسے اِس ظالم نے بُری طرح زخمی کیا تھا ، میرے پاس آیا اور اُس نے مجھے بتلایا کہ ڈیوک شیرانتہ اصل میں وِکٹر قمار باز ۔ یا یوں کہئے کہ مارتنہ حجام ہے ۔ مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا ۔ لیکن میں نے تحقیق کی اور مجھے معلوم ہؤا کہ شیرانتہ واقعی وِکٹر ہے ۔ میں نے اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا اور ہم نے مِل کر یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ اس کمینے نے سب سے زیادہ آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے اس لئے اس کو سزا بھی آپ کے سامنے دی جائے ۔ اب سب کچھ مکمل تھا ۔ لیکن اس کے نوکروں کے آجانے سے ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے "۔

لیڈی میری کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان باتوں کو سچ نہیں سمجھ رہی ۔ اس نے کہا "شیرانتہ ! میں ہرگز اِن باتوں پر یقین نہیں کرتی ۔ لیکن میرے اطمینان کے لئے تم کہہ دو کہ یہ سب جھُوٹ ہے "۔

برسٹن ۔ "وِکٹر ! جواب دو ۔ کیا تم مجھے جھٹلانے کی جرأت کر سکتے ہو "۔

وِکٹر ۔ " مادام ۔ ڈیوک برسٹن نے جھوٹ اور سچ کی آمیزش میں مہارت کا اتنا اعلےٰ ثبوت دیا ہے کہ میں اُس سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ افسانہ نویس بن جائے "۔

برسٹن ۔ جواب دے ۔ کیا تو وِکٹر قمار باز اور مارتنہ حجام نہ تھا ؟

شیرانتہ خاموش کھڑا تھا ۔ لیڈی میری نے کہا " شیرانتہ ، تُم اِس جھُوٹ کی تردید کیوں نہیں کرتے ؟

خون کے نکلنے سے شیرانتہ بمشکل کھڑا ہو سکتا تھا ۔ رُک رُک کر اُس نے کہا : " افسوس ، مادام یہ درست ہے "۔

لیڈی میری شیرانتہ کو چھوڑ کر فٹن میں بیٹھ گئی اور بولی " شیرانتہ ! کیا یہ مذاق کرنے کا موقع ہے ؟ "

" میں مذاق نہیں کر رہا ۔ میں مارتنہ حجام تھا "۔

ایک لمحہ میں میری کے چہرے پر عجیب تبدیلی پیدا ہو گئی ۔ اُس نے مغرورانہ لہجہ میں اپنے کوچوان سے کہا : " چلو " اور وِکٹر سے

مخاطب ہوکر بولی "خبردار! مجھے اپنی منحوس شکل نہ دکھانا"۔

برسٹن۔ "اور اگر تو چوبیس گھنٹے کے بعد ہاتھ میں ہوا تو جعلسازی کے جرم میں گرفتار کیا جائے گا"۔

وکٹر۔ "میں ایک ہفتے کے بعد سات بجے شام تاش ریسٹوراں میں ہوں گا"۔

جب تک لیڈی میری کی فٹن اُسے نظر آتی رہی وہ اُسے دیکھتا رہا۔ پھر بیہوش ہو کر اپنے وفادار نوکروں کے بازوؤں میں گر پڑا۔

آج مسٹر تاش کے ریسٹوراں میں بہت ہجوم تھا۔ خاص و عام فرانسیسی سفیر موسیو برکلام اور اُس سے زیادہ شاہ فرانس کے چھوٹے بھائی شہزادہ فلپ کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ سات بج چکے تھے لیکن ابھی وہ نہیں آئے تھے۔ لیڈی میری اور ڈیوک برسٹن بھی کھڑے کھڑے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ گرمی کی وجہ سے لیڈی میری کو پیاس محسوس ہوئی "کیا آپ مجھے لیمنڈ کا ایک گلاس دیں گے"۔

"بسر و چشم، لیڈی میری" کہہ کر برسٹن لیمنڈ لانے کے لئے ہجوم میں مل گیا۔

لیڈی میری نے تھوڑی دیر اُس کا انتظار کیا لیکن پھر اُس نے کہیں بیٹھنا مناسب سمجھا اور اس خیال سے ساتھ والے تاش کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں دو آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ایک تو سرہگ تھا اور دوسرا!!! لیڈی میری نے غور سے دیکھا۔ ہاں وہی جعلساز، مکار، جھوٹا وکٹر حجام۔

لیڈی میری۔ "سرہگ! آپ اور وکٹر، کیا میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں یا آپ اس جعلساز حجام سے تاش کھیل رہے ہیں!"

سرہگ۔ "آپ دونوں کی اس کمرے میں موجودگی مجھے بہت عزت بخش رہی ہے"۔

لیڈی میری حیرت سے سرہگ کی طرف دیکھ رہی تھی کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔

وکٹر۔ "لیڈی میری۔ مجھے اجازت ......"

لیڈی میری۔ "سرہگ! آپ جس سے چاہیں دوستی رکھیں۔ لیکن میں ہرگز کمینوں سے گفتگو کرنے کو تیار نہیں۔ اپنے ساتھی سے کہہ دیجئے کہ وہ مجھے مخاطب کرنے کی گستاخی نہ کرے"۔

وکٹر خاموش ہو گیا اور لیڈی میری ایک علیحدہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

اسی اثنا میں مسٹر تاش ڈیوک برسٹن کو دیکھ کر اُس کی طرف بڑھا: "یہ قمار باز میرے ریسٹوراں کو تباہ کر کے چھوڑے گا۔ آج پھر وہ سرہگ کے ساتھ تاش کے کمرے میں گیا ہے اور سرہگ کے لحاظ سے میں اُسے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ڈیوک صاحب! ازراہِ مہربانی میری مدد کیجئے"۔

برسٹن۔ باہر چند سپاہی کھڑے ہیں۔ اُن کو حکم دیتا ہوں کہ اُسے گرفتار کر کے لے جائیں"۔

ناش۔ لیکن اس طرح میری بدنامی ہوگی۔ آپ چار پانچ جنٹلمین اپنے ساتھ لے جائیے اور اُن کے ساتھ اُسے دروازے تک پہنچا دیجئے وہاں سے پولیس اُسے گرفتار کر لے گی۔

اس مقصد سے برسٹن لارڈ ڈلیفرڈ اور چند اور دوستوں کو لے کر ناش کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں وہ لیڈی میری کو دیکھ کر کچھ گھبرایا۔ لیکن پھر اُس کا غصہ سے بھرا چہرہ دیکھا تو مطمئن ہوگیا۔

برسٹن۔ ڈیوک شیرانتہ! ہم آپ کو ہوٹل کے باہر تک لے جانے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔

وکٹر، برسٹن کی آمد سے بالکل بے خبر معلوم ہوتا تھا۔

"کیا تو باہر نکلے گا یا نہیں؛ دس سپاہی تیرا انتظار کر رہے ہیں"۔

وکٹر اب بھی چپ تھا۔

"اسے گھسیٹ کر لے چلو" اور اس مقصد کے لئے وہ آگے بڑھے لیکن سرگٹ اُن کے سامنے کھڑا ہوگیا "ڈیوک برسٹن! آپ ایسا کام ہرگز نہ کیجئے جس کے لئے آپ کو تمام عمر پشیمان ہونا پڑے"۔

یہ دوست سرگٹ کی غیر متوقع مخالفت سے بہت حیران ہوئے اور اُس سے بحث کرنے لگے لیکن سرگٹ اپنی جگہ سے ایک انچ ہلنے کے لئے تیار نہ تھا۔ "میرے دوست کو ہاتھ لگانے سے پیشتر آپ کو میرے جسم کے اوپر سے گزرنا ہوگا"۔

اتنے میں باہر سے شور اور نعروں کی آوازیں آئیں۔

برسٹن۔ "دیکھ حجام! اب تو تیرا مالک بھی آگیا ہے"۔

وکٹر نے سرگٹ سے حاکمانہ لہجہ میں کہا "جاؤ۔ اُسے بُلا لاؤ"۔

لارڈ ڈلیفرڈ۔ "اب تک بد دماغی"

وکٹر۔ "لیڈی میری اور معزز زین برکلام کے آنے تک میں اپنی کہانی سناؤں گا۔ فرانس میں میرا ایک بڑا بھائی ہے جو بڑا دانا اور میرا خیرخواہ ہے لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میں اُس کے کسی حکم کی خلاف ورزی کروں۔ اُس نے مجھے ایک خاتون سے شادی کرنے کے لئے کہا۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس پر وہ بہت ناراض ہوا۔ اور اُس کے ڈر سے میں گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اُن دنوں موسیو برکلام کو حجام کی ضرورت تھی۔ میں نے اُس کی نوکری کر لی۔ اور اُس کے ساتھ انگلستان آگیا۔ یہاں آکر میں نے نوکری چھوڑ دی اور وقت گزارنے کے لئے جوا کھیلنا شروع کر دیا۔ میرے ہاتھ کے قیام کے دوران میں مجھے ایک معزز انسان کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ تاش کھیلنے میں دغا سے کام لیتا ہے۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ کون ہے کیونکہ میں نے وعدہ کیا تھا"۔

برسٹن :- "جو تیرا دِل چاہے بک"

وِکٹر :- "وہ اب اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے۔ قمار باز وِکٹر کی بات لوگ مان لیتے لیکن جعلساز شیر آنتہ کا کون اعتبار کرتا ہے۔ اچھا تو اس انسان نے مجھے خاموش رکھنے کے لئے آپ کے ساتھ میرا تعارف بحیثیت ڈیوک شیر آنتہ کرادیا۔ یہ شخص . . . . . "

شہزادہ فلپ بھاگتا ہوا آیا اور وِکٹر کے گلے کے ساتھ لپٹ گیا: "آہا بھائی! میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ کوئی آپ کے بغیر مُلک کا انتظام نہیں کرسکتا"۔ برکلام اس کے پیچھے آیا اور وِکٹر کے قدموں میں گر پڑا لیکن وِکٹر نے اُسے اُٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ "میرے آقا، دیکھ تیرے حجّام پر کیا گزر رہی ہے"۔

وِکٹر:- "اس شخص نے بھی مجھے راز فاش کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ دغا باز یہ ہے"۔ اُس کی اُنگلی برسٹن کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

برسٹن :- "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھ پر الزام لگانے والا شیر آنتہ ہے یا وِکٹر قمار باز یا مارٹنہ حجّام"

"برکلام اسے میرا نام بتلاؤ" اُس کی آواز میں شاہانہ رُعب و دبدبہ تھا۔ لیڈی میری کانپ رہی تھی۔ خدا جانے کیوں۔

برکلام :- "لیڈی میری اور معزز بن کیا میں آپ کو شہزادہ چارلس ڈیوک آف اورلینز ولیعہد شاہ فرانس کے سامنے پیش کرنے کا فخر حاصل کرسکتا ہوں"۔

ڈیوک برسٹن کے چہرے پر ایک غیر معمولی تغیر رُونما ہوچکا تھا۔ "موسیو چارلس۔ آپ آدھے گھنٹے میں میرا پیغام سُنیں گے"۔

شہزادہ چارلس :- "میں تمہارے خون سے اپنی تلوار آلودہ کرنی نہیں چاہتا۔ تمہارا چیلنج کوئی شریف انسان نہیں لے گا۔ اور جو لائے گا وہ مارٹن سے تھوڑے سے چابک کھائے گا"۔

برسٹن غصے کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

شہزادہ چارلس :- "ہاں فلپ، میں اب فرانس واپس جاؤں گا اور اس خاتون سے شادی کروں گا"۔

شہزادہ فلپ :- "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ جب بھائی نے آپ کی منت کی۔ ڈرایا۔ دھمکایا تو آپ برکلام کے حجام بنے لیکن اس کی بات نہ مانی۔ اب جب کوئی آپ کو مجبور نہیں کرتا تو آپ اس سے شادی کرلیں گے"۔

چارلس :- "انسان سیکھتا ہی رہتا ہے اور اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ صرف وہی خاتون ہے جو مجھے ہر حیثیت میں قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ میرے مہربانو! شب بخیر۔ لیڈی میری الوداع"۔

سُوکھے ہوئے گلاب کی پنکھڑیاں لیڈی میری کے گرد اُڑ رہی تھیں اور ایک پرانے فرانسیسی گیت کی آواز اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی +

(ماخوذ)

ظفر ملک

محفلِ ادب

جوشؔ کے استعارات

کوہستان کی عورتیں کے عنوان سے جوشؔ کی نظم کے چند اشعار درجِ ذیل ہیں۔ اس کی انوکھی ترکیبیں اور پُر معنی تشبیہیں ملاحظہ ہوں:-

یہ اُبلتی عورتیں، اس چلچلاتی دھوپ میں / سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے رُوپ میں

واہ کیا کہنا ترا اے حسنِ ارضِ آفتاب / یہ برشتہ رنگ، یہ تپتے ہوئے سنگین شباب

ہر سراپا ئبت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل / اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

چال جیسے تُند چشمے، تیوریاں جیسے غزال / عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال

عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب / پھٹ پڑا ہے حسن پہ طوفاں خیز پتھریلا شباب

یہ جواں چہرے ہیں، یہ چہروں میں برنائی کا جوش / توڑ کے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش

جسم ہیں کچھ اس قدر ٹھوس، الحفیظ والاماں / لیجئے چٹکی، تو چھل جائیں خود اپنی اُنگلیاں

مچھلیاں شانوں کی ابھری سی، بٹی سی کلائیں / آہن و فولاد کے پٹھے، سلاخوں کی رگیں

دید کے قابل ہے ان کافر بتوں کا رنگ رُوپ / کھپ چکی ہے جس میں بارش، ڈس چکی ہے جس کو دھوپ

اِن بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی، الاماں / پتھروں کا خون پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں

کنکروں کے فرش پر دُنیا سُلاتی ہے جنہیں / آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنہیں

کیا خبر کتنے دلوں کی جوتش پامالی ہوئی / ان اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

شاعرانہ مصوری کا اس سے بہتر نمونہ اور کونسا پیش کیا جا سکتا ہے۔ "اُبلتی عورتیں" "سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں" "تپتے ہوئے سنگیں شباب" "برسات کی راتوں کے خواب" "پتھریلا شباب" یہ عجیب و غریب ترکیبیں جوشؔ کے سوا اور کہاں دیکھنے میں آسکتی ہیں۔

"زمانہ"

مرد کا عورت سے بچنا بڑا مشکل ہے

(انگلستان کے ادیبِ اعظم برنارڈ شا کی سرگزشت)

• مسٹر برنارڈ شا نہ صرف انگلستان کے نامور ادیب ہیں بلکہ آپ کو دنیا کا سب سے بڑا ادیب تسلیم کیا جا چکا ہے۔ ابتدا میں

مسٹر برنارڈ شا شادی کے زبردست مخالف تھے۔ لیکن پھر بھی وہ شادی سے نہ بچ سکے۔ مسٹر برنارڈ شا کی شادی کیونکر اور کن حالات میں ہوئی، اس کی دلچسپ سرگزشت مسٹر برنارڈ شا ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔"

"شادی ایک مہمل اور لایعنی چیز ہے۔ شادی کرنا اپنی زندگی اور مستقبل کو تباہ کرلینا ہے۔ دنیا میں وہ شخص کیا ترقی کرسکتا ہے جو عورتوں میں پھنس جائے اور بچوں میں اُلجھ جائے۔ جس کو سکون اور اطمینان برباد کرنا ہو وہ شادی کرلے"۔ یہ تھے میرے وہ خیالات جن پر میں ابتدا میں یقین رکھتا تھا اور ان ہی خیالات کی بنا پر میرے وہم وخیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کبھی میں بھی شادی کروں گا مگر میرے ان خیالات کی عمارت کو ایک لڑکی کے تبسم نے کس طرح گرا دیا۔ یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے۔

انگلستان میں ایک نہایت صاحبِ ثروت شخص مسٹر مارس تھے، ان کی ایک خوبصورت لڑکی تھی جو پھولوں کی طرح تر و تازہ، موسم بہار کی طرح شگفتہ اور اس قدر دلفریب تھی کہ کوئی صاحبِ ذوق اسے دیکھنے کے بعد اس کے حسن کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اس زمانہ میں کنوارا تھا اور کنوارا ہی رہنا چاہتا تھا، میں اتنا غریب تھا کہ اگر میں اپنی سال بھر کی ساری آمدنی بھی مس مارس پر خرچ کردیتا تو شاید یہ مس مارس کے لئے ایک ہفتہ کے لئے بھی کافی نہ ہوسکتی۔ ایسی حالت میں مس مارس کے ساتھ شادی کا اگر میں خیال بھی کرتا تو حماقت تھی۔

اتوار کی ایک دلفریب شام کا ذکر ہے کہ میں لیکچر دینے کے بعد مس مارس کے مکان پر گیا۔ مس مارس اس وقت کھانے کے کمرہ سے وسطی حال میں آئی اور اس شان کے ساتھ آئی جیسے پرستان کی کوئی شہزادی زمین پر اُتر آئی ہو۔ اس کا مسرور چہرہ، خوبصورت پوشاک، حسین جسم اور دزدیدہ چہرہ مجھ پر اثر کیے بغیر نہیں رہا۔ مجھے یہ معلوم ہونے لگا جیسے میرا دل اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہو۔ جس طرح شراب انسان کو مآل سے بے خبر کردیتی ہے اسی طرح عورت کا حسن بھی سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ میرا اُصول، خیالات، سب کچھ فنا ہوگئے، میں جو شادی کا سب سے بڑا مخالف تھا یہ سوچنے لگا کہ اگر مس مارس میری شریک زندگی بن جائے تو میری زندگی کس قدر خوشگوار ہوجائے۔ میں ان ہی تخیلات میں غرق تھا کہ مس مارس نے مجھے کھانے کی دعوت دی۔ میں جو پہلے ہی سے مبہوت ہو رہا تھا کس طرح انکار کرسکتا تھا۔ مس مارس کا یہ پہلا وار تھا جس نے میرے خیالات بدل دیئے اور میں سوچنے لگا کہ میں اس خوشنما پھول کو کیونکر حاصل کرسکتا ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آسمانی بلندیوں پر میری اور مس مارس کی شادی ہوگئی ہو۔

میں سوچنے لگا کہ دولت اور افلاس کی یکجائی کس طرح ممکن ہے، میں غریب تھا اور مس مارس بے حد دولت مند۔ میرے دل نے کہا، اگر میں آج غریب ہوں تو کیا ہے۔ میرے دماغ میں علم کے خزانے بند ہیں، جب یہ دُنیا کے سامنے آئیں گے تو دُنیا مجھے جواہرات میں تول دے گی۔ اس لئے فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے، اس خیال سے مجھے تسلی ہوگئی، یا یوں کہئے کہ میں نے آپ کو تسلی دے دی۔ میں مس مارس سے ملتا رہا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ اس دُنیا میں ایک دولتمند اور غریب کی محبت تو ممکن ہے مگر شادی ناممکن ہے کیونکہ سوسائٹی ایک ایسا دیو ہے جو فطرت کے اُصولوں کو بھی کچل کر رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہماری محبت کو سوسائٹی کے قوانین نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور

مس مارس نے ایک دولتمند سے شادی کرلی۔ یا مس مارس کو ایک دولت مند سے شادی کرنے پر دُنیا اور دنیا والوں نے مجبور کردیا۔

یہ میری زندگی کا زبردست سانحہ تھا جس نے مجھے بتایا کہ دُنیا میں علم اور فضیلت کی زیادہ وقعت نہیں ہے۔ یہ جوہر بھی اسی وقت قیمتی ہے جب اس کے ساتھ دولت کا فریب ہو۔ حُسن اور دولت دونوں کی ضرورت میں محسوس کرنے لگا۔ مس مارس کی جانب سے اپنے خیالات کو ہٹانے کے لئے مجھے ازدواجی زندگی اختیار کرلینی پڑی۔ میں نے شادی کرلی۔ اور اس کے بعد زندگی کی جدّوجہد میں اس لئے مصروف ہوگیا تاکہ مس مارس کو یہ دکھا سکوں کہ مجھ میں کیسے کیسے جوہر پوشیدہ تھے۔ میں جدّوجہد کرتا رہا یہاں تک کہ سارے انگلستان میں میری شہرت ہوگئی اور اب میں انگلستان کے ممتاز لوگوں میں ہوں۔ مایوسی اور ناکامی نے مجھے جگا دیا اگر مس مارس میرے ساتھ بے وفائی نہ کرتی تو شاید مجھے بے مائیگی کا احساس کبھی نہ ہوتا۔ میں چند روز میں شہرت، دولت اور عزّت سب کچھ کا مالک ہوگیا۔ صرف اس لئے تاکہ مس مارس کو یہ بتا سکوں کہ مجھ میں کیا جوہر ہیں۔ اس لئے نہیں کہ میں دولت سے محبت رکھتا تھا، کیونکہ اب بھی میں دولت کو بے حقیقت تصوّر کرتا ہوں۔

مس مارس کی اپنے شوہر کے ساتھ اَن بن ہوگئی، اُسے طلاق لینی پڑی، وہ طلاق حاصل کرنے کے بعد بدستور تنہائی کی زندگی گزارتی رہی۔ چالیس سال کے بعد میں مس مارس سے پھر ملا۔ زمانہ نے مس مارس کو بدل دیا تھا۔ اس کے سیاہ بال سفید ہوچکے تھے۔ اس کا خوبصورت چہرہ اب شاداب نہ تھا مگر شوخی ہنوز باقی تھی۔ میں بھی ایک بوڑھا انسان بن گیا تھا مگر اب میں ایسا غریب نوجوان نہ تھا جس سے عورتیں غریبی کی وجہ سے بھاگا کرتی ہیں۔ ہماری یہ ملاقات کیا تھی، گذشتہ محبت کی ایک یادتھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جب چالیس سال کے بعد مس مارس مجھ سے ملی ہے تو اس کے دل میں کیا خیالات ہوں گے۔ مگر میں نے اس سے کہا "مس مارس تم نے میرے خیالات کو بدل دیا، تم نے مجھے بتا دیا کہ ایک عورت کس آسانی کے ساتھ مرد کے تخیلات کی بلند وبالا عمارت کو گرا سکتی ہے۔ میرے خیال میں اس دُنیا میں کسی انسان کا عورت سے بچنا ناممکن ہے۔ اگر تم مجھ سے محبت نہ کرتیں یا میں تم سے محبت نہ کرتا تو شاید میں آج بالکل مختلف انسان ہوتا۔"

"ذہن و دُنیا"

قطعِ تعلق

اچھا . . . . . خیر . . . . . تو خدا حافظ مگر تو کچھ بھولی تو نہیں جاتی۔ نہیں۔ تو اچھا رُخصت!

مجھے اب کچھ اور کہنا نہیں ہے۔ اچھا خدا حافظ۔ جاتی ہے؟ اچھا چلی جا۔ لیکن ذرا ٹھہر۔ دیکھ بارش شروع ہوگئی۔ پانی تھمتے ہی چلی جانا۔ مجھے اور کچھ کہنا نہیں ہے۔ اچھی طرح بدن چھپا لے۔ باہر بڑی سخت سردی ہے۔ اس وقت تو تجھے اوورکوٹ پہننا چاہیئے تھا۔ کیا تیری سب چیزیں تجھے واپس مل گئی ہیں۔ اپنی تصویر اور خط بھی تجھے واپس مل چکے ہیں؟ بہت اچھا . . . . . اچھا جا۔ خدا حافظ۔

لیکن ذرا ٹھہر۔ جُدا ہو رہی ہے تو ایک دفعہ اور مجھے دیکھ لے۔ ذرا نگاہیں اُٹھا لے۔ مگر خبردار نہ میں روؤں نہ تُو روئے یہ بیوقوفی ہے۔

آہ یہ کس قدر تکلیف کی بات ہے کہ ہم اس وقت اپنا پرانا عشق یاد کریں۔ آہ میں اپنی زندگی تجھے دے چکا تھا۔ اور تو اپنی زندگی مجھے دے چکی تھی۔ عمر بھر کے لئے۔ ہمیشہ کے لئے لیکن آج ہم اپنی اپنی زندگیاں واپس لے رہے ہیں۔ میں الگ ہو رہا ہوں۔ تو الگ ہو رہی ہے۔ میری بھی نئی زندگی شروع ہو گی اور تیری بھی۔ آج سے میری راہ الگ اور تیری راہ الگ۔ شاید اس جُدائی کا مجھے کچھ غم ہوگا اور تجھے بھی کچھ غم ہوگا۔ پھر اس کے بعد؟

اس کے بعد بھول جانا۔ فراموش کر دینا۔ میں تجھے بھُول جاؤں گا۔ تو مجھے بھُول جانا۔ پھر اس کے بعد؟

تیری دُنیا الگ ہو گی۔ میری دُنیا الگ۔ آج تک لوگ مجھے اور تجھے ایک ہی سمجھتے تھے۔ کل الگ الگ دیکھیں گے۔ تو میری زندگی کا ایک بھولا بسرا واقعہ بن جائے گی۔

پھر اس کے بعد؟

راستہ میں تُو اتفاقیہ کہیں مل جائے گی۔ میں تجھے دیکھ بھی لوں گا تو سلام کلام کچھ نہ کروں گا۔ اور نہ تو کرے گی تو ایسے کپڑے پہنے نکلے گی جو مجھے پسند نہ ہوں گے اور میں ایسی حالت میں ہوں گا کہ تو کراہت کرے گی۔

مہینوں گزر جائیں گے اور ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھیں گے۔ تیرے دوست میرا تذکرہ کریں گے۔ اور تو غور سے سُنا کرے گی اور میں اپنے دوستوں سے تیرے حالات سُنا کروں گا۔ حالانکہ تو میری جان تھی۔ اور میرے ارمانوں کی دُنیا —— میں پوچھوں گا۔ اس کا کیا حال ہے۔ دوست جواب دیں گے . . . . . خوش ہے۔ اور میرے دل کا خون ہو جائے گا۔

لیکن خیر یہ بے وقوفی کی بات ہے۔ اچھا۔ جا . . . . . لیکن ذرا مجھے یہ تو بتا کہ ہم دونوں کے عظیم الشان دل کیا اتنے ہی حقیر اور چھوٹے تھے جتنے اس وقت معلوم ہو رہے ہیں۔ کیا ہم شروع سے پاگل تھے۔ کیا تجھے بھی خوشی کے گزرے ہوئے دن یاد نہیں؟

کیا تجھے یاد ہے جب ہم روز آسمان پر پہنچ جایا کرتے تھے۔ کیا واقعی ہم عاشق تھے؟

دیکھ ذرا دیکھ تو کیا ہماری یہی محبت ہے۔ تو مجھ سے کہتی تھی میں تمہیں چاہتی ہوں . . . . . اور میں تجھ سے کہتا تھا . . . میری جان میں تجھ پر دم دیتا ہوں . . . . مرتا ہوں . . . . . لیکن کیا میرے اور تیرے اس دعوائے محبت کا یہی انجام ہونا تھا؟ . . . میرے اللہ یہ انجام کس قدر شرمناک ہے۔ کیا میں بے وفا ہوں؟ اور کیا تو بھی بے وفا ہے؟ اُف تو کیا ہم دونوں دوسرے لوگوں کی طرح دُنیا دار ہیں؟

لیکن نہیں یہ سب بیوقوفی کی باتیں ہیں، تو جا رہی ہے؛ بہت اچھا خدا حافظ۔ جا۔ . . . . مگر بارش موسلا دھار ہے تو کیسے جائیگی
"تو میں کوئی کچی مٹی کی بنی ہوئی ہوں ؟"

بہت اچھا۔ چلی جا۔ جا۔ خدا حافظ . . . . . . ارے تو چل پڑی ؟

لیکن زنجیر تجھ سے نہیں کھلے گی۔

کیا واقعی تو جا رہی ہے ؟ ایسی بارش میں ؟

لیکن نہیں میں سنگدل سہی۔ ایسی بارش میں تجھے جانے نہیں دوں گا۔ میری جان۔ آہ نہیں۔ میں تجھے جانے نہیں دوں گا۔

یہیں رہ صرف آج کی رات۔

ملعون ہو جاؤں۔ اگر تجھے ہاتھ بھی لگاؤں۔

رہ جا۔ میری جان رہ جا۔ میرا سر تیرے قدموں پر ہے

میں تجھے جانے دوں ؟

ناممکن . . . . . . ناممکن . . . . . . ناممکن

بیٹھ بھی۔ اب ہم اچھی طرح رہیں گے۔

جو کچھ تو کہے گی۔ میں وہی کروں گا۔

بس غصہ تھوک دے۔

آج کے بعد پھر کبھی تجھ سے نہیں لڑوں گا۔

(پال گرالڈی)

"مصور بمبئی"

نئی کتابیں

برہانِ مآثر - یہ دکن کی ایک قدیم تاریخ ہے جو اب تقریباً نایاب ہو چکی تھی لیکن حال ہی میں مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن نے دولتِ آصفیہ کی سرپرستی میں اسے نہایت حسنِ اہتمام کے ساتھ بڑی تقطیع کے تقریباً ساڑھے چھ سو صفحات پر شائع کیا ہے۔ کتاب کا مؤلف سید علی طباطبا ہے جو مشہور مؤرخ فرشتہ کا ہمعصر تھا۔ یہ عراق سے دکن میں آیا اور شاہانِ گولکنڈہ اور شاہانِ احمد نگر کی ملازمت میں رہا۔ کتاب کا سنِ تالیف ۱۰۰۰ھ ہے۔ برہانِ مآثر تین طبقوں پر مشتمل ہے۔ طبقۂ اول سلاطین گلبرگہ، سلطان علاء الدین حسن شاہ گنگوی بہمنی کے حالات سے شروع ہو کر فیروز شاہ بہمنی کے حالات پر ختم ہوتا ہے۔ طبقۂ دوم سلاطین بیدر، سلطان احمد شاہ بہمنی سے شروع ہو کر سلطان محمود شاہ بہمنی پر ختم ہوتا ہے اور طبقۂ سوم سلاطینِ احمد نگر، سلطان احمد شاہ بحری سے شروع ہو کر چاند سلطانہ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ کتاب تاریخ کے شائقین کیلئے عموماً اور تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خصوصاً نعمتِ غیر مترقبہ ہے، کاغذ ٹائپ اور جلد نہایت نفیس ہے۔ قیمت مجلد ۱۰؍ سکۂ انگریزی۔ بیرونِ ہند سے ایک پاؤنڈ انگریزی۔ مجلس مخطوطاتِ فارسیہ حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے۔

مضامینِ رشید - یہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کے اٹھارہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ مجلد شائع کیا گیا ہے۔ رشید صاحب ملک کے مشہور مزاحیہ نگار ہیں اور تعارف کے محتاج نہیں۔ قیمت عہ۔ پتہ: مکتبۂ پنجاب لاہور

واردات - یہ منشی پریم چند کے تیرہ دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے جو بہت اہتمام کے ساتھ مجلد شائع ہوا ہے قیمت عہ۔ پتہ: مکتبۂ پنجاب لاہور

مقالاتِ حالی حصۂ دوم - اس قابلِ قدر کتاب میں مولانا حالی مرحوم کی تقریریں اور کتابوں کے تبصرے جمع کئے گئے ہیں۔ مولانا حالی ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ایک بلند پایہ نقاد بھی تھے۔ اس کتاب کی ایک تاریخی حیثیت بھی ہے، وہ یہ کہ اس میں بعض مشہور مصنفوں کی اُن تصانیف پر بھی تبصرے ملتے ہیں جو اب قبولِ عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ قیمت غیر مجلد عہ، مجلد عہ۔ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے طلب کیجئے۔

مسلم گرلز کالج میگزین - یہ علی گڑھ کے زنانہ کالج کا رسالہ ہے جس کی ایڈیٹر زہرہ بانو صاحبہ (متعلمۂ درجہ دہم) ہیں۔ اس رسالے میں تمام مضامین نظم و نثر کالج کی طالب علم لڑکیوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ رسالہ معیار کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہے اور اس کے لئے ہم ایڈیٹر اور دیگر مضمون نگاروں کو مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں۔